



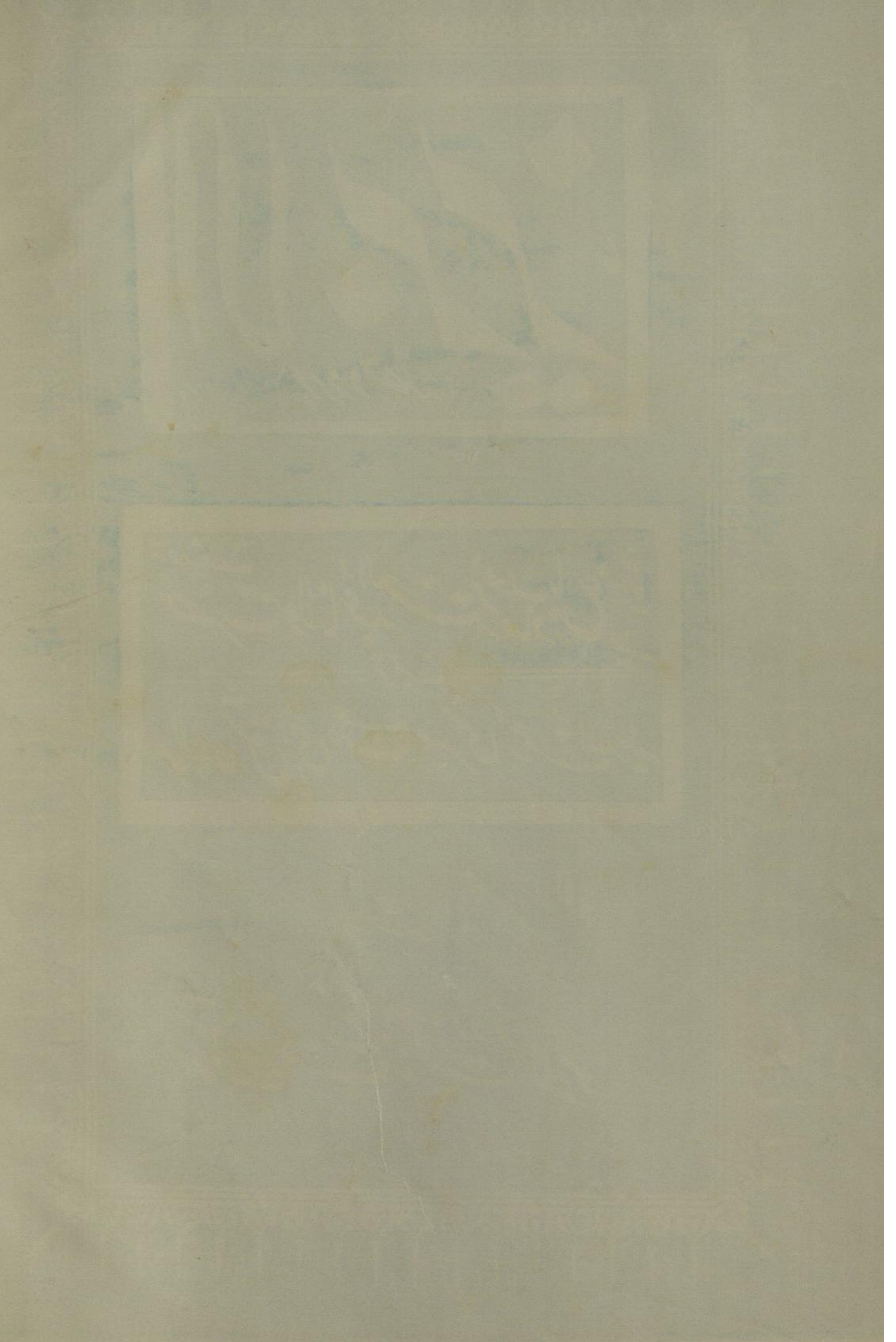
الامر  
(مردود حصه)

تصنيف  
حضرت مولانا عبد العزیز صاحب جامع رحمۃ اللہ  
ترجمہ  
مولانا عاشق الہی صاحب سامیر ٹھکی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر

مدنی کتب ساز گیت روڈ لاہور







الابرار  
ہر دو حصہ  
کابل

مؤلفہ: حضرت مولانا عبد العزیز دہلوی

اُردو ترجمہ

مولانا عاشق الہی صاحب میرٹھی مرحوم

ناشر

مدنی کتب خانہ کنیت و دلاہو



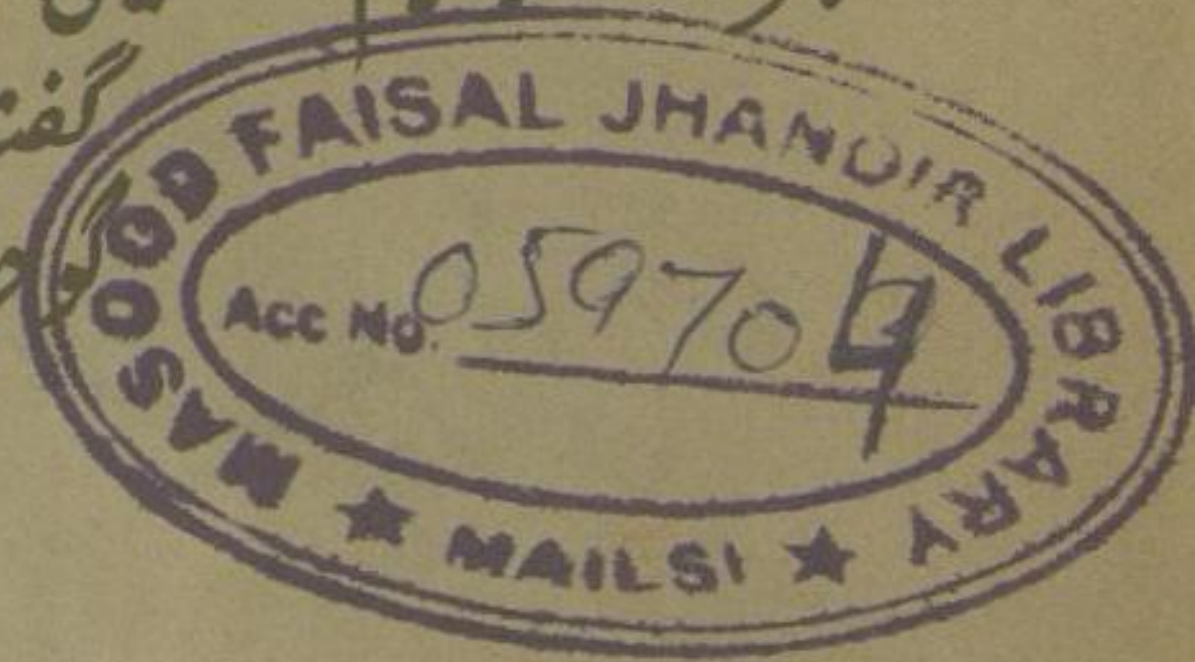
الَا اِنَّ اَوْلٰىئَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

قرآن حکیم

یاد رکھو کہ خدا کے دوستوں پر نہ تو کبھی مخلوقات کا خوف طاری ہوتا ہے اور نہ وہ کبھی رنجیدہ و غمزدہ ہوتے ہیں۔

ہرگز نہ میرا ننگہ دلش زندہ شد بہ عشق  
ثبوت است بر جریدہ عا دوام ما  
شان اولیا

اولیاء بہت قدرت ازالہ ، تیر جستہ باز گردانند ز راہ  
ہر کہ خواہد ہم نشینی با خدا اونشیند در حضور اولیاء  
گفتہ او گفتہ اللہ بود ،



بار \_\_\_\_\_ اول \_\_\_\_\_  
تعداد \_\_\_\_\_  
ہدیہ \_\_\_\_\_ ہر دو حصہ کامل \_\_\_\_\_  
مطبوعہ \_\_\_\_\_ شرکت پریس لاہور \_\_\_\_\_

ناشر

مدنی کتب خانہ کنیت روڈ لاہور ۲



نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۱۔	ابتدائیہ حصہ اول	۱
۲۔	فصل اول	
	حالات قبل ولادت	۲
۳۔	پہلا باب	
	وہ احادیث جنکا مطلب ہم نے شیخ سے دریافت کیا	۵۶
۴۔	دوسرا باب	
	آیات قرآنیہ اور سریانی زبان اور الم لیس ص ق وغیرہ فواتح سورت کے متعلق استفسارات	۱۶۹
۵۔	حصہ دوم	۲۸۱
	باب سوم	
	ان ظلمتوں کا ذکر جو بندوں کی ذات اور انکے اعمال پر داخل ہوتی ہیں اور انکو خبر بھی نہیں ہوتی	
۶۔	چوتھا باب	۳۲۹
	دیوان صالحین یعنی اہل تصرف اقطاب و ابدال کی مجلس کا بیان	
۷۔	پانچواں باب	
	پیری مریدی اور اسکے متعلق حضرت ممدوحؒ کے ارشادات	۳۵۰
۸۔	چھٹا باب	
	شیخ تربیت تلقین ذکر کا نفع اسماء حسنیٰ اور حلقہ درویشان	۳۹۶
	حضرت ممدوحؒ کے مشائخ	۴۱۷
۹۔	آٹھواں باب	۴۲۷
	سیدنا آدم علیہ السلام کی آفرینش کی تدبیج اور صورت بنی آدم کا فضل شرف	۴۴۷
۱۰۔	نواں باب	
	فتح ظلمانی و فتح نورانی کا فرق اور مجنون و مجذوب کی شناخت	
۱۱۔	دسواں باب	۴۸۸
	برنخ اور اس کی صورت و حالت اور اس میں نزول ارواح کی کیفیت	



صفحہ نمبر	مضامین	نمبر شمار
۵۰۷	گیارہواں باب جنتوں کی ترتیب اور شمار	۱۲-
۵۲۷	بارہواں باب جہنم کا بیان	۱۳-
۵۴۴	تمت	۱۴-



نحمدہ و نصلی علی نبیہ الکریم و سب لبس و لا تعسر و تتمہ بالخیر  
 قدوة العلماء العارفین زبدة الاصفیاء الواصلین المحقق المدقّق العلامة مولانا الحافظ احمد بن المبارک السجلماسی  
 حمد و صلوٰۃ کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ جب حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے شیخ دوران غوث زمان قطب السالکین حاصل  
 لواء العارفین مولانا سید عبدالعزیز دباغ قدس سرہ العزیز کی زیارت و معرفت مجھے نصیب فرمائی تو وہ وہ علوم و معارف  
 اور شمائل و لطائف مشاہدہ میں آئے کہ میں حیران ہو گیا۔ مدوح کو سید الوجود سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان  
 رفیع سے اتنا آگاہ پایا کہ جب سے پیدا ہوا نہ کسی سے سنا نہ کسی کتاب میں دیکھا، اللہ جلّ جلالہ کی ذات و صفات  
 اور اسماء کی وہ خداداد معرفت آپ میں پائی جس کی کیفیت ناقابل بیان ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کے حالات  
 علیہ سے اتنا واقف پایا گیا کہ گویا ہر نبی کے معاصر ہیں اور زیانہ نبوت میں ان کے ساتھ رہے ہیں۔ اسی طرح حضرات  
 ملائکہ کے حقائق اور انواع کے اختلاف اور مراتب کے تفاوت کا آپ کو اتنا علم پایا کہ بشر کے مبلغ علم سے باہر  
 تھا۔ کتب سماویہ اور انبیاء سابقین کی شریعتوں سے اتنی واقفیت دیکھی کہ جو بھی سنے وہ مدوح کی سید العارفین اور  
 امام الاولیاء ہونے کا اعتراف کرے، روز قیامت اور اس کے وقائع حشر و نشر و پکڑ و میزان و جنت و جہنم وغیرہ کی  
 ایسی واقفیت دیکھی کہ گویا ہر چیز کو آنکھوں سے دیکھ کر بیان کر رہے ہیں۔ چونکہ ان ہی چیزوں کی معرفت ہر مومن کا مقصود  
 و منتہائے مراد ہے کہ سیدنا جبریل علیہ السلام نے جب سیدنا و مولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان کی حقیقت  
 دریافت کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حقیقت ایمان یہ ہے کہ اللہ اور اس کے فرشتوں اسکی  
 کتابوں اس کے پیغمبروں اور روز قیامت اور تقدیر پر ایمان لائے کہ بھلی ہو یا بُری سب اللہ کی طرف سے ہے۔  
 اس سے معلوم ہوا کہ جس کو ان امور کی معرفت زیادہ نصیب ہوگی وہی ایمان میں افضل اور عرفان میں اکمل ہوگا اور اس  
 برس آپ کی خدمت میں رہا کہ بشمار معارف ہر وقت میرے کان میں پڑتے رہتے تھے مگر کبھی خیال نہ ہوا کہ ان  
 کو قلم بند کروں یاں جو کچھ آپ سے سُنتا اور جتنا سمجھتا تھا اپنے بعض اصحاب و خاص احباب سے نقل کر دیا کرتا تھا۔  
 پھر جو بھی سُنتا وہ تعجب کرتا اور کہتا تھا کہ ایسے بے مثل حقائق و معارف ہمارے کانوں میں کبھی نہیں پڑے  
 زیادہ تعجب کی بات یہ تھی کہ حضرت مدوح اُمّی محض تھے کہ علم ظاہری سے کبھی مس ہی نہیں ہوا تھا بخوف  
 طوالت میں ان حضرات کے نام نہیں گنوا تا جو علماء و فقہاء ہونے کے ساتھ خود بھی ولایت میں شہور اور  
 بکثرت صلحاء اولیاء کی صحبتوں میں رہ چکی اور ان کے فیوضات عالیہ سے مستفیض بن چکے تھے مگر جب مدوح کی کوئی تقریر  
 میرے ذریعہ سُنتے تو دو دو ہفتے اس کی لذت لیا کرتے اور مجھ سے کہا کرتے کہ واللہ یہ شخص وہی کامل اور عارف و اصل



ہے تم ان کی صحبت و محبت کبھی نہ چھوڑنا اور جب مجھ سے ملنے تو بڑے شوق سے بوجھا کرتے کہ شیخ سے سُننے ہوئے معارف لطائف میں کوئی نئی بات سُنی ہو تو سُننا۔ رجب ۱۲۹۰ھ میں حق تعالیٰ نے میرے قلب میں ڈالا کہ جو سُنوں وہ قلم بند کروں کہ نفع تام اور فائدہ عام ہو۔ چنانچہ رجب، شعبان، رمضان، شوال اور ذی قعدہ پانچ مہینہ کے سُننے ہوئے کلام کو میں نے جمع کیا تو ۱۵ جُز کے قریب ہو گئے۔ اس وقت مجھے افسوس ہوا کہ گذشتہ چار سال کے مسموعات کو اگر جمع کرتا تو دو سو جُز سے زیادہ ہوتے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت شیخ کے سینہ میں جو علوم موجود تھے ان کی شمار تو صرف اسی خدا کو ہے جس نے وہ عطا فرمائے تھے مگر بحر زخار کے چند قطرات میں نے جمع کئے ہیں جن کو پیش کرتا ہوں یہاں بطور مقدمہ حضرت کے ابتدائی حالات اور ان مشائخ کا تذکرہ جن سے ممدوح کو ظاہری و باطنی لقاء حاصل اور ذکر کی تلقین ہوئی ہے تین فصلوں میں بیان کر دینا ضروری ہے۔

## فصل اول حالات قبل از ولادت

حضرت ممدوح نے فرمایا کہ مولانا العربی فشتانی اولیاء اللہ میں سے تھے۔

اول شیخ محمد بن ناصر کی صحبت میں رہے اور ان کے بعد حضرت مبارک بن علی کی صحبت پائی۔ صورت یہ ہوئی کہ شہر فارس کی مسجد قروین میں حضرت عربی فشتانی نے حضرت مبارک بن احمد کو دیکھا اور آثار صلاح و بزرگی پا کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ حضرت مجھے بتلایئے اہل بصیرت کو بصیرت کس طرح حاصل ہوتی ہے۔ حضرت احمد بن مبارک نے فرمایا اچھا چھینکو، فشتانی نے کہا چھینک تو اس وقت مجھے نہیں آ رہی فرمایا اسی طرح مجھے بھی نہیں آ رہا کہ تمہیں بتاؤں بصیرت کیسے حاصل ہوتی ہے مطلب یہ ہے کہ چھینک آنا جس طرح غیر اختیاری ہے اسی طرح حصول نور باطنی بھی وہی اور محض عطاء رب ہے،

یہ جواب حضرت فشتانی کو ایسا سمجھایا کہ ان کے خادم و محب بن گئے۔ حضرت فشتانی کے ایک بہن تھیں راضیہ اور راضیہ کی ایک لڑکی تھی فارحہ۔ راضیہ کے شوہر علال قمارشی کا جو کہ امیر کبیر تھے انتقال ہو گیا تو راضیہ نے مکنا سہ کے ایک شخص سے نکاح کر لیا اور فارحہ کو ان کے ماموں حضرت فشتانی نے لے لیا اور نہایت محبت کے ساتھ پرورش کیا۔ حضرت فشتانی درویش ورعی ہونے کے ساتھ ساتھ عالم فقیہ اور معلم قرآن مجید بھی تھے کہ طلبہ کو درس دیا کرتے اور بچوں کو تجوید سکھایا کرتے تھے۔ میرے والد ماجد سیدنا مسعود دباغ بھی منجملہ طلبہ کے ایک طالب علم اور ان کے شاگرد تھے۔ ایک دن بھری مجلس میں حضرت فشتانی نے میرے والد کو آواز دی اور فرمایا کہ اپنی بھانجی کو میں تمہاری زوجیت میں دینا چاہتا ہوں۔ والد صاحب نے عرض کیا کہ حضرت اگر عطا فرماتے ہیں تو میں قبول کرتا ہوں۔ فشتانی نے فرمایا اچھا میں نے فارحہ کو تمہاری زوجیت میں دیا۔ والد صاحب نے عرض کیا کہ میں



نے قبول کیا۔ حضرت فشتالی نے فرمایا ہر چیز سب میرے ذمے ہے تم کو کسی قسم کا فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ والد صاحب کو اس بات کی بڑی خوشی ہوئی۔ اس سے پہلے بھی حضرت فشتالی کو میرے والد صاحب سے بہت محبت تھی۔ اور جب بھی والد صاحب ان کے پاس آیا کرتے تو وہ خوش ہو کر پاس بیٹھاتے اور روپیہ پیسیہ جو کچھ بھی حسب گنجائش وقت میسر ہوتا والد صاحب کو دیا کرتے تھے چنانچہ عقد نکاح تمام ہونے کے بعد حضرت فشتالی نے بھانجی کے جہیز کا انتظام کیا اور رخصتی کر کے والد صاحب کے گھر بھیج دیا۔ اس کے بعد والد صاحب سے ملے اور فرمایا کہ میری نشست گاہ پر آیا کرو۔ چنانچہ والد صاحب روزانہ عصر کے بعد جایا کرتے اور حضرت فشتالی روزانہ ان کو دو موزونہ دیا کرتے تھے۔

جب کہ اس ملک کا تقریبی سیکڑا سچا وقت تھا (فارحہ کو ترکہ پیری سے علاقہ زواغہ میں کچھ اراضی ملی تھی جو کثیر الزراعت تھی ایک دن حضرت فشتالی نے میرے والد سے فرمایا کہ مسعود تمہاری بیوی ماشاء اللہ بڑی نیک اور سمجدار ہے۔ وہ زونہ کے تمامی دیہات فروخت کرنے کے متعلق تم کو وکیل بنا دے گی اس لئے جاؤ اور سب کو فروخت کر آؤ۔

چنانچہ والد صاحب نے گھر میں اکڑ کر کیا اور والدہ نے ان کو خوشی وکیل بنا دیا۔ میری والدہ کے ایک باپ شامل علاقہ بہن تھی۔ والد صاحب ان کے پاس بھی گئے اور خواہش کی کہ وہ بھی وکیل بنا کر اختیار دیدیں تو اس علاقہ کی ساری جائداد فروخت کر آویں۔ مگر انہوں نے منظور نہ کیا اس لئے والد صاحب صرف میری والدہ کا حصہ فروخت کر آئے۔ اور میری علاقہ خالہ اپنے حصہ کے محاصل وصول کرتی رہیں۔ تین ٹہہ سال گزرے تھے کہ زونہ فرقہ کا خروج ہوا اور اس نے زواغہ کے تمام علاقہ پر غاصبانہ قبضہ کر لیا کہ اسی میں میری حوالہ کی بھی تمام اراضی چلی گئی۔ اور اس دن سے ان کو ایک جتنہ بھی وہاں سے نہ ملا۔ اس وقت علم ہوا کہ یہ حضرت فشتالی کا کشف تھا۔ غرض حضرت فشتالی میرے والد صاحب کے ساتھ تازلیت محبت کا برتاؤ فرماتے اور قسم قسم کے کھانے لاتے اور کھلاتے رہے۔ حتیٰ کہ میں نے خود اپنی والدہ محترمہ سے سنا کہ فرمایا کرتی تھیں "ماموں صاحب کی وفات کے بعد ہم نے طنجیہ ہی نہیں کھایا (کوئی خاص قسم کا طعام ہے) ماموں صاحب روزانہ ہمارے لئے تیار کر دیتے اور جب سب لوگ نماز عشاء پڑھ کر ان کی مسجد سے چلے جاتے تو ماموں صاحب ہمارے دروازے پر آکر دستک دیتے اور جب ہم کو اڑکھولتے تو طنجیہ میرے ہاتھ میں دے کر چلے جاتے تھے۔ مرتے دم تک ان کا یہ معمول قائم رہا۔

وہی یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ فارحہ تمہارے ایک لڑکا ہو گا جن کا نام عبدالعزیز ہو گا اور ولایت میں ان کی بڑی شان ہو گی۔ والدہ محترمہ نے یہ بھی سنایا کہ ماموں صاحب نے ایک مرتبہ فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ مجھ سے فرما رہے ہیں تمہاری بھانجی کو ایک بڑا دلی کامل عطا ہو گا۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ پر اللہ کا صلہ و سلام اس کے باپ کا کیا نام ہے۔ فرمایا مسعود و باغ۔



یہی بڑی وجہ تھی کہ حضرت فشتالی نے میرے والد کو نکاح کے لئے انتخاب کیا اور ان کے ساتھ بہت محبت رکھتے تھے۔ ان کی تمنا تھی کہ کاش حضرت عبدالعزیز کی ولادت کا وقت پائیں مگر ۹۹ سالہ میں عام دیا پھیل چکی تھی اس میں ان کا انتقال ہو گیا۔ جب وقت وفات قریب آیا تو انہوں نے والد صاحب کو بلوایا اور جب وہ آئے تو پوچھا تمہاری بیوی کہاں ہے، چنانچہ والدہ بھی آئیں اور حضرت فشتالی نے ایک ٹوپی اور ایک پاپوش سیاہ رنگ کے اس وقت صلیا، یہی پہنا، اوڑھا کرتے تھے دونوں کے حوالے کر کے فرمایا کہ یہ اللہ کی امانت تمہارے سپرد کرتا ہوں جب عبدالعزیز تم کو عطا ہو تو اس کو دے دینا چنانچہ والدہ صاحبہ نے اسکو لیکر بحفاظت رکھ دیا۔ حتیٰ کہ پہلے حمل میں لڑکی پیدا ہوئی اور پھر کچھ مدت بعد دوسرے حمل میں میری ولادت ہوئی۔ جب میں بڑا ہوا اور میں نے ماہ رمضان کا روزہ رکھا تو حق تعالیٰ نے والدہ محترمہ کو امانت یاد دلائی اور وہ حیا کر اُسے لے آئیں اور فرمایا کہ بیٹا مولانا فشتالی نے یہ امانت تم کو پہنچانے کی مجھے وصیت فرمائی تھی اس کو لو اور مجھے سبکدوش کرو۔ چنانچہ میں نے لیکر ٹوپی کو سر پر رکھ لیا اور جوتے کو پاؤں میں پہن لیا۔ اس وقت مجھے ایسی شدید گرمی معلوم ہوئی کہ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اور اس وقت میں نے حضرت فشتالی کے اشارہ کا مطلب سمجھا فالحمد للہ سب الغالبین۔ سید احمد بن عبداللہ جن کی ولایت و معرفت کامل مشہور اور کشف و کرامات و بصیرت کا عوام و خواص کو اعتراف ہے حضرت فشتالی کے شاگرد تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ حضرت ممدوح اکابر اولیاء میں سے تھے۔ اپنے حالات کو چھپاتے بہت تھے کہ دیکھنے والا کسی طرح بھی ان کو دلی نہ سمجھتا تھا۔ اگر ان کی وفات نہ ہو چکی ہوتی تو میں بھی ان کا کوئی حال زبان سے نہ نکالتا۔

آپ ایک مرتبہ موضع سائس میں تھے کہ دفعۃً فرمانے لگے بڑا سانحہ پیش آیا۔ میں نے پوچھا کیا ہوا؟ فرمایا اس وقت سید محمد بن ناصر کا انتقال ہو گیا۔ میں نے کہا آپ کو کیسے معلوم ہوا۔ فرمایا میں انتقال ہو گیا اس کے بعد مجھ سے فرمایا دیکھو یہ شخص جو سامنے نظر آ رہا ہے ان کی خبر مرگ ہی لا رہا ہے۔ حالانکہ وہ شخص بہت دور تھا اور خیال سا نظر آ رہا تھا مگر جب قریب آیا تو ہم سب اس کے پاس آ جمع ہوئے اور پوچھا کیا خبر ہے؟ اس نے کہا سید محمد بن ناصر کا انتقال ہو گیا۔ ایک دن میں مسجد قرین میں بیٹھا ہوا تھا کہ حضرت فشتالی آئے اور فرمایا کہ عورت بہت مبارک ہے، میں نے کہا کون عورت۔ فرمایا وہی جس سے تم نکاح کرو گے۔ چونکہ اس وقت مجھے نکاح کا دوسرا بھی نہیں تھا اس لئے میں نے کہا کہ میرا ارادہ تو نکاح کا نہیں ہے۔ فرمایا نکاح تو ہو کر رہے گا۔ چنانچہ سات ہی دن گزرے تھے کہ میرے قلب میں نکاح کی حرکت پیدا ہوئی اور میں نے نکاح کیا۔

ایک دن حضرت ممدوح کچھ اولیاء کا تذکرہ فرمانے لگے تو میں نے بھی چند بزرگوں کا نام لیا۔ فرمایا میں تو تم سے اکابر اولیاء کا تذکرہ کر رہا ہوں۔ رہے چھوٹے درجہ کے اولیاء سو شہر فاس اور بنی بازغہ کے درسیان رجو کہ ایک منزل



پر ہے، قریب چار سو کی تعداد کے مجھے معلوم ہیں حضرت ممدوح باوجود اتنا صاحب کشف ہونے کے اپنے آپ کو یحید چھپاتے تھے۔ ایک دن طلبہ سے فرمانے لگے تم سمجھتے ہو گے کہ کشف کوئی کمال ہے حالانکہ ذکاوت اور سرعت فہم ہے۔ اور اگر تمہیں یقین نہ آوے تو دیکھو تم کو معلوم ہے کہ نہ میں ولی ہوں نہ بزرگ۔ سب نے کہا جی ہاں ہمیں خوب معلوم ہے کہ آپ ولی نہیں ہیں۔ اس کے بعد آپ نے ایک طالب علم کی طرف توجہ فرمائی اور کہا تمہارا ارادہ فلاں وقت و فلاں کام کرنے کا ہے۔ اُس نے کہا ہاں صحیح ہے فشتالی نے فرمایا اب تو تم نے سمجھ لیا کہ کشف محض ایک سرعت فہم ہے۔ سب کو یقین آ گیا کہ ہاں ٹھیک ہے۔ ایک روز میں مسجد قرویین میں گیا تو حضرت فشتالی کو دیکھا کہ چہرہ کارنگ زرد ہے اور نہایت بدحواس و سراسیمہ ہیں۔ مجھے دیکھ کر فرمانے لگے کہ اس وقت نہ تم سے بات کر سکتا ہوں نہ کسی دوسرے سے۔ میں نے پوچھا آخر سب کیا؟ فرمایا اس وقت میری زبان پر ابن فارض کے قصیدہ تائیدہ کا یہ شعر آیا ہے

فلو خطرت لی فی سواک ارادۃ : علی خاطری سمحوا قضیت بردتی

اگر تیرے سوا کسی کا خیال بھولے سے بھی میرے دل پر گزرے تو میں اپنے مرتد ہونے کا حکم لگاؤں۔ اور چونکہ میرے دل پر دوسرے کا تخیل آتا ہے اس لئے میں گیا گذرا ہو گیا۔ میں نے کہا یہ تو غلبہ حال تھا جو ابن فارض پر طاری ہوا تھا مگر جاتا رہا اور اس کو یقیناً قرار نہ ہوا تھا۔ پس اتنا کہنا تھا کہ ممدوح کو سکون ہو گیا اور فرمایا اللہ تم کو جزائے خیر بخشے تمہاری تقریر سے گھٹا پھٹ گئی اور بڑا بوجھ اتر گیا۔ جس زمانہ میں دیدان نے سلطان اسماعیل سے باغی ہو کر شہر فاس کا محاصرہ کیا اور رسد بند کر دی تو یاشندگان فاس کو سخت مصیبت کا سامنا ہوا۔ حضرت فشتالی اس زمانہ میں بار بار فرمایا کرتے کہ او میر ہو یا سویر سلطان اسماعیل کے بغیر چارہ نہیں۔ چنانچہ انجام یہی ہوا کہ باغیوں نے سلطان سے امان چاہی اور صلح کا پیام پہنچا کر بغاوت سے تائب ہوئے۔ حضرت ممدوح کے ہمسایہ پڑوسی کہا کرتے تھے کہ حضرت فشتالی رات کا اکثر حصہ نماز و تلاوت قرآن میں گزارا کرتے ہیں۔ اور شروع رات میں تو سکون کے ساتھ ان کی تلاوت سنائی دیتی ہے مگر آخر شب میں بجز تڑپنے اور زمین پر لوٹنے کے کوئی آواز نہیں آتی۔ شریعت محمدیہ کا ظاہری ادب بھی ممدوح میں حد کو پہنچا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ مسجد قرویین میں وہ اور میں دونو بیٹھے ہوئے دیر تک باتیں کرتے رہے حتیٰ کہ موزن نے اذان دی حضرت فشتالی اٹھتے اور مسجد سے باہر جا کر تھوڑی دیر بعد واپس آئے۔ میں نے کہا باہر کیوں تشریف لے گئے تھے۔ میری سمجھ میں تو کوئی بات ضرورت کی نہیں آئی جو آپ کو بیرون مسجد لے گئی۔ ممدوح چپ ہو گئے اور بات کو ٹالا مگر میں نے اصرار کیا کہ آخر کیا ضرورت پیش آئی تھی۔ فرمایا تم کو بڑی کمدید ہے۔ میں باہر اس لئے گیا تھا کہ چلنا خانہ حند کی طرف نماز کے لئے ہو جائے۔ کیونکہ پہلے قدم تو تمہارے پاس بیٹھنے کے لئے اٹھے تھے۔ ممدوح کے پڑوسیوں کا بیان ہے کہ



حضرت فشتالی جب اپنے گھر کے لئے گوشت خرید کرتے تو ہمسایوں کے لئے بھی ضرور خریدتے اور فرمایا کرتے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اکیلا گوشت کھاؤں اور میرے پڑوسی گوشت نہ کھائیں۔ ایک مرتبہ آپ خانقاہ میں بیٹھے ہوئے تھے جو مسجد کے قریب تھی جہاں اس وقت مسجد کا بڑا دروازہ ہے اس کی طرف نظر اٹھا کر فرمانے لگے یہاں ایک بڑا دروازہ کھلنے والا ہے، چنانچہ کچھ مدت کے بعد اسی جگہ دیوار میں دروازہ کھولا گیا اور وہ یہی دروازہ ہے جس میں آنے والے محل وضو پر پہنچتے ہیں۔ غرض مدوح کے کشف و کرامات اتنے کثیر ہیں کہ مستقل کتاب کی ضرورت ہے باقی آپ کی جلالت شان اور فخر و مہابت کے لئے تو صرف یہی رابطہ کافی ہے جو آپ کے اور غوث الزمان حضرت عبدالعزیز قدس سرہ کے درمیان قائم ہوا کہ اپنی تربیت دادہ بھانجی کو سید مسعود کی زوجیت میں دیا جن کے بطن سے اپنے وقت کا جلیل الشان غوث پیدا ہوا

## فصل دوم۔

سلوک کی تدریج اور ان مشائخ کا بیان جس نے آپ کو روحانی میراث ملی، نسب طاہر حضرت شیخ کا یہ ہے مولانا السید عبدالعزیز بن سید مسعود بن سید احمد بن سید محمد بن سید محمد بن سید عبد الرحمن بن سید قاسم بن سید محمد بن سید احمد بن سید قاسم بن سید محمد بن سید محمد بن سید عبد الرحمن بن سید عبد الرحمن بن سید عبد الرحمن بن سید قاسم بن سید قنوں بن سید علوش بن سید مندیل بن سید علی بن سید عبد الرحمن بن سید عیسیٰ بن سید احمد بن سید محمد بن سید عیسیٰ بن سید ادیس بن سید عبد اللہ کامل بن سید حسن بن سیدنا مولانا حسن اسبط بن سیدنا مولانا علی رضی اللہ عنہم اجمعین۔

حضرت مدوح نے فرمایا کہ جس وقت سے میں نے اس امانت کو جس کی میرے لئے حضرت فشتالی نے وصیت فرمائی تھی بدن پر پہنا اور جو انہوں نے میرے متعلق فرمایا تھا اس کو سمجھا اسی وقت حق تعالیٰ نے میرے دل میں اپنی عبودیت خالصہ کا شوق و انتظار ڈال دیا اور میں اس کی حد درجہ کُرید اور تلاش میں لگ گیا کہ جس کو بھی سُناتا لوگ اس کو پیر نہاتے اور ولی بتاتے ہیں اس کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ورد و ذکر تلقین فرمانے کی درخواست کیا کرتا تھا۔ مگر جب ان کے بتائے ہوئے اوراد و اذکار کو پابندی سے چند روز کرتا مجھے تنگدلی پیش آتی اور انشراح و انبساط نہ ہوتا۔ آخر اس کو چھوڑ کر دوسرے کے پاس جاتا اور جب وہاں بھی یہی صلیق پیش آتی تو تیسرے کی خدمت میں حاضر ہوتا، اسی سرگردانی میں ستر سالہ سے لے کر اسی سالہ تک کامل بارہ برس گزر گئے۔ میری عادت تھی کہ میں جمعہ کی رات سید علی بن حرز ہم کے مزار پر گزرا کرتا تھا۔ رات بھر وہیں رہتا اور دوسرے شب بیدار صلیح کے ساتھ قصیدہ بردہ پڑھا کرتا تھا۔ حسبِ عادت ایک شب جمعہ میں جب ہم لوگ ختم سے فارغ ہوئے تو میں روضہ سے باہر نکلا اور دروازہ کے قریب بیری کا درخت تھا اس کے نیچے میں نے ایک شخص کو بیٹھا پایا۔ وہ مجھ سے باتیں کرے اور جو باتیں میرے دل میں تھیں ان کو ظاہر فرمانے لگے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ شخص اولیاء عارفین میں سے ہے اور میں نے عرض کیا کہ مجھے خادمیت میں قبول فرمائیے



اور ذکر و ورد کی تلقین کیجئے۔ انہوں نے بات طے کر دوسری باتوں میں مجھے لگانا شروع کیا مگر میں بار بار وہی سوال کرتا رہا ان کا مقصود میری طلب صادق کا جانچنا تھا کہ ان کی تلقین پر موافقت کروں گا یا نہیں۔ ان کے تغافل اور میرے اصرار و الحاح کو دیر گز گئی حتیٰ کہ صبح نمودار ہو گئی اس وقت انہوں نے فرمایا کہ جب تک عہد و پیمان نہ دو گے کہ کبھی ترک نہ کروں گا اس وقت تک کوئی وظیفہ نہ بتاؤں گا۔ چنانچہ میں نے اللہ کا عہد و پیمان و میثاق دیا کہ پوری پابندی کروں گا اور کبھی نہ چھوڑوں گا میرا خیال یہ تھا کہ ایسا ہی کوئی وظیفہ بتائیں گے جیسا ان سے پہلے دوسرے بتا چکے ہیں مگر انہوں نے وظیفہ بتایا تو یہ کہ روزانہ سات ہزار مرتبہ پڑھا کرو۔

اللہ بجاہ سیدنا محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجمع بینی و بین سیدنا محمد بن عبد اللہ فی الدنیا قبل الاخرۃ۔ الہی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جاہ کا واسطہ مجھے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لقاء آخرت سے پہلے دنیا ہی میں نصیب فرما۔ اس کے بعد ہم اٹھتے ہی تھے کہ ناظم روضہ حضرت عمر بن محمد ہواری آگئے۔ ان کو خطاب کر کے انہوں نے فرمایا یہی ہے وہ شخص اور پھر فرمایا کہ میں اس کے ساتھ حسن سلوک کی تم کو تاکید کرتا ہوں۔ سید عمر نے جواب دیا کہ حضور یہ میرے سر کے تاج ہیں سید عمر نے اپنی وفات کے وقت مجھ سے پوچھا تھا میں معلوم بھی کیا کہ میری کے درخت کے نیچے تم کو ذکر کس نے تلقین کیا تھا۔ میں نے کہا مجھے معلوم نہیں۔ فرمایا وہ حضرت خضر علیہ السلام تھے۔ اور جب حق تعالیٰ نے مجھے بصیرت بخشی تو خود بھی اس کا علم ہو گیا۔ غرض میں نے وظیفہ شروع کیا۔ مگر پہلے دن تو رات ہو گئی اور تمام نہ ہو سکا۔ لیکن اس کے بعد کچھ کچھ ہلکا پڑتا رہا اور میری فات اس کی مصاحب بنتی رہی حتیٰ کہ زوال تک پورا کر لیتا تھا۔ پھر ہلکے ہونے میں ترقی ہوتی رہی حتیٰ کہ اشراق کے وقت پورا ہونے لگا پھر ثقل میں اور کمی ہوئی حتیٰ کہ طلوع آفتاب تک پورا پڑھ لیا کرتا تھا۔ اس زمانہ میں، میں حضرت عمر بن محمد ہواری کے پاس بیٹھا اٹھتا رہا اور وہ بھی میرے ساتھ خاص محبت فرماتے رہے حتیٰ کہ ۲۵ سالہ میں ان کی وفات ہو گئی۔ بوقت وفات میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ فرمانے لگے جانتے بھی ہو میرے پر کون تھے۔ میں نے کہا مجھے تو معلوم نہیں فرمایا سید فشتالی قدس سرہ۔ اور یہ بات دنیا سے رخصت ہوتے وقت ہی بتائی اس سے پہلے کبھی ذکر نہ فرمایا۔ سو الحمد للہ حضرت فشتالی قدس سرہ کے تمامی اسرار و کیفیات بواسطہ سید عمر مجھے حاصل ہوئیں اور اس کا مشاہدہ مجھے نور بصیرت نصیب ہونے کے بعد ہوا۔ حالانکہ سید عمر بھی حضرت فشتالی کے تمام اسرار کے حامل نہ تھے بلکہ چند ہی کے حامل تھے۔ مگر مجھے حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ان کے تمامی اسرار عطا فرما دیئے بلکہ ان سے بھی زیادہ اور اتنے زیادہ کہ میں اپنے مولیٰ کریم کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔

ایک دن فرمایا کہ حضرت فشتالی عارف باللہ اور اپنی زندگی میں دیوان الصالحین (وہ مجلس جس میں اقطاب عالم و اغواث کا روزانہ اجتماع ہوا کرتا ہے) کے حاضر ہونے والوں میں تھے۔ میں نے عرض کیا اور بعد وفات؟ فرمایا نہیں۔



اور ایسا ہی سیدنا منصورؑ کی بابت فرمایا کہ وہ اقطاب میں سے تھے اور صرف بحالت حیات اہل دیوان میں سے تھے انتقال کے بعد اس مجلس میں حاضر نہیں ہوتے۔ اور اس کا ایک خاص سبب بیان فرمایا جو اثناء کتاب میں انشاء اللہ آئے گا۔ نیز حضرت نے فرمایا کہ سید عمر کی وفات کے تین دن بعد مجھے فتح عطا ہوئی۔ (یعنی مشاہدہ مخلوقات و مشاہدہ حلال و حلال الہی کی قابلیت جو اقطاب و اغواث اور کمل اولیا کو دی جاتی ہے۔ اور آئندہ ہم اس کو فتح ہی سے تعبیر کریں گے جس کا حقیقی مفہوم مطالعہ کتاب بالخصوص انا فتحنا لک فتحا مبینا کی تفسیر کے ضمن میں سمجھا جا سکے گا) اور ہم نے حقیقت نفس سے اللہ کو پہچانا فلہ الحمد ولہ الشکر اور یہ بخشبہ کا دن تھا ۸ رجب ۱۲۵ھ صورت یہ ہوئی کہ میں اپنے گھر سے نکلا اور حق تعالیٰ نے ایک صاحب خیر کے ہاتھ سے مجھے چار موزونہ دلائل چنانچہ میں نے مچھلی خریدی اور اس کو بیکر گھر آیا میری بیوی نے کہا کہ علی ابن حزم تک جا کر روشن زمینوں میں اور لا دو کہ مچھلی مچھون اور پکالیں میں باہر نکلا اور باب الفتوح تک ہی پہنچا تھا کہ بدن میں ریشہ سا پیدا ہوا اور بڑے زور کی کپکپی طاری ہوئی۔ اس کے بعد سارے گوشت کے اندر بکثرت چوہنٹیاں سی چلتی محسوس ہوئیں۔ مگر میں آگے قدم بڑھاتا رہا۔ یہ حالت افزوں ہوتی رہی حتیٰ کہ سید یحییٰ بن علال کے مزار تک پہنچا تو میرا سینہ اتنا لرزنا لگا کہ چنبر گردن میری ڈاڑھی سے ٹکراتا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ بے شک موت آگئی۔ اس کے بعد دھوئیں کی طرح ایک چیز میرے بدن سے نکلی اور میری ذات رحیم کا اطلاق روح کے مقابلہ میں جسم کے ظاہری و باطنی مجموعہ پر ہوتا ہے) طویل ہونے لگی حتیٰ کہ بہت ہی زیادہ لمبی ہو گئی۔ اس کے بعد دنیا کی چیزیں منکشف ہو کر میری نظروں کے سامنے آنے لگیں کہ تمامی شہر اور قصبے اور دیہات اور جو کچھ بھی بزرگ زمین پر ہے سب کو میں نے دیکھا اور میں نے نصرانیہ کو دیکھا کہ اپنے بچے کو گود میں لئے دودھ پلا رہی ہے۔ (شاید آئندہ کے غلبہ نصرانیت و حکومت نصاریٰ کا مشاہدہ ہوا ہو) اور تمامی سمندر مجھے نظر آئے۔ ساتوں زمینوں کو اور جو کچھ بھی ان میں چرند پرند کی مخلوقات آباد ہے سب کو میں نے دیکھا۔ آسمان کو میں نے دیکھا کہ گویا میں اس کے اوپر ہوں اور جو کچھ بھی اس میں مخلوقات ہے اس کو دیکھ رہا ہوں۔ پھر دفعۃً ایک نور عظیم کو ندنے والی بجلی کی طرح ہر جانب سے آنے لگا۔ میرے اوپر سے بھی نیچے سے بھی داہنے سے بھی بائیں سے بھی اور آگے سے بھی پیچھے سے بھی اور مجھے شدید لرزہ چڑھ آیا کہ مجھے موت کا گمان ہوا اور میں اپنے منہ کے بل زمین پر لیٹ گیا۔ تاکہ اس روشنی کو نہ دیکھوں۔ مگر حیب لیٹ گیا تو وہ مجھے محسوس ہوا کہ میری ذات سبکی سبب آنکھ سنی ہوئی ہے کہ آنکھ بھی (باوجود بند ہونے کے) دیکھ رہی ہے اور سر بھی دیکھ رہا ہے اور پاؤں بھی دیکھ رہے ہیں غرض تمامی اعضا میں قوت باصرہ موجود ہے میں نے اپنے کپڑوں پر نظر ڈالی جن کو بدن پر پہنے ہوئے تھا تو دیکھا کہ وہ نظروں کو روک نہیں سکتے اور میری نگاہ اُن سے پار ہو کر ساری ذات میں دوڑتی ہے تب مجھے یقین ہو گیا



کہ اوندھا پڑنا اور کھڑا رہنا دونوں برابر ہیں۔ تھوڑی دیر تک یہ حالت رہی مگر پھر جاتی رہی اور میں اپنی پہلی حالت پر آگیا۔ اس وقت میں گھر واپس آیا اور زیت کے بازار تک نہ پہنچ سکا کہ مجھے اپنی جان کا خطرہ ہوا اور میں رونے لگا۔ اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے پھر وہی حالت طاری ہوئی۔ اور پھر جاتی رہی۔ غرض اس کا تار بندھ گیا کہ ایک ساعت کے لئے عود کرتی اور دوسری ساعت منقطع رہتی یہاں تک کہ میری ذات کی مصاحب بن گئی اور دن بھر میں صرف تھوڑی دیر کے لئے اور رات میں تھوڑی دیر کے لئے منقطع ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد دہائی ہو گئی کہ کسی وقت بھی غائب نہ ہوتی تھی۔ اور اللہ کریم نے مجھ پر بڑا رحم فرمایا کہ اپنے اولیاء میں ایک عارف سے مجھے ملا دیا جس کی صورت یہ ہوئی کہ فتح کے اگلے روز صبح ہوئی تو میں مولانا ادیس کے مزار پر حاضری کے لئے چلا۔ محلہ سماط العدول میں مولانا سید حاج احمد جرنیدی مجھے مل گئے۔ میں نے وہ واقعہ جو مجھے پیش آیا تھا اُن سے ذکر کیا۔ انہوں نے کہا کہ اچھا میرے گھر چلو چنانچہ میں ان کے ساتھ ہولیا۔ اُن کا مکان غسالین کے متصل ستایا کے قریب محلہ صفاریں میں تھا۔ وہ مجھے گھر کے اندر لے گئے اور خلوت خانہ میں بیٹھ کر کہا اب سناؤ کیا دیکھا تھا۔ میں نے سارا واقعہ پھر دوہرایا مگر اُن پر جو میری نظر پڑی تو دیکھا وہ رو رہے ہیں واقعہ سنکر فرمایا لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ۔ یہ چار صدیاں گزریں کہ ایسا واقعہ بیان کرنے والا ہم نے کوئی سنا بھی نہیں۔ اس کے بعد مجھے بہت سارو پیہ دیا اور ایک مرتبہ فرمایا کہ پانچ اشرفیاں دیں۔ اور کہا کہ ان کو اپنی ضروریات میں خرچ کرو اور جب ختم ہو جائیں تو دوسرے پاس نہ جانا میرے ہی پاس آنا کہ جو ضرورت ہوگی میں تم کو دوں گا اور میں تم سے بتا کیسے کہتا ہوں کہ سید عبداللہ تادوی کے پاس ضرور جانا انشاء اللہ خیر نصیب ہوگی۔ غرض میں اُن سے رخصت ہوا اور اُس دن کے بعد مجھے سید احمد جرنیدی کی ملاقات نصیب نہ ہوئی۔ کیونکہ ان کو دفعۃً مرض الموت لاحق ہوا اور وہ انتقال کر گئے۔ مگر میں نے ان کی وصیت پر عمل کیا اور سید عبداللہ تادوی کی جانب چلا۔ باب البحر پر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دروازہ سے باہر ایک سیاہ قام شخص اُس بڑے پتھر کے پاس کھڑا ہے جس کے قریب مجدی بیٹھا کرتے تھے۔ اُس نے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالی میں متفکر ہو کر سوچنے لگا کہ آخر اس شخص کا ارادہ کیا ہے۔ جب قریب پہنچا تو انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور سلام کیا جس کا میں نے جواب دیا۔ پھر کہنے لگے میں چاہتا ہوں کہ جامع مسجد تک میرے ساتھ چلو وہاں بیٹھ کر ذرا دیر باتیں کریں۔ میں نے کہا بہت اچھا۔ چنانچہ قریب ہی جامع مسجد تھی وہاں جا بیٹھے اور وہ کہنے لگے کہ میں فلاں فلاں امر سے پریشان ہوں اور میں نے ایسا ایسا واقعہ دیکھا ہے اور مجھے یہ یہ پیش آیا ہے۔ یعنی تمامی واقعات جو مجھے پیش آئے تھے وہ سب از خود بیان فرمادیئے۔ ان کی اس گفتگو سے واللہ میرا سارا بوجھ اتر گیا اور میں سمجھ گیا کہ یہ شخص اولیاء کاملین سے ہے۔ خود ہی انہوں نے بتایا کہ سید انام عبداللہ برنادوی ہے اور میں برنو کا باشندہ ہوں۔



اور یہاں شہر ناس میں صرف تمہاری غرض سے آیا ہوں مجھے بڑی خوشی ہوئی اور اس وقت میں نے مولانا سید احمد جرنیدی کے کلام کی برکت کو سمجھا کہ مرحوم بڑے اہل خیر و صلاح تھے۔ غرض سید عبداللہ برناوی میرے ساتھ رہے کہ میری رہبری فرماتے تھے کچی و بدراہی سے بچاتے قلب کو قوت پہنچاتے، اور میرے دل سے وہ خوف مٹاتے رہتے تھے جو بقیہ رجب اور تمام شعبان و شوال و ذی قعدہ اور عشر ذی الحجہ تک پانچ مہینے کے مشاہدات میں مجھے پیش آتے رہے حتیٰ کہ عید الاضحیٰ کا تیسرا دن آیا تو مجھے سید الوجود صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت نصیب ہوئی۔ اس وقت عبداللہ برناوی نے فرمایا کہ اے عبدالغفریز آج سے پہلے تو مجھے تمہارے متعلق اندیشہ تھا مگر آج چونکہ حق تعالیٰ شانہ نے تم کو اپنی رحمت کاملہ یعنی وجود باری و سید الوجود صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا دیا اس لئے میرا دل مطمئن ہو گیا اور اب تم کو اللہ کی امان میں دے کر رخصت ہوتا ہوں چنانچہ مجھے چھوڑ کر وہ اپنے وطن چلے گئے درحقیقت ان کا میرے ساتھ رہنا اس غرض سے تھا کہ جو مشاہدات مجھے پیش آرہے تھے ان میں بطلت کا دخل ہونے سے مجھے بچائے رکھیں حتیٰ کہ مشاہدہ محمدیہ نصیب ہو جائے کیونکہ صاحب فتح پراس کے بعد کوئی اندیشہ نہیں رہتا۔ جو کچھ اندیشہ و خطرات ہوتے ہیں وہ اس مشاہدہ سے پہلے ہی پہلے ہوتے ہیں حضرت عبداللہ برناوی کے ساتھ مجھے بہت قصے پیش آئے جن میں عجیب ترین یہ ہے کہ ایک دن انہوں نے عورت کی صورت میں آکر مجھے بہت کچھ پھسلا یا اور بار بار اصرار سے اپنی طرف مائل کیا۔ صورت یہ ہوئی کہ محلہ جزائریں عامر میں کھڑا تھا کہ ایک عورت چادر اوڑھے منہ پر نقاب ڈالے خوشبو میں مہکی ہوئی صاف ستھری نہایت حسینہ و جمیلہ میرے پاس آئی اور کہنے لگی اے میرے سردار ذرا تنہائی میں آپ سے باتیں کرنے کو میرا دل چاہتا ہے۔ یہ سنکر میں بے تحاشا بھاگا اور جب آدمیوں کے مجمع میں پہنچ گیا تو ٹھہر گیا اور سمجھا کہ اب جان بچ گئی مگر صیغہ میں پہنچا تھا کہ دیکھتا کیا ہوں وہ میرے پاس کھڑی اور مجھے اپنی طرف پھسلا رہی ہے۔ میں پھر بھاگا اور شرائطین پہنچ کر دم لیا اور سمجھا کہ اب اس کی اُمید منقطع ہو چکی ہوگی۔ مگر دیکھتا کیا ہوں کہ وہ میرے پاس کھڑی پھسلا رہی ہے۔ میں پھر بھاگا اور شماعین پہنچا مگر دیکھتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ ہے اور پاس کھڑی ہوئی ہے میں پھر بھاگا اور مسجد قرویین کی شرقی جانب پہنچا اور سمجھا کہ بس اب نجات مل گئی۔ مگر دیکھا کہ وہ میرے پاس کھڑی ہے۔ میں پھر بھاگا حتیٰ کہ صفارین تک پہنچا اور سمجھا کہ بس اب بچ گیا۔ مگر دیکھتا ہوں کہ وہ پاس کھڑی ہے۔ میں پھر بھاگا اور اب دوبارہ شماعین تک پہنچا اور سمجھا کہ بس اب چھٹکارا مل گیا۔ مگر دیکھتا ہوں کہ وہ پاس کھڑی پھسلا رہی ہے۔ میں پھر بھاگا حتیٰ کہ مسجد قرویین میں جا گھسٹا اور دل میں کہا کہ بس اب پچھپا چھٹ گیا مگر بڑے فانوس کے پاس پہنچا تو دیکھتا ہوں کہ وہ میرے پاس کھڑی ہے اس وقت مجھ پر غلبہ ہوا اور قریب تھا کہ میں غل مچاؤں اور لوگ آجھ ہوں کہ وہ عورت دفعۃً عبداللہ برناوی بن گیا۔ اور فرمایا کہ یہ کارنامہ تو میرا تھا۔ اور تم کو آزمانے



کے لئے کیا تھا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ سادات کا میلان طبع عورتوں کی طرف زیادہ ہے سو الحمد للہ تم کو ایسا ہی پایا جیسا میں چاہتا تھا اور بہت خوش ہوئے۔

حضرت برنادی کے بعض معارف اثناء کتاب میں ملاحظہ سے گزریں گے۔

جس زمانہ میں وہ اپنے وطن واپس ہو گئے تو میں نے اپنے حضرت سید عبدالعزیز سے بارہا سنا کہ آج میں حضرت عبداللہ برنادی کے ساتھ تھا، اور انہوں نے مجھ سے یہ فرمایا، اور میں نے اُن سے یہ کہہ حالانکہ یہ زمانہ وہ تھا کہ میں قریب قریب ہر وقت آقا عبدالعزیز کے پاس رہتا اور بہت ہی کم اُن سے الگ ہوتا تھا۔ مگر جب بارہا یہ سنا تو میں نے کہا حضرت کیا مولانا برنادی اپنے ملک کو واپس نہیں گئے؟

فرمایا اللہ والوں کے وطن کتنے ہی دور کیوں نہ ہوں مگر وہ ایک دوسرے سے دور نہیں ہوتے۔ حتیٰ کہ ایک اللہ والا جو مشرق میں ہو وہ دوسرے اللہ والے سے جو سوڈان یا بصرہ وغیرہ میں ہو باتیں کر لیتا، اور ایسی طرح باتیں کرتا ہے جیسے اپنے پاس بیٹھے ہوئے آدمی سے باتیں کیا کرتا ہے، اور جب کوئی تیسرا اللہ والا ان دونوں سے باتیں کرنا چاہتا ہے تو وہ بھی کر لیتا ہے اور اسی طرح چوتھا بھی، حتیٰ کہ تم دیکھو گے اللہ والوں کی ایک جماعت متفرق ہے کہ کوئی کسی ملک میں ہے اور کوئی کسی قطر میں مگر وہ آپس میں اس طرح باتیں کرتے ہیں جیسے ایک مجمع کے مجتہدین آپس میں باتیں کیا کرتے ہیں۔ حضرت برنادی کی ۱۲۶ھ میں وفات ہوئی اور حضرت نے فرمایا کہ ان کے تمامی اسرار کا میں ہی وارث ہوا۔ خالص حمد للہ۔

نیز فرمایا کہ مجھے اُن بزرگوں کے جن کی مجھے ملاقات نصیب ہوئی حضرت منصور ہیں کہ قطب وقت تھے اور میرا اُن سے ملنا سورج گرہن سے ایک ماہ قبل ہوا تھا۔ ملنے کی صورت یہ ہوئی کہ حضرت منصور سوت بٹنے اور بٹنے کا کام کیا کرتے تھے۔ میں اپنے بھائی علّال کو لے کر اس نہایت سے چلا کہ دیکھوں شاید کوئی بٹنے کا کام اُن کو سیکھا دے۔ نقش و نگار کی جہاں بناوٹ ہوتی تھی میں وہاں پہنچا، اور کام دیکھنے لگا ایک شخص مجھ سے ملا اور میں نے اس سے بات چیت کر لی فارغ ہو کر جب واپس ہونے لگا تو ایک شخص نے مجھے آواز دی جس سے میں بالکل واقف نہ تھا۔ اور کہا کہ میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں میں اس کے پاس آیا تو اس نے پوچھا آپ کون ہیں؟ میں نے کہا شریف (یعنی سید) کہا ماشاء اللہ اخبار اطہار، ابراہیم پوچھا آپ کا نام کیا ہے؟ میں نے کہا عبدالعزیز۔ کہا کتنا پیارا و بزرگ نام ہے۔ پھر پوچھا کیا آپ کے ماں باپ حیات ہیں؟ میں نے کہا نہیں دونوں کا انتقال ہو چکا۔ کہنے لگے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کی بیوی بچے ہیں؟ میں نے کہا ہاں کہتے لگے کچھ روپیہ پیسہ بھی پاس ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ کہا لیتے جاؤ۔ میں نے دیکھا تو تیس موزونہ تھے۔ بس یہ سب ہوا ان سے تعارف کا اور پھر ان کے ساتھ میرے عجیب عجیب واقعات پیش آئے۔ جن میں چند کا



تذکرہ اس کتاب میں انشاء اللہ آئے گا۔ غرض اللہ و رسولؐ کی محبت میں میرا ان کا ساتھ رہا حتیٰ کہ ۱۲۹ھ میں ان کی وفات ہو گئی۔ سورج گرہن ۲۹ محرم ۱۱۸ھ میں ہوا تھا لہذا قریب بارہ سال کے معیت رہی۔ میں نے حضرت ممدوح سے پوچھا کہ دونوں میں بڑا کون تھا؟ سید عبداللہ برناوی یا حضرت منصور؟ فرمایا حضرت عبداللہ برناوی بڑے تھے اگرچہ دونوں قطب تھے۔ نیز فرمایا کہ جب حضرت منصور کا انتقال ہوا تو ان کے اسرار کا بھی میں ہی وارث ہوا فالحمد للہ۔

حضرت ممدوح نے فرمایا کہ بمنجملہ اُن مشائخ کے جن کی لقاء و معیت مجھے نصیب ہوئی حضرت محمد لہوآج ہیں جن کا وطن تطاون کے قریب تھا جیسا کہ حضرت منصورؒ کا وطن شہر فحوص میں جبل حصب تھا۔ اور اُن سے ملنے کی یہ صورت ہوئی کہ جب میرے والد بزرگوار کا انتقال ہو گیا تو میرے چچا مجھ کو اور میرے بھائی کو نقش و نگار کی بناوٹ سکھانے کے خیال سے کارخانے میں لے گئے۔ کارخانہ کا ایک کاریگر حضرت محمد لہوآج کا رشتہ دار تھا۔ اور حضرت ممدوح اس تعلق سے کارخانہ میں آیا کرتے تھے۔ مگر مقصود مجھ سے ملنا ہوتا تھا کہ جب آتے تو میرے پاس بیٹھتے اور باتیں کیا کرتے تھے۔ اس طرح پرہم دونوں میں اچھا خاصہ تعارف ہو گیا۔ اور یہ میرا اُن سے ملنا حضرت منصور سے پہلے ہوا تھا یعنی ۱۲۰ھ میں مگر اُن کی وفات حضرت منصور کے چند روز بعد ہوئی اور اُن کی وفات پر اُن کی باطنی میراث بھی مجھ ہی کو ملی۔ ان کی معیت میں بھی مجھے بہت کچھ واقعات پیش آئے جن میں بعض کا تذکرہ اسی کتاب میں انشاء اللہ آئے گا۔ الحاصل وہ مشائخ جس نے بطریق معروف استفادہ روحانی حاصل ہوا یہ پانچ حضرات ہیں۔ اول سیدنا خضر علیہ السلام دوم سید عمر بن محمد ہواری خادم روضہ علی بن حرز ہم بوصیتہ خضر یہ سوم عبداللہ برناوی۔ چہارم منصور بن احمد اور پنجم محمد لہوآج رحمۃ اللہ علیہم اجمعین مگر آگے کتاب میں معلوم ہوگا کہ حضرت ممدوح کو ان کے علاوہ دیگر اولیاء کاملین کی بھی لقاء و صحبت نصیب ہوئی اور حضرت ممدوح ان کے اسرار باطنیہ کے وارث ہوئے۔ بمنجملہ ان کے غوث وقت حضرت احمد بن عبداللہ مصری ہیں۔ چنانچہ میں نے حضرت ممدوح کو یہ فرماتے سنا کہ جس دن میں دیوان صالحین و مجلس اقطاب و اغواث، میں داخل ہوا ہوں تو تمام دن احمد بن عبداللہ نے اور اسی طرح دیگر اہل دیوان نے بجز اس کے کوئی بات ہی نہ کی کہ مجھے کتمانِ سر کی تاکید فرماتے رہے۔ حتیٰ کہ حضرت احمد بن عبداللہ نے تمامی اہل دیوان کو حکم فرمایا کہ اس بارہ میں ایک ایک واقعہ مجھے سنائیں چنانچہ ان حضرات نے تقریباً دو سو واقعات مجھے سنائی۔ ان آٹھ واقعات میں نے حضرت ممدوح سے سنے تھے لہذا چند درج کتاب کرتا ہوں۔

پہلا قصہ :- خاص حضرت احمد بن عبداللہ غوث کا ہے کہ فرمایا۔ میرا ایک مرید تھا اور مجھے اس کے ساتھ بڑی محبت تھی۔ ایک دن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان اس کو سننے لگا کہ بیٹے اگر سیدنا محمد



صلی اللہ علیہ وسلم کا نور نہ ہوتا تو زمین کے اسرار میں ایک ستر بھی ظاہر نہ ہوتا۔ وہ نور معظم نہ ہوتا تو نہ کوئی چشمہ اُبتلا نہ کوئی نہر بہتی۔ عزیز من آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نور مبارک ماہ مارچ (شروع موسم بہار) میں تین مرتبہ تمامی بیجوں میں مہکتا ہے جس کی برکت سے ان میں پھول آتا ہے۔ بیٹیا اگر نور محمدی نہ ہوتا تو کوئی تخم بھی پھل نہ لاتا۔ صاحبزادہ ضعیف ترین ایمان والے کو بھی اپنا ایمان پہاڑ جیسا بلکہ اس سے بھی بڑا اور وزنی معلوم ہوتا ہے۔ اور ذاتِ انسانی لیسا اوقات ایمان کا یہ بوجھ اٹھانے سے عاجز ہو کر اس کے پھینکنے کا ارادہ کرتی اور عیاذ باللہ مرتد و آزاد بننا چاہتی ہے) کہ دفعۃً نور محمدی مہکتا ہے اور بار ایمان کے اٹھانے میں معین و مددگار بنتا ہے جس کی وجہ سے مومن کو ایمان شیریں اور پاکیزہ معلوم ہونے لگتا ہے (اور وہ ارتداد سے بچ جاتا ہے) عرضِ عظمت شانِ محمدی اور اُن حسنات و خیرات کا ذکر کرتے کرتے جو بطفیل نور محمدی دُنیا و فانیہا کو نصیب ہوئی ہیں، میں ذاتِ محمدی میں محو ہو گیا۔ مرید نے جب میری یہ حالت دیکھی تو کہا اے میرے آقا اسی نبی محترم کے جاہ کا واسطہ مجھے ستر عطا فرما دیجئے۔ میں نے باز رہنا بھی چاہا مگر جب بڑی ذات کے جاہ کا واسطہ نظر کے سامنے آیا تو میں نے ہمت سے کام لیا اور اس کو نور بصیرت دیدیا۔ مگر چند ہی روز گزرے تھے کہ لوگوں نے اُس پر کفر کی گواہیاں دیں اور اس کو قتل کرادیا۔ یہ شخص خود کا یدو اور علاقہ مصر میں ناحیہ کا باشندہ تھا۔ مجھ سے ستر الہی لے کر وطن چلا گیا، اس کے پاس لوگوں کا اجتماع ہونے لگا اور وہ اُن کی عقول سے بالا اسرارِ الہیہ ان کو سنانے لگا جس پر وہ بھڑکے اور شہادتیں جمع کر کے قتل کا حکم دلا دیا۔

دوسرا قصہ: ایک صاحب نے فرمایا کہ میرا ایک مرید تھا جس نے بارہ برس میری خدمت کی۔ اور مجھے بھی اس کے ساتھ بڑی محبت تھی حتیٰ کہ میرا ارادہ تھا کہ اپنی لڑکی اس کی زوجیت میں دے دوں۔ میں ہر ہفتہ میں تین دن کے لئے بستی چھوڑ کر کنارہ سمندر پر جا بیٹھا کرتا تھا۔ اتفاق سے اُسی زمانہ غیبت میں عید آگئی میرے چھ لڑکے تھے اور تین لڑکیاں اور ایک خدمت گار جب میں گھر آیا تو دیکھا کہ اس نے عید کے موقع پر سب کے لئے کپڑے بنوائے اور حسبِ مراتب جس کو جس چیز کی ضرورت تھی سب مہیا کر دی اس سے مجھے بڑی مسرت ہوئی جب وہ میرے سامنے آیا تو محبت و عقیدت سے ملا اور درخواست کی کہ ستر الہی اس کو عطا کر دوں جب اُس نے بار بار اصرار کیا تو بادلِ ناخواستہ میں نے اس کو ستر عطا کر دیا مگر چالیس دن سے زیادہ زندہ نہ رہا کیونکہ لوگوں نے اس کی زبان سے وہ اسرارِ الہیہ سُن کر جن کو عقولِ عامہ برداشت نہیں کر سکتیں شہادتیں فراہم کر دیں اور پچاسی کا حکم دلا دیا۔ (تیسرا قصہ) ایک صاحب نے فرمایا میرا ایک مرید تھا جس کی خدمت گزاری و سلیقہ شکاری کی وجہ سے مجھے اس کی ساتھ محبت ہو گئی تھی نیز وہ میرا ہم محلہ اور مہاسیہ بھی تھا۔ میری بیوی اکثر بیمار رہا کرتی تھی اور وہ مرید اپنی بیوی کو میرے گھر لے آیا کرتا تھا کہ جو کام میری بیوی نہ کر سکتی اس کو وہ انجام دیا کرتی تھی۔ عرضِ دونوں



میاں بیوی ہماری خدمت میں لگے رہتے تھے۔ اور اس وجہ سے مجھے اس کی محبت بہت زیادہ ہو گئی تھی۔

ایک دن میں ایک جگہ کھڑا ہوا تھا کہ اپنی چھوٹی سی سچی کو لے کر آیا جس کے ہاتھ میں قرآن مجید تھا۔ مجھے پتہ بھی نہ چلا دفعۃً کیا دیکھتا ہوں کہ سچی میرے پیروں میں پڑی ہے اور قرآن مجید اس کے ہاتھ میں ہے۔ میں نے گہرا کر اپنے پاؤں مٹائے اور پیچھے کو قدم سرکا کر کہا کہ اسے شخص آخر تو چاہتا کیا ہے؟ یہ واسطہ تو بہت ہی بڑا لایا۔ بولا میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مجھے سیر الہی عطا فرما دیجئے میں نے کہا عزیز من سیر الہی بڑی بھاری چیز ہے۔ تو اُسے برداشت نہ کر سکے گا کہ جسے حق تعالیٰ قوت بخشنے اس کے سوا کوئی اس کو نہیں اٹھا سکتا اور دو تہائی آدمی تو اس کے حامل کو ہتھو تھو ہی کرتے ہیں اور اسی میں اس کی تباہی و موت ہے۔ اس نے کہا کہ حضرت آپ عطا فرما دیجئے۔ میں اس کو برداشت کر لوں گا۔ غرض اس کی اور اس کی بیوی کی خدمتوں پر اور ان تعلقات و حقوق پر جو اس کے میرے ساتھ قائم تھے۔ نیز معصوم سچی اور کلام اللہ کا واسطہ لانے پر نظر کر کے میں نے ہاں کر لی اور اس کو سیر الہی دیدیا (اب شیخ عبدالعزیز فرماتے ہیں) اُس نے سیر الہی بغیر ذات کے لیا تھا اور جس کو بھی بغیر ذات کے سیر الہی ملا کرتا ہے وہ اس کو تباہ کر دیتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ ذات سے کیا مراد ہے؟ فرمایا کہ شیخ کی ذات اور ذات کے اسرار مگر یہ مرید کی طرف شیخ کی ذات کے بعد ہی منتقل ہوا کرتے ہیں، اور ولی ستر کے دینے کی طوافت رکھتا ہے مگر ذات کے دینے کی طاقت صرف حق تعالیٰ میں ہے۔ جیسے جلتے چراغ سے دوسرے کی بتی کو روشن کرنا تو کسی اور اختیار عبد کے ماتحت ہے مگر اس میں تیل ڈالنا بندہ کا اختیاری فعل نہیں۔ یہ اُسی وقت ہوتا ہے جبکہ چراغ کے جلنے کی مدت ختم ہو جائے اور اس کا تیل دوسرے چراغ میں جا کر یہ گل ہو جائے۔ اسی کو اسرار کا وارث ہونا کہتے ہیں جو شیخ کے انتقال پر کہ تربیت و افاضہ جسمانی کے ختم کا وقت ہے بصورت ترکہ اہلیت والے مرید کو ملتا ہے) الحاصل یہ شخص سیر الہی لے کر چلا اور تین ہی دن شیخ کی نظر سے اوجھل رہا تھا کہ شیخ کی شان میں کلمات ناشائستہ بکنے لگا۔ شیخ کو بھی کسی نے اطلاع کی آپ کا فداں مرید آپ کے متعلق یہ یہ کہتا ہے۔ شیخ نے تغافل برتا اور ٹال دیا مگر اُس پر بلا و آفت نازل ہوتی رہی۔ اسی تاریکی و ظلمت میں چند روز گزرے کہ ایک قافلہ آیا اور یہ اس کے ساتھ بحری سفر میں چلا گیا۔ وہاں جا کر قید ہوا اور پھر نصرانی بن گیا۔ والعیاذ باللہ۔ یہ بد نصیبی قبل از وقت سیر الہی میں جلد بازی کے سبب لاحق ہوئی کہ اسلام سے بھی محروم ہو گیا۔

(چوتھا قصہ) ایک صاحب نے فرمایا میں نے اور ایک اور شخص نے جو کہ میرا دینی بھائی تھا یہ طے کیا کہ وطن سے باہر نکلیں اور کسی ولی کو تلاش کریں جو ہمارا ہاتھ پکڑے اور سلوک کا راستہ طے کرائے۔ چنانچہ ہم سیاحت کرتے کرتے ایک شہر میں پہنچے اور وہاں ایک اللہ والا مل گیا۔ یہ بزرگ شریک کی دکان رکھتے تھے۔ پس ہم میں سے ایک نے تو آگ سلگانے کی خدمت اپنے ذمہ لے لی اور دوسرے نے تول کر سودا دینے کی



اور خود شیخ شریک لپکا یا کرتے تھے۔ مدت دراز تک ہم یہ خدمت انجام دیتے رہے حتیٰ کہ شیخ کا وقت آخر آگیا اور اُن غشی طاری ہوئی۔ اس وقت میرے دینی بھائی نے پاس آکر شیخ سے درخواست کی کہ مجھے ستر عطا فرمادیجئے شیخ نے فرمایا تم میں تو ابھی اس کی طاقت آئی نہیں۔ اُس نے اصرار کیا کہ نہیں حضرت مجھے تو عطا ہی فرمادیجئے شیخ نے میری طرف دیکھا اور فرمایا کیوں جی تم اشیاء کرتے ہو کہ اس عطا کے لائق تو تم ہو لیکن اگر اس کو دیدیا جائے تو تمہیں ملال یا حتیٰ تلفی کا خیال تو نہ ہوگا) میں نے کہا اگر حضرت کی رائے یہی ہے تو میری طرف سے بخوشی اجازت ہے۔ فرمایا ہاں چشم پوشی کرو۔ اللہ تمہیں اس کا عوض اپنے پاس سے عطا فرمائے گا چنانچہ میں راضی ہو گیا اور اور میرے بھائی نے ستر لے لیا۔ دو روز کے بعد شیخ کی وفات ہو گئی اور میرا بھائی اپنے وطن واپس چلا گیا میں بدستور شیخ کی دکان پر کام انجام دیتا رہا کہ جو کچھ کماتا وہ شیخ کے گھر والوں پر خرچ کر دیتا شیخ کے ایک بیوی تھی اور تین لڑکیاں اور ایک لڑکا غرض کامل بارہ برس تک میں دکان کو سنبھالے اور اولاد شیخ کی خدمت کرتا رہا حتیٰ کہ صاحبزادیوں کے بیاہ ہو گئے اور سب اپنے اپنے گھروں کی ہو گئیں۔ صاحبزادہ صاحب بجانب مغرب سفر کر گئے اور پیرانی صاحبہ نے دیور کے ساتھ اپنا نکاح کر لیا۔ اب کوئی نہ رہا جس کی خاطر یہاں رہوں اس لئے میں نے بھی وطن کا عزم کر لیا جو کچھ پونجی تھی اس کو میں نے بیچ دیا اور سامان سفر مہیا کیا۔ اب صرف اتنا کام رہ گیا کہ شیخ کے مزار پر حاضر ہو کر آخری زیارت کر لوں اور روانہ ہو جاؤں۔ مزار آبادی سے بہت دور اور خوفناک جگہ میں تھا۔ چنانچہ میں پہنچا اور جب زیارت کر کے واپس ہونے لگا تو میرے دل نے کہا کہ ہائے اب تو جا رہا ہے اور پھر شیخ کی زیارت کبھی نہ ہو سکے گی۔ اس پر مجھے وحشت طاری ہوئی اور شیخ کی محبت نے میرا دل اور دامن پکڑ لیا۔ چنانچہ میں واپس ہوا اور گھنٹہ بھر وہاں بیٹھا، اس کے بعد پھر چلنے لگا تو دوبارہ پھر وہی وحشت طاری ہوئی اور میں واپس ہوا حتیٰ کہ زوال تک بیٹھا۔ آخر پھر چلنے کا ارادہ کیا اور پھر مجھے اسی قلق و وحشت نے پکڑا غرض اسی حال میں کہ بار بار اٹھ کر چلتا اور شیخ کی جدائی کے قلق سے روتا ہوا واپس آتا تھا رات ہو گئی اور میں بیٹھ گیا۔ جوں جوں رات گذرتی رہی میری بے چینی اور شیخ کی محبت میں ترقی ہو کر گریہ و زاری برہستی رہی حتیٰ کہ پو پھٹی اور صبح نمودار ہو گئی۔ اس وقت سیدنا حضرت علیہ السلام تشریف لئے اور مجھے ذکر تلقین فرمایا اور حق تعالیٰ نے فتح نصیب فرمائی کہ چشم بصیرت کھل گئی اور باب مشاہدہ وا ہو گیا) اس طرح با مراد ہو کر میں وطن روانہ ہوا۔ راستہ میں میرے دینی بھائی کا وطن پڑتا تھا۔ جب میں اس شہر میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ایک انسان کو جلانے کے لئے لوگ لکڑیاں جمع کر رہے ہیں میں گے بڑھا کہ دیکھو وہ کون شخص ہے۔ دیکھا تو میرا وہی دینی بھائی تھا۔ لکڑیاں جمع کرنے والوں سے میں نے پوچھا آخر اس شخص کا جرم کیا ہے؟ انہوں نے کہا یہ ایسا ایسا کہتا ہے۔ یعنی اسرار الہیہ میں سے ایک



راز کا اُس نے افشا کیا جس کی عقول عامہ متحمل نہ ہو سکیں۔ اُنہوں نے علماء سے استفتاء کیا اور علماء نے  
 اس کے جلائے جانے کا فتویٰ دیا۔ میں آگے بڑھا کہ اپنے بھائی کو میں نے تو پہچان لیا تھا تو مگر وہ اپنی مصیبت  
 و پریشانی میں مجھے نہ پہچان سکا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ لوگ تم کو کیوں جلاتے ہیں۔ کہا مجھے یہ یہ کہتے ہوئے  
 اُنہوں نے سنا۔ حالانکہ میں نے حق بات کہی ہے میں نے کہا ممکن ہے تم نے اس کے سوا اور کچھ بھی کہا ہو  
 جواب دیا کہ نہیں۔ اور کچھ بھی نہیں کہا۔ اب میں نے مجمع سے کہا کہ صاحبو! جب تک میں سلطان کے پاس  
 سے واپس نہ آؤں اُس وقت تک ہاتھ روکے رہو۔ میں ابھی جاتا ہوں اور سلطان سے عرض کر دوں گا کہ اس  
 شخص پر قتل کا حکم صحیح نہیں ہے لہذا تا حکم ثانی ساری کاروائی کو ملتوی رکھو۔ اور چونکہ مجھے غالب گمان ہے  
 کہ میری تقریر پر سلطان اپنا حکم ضرور واپس لیں گے اس لئے میری واپسی سے قبل اگر کسی نے کوئی کاروائی  
 کی تو وہ اپنی جان کی خیر نہ سمجھے۔ سب نے کہا بہتر ہے جب تک آپ واپس نہ آئیں گے ہم کچھ نہ کریں گے۔  
 چنانچہ میں بحضور سلطان پہنچا اور دیکھا کہ علماء و پاس بیٹھے ہیں اسی شخص کا تذکرہ ہو رہا ہے اور سلطان کو اس  
 کے قتل پر اُبھار رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا اے ہمارے پادشاہ، خداوند قدس آپ کا ناصر و مددگار ہے اور  
 ہر معاملہ میں آپ کو اپنے محبوب و پسندیدہ راستہ پر چلاتا رہے۔ دیکھئے ہر ابن آدم کی ذات پر چھیا سٹھ فرشتے  
 تعینات ہیں جو شخص کسی ایک ذات کو بھی ناحق قتل کرے گا تو مقتول کی ذات کے فرشتوں کی اتنی کثیر تعداد کا  
 اس کے سوا کوئی مشغلہ نہ ہو گا کہ قاتل پر لعنت برسنے کی بددعا کرتے رہیں کہ اُسی نے ذات کو قتل کر کے ان کو بلا  
 وجہ باہر نکالا اور معطل بنایا ہے اور ظاہر ہے کہ فرشتوں کی دُعا مقبول و مستجاب ہے لہذا اے ہمارے پادشاہ  
 اس بددعا سے ڈرنا چاہیئے نیز ہر ذات پر سات فرشتے بغرض محافظت و کتابت اعمال تعینات ہیں پس  
 جب کوئی ذات بلا وجہ قتل کی جاتی ہے تو ان فرشتوں کا اب صرف یہ کام ہوتا ہے کہ مقتول کے اعمال نامے سے  
 اُس کی خطاؤں کو نقل کر کے قاتل کے اعمال نامے میں لکھ دیں اور قاتل نے جو بھی عمل نیک کیا ہے وہ اس کے  
 اعمال نامے سے منتقل کر کے مقتول کے اعمال نامے میں درج کر دیں۔ قاتل کے مرتے دم تک ان کا یہی شغل رہتا  
 ہے، پھر اس کے مرنے کے بعد اس کی بدکاریوں کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں۔ اور ملائکہ کا تذکرہ چونکہ بارش کا حکم  
 رکھا ہے کہ جس کا ذکر بھلائی کے ساتھ کرتے ہیں اس پر بھلائی برستی ہے اور جس کا تذکرہ بُرائی کے ساتھ کرتے ہیں اس  
 پر بُرائی برستی ہے لہذا مقتول کا تذکرہ بھلائی کے ساتھ کرتے ہیں اور اس پر خیر و خوبی کا نزول ہوتا تھا ہے اور قاتل کا  
 تذکرہ بُرائی کے ساتھ کرتے رہتے ہیں (لہذا قبر و عالم برزخ میں بھی) اُس پر آفات برستی رہتی ہیں پس اے میرے  
 پادشاہ کیا آپ کو اس سے ڈر نہیں لگتا؟ سلطان نے فرمایا کہ ان علماء ہی نے قتل کا فتویٰ دیا ہے میں نے کہا مگر  
 ان حضرات نے قتل کے فتوے میں جلدی کی۔ ان کو چاہیئے تھا کہ قاتل کے لفظ اور نیت دونوں میں



غور فرماتے۔ اگر لفظ اُس کے قتل کو چاہتے تھے تو اُس سے اُس کی نیت اور مراد معلوم کرتے کہ اس کے صحیح و موافق شریعت ہونے پر قتل کا حکم نہ ہوتا۔ لہذا کسی کو بھیج کر اس شخص کو بلوایا جائے اور اُس کا مقصود معلوم کر لیا جائے علماء نے کہا ہاں بالکل ٹھیک ہے اور ہمیں اس پر ضرور عمل کرنا چاہیے۔ چنانچہ وہ بلوایا گیا اور چونکہ اس کے لفظوں سے جو مقصود تھا وہ شرعاً صحیح تھا اس لئے اس کو فوراً رہا کر دیا گیا۔ میں نے حضرت ممدوح سے پوچھا کہ پھر رہائی کے بعد کیا ہوا فرمایا جس بھائی نے رہا کر لیا تھا اُسی نے وہ ستر الہی جو شیخ سے ملا تھا۔ اُس سے سلب کر لیا اور وہ منجملہ عوام کے بن گیا۔ میں نے سوال کیا کہ پہلے اور دوسرے قصہ والوں کا قتل ہونے کے بعد کیا انجام ہوا فرمایا ان کی موت ولایت پر ہوئی مگر تیسری حکایت والا (جس نے شیخ کے ساتھ سوء ادب کیا تھا) البتہ کفر پر مرا۔ اللہ اذنا مسئلہ حسن الادب با ولبائیک و نعوذ بک من سوء الادب با صفیائیک (پانچواں قصہ) ایک صاحب نے فرمایا کہ میرا ایک مرید تھا۔ اور بارہ برس سے میری خدمت میں رہتا تھا۔ بڑا سخی اور حوصلہ والا تھا کہ تجھ پر اور اپنے غریب برادران طریقت پر قریب ایک قنطار کے خرچ کر چکا تھا۔ میرا ایک بھائی تھا جو شاہی ملازم تھا۔ ایک دن سلطان کو غصہ آیا اور بھائی پر اتنی رقم کا جرمانہ کیا جو اس کی وسعت سے باہر تھا۔ چونکہ عام لوگ مجھے بنظر عظمت و احترام دیکھتے تھے اس لئے کو تو ال شہر مجھے کوئی نقصان نہ پہنچا سکا۔ مرید نے وقت کو غنیمت سمجھ کر مجھ سے کہا کہ حضرت یا تو مجھے ستر عطا کر دیجئے یا جو رقم کثیر میں نے آپ پر اور آپ کے ساتھی فقیروں پر کھوئی ہے وہ سب ادا کر دیجئے ورنہ میں کو تو ال کو بلاتا ہوں ان تین باتوں میں میں جس کو آپ چاہیں پسند کر لیں میں نے کہا کہ اے شخص اللہ سے ڈر اور مجھے دھمکا کر مجبور نہ بنا، جلدی ہی اللہ تجھے ستر عطا فرما دے گا جیسا کہ تو چاہتا ہے بلکہ توقع و خیال سے بھی زیادہ دے گا۔ اور اگر تجھے میرے کلام میں شبہ ہو تو میں اللہ کا عہد و میثاق دیتا ہوں کہ صبر کرالیا ہی ہو گا مگر جوں جوں وہ میری سماعت کی گفتگو سننا دوں دوں بھڑکتا اور میری ایذا رسانی میں اوپر چڑھتا تھا۔ بالآخر کہنے لگا کہ میں تو تمہارا بیچھا چھوڑنے کا نہیں جب تک کہ میری ساری رقم جو میں نے تم پر ضائع کی ہے ادا نہ کر دو ورنہ کو تو ال کو لا کر ابھی پکڑواتا ہوں اور صورت حال ایسی نازک تھی کہ کو تو ال کو ذرا بھی گنجائش ملے تو وہ مجھے نہ چھوڑے جب اس شخص نے بار بار مجھ سے یہی کلمات کہے تو میں سر کے بل سجدہ میں گرا اور اس کے لئے ستر کی دعا مانگی۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے اس کو ستر عطا فرمایا۔ چند ہی روز گزرے تھے کہ اس کو ایک ایسی چیز نظر آئی جس کو حق تعالیٰ نے عقول عامہ سے مخفی رکھا ہے کیونکہ وہ اس کو برداشت نہیں کر سکتیں اور یہ شخص لوگوں سے اس کا تذکرہ کرنے لگا۔ لوگوں نے اس کو سنکر اس کے کفر پر شہادتیں مہیا کیں اور اسی وقت اس کو قتل کرادیا۔ اگر یہ شخص صبر کرتا اور ستر ذات کو لیت جس کے ذریعہ ستر ولایت قائم رہتا ہے تو حق تعالیٰ اس کو توفیق بخشتا اور اسرار ولایت میں کسی ایک راز کا



بھی افشا نہ کر سکتا۔ مگر اُس نے چونکہ عجلت کی اس لئے حق تعالیٰ نے اس کو سزا دی۔ میں نے حضرت شیخ سے پوچھا کہ یہ شخص کس حال پر مرا فرمایا مرا تو ولایت ہی پر۔ اور وہ اسرارِ جن کا افشاں صاحبوں کی موت کا سبب ہوا میں نے حضرت شیخ سے سُننے لگا کہ ان کو تحریر میں نہیں لاتا کہ وہ اسرار ہیں جو قابلِ بیان نہیں اگر وہ بیان میں لائے جاسکتے تو ان کا نام اسرار ہی کیوں ہوتا اور بالآخر اس اظہار پر بھی وہی نتیجہ مرتب ہوگا کہ لوگ کفر کے فتوے دیں گے کیونکہ عقول عامہ حقیقت کو نہیں سمجھ سکتیں، **و** سر کا ترجمہ ہے راز اور یہ ایک اصطلاح ہے صوفیہ کی جس کی حقیقت چراغِ قلب کی وہ روشنی ہے جس سے ذات و صفات کے حقائق و معارف اور عالم ملک و ملکوت کے مخفیات گوناگوں کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اور جس طرح قوت و ضعف کے اعتبار سے نورِ بصارت کے حد ہا مراتب ہیں۔ اسی طرح اس نورِ بصیرت کے بھی بے شمار درجے ہیں کہ ایک مشاہدہ ہے سید الوجود صلی اللہ علیہ وسلم کا جس کے مافوق کوئی مشاہدہ نہیں۔ اور ایک مشاہدہ ہے معمولی درجہ کے ولی کا کہ دونوں کے درمیان صلحا، اولیا، ابدال، اقطاب، اغواث۔ صحابہ، انبیاء اور ملائکہ کے کثیر درکثیر فرق مراتب ہیں و فوق کل ذی علم علیہ۔ پھر اس نور کے لئے اس کے مناسب ظرف کی ضرورت ہے کہ معمولی قمریہ زیادہ طاقت کی بجلی کے کرنٹ کو برداشت نہیں کر سکتا اور پھٹ کر چور چور ہو جاتا ہے۔ یہ مولیٰ کریم کا انعام ہے کہ عوام الناس سے تمامی اسرار کو مخفی رکھا ہے کہ ان کی عقول جو بقدر ضرورت دنیا میں ان کو عطا فرمائی ہیں ان کی مستحکم نہیں ہو سکتیں۔ اور ظاہر ہے کہ ان کا انکشاف اگرچہ کمال ہے مگر مدارِ نجات نہیں۔ مدارِ نجات وہ قانون الہی ہے جس کا نام شریعت ہے کہ فوج میں بھرتی ہو کر غنیمت پر تلوار چلانا اگرچہ ایک با عظمت عہدہ ہے مگر ساری رعایا کو اس سے نوانا جائے تو نظامِ سلطنت مختل ہو جائے۔ عام رعایا کی وفاداری کا امتحان صرف قانونِ سلطانی کی پابندی میں ہے کہ کوئی بچہ بھی کسی جرم کا مرتکب نہ ہو۔ طفل ضعیف اگر باپ کو جنگ میں تلوار چلاتا دیکھ دھند کرے اور وہ اس کی خوشامد یا گریہ وزاری پر تلوار اس کے ہاتھ میں دیدے تو عجیب نہیں بچہ خود اس کا شکار ہو جائے کہ ہر کارے دہر مردے۔

مولانا رومی نے مثنوی میں ایک چرواہے کا قصہ لکھا ہے کہ فرطِ محبت میں شراب چادر سے منہ ڈھاپے کھڑی زمین پر پڑا ہوا گنگنار ہاتھ کا اے میرے پیارے اللہ اگر تجھے پاؤں تو اپنی بکریوں کا دودھ پلاؤں اور تیرے پاؤں دباؤں وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ یہ کلمات کفریہ ہیں کہ حق تعالیٰ کی ذات پاک جسم سے منزہ اور کھانے پینے سے بے نیاز ہے، اور اسی لئے سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اس کو ڈانٹا اور دھمکایا۔ مگر حق تعالیٰ نے ان الفاظ کے منشاء پر نظر فرما کر کہ شرابِ محبت کا سکر ہے، اس کو معذور قرار دیا۔ جیسے جج کسی قاتل کو پھانسی کا حکم دے مگر دائرے اس کی خاندانی شرافت پر نظر فرما کر مرمتِ خسروانہ سے اس کو رہا کر دے اور اسی جج کو جس نے شاہی قانون کا احترام کرتے ہوئے سزائے موت کا حکم سنایا تھا بذریعہ تار حکم فرمائے کہ اس کو فوراً چھوڑ دو۔



قانونی مجرم بہر حال مجرم ہے اور جج کا فیصلہ بہر حال قابل استائش اور محافظ خانہ میں محفوظ رکھ کر دیگر مقدمات میں بے  
نظر بننے کا مستحق ہے۔ مرحمت خسروانہ نے مجرم کو رہا ضرور کیا۔ مگر نہ جج پر عتاب فرمایا کہ فیصلہ کے وقت سمجھ  
سے کیوں نہ کام لیا۔ اور نہ مجرم کے مجرم کا انکار کیا، بلکہ غور کرو تو مجرم کا اثبات ہے کہ معافی نام ہی ہے  
مستحق سزا سے سزا اٹھا لینے کا۔ نہ کہ بری دے تصور کو چھوڑ دینے کا جس کو عدل و انصاف کہتے ہیں۔ پھر  
کسی کی ہستی ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو کہ صاحبِ شریعت جلیل القدر پیغمبر تھے ایک عامی چرواہے سے  
عیاذ باللہ نیچے اتار دے۔ آپ اس چرواہے سے ہزاراں ہزار گونہ زیادہ محبت الہیہ رکھتے تھے مگر اس کے  
ساتھ ہی اس سے نکھو کھا گونہ بڑا ظفر بھی رکھتے تھے۔ جیسے کسی کی ایک گھونٹ شراب سے عقل جاتی رہے اور  
کوئی چند بوتلیں پیکر بھی مطلق از جا رفتہ نہ ہو۔ بلکہ قانونی نظم کو سمجھائے ہوئے اہل ہدیان متوالوں کی پکڑ دھکڑ  
میں مشغول رہے مگر وہ نہایت پیغمبر کا تھا کہ وحی الہی کا شاہی تار براہِ راست آپ کو پہنچ گیا ورنہ آج جبکہ اس  
اطلاع کا دروازہ بند ہو گیا ہے، علماء و امت محمدیہ کو بجز گرفت اور سزا دنیا جاری کرنے کا چارہ کار ہی کیا  
ہے۔ ہاں اس مرحمت خسروانہ کا اثر بیوم شر ضرر ظاہر ہو گا کہ بے شمار قانونی مجرم عفو شاہشاہی سے  
بہرہ یاب اور سجن جہنم سے رہا ہوں گے۔ یہی حال اہل مکاشفہ کا ہے کہ جب قبل از وقت اور بالا از طاقت  
کیفیت کے ملنے پر اہل پڑیں تو علماء و مجبور ہیں کہ خلافِ شرع کلمات پر قانونی سزا جاری کریں کہ اس میں قصور  
علماء کا نہیں، بلکہ اُبلنے والوں کا ہے کہ قبل از وقت اور ناقابلِ برداشت بوجھ اٹھایا کیوں۔ جیسا کہ خفیہ پولیس  
جن کی معلومات کے لئے اخفا و کتمان ہی فرض اولین ہے اگر تنگ ظرفی سے کسی راز کو افشا کر دے تو خطا  
وار وہ ہے نہ کہ گورنر جس نے اُسے برخواست کیا یا قید کیا۔ رہا یہ کہ علماء صاحبِ کشف کیوں نہ ہونے تاکہ اس  
راز کی واقعیت معلوم کر لیتے۔ سو اول تو تکوینی معاملات سے کہ عموماً ان اسرار کا تعلق اسی سے ہے، اہل تشریع  
کا واقف ہونا ضروری نہیں۔ کیونکہ ہر خدمت جدا ہے اور ہر محکمہ کے فرائض و ضروریات علیحدہ ہیں۔ جیسا کہ سیدنا  
موسیٰ اور سیدنا خضر علیہما السلام کے قصہ سے ظاہر ہے جو کہ قرآن مجید میں مفصل مذکور ہے۔ اور با ایں ہمہ افضلیت  
افضلیت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو ہے جن کی نبوت و رسالت قطعی اور جلالِ شان قرآن مجید میں جگہ جگہ  
مذکور ہے۔ اور راز اس کا یہ ہے کہ ان کے چراغِ قلب کا رُخ تکوینی مشاہدات کی طرف نہیں بلکہ معافی اور  
دقائقِ قانونِ الہی و سیاستِ عامہ کی تدابیر کی جانب ہوتا ہے جیسا کہ رموزِ مملکت کی دانش سلاطین ملک  
کے لئے۔ دوئم علماء و شریعت کو اگر تکوینی کشف ہو بھی تو حق تعالیٰ نے چونکہ بقا و عالم اور امن عام کا مدار شریعت  
ہی پر رکھا ہے، اس لئے اس سیاست کا تقاضا ان کا پہلا فرض ہے۔ کہ آج واقعی ایک مغلوب الحال کوئی بت  
خلافِ شرع کہہ رہا ہے اور چرواہے کی طرح اس کو معذور قرار دیا جا رہا ہے تو کل کو ایک واقعی بددین مکرر شخص



خلاف شرع کلمات بک رہا اور نقال محض بن کر صاحبان اسرار کی نظیر پیش کر رہا ہے تو کیا منہ ہے کہ اس کو معافی نہ دی جائے اور یہ کہلوایا جائے کہ مولیوں کی من مانی شریعت ہے جس کو چاہا مغلوب الحال کہہ لیا اور جس کو چاہا نقال بنا کر قتل کر دیا۔ اس طرح تو نظم عالم دامن عام ہی اُٹھ جائے گا۔ بہر حال خفیہ پولیس بھی ایک سرکاری محکمہ ہے اور بڑا معتمد علیہ ہے جس کا کام یہ ہے کہ واقعات کی حقیقت منکشف کرے اور انعام پاوے۔ مگر جج کی عدالت بھی اُسی سرکار کا محکمہ عالیہ ہے۔ جہاں صرف قانونی بحث ہے کہ جب کوئی ملزم لایا جائے گا تو پہلا سوال یہ ہوگا کہ معائنہ کے دو گواہ پیش کرو۔ واقعہ کتنا ہی سچا کیوں نہ ہو اگر شہادت بروئے قانون مکمل نہیں تو پھانسی تو کیا معنی ایک دن کا جیل خانہ بھی نہ ہوگا۔ نہ محکمہ پولیس کو اس میں ناگواری ہے کہ واقعہ اور حقیقت کی بھی رعایت نہ کی اور ہماری جدوجہد کو ضائع کر دیا۔ اور نہ جج پر گرفت ہے کہ سرکاری محکمہ کی صداقت پر اعتماد کیوں نہ کیا۔ چونکہ آئندہ یہ بحث بار بار آئے گا اس لئے اپنی فہم کے موافق بندہ نے اس کی تقریر ضروری سمجھی تاکہ نہ اہل باطن کی محبت دل سے نکلے نہ اہل ظاہر کی عظمت میں فرق آدے کہ دونوں حضرات سرکاری محکمہ کے عہدہ دار اور شاہی غلام ہیں۔ واللہ اعلم ان اسرار الہیہ کا زیادہ تعلق چونکہ کثوف کونیہ سے ہوتا ہے جس کے حامل صاحبان خدمت کہلاتے ہیں۔ اس لئے ان کو نسبتاً خضر یہ سے مستفید ہونا ضروری ہے۔ اور ان میں قطبیت و غوثیت کے عہدہ باطنیہ پر وہی فائز ہوتے ہیں جو مَرَجُ الْبَحْرِ سَیْنِ مَلِیْتَقِیَانِ بَیْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَا یُفِیْقَانِ کے مصداق ہوں کہ با متثال فرمان نبوی کَلِمَةُ النَّاسِ عَلَى قَدْرِ عَقُولِهِمْ اسرار مخفیہ کو عوام پر ظاہر نہ ہونے دیں۔ میا دافتنہ اور اختلال سیاست شرعیہ کا سبب ہو جائے اور خود شب و روز بجز مشاہدہ میں غرق اور معارف عجیبہ و لطائف غریبہ میں پہاڑ کی طرح ثابت قدم بھی بنے رہیں کہ تکوین و تشریع دونوں کا حق کما ہو حقہ پورا کر کے مولی کریم کے سامنے حاضر ہوں۔

(تسبیح ۷۷ فصل ۱) شیخ کی بعض کرامتوں کا بیان

یوں تو حضرت شیخ مجسم کرامت تھے کہ باوجودیکہ اُمّی محض تھے۔ اور باقاعدہ تحصیل علم تو درکنار بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کسی مجلس درس میں آپ کو دیکھا ہی نہیں گیا جتنی کہ حافظ قرآن مجید بھی تھے۔ چند سورتیں ادا نماز کے قابل یاد محقق مگر ان علوم میں بحث فرماتے تھے جن سے بڑے بڑے علماء عاجز تھے اور آپ ہی کی تحقیق بروئے عقل و نقل ہر طرح صحیح و صائب ہوتی تھی، تاہم سب سے پہلے ہم اُس کرامت کو بیان کرتے ہیں جس سے بالا کوئی کرامت نہیں۔ آوردہ صحت عقائد اور شان استقامت ہے۔ چنانچہ جب مجھے آپ کی صحبت نصیب ہوئی تو میں نے سب سے پہلے توحید کے متعلق آپ کا عقیدہ دریافت کیا۔ آپ نے ترتیب وار تمامی عقائد اہل سنت والجماعۃ ظاہر فرمائے کہ ایک بھی نہ چھوڑا۔ ایک بار فرمایا بندہ کو فتح نصیب ہی نہیں ہوتی جب تک کہ اہل سنت والجماعۃ کے عقیدہ پر نہ ہو۔ اور اللہ کا ایک بھی ولی کسی دوسرے عقیدہ پر نہیں ہوا۔ اور اگر فتح سے قبل کسی دوسرے عقیدے پر تھا بھی تو فتح کے بعد اُس پر واجب ہوا ہے



لہ تو بہ کرے اور فوراً عقیدہ اہل سنت والجماعتہ کی طرف رجوع ہو چنانچہ علامہ بدرالدین زکشی نے بھی کتاب جمع الجوامع میں یہی لکھا ہے) میں نے ہمیشہ حضرت مدوح کو اہل سنت کی مدح و ثنا کرتے سنا۔ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اہل سنت سے بہت ہی زیادہ محبت ہے اور اللہ سے دعاء مانگا کرتے تھے کہ ان ہی کے عقیدے پر مرنا نصیب ہو۔

پھر میں دیگر مذہب والوں کے شبہات (یعنی ان کے عقائد جن کا منشا علمی اشتباہ ہوتا ہے) پیش کیا کرتا تو آپ دہر اشتباہ کی تہ کو پہنچتے اور ایسی پیاری تقریر سے اس کا حل فرماتے جیسے دیکھا بھالا شخص جواب دیا کرتا ہے۔ غرض شان ربوبیت و سرالوہیت کی وہ باتیں آپ کے دہن مبارک سے ہمارے کان میں پڑتی تھیں جو نہ کبھی آنکھوں نے دیکھیں نہ کانوں نے سُنیں اور نہ ہم جیسوں کی عقل پہ کبھی اُن کا گذر ہوا۔ حالانکہ معقول و منقول میں جان کھپانا مدت ہائے دراز سے ہمارا مشغلہ رہا ہے حتیٰ کہ اگر کسی کو حق تعالیٰ توفیق بخشا ہے اور وہ اس بحث میں آپ سے مکالمہ رکھتا اور تمامی اہل ہوا فرقوں کے اشتباہات میں آپ کے ساتھ دوڑتا تو عقیدہ حقہ کی ایک بے نظیر قوت حاصل کرتا اور اس کو ایسا ملکہ نصیب ہو جاتا کہ بہتر فرقوں کے تمامی اشتباہات کے جواب پر پوری قدرت پالیتا۔

ایک مرتبہ آپ نے کشف و مشاہدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے تو مغیبات میں یقین اسی کا کیا ہے جس کو (نور بصیرت سے) دیکھ لیا ہے، کہ بے دیکھی چیز پر کون ایمان لایا کرتا ہے اور دیکھے بغیر تو خطرات و شبہات دور ہی نہیں ہوا کرتے۔ اس کے بعد میں نے احادیث صفات کے متعلق آپ سے استفسار کیا کہ روحہ اللہ اور ید اللہ وغیرہ میں تفویض ضروری ہے (کہ ان کی حقیقت کا علم اللہ کے حوالہ کریں) جیسا کہ متقدمین کا مسلک ہے، یا تاویل ضروری ہے (کہ وجہ سے مراد ذات ہے اور ید سے مراد قوت) جیسا کہ متاخرین کا طریق ہے؟ فرمایا کہ تفویض ضروری ہے۔ اور شان ربوبیت اتنی بلند و عظیم ہے کہ بندے نہ اس کی مقدار سمجھ سکتے ہیں اور نہ اس کی کسی ایک چیز کی بھی حقیقت و کنہ تک رسائی پا سکتے ہیں۔

دیکھو اگر دنیا والے جنت کی نعمتوں کے بارہ میں جتنا بھی انہوں نے سنا ہے اگر ان کی اصل حقیقت سے واقف ہونا چاہیں تو بالکل ناممکن ہے کیونکہ وہاں کا انگور نہ یہاں کے انگور جیسا ہے نہ کھجور یہاں کی کھجور کی طرح ہے۔ نہ وہاں کا سیم وزر یہاں کے سیم وزر کی مثل ہے بلکہ حق تعالیٰ اگر کسی بندہ کی آنکھیں کھول دے اور وہ جنت کے انگور و کھجور اور سیم وزر کو دیکھ لے تو ان کی حقیقت اور ماہیت میں اتنا بجد و بے پایاں فرق پائے گا کہ دونوں میں سبز نام کی شرکت کے کچھ بھی مناسبت نہیں۔ اسی طرح دوسری زمین کے باشندوں کا حال ہے اس زمین کی نعمتوں کے متعلق کہ اگر ان کے سامنے مثلاً شہد گھی، دودھ، اور روٹی وغیرہ چند کھانے ہی کی چیزوں کا نام لیا جائے تو ان کی سمجھ میں بھی نہیں آئے گا کہ شہد و روٹی وغیرہ کیسی ہوتی ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ چیزیں دوسری زمین میں بالکل نہیں ہوتیں۔

پس جب ایک حادثہ کا دوسرے حادثہ کے ساتھ یہ حال ہے کہ ایک جگہ کی مخلوق دوسری جگہ کے



مخلوقات کی اصل حقیقت نہیں سمجھ سکتی، تو قدیم سبحانہ و تعالیٰ کا حادثہ کے ساتھ کیا پوچھنا کہ اس کی صفات قدیمہ کی حقیقت اور اس کو بشر سمجھ لے، لہذا بندہ پر واجب ہے کہ جب اُس کی صفات کے متعلق کوئی بات سُنے تو ظاہری مفہوم سے جو کہ شرعاً محال ہے اس کو منکر سمجھنا ہو، حقیقی مفہوم کو اللہ جل جلالہ کے حوالے کرے۔ میں کہتا ہوں کہ تفویض ہی مذہب ہے۔ امام مالک حضرت سفیان بن عیینہ، حضرت سفیان ثوری، حضرت حماد بن زید، حضرت حماد بن سلمہ، حضرت شعبہ، حضرت شریک، حضرت ابو عوانہ، حضرت ربیعہ، امام اوزاعی، امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، حضرت ولید بن مسلم، امام بخاری، امام، امام ترمذی، حضرت ابن المبارک، حضرت ابن ابی حاتم اور حضرت یونس بن عبد الاعلیٰ (مقتدایان اہل سنت علماء و محدثین) کا اور یہی قول ہے اہل قرون ثلاثہ (حضرات صحابہ و تابعین) کا جو کہ تمامی قرون (ماضیہ مستقبلہ) میں افضل و بہترین ہیں رضی اللہ عنہم اجمعین۔ حتیٰ کہ امام ابو حنیفہ کے شاگرد امام محمد بن حسن شیبانی فرماتے ہیں کہ شرق سے لے کر غرب تک تمامی فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ رب کی صفات کے بارے میں قرآن پر اور ان احادیث پر جو کہ بروایات ثقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں بذاتِ شبہ اور تفسیر کے ایمان لایا جائے (مثلاً نہ یہ کیا جائے کہ اس کا ہاتھ یا منہ عیاذاً باللہ ہماری طرح ہے کہ کیسے کیسے شئی نے تشبیہ کو باطل کر دیا ہے اور نہ یہ بتایا جائے کہ ہم حبس نہیں تو پھر کیا ہے اس لئے کہ جس کی کتنے تک عقل تک رسائی نہیں اس کی تفسیر گویا اندھے کا تیر ہے جو خلاص عقل ہے)۔

اور امام الحرمین نے رسالہ نظامیہ میں اس طرح تحریر فرمایا ہے "ان ظواہر کے متعلق علماء کے مسلک مختلف ہیں کہ بعض کی رائے تفسیر کے متعلق ہے۔ اور انہوں نے آیات کلام اللہ و احادیث رسول اللہ میں اسی کا التزام کیا ہے جہاں بھی وجہ وید وغیرہ ایسی صفات آئیں جن کے ظاہری معنی شان ربوبیت کے منافی ہیں وہاں اقرب الی الفہم مجازی معنی لے کر تفسیر کر دی کہ منہ سے مراد ذات اور ہاتھ سے مراد قدرت ہے)۔ مگر آئمہ سلف اس طرف گئے ہیں کہ تاویل سے باز رہے اور ان کے معانی اللہ جل جلالہ کے حوالہ کرے اور ہمارے نزدیک پسندیدہ رائے اور جس عقیدہ پر خدا کے سامنے حاضر ہونے کو ہمارا دل چاہتا ہے وہ آئمہ سلف ہی کا اتباع ہے کہ اجماع اُمت کا حجت ہونا دلیل قطعی سے محقق ہو چکا ہے۔ پس اگر ان ظواہر کی تاویل کرنا ضروری ہوتا تو حضرات سلف کو فروعی مسائل سے زیادہ اس کا اہتمام ہوتا۔

کیونکہ عقائد کا قصہ ہے اور وہ بھی ذات و صفات الہیہ کے متعلق جو کہ اصل الاصول ہے، اور جب صحابہ و تابعین کا بہترین زمانہ تاویل و تفسیر سے گریز ہی پر گذر لیا تو کون وجہ ہے کہ اس کی پیروی نہ کریں۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ صحابہ و تابعین کا مشرب تو ظاہر ہو چکا اب رہے تیسرے قرون و ائمہ فقہاء و بلاد



مثلاً امام ثوری و اوزاعی و مالک و لیث اور ان کے سمیعہ علماء (سوان کا مذہب (اسی تفویض کا) ہم پہلے نقل کر چکے۔ اور یہی مشرب اُن آئمہ کا بھی ہے جو فقہاء مذکورین کے شاگرد اور اُن سے علوم حاصل کرنے والے تھے۔ پھر اس پر کیے نہ اعتماد کیا جائے جو تینوں قرون کا متفق علیہ ہے کہ وہی لبشہادت صاحب الشرعیۃ علیہ الصلوٰۃ والتحیہ بہترین قرون ہیں۔ الحاصل حضرت شیخ کا عقیدہ وہی تھا جو اہل قرون ثلاثہ کا تھا اور یہی وہ بڑی کرامت ہے جس سے بالا کوئی کرامت نہیں ہے۔ علامہ ابن حجر تحریر فرماتے ہیں کہ شیخ ناصر الدین ابن مینر کا قول ہے استقامت (یعنی عقاید حقہ پر ثبات) ہی ایک ایسا کمال ہے جس کا کرامت ہونا یقینی اور لاریب ہے، بخلاف دیگر خوارق عادات کے کہ وہ کبھی رحمت ہوتے ہیں جبکہ اہل صلاح کے ہاتھ پر ظاہر ہوں۔ اور مخلوق کو اللہ کی طرف لانے کا وسیلہ بنیں، اور کبھی فتنہ ہوتے ہیں جبکہ بد دین کے ہاتھوں بصورت استدراج ظاہر ہوں۔ اور مخلوق کو بد دین بنانے کا ذریعہ بنیں) اس فیصلہ کے سننے کے بعد مطلق ضرورت نہ تھی۔

(ہم خوارق عادات کا تذکرہ کریں مگر چونکہ عوام کے نزدیک ان ہی کا نام کرامات ہے اس لئے) ہم کہتے ہیں کہ حضرت ممدوح کے کشف و کرامات بھی ہم نے بے شمار دیکھے ہیں جن کا احاطہ ناممکن ہے، چنانچہ چند کا ذکر کرتے ہیں۔

حضرت ممدوح سے تعارف کا شروع زمانہ تھا کہ میرے بچہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کی ماں کو بڑا صدمہ ہوا۔ کیونکہ اس سے پہلے اس کا ایک بچہ اور مرچکا تھا۔ میں اس کو تسلی دینے لگا کہ میں نے حضرت احمد ابن عبد اللہ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ میں بچوں کو دیکھتا ہوں، اور پھر جو کچھ اُن کو آئندہ زندگی میں پیش آنے والا ہے اس پر نظر کرتا ہوں تو مجھے بڑا ترس آتا ہے (کہ ان لادلوں کو ہماری طرح بہت کچھ پاپڑ بیلینے ہیں) اس لئے جو بچپن ہی میں دُنیا سے اُٹھ گیا وہ سب آفتوں سے بچا رہا۔ اور تمہارا بچہ بھی انتقال کر گیا۔ لہذا خوش ہوؤ کہ ہر قسم کے افکار معاش و معاد سے محفوظ رہا) صبح کو جب حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا رات تم اپنی بیوی سے یہ باتیں کہہ رہے تھے، اور میری ساری تقریر نقل فرمادی۔

حضرت ممدوح سینہ کی کسی تکلیف کے سبب لونگ کھایا کرتے تھے اور جب آپ سانس لیا کرتے تو اُس کی خوشبو مہکتی تھی، جسے میں دن بھر سونگھتا کرتا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ رات کے وقت اپنے گھر میں بھی باوجودیکہ دروازے بند ہوتے تھے بعینہ یہی خوشبو مجھے سنگھائی دیتی تھی، حالانکہ حضرت کا مکان محمد رأس الجنان میں تھا اور میرا گھر محلہ بکر نقر میں۔ اور آپ اپنے مکان میں ہوتے تھے اور میں اپنے گھر میں مگر وہ خوشبو گھر کے اندر بار بار مہکتی تھی میں نے اس پر غور کیا اور بیوی کو بھی آگاہ کیا کہ اُسے بھی حضرت کے ساتھ محبت تھی اور حضرت بھی اس کے ساتھ بہت محبت فرماتے تھے ہم دونوں کو یہ خوشبو سونگھتے ہوئے جب ایک مدت گزر گئی تو میں نے ایک دن حضرت سے ذکر کیا کہ آپ کے دہن مبارک



کی خوشبورات کے وقت ہمیں اپنے گھر آیا کرتی ہے اور ہم اسے ہمیشہ سونگھا کرتے ہیں۔ کیا آپ ہمارے پاس ہوتے ہیں؟ فرمایا جی ہاں۔ میں نے ہنسی کے طور پر کہا کہ اسے میرے آقا اب کی دفعہ اس خوشبو کی ٹوہ لگا کر حضرت کو ہاتھوں سے بھینچ لوں گا۔ آپ نے بطور خوش طبعی جواب دیا کہ ہم گھر کے دوسرے کونہ میں جا کھڑے ہوں گے۔ اس کے بعد اس خوشبو کے قصہ کا دوبارہ ذکر آیا تو فرمایا یہ تو سونگھ رہے۔ اور شوق کہاں ہے مطلب یہ ہے کہ محبت کا درجہ شوق تک پہنچے جب روحانی کچھتی نصیب ہو، ایک مرتبہ فرمایا کہ میں تم سے نہ رات کو جدا ہوتا ہوں نہ دن کو۔ ایک بار فرمایا اگر گھنٹہ بھر میں پانچ سو مرتبہ تمہارا خیال نہ کروں تو بحضور خداوندی مجھ سے مطالعہ کیجیو۔ ایک دفعہ میں نے عرض کیا کہ حضرت میں نے اپنی ذات کو اور آپ کی ذات کو ایک کپڑے میں دیکھا ہے۔ فرمایا خواب سچی ہے کہ تم مجھ سے نہ دن کو جدا ہو وگے نہ رات کو ایک مرتبہ فرمایا اچھا آج رات کو ہم تمہارے پاس آئیں گے۔ ذرا دھیان رکھیو۔ چنانچہ اخیر شب میں جبکہ میں کچھ سو رہا تھا کچھ جاگ رہا تھا۔ آپ (بطریق کرامت) تشریف لائے۔ جب میرے قریب آئے تو میں نے آپ کا ہاتھ خوب مضبوط پکڑ لیا اور آگے بڑھا کہ بوسہ دوں جب آپ کے ہاتھ اور سر کو بوسہ دیا تو آپ غائب ہو گئے۔

ایک بار سلطان نے میرے نام فرمان جاری کیا اور اپنے دو خاص آدمیوں کے ہاتھ بھیجا کہ مکنا سر پہنچ کر جامع مسجد ریاض میں امامت انجام دو۔ پس خدا ہی جانتا ہے کہ (وطن اور حضرت کی صحبت چھوٹنے کے خیال سے) مجھے کتنی پریشانی ہوئی حضرت نے سنا تو فرمایا گھبراؤ مت تم مکنا سے جاؤ گے تو ہم بھی تمہارے ساتھ جائیں گے۔ باقی کوئی منکر کی بات نہیں۔ سلطان جو تم سے چاہتے ہیں وہ ہوگا نہیں چنانچہ میں ہر دو قاصد کے ساتھ مکنا سر پہنچا۔ مگر حق تعالیٰ نے مجھ پر بڑا فضل فرمایا اور وہی ہوا جو حضرت نے فرمایا تھا کہ میں اپنے گھر واپس آگیا۔ میرے خسر مولانا محمد بن عمر نے جو سنا تو مجھے خط لکھا کہ تم مکنا سر گئے مگر نہ سلطان ملے اور باضابطہ استعفا دیا۔ دیکھیے تم پر کیا عتاب نازل ہو۔ مناسب ہے کہ فوراً مکنا سر واپس جاؤ۔ اور سلطان سے ملو

۱۔ جس طرح مادیات میں برق کو حق تعالیٰ نے یہ طاقت بخشی ہے کہ ہمارے پاؤں جس مسافت کو سال بھر میں طے کریں وہ اس کو بذریعہ تار کے ایک سینکڑ میں عبور کر جاتی ہے۔ اور بدن کی کھال وہڈی وغیرہ جو کہ نور بصیر کے لئے حاجب ہے وہ اس کے لئے حاجب اور مانع نفوذ نہیں کہ ایک سرے اسی کے ذریعے اندرون شکم کے فوٹو لینے کا آلہ ہے۔ اسی طرح روحانیت میں نور بصیرت کو حق تعالیٰ نے اس سے بھی صد گونہ زیادہ طاقت بخشی ہے کہ زمان و مکان کا بُعد اور دیوار و پہاڑ وغیرہ اجسام کثیف کا جرم اس کے راستہ میں مزاحم و حامل نہیں بنتا اور وہ ہلک جھپکتے میں مشرق و مغرب تمامی آفاق بلکہ فوق السموات و تحت الارضین کا گشت کر لیتی اور تمام اجرام حتیٰ کہ گوشت و پوست تک میں بسرعت کاملہ نفوذ کرتی ہے۔ اسی کا نام کشف ہے اور صاحبان خدات اقطاب و اغوش سے چونکہ انتظام عوالم کا کام لیا جاتا ہے اس لئے ان کو یہ قوت خزانہ الہیہ سے بیش از بیش عطا کی جاتی ہے لہذا نہ اپنے محروم و ناواقف ہونے کے سبب ان کرامتوں کا انکار کرو اور نہ ان عہدہ داران تکوین کو سلطان باختیار اور ہم پلہ علیم و قدیر سمجھو واللہ اعلم۔



اور مسجد ریاض کی امامت پر اپنی خوشنودی کا اظہار کرو۔ اس کے سوا کسی رائے پر عمل نہ کرنا۔ میں یہ خط لے کر حضرت کے پاس آیا۔ فرمایا مسیال اپنے گھر بیٹھو اور کسی بات کا اندیشہ نہ کرو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جیسا حضرت نے فرمایا تھا۔ اور یہ ایک عجیب حیرت خیز کرامت ہے جس کا عجوبہ ہونا واقعہ کے مفصل ذکر کرنے پر موقوف ہے حتیٰ کہ مکنا سہ کے میرے بعض احباب کہا کرتے تھے کہ اس سے زیادہ عجیب بات ہمارے دیکھنے میں نہیں آئی کہ خود سلطان تمہارے نام فرمان جاری کریں۔ اور اس میں تاکید حکم ہو۔ اور ڈو خاص مصاحب اس کو لے کر جاویں اور تم کو لے کر مکنا سہ پہنچیں۔ اور تم سلطان سے ملاقات تک نہ کرو۔ اور اپنے وطن فاس واپس آ جاؤ۔ اور کچھ پروا نہ کرو (اس کا انجام کیا ہوگا) واللہ بڑی عجیب بات ہے۔ مگر یہ سب حضرت شیخ کی برکت تھی۔

ایک عورت کو حمل قرار پایا۔ آپ نے فرمایا لڑکا ہوگا۔ جب نواں مہینہ شروع ہوا اور عورت کی عادت تھی کہ نویں مہینے کے شروع میں ہی ولادت ہو جاتی تھی۔ تو اس کے درد اٹھا ہمیں لہتیں ہو گیا کہ دروزہ ہے۔ مگر حضرت نے فرمایا کہ یہ تو مرض کا درد ہے، ولادت تو ابھی دور ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جیسا حضرت نے کہا تھا۔

ایک دفعہ مولانا محمد امیارہ سے میری ملاقات ہوئی اور مولانا نے حضرت شیخ کے لئے چار موزونہ دے اس کے بعد حضرت نے فرمایا محمد امیارہ بڑی چیز ہیں۔ حبیب میں ہاتھ ڈالا تو برے موزونات نکلے۔ لہذا ان کو لوٹا کر دوبارہ اچھے موزونات نکالے۔ اور وہ ہمیں دے۔ چنانچہ میں نے مولانا محمد امیارہ سے مل کر حضرت کا مقولہ نقل کیا تو فرمایا بالکل صحیح ہے۔ پہلے کھوٹے موزونات نکلے تھے میں نے ان کو حبیب میں ڈال لیا اور پھر دوبارہ کھرے موزونے نکالے اور پیش کئے تھے۔

حضرت کے صاحبزادہ سید ادیس کو ایک بار خطرناک مرض لاحق ہوا اور ان کی والدہ بہت پریشان ہوئیں۔ ایک دن بعد مغرب میں عیادت کو آیا اور دیکھا کہ غلبہ مرض کے بولا بھی نہیں جاتا۔ اس حالت سے مجھے بھی پریشانی ہوئی۔ مگر حبیب ہم باہر آئے تو حضرت نے فرمایا یہ مرض الموت نہیں ہے اور انشاء اللہ صحت ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اسی طرح ایک بار صاحبزادی صاحبہ سیدہ فاطمہ کو مرض پیش آیا اور اس نے بڑا طول پکڑا۔ مگر حضرت نے فرمایا کہ مرنے کی نہیں۔ انشاء اللہ تندرست ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اسی طرح ایک مرتبہ میں حضرت کے ساتھ مولانا محمد امیارہ کے بچہ کی عیادت کو گیا کہ وہ ایک سخت مرض میں مبتلا تھا۔ مگر حضرت نے فرمایا اس مرض میں تو مرنے کا نہیں۔ انشاء اللہ عنقریب تندرست ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اسی طرح ایک دفعہ میرے دوست حاج محمد علی سبجلماسی کا بچہ اتنا بیمار کہ باپ نے اس کو رڈی۔ میں نے اس کا ذکر جبکہ اندلس کی جامع مسجد میں نماز سے نازغ ہو کر نکلے اور باب الفتوح کی طرف جا رہے تھے حضرت سے کیا۔ تو فرمایا کہ کوئی اندیشہ کی بات نہیں ہے۔ بچہ کی ماں اس کا مرنا



گوارا نہیں کرتی کہ اگر وہ مر جائے تو ماں کو اتنا صدمہ ہو کہ جھیل نرسکے لہذا ماں کی خاطر بچہ پر حق تعالیٰ نے کرم فرمایا، اور وہ ابھی مرے گا نہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہ چاروں بیمار آج تک کہ ۲۲ ربیع الاول ۱۳۸۷ھ ہے محمد اللہ بقید حیات ہیں۔ ایک مرتبہ ہم نے قطب الوقت شیخ عبدالسلام بن شیش کے مزار کی زیارت کے لئے سفر کیا اور نماز ظہر کے قریب وہاں پہنچے۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ یہاں ضرور قیام کریں گے۔ مگر حضرت شیخ نے رفقاء سے فرمایا کہ تم لوگ یہیں ٹھہرو اور سواریوں سے نہ اترنا ہم زیارت کر کے ابھی واپس آتے ہیں۔ چنانچہ صرت میں آپ کے ساتھ پہاڑی پر جہاں مزار تھا، چڑھا۔ اور جب زیارت سے فارغ ہو لئے تو حضرت نے مجھ سے پوچھا کہو کیا دعائیں مانگیں۔ میں نے عرض کیا کہ اس زیارت میں تو میری ساری دعائیں آپ کے لئے مخصوص رہیں کہ جب سے بیٹھا تھا حضرت ہی کے لئے خیر و خوبی کی دعائیں مانگتا رہا۔ اور دوسروں کے لئے تو کیا خود اپنے لئے بھی کوئی دعا نہیں مانگی حضرت نے فرمایا اور یہی حال میرا رہا کہ ساری زیارت صرت تمہارے لئے تھی۔ اور کسی دوسرے کے لئے میں نے دعا ہی نہیں مانگی۔ مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی اس کے بعد ہم پہاڑ سے اترے اور آپ نے ہم کو شہر تطاون کے سفر کا حکم سنایا۔ میں نے عرض بھی کیا کہ شہر بہت دور ہے اور آج وہاں تک پہنچ بھی نہیں سکتے کہ دن بہت ٹھوڑا (باقی ہے) باقی جس طرح حکم ہو تعمیل کے لئے حاضر ہیں۔ مگر اس پر بھی حضرت نے تاکید سے پھر وہی فرمایا۔ چونکہ ہمیں یقین تھا کہ بات وہی ٹھیک ہے جو حضرت کی زبان سے نکلے۔ لہذا ہم سواریوں پر سوار ہو کر روانہ ہوئے اور رات بھر چلتے رہے حتیٰ کہ صبح صادق ہونے پر شہر تطاون میں داخل ہوئے۔ بس شہر میں گھستا تھا کہ آسمان نے اپنی بکھالیں کھول دیں اور اس زور سے بارش ہوئی کہ الہی پناہ۔ پورے دو دن یہی زور رہا۔ اسی اثنا میں حضرت مجھے لے کر اُس گھر کی چھت پر چڑھے جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے اور فرمایا احمد دیکھ رہے ہو کیسی موسلا دھار بارش رہی ہے۔ میں نے کہا جی حضرت۔ فرمایا اسی کی وجہ سے میں نے تم کو رات بھر چلایا کہ جس وقت میں حضرت شیخ کے مزار پر پہنچا ہوں اُسی وقت یہ بارش مجھے نظر آگئی تھی۔ ہبلا متلاؤ اگر یہ شدید بارش ہمیں اُن پہاڑی دڑوں میں آتی جہاں ہمارے پاس نہ اپنے کھانے کی کوئی چیز تھی نہ سواریوں کو کھلانے کی اور پھر متواتر دو دن یہ برستی رہتی تو ہمارا کیا حال ہوتا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت اگر مرتے نہیں تو مصیبت تو اتنی اٹھاتے جس کی حد نہیں۔

اس کے بعد میں نے آپ کا ہاتھ چوما اور عرض کیا اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے پھر دو دن کے بعد جیم

تطاون سے چلے تو اُس وقت بھی خوب بارش ہو رہی تھی ہم نے عرض بھی کیا کہ حضرت بارش ہی سے تو ہم بھاگے اور پھر اسی میں گھسنے لگے مگر آپ کچھ جواب نہ دیا۔ عرض ہم شہر سے باہر آئے اور چاہا کہ جانوروں کے چارہ کے لئے جو خرید لیں۔ مگر حضرت نے



منع فرمادیا۔ آخر اسی شدید بارش میں ہم چل پڑے۔ میل دو میل سے زیادہ نہ چلے تھے کہ گھٹا پھٹ گئی۔ ہوا  
 ٹھہر گئی۔ سورج نکل آیا۔ اور نظر بڑا سوہنا ہو گیا۔ اس پر ہم کو بڑا تعجب ہوا۔ پھر جب عصر کا وقت  
 نصف رہ گیا تو ہم نے عرض کیا کہ حضرت سوار یوں کا چارہ کہاں ملے گا۔ آپ نے رفقاء سے پوچھا کہ  
 آبادی کتنی دُور ہے؟ معلوم ہوا اتنی دُور ہے کہ آدھی رات سے پہلے نہیں پہنچ سکتے۔ آپ خاموش ہو  
 گئے اور چلتے رہے حتیٰ کہ مغرب کا وقت قریب آ گیا تو فرمایا دامنِ طرف کو مڑ جاؤ۔ چنانچہ ہم نے راستہ  
 چھوڑ کر دامنِ جانبِ سوار یوں کا منہ پھیر دیا۔ تھوڑی ہی دُور چلے تھے کہ غلہ کے کھلیان ہمیں نظر  
 آئے جن میں ابھی دائیں نہ چلی تھی، اور اس کے قریب ہی پانی کا چشمہ تھا۔ فرمایا یہاں اتر جاؤ کہ حق تعالیٰ  
 نے جانوروں کی خوراک بھی عطا فرمادی ہے۔ کہ کھلیان میں سے جتنی ضرورت ہوے لو۔ چنانچہ ہم نے  
 کھلیان میں سے لے کر جانوروں کے سامنے رکھ دیا کہ انہوں نے خوب کھایا۔ اور الحمد للہ ہم نے بڑے آرام سے  
 رات گزاری۔ عشاء کے قریب کھلیان کا ایک مالک آیا اور ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ جانوروں نے جتنی  
 قیمت کا غلہ کھایا تھا اس سے زائد حضرت نے اس کو عطا فرمایا۔ اس پر وہ بہت ہی زیادہ مسرور ہوا۔  
 اور رات بھر ہمارے پاس رہا۔ ہمارے ہی ساتھ کھانا کھایا۔ اور ایسا بن گیا گویا ہمارا رفیق سفر ہے ایسا  
 ہی قصہ دوسری دفعہ پیش آیا کہ ہم شیخ عبدالسلام کے مزار پر جا رہے تھے۔ مگر جب بنی زکار گھاٹی پر  
 پہنچے تو عصر کا وقت نکل چکا تھا۔ جو لوگ اس گھاٹی کو ہم سے پہلے عبور کر چکے تھے وہ پڑاؤ بھی ڈال چکے  
 تھے۔ ہم نے عرض کیا کہ حضرت جو قافلہ ہم سے پہلے چلا تھا وہ سوار یوں سے اتر چکا ہے کہ اب آگے جانے  
 کا وقت نہیں رہا، فرمایا چلے چلو۔ ہم نے عرض کیا حضرت چلیں کیسے؟ نہ ہمیں راستہ معلوم اور نہ کوئی راستہ  
 بتانے والا ہمارے ساتھ۔ فرمایا چلے چلو۔ چنانچہ ہم یہاں سے بڑھے اور رہبر کے بغیر ہی آگے چل دیئے  
 ہم قدم اٹھاتے رہے اور حق تعالیٰ ہمیں راستہ کا الہام فرماتا رہا۔ حتیٰ کہ پانی کے ایک چشمہ پر پہنچے جس  
 کے قریب ہی کھلیان تھا جس میں دائیں چل چکی تھی یعنی بیل چلا کر بھوسہ الگ اور غلہ الگ ہو چکا  
 تھا، کھلیان کا مالک ہمیں ملا اور اس نے یہاں اترنے کی ہم سے خواہش کی۔ چنانچہ ہم نے بڑے  
 آرام سے رات گزاری کہ ہمارے جانور بھی رات بھر بھوسہ کھاتے رہے اور جو قافلہ ہم سے پہلے (گھاٹی پر)  
 اتر چکا تھا اُن کے جانوروں کو رات بھر بھوسہ نہ ملا۔ اس سفر زیارت میں بڑے بڑے دقائق و حقائق حضرت  
 کی زبان مبارک سے سننے میں آئے جن میں اکثر کو میں نے اس کتاب میں درج بھی کر دیا ہے۔ حضرت ممدوح  
 جب اماکن و مواضع کا تذکرہ فرمایا کرتے تو انجان آدمی یوں سمجھتا تھا کہ حضرت نے ان مقامات کا ضرور  
 سفر کیا اور چپہ چپہ کو دیکھا ہے حالانکہ وہ محض کشف ہوتا تھا۔ اکثر آپ دُور دُور مقامات کا سفر رہبر



کو ساتھ لئے بغیر کیا کرتے اور ایسے راستوں سے نکل جاتے تھے جن کو اکثر آدمی جانتے بھی نہ تھے۔ ایک دن آپ نے مولانا علی بن عبد اللہ صباغی سے جن کا مکان شہر فاس سے چار منزل پر موضع صباغات میں تھا فرمایا کہ میں ایک دن مجمع کے ساتھ چلا کہ ہم سب گھوڑوں پر سوار تھے حتیٰ کہ فلاں مقام پر پہنچے۔ حضرت نے اس جگہ کا نام بھی بتایا اور اس کی صورت و کیفیت سب بتائی۔ پھر میں رفقاء کو وہیں چھوڑ کر تمہارے وطن میں داخل ہوا اور سارا حلیہ اس کا اور مولانا کے گھر کا ایسا بیان کیا گویا نظر کے سامنے ہے (اور دیکھ دیکھ کر بیان کر رہے ہیں) حالانکہ محض کشف تھا۔ اور گھوڑوں پر سوار ہونا صرف کشف کو چھپانے کی غرض سے ذکر کیا تھا۔ مولانا علی نے ہم سے خود کہا کہ حضرت نے آنکھوں دیکھا ایسا ٹھیک حال بیان فرمایا ہے کہ نہ ذرہ برابر کسی مٹھی نہ بیشی۔ اس کے بعد حضرت نے اُن سے فرمایا کہ فلاں جگہ جہاں تم اپنے گھوڑے باندھا کرتے ہو ایک بڑے ولی کی قبر ہے، آئندہ وہاں گھوڑے نہ باندھنا۔ چنانچہ انہوں نے واپس جا کر چھان بین کی تو حضرت کا فرمودہ صبح پایا اور اس جگہ مزار بنادیا گیا میں نے حضرت کو یہ بھی فرماتے سنا کہ وہ ولی ہمارے آباء میں سے ہیں یعنی غوث تھے۔ اور ایک مرتبہ اس کی تصریح بھی فرمادی۔ ایک روز میں آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا ایک شخص نرا سے آیا جو کہ مشہور بستی ہے۔ آپ نے پوچھا کہاں رہتے ہو؟ اُس نے کہا نرا کارہنے والا ہوں۔ حضرت اس بستی کا حلیہ اور اس کے مقامات و علامات بیان فرمانے لگے۔ اور وہ شخص آپ کی تصدیق کرتا اور یوں سمجھتا رہا کہ حضرت اس جگہ جا چکے تھے۔ پھر جب وہ چلا گیا تو میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ کشف کو لوگ پسند کرتے ہیں حالانکہ اس میں بڑی مضرت ہے خود ولی کے لئے بھی اور اس کے لئے بھی جو ولی سے اس کا طالب ہوتا ہے۔ ولی کے لئے تو یہ ضرور ہے کہ اُس میں مشاہدہ حق سے مشاہدہ خلق کی طرف اُترنا ہے اور یہ بالا مقام سے پستی کی طرف انحطاط ہے اور طالب کا ضرر یہ ہے کہ کشف و کرامت کا طالب وہی ہوتا ہے جس کی محبت اوپر ہی ہوتی ہے۔ اور جب ولی نے اس کی موافقت کی (کہ کشف یا کرامت کا ظہور ہو گیا) تو اس کو گویا اس کی حالت ناقصہ اور اندھے پن پر برقرار رکھا (ان دونوں باتوں کی تشریح انشاء اللہ آئندہ کتاب میں آئے گی) ایک بار یہ قصہ پیش آیا کہ سادات میں سے ایک شخص مجھ سے ایک دقیق کتاب پڑھا کرتے تھے اور میں جب اُس کی شرح کیا کرتا تو اُن کو بہت پسند آتی اور وہ کہا کرتے کہ جس وضاحت سے آپ بیان کرتے ہیں علماء میں کسی کو بھی ہم نے ایسا کھول کر سمجھاتے نہیں پایا۔ غرض انشاء درس میں ایک دقیق مسئلہ آگیا جس میں مصنف کتاب نے اسرار الہیہ میں سے ایک سربیان کیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ میں نے کہہ دیا مجھے معلوم نہیں کیونکہ سُر الہی کا افشا کرتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔



مگر ان کا شوق بڑھتا رہا۔ تب میں نے کہا واللہ میں اس کی شرح ہرگز نہ کروں گا جب تک عہد و پیمان نہ دو کہ نہ کسی اپنے سے ظاہر کرو گے نہ کسی غیر سے۔ چنانچہ انہوں نے عہد و پیمان دیا اور میں نے اس کا مطلب بیان کیا اور جتنے بھی اشکالات اس پر وارد ہوتے تھے سب کا ایسا جواب دیا کہ مسئلہ آفتاب کی طرح کھل گیا۔ اس پر وہ بہت ہی خوش ہوئے۔ میں نے اُن سے یہ بھی کہا کہ دیکھو اگر ہمارے حضرت سے کبھی ملنے کا اتفاق ہو اور گفتگو کا سلسلہ چلتے چلتے اس مسئلہ تک پہنچ جائے اور حضرت تم سے اس کی شرح بیان کرنا چاہیں تو اپنی ناواقفیت ظاہر کرنا اور ایسے بنجانا جیسے کبھی سنا ہی نہیں ہے چنانچہ انہوں نے مجھ سے اس کا عہد بھی کر لیا۔ اس کے بعد میں اسی روز حضرت ممدوح سے ملا تو سب سے پہلی بات آپ نے یہی فرمائی کہ فلاں سید سے تم نے یہ گفتگو کی اور وہ مسئلہ بھی ذکر فرما دیا۔ میں نے عرض کیا ہاں حضرت ٹھیک ہے مگر میری نیت خیر ہی کی تھی کہ حضرت کی زبان سے اور کچھ زائد معلوم ہو جائے گا نہ یہ کہ حضرت کا امتحان لینا تھا۔ اس کے بعد میں حضرت کی خاطر مبارک کوٹھو لتار ہا کہ رخصتا خواستہ گرائی تو نہیں آئی، مگر الحمد للہ ایسا صاف پایا جیسے شخص کا نکلا ہوا دودھ۔ غرض آپ کے کشوفات اتنے بے شمار ہیں کہ ان کے جمع کرنے کو ایک مستقل تالیف کی ضرورت ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس کتاب میں جو کچھ مذکور ہے وہ سب ممدوح کی کرامات ہی ہیں۔ آپ کی ایک بڑی کرامت یہ تھی کہ آپ کا کلام دلوں میں اثر کرتا تھا۔ ایک دن ایک عالم آپ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ حضرت دعا فرمائیے حق تعالیٰ میرے دل میں دوسو سوں کا آنا بند فرما دے۔ فرمایا میاں دوسو سے ہمیشہ راستہ کی ناواقفیت کے سبب آیا کرتے ہیں کہ ایک شخص کسی شہر کے جانے کا قصد کرے اور اُس کے راستہ سے ناواقف ہو تو ظاہر ہے کہ اس کے خیالات میں انتشار ہوگا۔ طبیعت کبھی یہ کہے گی کہ راستہ ادھر کو ہے۔ لہذا وہ اس طرف چل پڑے گا، اور کبھی کہے گی کہ نہیں بلکہ راستہ ادھر کو ہے لہذا وہ ادھر کو چلنے لگے گا۔ غرض متحیر رہے گا کہ کدھر کو جائے۔ اور جو شخص راستہ سے واقف ہوگا اُس کا قلب اس سے محفوظ ہوگا اور وہ اطمینان کے ساتھ چلتا رہے گا۔ پس دنیا و آخرت کا راستہ چونکہ ذات حق ہے اس لئے جس نے اللہ کو پہچان لیا کہ واقعی اس کی کیا شان ہے اور کیا استحقاق، اس نے دونوں جہان کی دولت پائی اور اس کو پُر لطف زندگی عطا ہوئی اور جو اُس سے ناواقف رہا اس کی حالت برعکس ہوئی۔ آپ کی اس تقریر سے حق تعالیٰ نے مجھ پر یہ فضل فرمایا کہ جب طبیعت کسی ضرورت کے پورا کرانے میں غیر اللہ کی طرف جاتی تو ایک اندرونی کشش اس کو پھیر کر اللہ کی طرف لے آتی تھی کہ قاضی الحاجات کا استنام چھوڑ کر محتاجوں کا دامن کیوں پکڑتا ہے، اللہ سے دعا ہے کہ اس معرفت کو اتمام پر پہنچائے۔ میں نے آپ کو یہ فرماتے سنا کہ مومن جب سوتا ہے تو اللہ ہی کے دھیان میں سوتا ہے اور جب جاگتا ہے تو اللہ ہی کے



دھیان میں جاگتا ہے۔ یہ کلام سُنکر اس کا مفہوم میرے قلب میں اُتر گیا۔ اور الحمد للہ کہ سونے کی حالت میں بھی اللہ میرے دل میں ہوتا ہے (ہم اس کا مطلب سمجھنے سے بھی عاجز ہیں۔ کیونکہ اللہ کی محبت و عظمت سے ہمارا دل خالی ہے۔ ہاں دنیوی ترقیات سے اگر سبق لیں کہ بعینہ یہی حال ہمارا جاہ و مال دنیا کے ساتھ ہے کہ اُسی کے خیال میں سوتے ہیں اور اُسی کے خیال میں آنکھ کھلتی ہے۔ جس کی وجہ سے بحالت خواب بھی دنیا ہمارے دلوں میں بیٹھی ہوئی ہے تو شاید کچھ سمجھیں اور آنکھیں کھلیں) ایک مرتبہ فرمایا کہ بندہ کا خیال جب غیر اللہ کی طرف جاتا ہے تو اللہ جل جلالہ سے بے تعلق بن جاتا ہے۔ پھر کوئی تو ایک پھر میں رہتا ہے اور اللہ کی طرف لوٹ آتا ہے اور کوئی دوپہر بعد اور کوئی اس سے کم مدت میں اور کوئی اس سے زیادہ مدت میں، لہذا ہر بندہ کو غور کر لینا چاہیے کہ اس کے قلب کا اللہ جل جلالہ کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ آپ کا یہ کلام الحمد للہ میرے قلب کی لگام بن گیا کہ جب بھی اس نے غفلت کے سمندروں کی طرف قدم بڑھایا تو اس کلام نے (آزادی پسند گھوڑے کی لگام بن کر) اس کو کھینچ لیا کہ مولیٰ کریم سے قطع تعلق کر کے کہاں ڈوبنے جاتا ہے) ایک بار آپ نے فرمایا کہ بندہ کو اللہ کی معرفت نصیب نہیں ہوتی جب تک کہ سید الوجود صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت نصیب نہ ہو جائے اور شیخ کی معرفت نصیب نہیں ہوتی جب تک کہ تمامی بشر اس کی نگاہ میں فنا نہ ہو جائیں کہ نہ کسی پر نظر جائے نہ خیال لہذا سب پر نماز جنازہ پڑھو اور ان کی طرف سے توقع و انتظار کو اپنے دل سے نکال دے۔ آپ کے اس کلام سے حق تعالیٰ نے مجھ پر بڑا فضل فرمایا کہ ہر قسم کی خیر و خوبی نصیب ہونے کا یہی وسیلہ بنا۔ اور اس کلام کی شرح اتنی طویل ہے کہ اس کے پیچھے پڑیں تو بہت دُور نکل جائیں۔ اس لئے جتنا ذکر کرو یا اُسی پر اکتفا کرتے ہیں (فص) چونکہ تمامی حسنات دین و دنیا بلکہ سچ پوچھو تو ایمان کی اصل بھی یہی معرفت ہے اس لئے اپنی فہم نارسا کے موافق بقدر ضرورت تشریح کرتا ہوں۔ حج کا مسافر جب شوق لقار رب میں وطن کو الوداع کہتا اور بندرگاہ پر پہنچتا ہے تو سب سے پہلے جہاز کی تلاش کرتا ہے کہ گودی میں جاپان و جرمن ہر ملک کو جانے والے جہاز کھڑے ہوتے ہیں۔ اور حیب پوری چھان بین سے پتہ چلا لیتا ہے کہ جہاز جانے والے جہازوں کا ٹکٹ گھریہ ہے تو اپنی مناسب طبع، موسم و وقت اور جہاز کی رفتار و وزن وغیرہ کی کُرید و تحقیق کے بعد اس پر آ بیٹھتا ہے۔

گویا نئی دنیا میں آنا اور سید اللہ مجرّہ لوہے سے ملتا ہوا اپنی جان و مال کو کپتان کے سپرد کر دیتا ہے یہاں اس کا مزاج بھی بدل جاتا ہے کہ بُری سطح پر جن چیزوں کی رغبت تھی اُن سے وحشت ہونے لگتی ہے اور احکام بھی بدل جاتے ہیں کہ پہلے ہر طرح کی کُرید اور ہر دلال سے بحث مباحثہ تھا کہ دھوکا نہ کھا جائے مگر اب اس کو یہ سوال



کرنے کا بھی حق نہیں کہ جِدہ کب پہنچاؤ گے، اس لئے کہ یہ کام خدا کا ہے نہ کہ نا خدا کا۔ یہ تمثیل ہی شیخ طریقت کی۔ آخر حق تعالیٰ کے محض فضل سے طوفان و تلاطم اور قدم قدم پر ڈوبنے کے خطرات سے بچا ہوا حبيب حرم الہی میں قدم رکھتا ہے تو اس کو ہر امن و امان کا شاہی پروانہ ملتا اور وہ انشراح نصیب ہوتا ہے جو تمام سفر کی کلفتوں کو محو کر دیتا ہے۔ بیت اللہ پر نظر پڑتی ہے تو اس کے سیاہ پردے اس کی آنکھوں کی پٹکی بن کر اس کو متوالا بنا لیتے ہیں کہ کبھی چومتا ہے اور کبھی سجدہ میں گرتا ہے اور کبھی دامن پکڑ کر چپٹا ہے اور گر کر اٹا ہے اس کی ایک ایک نماز ایک ایک لاکھ بنا دی جاتی اور ایک ایک نگاہ محبت پر دس دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں وہ خوب سمجھتا ہے کہ یہی لقیعہ ناف ارض اور وہ پہلی ہستی ہے کہ ساری زمین با اس طول و عرض اپنے وجود میں اُسی کی مرہون احسان ہے۔ ہر چند کہ پتھروں کی چٹائی کا ایک سادہ کوٹھا ہے مگر دنیا بھر کے مریض محلوں سے زیادہ پیارا اور بزرگ ترین ہے کہ دوسری طرف رُخ کر کے کوئی نمازوں میں فنا بھی ہو جائے تو مردود ہے ایک سجدہ بھی مقبول نہیں۔ یہ تمثیل ہے وجود سید الوجود صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ اب اس کو پُصراطِ حیلے باریک راستہ پر چلنا ہے کہ جہاں یہ سمجھتا ہے یہی مقام جلالت گاہ حق ہے کہ جو کچھ ملے گا اسی آستانہ سے ملے گا۔ وہیں یہ بھی یقین کئے ہوئے ہے کہ خانہ خدا ہے خود خدا نہیں، اور بیت اللہ ہے، ذات اللہ نہیں حتیٰ کہ اس کو اللہ سمجھ کر ایک بھی سجدہ کروں تو وصال بدل جائے گا۔ ہجر و فراق سے۔ اس لئے یوم ولادت جیسی معصومیت و مغفرت لینے کے لئے ابھی ذرا سا سفر اور کرنا ہے اور لباس ہوائے نفس اتار کر مردہ کی کفنی پہنے ہوئے دیوانہ وار چنچتے چلاتے اُس ہو کے میدان میں جانا ہے جس کا نام عرفات ہے، جہاں نہ کوئی بستی ہے نہ کسی درخت کا سایہ، اور نہ کوئی مکان ہے نہ دکان۔ وحدانیت محضہ و بے نیازی خالصہ ہے۔ ہاں اس دائرہ میں قدم رکھتے ہی مقصود سفر پورا اور شاہی دربار سے حاجی کا خطاب عطا ہوگا۔ مگر اس سفر کا مژور و مطوّت اور محافظ راہرو وہی بیت اللہ ہوگا کہ حج مبرور کی ابتدا و انتہا اسی کا طوافِ قدوم و طوافِ افاغہ اور طوافِ الوداع ہے۔ یہ ہے تمثیل معرفت الہیہ کی کہ وصول الی اللہ چاہتا ہے تو اس ترتیب سے سفر کرے ہر ترجمہ۔

میں نے اپنے بعض برادران طریقت سے درخواست کی تھی کہ حضرت محدوح کی کچھ کرامات جو انہوں نے دیکھی ہوں مجھے لکھ کر بھیج دیں۔ چنانچہ چند تحریرات آئیں اور ان کو میں نے حضرت شیخ پر پیش کیا جب حضرت نے ان کی تصدیق فرما دی تب درج کتاب کرتا ہوں۔ مولانا محمد بن احمد زبیری کا بیان ہے کہ میرا قلب تجارت و زراعت کے دنیوی دھندلوں میں بہت پھنسا ہوا تھا۔ اسی جدوجہد میں لگا رہا کہ نہ دن کو چین تھا نہ رات کو آرام۔ دنیا ہی دنیا مقصود تھی اور آخرت کا منظر ایک خواب خیال بن گیا تھا۔ حالانکہ مجھے حق تعالیٰ نے زمرہ علماء میں بنایا اور علم نصیب فرمایا تھا۔ میری چختہ نیت تھی کہ مجھے



محکمہ شہادت کی افسری ملے یا کسی شہر کا عہدہ قضا۔ مگر حق تعالیٰ نے مجھ پر فضل فرمایا اور حضرت ممدوح کی خدمت میں پہنچا دیا جنہوں نے میرے قلب کی گندگیاں دھو دیں۔ جب میں بیعت ہوا اور حضرت نے میرے مرض لا علاج کو دکھیا تو سب سے پہلے حکم دیا کہ کھیتی کے جتنے بھی بیل میرے پاس ہیں سبکو بیچ دوں اور فلاں کام کروں۔ اور وہ سبب معاش کا ایک مشغلہ تھا کہ اسباب دنیویہ کے منافی بھی نہ ہوا۔ درحقیقت مقصود یہ تھا کہ کھیتی کی محبت میرے قلب سے مٹائیں کیونکہ کسب دنیا جائز ہے نہ کہ حب دنیا۔ چہ جائیکہ عشق دنیا، حضرت کی حسن تدبیر پر صد آفرین کہ جس گندی حالت سے مجھے نکالنا چاہتے اس طرح نکال لیا کرتے تھے کہ مجھے خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ بلکہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب پہلے سے زیادہ راحت و لذت میں ہوں اور حالت سابقہ کی گندگی و ظلمت آنکھوں کے سامنے ظاہر ہو جاتی تھی۔ اور یہی میرے اور تمامی برادران طریقت کے ساتھ حضرت کا طریق تربیت رہا کہ جب کسی کو بُری حالت پر دیکھتے تو صراحتاً کہ بھی نہ فرماتے کہ اس کو چھوڑ، یا یہ کہ نہ چھوڑنے پر لعن طعن فرما دیں، یا تعلق قطع کر دیں، کہ ایسی صورتوں کا نتیجہ عموماً اچھا نہیں نکلتا۔ کیونکہ نفس اس کا انکار کرتا اور بسا اوقات ضد اور مخالفت کا داعی بن جاتا، لہذا شفقت و نرمی برتنے بلکہ اس کی حالت کی کسی درجہ میں تعریف فرما دیا کرتے تھے۔ پھر اس کو آہستہ آہستہ اوپر چڑھاتے کہ وہ خود ہی اپنی حالت قبیح سمجھنے لگتا اور اپنے سینہ میں ایک انشراح و تازگی محسوس کیا کرتا تھا۔ غرض بیلوں کی فروختگی کے بعد چند ہی روز گزرے تھے کہ کھیتی کی محبت میرے دل سے نکل گئی بلکہ اس سے کراہت معلوم ہونے لگی۔ اس کے بعد مجھے کتابیں بیچ دینے کا حکم فرمایا اور دوسرا کام بتایا کہ فلاں کام کروں جسے میرا دل پسند بھی کرتا تھا اور نفس بھی اس سے خوش تھا۔ اس کے بعد لوگوں سے مال کی طمع اور حرص نے میرا دامن پکڑا کہ اہل ثروت کی طرت نظر جاتی اور انتظار رہتا تھا کہ اگر نذرانے اور ہدایا پیش کریں گے پس حضرت ممدوح نے اس سے بھی اور چڑھا دیا۔ اور اب الحمد للہ لوگوں کے مال کی طمع تو درکنار کسی نفع یا ضرر کے متعلق مخلوق پر نظر ہی نہیں جاتی راصل کرامت تو یہ ہے کہ نیابت ہے مرشد عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی، رہے کشف کے قصے سو چند وہ بھی سُن لو۔ شروع تعلق میں ایک دن حضرت نے مجھ سے پوچھا تمہارے پاس گھی بھی ہے؟ میں نے کہا جی حضرت ہے۔ فرمایا کچھ ہمارے لئے لے آنا۔ میرے ایک پر بھاٹی نے کہا ممکن ہے باقی ماندہ گھی ارزانی کے موسم تک نہ چل سکے۔ میں نے کہا ہاں صحیح ہے حضرت نے فرمایا اچھا فلاں وقت تک بھی چل سکے گا؟ میں نے کہا جی ہاں۔ فرمایا جتنا اس سے زائد ہو وہ لے آنا چنانچہ میں نے آیا اور جب وہ وقت آیا (جس پر گھی کو ختم ہونا تھا) تو ایک شخص لوجہ اللہ مجھے گھی دے گیا جہاں میرا گمان بھی نہ گیا تھا۔ اور یہ گھی مجھے ارزانی کے موسم تک کو کافی ہو گیا۔



ایک مرتبہ میں نے اپنے غلہ کی فروختگی کے متعلق آپ سے مشورہ کیا تو فرمایا فلاں مہینہ کی پانچ تک سب بیچ دینا۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ پانچ اور چھ تاریخ کو خوب بارش ہوئی اور غلہ بیکارزاں ہو گیا۔ مگر میں پہلے ہی بچ کر خوب نفع اٹھا چکا تھا۔

میری دو بیویاں تھیں جن میں ایک کو حمل تھا۔ حضرت کی زیارت کو گیا تو اس کا تذکرہ آگیا فرمایا لڑکا پیدا ہوگا جس کا نام احمد ہوگا۔ میں نے آکر بیوی سے ذکر کیا اور ایسا ہی ہوا جیسا حضرت نے فرمایا تھا۔ اس کے بعد دوسری بیوی کو غیرت آئی کہ سوکن کے تو لڑکا ہوا اور میرے لڑکی ہے جو کہ شیر خوار تھی۔ لہذا اُس نے قبل از وقت بچی کا دودھ چھڑا دیا تاکہ حمل قرار پاسکے۔ میں نے اس پر اس کو ملامت بھی کی کیونکہ بچی کے متعلق خطرہ تھا مگر اُس نے کہا کہ میں حاملہ ہوں اور حمل کا دودھ بچی کو نقصان دیتا اس لئے قبل از وقت چھڑایا ہے) اس پر اُس نے قسم بھی کھائی۔ جب میں حضرت کی زیارت کو گیا تو اس قصہ کا بھی تذکرہ کیا۔ فرمایا جھوٹی ہے حمل و مل کچھ نہیں۔ میں نے واپس آکر کرید کی تو واقعہ ہی تھا جو حضرت نے فرمایا۔ تین مہینہ گزرنے کے بعد جب میری حاضری دوبارہ ہوئی تو حضرت نے پوچھا کہ بیوی کو حمل ہے؟ میں نے حضرت مجھے پتہ نہیں۔ فرمایا ہاں پندرہ دن کا ہے اور انشاء اللہ لڑکا ہوگا۔ اس کا نام میرے نام پر عبد العزیز رکھنا کہ وہ انشاء اللہ میرے ہی مشابہ ہوگا۔ میں نے واپس ہو کر بیوی کو بشارت سنائی اور وہ بہت خوش ہوئی۔ چنانچہ لڑا پیدا ہوا اور درحقیقت وہ بدن اور صورت میں حضرت کے بہت مشابہ تھا۔ پھر پہلی بیوی دوبارہ حاملہ ہوئی تو فرمایا انشاء اللہ لڑکی ہوگی اور اس کا نام میری ماں کے نام پر (فارحہ) رکھنا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

ایک دن میں آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور آپ مجھ سے خوش طبعی فرما رہے تھے کہ ارشاد فرمایا کیوں جی کیا تم نے فلاں کام کیا تھا۔ میں نے کہا نہیں۔ کیونکہ میرا گمان یہی تھا کہ میں نے نہیں کیا۔ اس پر ہنسے اور فرمایا ذرا سوچو۔ میں نے قسم کھائی کہ حضرت واللہ میں نے نہیں کیا۔ حضرت نے پھر وہی فرمایا اور میں نے پھر قسم کھائی مگر جو تھی دفعہ جو میں نے غور کیا تو واقعی پندرہ برس ہوئے بہت دور شہر میں جو کہ فاس سے سات منزل ہے مجھ سے وہ گنلہ صادر ہوا تھا۔ تب شرم کے مارنے مجھے پسینہ آگیا۔ حضرت نے میری یہ حالت دیکھ کر فرمایا اب بھی قسم کھاؤ گے؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت نہیں اور آپ کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ پھر میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ کو اس کی خبر کیے ہو گئی۔ فرمایا اللہ میاں سے کیا چیز چھپ سکتی ہے۔ اور اسی طرح جس کو بھی اللہ اپنے اسرار و غیبات پر مطلع فرمادے۔ اس کے بعد آپ نے اور چند خطاؤں پر مجھے مطلع کیا جو مجھ سے آگے مجھے سرزد ہوئی تھیں اور میں نے آپ کے ہاتھ پر سب سے توبہ کی۔ ایک دن میں آپ کے سامنے کے رخ پر بیٹھا ہوا تھا اور آپ نے داہنے ہاتھ پر ٹیک لگائے خواب بیداری کے درمیان لیٹے ہوئے تھے کہ میرے قلب پر ایک برا خطرہ



گذرا۔ فوراً آپ نے آنکھیں کھول دیں اور فرمایا کیا کہا تم نے؟ میں نے کہا حضرت میں نے تو کچھ نہیں کہا۔  
فرمایا اپنے دل میں تم نے کیا کہا؟ مجھے بڑی شرم آئی اور میں نے توبہ کی۔

ایک مرتبہ خلوت میں بیوی کی شرمگاہ پر میں نے قصداً نظر ڈالی۔ جب زیارت کے لئے آیا حالانکہ میرا مکان آپ سے دو منزل دور تھا۔ مگر بطریق مزاح فرمانے لگے کیا فرماتے ہو اے علماء دین بیوی کی شرمگاہ پر نظر ڈالنے کے متعلق۔ میں نے علماء کا قول ظاہر کیا (کہ مکروہ ہے) فرمایا تم ایسا کرتے ہو؟ میں نے کہا "نہیں" اس لئے کہ واقعہ بالکل بھول گیا تھا۔ فرمایا حتیٰ کہ نلاں شب میں یہی نہیں؟ تب مجھے یاد آیا اور شرمایا گیا۔ فرمایا پھر ایسا نہ کرنا کہ انشاء اللہ یہ نظر کعبہ پر ڈالیں اور اللہ کیا پاکیزہ طریق نصیحت ہے کہ جو نگاہ پاک خانہ خدا پر ڈالنے کے لئے اللہ نے بخشی ہو وہ محل بول پر ڈال کر گندی کیوں بنائی جائے

ایک مرتبہ میری دونوں بیویاں ایک ہی گھر میں تھیں کہ ایک کو اپنے گھر میں رہنے سے کوئی عذر مانع ہوا تھا۔ مکان میں چار پلنگ تھے دو پر وہ دونوں الگ الگ بیٹ گئیں اور تیسرے پر میں تنہا لیٹ گیا اور چوتھا خالی رہا۔ شب میں ایک بیوی سے ہمبستر ہوا۔ حسب معمول جب زیارت کے لئے حاضر ہوا تو مزاح کے طور پر حضرت نے فرمایا کیا فرماتے ہیں علماء شریعت در بیویوں کو ایک گھر میں جمع کرنے اور دونوں سے صحبت کرنے کے متعلق؟ میں سمجھ گیا کہ میرے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ لہذا عرض کیا کہ حضرت آپ کو کیسے خبر ہوئی۔ فرمایا اور چوتھے پلنگ پر کون سویا تھا؟ میں نے کہا حضرت میں نے ہمبستری کی ہر ایک سے اُس وقت جبکہ دوسری سو رہی تھی۔ میں نے کہا حضرت بیشک مفتی بہ قول یہی ہے اور میں اللہ سے توبہ کرتا ہوں (چونکہ ان واقعات میں کشف ہی نہیں بلکہ ارشاد و اصلاح ہے اُن مخفیات کی جن پر نہ کوئی مطلع ہوتا ہے نہ اس کے متعلق شرعی حکم یا لور و ظلمت کا سوال کیا جاتا ہے۔ اس لئے یہ چند قصے بضرورت بیان کر دیئے۔ ان کو گندا کہہ کر اعتراض نہ کرنا)

ایک مرتبہ چند برادران طریقت کے ساتھ بغرض زیارت حاضر ہوا۔ جب ہم رخصت ہو کر چلے تو نہ ہمارے پاس کوئی ہتھیار تھا نہ چوروں کی مدافعت کا کوئی سامان۔ اتفاق سے لبتی کا راستہ بھول گئے اور رات کو ایک خطرناک بیابان میں ٹھہرنا ہوا جو کہ راہ زنون کا پڑاؤ تھا۔

سب رفقاء تو سو گئے مگر میں اور میرا ایک ساتھی دو شخص جاگ رہے تھے کہ قریب ہی ہمیں شیر کی آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے رفیق سے کہا کہ دوسروں کو جگامت کہ وحشت کھائیں گے۔ کیونکہ اُن میں بعض ایسے ہیں جن کو ایسی صورت کبھی پیش نہیں آئی۔

بس دعا کرو کیا عجب ہے حق تعالیٰ اس کا منہ دوسری طرف پھیر دے۔ جب صبح قریب ہوئی تو ہم اُٹھے اور وہاں سے چل دیئے۔ پاس ہی ہم کو ایک خرگوش پڑا نظر آیا۔ جیسے



اس کی رُوح ابھی نکلی ہے۔ کچھ دنوں بعد جب پیر بھائیوں کے ساتھ حضرت کی زیارت کے لئے آیا تو رات بھر کا جاگا ہوا تھا کیونکہ درندوں سے حفاظت کے لئے پہرہ دیتا رہا تھا اس لئے حاضر خدمت ہو کر میں نے عرض کیا کہ حضرت میں ذرا سو رہوں کہ تمام رات کا جاگا ہوا ہوں فرمایا یہ کیوں؟ میں نے عرض کیا جنگلی جانوروں کی خاطر پہرہ دیتا رہا۔ فرمایا اور تمہارے پہرہ دینے سے ہوتا کیا؟ اور فلاں شب (یعنی شیر کی آہٹ والی رات) میں اگر لیٹرے تم پر آپڑتے تو تم کیا کر لیتے؟ میں نے عرض کیا حضرت اس کا کیا مطلب؟ فرمایا جب تم فلاں پہاڑی کے درہ میں پہنچے تھے تو تم کو تین آدمی ملے تھے۔؟ میں نے کہا جی ہاں۔ فرمایا جب وہ پہاڑ پر چڑھے تو وہاں چار آدمیوں کو اور بیٹھا پایا جو کہ لوٹنے کے لئے مسافروں کا انتظار دیکھ رہے تھے۔ ان تینوں نے ان کو بھی تمہاری اطلاع کر دی اور اب ساتوں ڈاکو تمہارے پیچھے لگ گئے۔ کہ دیکھیں رات کہاں گزارتے ہو۔ جب تم رات کو اتر پڑے تو وہ تمہارے سو جانے کا انتظار دیکھتے رہے۔ آخر جب انہوں نے سمجھا کہ تم سب سو گئے تو انہوں نے تمہاری طلب میں قدم بڑھائے۔ مگر دیکھا کہ تمہارے قریب شیر کھڑا ہے۔ کہنے لگے کہ کیا کرنا چاہیے اگر شیر سے لڑتے ہیں تو یہ سب لوگ جاگ جائیں گے۔ اور اگر ان کی طرف چلیں تو راستہ میں شیر حائل ہے۔ آخر تم کو چھوڑ گئے اور دوسرے قافلہ کی طرف رُخ کیا۔ مگر جب وہاں بھی کچھ نہ ملا تو پھر دوسری جانب سے تمہاری طرف آئے۔ لیکن اس جانب بھی ان کو شیر نظر پڑا اور وہ یوں سمجھے کہ یہ شیر دوسرا ہے۔ چنانچہ ایک نے کہا یہ کون لوگ ہیں کہ ہم ایک سمت سے آئے تو دیکھا شیر ان کی حفاظت کر رہا ہے اور پھر دوسری سمت سے آئے تو ادھر بھی دیکھا کہ شیر ان کی حفاظت کر رہا ہے اس راز کی حقیقت کو سمجھا بھی چاہا مگر حق تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی اور وہ نہ ادراک کر سکے کہ کرامت ہے اولیاء اللہ کی اور خدام و زائرین غوث کی حفاظت ہے من اللہ ورنہ ڈکیتی سے تائب ہو جاتے) میں نے عرض کیا اور وہ خرگوش کیسا تھا؟ فرمایا شیر میں بنی آدم کی طرح ایک نخوت کا مادہ ہے اور جس طرح انسان کے منہ پر مکھی بٹھتی ہے تو وہ اس کو دفع کرتا ہے اسی طرح وہ شیر بیٹھا ہوا تھا کہ خرگوش سامنے آگیا جس نے شیر کو دیکھا نہیں تھا۔ لہذا شیر نے اس کو مار دیا۔ ایک دن میں آپ کے مکان پر تھا آپ تو نیچے کچھ کام کر رہے تھے اور میں اوپر کھڑا ہوا اپنے سامنے کی چھت پر نظر ڈال رہا تھا۔ دفعۃً ایک عورت اس چھت پر چڑھی جس کے چہرہ پر مجھے سُرخ دہکتی ہوئی نظر آئی۔ میں اس کو غور سے تنکے لگا کہ معلوم کروں یہ سُرخ خون کی ہے یا رنگ کی میری اس پر نظر پڑی ہی تھی کہ شیخ نے مجھ پر نظر ڈالی اور فرمایا اللہ سے ڈرو یہ بد نظری اور میرے سامنے؟ اور پہننے لگے۔ ایک مرتبہ خوردنوش کا غلہ وغیرہ خرید کر رکھ لینے کا میں آپ سے مشورہ لینے لگا فرمایا کوئی چیز نہ خریدو کہ جتنا موجود ہے فصل تک کے لئے کافی ہے البتہ گھی



خرید لو کہ تمہارے پاس اتنا ہے جو موسم تک نہ چل سکے گا۔ میں نے کہا حضرت نے صحیح فرمایا مگر فلاں عورت کا میرے پاس امانت رکھی رکھا ہے اور ایک دن وہ آئی تھی تو میں نے اس سے اپنے پاس گھی کم ہونے کا ذکر کیا تھا اُس نے جواب دیا کہ گھی میرے پاس بہتیرا ہے جتنا بھی تمہیں درکار ہو لے لینا اگرچہ میں یہ نہیں سمجھا کہ اس کا مقصود لوجہ اللہ دینا تھا یا قرض۔ مگر بہر حال میرا خیال ہے کہ وہ سچی ہے۔ اور بوقت ضرورت اس سے گھی مل جائے گا۔ آپ نے ذرا دیر سکوت فرمایا اور کہا کہ گھی تو ضرور خرید لو۔ اور دوبارہ سہ بارہ پھر یہی فرمایا۔ میں سمجھ گیا کہ عورت اپنی بات کو پورا نہ کرے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جب گھی بیچنے کا وقت آیا تو اُس نے میرے ہی گھر بیٹھ کر اپنا سارا گھی فروخت کر دیا۔ حالانکہ اُسے میری حالت رفق و تنگدستی معلوم تھی۔ اس کے بعد تو حق تعالیٰ نے شیخ کی برکت سے مجھے توقع سے بھی بہت زیادہ فراخی عطا فرمادی۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے کچھ رقم مجھے قرض دی اور بقیہ میرے پاس امانت رکھ گیا۔ چند روز بعد اپنی امانت اور قرض دونوں رفتیں وصول کرنے کے لئے آیا مگر میرے پاس اُس وقت پیسہ بھی نہ تھا کہ دیدوں اور کوئی ایسی چیز میری تھی کہ جسے بیچ کر قرض ادا کروں۔ اور میرا خیال تو یہ تھا کہ اس کو مدت تک ضرورت نہ ہوگی۔ اس لئے پہلے سے کچھ فکر و اہتمام بھی نہ کیا۔ غرض میں نے اُس کی امانت نکانی اور دل میں حضرت شیخ کو یاد کرنے لگا کہ کاش قرض کا تذکرہ نہ کرے۔ چنانچہ وہ خاموش رہا اور اب تک بھی کہ چھٹھیسے گزر چکے ہیں اُس نے مجھ سے اس کا ذکر نہیں کیا حالانکہ وہ آیا ہی اس لئے تھا کہ دونوں رقم لے کر جائے۔

ایک مرتبہ ایک اجنبی عورت کے ساتھ مجھے ایسا واقعہ پیش آیا جو شرعاً ناپسندیدہ تھا اگرچہ خفیف تھا ایک دن میں آپ کے پاس بیٹھا ہوا عورتوں ہی کے متعلق آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ کہ نہ معلوم کس تقریب میں اس عورت کا بھی ذکر آگیا۔ فوراً ہی فرمایا میں تمہارے اور اس عورت کے درمیان ایک نیلیوں دورا دکھ رہا ہوں جو علامت ہے ظلمت و معصیت کی، ایسا کیوں ہے؟ مجھے اپنی حرکت یاد آگئی اور میں شرما گیا۔ حالانکہ اس قصہ کو تقریباً پانچ برس گزر چکے تھے۔ فقط۔

اسی طرح میرے دوست مولانا علی بن عبداللہ صباغی نے چند کرامتیں لکھ کر بھیجیں جنکو میں نے حراً حراً حضرت شیخ پر پیش کیا اور حضرت نے اُن کی تصدیق فرمائی۔ کیونکہ میری غرض یہ ہے کہ اس کتاب میں صرف وہی لکھوں جو اپنی آنکھوں سے دیکھا یا حضرت شیخ سے اپنے کانوں سے سنا ہے وہ لکھتے ہیں کہ آخر رمضان میں آپ کی زیارت کر کے جب میں واپس جانے لگا تو حضرت نے فرمایا بقرعید کے لئے ہمارے واسطے ایک منیڈھالانا۔ میں نے عرض کیا بہتر ہے چنانچہ جب عید قریب آئی تو میں نے دو منیڈھے خریدے اور انکو لیکر وطن سے روانہ ہوا۔ میرا ایک پر بھائی سے جنکا مکان راستہ میں نصف فاصل پر پڑتا تھا اور وہ اتفاق سے اس وقت حضرت کے پاس بیٹھے تھے حضرت نے فرمایا تھا کہ علی صباغی دو منیڈھے لیکر آئے گا اُن میں سے



ایک تم رکھ لینا اور عید میں قربانی کر دینا اور دوسرا ہمیں پہنچا دینا چنانچہ حب میں اُن کے مکان پر پہنچا تو انہوں نے حضرت کا ارشاد مجھے پہنچا یا۔ چونکہ میں اُن کو بارہا حضرت کی خدمت میں دیکھ چکا تھا اس لئے اُن کی بات کا مجھے یقین آگیا اور میں نے کہا بہتر ہے دونوں میں جو پسند ہو وہ لے لو۔ کہنے لگے کہ جو ادنیٰ ہو وہ ہم لیں گے اور جو اعلیٰ ہے وہ حضرت کے پاس جائے گا۔ چنانچہ دونوں میں جن کو اعلیٰ و بہتر سمجھا وہ ہم نے رکھ لیا اور ادنیٰ اُن کے حوالے کر کے وہاں سے روانہ ہو گئے۔ حضرت کے پاس پہنچے تو اس سے قبل کہ آپ اس کو دیکھیں فرمانے لگے فلاں صاحب نے اپنا کام بنا لیا کہ اعلیٰ تو رکھ لیا اور ادنیٰ تم ہمارے لئے لائے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت ہمیں تو یہی فریبہ اور اعلیٰ معلوم ہوا۔ ارشاد فرمایا ہاں اس کی اوجھ میں چربی ہے (جس سے موٹا معلوم ہوتا ہے مگر گوشت چکنا دوسرے ہی کا تھا) چنانچہ عید میں قربانی ہونے پر دونوں منیڈھے ایسے ہی نکلے۔ جیسے حضرت نے فرمایا تھا۔

اسی سفر میں یہ قضہ بھی پیش آیا کہ ایک منیڈھا پیر بھائی کو دے کر حب ہم چلنے لگے تو فکر ہوا کہ دوسرے کو لے کر کیسے چلیں۔ اونٹوں پر بھی اس کو لانا مشکل، اور پیدل بھی اس کے ساتھ چلنا دشوار کہ بھینٹ اور منیڈھے کو تنہا چلنا بہت اکھٹا ہے، مگر اللہ پاک نے سامان مہیا فرما دیا کہ بکریوں کا ایک گلہ فاس ہی کو جانے والا مل گیا۔ چونکہ ہم سب سواریوں پر تھے اور صرف میرا علاقہ بھائی پیدل تھا اس لئے ہم نے اس کو منیڈھے کے ساتھ چھوڑا کہ گلہ کے ساتھ منیڈھے کو لے کر آجائے۔ چنانچہ وہ ہم سے ایک دن بعد پہنچا جب وہ حضرت کے سامنے آیا تو حضرت نے فرمایا اچھا تم ہمارے لئے گوسفند لائے اور ہم نے تمہیں فرزند دیا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت یہی مراد اس کی بھی تھی۔ اور واقعہ یہ تھا کہ اس کے نکاح کو پندرہ برس ہو چکے تھے مگر اولاد نہیں ہوتی تھی حتیٰ کہ اس پر بیوی بانج ہوئے کا الزام لگاتی تھی اس لئے اس کو اولاد کا بے حد شوق تھا۔ منیڈھے کو باندھ کر حب ہم اپنی قیامگاہ کو اور حضرت ہم سے رخصت ہو کر اپنے گھر تشریف لے جانے لگے تو رات کا وقت تھا۔ چراغ کی روشنی میں آپ کی نظر میرے بھائی پر پڑی تو فرمایا میرے قریب آؤ۔ اس کے بعد اس کی پیشانی کھول کر تین مرتبہ کچھ کلمات پڑھے اور فرمایا کہ بیچہ کا نام کیا رکھو گے۔؟ بھائی نے کہا حضرت ہی نام بھی تجویز فرمادیں۔ فرمایا اس کا نام رحال رکھ دینا۔ چنانچہ ہماری برادری بھر میں بھی کسی کا نہ تھا اور نہ آباؤ اجداد میں اس نام کا کوئی گذر تھا۔ حاضرین میں ایک شخص نے کہا بھی کہ یہ نرالا نام حضرت کو کہاں سے مل گیا۔ فرمایا اس وقت ذہن میں یہی آیا غرض جب ہم واپس وطن پہنچے تو بھاج کو حاملہ پایا۔ حالانکہ اس وقت تک گھر والوں کو بھی حمل کا علم نہ تھا غرض ولادت ہوئی اور لڑکا پیدا ہوا حضرت کے فرمانے کے موافق اس کا نام رحال رکھ دیا مگر وہ اس نرالے نام پر بہت متعجب ہوئے۔ کچھ دنوں بعد میرے ذہن میں آیا کہ شاید بیچہ زندہ نہ رہے چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ تین سال کا ہو کر دنیا سے رحلت



کر گیا۔ اور اُس وقت معلوم ہوا کہ حضرت نے اس کا نام اسی لئے رکھا تھا جو فرمایا تھا۔ اس کے بعد جو ماضی ہوئی تو حضرت نے بھائی سے فرمایا اُس دفعہ ہم نے تم کو رکھا دیا تھا اور اس دفعہ وہ بچہ دیں گے جو تمہارے پاس رہے گا اور رحلت نہ کرے گا۔

فے۔ حق تعالیٰ نے جس طرح ظاہری نظام عالم حکام و سلاطین کے ہاتھ میں دیا ہے اور گو وہ محض تنفیذ مقدرات کے وسائل و آلات ہیں کہ جو کچھ ہوتا ہے بحکم خدا ہوتا ہے، مگر اس کا ظہور ان کے ہاتھوں ہوتا ہے، اور محض اسی ظاہری توسط پر یہ کہنا صحیح ہے کہ پادشاہ نے فلاں کو جاگیر دی میں نے فلاں کو مکان دیا۔ اسی طرح اُن سے پہلے یہ نظام عالم باطنی طور پر اقطاب و اغواث کے ہاتھوں میں دیا ہوا ہے۔ کہ ملائکہ کی طرح امور تکوینی کی تنفیذ کے یہ حضرات آلہ کار ہیں کہ مشیت الہیہ کے ماتحت جب ہونے والی باتیں ان کی قلوب پر وارد ہوتی ہیں تو یہ ان کو واقع کرنے کا واسطہ بنائے جاتے ہیں، اور جس امر کا نہ ہونا تقدیر الہی میں طے ہوتا ہے اس کے واقع ہونے کی سعی و تدبیر ان کے ہاتھوں عمل میں آتی ہے۔ بلاشبہ ایسا سمجھو جیسے شاہی منشا و خواہش خواہ کسی کے عزل کے متعلق ہو یا نصیب کے اور عزت کے متعلق ہو یا ذلت کے اول وزراء کے واسطہ سے انجام پاتی ہے اور وزراء اس کی تنفیذ حکام متعلقہ کے ذریعہ کرتا ہے لہذا اسی توسط باطنی کی بنا پر ان حضرات الملہکاران قضا و قدر کا یہ کہنا صحیح ہوتا ہے کہ ہم نے تمہیں لڑکا دیا یا یہ کہ لڑکی عطا کی گویا عطا کردہ خداوندی کو کشف سے معلوم کر کے اظہار کیا اور امر مقدر کی تنفیذ کا واسطہ بن کر اس کو اپنی طرف منسوب کیا۔ جیسے شاہی خزانچی کسی کو ہزار روپیہ دیکر کہے کہ میں نے تم کو ایک تھیلی دی۔ درنہ ظاہر ہے کہ فرزند کا حقیقتہً دینا اگر کسی کے اختیار میں ہوتا تو رحلت کر نیوالے بچہ کو صاحبِ عمر بنانا بھی بدرجہ اولیٰ اس کے اختیار میں ہوتا۔ اور غوثِ وقت کو اس کا نام رحلت کنندہ رکھ کر تمام تبشیر کی ضرورت نہ ہوتی۔ خوب سمجھ لو تاکہ نہ توحید ہاتھ سے جائے نہ اولیاء کی محبت و عظمت قلب سے نکلنے پائے۔ واللہ اعلم۔

میں ایک دن اپنے ایک رفیق کے ساتھ شکار کو گیا۔ کھانا ہم نے صبح سویرے گھر پر کھالیا اور ساتھ کچھ د رکھا کیونکہ خیال تھا کہ رفیق بڑا شکاری ہے اور جلدی ہی والی ہو جائے گی مگر شکار نہ ملا اور میں گھومتے ہوئے بڑی دیر تک گئی بھونکے بتیاب کر دیا اور نام و پیمان ہوئے کہ کھانا ساتھ کیوں نہ لیا تھا۔ آخر پہاڑ کے نیچے سے ایک بھوکسی لکڑا آئے جب حضرت کی تیار کو حاضر ہوا تو فرمایا تم چار شنبہ کو شکار کے لئے کیوں گئے تھے اور پھر کھانا بھی ساتھ نہ لیا حتیٰ کہ تم کو ایک شخص ملا اور اُس نے تمہاری خرابی بھی ٹھنی مگر اس میں کچھ نہ پایا یہ بٹولنے والے خود حضرت شیخ تھے پھر تم بڑے بھوکے ہوئے گھر پہنچے غرض سارا قصہ بیان فرمایا اور ساتھ ہی اس جھگل کا پورا نقشہ کھینچ دیا بلکہ یہ بھی فرمایا کہ اُس پہاڑ پر پیالہ کی برابر ایک چشمہ ہے جس کا پانی باہر نہیں بہتا اور نہ اُس میں کمی ہوتی نہ بیشی۔ چونکہ میں نے وہ چشمہ کبھی دیکھا نہ تھا۔ کیونکہ پہاڑ کے



اوپر شکاری بھی بہت ہی کم چڑھتے تھے اس لئے واپس آکر تحقیق کی اور ایک شکاری سے اس کا پتہ لگا کہ  
 بعینہ حضرت کے فرمانے کے مطابق ہے۔ حضرت نے یہ بھی فرمایا تھا کہ لا الہ الا اللہ میں نے اور مولانا منصور  
 نے بارہا اس چشمہ کے پاس نماز پڑھی ہے کہ بلندی کی وجہ سے چوٹی پہاڑ پر وہ جگہ ہمیں بہت اچلی معلوم ہوئی۔  
 ایک مرتبہ حاضر ہوا تو اسی طرح ایک دوسرے مقام کا صحیح حال بیان فرمایا اور کہا کہ تم اس جگہ اپنے گھوڑے  
 کیوں باندھا کرتے ہو؟ وہاں تو ایک ولی مدفون ہیں خاص تمہارے گھوڑے کے پاؤں کے پاس۔ حالانکہ میں نے  
 سارے حصہ میں کہیں ایک قبر کا بھی نشان نہیں پایا نہ کسی سے کبھی سنا بلکہ گورستان وہاں سے نصف میل پر تھا  
 مگر حضرت نے فرمایا کہ تمہاری اس چراگاہ میں قبریں تو سات ہیں مگر جو قبر تمہارے گھوڑوں کے پاؤں کے قریب  
 ہے اس کا احترام نہ کو ضرور کرنا چاہیے کہ کوئی آڑ قائم کر کے قبر کی شکل بنادو۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے پوچھا  
 کہ حضرت وہ کون بزرگ ہیں؟ فرمایا وجہ اور تلمسان کے درمیان ایک بدوی قبیلہ کے باشندے تھے جو صباغات  
 میں رہا کرتے تھے اور لوگ ان کو ایک طالب علم سمجھتے تھے، ولی نہیں سمجھتے تھے وہیں ان کا انتقال ہو گیا اور  
 دفن کر دیئے گئے ہم نے وجہ اور تلمسان کے درمیان کے قبائل کا نام لینا شروع کیا اور حضرت انکار فرماتے  
 رہے حتیٰ کہ ہم نے بنو ریاح کا نام لیا تو حضرت نے فرمایا ہاں اسی قبیلہ کے تھے حالانکہ نہ حضرت (بظاہر اسباب)  
 ہمارے وطن سے واقف تھے نہ وجہ تلمسان سے۔ اور نہ ان کے مابین کی بدوی آبادیوں سے اور نہ کبھی ادھر کا  
 سفر کیا تھا۔ اس کے بعد فرمایا اگر دیکھنا چاہو تو کھدال لے کر اس جگہ کو کھود لینا تحقیق ہو جائے گی وہ جگہ تمہارے  
 صاحبزادہ کے گھر کی بائیں جانب باہر کے رخ اُس چبوترہ کے عین سامنے ہے جو چراگاہ کے دروازہ کی طرف  
 پڑتا ہے چنانچہ وطن آیا تو میں نے گھر والوں سے اس کا تذکرہ کیا اور پھاڑا لیکر جگہ کو کھودا تو بالکل حضرت  
 کے ارشاد کے موافق پایا۔ پھر میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ سات قبروں میں صرف اسی ایک قبر کی کیا خصوصیت  
 کہ دوسروں کا احترام ضروری نہ ہوا فرمایا ان کی روح (شہد کی طرح) آزاد ہے (کہ مدفن سے تعلق رکھتی اور  
 لیدھ وغیرہ سے تکلیف پاتی ہے) اور دوسروں کی روحیں (عام مومنین کی طرح) برزخ میں مقید ہیں اور زمانہ  
 قریب تین سو برس کے گزر لیا کہ عام قبور کا جو احترام شرعاً ضروری تھا وہ بھی کہیں گی و اندر اس کے سبب  
 اٹھ گیا) مجھے تسلی ہو گئی اور اشکال رفع ہو گیا۔ ایک مرتبہ حضرت کی زیارت کے لیے میرا چچا زاد بھائی۔  
 عکال میرے ساتھ آیا جو کہ میرا سالہ بھی ہوتا تھا۔ پہلی ہی مرتبہ آیا تھا اور اس کی بیوی حاملہ تھی اس کی نیت  
 یہ تھی کہ تنگدستی کے لئے دعا کرائے جن میں وہ مبتلا و پریشان تھا۔ جب سامنے پہنچا تو حضرت نے فرمایا کیا  
 تمہاری بیوی حاملہ ہے؟ عرض کیا جی۔ حضرت نے فرمایا کیا تم پسند کرتے ہو کہ تمکو لڑکی عطا ہو اور وہ رزق  
 لے کر آوے۔ اُس نے عرض کیا حضرت بڑی خوشی سے۔ فرمایا ہمیں بھی یہی پسند ہے۔ اچھا اس کا نام



کیا رکھو گے؟ اس نے کہا جو بھی حضرت تجویز فرما دیں۔ فرمایا اس کا نام خدیجہ رکھنا میرا بھائی بہت خوش ہوا کہ ولادت دختر اور وسعت معاش دونوں کو حضرت نے جمع فرما دیا کہ اُس کی یہی مراد بھی تھی۔ چنانچہ وطن آئے تو معلوم ہوا اُس کے گھر لڑکی پیدا ہوئی ہے پھر ساتویں دن اس کا نام حضرت کی تجویز کے موافق خدیجہ رکھا گیا تو لوگوں کو بڑا تعجب ہوا کہ برادری بھر میں یہ نام کسی کا نہ تھا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت نے خدیجہ نام کیوں تجویز فرمایا؟ ارشاد فرمایا کہ جس خوش نصیب کو بھی حق تعالیٰ نے فتح کبیر عطا فرمائی اور اس نے نکاح کرنے کا قصد کیا ہے تو ایسی عورت کی جستجو کی ہے جس کا نام خدیجہ ہو۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اُم المؤمنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے بڑی راحت ملی اور ان ہی کے پاس ہر قسم کی دنیوی و دینی خوبیاں آپ کو عطا ہوئیں۔ میری بھی تمنا ہے کہ حق تعالیٰ مجھے لڑکی عطا فرمائے تو اس کا نام خدیجہ رکھوں۔

مجھے نیند بہت آیا کرتی تھی اگر صبح صادق کے قریب آنکھ کھل جاتی تو بیوی سے مہیستر ہوا کرتا ورنہ سوتا ہی رہتا اور طلوع فجر کے بعد آنکھ کھلا کرتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ حاضر خدمت ہوا تو حضرت نے حاضرین سے فرمایا "فلاں شخص کے پاس جیب کبھی بھی ہم گئے تو اس کو سوتا ہوا پایا۔ یا بیوی سے مہیستری کرتے ہوئے" ایک شخص نے پوچھا کہ پھر حضرت اُس وقت میں سونا بہتر ہے یا مہیستری؟ فرمایا سونے سے تو مہیستری ہی بہتر ہے کہ مبارک وقت میں بیداری تو ہے مگر نماز کے اوقات میں مہیستر ہونے سے اگر حکم خدا بچہ پیدا ہوا تو وہ اپنے ماں باپ کا نافرمان ہوگا۔ چنانچہ پھر کبھی میں نے ایسا نہیں کیا۔ اس ارشاد میں کہ بادئات نماز مجامعت سے علق ہوگا تو بچہ عاق اور والدین کا کہنا نہ ماننے والا پیدا ہوگا۔ حضرت کی دوسری کرامت تھی کہ یہی علی بن عبد اللہ اپنی اولاد کے غیر مطیع ہونے کے ہمیشہ شاکی رہتے تھے اور ہم نے خود دیکھا کہ بعض وقت ان کے بچے بڑی بُری حرکتیں کر گزرتے تھے۔ مولانا علی کی دعا تھی کہ بار الہا مجھے حضرت شیخ کی محبت پر مرنا نصیب کیجیو اور قیامت کے دن حضرت ہی کی جماعت میں اٹھائیو۔ چنانچہ وہ قبول ہوئی کہ موت کا وقت قریب آیا تو ان کے قلب میں خیال پیدا ہوا کہ اب میرا وقت قریب آگیا ہے، وہ بیوی سے یہ کہہ کر کہ میں حضرت کی خدمت میں فاس جاتا ہوں تاکہ وہیں وفات پاؤں۔ صباغات چھوڑ کر اہل وطن سے رخصت ہو کر آستانہ شیخ پر پڑے اور چند ہی روز بعد بیمار ہو گئے حضرت نے ان کو وصیت کرنے اور لقاء رب کی تیاری کا حکم فرمایا اور اپنے گھر رکھ کر ان کی تیمارداری فرمائی کہ باہر خود حضرت اور گھر میں حضرت مخدومہ اور دیگر متعلقین تمامی وہ ضروریات انجام دیتے تھے جن کی بیمار کو ضرورت ہوتی ہے۔ آخر جب وقت اخیر آگیا تو حضرت دولت خانہ میں تھے اور یہاں پر مہمان خانہ میں کہ حضرت نے حاضرین سے فرمایا علی صباغی کو اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی زیارت ہوئی چنانچہ لوگ دریافت کرنے کے لئے اوپر چڑھ گئے تو دیکھا زبان بند ہو چکی ہے۔ مگر اس پر بھی حضرت شیخ کا مقولہ ان سے نقل کیا۔



جس کو انہوں نے سمجھا اور گردن کو حرکت دے کر اشارہ کیا کہ ہاں صحیح ہے اور منہ کھول دیا جیسے کوئی ہنستا ہے۔ اس کے بعد تھوڑی دیر مسکراتے رہے اور اسی حال میں روح پرواز کر گئی۔ میں نے حضرت سے سنا کہ فرماتے تھے۔ سید علی کو صباغات میں نوے برس رہ کر بھی وہ حالت نصیب نہ ہوتی جس پر ان کا دم نکلا ہے۔ اسی طرح ایک تحریر مولانا عبد اللہ بن علی تازی کی آئی جس کو میں نے حضرت پر پیش کیا اور تصدیق ہو جانے کے بعد درج کرتا ہوں وہ لکھتے ہیں مولانا عبد الرحمن مخونچی نے بیان کیا کہ میں ایک دفعہ حضرت ممدوح کے ساتھ مولانا الشیخ ادریس کے مزار تک گیا، وہاں حضرت نے کسی ضرورت سے مجھے اپنے مکان پر بھیجا میں حضرت کو وہیں چھوڑ کر لپکا ہوا دولت خانہ پر پہنچا۔ یہاں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ ایک شخص دھونے کی غرض سے کپڑے لینے کے لئے حضرت کی تلاش میں دروازہ پر کھڑا ہے۔ ہم شیخ کی تشریف آوری کے انتظار میں بیٹھ گئے کہ دفعۃً حضرت کپڑے لئے ہوئے اپنے گھر سے نکلے اور وہ دھوبی کو دیدئے۔ حالانکہ حضرت شیخ مولانا ادریس کے راستہ میں کیچڑ ہونے کی وجہ سے کھڑا دل پہن کر گئے تھے اور میں اتنا تیز آیا تھا کہ حضرت اگر پالوش بھی پہنے ہوئے ہوتے تو مجھ سے پہلے گھر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ یہی مولانا عبد الرحمن کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت کی عینک گم ہو گئی۔ میں دوسری عینک محمد کواش کی دکان سے لے کر آیا مگر وہ بنیائی پر ٹھیک نہ لگی۔ حضرت نے فرمایا ہماری پہلی عینک تلاش کرو کہ وہ بہت صاف تھی۔ غرض ہم نے کتاب کا ورق ورق چھان مارا جس میں حضرت عینک رکھا کرتے تھے مگر وہ نہ ملی۔ دفعۃً حضرت کا رنگ بدل گیا اور حیب میں نے دریافت کیا کہ حضرت کیا بات ہے تو فرمایا مجھے اس عینک سے ناگواری ہے اس کے بعد وہ کتاب اٹھائی جس میں ہم بار بار دھونڈ چکے تھے اور یہ ناقص عینک بیٹی مبارک پر چڑھی ہوئی تھی کہ دفعۃً وہ نیچے گری اور حضرت نے کتاب کو ہاتھ سے رکھ دیا، دیکھتے کیا ہیں کہ پرانی مانوس عینک کتاب کے اوپر پڑی ہے۔ تب آپ نے صاحبزادہ سید عمر سے فرمایا اپنی ماں سے کہہ آؤ کہ حق تعالیٰ نے میری عینک مجھے واپس فرمادی۔ یہی عبد الرحمن فرماتے ہیں کہ سخت جاڑہ کے زمانے میں ہم حضرت کے پاس بیٹھتے تو پیشانی مبارک سے بکثرت پسینہ ٹپکتا ہوا دیکھتے تھے مگر پھر یہ حالت نہ رہی۔ ہم نے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا یہ پسینہ مجھے ابتداء میں آتا تھا۔ جبکہ مشاہد کبھی سامنے آتا اور کبھی غائب ہونے پر میری حالت عام لوگوں کی سی ہوتی تھی اور حیب مشاہدہ ہوتا تو انسانی حالت سے مجھے باہر نکال دیتا تھا۔ اور پھر جب غائب ہوتا تو میری حالت عام انسانوں کی سی بن جاتی تھی۔ اور اس سے مجھے سخت تکلیف ہوتی تھی۔ مگر حیب وہ دائمی بن گیا کہ کسی وقت بھی غائب نہیں ہوتا تو طبیعت اس کی عادی اور فات اس سے مانوس ہو گئی اس لئے اب بدن پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ ایک مرتبہ میرے بھائی یہی مولانا عبد الرحمن مدرسہ عطارین کی چھت پر چڑھ گئے اور



وہاں گھروں کی چھتوں پر عورتیں نظر آئیں تو ہم ان کو تھکنے اور ان کا تذکرہ کر کے باہم ہنسنے لگے حتیٰ کہ غلبہ خوش طبعی میں ایک شخص ہوا میں بڑے زور سے اچھلا بھی۔ جب ہم حضرت کے مکان پر آئے اور صقلا یہ میں (کہ مہمان خانہ یا خانقاہ تھی) بیٹھے تو حضرت خوب ہنسنے اور فرمایا وہ شیخ بہت اچھا ہے کشت نہ ہوتا ہو۔ اس کے بعد فرمایا سچ تباؤ جھوٹ نہ بولنا تم دونوں کہاں گئے تھے۔ ہم نے واقعہ عرض کر دیا تو حضرت نے مفصل قصہ ایسا سنایا گویا ہمارے ساتھ تھے۔ حتیٰ کہ اُچھلنے کا واقعہ بھی بیان فرمادیا حالانکہ اس کا تذکرہ ہم نے آپ سے بالکل نہ کیا تھا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ اُس وقت ممدوح زائرین کے مجمع میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اس اچھلنے کا مشاہدہ فرما کر دفعۃً کھل کھلائے حاضرین نے سمجھا کہ ہم میں کسی کی بات پر ہنسنے ہیں۔

ایک مرتبہ میں حاضر خدمت ہوا اور میری بیوی حاملہ تھی تو میں نے اس کا تذکرہ کیا۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے ہنسی کے طور پر کہا لڑکی ہوگی۔ حضرت نے مجھ سے فرمایا میرے پاس آؤ اور پھر کان میں کہا کہ واللہ لڑکا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ایک بار بغرض زیارت حاضر ہوا اور لڑکے کو مرلیض چھوڑ آیا تھا۔ اس کے لئے دعا و صحت کی میں نے درخواست کی تو فرمایا اب کے آؤ گے تو درخواست کرنا۔ میں سمجھ گیا کہ بچہ جلدی وفات پا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ایک مرتبہ میں تیس اوقیہ حضرت کے لئے لیکر بغرض زیارت فاس آیا مگر جب شہر کے قریب پہنچا تو اس میں سے ایک اوقیہ نکال لیا۔ جب باقی رقم حضرت کو پیش کی تو فرمایا اپنی کاروائی تم چھوڑتے نہیں۔ جاؤ ایک موزونہ کی کھجور اور تین موزونہ کا پنیر لے کر آؤ اس اوقیہ کے عوض جو تم نے نکال لیا ہے میں نے کہا حضرت کی عقل و دانش پر بھی آفرین۔ اسی طرح سید عربی زیادہ نے تحریر بھیجی جن میں چند قصے تو میرے سامنے پیش آئے اور ان کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اور جو میرے سامنے کے نہیں ان کو میں نے حضرت پر پیش کر کے جب تصدیق کر لی تو درج کتاب کرتا ہوں۔

لکھتے ہیں کہ میں سرکاری کتب خانہ کے لئے کتابیں خرید کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ چند کتابیں خریدیں اودان کی قیمت مالک کو دیدی کہ دفتر سے مجھے قیمت پیشگی مل چکی تھی۔ جب وہ کتابیں میرمنشی کے پاس پہنچیں تو ان کو پسند نہ آئیں۔ اور وہ بہت کچھ گرجے اور چپکے اس کے بعد وہ کتابیں مجھے واپس کر دیں اور کہا کہ ان کو مالک پر واپس کر کے قیمت داخل کر دو ورنہ پھر جو ہم سے ہو سکے گا ہم کریں گے یہ سنکر میں نہایت بے چین و پریشان اور مغمو و خائف ہوا کہ میرمنشی کا قہر و سٹو مجھے معلوم تھا۔ پھر حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ عرض کیا اور یہ بھی کہ مالک نے کتابیں واپس لینے سے انکار کر دیا اور میرے پاس اتنی رقم نہیں کہ خود ادا کر دوں، اور میرمنشی مزاج کا بڑا کڑوا ہے اور با اختیار و صاحب اقتدار ہے فرمایا کچھ اندیشہ نہ کر انشاء اللہ عنقریب کوئی سبیل نکل آئے گی چنانچہ چند روز ہی گزرے تھے کہ سلطان نے میرمنشی کو قتل کر دیا اور میری پریشانی دور ہو گئی۔ ایک مرتبہ بہار وطن نامنا میں فساد عظیم ہوا اور قاضی شہر میرے خاص دوست تھے۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ ان پر بھی



سلطانی عتاب ہوگا) اس لئے میں دعاء خیر کرانے کے لئے حضرت کے پاس آیا تو فرمایا کہ قاضی صاحب کے متعلق تو کوئی خطرہ نہ کرو۔ باقی میرمنشی کا میں ذمہ دار نہیں۔ یہ میرمنشی بھی میرے دینی بھائی اور دہی صاحب تھے جس نے کتابوں کا قصہ پیش کیا تھا چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ قاضی صاحب پر تو ذرہ بھر بھی آپس نہ آئی اور میرمنشی کے قتل کا حکم صادر ہو گیا۔ نیز میرمنشی کے قتل کا قصہ ابھی عوام میں پھیلا نہ تھا صرف چند ہی لوگوں کو معلوم ہوا تھا کہ میں حضرت کے مکان پر حاضر ہوا اور دستک دی آپ باہر تشریف لائے اور بغیر اس کے کہ میں اطلاع دوں خود ہی فرمایا کہ میرمنشی تو مر گیا۔ میں نے کہا جی ہاں۔ فرمایا میں نے تو تم سے کہہ دیا تھا۔ اس کے بعد فرمایا کیا میرمنشی کی تمہارے پاس کچھ کتابیں ہیں؟ میں نے عرض کیا ہاں حضرت ہیں۔ فرمایا اللہ انجام بخیر فرمائے۔ یہ سنکر میں ڈر گیا کہ کچھ کشاکشی ضرور پیش آئی ہے) اور کانپتے ہوئے حضرت کے ہاتھ پر جھبکا اور بوسہ دیکر عرض کیا کہ حضرت مجھے تو بڑا اندیشہ ہو گیا ہے نیز حاضرین نے بھی میری سفارش کی حضرت نے فرمایا طلبی و تلاش تو ضرور ہونی ہے۔ مگر انشاء اللہ انجام سلامتی ہے۔ چنانچہ مجھے اس کا انتظار لگ گیا اور آخر کار اس کا ظہور ہوا کہ میرمنشی کا جن جن سے بھی میل جول تھا سبکی تلاشی و طلبی و تفتیش ہونے لگی اور جو گرفتار ہوئے ان کو گردن زدنی و ضبطی املاک اور ذلت و خواری کے بڑے بڑے مصائب پیش آئے۔ یہ دیکھ کر میرا خوف پر خوف بڑھتا اور حضرت کی خدمت میں بار بار جاتا ہوتا رہا۔ آپ فرماتے کہ موت تو ہے نہیں باقی پریشانی ضرور ہے حتیٰ کہ مجھے مکنا سہ دار السلطنت لے جانے کے لئے قاصد میرے پاس بھی آگیا اور میں اس کو لیکر حضرت کے پاس آیا۔ حضرت اُس سے بڑی مسرت و انبساط سے ملے اور اُس کے لئے دعاء خیر فرما کر میرے متعلق اس کو بہت کچھ نصیحت فرمائی اور مجھ سے فرمایا کہ انشاء اللہ بخیریت واپس آؤ گے نیز قاصد کی معرفت اس حاکم کو جس کے سپرد میرمنشی کے معاملہ کی تفتیش و تحقیقات تھیں سلام بھی کہلا بھیجا۔ غرض میں مکنا سہ پہنچا اور میرمنشی کی جو کتابیں میرے پاس تھیں وہ پیش کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے وصول کر کے مجھے رخصت کر دیا اور میں بحمد اللہ فاس واپس آگیا۔

اس کے بعد چند لوگوں نے جو ظلم پسند حکام میں مقرب بننا چاہتے ہیں افسر تفتیش کو مجھ پر بھڑکایا اور افترا باندھ کر اس کو سنکایا کہ فلاں شخص کا بہت کچھ مال ابھی اس کے پاس باقی ہے۔ چنانچہ مجھے گھر آئے ایک ہی ہفتہ گزرا تھا کہ سپاہی آمو جو دہوا اور کہنے لگا کہ تاسنا کے قاضی صاحب کو معلوم ہوا کہ تمہارا معاملہ خیر و خوبی سے طے ہو گیا ہے تو انہوں نے افسر تفتیش کو لکھا کہ سید عربی کو ہمارے پاس بھیجو کہ موضع سلا میں ہم سے آکر ملاقات کر جائیں۔ لہذا اگر آپ چلنا چاہیں تب آپ کی مرضی اور نہ چلنا چاہیں تب آپ کی خوشی میں اس کو لے کر حضرت کی خدمت میں آیا اور اس نے حضرت کے سامنے بھی یہی گفتگو کی، اور حضرت خاموش بیٹھے سنتے رہتے اس کے بعد مجھ سے فرمایا کہ میری رائے تمہارے متعلق یہ ہے کہ اس کے ساتھ چلے جاؤ۔ مگر تیس او قبہ اپنے ساتھ



ضرورے لو تاکہ افسر تفتیش کو دے سکوں سپاہی بولا کہ ہاں حضرت رائے میری بھی یہی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حق یہ تو نامنا کے قاضی صاحب کی طلبی تہاتے ہیں (جو میرے پرانے دوست ہیں) لہذا ان ہی کے ساتھ جانے کی مجھے کیا حاجت ہے اور پھر تینسٹ اوقیہ ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت۔ فرمایا جو میں کہہ رہا ہوں وہ مانو میں فضول بات نہیں کہہ رہا۔ چونکہ مجھے اس بلا کی خبر نہ تھی جو اس شخص کے دل میں تھی کہ اس کی یہ ساری گفتگو محض دھوکا اور چال تھی لہذا جب میں اس کو نہ سمجھا اور اپنی نادانی پر جارا رہا تو حضرت نے ان لفظوں میں گویا اس کی تصریح ہی فرمادی اور وہ شخص بھی اس کو سنتا رہا مگر منہسی میں اس کو رہا گیا اس کے بعد جب ہم نے حضرت کے پاس سے اٹھنے کا ارادہ کیا تو حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ موت کا اندیشہ کرو مت البتہ قید بگتنا ضروری ہے۔ چنانچہ میں قاصد کے ساتھ مکناسہ روانہ ہو گیا مگر تیس اوقیہ جس کا شیخ نے حکم فرمایا تھا اپنے ساتھ نہ لئے جب ہم مکناسہ پہنچے تو افسر نے میری طرف سے منہ پھیر لیا۔ اور حکم دیا کہ ہمارے گھر میں اس کو محبوس رکھو کہ جب تک سلطان سے مشورہ نہ کر لوں یہ باہر نہ نکلنے پائے۔ اور واقعہ یہ تھا کہ مجھ سے پہلے میرے ہم وطن چند لوگوں کے متعلق اُس نے سلطان سے مشورہ کیا اور اُن کو قتل کرا چکا تھا اس لئے خدا ہی جانتا ہے کہ خوت کے مار میرا کیا حال ہوا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ بس اب قتل ہی ہوتا باقی ہے۔ مگر اللہ کی شان کہ جس وقت وہ افسر مشورہ کے لئے روانہ ہوا اُسی وقت بہ برکت حضرت شیخ اُس مقتول و معتوب میرمنشی کا ایک عزیز حضرت ابوالعباس سبئی قدس سرہ کا غلات سلطان کی نذر کرنے کے لئے آیا۔ اس پر سلطان نے خود اس شخص کو ادھیں کا بھی تعلق اُس میرمنشی سے تھا سب کو معافی دیدی چنانچہ مجھے نجات ملی مگر نسخہ کے بارہ میں مجھے گرفتار کر لیا گیا اور نسخہ کی قیمت تینسٹ ہی اوقیہ تھی اس وقت میں حضرت کے اس ارشاد کا مطلب سمجھا کہ تیس اوقیہ اپنے ساتھ لے جانا غرض فراہمی رقم میں بہت سہ گزراں رہا اور مارا پھرا۔ آخر حق تعالیٰ نے اس کا انظام فرمادیا اور مجھے رہائی نصیب ہوئی۔ نا الحمد للہ علی احسانہ۔ ایک مرتبہ میں بعد مغرب حضرت کے گھر آیا اور دیر تک دیوارہ پر بیٹھا رہا کہ نہ دستک دی نہ کسی کو آواز۔ اس کے بعد حضرت کی آہٹ مجھے محسوس ہوئی کہ سیڑھیوں سے اتر رہے ہیں اور میرا نام لے کر فرمایا کیا تم گھنٹہ بھر سے یہیں بیٹھے ہوئے ہو۔ میں نے یہ کہہ کر کہ ہاں حضرت، آپ کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ ایک مرتبہ مدرسہ میں ایک جاہل سے کہ حضرت کی شان نہ پہچانتا تھا میری بحث ہونے لگی جب حاضر خدمت ہوا تو ساری گفتگو حضرت نے نقل فرمادی کہ رات تم نے فلاں شخص سے یہ کہا اور اس نے یہ کہا اسی طرح ایک دفعہ میں نے عرض کیا کہ حضرت فلاں شخص کو آپ کے ساتھ بڑی محبت ہے کہ بہت تعریفیں کیا کرتا ہے، فرمایا کہ اس کو میری محبت خاک نہیں اور تجربہ کرنا چاہو تو اس سے ایسی گفتگو کرو جس سے معلوم ہو کہ تم مجھ سے بذمیں ہو گئے ہو پھر دیکھنا وہ کیا کہتا ہے چنانچہ وہ شخص جب میرے پاس آیا تو میں نے کہا میاں اب تو کچھ



اور ہی تحقیق ہوا اور ایسی تقریر کی جس سے وہ سمجھا کہ شیخ کے متعلق میرا خیال بدل گیا ہے یہ سُنکر وہ فوراً ہی کھل گیا اور کہنے لگا میں تو آپ سے پہلے ہی کہہ چکا تھا اور اپنی چھپی جداشت ساری ظاہر کر دی تب میں نے کہا کہ جناب والا میں تو آپ کو آزمایا تھا سو آپ کی حقیقت واضح ہو گئی اس پر وہ بہت شرمندہ ہوا ایک مرتبہ میں صقلابہ میں بیٹھا ہوا حضرت سے باتیں کر رہا تھا کہ دفعۃً پیرانی صاحبہ کے گریہ کی آواز آئی اور وہ بدحواس ہو کر گھر میں گھومنے لگیں، کیونکہ ان کو بھائی کے انتقال کی خبر ملی جو پردیس میں تھے اور اس دفعی خبر سے اُن کے کلبجہ ہلک گ کا شعلہ بھڑک اُٹھا۔ حضرت نے اوپر سے جہاں کا اور فرمایا اس کا انتقال نہیں ہوا اور جس نے تم کو یہ خبر پہنچائی ہے خدا کی قسم غلط پہنچائی ہے۔ مگر سانحہ ایسا تھا کہ ان کو قرار دیا گیا مگر اس کے بعد خبر آئی کہ غلط افواہ تھی اور محمد اللہ وہ اب تک بقید حیات ہیں ایک مرتبہ آپ بالا خانہ پر چڑھ رہے تھے کہ ایک شخص جس کا ایک عزیز سلطان کے دلی عہد کی معیت میں کہیں باہر گیا ہوا تھا آیا اور کہنے لگا کہ حضرت فلاں شخص سے جو بظاہر سچا اور صالح ہے مجھے خبر ملی ہے کہ میرا عزیز بخیریت ہے مگر میرا دل بے چین ہے آپ فرمائیے کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ حضرت نے معاملہ کو گول کیا۔ مگر جب ان کا اصرار ہوا تو فرمایا جب تم باز ہی نہیں آتے تو صبح خبر یہ ہے کہ غریب الوطن حاج عبد اکرم سب کی پرکھ اس کے عزیز کا یہی نام تھا، اللہ کی رحمت نازل ہو۔ اس کو تو دلی عہد نے قتل کر دیا، اور مجھے وہاں کے اُس صاحب خدمت نے اطلاع دی ہے جو اس کے جنازہ کی نماز میں شریک تھا۔ چنانچہ بعد میں یہی خبر آئی حضرت ممدوح کے پاس ایک خادم ملازم تھا۔ جس کو معاوضہ خدمت میں حضرت کچھ ماہوار تنخواہ دیا کرتے تھے مگر وہ حاکم سے روپوش تھا۔ اس کا ایک بھائی اس کی تخریب دایا اور سانی کے درپے تھا۔ حضرت نے اس کو سمجھایا بھی کہ اس کا پیچھا چھوڑے مگر وہ نہ مانا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ حاکم ضلع کے پاس پہنچا اور مجری کی کہ میرا بھائی شیخ عبد العزیز کے پاس موجود ہے اور وہ مجھے اس پر قابو نہیں پانے دیتے چنانچہ سپاہی کو تعینات کر دیا گیا اور وہ مجر کو لٹے ہوئے حضرت کے پاس آیا اور کہا اٹھو افسر پولیس نے بلایا ہے۔ حضرت نے فرمایا کیا مجھے؟ اُس نے کہا ہاں تمہیں اور تمہارے نوکر کو۔ فرمایا حکم حاکم لسرچسپم حاضر ہوں کہ رعیت ہوں اور ناچیز مسکین۔ پھر مجھ سے فرمایا کہ چلو۔ چنانچہ ہم سب محکمہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستہ میں سپاہی کو ندامت ہوئی اور اُس نے کہا حضرت ہمیں ہوت صرف اس شکایت کنندہ کے بھائی کی تھی جس کو ہم نے گرفتار کر لیا لہذا آپ واپس تشریف لے جائیں۔ حضرت نے فرمایا اور میں نے اس کی گرفتاری سے تم کو روکا کب تھا۔ چنانچہ ہم لوٹ آئے اور وہ ملازم کو لے کر چلے گئے۔ مہینہ بھر بھی نہ گذرا تھا کہ اس کا بھائی دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اور شیخ کا ملازم واپس آ گیا کہ اب کوئی خدشہ ہی باقی نہ رہا۔ جن ایام میں مشہور قبیلہ بنی بڑتاسن کا واقعہ پیش آیا کہ انہوں نے بغاوت کی اور سلطان کی طرف سے اُن کی گرفتاریاں عمل میں آئیں تو قبضہ تازہ کے ایک اہل کار نے اس آگ کو



باشندگان تازہ پر لا برسلنے کی غرض سے ایک جعلی تحریر مرتب کی جس میں بنی بڑ تاسن کے نام اُن کی طرف سے لکھا تھا کہ ہم ہر طرح تمہارے ہم خیال اور حامی و مددگار ہیں۔ اور اس کاغذ کو سلطان کے حضور میں جا پیش کیا۔ سلطان یہ دیکھتے ہی بھڑک اُٹھے اور ارادہ فرمایا کہ انتقام لینے کے لئے گورنر کو روانہ کریں کہ دفعۃً خیالی آیا اور محض بمنزید احتیاط اس اہل کار کو بند کر لیا۔ باشندگان تازہ کو اطلاع ملی تو کانپ گئے اور حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر بھاگ جانے اور وطن چھوڑ کر روپوش ہو جانے کا مشورہ لینے لگے۔ حضرت خاموش سنتے رہے اور پھر فرمایا اگر تم مانو تو اپنی رائے ظاہر کرو۔ سب نے کہا حضرت ضرور ارشاد فرمائیں کہ اسی کو معلوم کرنے کے لئے تو ہم آئے ہیں اور یقیناً اسی پر عمل کریں گے۔ فرمایا تم کو سید ہا سلطان کی طرف رُخ کرنا چاہیے، البتہ اُن سے پہلے وزیر سے مل لینا چاہیے۔ چنانچہ حسب ارشاد حضرت والا سب روانہ ہو گئے اور وزیر کے پاس پہنچے وزیر صاحب اُن کو بارگاہ سلطانی میں لے گئے اور بہت کچھ کلماتِ خیر کہہ کر اہل کار نے ان پر جو افتراء باندھا تھا اس سے بالکل بڑی و بے لوث ہونے کا اظہار کیا۔ اس پر سلطان نے فوراً ہی اہل کار کو بلایا اور قتل کر دیا ایسا ہی ایک قصہ دوسرے شخص کا پیش آیا کہ وہ تاس ہی میں اُس کا سرکاری عملہ کا ایک ممبر تھا جن میں (سلطانی غناب پر) کچھ اوپر بیس آدمی شوال ۱۳۳۵ھ میں قتل کئے جا چکے تھے اور تفتیش جاری تھی یہ شخص گرفتاری سے قبل گھبرایا ہوا حضرت کے پاس آیا اور مفرد ہو جانے کا خیال ظاہر کیا۔ حضرت نے فرمایا ایسا نہ کرو بلکہ حاکم ضلع کے سامنے جا کھڑے ہو۔ اور کہہ دو کہ میں حاضر ہوں جو بھی آپ کا منشا ہو مجھے تعمیل حکم میں کوئی عذر نہیں چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ حاکم ضلع نے کہا اگر تمہارا یہ دعویٰ سچا ہے تو فوراً فوج چلے جاؤ اور وہاں تیر اندازوں کے ساتھ ہو کر فوجی خدمت انجام دو۔ یہ شخص حضرت کے پاس پھر آیا۔ آپ نے فرمایا بس جلدی کرو چنانچہ یہ شخص روانہ ہو گیا چند ہی روز گزرے تھے کہ حاکم ضلع مع اپنے آوروں کے گرفتار ہو گیا اور ان میں اسی تعداد کے آدمی قتل کئے گئے (جتنوں کو اُس نے قتل کرایا تھا) حضرت کی برکت سے یہ شخص بچ گیا اور ظالموں کو اپنے کئے کا بدلہ مل گیا۔ یہ عادت حضرت کی میں نے بارہا دیکھی کہ جب کوئی مفرد ہونے کا مشورہ لیتا تو آپ اس کو منع فرماتے اور تاکید کیا کرتے تھے کہ حاکم کے سامنے حاضر ہو جاؤ۔ اور میں نے اس کا انجام ہمیشہ بہتر ہی پایا ہے۔ ایسے واقعات اگر درج کروں تو بہت طول ہو جائے۔ ایک افسر کو سلطان نے معطل کر دیا۔ وہ حضرت کی خدمت میں دعا کے لئے حاضر ہوا کہ اپنے عہدہ پر بحال ہو جاؤں حضرت نے اس سے وعدہ فرمایا چند ہی روز گزرے تھے کہ سلطانی فرمان اس کی سجائی کا آگیا۔ اتفاق سے حضرت نے چند حفاظ کلام اللہ کے متعلق اس سے سفارش کی کہ فلاں ٹیکس ان سے معاف کر دیا جائے۔ مگر حاکم نے سفارش کو نہ مانا اور صاف انکار کر دیا۔ اب اس حاکم کا بھائی حضرت کی خدمت میں آیا اور حضرت نے اس سے وعدہ فرمایا کہ بھائی کا عہدہ تم کو مل جائیگا



چنانچہ چند ہی روز کے بعد وہ دنیا سے رخصت ہو گیا اور اس کا بھائی اس جگہ پر مامور ہوا۔ اس نے حضرت کی سفارش  
 جس کے متعلق بھی تھی پوری کر دی۔ میرا پہلا نکاح مولانا محمد بن عمر سلجاسی امام و خطیب مسجد مولانا ادریس  
 کی لڑکی سے ہوا تھا۔ اُدھر تو مولانا کی شان علمی و مرتبہ علیا سے واقفیت اور ادھر خود لڑکی کی عقل سلیقہ شجاری  
 اور حسن معاشرت اس لئے مجھے اس کے ساتھ بہت ہی محبت تھی چونکہ حضرت کو بھی اس کا علم تھا کہ مجھے جتنی محبت  
 اپنی بیوی کے ساتھ ہے دنیا میں کسی کے ساتھ نہیں اس لئے کبھی کبھی پوچھا کرتے تھے۔ کیوں جی ہمارے ساتھ بھی  
 تمہیں اتنی ہی محبت ہے۔ جتنی بیوی کے ساتھ ہے یا وہ زیادہ پیاری ہے؟ میں سچ بولتا اور عرض کر دیتا کہ حضرت  
 کہ حضرت اسی کی محبت زیادہ ہے اور درحقیقت میں معذور تھا کہ حضرت کے مرتبہ سے جاہل اور امام وقت ہونے سے ناوقت  
 تھا۔ حضرت پر اس جواب کا اثر ہوا کرتا تھا اور ہونا بھی چاہیئے تھا کیونکہ مرید کے قلب میں جب تک اپنے شیخ اللہ و رسول کے سوا  
 غیر کا تسلط ذرا بھی رہے گا اس کا کچھ بھی کام نہ بنے گا غرض اس بارہ میں آپ میرا قدم آگے بڑھانے اور اس حالت سے  
 مجھے منتقل کرنے کی تدبیر میں لگے رہے۔ مگر میں باز نہ آیا۔ آخر تائیسویں شب رمضان ۱۲۵۵ھ کی صبح کو جب  
 میں حاضر ہوا تو اپنے اشنا و گفتگو میں فرمایا کہ اولیاء اللہ کے ساتھ ربط ضبط بمنزلہ زہر خورانی کے ہے اور ہمارے  
 فلاں بزرگ تو اپنے مرید کے لئے نہ بیوی چھوڑی نہ بچہ۔ ان کو محض اپنا بنالیا تھا میں اس اشارہ کو بالکل نہ سمجھتا تھا  
 کہ چند ہی دن بعد میری بیوی مبتلا مرض ہوئی اور بہت کچھ علاج کیا مگر دنیا سے رخصت ہو گئی چونکہ اس کو  
 بھی حضرت سے محبت تھی اور حضرت بھی اس سے محبت فرماتے تھے اس لئے حضرت اس کے لئے دوائیں اور وہ  
 اشیاء جن کی مرہن کو رغبت و ضرورت ہوتی ہے اس کو بھیجا کرتے اور یہ بھی اُمید دلایا کرتے تھے کہ شفا نصیب ہوگی۔ مگر  
 اس سے مراد شفاء آخرت ہوتی تھی جیسا کہ بعد میں خود ظاہر فرمایا۔ اس کی وفات کے بعد میری گردید گنی پچہ کے  
 ساتھ بڑھی جسے وہ (اپنی نشانی) چھوڑ گئی تھی کہ جب اس کو دیکھتا تو قلب اسی کا ہو رہا تھا۔ ماں کے بعد وہ  
 بھی چند ہی روز زندہ رہا اور آخر انتقال کر گیا اس کے بعد میں نے مولانا کی دوسری لڑکی (یعنی اپنی سالی) سے  
 نکاح کیا اور وہ اپنے حسن و جمال کی وجہ سے میرے دل کی مالک بن گئی۔ مگر وہ بھی زندہ نہ رہی اور چھوڑی مدت  
 بعد سفر آخرت کر گئی۔ اس کے بعد حق تعالیٰ نے مجھے شیخ کی محبت کا ملہ نصیب فرمائی جس سے بالاکوئی محبت نہیں  
 اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ ایک مرتبہ میں آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور آپ محبت الہیہ کے متعلق تقریر فرما رہے تھے  
 کہ وہ کیسی ہوتی ہے۔ میں اس کے متعلق سوال پر سوال کر رہا تھا اور حضرت ان کا جواب دے رہے تھے (یہ سوال  
 جواب) میں نے درج کتاب بھی کر دئے ہیں جو ناظرین کی نگاہ سے گذریں گے (انشاء اللہ) اس کے بعد حضرت نے  
 سنہس کر فرمایا کہ ہم تمہارے متعلق آخر کیا تدبیر کریں۔ دنیا میں تم بیویوں ہی سے محبت رکھتے رہے حتیٰ کہ حق تعالیٰ نے ان کو  
 اپنے جوار رحمت میں بلا لیا اور ان کی روحوں کو دیگر ارواح کے ساتھ عالم برزخ میں جگہ دیدی مگر تم اب بھی انہیں کی



محبت کا ملہ پر جتے ہوئے ہو۔ بھلا اب عالم برزخ سے نکال کر حق تعالیٰ ان کو کہاں پہنچا دے کہ تمہارا قلب ان کی محبت سے خالی ہو جائے۔ پس حضرت کے ان کلمات نے ان کی محبت کو میرے قلب سے دھو دیا اور اب ساری محبت خالص شیخ کے ساتھ ہو گئی کہ تیسرا نکاح بھی میں نے اپنی دوسری سالی سے کیا مگر اس کے ساتھ وہ رنگ نہ ہوا کہ دل اُسی کا ہو کر رہے خالص الحمد للہ علی السلاۃ والعافیتہ۔ ایک مرتبہ حضرت مخدومہ پیرانی صاحبہ کو حمل قرار پایا آپ حضرت سے کہنے لگیں اے میرے سردار اللہ نے مجھے کافی بچے دیئے ہیں اس حمل کی مجھے ضرورت نہیں ہے خصوصاً جبکہ خانگی امور اور مہمانوں کی خدمت کا بوجھ میرے سر پر ہے اور کوئی بات دی بھی ہمارے پاس نہیں ہے جس سے کام میں مدد لے لیں۔ لہذا اگر تم واقعی دلی ہو جیسا کہ لوگ سمجھتے ہیں تو دعا کرو یہ حمل گر جائے کہ واقعی مجھے اس کی حاجت نہیں ہے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ حضرت شیخ ان کو ہمیشہ اس کی تاکید فرماتے رہتے تھے کہ سر ڈھانپ لینے اور سو جانے کے بعد کبھی اپنا منہ نہ کھولیں۔ مبادا ایسی چیز نظر آجائے جس کی برداشت نہ کر سکیں۔ مگر اتفاق سے ایک بار وسط شب میں ان کا منہ کھل گیا اور ان کو شیخ کے پاس تین مردان عین دکھائی دیئے اس سے ان کے دل میں اتنا خوف بیٹھا کہ فوراً اسقاط حمل ہو گیا۔ حضرت شیخ کی اس حالت کا اہلخانہ اور بعض زائرین نے بھی مشاہدہ کیا تھا کہ آپ کو کبھی کبھی اپنے جسم سے ایک خفیف غیبت حاصل ہوتی تھی حتیٰ کہ دیکھنے والا سمجھتا تھا کہ روح بدن سے نکل گئی اور نہ سانس میں حرکت باقی ہے نہ ہونٹوں میں اور نہ رگوں میں چنانچہ ایک دن آپ پر یہ حالت طاری تھی کہ جانے والوں میں ایک شخص آپ کے پاس پہنچ گیا اور اس نے دیکھا کہ بجلی کی طرح ایک روشنی پھیلی ہوئی ہے مگر بجلی کی سی اس میں سرعت نہیں ہے اور ہے اُس سے زیادہ صاف اُس نے باہر آ کر دوسروں کو خبر دی اور اب جتنے بھی موجود تھے سب نے وہاں جا کر آپ کی اس حالت کو دیکھا۔ اگلے دن جب میں حضرت سے ملا اور آپ کے ساتھ نشست گاہ میں آیا تو آپ نے اِنَّا لِلّٰہ پڑھی اور فرمایا کل میری ایک ایسی بات کا ظہور ہو گیا جس کے ہمیشہ مخفی رکھنے کی عادت تھی۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت واقعہ تو میں بھی سن چکا ہوں مگر اس میں راز کیا تھا۔ فرمایا وہ تو تھا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور پھر بڑی بڑی مفید باتیں بیان فرمائی۔ نیز حضرت مدوح کی ایک کرامت میں نے حاج عبد القادر تازی کی بیاض میں خود حضرت کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دیکھی۔ وہ یہ تھی کہ حضرت مدوح بچپن میں محمد بن عمر دلائی کے پاس حمام کی خدمت میں خود ر بصورت ملازمت انجام دیا کرتے تھے جب وہ سفر حج میں روانہ ہوئے تو حضرت اسی کام پر ان عبد القادر کے پاس ملازم ہو گئے۔ عبد القادر نے خود مجھ سے کہا کہ ایک دن سید عبد العزیز نے میری بیاض اُٹھا کر اس پر لکھ دیا الحمد للہ وحدک۔ آج میرے آقا محمد بن عمر کی وفات ہو گئی اور وہ جوار رحمت الہیہ میں پہنچ گئے۔ کتبہ عبد العزیز ابن سعود دہلی ۱۲۸۵ ماہ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ میں نے آواز دی اور کہا یہ کیا لکھ رہے ہو۔ انہوں نے فوراً قلم اُٹھا کر تحریر کو قلم زد کر دیا اور فرمایا کچھ نہیں لکھا۔ میں اس سے پہلے بھی ان کی کرامتیں دیکھ چکا تھا اس لئے انتظار رہا۔



اور جب حجاج واپس آئے تو معلوم ہوا کہ محمد بن عمر کا ماہ ذیقعدہ میں انتقال ہو گیا۔ میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ فتح تو حضرت کو ۳۵ھ میں عطا ہوئی پھر یہ واقعہ کیسے ہوا۔ فرمایا فتح (اور کشف) تو مجھے اسی وقت سے حاصل ہو گیا تھا جب میں نے حضرت عربی فشتانی کی امانت کو پہنا تھا۔ مگر وہ تنگ تھی کہ جب کسی شے کی طرف توجہ کرتا تو وہ شے ظاہر ہو جاتی تھی مگر بجز اس کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا جس زمانہ میں آپ محمد بن عمر کے پاس ملازم تھے صبح ہی پانی گرم کرنا آپ کا کام تھا۔ ایک ذرا دیر ہو گئی تو نیچر آپ پر بڑبڑایا۔ اس پر آپ کو غصہ آ گیا اور فرمایا جو جتنی لکڑیاں چاہے پھونک اور جلاؤ والٹدیہ دیگ کبھی گرم نہ ہوگی۔ چنانچہ صبح سے لے کر عصر تک بہتیری لکڑیاں جلا لیں مگر پانی ٹھنڈے کا ٹھنڈا ہی رہا۔ محمد بن عمر کہیں گئے ہوئے تھے جب آئے تو سارا قصہ معلوم ہوا کہنے لگے پیارے عبدالعزیز مجھے تو تمہارے ساتھ محبت ہے اور تمہاری خدمت کرتا رہتا ہوں مگر تم مجھے خسارہ دینا چاہتے ہو۔ جس نے تم کو ڈاٹا تھا بھلا بھلا اس کو کیا نقصان پہنچا۔ اس میں نقصان تو میرا ہے اور میری کوئی خطا نہیں۔ غرض شیخ کو ترس دلانے اور راضی کرنے کی باتیں کرتے رہے حضرت نے خود فرمایا کہ مجھے شرم آگئی۔ کیونکہ درحقیقت اگر میں کام نہ بھی کرتا تو وہ مجھے اجرت دیا کرتے اور یوں کہا کرتے تھے کہ میں تم کو برکت کی غرض سے رکھے ہوئے ہوں نہ کہ کام کی خاطر۔ لہذا میں نے لکڑیاں دیگ کے نیچے رکھیں اور کہا کہ تم لوگوں کو آگ جلاؤ تا تو آتا نہیں لو دیکھو پانی کھولنے لگا۔ ہاتھ لگایا تو واقعی پانی تیز گرم تھا یہ قصہ میں نے بہت لوگوں سے سنا اور خود حضرت مدوح سے بھی سنا۔

آپ کی ایک بڑی کرامت یہ تھی کہ آپ سے کسی علمی مسئلہ میں علماء کے اقوال دریافت کیا کرتا تو (باوجود اُنٹی ہونے کے) آپ کو ہر مسئلہ سے پورا واقف پاتا۔ حتیٰ کہ جس مسئلہ پر سب کی اتفاق ہوتا اور جس میں اختلاف ہوتا دونوں کو واضح فرماتے اور علماء ظاہر و علماء باطن کے ہر مسئلہ میں جتنے بھی اقوال ہوتے سب کا ذکر کر دیا کرتے تھے۔ پورے چھ سال تک میں اس کا تجربہ کرتا رہا۔ نیز قرون ماضیہ میں جو حوادث ہو چکے تھے ان کی بھی واقفیت تامہ رکھتے تھے۔ ایک دن میں آپ کے ساتھ سوق النخیس میں تھا کہ گرج اور کلی اور کڑک کا سبب دریافت کر بیٹھا تو اس بارہ میں آپ نے ایسی نفیس تقریر فرمائی جس کو آپ ہی جیسا شخص نقل کر سکتا ہے۔ سلسلہ گفتگو میں اُس آگ کا تذکرہ آ گیا جو قرطبہ میں بہاہ جمادی الآخر ۳۵۷ھ میں ظاہر ہوئی تھی اور اس کو حافظ ابن حجر نے کتاب الفتن میں اور قرطبی نے تذکرہ میں اور ابو شامہ و امام نووی نے اپنی تصانیف میں مفصل بیان کیا ہے۔ میرا ارادہ بھی ہوا کہ ان کی روایات آپ کو سنائوں مگر آپ خود اس کا قصہ اورتیہ کہ وہ کس طرح پھیلی بیان فرمانے لگے حتیٰ کہ تمامی علماء تاریخ کے اقوال نقل فرمادیئے۔ بلکہ اتنا زیادہ کہ اس کا سبب کیا ہوا تھا اور نیز اُس شخص کا نام جس کو آخرت میں اس آگ کا عذاب دیا جائے گا مع دیگر اسرار کے جن کا اظہار مناسب نہیں ہے۔ غرض آپ کی کرامتیں اتنی بے شمار اور ان گنت ہیں کہ اپنی اور اپنے دوستوں کی معلومات ہی کو ڈھونڈ کر جمع کروں تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔ مگر طالب کے لئے اتنی ہی مقدار کافی ہے۔



اس لئے اس پر اکتفا کرتا ہوں، البتہ جس طرح ایک بڑی کرامت (یعنی سلامتی غنائم دستقامت علی الدین) سے اس بحث کو میں نے شروع کیا تھا اسی طرح ایک بڑی کرامت پر اس کو ختم کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ شروع میں جب مجھے آپ سے تعارف ہوا اور آپ کی وسعت عرفان و فیضان ایمان کو میں نے دیکھا تو آپ کی آزمائش کی غرض سے صحیح اور موضوع حدیثوں کا آپ سے استفسار کرنے لگا کہ میرے پاس علامہ جلال الدین سیوطی کی تالیف کردہ کتاب الدرر المنثور فی الاحادیث المشاہیر موجود تھی جو ایک عجیب کتاب ہے کہ جتنی احادیث عام لوگوں میں مشہور ہیں سب کو حروف تہجی پر ترتیب دیکر ہر حدیث کے متعلق یہ ظاہر کیا ہے کہ صحیح ہے یا (من گھڑت) موضوع۔ کسی طالب علم کو اس کتاب سے خالی نہ رہنا چاہیے کہ نہایت نفیس کتاب ہے۔ چنانچہ میں نے حضرت شیخ سے پوچھا کہ اُمِّتُ اَنْ اُحْكَمَ بِالْظَوَاهِرِ وَاللَّهِ يَتَوَقَّى السَّرَاسِ کسی حدیث ہے۔ فرمایا یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمودہ نہیں ہے چنانچہ علامہ سیوطی نے بھی یہی کہا ہے میں نے پوچھا اور کُنْتُ كُنْتُ اَلَا لِعَرَفْتُ اِنْ فَرَمَا يَهْ بِهٖ نَبِيٌّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَا فَرَمُوْدَهٗ نَهِيْٓسْ هٓے۔ چنانچہ علامہ سیوطی نے بھی یہی لکھا ہے کہ لا اصل له پھر حدیث اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْعُقُلَ کو سنایا۔ فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا۔ چنانچہ احمد بن حنبل کا قول بھی یہی ہے اور علامہ ابن الجوزی نے اس کو الموضوعات میں لکھا ہے۔ اور ابن تیمیہ نے تصریح کی ہے کہ یہ حدیث جھوٹی ہے۔ علامہ زرکشی نے لکھا ہے کہ یہ حدیث بالاتفاق موضوع ہے، ایسے ہی علامہ سیوطی نے (اپنی دوسری تالیف) اللثا فی المصنوعہ فی الاحادیث الموضوعہ میں اس کو موضوع لکھا ہے، اگرچہ درر منتشرہ میں ایک دوسری صحیح حدیث کو اس کا شاہد بنایا ہے (مگر اس سے صحت مضمون کا صحیح ہونا ثابت ہوگا۔ اس کے الفاظ یکسور موضوع رہیں گے) با این ہمہ وہ شاید بھی حسن کی مرسل حدیث ہے اور ابن حجر نے شرح میں لکھا ہے کہ حسن کی احادیث مرسلہ قابل استدلال نہیں ہیں پھر اس حدیث کے متعلق دریافت کیا اَتَّخِذُ دُعَاءَ الْفَقْرِ اَوْ يَدَا اَيَّانَ لِحَمْدِ نُوْكُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا۔ چنانچہ علامہ سیوطی نے الحادی فی الفتادی میں یہی لکھا ہے پھر اس حدیث کے متعلق دریافت کیا اُحِبُّ الْعَرَبَ لَثَلَاثٍ لَا نِيَّ عَرَبِيٍّ وَالْقُرْآنُ عَرَبِيٌّ، وَكَلَامُ أَهْلِ الْجَنَّةِ عَرَبِيٌّ فرمایا۔ یہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا چنانچہ ابن الجوزی نے اس کو موضوعات میں ذکر کیا ہے پھر علامہ سیوطی نے کاتبی کی بابت دریافت کیا فرمایا یہ بھی حدیث نہیں ہے چنانچہ علامہ سیوطی کا درر میں یہی قول ہے پھر اَكْرِمُوْا عَمَّا كُنْتُمْ اَتَّخِلُ کی بابت دریافت کیا فرمایا یہ بھی حدیث نہیں ہے چنانچہ ابن حجر نے شرح میں اور سیوطی نے لثا فی مصنوعہ میں اور ابن الجوزی نے الموضوعات میں یہی لکھا ہے پھر حدیث اَنَا أَفْضَلُ مَنْ نَطَقَ بِالْمُضَادِّ کے متعلق سوال کیا فرمایا حدیث نہیں ہے چنانچہ علامہ ابن کثیر نے اور النثر میں علامہ ابن الجوزی نے اور علامہ سیوطی نے درر میں یہی لکھا ہے الغرض مجھے محفوظ نہیں رہا بہتیری حدیثوں کے متعلق میں نے دریافت کیا اور آپ کا جواب بالکل علماء محدثین کے موافق پایا اس سے زیادہ عجیب و غریب بات یہ پائی کہ میں جب اس بحث میں آپ سے گفتگو کرتا تو ایک حدیث جو بخاری



میں آئی ہے مگر مسلم میں نہیں آئی اور دوسری حدیث جو مسلم میں آئی ہے مگر بخاری میں نہیں آئی آپ دونوں کو متمیز فرمادیتے تھے۔  
 آخر جب پورا امتحان کر چکا اور مجھے محقق ہو گیا کہ حدیث کی شناخت آپ کو پوری ہے تو میں نے دریافت کیا کہ حضرت آپؐ کیسے کلام معلوم  
 کر لیتے ہیں۔ ایک مرتبہ تو جواب دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام چھپ نہیں سکتا پھر دوسری مرتبہ میں نے یہی سوال کیا تو فرمایا انا  
 جب چارہ کے موسم میں بات کرتا ہے تو اس کے منہ سے بھاپ نکلتی ہے اور جب گرمی کے موسم میں کلام کرتا ہے تو بھاپ نہیں نکلتی اسی طرح  
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام جب کسی کے منہ سے نکلے گا تو اس سے ایک نور خارج ہوگا، اور جب دوسرے کا کلام منہ سے نکلے گا  
 تو وہ نور سے خالی ہوگا پھر ایک مرتبہ میں نے آپؐ یہی سوال کیا تو فرمایا چراغ کو جب اُس کی غذا املتی (اور اس میں تیل ڈالا جاتا ہے)  
 تو اُس کی روشنی قوت پکڑتی ہے اور جب اسکو غذا نہیں ملتی تو بدستور اپنی حالت پر رہتا ہے اسی طرح اہل عرفان جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
 کا کلام سنتے ہیں تو اُن کے انوار میں قوت اور معارف میں بڑی ہوتی ہے۔ اور جب دوسرے کا کلام سنتے ہیں تو ان کی حالت بدستور رہتی  
 ہے جب مجھے معلوم ہو گیا کہ اس میں آپ کا قدم اتنا راسخ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ  
 کی شناخت میں کبھی نہیں ڈگمگاتا تو میں نے قرآن اور حدیث میں فرق کے متعلق آپ کو آزماتا چاہا کہ آپ عاقل قرآن تو کیا بحر سنج کے  
 حزب کے دوسری سوئیں بھی آپ کو یاد نہ تھیں چنانچہ میں ایک مرتبہ قرآن مجید کی کوئی کی کوئی آیت پڑھتا اور پوچھتا کہ حضرت یہ قرآن  
 ہے یا حدیث؟ آپ فرماتے کہ یہ تو قرآن ہے پھر دوسری مرتبہ ایک حدیث سناتا اور پوچھتا کہ یہ حدیث ہے یا قرآن فرماتے  
 کہ یہ تو حدیث ہے۔ غرض اس کا بھی بہت کچھ امتحان کیا حتیٰ کہ ایک مرتبہ میں نے کہا حَافِظُوا عَلٰی الصَّلٰوَاتِ وَالصَّلٰوَةِ  
 الْوُسْطٰی وَهِيَ صَلٰوةُ الْعَصْرِ وَقُوْا لِلّٰهِ قَانِتِیْنَ کلام اللہ ہے یا کلام الرسول۔ فرمایا اس میں کچھ تو قرآن ہے اور کچھ  
 حدیث اور وہی صَلٰوةُ الْعَصْرِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لب مبارک سے نکلا ہے۔ صرف یہ کلام اللہ نہیں  
 ہے یا قی سب کلام اللہ ہے میرے استفسار کے وقت علماء کی ایک جماعت بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ سن کر واللہ ہم سب  
 حیران ہو گئے جب مجھے علم ہو گیا کہ حدیث و قرآن میں امتیاز بھی آپ کو پورا حاصل ہے تو مجھے خیال آیا کہ قرآن  
 اور احادیث قدسیہ میں فرق کے متعلق آپ کو آزمادوں چنانچہ میں ایک حدیث قدسی پڑھتا اور آپ سے  
 دریافت کرتا کیا یہ قرآن ہے؟ فرماتے یہ تو نہ قرآن ہے نہ ایسی حدیث ہے جیسی تم پہلے پوچھتے رہے ہو بلکہ حدیث  
 ہی کی دوسری قسم ہے جس کو حدیث ربانی کہنا چاہیے میں نے آپ کا ہاتھ چوم لیا اور عرض کیا کہ حضرت ہماری  
 آرزو یہ ہے کہ تینوں کافروں ہمیں سمجھا دیں۔ کیونکہ حدیث قدسی کو کچھ تو مشابہت ہے قرآن سے اور کچھ مشابہت  
 ہے غیر قدسی حدیث سے قرآن کے ساتھ مشابہت ہے بلحاظ منزل من اللہ ہونے کے، اور غیر قدسی حدیث  
 کے ساتھ مشابہت ہے اس بارہ میں کہ اس کی تلاوت کو عبادت نہیں قرار دیا گیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا یہ تینوں  
 کلام اگرچہ نکلے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے دہن مبارک سے ہیں اور آپ کے انوار تینوں میں موجود ہیں  
 مگر پھر بھی ان میں یہ فرق ہے کہ قرآن میں جو نور ہے وہ قدیم ہے فات حق سبحانہ کا نور کہ اس کا کلام قدیم ہے



اور حدیث قدسی میں جو نور ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک کا نور ہے، اور نورِ قرآن کی طرح نہیں ہے، کہ قرآن کا نور قدیم ہے اور اس کا نور قدیم نہیں۔ اور غیر قدسی حدیث میں جو نور ہے وہ ذاتِ محمدی کا نور ہے لہذا نسبت کے لحاظ سے تین قسم کے نور ہو گئے کہ نورِ قرآن منسوب ہے ذاتِ باری عزاسمہ کی طرف اور حدیث قدسی کا نور منسوب ہے روحِ محمدی کی طرف اور عام احادیث کا نور منسوب ہے ذاتِ محمدی کی طرف صلی اللہ علیہ وسلم میں نے سوال کیا کہ نورِ روح اور نورِ ذات میں کیا فرق ہے؟ فرمایا کہ ذات پیدا ہوئی ہے مٹی سے اور مٹی ہی سے سب بندوں کی پیدائش ہے۔ اور روح کا تعلق ملائکہ اعلیٰ سے ہے اور ملائکہ اعلیٰ تمامی مخلوق میں سب سے زیادہ حق تعالیٰ کی معرفت رکھنے والی جماعت ہے۔ اور چونکہ ہر شے اپنی اصل کی طرف رجوع کیا کرتی ہے لہذا نورِ روح کو تعلق ہوگا خالق کے ساتھ، اور نورِ ذات کو تعلق ہوگا مخلوق کے ساتھ۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث قدسیہ کا تعلق جہاں بھی دیکھو گے حق تعالیٰ کے ساتھ دیکھو گے کہ یا اس کی عظمت ظاہر کرے گی یا اس کی رحمت اور یا اس کی وسعت ملک و کثرتِ علم اور چنانچہ مسلم میں ابوذر کی حدیث یا عبادی لو ان اولکم و آخرکم و انفسکم و جنکم الخ میں عظمتِ الہیہ کا اظہار ہے اور حدیث قدسی اَمَّا ذُو الْعِبَادِ الْصَلِیْحِیْنَ الْخِ رَحْمَتِ الْہِیْہِہِ کی منظر ہے اور حدیث یا اللہ فلا ی لا تغنیہا نفقۃ سحائب اللیل والنہار الخ اللہ کے وسعت ملک و کثرتِ عطا کو ظاہر کر رہی ہے اور ذاتِ باری میں ان کمالات کا علم روح کے ہی علوم میں سے ہے۔ اور غیر قدسی احادیث کو دیکھو گے کہ انکا روئے سخن صرف ان امور کی جانب ہے جن کا تعلق عباد و بلاد کی اصلاح (اور دنیا و مافیہا کے مصالح) کے ساتھ ہے مثلاً حلال و حرام چیزوں کی تفصیل یا عذاب و ثواب کا تذکرہ کہ حکمِ خدا کی تعمیل پر آمادہ کریں وغیرہ۔ یہ ناتمام خلاصہ ہے حضرت کی تقریر کا جو میں سمجھا ہوں ورنہ حق یہ ہے کہ میں نہ آپ کی جامع تقریر کو ضبط کر سکا اور نہ پورے مفہوم کو ادا کر سکا پھر میں نے سوال کیا کہ حدیث قدسی اللہ کا کلام بھی ہے یا نہیں۔ فرمایا نہیں، وہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے اللہ کا نہیں ہے۔ میں نے عرض کیا پھر وہ حق تعالیٰ کی طرف منسوب کیوں ہے؟ کہ اس کا نام حدیث قدسی رکھا اور اس کی روایت کرنے میں یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں کہ اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب سے روایت فرماتے ہیں۔ جب یہ کلام الرسول ہے تو پھر رب سے روایت کہاں ہوئی اور احادیث مذکورہ میں ضمیر متکلم کیسے صحیح ہوئی کہ اے میرے بندو، اور میں نے اپنے بندوں کے لئے فراہم کیا ہے، اور میرے کچھ بندے صبح کو مومن اُٹھے اور کچھ منکر۔ کیونکہ اس طرح تو فرمانا حق تعالیٰ ہی کا حق ہے نہ کہ رسول کا کام) لہذا احادیث قدسیہ کو اللہ کا کلام ہونا چاہیے اگرچہ قرآن مجید کی طرح نہ کہ ان کے الفاظ معجز ہوں اور نہ ان کی تلاوت داخل عبادت ہو۔ یہ سنکر ایک مرتبہ تو یہ تقریر فرمائی کہ حق تعالیٰ کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر انوار برسا کرتے تھے حتیٰ کہ آپ کو شاہدہ خاصہ حاصل ہوتا تھا۔ اگرچہ شاہدہ میں آپ ہر وقت رہتے تھے۔



مگر پھر بھی بعض انوار کی خصوصی شان آپ پر خصوصی مشاہدہ کا سبب بنتی تھی (پس اس مشاہدہ خاصہ میں اگر آپ کو انوار کے ساتھ ربلا واسطہ حق تعالیٰ کا کلام سنائی دیتا یا فرشتہ نازل ہوتا اور کلام الہی سناتا) تو وہ قرآن کہلاتا تھا۔ اور اگر نہ کلام سننے اور نہ فرشتہ آتا تو وہ وقت حدیث قدسی کا ہے اور اس حالت میں آپ جو کچھ بھی کلام فرماتے تھے وہ صرف شان ربوبیت کے متعلق ہوتا تھا کہ اسی کی عظمت و سطوت کا اظہار ہوتا تھا یا اُس کے حقوق شامانہ کا بیان رہا اس کا انتساب حق تعالیٰ کی طرف سوا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مشاہدہ خاصہ میں تمامی امور خلط ملط ہو جاتے تھے حتیٰ کہ باطن بحکم ظاہر اور غیب بمنزلہ شہادۃ بنجاتا تھا۔ لہذا اس کا انتساب رب کی طرف ہوا کہ اس کا نام حدیث ربانی رکھا گیا اور اس کے متعلق یہ کہا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو اپنے رب سے روایت فرماتے ہیں۔ اور ضمیروں کی وجہ یہ ہے کہ اپنے رب کی شان کو مشاہدہ فرما کر زبان حال (حق تعالیٰ کی طرف سے) نقل فرمایا۔ یا قی احادیث غیر قدسیہ آپ کا وہ کلام ہے جو ذات مطہرہ میں ہمہ وقت رہنے والے نور کے ساتھ دہن مبارک سے نکلا کہ وہ نور کسی حال بھی آپ سے جدا نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے جس طرح جرم آفتاب کو انوار محسوس سے نوازا ہے اسی طرح ذات محمدی کو انوار حق سے نوازا ہے کہ جیسے سورج کی روشنی سورج کے ساتھ لگی ہوئی ہے، کبھی جدا نہیں ہوتی۔ ایسے ہی ذات محمدی کے لئے نور حق لازم و دائم ہے کہ کسی وقت علیحدہ نہیں ہوتا لہذا کوئی حدیث بھی حقانیت سے خالی نہیں، دوسری مرتبہ اس کی شرح بصورت تمثیل اس طرح، بیان فرمائی کہ فرض کرو ایک شخص کو ایک خاص مقدار پر ہر وقت بخار رہتا ہے اور کسی وقت زور پکڑ کر اتنا تیز ہو جاتا ہے کہ ہوش و حواس کھو دیتا اور ایسی حالت کر دیتا ہے کہ وہ خود بھی نہیں سمجھتا کہ کیا کہہ رہا ہوں۔ اور کبھی اتنا تیز ہوتا ہے کہ حواس بھی معطل نہیں ہوتے اور عقل و شعور بھی قائم رہتا ہے کہ زبان سے جو کہتا ہے اس کو سمجھتا بھی ہے۔ پس بخار کی تین حالتیں ہوئیں ایک دائمی جو معین مقدار پر ہے دوم اتفاقی جس نے حواس کو معطل بنا دیا سوم بین بین کہ معتاد سے زائد ہے مگر حس و عقل قائم ہیں یہی حال ذات محمدی میں انوار حق کا ہے کہ جب وہ مقدار معین و معتاد پر ہوتے تھے تو ایسی حالت میں جو کلام فرماتے اُس کا نام حدیث ہے غیر قدسی اور جب وہ انوار ذات محمدی میں مشتعل ہوتے اور اتنا زور پکڑتے کہ آپ کو حالت معتادہ سے باہر اور حواس ظاہر یہ بشریہ سے بالا، بنا دیتے تو ایسی حالت میں دہن مبارک سے نکلا ہوا کلام قرآن کہلاتا ہے چنانچہ نزول قرآن کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی حالت ہوتی تھی اور جب ان انوار میں اشتعال تو ہوتا تھا مگر اتنا کہ آپ کو حالت معلومہ سے باہر نہ نکالتا تھا تو ایسی حالت کا کلام حدیث قدسی کہلاتا ہے۔ اور ایک مرتبہ اس کی تقریر اس طرح فرمائی کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک سے نکلا ہوا کلام اگر آپ کے اختیار و ارادہ کے بغیر نکلا ہے تب تو قرآن ہے اور اگر با اختیار و ارادہ نکلا ہے تو اُس کی دو صورتیں ہیں۔ اگر عارضی انوار بھی اس وقت مشتعل ہیں تو وہ حدیث قدسی ہے۔



اور اگر صرف دائمی انوار ہیں تو اس کا نام حدیث ہے غیر قدسی۔ اور چونکہ آپ کے ہر کلام کے ساتھ انوار حق سبحانہ کا ہونا لازم و ضروری ہے۔ لہذا جو کچھ بھی آپ کی زبان مبارک سے نکلا ہے وہ سب وحی الہی ہے۔ البتہ انوار کی حالتوں کے اختلاف سے اس کی تین قسمیں بن گئی ہیں واللہ اعلم۔ میں نے عرض کیا کہ بات تو بڑی پیاری ہے مگر سوال یہ ہے کہ حدیث قدسی اللہ کا کلام نہیں ہے، اس کی کیا دلیل ہے فرمایا اللہ کا کلام تو چھپ نہیں سکتا (گویا وہ خود کھدیتا ہے کہ میں کلام خدا ہوں) میں نے کہا کہ بذریعہ کشف؟ فرمایا کہ بذریعہ کشف بھی اور بلا واسطہ کشف بھی کہ حق تعالیٰ نے جس کو بھی عقل عطا فرمائی ہے جب وہ کلام اللہ پر کان لگائے گا اور اس کے بعد کسی دوسرے کا کلام مٹنے کا تو لامحالہ دونوں میں فرق محسوس کرے گا۔ دیکھو حضرات صحابہ کو کہ بیش از بیش عقل رکھتے تھے آبائی مذہب چھوڑ کر ان کو ادھر لگا لگا صرف کلام اللہ ہی ہے کہ عقل کے سبب قرآن کا کلام الہی ہوتا سورج کی طرح ان پر واضح ہو گیا، اور اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف احادیث قدسیہ جیسا کلام ہوتا (اور قرآن نازل نہ ہوتا) تو آپ پر متکبرین عرب اور صدی مشرکین میں، کوئی ایمان نہ لاتا۔ وہ چیز جس کے سامنے سبکی گردنیں جھک گئیں وہ قرآن مجید ہی ہے کہ اللہ سبحانہ کا کلام ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ان کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ اللہ کا کلام ہے حالانکہ وہ بت پرستی میں غرق تھے، اور اللہ کی پہچان و واقفیت ان کو پہلے سے نصیب نہ تھی پھر کیسے شناخت کیا کہ بیشک یہ اللہ کا کلام ہے زیادہ سے زیادہ یہ سمجھتے کہ بشری طاقت سے بالا کلام ہے اور اس جیسا کلام کوئی انسان نہیں کر سکتا سو ممکن ہے مثلاً فرشتوں کا کلام ہو۔ فرمایا (جلیے دھوپ پر جس کی بھی نظر پڑی اور آنکھ کی پتلی میں سرایت کر گئی ہے تو یہی ضروری علم اس کے دل میں پڑا ہے کہ یہ سورج کی روشنی ہے) اسی طرح جس نے بھی کلام الہی کو سنا اور اس کے معانی کو اپنے قلب میں اتارا ہے اس کو علم الیقین ہوا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے کیونکہ جو شان عظمت و شان کبریا فی اس میں موجود، اور جس سطوت برہمیت میں ہے وہ خالص عظمت ربوبیت اور محض سطوت الوہیت ہے۔ دیکھو ایک صاحب عقل انسان جب دنیا کے کسی پادشاہ کی تقریر سنے اور پھر اس کی رعیت کی تقریر سنے تو شاہی تقریر میں ایک خاص دم خرم پائیگا حتیٰ کہ فرض کرو کہ ایک اندھا کسی مجمع میں آ بیٹھے جہاں پادشاہ بھی جھپٹا بیٹھا ہوا دیکھ کر بعد دیگرے سب کی تقریر ہونے لگے تو جس وقت بھی پادشاہ کی تقریر اس کے کان میں پڑے گی وہ فوراً امتیاز کرے گا کہ پہلی تقریروں سے جدا ہے۔ اور یہ فرق ایسا بت ہوگا کہ برائے نام بھی اس کو شبہ نہ رہے گا کیونکہ جو حاکمانہ جلال و بے رعبی فطری طور پر اس کے لفظ بلفظ میں برسیگی وہ محکوم و مرعوب کی گفتگو میں کتنا ہی وہ اپنے کو نہائے اور متر پر ہاتھ مار مار کر گرے مگر نہیں ہو سکتی (جب فانی کا فانی کے ساتھ یہ رنگ ہے تو کیا پوچھنا کلام قدیم کا۔ حضرات صحابہ نے تو قرآن ہی سے اپنے رب کو پہچانا، اس کی صفات کو پہچانا، اور جس ربوبیت کا وہ مستحق ہے اس کو پہچانا۔ کہ صرف قرآن کا سننا ہی ان کے لئے اللہ کا علم الیقین حاصل ہونے میں اللہ کو آنکھوں سے دیکھنے کے قائم مقام ہو گیا اور حق سبحانہ،



و تعالیٰ ان کا ایسا (جاننا پہچانا) بن گیا جیسے ہنشین کردہ اپنے ہنشین پر کبھی نہیں چھٹتا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ کلام الہی کی پہچان کئی باتوں سے ہوتی ہے اول اس کا بشر بلکہ تمامی مخلوقات کی طاقت سے باہر ہونا کہ ہر کلام متکلم کے حسبِ علم ہوا کرتا ہے۔ اور حق تعالیٰ کا علم چونکہ محیط اور اس کا حکم نازل ہے (کہ اس کے اجراء کو کوئی ہستی روک نہیں سکتی) لہذا اس کا کلام اس کے موافق ہوگا اور مخلوق کا علم (ہرشی کو) محیط بھی نہیں اور اس کا حکم بھی عاجز ہے۔ کیونکہ دونوں دوسرے کے ہاتھ میں ہیں، لہذا اس کا کلام اس کے علم کے موافق ہوگا کہ وہ جانتا ہے میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔ دوم کلام الہی میں ایک خاص زور ہے جو دوسرے کے کلام میں نہیں کیونکہ ہر کلام اپنے متکلم کے احوال کا تابع ہوا کرتا ہے۔ لہذا کلام قدیم اپنے ساتھ الوہیت کی سطوت اور ربوبیت کی شان کبریائی لئے ہوئے نکلا گا، اور یہی وجہ ہے کہ جہاں اس میں (دشمنوں کے لئے سزا کی) دھمکی ہے وہیں اس میں (دوستوں کیلئے) انعام کا وعدہ بھی ہے۔ اور جہاں ڈراتا دھمکانا ہے وہیں خوشخبری سنانا ہے کہ (دونوں متضاد کیفیتیں) مخلوط اور ساتھ ساتھ ہیں اگر اس کے کلام میں اس شوکت و زور کے سوا اور کچھ بھی نہ ہوتا کہ وہ تکلم فرما رہا ہے درانحالیکہ سارا ملک اس کی ملک ہے، تمامی شہر اس کے زیرِ نگیں ہیں، سارے بندے اس کے غلام ہیں، زمین اس کی مقبوضہ ہے، آسمان اس کا مملوک ہے اور تمامی مخلوقات اس کی پیدا کردہ ہے، کوئی ہستی بھی اس کی مخالفت نہیں کر سکتی۔ تب بھی رہچاہے کے لئے، کافی تھا۔ اور دوسرے کے کلام میں لامحالہ ایک خوف کا اثر ہوگا کہ کیا ہی اعلیٰ سے اعلیٰ مقرر کیوں نہ فرض کر لیا جائے مگر اس کے باطن میں ضرور خوف الہی بھرا ہوگا اور حق تعالیٰ کو کسی کا ڈر نہیں کیونکہ وہ غلبہ والا ہے۔ لہذا اس کا کلام بھی غلبہ والا ہے۔ سوم یہ کہ کلام قدیم سے اگر حروفِ حادثہ کو علیحدہ کر دیا جائے اور خالص معانی قدیمہ باقی رہ جائے تو ان کا تکلم (ایک وقت) ساری مخلوق کے ساتھ ایسا پاؤ گے کہ ماضی و حال و استقبال میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ کیونکہ معنی قدیم میں نہ ترتیب ہے نہ تجزیہ (کہ یہ پابندی صرف الفاظ میں ہے جب تک پہلا حرف زبان سے نکل کر ختم اور فنا نہ ہو جائے گا دوسرا حرف کبھی نہ نکل سکے گا) اور صاحبِ بصیرت کی نظر اول معنی قدیم پر پائی جاتی ہے اور دیکھتا ہے کہ ان کی کوئی حد و انتہا نہیں۔ اس کے بعد حروف پر نظر ڈالتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک صورت ہے کہ اس میں معنی قدیم کو چھپا دیا گیا ہے لہذا جب اس صورت کو علیحدہ کرتا ہے تو ایک غیر متناہی شے دکھائی دیتی ہے، یہ تو باطن قرآن ہے اور جب صورت پر نگاہ ڈالتا ہے تو اس کو دو پٹھوں میں محدود اور اوراق میں محصور و محبوس دیکھتا ہے، اور یہ ظاہر قرآن ہے۔ اور جب کان لگا کر قرآن کو سنتا ہے تو معانی قدیمہ کو طے الفاظ میں رکھا ہوا ایسا صاف دیکھتا ہے کہ محسوسات جس طرح حاسہٴ بصر سے چھپ نہیں سکتیں اسی طرح وہ معانی قدیمہ اس کی نگاہِ بصیرت سے چھپ نہیں سکتے۔ چہارم ماہِ الفرق وہ امتیاز ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آپ کے کلام اور کلام الہی کے درمیان واقع ہوا ہے کہ آپ نے کلام اللہ کے لکھنے (اور سینہ کے علاوہ کاغذ میں بھی



محفوظ رکھنے کا حکم فرمایا، اور دوسرے کلام کو کھٹنے کی ممانعت فرمائی۔ بلکہ دوسرا کلام اگر کسی نے لکھ لیا تھا تو اس کو محو کرنے کا حکم فرمایا۔ مبادا کسی زمانہ میں تحریر کو دلیل قرار دے کر کوئی غیر اللہ کے کلام کو کلام اللہ نہ سمجھ بیٹھے اور یہ جو کہیں ثبوت ملتا ہے کہ صحابہ نے احادیث قدسیہ کو بھی لکھ لیا تھا۔ سوا اول تو ان کی کتابت انہوں نے کلام الرسول قرار دے کر کی تھی نہ کہ منجملہ کلام اللہ کے سمجھ کر اور اسی لئے یہ سُرخ دھڑے کر اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب سے روایت فرمایا ہے اس کو قرآن کے ساتھ خلط ہونے سے جدا کر دیا تھا) علاوہ ازیں تہ امور یعنی بشری طاقت سے خارج ہونا اور روایات جو اس کے بعد بیان کی ہیں اُن میں سے ایک بات بھی اُن میں نہیں پائی جاتی۔ یہ ہے خلاصہ جو عام احادیث اور حدیث قدسی اور قرآن میں فرق کے متعلق حضرت کے اشارات سے ہم نے سمجھا ہے اور آپ کا یہ جواب کہ جو شخص بھی اللہ کا کلام سُنے گا اور پھر دوسرے کلام اس کے کان میں پڑے گا تو لا محالہ وہ دونوں میں ایک بتین فرق پائے گا۔ اس کے قریب قریب امام ابو بکر یا قلانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کتاب الامتصار میں اشارہ کیا ہے اور اس پر بہت زور دیا ہے اور خوب لکھا ہے جو دیکھنے کے قابل ہے۔ حتیٰ کہ اسی سے ردافض کے بہترے دعویٰ جن میں غیر قرآن کو انہوں نے قرآن کی طرف منسوب کیا ہے، رد فرمائے ہیں۔ اگر اندیشہ طوالت نہ ہوتا تو ہم ان کی تقریر بھی نقل کر دیتے۔ الحاصل حضرت کا پہلا ہی جواب سُنکر میں حیران ہو گیا کہ حضرت نے فی البدیہہ وہ سارا مضمون ادا فرما دیا جو امام مذکور نے بیان کیا تھا۔ (چہ جائیکہ چار جواب زائد) اور پانچواں فرق جس پر حضرت نے تقریر کو ختم کیا تھا۔ اور بھی بیان فرمایا مگر اس کا تعلق خالص کشف سے ہے لہذا ہم نے اس کو نہیں لکھا کہ عقول عامہ سے بالا ہے پس مقدمہ کتاب میں اتنا ہی لکھنا کافی ہے اس لئے اس کو ہمیں ختم کرتے ہیں اور چونکہ مقصود یہ ہے کہ حضرت کی معلومات و ملفوظات جو ہمارے سننے میں آئے ان کو یکجا جمع کر دیں لہذا اب اس کو شروع کرتے ہیں اور ملحوظ مبحث چند ابواب میں اس کی ترتیب دیتے ہیں۔

(پہلا باب) وہ احادیث جن کا مطلب ہم نے حضرت شیخ سے دریافت کیا۔

(۱) ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے یہ حدیث مروی ہے کہ ایک دن جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور آپ کے دونوں ہاتھوں میں دو کتابیں تھیں۔ جو کتاب آپ کے داہنے ہاتھ میں تھی اس کے متعلق آپ نے فرمایا کہ یہ کتاب میرے رب العالمین کی طرف سے ہے جس میں تمامی اہل جنت کے نام درج ہیں مع اُنکی ولایت اور قومیت کے اور اب ان میں نہ کسی کا اضافہ ہو سکتا ہے نہ کسی کی کمی ہو سکتی ہے۔ پھر جو کتاب آپ کے بائیں ہاتھ میں تھی اس کے بارہ میں فرمایا کہ یہ کتاب ہے رب العالمین کی طرف سے جس میں اہل جہنم کے نام درج ہیں مع ان کی ولایت اور قومیت کے، اور اب اُن میں نہ کوئی نام بڑھایا جاسکتا ہے اور نہ گھٹایا جاسکتا ہے اس کے بعد آپ نے ہاتھ سے اشارہ فرمایا کہ ان کو پھینک دیا۔ اور فرمایا تمہارا پروردگار بندوں سے فراغ پا چکا اور



فیصلہ آخر لکھا جا چکا کہ یہ فریق جنت میں جانے والا ہے اور یہ گروہ دوزخ میں۔ اس حدیث پر ایک عالم نے اشکال دار کیا کہ ایک چھوٹے سے کاغذ میں جس کو ہاتھ اٹھا سکے اتنے بے شمار نام جن کے لئے بڑے سے بڑا جڑ بھی ناکافی ہے۔ کیسے سما گئے خصوصاً جبکہ نہ چھوٹے جسم کو بڑا بنایا گیا اور نہ بڑی چیز کو چھوٹا کیا گیا۔ یہ عقلاً محال ہے حالانکہ علماء کلام کا قول ہے کہ قدرت الہیہ کا تعلق ممکنات سے ہے نہ کہ محال سے اور یہ حدیث ہے قول نبی معصوم کا جس کا ہر کلام وحی الہی ہے (پھر دونوں میں تطبیق کی کیا صورت ہے) حضرت نے اس کا جواب تحریر فرمایا کہ علماء کلام کا قول بالکل صحیح اور اہل سنت والجماعہ کا عقیدہ یہی ہے حتیٰ کہ ولی کی کرامت اور نبی کے معجزات میں ایک چیز بھی ایسی نہیں جو عقلاً محال ہو البتہ بعض صورتوں کے سمجھتے سے عقل قاصر ضرور ہوتی ہے مگر جب اسکی حقیقت سے آگاہی ہوتی ہے تو فوراً عقل اس کو تسلیم کر لیتی ہے (جیسے ہوائی جہاز کی پرواز کہ اس کی ایجاد سے پہلے جب کہا جاتا تھا کہ لوہے اور لکڑی کا ایک بڑا مکان پرندوں کی طرح ہوا میں اڑے گا اور اس کی باگ انسان کے ہاتھ میں ہوگی کہ جرمن و جاپان جس ملک میں چاہے گا اُتارے گا اور جہاں سے چاہے گا معلق اُٹھا کر ریل کی طرح چلا گا تو اس کو ناممکن بنایا اور کہنے والے کو دیوانہ قرار دیکر مذاق اُڑایا جاتا تھا مگر جب مشاہدہ میں آگیا اور حقیقت کھل گئی تو عقل نے فوراً مان لیا کہ اب بیسیوں جہاز اُڑتے ہوئے دیکھتا ہے اور حیرت بھی نہیں ہوتی۔ لہذا ارشاد محمدی کی حقیقت سمجھو کہ) مراد قلم کی لکھت نہیں ہے بلکہ نظر کی لکھت ہے (جیسے پچاس سال آئینہ کی تجاویز کا ایک طومار کسی مدبر کی قوت فکر یہ میں آوے اور وہ آنکھیں بند کر کے اس کو مسلسل پڑھنا شروع کرے اور کہے کہ یہ سب میری نظر کے سامنے ہے تو مراد نظر چشم نہیں بلکہ نظر خیال ہے) اس کی شرح یہ ہے کہ صاحب بصیرت شخص خصوصاً سید الاولین والآخرین سیدنا و مولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا قصد جب کسی چیز کے دیکھنے کی طرت متوجہ ہوتا تو آپ کے اور اس شے کے درمیان جتنے پردے حائل ہوتے تھے آپ کی بصیرت اُن کو بھاڑتی چلی جاتی تھی حتیٰ کہ اس کی روشنی اس شے تک پہنچتی اور اس کو محیط ہو جاتی تھی کہ اس کا ریشہ ریشہ نظر آ جاتا تھا جیسے آلہ ایکس رے کی برق بڑی اور چپے کے اندر گھسٹی چلی جاتی ہے کہ یہ پردے جو نگاہ چشم کے لئے آڑ بنے ہوئے ہیں برق اُن کو بے تکلف پار کر جاتی اور اندر کی ذرہ ذرہ چیز کا نقشہ کھینچ لاتی ہے) پھر یہ بصیرت بھی مہذبہ آلہ کے ہے لہذا اس کا حکم متعدی ہوتا ہے نور بصر کی جانب کہ جو طاقت بصیرت کو حاصل تھی وہ بصر کو بھی حاصل ہو جاتی ہے اور جو چیز بھی اُس وقت سامنے ہوتی ہے اُسی میں وہ شے منقوش دکھائی دیتی ہے کہ دیوار سامنے ہوئی تو دیوار میں اور ہاتھ مقابل ہوا تو ہاتھ میں اور کاغذ مقابلہ پر ہوا تو کاغذ میں (جیسے ایکس رے کی برق محض آلہ ہے اندرون شکم پہنچ کر جس جس چیز کو بھی دیکھا ہے اُسے نوٹو کے کاغذ تک ایسا صاف پہنچا دیتی ہے گویا یہ کاغذ ہی دیکھ رہا ہے اور پھر اس کا پورا نقشہ کھینچ کر نگاہ چشم کے سامنے آتا ہے) اسی حقیقت پر اُس حدیث کو متفرع کیا جائے گا۔



جو مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ”مجھے اس دیوار میں جنت اور دوزخ کھڑی نظر آئیں“ الخ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بصیرت کاملہ جبکہ آپ نماز کسوف میں مشغول تھے جنت و دوزخ کی طرف متوجہ ہوئے لہذا تمامی پردے پھاڑ کر وہاں پہنچی اور پھر اس کو نور بھرتک لاکر اس دیوار میں منقوش کر گئی جو اُس وقت آپ کے سامنے تھی۔ لہذا آپ نے فرمایا کہ مجھے اس دیوار میں جنت و دوزخ مجسم کھڑی دکھائی گئیں اسی حقیقت پر یہ حدیث متفرع ہے۔ پس اگر دیوار میں جنت و دوزخ نظر آنے کی حدیث پر اشکال ہے تو اس اسماء بہشتاں و دوزخیان کی کتاب والی پر بھی اشکال ہے، اور اگر اس پر کوئی اشکال نہیں تو اس پر بھی کوئی اشکال نہیں۔ غرض اشکال کا مبنی صرف یہ ہے کہ کتاب کو قلمی کتابیت سمجھ لیا حالانکہ وہ نظری کتابیت تھی۔ علاوہ ازیں اگر قلمی کتابیت ہوتی تو یہی حدیث اپنے آخری حصہ سے متناقض ہوگی کہ اس میں مذکور ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کتابوں کو پھینک دیا۔ پھر جو تحریر اللہ جل جلالہ کی طرف سے آئی ہو، بالخصوص جبکہ اس میں اللہ کے مقبول و برگزیدہ اور بہترین مخلوقات حضرات انبیاء و اولیاء و صالحیاء کے اسماء مقدسہ لکھے ہوئے ہیں اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پھینک دیتے جبکہ آپ سے زیادہ اللہ جل جلالہ اور اس کے پیغمبروں اور فرشتوں کی تعظیم کرنے والا ساری مخلوق میں کوئی بھی نہیں۔ الحاصل تحریر سے مراد صرف وہ صورت ہے جو (بواسطہ بصیرت) نظر کو حاصل ہوئی اور نظر میں اُس کا آجانا نہ محال ہے نہ مشکل کہ آخر تمامی مریات رات دن نظر ہی میں سماقتی رہتی ہیں اور باوجود اس کے بہت چھوٹا ہونے کے بڑی سے بڑی چیز اس میں منقوش ہو جاتی ہے حتیٰ کہ آسمان باایں وسعت نامحدود آنکھ کی اسی مسور کی دال سے چھوٹی تپکی میں سما جاتا ہے لہذا حدیث مذکور از قسم ممکنات ہوئی اور یہی حال ہے تمامی معجزات اور شوارق کا کہ از قسم محالات نہیں بلکہ عوام کی عقل ان کی حقیقت سمجھنے سے قاصر رہ گئی واللہ اعلم۔

(۱۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ یہ قرآن سات حرفوں پر نازل کیا گیا ہے اس کے متعلق میں نے حضرت ممدوح سے چند مرتبہ استفسار کیا اور حضرت نے مجھے متعدد جواب بھی دئے مگر تسکین نصیب نہ ہوئی اور مجھے شافی جواب کا شوق و انتظار لگا رہا کیونکہ اشکال کا اصل سبب یہ ہے کہ لفظ حرف کا مفہوم بروئے لغت بالکل واضح ہے، اور حبیب اشکال سورتوں کے شروع حروف مثلاً الحمد ص ق ن وغیرہا کی مراد سمجھنے میں ہے، لفظ حرف کا مفہوم سمجھنے میں کوئی اشکال بھی نہیں۔ مگر ترجمہ آنا واضح ہونے کے باوجود حضرات علماء کا اس میں اتنا اختلاف ہوا ہے کہ دیکھنے والے کی حیرت میں اضافہ ہی ہوتا ہے اس لئے کہ جناب رسول اللہ علیہ وسلم کی مراد ظاہر ہے کہ ایک ہی ہوگی مگر علماء کے اختلاف کی تعداد اس کے معنی بیان کرنے میں چالیس اقوال تک پہنچ چکی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معنی بہت ہی دقیق اور چھپے ہوئے ہیں، اور پھر بھی ممکن ہے کہ اصل مراد ان تمامی اقوال سے باہر اور ہی کچھ ہو۔ حالانکہ یہ حدیث حضرت عمر بن الخطاب



ہشام بن حکیم۔ آبی بن کعب، عبد الرحمن بن عوف، عثمان بن عفان، عمر بن ابی سلمہ۔ ابو جہیم۔ سمرہ بن جندب، عمرو بن العاص۔ ام ایوب انصاریہ وغیرہ بکثرت صحابہ سے منقول ہے رضی اللہ عنہم اجمعین۔ ابولعلی موصلی تو اپنی مسند کبیر میں یہ روایت لائے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خطبہ پڑھنے کے لئے ممبر پر کھڑے ہوئے اور حاضرین سے فرمایا میں تم کو اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ جس نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ سے یہ حدیث سنی ہو کہ بیشک قرآن نازل کیا گیا ہے سات حرفوں پر، وہ اٹھ کھڑا ہو۔ یہ سنکر چہار جانب سے بیٹھا صحابہ کھڑے ہو گئے کہ ہر شخص کہتا تھا ہاں حضرت کو یہ فرماتے ہوئے میں نے سنا ہے۔ پھر حضرت عثمان نے فرمایا ہاں حضرت کو یہ فرماتے میں نے بھی سنا ہے۔ اسی بنا پر ابو عبیدہ وغیرہ حفاظ حدیث نے تو یہاں تک کہا ہے کہ یہ حدیث احادیث متواترہ میں سے ہے (مزید برآں) اکثر علماء سلف و خلف نے اتنا اہتمام فرمایا ہے کہ خاص اسی مسئلہ میں مستقل کتابیں تصنیف کر دیں جن میں بہترین تحریرات جو میری نظر سے گزری ہیں چار اجلہ علماء کی ہیں۔ اول علامہ ابوبکر یا قلائی کی تحریر کتاب الانتصار میں کہ خوب ہی مسئلہ کو کھولا اور واضح کیا ہے۔ دوم حافظ کبیر ابن الجزری کی تحریر النشر میں کہ دس فصیلیں بنا کر پوری بحث کی ہے اور جن جن صحابہ سے یہ حدیث مروی ہے ان کی بڑی تلاش کی ہے۔ سوم امام المحدثین علامہ ابن حجر کی تحریر بخاری کی شرح میں بذیل کتاب فضائل القراء۔ چہارم علامہ جلال الدین سیوطی کی تقریر کتاب الاتقان فی علوم القراءت میں تفصیل وار چالیس اقوال نقل کئے ہیں۔ مگر باوجودیکہ میں چاروں اکابر علماء کی تمامی تحقیق سے آگاہ ہو چکا اور از ابتداء تا انتہا اس کے ظاہر و باطن کو خوب سمجھ چکا ہوں مجھے اس کا غلبہ ظن بھی نصیب نہ ہوا کہ لفظ حرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ ہے۔ بلکہ اس کی تعیین بدستور مشتبہ رہی لہذا میں نے حضرت ممدوح سے ایک مرتبہ عرض کیا کہ میرا مقصود صرف یہ دریافت کرنا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد سات حرفوں سے کیا ہے فرمایا اچھا کل کو انشاء اللہ جواب دیں گے۔ اگلا دن ہوا تو فرمایا اور بیشک جو فرمایا وہ سچ فرمایا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق آپ کی مراد دریافت کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مراد یہ ظاہر فرمائی۔ چنانچہ کامل عین دن میں نے حضرت شیخ سے بحث کی اور آپ مراد محمدی کی وہ تفصیل بیان فرماتے رہے اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ اس حدیث کی تو بڑی شان ہے، اور ایسے اسرار سننے میں آئے جن کی کیفیت ناقابل بیان ہے میں اس کے متعلق جتنا لکھ سکتا ہوں اس کو پیش کرتا ہوں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک کو فطرۃ ایک خاص قوت عطا فرمائی گئی ہے جس کے انوار کی سات قسمیں ہیں اور ان ساتوں انوار کے دو، دو رخ ہیں۔ ایک بجانب حق سبحانہ، اور دوسرا بجانب خلق، پہلا رخ (موسلا دہر بارش کی طرح) ہر وقت برستا رہتا ہے کہ نہ کبھی ختم ہوتا ہے نہ اس کی رفتار سست پڑتی ہے پس حق تعالیٰ جب آپ پر قرآن کی کوئی آیت نازل فرماتا تو اس رخ اول کے نور کا سب نہیں بلکہ



کچھ حصہ اس کے ساتھ نازل فرماتا تھا۔ اس لئے کہ وہ نور بجہت حق سبحانہ سقمتا تو کسی وقت بھی نہیں، لہذا جتنا بجہت خلق اُترتا تھا وہ اس کا کچھ حصہ ہوتا تھا اس کے بعد دوسری آیت نازل فرماتا تو اس کے ساتھ دوسرے نور کا کچھ حصہ ہوتا تھا۔ پھر مثلاً تیسری آیت نازل ہوتی تو تیسرے نور کا کچھ حصہ ہوتا تھا۔ اسی طرح ہر آیت کے ساتھ ان ساتوں

انوار میں کسی نور کی معیت ضرور ہوتی تھی اور سات حروف سے یہی سہفت انوار مراد ہیں) میں نے عرض کیا کہ وہ سہفت انوار کیا ہیں فرمایا حُرَّتِ نبوت، حُرَّتِ رسالت، حُرَّتِ آدمیت، حُرَّتِ روح، حُرَّتِ علم، حُرَّتِ قبض اور حُرَّتِ بسط۔ چنانچہ حُرَّتِ نبوت کی شناخت یہ ہے کہ آیت شریفہ صبر کا حکم دے رہی ہو حق راہ بتا رہی ہو اور دنیا و لذات دنیا سے زہد و نفرت دلارہی ہو۔ کیونکہ نبوت کا طبعی خاصہ ہے حق کی طرف جھکنا اور زبان سے حق بات کا کہنا۔ راہ حق پر چلانا۔ اور اس میں خیر خواہی خلق کا حق ادا کرنا۔ اور حُرَّتِ رسالت کی علامت یہ ہے کہ آیت شریفہ میں بحث ہو عالم آخرت اور اس کے درجات و مقامات سے اور تذکرہ ہو ان کے ثواب وغیرہ کا اور حُرَّتِ آدمیت کا حاصل وہ نور ہے جس کو حق تعالیٰ نے بنی آدم میں رکھا اور ان کو اس کلام کی قدرت بخشی جو آدم کی طرف منسوب ہے، اور جس کی بنا پر ان کا کلام ملائکہ اور جنات اور تمامی متکلم مخلوقات کے کلام سے ممتاز اور جدا ہے اور اس نور کو باوجودیکہ وہ ہر آدمی میں موجود ہے (ذات محمدی کے) سہفت انوار میں شامل اس لئے کیا گیا ہے کہ آپ صفائی و طہارت میں (کہ خاصہ ہے اس نور کا) مستہیا پر پہنچے ہوئے ہیں کیونکہ ذات محمدی کو طہارت و صفائی میں وہ کمال حاصل ہے جس سے اوپر کوئی کمال نہیں۔ اور نہ ذات محمدی کے سوا کسی میں اس کا ہونا ممکن ہے۔ الغرض جب یہ نور جس سے انسانی کلام وقوع و قوع میں آتا ہے۔ ذات محمدی میں نور نبوت، نور رسالت، نور روح، نور علم، نور قبض اور نور بسط کے ساتھ جمع ہوگا تو ظاہر ہے حد درجہ کامل ہوگا کہ اس نور کو مدد ملے گی ان چھ انوار مذکورہ سے۔ لہذا آپ پر آیات قرآنیہ کا نزول ہوگا درآنحالیکہ کوئی آیت بھی اس نور سے خالی نہ ہوگی کیونکہ قرآن مجید کا نزول اسی بشری لغت میں ہوا ہے اور حُرَّتِ روح کی علامت یہ ہے کہ آیت شریفہ کا تعلق محض حق تعالیٰ کی ذات و صفاتِ علیہ کے ساتھ ہو اور مخلوق کا اس میں کوئی تذکرہ نہ ہو۔

اور حُرَّتِ علم کی علامت یہ ہے کہ آیت شریفہ میں اتم ماضیہ اور گذرے ہوئے حالات کی بحث ہو مثلاً عاد و ثمود و قوم نوح اور قوم ہود و قوم صالح وغیرہ کی خبریں، یا تنبیہ ہو کسی رائے کے مذموم ہونے پر جیسے حق تعالیٰ کا ارشاد اُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْأَعْدَىٰ الرَّاسِ اس میں اس رائے کی غلطی ظاہر فرمائی ہے کہ کافروں نے ہدایت کے بدلہ گمراہی کو خرید لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تجارت با نفع نہ ہوئی بلکہ تجارت کا سلیقہ ہی کھو بیٹھے) الحاصل حُرَّتِ علم ہی پر نزول ہوگا قصص اور مواعد اور حکم وغیرہ کا اور یہی نور ہے جس کو عطا ہو اس کی نادانیت کو بالکل زائل کر کے ایسا واقف کامل بنا دیتا ہے کہ فرمن کر و ایک شخص کسی بلند پہاڑ میں پیدا ہوا اور وہیں ملا



سہا ہو حتیٰ کہ جوان ہو گیا ہو اور کبھی کسی بشر یا جن سے نہ ملا ہو، پھر اس کو شہر میں لایا جائے اور صورت یہ ہو کہ حق تعالیٰ نے اس کو علم سے اس کی مدد فرمائی ہو تو جس نے عمر بھر تحصیل علم میں گزاری ہو وہ اس کے ساتھ کسی بحث میں بات بھی نہ کر سکے گا اور اس کی وہی معلومات کے سامنے اُس کی کسی معلومات کو پاسنگ کا درجہ بھی نہ ملے گا اور حروف قبض کی علامت یہ ہے کہ آیت کا روئے سخن اہل کفر و ظلمت کی طرف ہو کہ کبھی ان پر بدعا ہو اور کبھی ڈانٹ اور کبھی دھمکی مثلاً فرمان الہی فی مَلُوْا بِہِم مَّرَضٌ الْآیۃ اُن کے قلوب میں (ظلمت و شک کا) مرض ہے پس اللہ نے ان کے مرض میں اضافہ فرمایا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ ان کے کرتوتوں کی سزائیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ نور کا شکر اور ظلمت کا شکر باہم ہمیشہ جنگ میں رہتے ہیں پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر حجب ظلمت کی طرف جاتی تھی تو آپ کو ان قباض ہوتا تھا اور آیات مذکورہ اس حالت میں دہن مبارک سے نکلتی تھیں۔ اور حروف لیس کی علامت یہ ہے کہ آیت شریفیہ میں مخلوق پر نعمت ہائے خداوندی اور ان کی تفصیل سے بحث ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ حجب اللہ کے انعامات پر جاتی تھی تو آپ کو انبساط ہوتا تھا اور آیت مقام لیس سے نکلتی تھی۔ حضرت ممدوح نے فرمایا کہ یہ حروف سبعہ میں ہر حرف کی علامت تقریباً ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ساتوں حروف میں ہر حرف تین سو چھپا سٹھ وجوہ ہیں۔ ہر وجہ کی شرح کی جائے اور ہر آیت میں جتنی بھی وجوہ ہیں ان کو واضح کیا جائے تو لوگوں کو باطن محمدی آفتاب کی طرح روشن ہو جائے (پھر ناممکن ہے کہ آپ پر ایمان لئے بغیر کوئی بھی رہے) مگر وہ سراسر الہی ہے جس کا اخفا واجب ہے۔ ہاں جس کو حق تعالیٰ نے فتح کبیر عطا فرمائی ہے اُسے خود ہی علم حاصل ہو گیا ہے مگر جس کو فتح نصیب نہیں، ضروری ہے کہ اُسے اس کی حالت پر چھوڑا جائے (کہ تقدیر الہی جہنم کے متعلق پوری ہو) میں نے عرض کیا کہ اس باب میں جتنی بھی حدیث آئی ہیں وہ اس پر دلالت کر رہی ہیں کہ حروف سبعہ سے مراد ایسی شے ہے جسے قرآنی الفاظ کے لفظ کی کیفیت کے ساتھ تعلق ہے۔ مثلاً حضرت عمر کا ارشاد کہ میں نے ہشام بن حکیم کو ان حروف پر قرآن مجید پڑھتے ہوئے سنا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نہیں پڑھائے تھے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کا صحیح ہونا ظاہر کیا اور ارشاد فرمایا کہ قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے، جسے جو بھی آسان معلوم ہو وہ پڑھے۔ اور حضرت کی تقریر کا مطلب یہ ہے کہ حروف سبعہ ذات محمدیہ کے باطن اوصاف اور بانی انوار ہیں سبب ان میں حضرت ہشام اور حضرت فاروق کا اختلاف کیسے ممکن ہے کہ ان کو حضرت یہ جواب عطا فرمادیں کہ قرآن سات انوار ربانیہ پر نازل ہوا ہے حضرت نے فرمایا کہ تلفظ کا اختلاف جو کچھ بھی اس بار میں حدیثوں کے اندر مذکور ہے وہ فرع ہے ان ہی انوار باطنیہ کے اختلاف کی کہ حروف کا جزم اور پیش ناشی ہے تو قبض سے۔ اور زیر ناشی ہے حروف رسالت سے۔ اور زیر ناشی ہے حروف آدمیت سے۔ اور ہر آیت کے لئے ایک فتح حاصل اور فوق مخصوص ہے۔ جب میں نے حضرت کی یہ نورانی تقریر



سُنی تو میں نے سورہ فاتحہ اور شروع سورہ بقرہ کی آیتیں پڑھیں، اور حضرت نسان انوار باطنیہ کو ہر لفظ پر مرتب فرما کر مجھے دکھایا، اور پھر میں نے ان آیات کو امام نافع ابن کثیر ابو عمرو ابن العلام ابن عامر معاصم حمزہ اور کسائی کی جدا جدا قرات میں پڑھا تو حضرت سے عجیب و غریب لفظ میں تے سُنے اور معلوم ہوا کہ ان قراءت سب کے اختلافات بیشک انوار باطنیہ ہی کے اختلاف پر متفرع ہیں۔ اس وقت مجھے تسکین ہوئی اور جس بات کی جستجو کرتے مجھے بیس سال سے زائد گزر چکے تھے الحمد للہ مجھے مل گئی۔ اس تفریع کے ضمن میں چونکہ حضرت نے فرمایا کہ اس آیت میں مثلاً کچھ منجملہ اجزاء نبوت کے ہے اور کچھ منجملہ اجزاء رسالت کے حتیٰ کہ اسی تفصیل سے انوار سب کے اجزاء ظاہر کئے۔ لہذا میں نے عرض کیا کہ ان حروف سب کے اجزاء کی تفصیل اور بیان فرما دیجئے تاکہ نائدہ مکمل اور نفع تام ہو جائے فرمایا ہاں سنو! ان ساتوں حروف میں ہر حرف کے سات اجزاء ہیں کہ سب کا مجموعہ انچاس ہو جائے گا۔ پس آدمیہ کا جزء اول: صورت ظاہری کا کمال حُسن ہے کہ مثلاً ہا تھ بھی نہایت حسین ہوں، پاؤں بھی نہایت حسین ہوں، انگلیاں بھی نہایت حسین ہوں غرض بدن کا ہر عضو کمال خوبصورت ہو نیز ان کا منظر بھی حُسن میں اکمل ہو کہ رنگ میں مثلاً چمک اور صفائی اعلیٰ درجہ کی ہو وغیرہ ذلک جزء دوم جسم کے ظاہری منافع کا کمال ہے۔ کہ مثلاً احواس خمسہ ظاہریہ میں قوت سماعت بھی اکمل ہو قوت بصر بھی اتم ہو قوت شامہ بھی اکمل ہو قوت بصر بھی اتم ہو قوت ذائقہ بھی اتم ہو قوت لامسہ بھی اکمل ہو۔ اسی طرح آواز بھی نہایت پیاری ہو گفتار گو یائی بھی قوی تر اور بہترین ہو فصاحت و بلاغت بھی بدرجہ اتم ہو وغیرہ وغیرہ۔ جزء سوم: صورت باطنیہ کا کمال حُسن ہے کہ مثلاً قلب کی شکل بھی اعلیٰ درجہ کی معتدل ہو جگر کی ساخت بھی بہترین ہو دماغ کی خلقت بھی عجیب ترین ہو۔ رگیں اور پٹھے بھی افضل ترین ہوں غرض اعضاء باطنیہ میں ہر عضو کمال اعتدال اور حُسن نفع اور کام کے لئے وہ بنایا گیا ہے اس میں حد درجہ کی خوبی کے لئے ہوئے ہو۔ جزء چہارم: کمال حُسن باطنی ہے کہ مثلاً لذت اور حُسن سے وجدان کا متاثر ہونا بدرجہ کمال پہنچا ہوا ہو۔ جزء پنجم: ذکوریت ہے کہ جزء ہے کمال انسانی کا کہ اس میں سرفعل (اور قوت تاثیر) ہے اور انوشیت میں سرانفعال (اور مادہ تاثیر) ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے آدم کو خاص اپنے لئے پیدا فرمایا، اور باقی تمام چیزوں کو آدم کے لئے پیدا فرمایا، جن میں عورتیں بھی داخل ہیں۔ اور چونکہ سب چیزوں کو آدم کے لئے پیدا فرمایا لہذا ان کو سرفعل عطا فرما کر خلیفہ بنایا کہ تمامی اشیاء میں فاعل متصرف بنیں) اور یہی سرفعل ان کی تمام اولاد ذکور میں قیامت تک کے لئے ودولیت فرمایا جزء ششم شیطانی حصہ کا نکال لینا ہے کہ آدمیت کی تکمیل اسی سے ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے شق صدر کی کہ فرشتوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک چاک کر کے قلب میں سے نکالا جو نکالنا تھا اور اس کو دھویا جس شئی بھی دھونا تھا اور اس کو بھر دیا ایمان و دانش سے۔ جزء ہفتم: کمال عقل ہے کہ صفائی و معرفت



میں حد درجہ پہنچی ہوئی ہو اسی طرح قبض کے بھی سات اجزاء ہیں۔ اول وہ حاسہ ہے جو ذات انسانی میں رکھا ہوا اور اس کے تمامی جواہر میں پھیلا ہوا ہے کہ اسی کی وجہ سے ہر عضو اور ہر جوہر اچھی چیز میں مزہ پاتا ہے اور بڑی چیز سے تکلیف مثلاً قوت ذوق کو شہد کے مٹھاس سے لذت ملتی ہے، اور اندرائیں کی کرواہٹ سے کلفت پہنچتی ہے دوم انصاف ہے کہ یہ بھی قبض کا جزو ہے اور اس کے بغیر قبض کامل نہیں ہوتا کیونکہ اس وقت بحث نورانی قبض میں ہے۔ پس اگر اس کے ساتھ انصاف نہ ہوگا تو وہ قبض ظلمانی بن جائے گا اور اسے قبض والا شخص غضب الہی کا مستحق ہوگا۔ سوم ضد سے نفرت ہے جیسا کہ ہر چیز کو اپنی ضد سے نفرت ہوا کرتی ہے پس اس نور کے ہر جزو سے حسن کو اپنی ضد یعنی قبح سے ایسی نفرت ہوگی کہ اس کے ساتھ جمع نہ ہو سکے گا۔ چہ جیسے سپیدی نہیں جمع ہو سکتی سیاہی کے ساتھ اور قیام جمع نہیں ہو سکتا غور کے ساتھ۔ چہارم حق بات کہنے میں نہ شرماتا ہے کہ کتنا ہی تلخ ہو کہنے سے نہ چوکے اور اللہ کے بارے میں طعن و ملامت کا اندیشہ اسکی زبان کو نہ پکڑے پنجم تعمیل احکام ہے کہ بحث قبض نورانی میں ہے اور حب قبض کے ساتھ شریعت کی مخالفت آمیلگی تو وہ ظلمانی بن جائے گا اور ایسے قبض والے پر حق تعالیٰ کی ناراضی لازمی ہے ششم ہم جنس کی طرف میلان کامل ہے کہ اس میں گھل مل جائے۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کو یہ کہتا سنتے کہ اللہ برحق ہے اور وہ ہمارا خالق ہے وہ ہمارا روزی رسان ہے وہ لیگانہ ہے کہ ملک میں اس کا کوئی شریک نہیں وغیرہ وغیرہ تو آپ کا قلب اس قول کی طرف کھینچتا تھا اور اس کی محبت اس حد پر پہنچتی تھی کہ آپ کے اعضاء میں انشراح پیدا ہوتا اور وہ اس کلام کی کیفیت سے متکلیف ہو جاتے اور آپ کی ذات اس نور کا اظہار کیا کرتی تھی جو اس کلام کے ساتھ نکلا ہے پس جس طرح ضد مثلاً کلمات کفریہ کے مستنہ سے ملکی نفرت ہوتی تھی اسی طرح ہم جنس کی طرف بدرجہ کمال کشش ہوتی تھی۔ ہفتم گرفت کی قوت کاملہ کہ جب کسی شے کو پکڑے تو ناخن برابر بھی نہ گرنے پائے محسوسات میں اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص نے مثلاً دس چیزوں کو تھاما۔ اگر ان میں سے ایک بھی ہاتھ سے چھوٹ گئی تو گرفت میں اس کی قوت کامل نہیں ہے، اور اگر ایک بھی نہ گری تو بیشک کامل ہے۔ اسی طرح کسی نے ایک شے کو پکڑا اگر اس کو مضبوط پکڑے نہ رہا تو قوت گرفت ناقض ہے اور اگر مضبوط پکڑے رہا تو بیشک قوت کاملہ ہے اور پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ہم جنس کی طرف میلان اور اس سے متاثر ہونا منجملہ اجزاء قبض کے ہے لہذا اس کے لئے اس قوت گرفت کا ہونا ضروری ہے تاکہ اس کشش میں دوام و استحکام رہے اور اسی طرح ضد سے نفرت بھی منجملہ اجزاء قبض کے ہے لہذا اس کے لئے بھی اسی قوت گرفت کی ضرورت ہے تاکہ نفرت دائمی رہے اور لسیط کا پہلا جزو فرح کامل ہے، اور وہ ایک نور ہے جس کے باطن میں پڑتا ہے اس سے کینہ و حسد اور نیکرد بخل اور لوگوں کے ساتھ بغض و عداوت کو نکال پھینکتا ہے کہ یہ چیزیں فرح کامل کے منافی ہیں کیونکہ ان کا



مقتضیٰ غصہ ورنج اور گھٹن اور گلشن نیک فرح و سرور اور حب اس فرح کے ساتھ نور ایمان پایا جائے گا تو ذات کے اندر اس کا نزول موافقت و مجانست کے ساتھ ہوگا اور خوب گھل مل جائے گا کہ بشاشت ایمان فی القلب کا یہی مفہوم ہے) اور اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے بارش کسی زرخیز عمدہ زمین پر برسے کہ اس سے بہترین غلہ کی طرح بہترین اخلاق پیدا ہوں گے۔ دوسرا جزء ذات انسانی میں جبر کا قیام ہے۔ اور وہ ایک نور ہے جسے عطا ہوتا ہے خیر و صلاح کو اس کی طبیعت ثانیہ بنا دیتا ہے کہ اس کو ہر کار خیر اور اہل خیر کی ساتھ محبت ہوتی ہے اور ایسی ہی باتوں میں فکر و رُتارتا رہتا ہے جن سے خیر حاصل ہو۔ اور اگر کوئی شخص اس کے ساتھ عہد لائی کرتا ہے تو کبھی اس کو بھولتا نہیں، اور جو اس کے ساتھ بُرائی کرتا یا ایذا پہنچاتا ہے تو جہاں اس کا وقت گذرا اس کو بھول جاتا اور اس کا خیال بھی باقی نہیں رہتا حتیٰ کہ اس کو آزماؤ تو اس کا قلب بالکل خالی اور الیا مطلق پاؤ گے گویا کوئی کلفت پہنچی ہی نہیں۔ تیسرا جزء فتح حواس ظاہری ہے جس کا مفہوم وہ لذت ہے جو ظاہری حواس میں ڈال جاتی ہے کہ حواس کی رگیں کھل کر اس کیفیت سے متاثر ہوتی ہیں جس کا ادراک بندر لعل حواس ہوتا ہے، اور یہی لذت کمال ہے بسط کا مثلاً حاسہ لبہ میں ایک لذت رکھی گئی ہے جس کی وجہ سے حسین صورتوں کی طرف میلان ہوتا ہے، حتیٰ کہ یہ لذت جب حد درجہ بڑھ جاتی ہے تو اسی سے عشق اور انقطاع باطنی پیدا ہوتا ہے کہ جسے دیکھا ہے پس اُسی کا ہو رہتا ہے۔ اسی طرح حاسہ سمع میں ایک لذت رکھی گئی ہے جس سے خوش آوازی اور راگ و نغمہ کی طرف کشش ہوتی ہے (حتیٰ کہ یہ لذت بڑھتے بڑھتے، اضطراب اور بدن میں حرکت و تڑپ پیدا کر دیتی ہے اسی طرح تمامی حواس کا حال ہے کہ ان میں لذت کا مادہ ہے جو محض ادراک شعور سے ناپید چیز ہے اور کمال حواس اور فتح حواس میں کہ آدمیت کا جزو ہے یہی فرق بھی ہے کہ کمال حواس میں محض ادراک ہوتا ہے مثلاً آنکھ نے خوبصورت اور بدصورت میں امتیاز کر لیا اور اس کو اچھا کھدیا اور اس کو بُرا) مگر فتح حواس میں عروق کا انشراح ہو جانے سے ایک لذت جاذبہ نصیب ہوتی ہے کہ اس ادراک کردہ شدہ خوبی کا گرویدہ بنا اور ہر طرف سے ہٹا کر صرف اسی کا بنا دیتی ہے چنانچہ بہت سے آدمی تمکو نظر آئیں گے کہ اچھی صورتوں پر ان کی نگاہ پڑتی ہے مگر متاثر نہیں ہوتے۔ اسی طرح بہتر ہیں کہ پیاری آوازیں اور نغمے ان کے کانوں میں پڑتے ہیں مگر ان پر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا اس سے معلوم ہوا کہ نفس ادراک اور چیز ہے اور اس کا (تہذاذ کو تاثر دوسری چیز ہے) چوتھا جزو فتح حواس باطنیہ ہے کہ جو حالت ظاہری حواس میں ادراک اور التہذاذ میں فرق و امتیاز اور فتح حواس میں ادراک کردہ سے متاثر و گرویدہ ہونے کی بیان ہو چکی ہے، یعنی وہی حواس باطنیہ کے کمال اور فتح میں جاری ہوگی کہ جس کو فتح حواس باطنیہ نصیب ہوگا اس کا وجدان و تحسین و تمامی اعضاء باطنیہ حس معانی کے نفس ادراک سے زائد ایک تاثر و التہذاذ بھی حاصل کریں گے جو میلان اور پھر گرویدگی و انقطاع تام تک پہنچائے گا۔ پانچواں جزو مقام رفعت ہے کہ



انسان جب تمامی اجزاء آدمیت سے متصف اور پھر تمامی اجزاء قبض سے مزین اور پھر مذکورہ چار اجزاء لبط سے آراستہ ہو جائے گا تو اس کو اپنی قدر معلوم ہوگی کہ اُسے کیا کچھ ملا ہے۔ اور نیز یہ کہ یہ خرمیاں کسی بڑی ہی چیز کو عطا ہوا کرتی ہیں رہ کر کس و نا کس کو نہیں ملتیں، لہذا وہ سمجھے گا کہ پروردگار عالم کے نزدیک اس کا درجہ تمامی مخلوقات سے بڑا ہے اور وہ عند اللہ رفیع القدر ہے۔ اور بڑے کو لازم ہے کہ بڑائی کے کام اور بہترین خصائل اختیار کرے (نہ یہ کہ چھجورائے اور ذلت کے کام کرے)، حق تعالیٰ فرماتا ہے وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَفَرَمَاتَا هُمْ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ اور جب اس کا علم ہوگا کہ رفیع القدر اور کبیر الدرجہ ہے تو اس کا لبط کامل ہوگا اور اسی لئے مقام رفعت منجملہ اجزاء لبط کے ہے۔ چھٹا جز حسن تجاوز ہے کہ کوئی اس پر ظلم کرے تو اُسے معاف کرے، اور کوئی بد سلوکی کرے تو درگزر کرے اور حسن تجاوز منجملہ اجزاء لبط کے اس لئے ہے کہ گفتگو لبط نورانی میں ہے۔ لہذا اگر اس کے ساتھ رنجائے عفو و درگزر کے (بد سلوکی و بے راہی ہوگی تو لبط ظلمانی بن جائے گا۔ اور غضب الہی کا سبب ہوگا۔ لہذا معلوم ہوگا کہ لبط نورانی کی حقیقت اور اس کے اجزاء ضروریہ میں حسن تجاوز بھی داخل ہے۔ ساتواں جز وانکسار و تواضع ہے۔ اور اس کے بھی اجزاء لبط میں داخل ہونے کی وجہ وہی ہے جو حسن تجاوز میں بیان ہو چکی ہے کہ لبط والے کا مرتبہ چونکہ بلند ہے لہذا اس کو انبیا و حبس کے سامنے جو کہ اس کے ہم عصر و رفیق سفر ہیں تواضع اور اور تذلل لازمی ہے ورنہ اگر تکبر کیا اپنے کو اُن کا اونچا سمجھا تو لبط میں کبر کا دخل ہو گیا اور غضب الہی کا مستحق بن گیا۔

ہاں یہ بھی ضرور سمجھ لینا چاہیے کہ آدمیت اور قبض اور لبط اور ان تینوں کے تمامی اجزاء جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں پائے جاتے ہیں اسی طرح دوسروں میں بلکہ غیر مسلم میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ ذات محمدی میں وہ خاص انسانیت موجود ہے جس سے اوپر کوئی انسانیت نہیں، اور آپ کے متعلق شیطانی حصہ نکالنے سے جو کہ جزو ہے انسانیت کا وہ اخراج مراد ہے جو شوق صدر کی صورت میں پیش آیا اور دوسرے میں محض درجہ کمال مراد ہے نہ کہ اعلیٰ درجہ کمال۔ یعنی اس کی ذات سے بے حیاتی و قباحات کو نکال لیا گیا ہے جس کی وجہ سے نہ وہ شریر رہا اور نہ بد خلقی سے متصف، نہ یہ کہ وہ مضغہ گوشت ہی نکال لیا گیا جس میں شیطانی اثر لینے کا مادہ پھرتا ہے، کہ یہ مخصوص ہے درجہ نبوت کے ساتھ۔ اسی طرح قبض میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قبض نورانی کا اعلیٰ ترین درجہ حاصل ہے۔ رہے دوسرے لوگ سو اگر وہ آپ کے طریقہ کے متبع اور آپ کی سیرت پر چل رہے ہیں تو حسب اتباع ان کا قبض نورانی ہوگا، اور منتہا یہ ہے کہ درجہ کمال حاصل کرے گا، نہ یہ کہ انتہائی کمال پر پہنچ جائے کہ انتہائی کمال مخصوص ہے مرتبہ نبوت کے ساتھ اور اگر آپ کی شریعت کے خلاف چل رہا ہے تو اس کا قبض ظلمانی ہوگا اور قبض کے جزو اول میں جو اس کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے یہاں اس کے برعکس ہوگی کہ یہ شر سے لذت



پائے گا اور خیر سے تکلیف پائے گا۔ اور قبض کا جزو ثانی یعنی انصاف تو یا نکل ہی جاتا رہے گا کہ جب بدی میں اس کو مزہ آتا ہے اور مصلحتی میں کلفت ہوتی ہے تو انصاف کا صدور قطعاً محال ہے۔ اس لئے کہ انصاف اسی سے ممکن ہے جس کو خیر میں لذت آوے اور شر سے دل دکھے نیز قبض کا جزو سوم یعنی ضد سے نفرت بھی قبض ظلمانی میں معکوس ہو جائے گا کہ اب اس کو خیر سے نفرت ہوگی اور یہی حال لقیہ اجزاء کا ہے کہ قبض ظلمانی میں ان کے سب اثرات برعکس ہو جائیں گے۔ پس اگر تمامی اجزاء قبض منکس ہو گئے تو یہ قبض ظلمانی وہ ہے جو شیاطین اور متمرّد کفار میں پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مستحزات محمدیہ کا مشاہدہ کرنے کے بعد بھی ان کے کفر و طغیان میں اضافہ ہی ہوا کہ کھار کی شوریّت میٹھی سے میٹھی چیز کو بھی نمکین بنا دیتی ہے اور اگر قبض کے بعض اجزاء منکس ہوئے اور بعض نہ ہوئے تو یہ قبض عامہ مومنین کا ہے پھر ان میں بھی اندک اس کے قوی و ضعیف ہونے کے لحاظ سے بد حالی میں کمی و بیشی کا فرق ہوگا) یہی حال لبط کا ہے کہ ذات محمدی میں لبط نورانی کا اعلیٰ ترین درجہ کمال موجود ہے۔ اور دیگر ذوات میں وہی تفصیل جاری ہوگی جو قبض میں بیان ہوئی ہاں لبط نورانی میں حسن تجاویز اور شان تواضع ہوگی کہ دونوں اس کے اجزاء میں ہیں اور لبط ظلمانی میں یہ دونوں منتفی ہو جائیں گے (جیسا کہ قبض میں صرت ایک جزو یعنی انصاف منتفی ہوا تھا)۔

اسی طرح نبوت کے ساتھ اجزاء ہیں اول حق گوئی اور اس کا منشا وہ نور ہے جو ذات میں قرار پاتا اور حق بات کہنے پر مجبور کیا کرتا ہے۔ اور یہ اس کی طبیعت ثانیہ اور خصلت طبعیہ بن جاتی ہے کہ اس بارہ میں کتنی ہی احباب مخالفت اور گھر بار سے مفارقت کیوں نہ ہو بلکہ گردن کٹنے کی بھی نوبت آجائے مگر یہ حق گوئی سے باز نہیں آسکتا چنانچہ مشرکین مکہ نے کتنا ہی چاہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قول حق سے باز آجائیں اور ہر حیلہ و تدبیر سے آپ کو پھسلایا گیا مگر آپ نے نہ مانا آخر دشمنی پر پل پڑے اور سب نے مل کر گویا ایک کمان بن کر آپ پر تیر برسائے مگر پاؤں تو ڈگتے آپ کے استقلال و ثبات قدم میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ اس لئے کہ ذات مقدسہ میں حق گوئی طبعی اور فطری تھی کہ اس کے خلاف کا تصور بھی ممکن نہ تھا۔ اس کے بعد حضرت ممدوح نے دو حکایتیں نقل فرمائیں کہ عجم کے کسی شہر میں پرندوں کو ہمارے ہاں کے طوطے اور مینا کی طرح پڑھایا جاتا اور گھر کے دروازہ پر رکھا جاتا تھا کہ جب کوئی چور گھر میں گھستا تو وہ بولتے تھے "چور آگئے" کتنا ہی کوئی ان کو ڈراتا دھمکاتا اشاروں سے خوف دلاتا یا کتیتی ہی ان کو کھانے کی چیز دیجاتی حتیٰ کہ ان کو قتل بھی کر دیا جاتا مگر وہ اپنی صدا لگانے سے باز نہ آتے تھے اس حکایت سے حضرت ممدوح کا مقصود حق گوئی کا مطلب سمجھانا تھا کہ جب تعلیم کا یہ اثر آفہ وہ بھی پرندہ جانوروں پر اتنا ہو گیا کہ حق بات کہنا ان کی خصلت طبعیہ بن گیا تو کیا پوچھنا بنی آدم کا اور پھر کیا پوچھنا مومنین کا۔

دوسرا قصہ یہ بیان فرمایا کہ ایک مرید نے اپنے شیخ سے کہا مجھے کوئی بات ایسی بتائیے جس سے اللہ کے ہاں راستہ



نصیب ہو۔ شیخ نے کہا اوصافِ خداوندی کی مشابہت اختیار کرلو۔ کہ جب تم اس کے اوصاف کی ذرا سی بھی  
 مشابہت لو گے تو وہ تم کو اپنے دشمنوں کے ساتھ جہنم میں پہنچا گوارا نہ فرمائے گا بلکہ اپنے دوستوں کے ساتھ دارِ  
 نعیم میں جگہ دے گا۔ اس نے کہا کہ حضرت یہ کیسے ہو سکتا ہے، اللہ کے اوصاف تو بے شمار ہیں فرمایا ایک ہی  
 وصف میں اس کے شبیہ بن جاؤ عرض کیا وہ کونسا وصف فرمایا جو بات حق ہو وہ کہو کہ حق گوئی اس کی ایک وصف  
 ہے۔ مرید نے اس کا وعدہ کر لیا اور وہاں سے چلا گیا مرید کے سہاویہ میں ایک ناکتخدا لڑکی رہتی تھی۔ اس کے  
 ساتھ اتفاق سے زنا صدور ہو گیا۔ لڑکی نے حالانکہ طلب اور ابتداء اسی کی طرف سے ہوئی تھی مگر یہ سمجھ کر کہ قصہ  
 چھپنے والا نہیں ہے اپنے باپ سے کہ دیا۔ اور اس نے جاکر عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا یہ شخص گرفتار ہو کر حاکم کے  
 سامنے آیا۔ اور اس سے کہا گیا کہ کتنے ہوندر می کیا کہہ رہا ہے چونکہ اپنے شیخ سے کیا ہوا عہد و پیمان مرید کو یاد تھا  
 اس لئے جھوٹ بولنے کی ہمت نہ ہوئی اور بولا ہاں یہ سچ کہا ہے بیشک مجھ سے یہ فعل سرزد ہوا ہے۔ حاکم نے  
 یہ سن کر کہا کہ معلوم ہوتا ہے یہ شخص دیوانہ ہے، اس کو پاگل خانہ میں داخل کرنا چاہیے کہ عقل رکھنے والا  
 کبھی ایسا اقرار نہیں کر سکتا جس سے اس کی جان کو گزند پہنچے چنانچہ اسے پاگل خانہ بھیج دیا گیا کچھ دنوں بعد  
 نے سفارش کی اور حاکم نے اسے چھوڑ دیا۔ اس قصہ سے حضرت ممدوح کا اشارہ اس طرف تھا کہ حق گوئی کا انجام  
 ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔ جہودم صبر ہے اور وہ ایک نور ہے جس کی وجہ سے اللہ کے راستہ میں جو مصائب و تکالیف پیش  
 آتی ہیں ان کا احساس جاتا رہتا ہے۔ اور یہی ہے وہ صبر حقیقی جس میں کلفت کا نام بھی نہیں رہتا۔ اور اس کی وجہ یہ  
 کہ یہ نور اسی کو ملے گا جسے فتح نصیب ہوتی ہے اور اس کی عقل چونکہ وسیع ہو جاتی ہے اس لئے وہ ہمہ وقت اللہ جل جلالہ  
 کے کمالات کی سیر میں لگی رہتی ہے اور کمالاتِ الہیہ کی کوئی مدد و انتہا نہیں۔ لہذا جب اس کے بدن کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اس کے  
 فکر و دھیان کی وہ مشغولیت اسے اس تکلیف کا احساس نہیں ہونے دیتی۔ چنانچہ ایک بزرگ پر کہ اپنے زمانہ کے  
 غوث تھے چار آدمی قتل کرنے کے لئے آچڑھے اور گھر میں گھس گئے۔ حالانکہ ان کے بیوی بچے اور دیگر متعلقین گریہ و زاری کا  
 کاشور مچا رہے تھے مگر وہ اپنے دھیان میں ایسے غرق تھے کہ نہ بیوی کی چیخوں پر توجہ ہوئی نہ بچوں کے چلاتے پر اور نہ اپنی  
 تکلیف پر کہ چوران کو گھیسٹے ہوئے باہر لائے اور ان کو ذبح کر دیا یہ ہے وہ عجیب و غریب صبر کہ سننے میں بھی نہیں آیا اور جب  
 اولیاءِ امت کے صبر کا یہ عالم ہے کیا پوچھنا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صبر کا۔ اور جب ذاتِ انسانی محبوب  
 اور شاہد سے محروم ہوتی ہے تو اس کی عقل کا نور ذات ہی میں محدود رہتا ہے۔ اور جب ذات کو مصرت پہنچانے  
 والی کوئی بات پیش آتی ہے تو وہ اس کو بہت زیادہ محسوس کرتی ہے حتیٰ کہ ایک سیخ گرم کر کے اس کو داما  
 جلٹے تو اسے بیس گرم سیخوں سے داغنے کے برابر معلوم ہوتا ہے اور اگر صاحبِ بصیرت کو داما جلٹے تو مطلق  
 بھی احساس نہ ہوگا۔ جیسا کہ غوثِ مذکور کا حال ہوا یا احساس ہوگا مگر خفیف اور معمولی۔



فہم سمجھتے ہیں کہ غلبہ غیظ و غضب میں اکثر انسان کے حواس معطل ہو جاتے ہیں کہ سامنے کوئی کھڑا اور کچھ ہی کہہ رہا ہو مگر نہ اس کو دیکھتا ہے نہ اس کی سنتا ہے کیونکہ اس کی قوت فکر یہ صرف دشمن کی طرف متوجہ اور جذبہ انتقام میں غرق ہو کر اسی کی ہو رہی ہے۔ پھر شاہدہ ملکوتی میں مستغرق ہو جانے والے کا تو کیا پوچھنا۔ مگر یہ حال اولیاء اُمت پر طاری ہوتا ہے نہ کہ انبیاء کرام پر، کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کو وہ قوت عطا کی جاتی ہے جس کے سبب شاہدہ خالق میں منتہا درجہ پر پہنچ کر بھی وہ شاہدہ خلق سے غافل نہیں ہوتے۔ کیونکہ ان کی خدمت مقصودہ کا مقتضا یہی ہے۔ پس اگر سوانح محمدیہ میں تم کو وہ واقعات نظر آئیں جن سے طبعی و بدنی تکالیف کا احساس اور حدوث واقعات پر بقاء حواس ثابت ہے مثلاً صاحبزادہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وفات پر حزن ہوا اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ یا بحالت نماز کسی عورت کا بچہ رونے لگا تو آپ کو خبر ہوئی اور نماز کو مختصر کر دیا۔ اسی طرح دیگر انبیاء علیہم السلام کا قوم کی ضد اور ایذا رسانی پر تاسف کرنا اور بدو عادیان وغیرہ، تو اس سے خلیجان میں نہ پڑنا کہ حقیقت یہ ہے جیسا ان کا منصب رفیع ہے ایسی ہی ان کو طاقت بے نظیر دے گئی ہے کہ بیک وقت دونوں شاہد قائم رکھتے ہیں بلکہ جتنا شاہدہ خالق میں کمال بڑھتا ہے اسی قدر طبع کی لطافت اور حواس کی ذکاوت بڑھتی جاتی ہے۔ چنانچہ اجزاء آدمیت میں اس کا کمال پہونا مذکور ہو چکا ہے۔ لہذا ان کی بصیرت کاملہ کا ایک رخ ہمہ وقت خالق کی طرف ہے کہ شاہدہ و مکالمہ و مناجات کی لذت اٹھا رہے ہیں، تو اس کا دوسرا رخ ہمہ وقت خلق کی طرف ہے کہ ارشاد و اصلاح کی ہر ممکن سے ممکن تدبیر میں لگے ہوئے ہیں اور چونکہ ان کی عقل نہایت وسیع اور طبع لطیف ترین ہے اس لئے روحانی ایذا کی طرح جسمانی ایذا کو بھی جلد اور زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جتنی ایذا مجھے دی گئی ہے کسی نبی کو بھی نہیں دی گئی اور اس کا سبب یہی تھا کہ آپ کی لطفانت و نزاکت طبع اور ذکاوت حس بھی کوئی دوسرا لے کر نہیں آیا۔ نیز اگر احساس قوی نہ ہو تو اجر بھی بھر پور نہ ہو۔ پس صبر کا کمال جس میں جامعیت ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح دُکھ میں ڈاکٹر کے نشتر لگانے سے کسی نازک بدن کو تکلیف بھی نسبتاً زیادہ ہوتی ہے کہ رو دیتا ہے مگر اس کا دل ڈاکٹر کی عطمت و شفقت اور وجوب اطاعت و ضبط کی کوشش میں غرق رہتا ہے۔ کیونکہ خوب جانتا ہے اس کا انجام صحت دائمی ہے واللہ اعلم۔ جزو سوم رحمت ہے اور وہ ایک نور ہے جو تمامی مخلوق پر شفقت اور ترس کھانے کو مقتضی ہوتا ہے۔ اور یہ ناشی ہوتا ہے اُس رحمت سے جو اللہ کی طرف سے بندہ پر ہوتی ہے لہذا جس قدر اللہ کی رحمت بندہ پر ہوگی اسی قدر اس بندہ کی شفقت عام لوگوں پر ہوگی اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی رحمت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی بندہ پر نہیں ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو شفقت عام مخلوق پر ہے اس کی بھی کوئی برابری نہیں کر سکتا بلکہ قریب بھی نہیں پہنچ سکتا۔ آپ کی رحمت و شفقت اتنی عظیم ہے کہ عالم علوی اور عالم سفلی اہل دنیا و اہل آخرت سب کو شامل ہے چنانچہ آیت شریفہ بِالْمُؤْمِنِينَ دُفِعَ عَنِ



میں حق تعالیٰ نے چار باتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے ایک یہ کہ (رافت محمدیہ کے) اس نور سے اسی مخلوق کو سیراب کیا جاتا ہے جن کو خوشنودی حق کا پروانہ عطا ہوا ہے (یعنی مومنین) دوم یہ کہ اس نور کو حق تعالیٰ کا قرب حاصل ہے یعنی قرب مرتبہ نہ کہ قرب مکانی سوئم یہ کہ وہ نور مقرب تمامہ ذات محمدی میں موجود ہے چہارم یہ کہ آپ کی ذات مقدسہ میں اس کی برداشت کی اتنی طاقت ہے کہ نہ اس میں آپ کو کلفت لاحق ہوتی ہے نہ کوئی مشقت۔ اور یہی وہ کمال ہے جس کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمامی مخلوقات پر فوقیت رکھتے۔ آیت شریفہ کا ان چہار معانی کی طرف اشارہ منجملہ اسرار الہیہ کی ہے جن کا انحصار درجہ ہر درجہ کے علاوہ اس آیت میں اور بھی اشارات میں جزو چہارم معرفت ہے اللہ جل جلالہ کی اس درجہ پر جو اس کی معرفت کی شایان ہے جزو پنجم۔ خوف کامل ہے کہ اللہ جل جلالہ کا خوف باطن میں تو ہر شے کے موجود ہے مگر اس کے ساتھ ظاہر پر بھی خوف کا پورا اثر نمایاں ہو جس کا سبب عقل سلیم اور اللہ کی ظاہری معرفت ہے (جو بشریعت تعلیم کر رہی ہے) پس باطنی خوف تو زمین ہوا کافر ہر شخص میں ہے بلکہ جسم کے ہر عضو اور جو ہر پر ہر جادہ کی ہے کیونکہ ہر جوہر کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو اللہ کا پیدا کیا ہوا ہے اور مخلوق کا طبعی تقاضہ ہے کہ اپنے خالق سے ڈرے کہ ہر فانی و حادث، قدیم سے ڈرا کرتا ہے بلکہ یہ خوف ہر جادہ نبات میں بھی موجود ہے کہ سب ہی اس کے بندے ہوئے ہیں چنانچہ خود ارشاد فرماتا ہے تَتَذَكَّرُ إِلَىٰ التَّامَّةِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعَتَيْنِ پھر حق تعالیٰ نے آسمان کی طرف توجہ فرمائی درانحالیکہ وہ دھوئیں کی شکل میں تھا اور اس سے اور زمین سے فرمایا کہ دونوں حاضر ہوؤ خود بخوشی یا بخر، دونوں نے عرض کیا کہ ہم بخوشی حاضر ہیں۔ یہ اظہار اطاعت اسی خوف باطنی و اصل کا اثر تھا جو ہر مخلوق کی فطرت میں موجود ہے اور اسی خوف کا منشاء ہے وہ تسبیح جو آیتِ وَاقُونَ شَيْءٍ إِلَّا أَلْبِسُوا بِحُجُبٍ میں مذکور ہے کہ ایک چیز بھی ایسی نہیں جو حد کے ساتھ اللہ کی تسبیح نہ پڑھتی ہو یا اس خوف باطنی کا حکم تو دوام و استمرار ہے کہ ایک لمحہ کو بھی جلا نہیں ہوتا۔ مگر خوف ظاہری کا سبب چونکہ اللہ کی طرف توجہ و التفات ہے لہذا جب تک توجہ قائم رہتی ہے وہ بھی قائم رہتا ہے اور جب دوسری چیز میں مشغول ہو کر توجہ ہٹ جاتی ہے تو خوف بھی جاتا رہتا ہے مگر جس پر حق تعالیٰ فضل فرماتا ہے اس کے اور اس خوف باطنی کے درمیان جو پردہ حائل ہے اسکو ہٹا دیتا ہے اور اس کیلئے ظاہری خوف بمعنی ظلمت سے پاک صاف اور دائمی بن جاتا ہے پھر اس خوف کو مدد پہنچتی ہے معرفت الہیہ سے اور معرفت الہیہ غیر متناہی ہے لہذا اس کے خوف کی بھی کوئی انتہا نہیں رہتی غرض خوف ظاہر تو خوف باطنی سے صفائی اور دوام کا نفع حاصل کرتا ہے اور خوف باطن اس خوف ظاہری سے زیادتی اور فیضان کا نفع اٹھاتا ہے اور اس مجموعہ کا نام خوف کامل رکھا جاتا ہے۔ رہا یہ امر کہ باطن کو ظاہر سے زیادتی و فیضان کا نفع کیسے ملتا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ خوف باطنی کو تمامی اجسام کے ساتھ برابر کی نسبت ہے (کہ مخلوق ہونے کے درجہ میں چھوٹے ہوں یا بڑے سب اجرام مساوی ہیں) اگر ان میں فرق مراتب ہے تو خوف ظاہری کی وجہ سے ہے کہ خوف ظاہری کا سبب معرفت الہیہ ہے اور معرفت الہیہ میں اجسام کے درجات مختلف ہیں۔ جزو ششم باطل کا بغض ہے جس کا منشاء وہ نور ہے جو ذات میں ہر وقت



موجود ہے۔ اور اس کا کام یہ ہے کہ ظلمت کی انواع مختلفہ کی طرف توجہ کرے اور ان کا ایسا استحضار ہو گیا  
 بالکل نظر کے سامنے ہیں پھر رفع کرنے میں ان کا ایسا مقابلہ کرنے جیسا کہ ہر شے اپنی ضد کا مقابلہ کیا کرتی ہے مگر ظلمت  
 کا نظر کے سامنے آنا اس کے ساتھ بغض رکھنے میں مدد پہنچتا رہے گا۔ اور جب اس کا استحضار دائمی ہو جائے گا تو بغض بھی  
 دائمی ہو جائے گا۔ پس باطل کے ساتھ یہ دائمی بغض جو ایک لمحہ کے لئے بھی کم نہ ہو بجز اجزاء نبوت کے ہے جز و مفہم  
 عفو ہے اور اس کا منشا وہ نور ہے جو دائمات میں قائم ہے اور اس نور کا اقتضا طبعی ہے کہ جو اس کو مصرت پہنچائے یہ  
 اس کو نفع پہنچائے، اور جو اس سے توڑے یہ اُس سے جوڑے، اور اس پر ظلم کرے یہ اُس سے درگزر کرے، اور جو اس کے ساتھ  
 بد سلوکی کرے یہ اُس پر احسان کرے۔ پس وہ عفو جس کی یہ شان ہو نبوت کا جزو ہے اور اس کے لئے دوام بھی شرط ہے کیونکہ  
 اس کا سبب نور مذکور ہے اور وہ ذات نبی میں دائماً رہتا ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عفو و کرم کی یہی شان تھی  
 یہ بھی معلوم کر لیتا چاہئے کہ خصال نبوت میں جامعیت کاملہ جس سے بالا کوئی درجہ نہیں بجز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے  
 دوسرے کو حاصل نہیں ہوئی۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ آدمیت و تقبض و لبط ہر سر انوار کے تمامی اجزاء کا جو کمال ذات  
 محمدی میں آیا ہے وہ کسی ذات میں نہیں آیا۔ اور جب ذات محمدی میں یہ اکیس خصال بدرجہ اتم آئے اور پھر ان پر نزول  
 ہوا خصال نبوت کا تو ان کے انوار بیش از بیش ہو گئے اور اسرار کی شعاعیں دور دراز دور پھیل گئیں کہ اول نبوت  
 کی پہلی خصلت ان اکیس خصال پر اتری تو یہ اکیس انوار اس خصلت نبوت میں بیوست ہو گئے۔ اور پھر دوسری خصلت  
 نبوت کا نزول ہوا تب اکیس خصال پر ہوا اور بائیس انوار اس میں گھل مل گئے۔ اور پھر تیسری خصلت نبوت کا نزول ہوا تب اکیس خصال  
 پر ہوا اور ان کے تیس انوار اس میں مندرج ہو گئے دلی ہذا القیاس۔ گویا نور حق (کہ نبوت کی پہلی خصلت ہے)  
 مرکب ہوا بائیس انوار سے۔ یعنی ایک خود اس کا نور اور اکیس انوار آدمیت و تقبض و لبط کے اور نور صبر کہ نبوت  
 کی دوسری خصلت ہے) مرکب ہوا تیس انوار سے۔ یعنی ایک خود اس کا نور اور بائیس انوار ماقبل کے اور  
 نور رحمت (کہ نبوت کی تیسری خصلت ہے) مرکب ہوا چوبیس انوار سے کہ ایک خود اس کا نور اور تیس انوار پہلے  
 کے۔ اور اسی وجہ سے آپ کی رحمت و شفقت تمامی مخلوقات پر عام ہوئی۔ (اور آپ رحمۃ اللعالمین قرار پائے)  
 اور آپ کی معرفت الہیہ کی شرح تو برون از طاقت ہے خلاصہ یہ ہے کہ اول منصب نبوت کی عظمت شان اپنی  
 نگاہ کے سامنے لاؤ اور پھر اس کے اجزاء و خصال کی جو تفصیل کی گئی ہے اس کی حقیقت اور شرح کو فرداً فرداً  
 نظر کے سامنے لاؤ اور پھر ان تمامی اجزاء کے انوار کو ان تمامی انوار پر آثار جن کو بیان کیا جا چکا ہے اور ایک ایک نور کے  
 بعد دیگر انوار سابق میں سلسلہ وار درج کرتے جاؤ اور اب دیکھو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کتنی بنیظیر و لامثال ہے کہ بے  
 اختیار زبان سے نکلتا ہے بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔ صلی اللہ علیہ وسلم وآلہ بقدر حسنہ و جمالہ و خصالہ۔  
 اسی طرح روح کے ساتھ اجزاء ہیں۔ جز اول ذوق الانوار۔ کہ ایک نور ہے جو روح میں سرایت کئے ہوئے ہے



اور کائنات میں جتنے بھی تہذبات خداوندی جاری ہیں ان کے انوار اور عالم علوی میں جتنے بھی انوار موجود ہیں ان سب کا ذائقہ لیتا ہے اور جسمانی ذوق اور روحانی ذوق میں چند باتوں کا فرق ہے۔ ایک یہ کہ روحانی ذوق کا تعلق صرف نور سے ہے برخلاف جسمانی ذوق کے کہ اس کا تعلق اشیاء کے جرم سے ہے مثلاً شہد کی مٹھاس ہمیں اسی وقت محسوس ہوگا جبکہ اُس کا جرم ہماری زبان کو لگے، اور روح کو شہد کا ذائقہ اُس کے جرم سے نہیں بلکہ اُس نور عقل سے محسوس ہوگا جو مٹھاس کی حقیقت کے ساتھ قائم ہے دوئم یہ کہ اس میں اتصال بھی شرط نہیں یعنی جسمانی ذوق جب تک کہ شہد کا جرم زبان سے متصل نہ ہو جائے کبھی حاصل نہ ہوگا، برخلاف روحانی ذوق کے کہ جرم متصل ہو یا غیر متصل دونوں کا مساوی ذائقہ لے گا سوئم یہ کہ ذوق روحانی روح کے کسی خاص حصہ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اس کے ظاہری و باطنی تمامی جواہر میں سرایت کئے ہوئے ہے برخلاف ذوق جسمانی کے کہ وہ عادتاً صرف زبان کے ساتھ مخصوص ہے کہ جسم کے کسی دوسرے حصہ کو شہد کا مٹھاس کبھی محسوس نہ ہوگا۔ چہاں یہ کہ ذوق روحانی کے لئے انسان کے تمامی حواس ظاہریہ و باطنیہ واسطہ بنتے ہیں کہ مثلاً شہد پر نظر بھی جائیگی تو شہد کا ذائقہ بواسطہ اُس نور کے جو علوت کے ساتھ قائم ہے روح کو محسوس ہوگا۔ اسی طرح مثلاً شہد کا لفظ سننے لگا تو روح اُس نور کو جو شہد کے ساتھ قائم ہے چکھے گی اور اس طرح شہد کا مٹھاس محسوس کرے گی۔ برخلاف جسمانی کے کہ آنکھ سے دیکھ کر یا کان سے سن کر اُس کو شہد کا ذائقہ نہ آئے گا۔ اسی طرح جب تم مثلاً لفظ حیت یا لفظ رضوان یا لفظ رحمت سنو گے تو روح کو بواسطہ حس باطنی اُن کا مزہ آئے گا علی ہذا جب تم قرآن مجید سنو گے تو سب سے پہلے روح کو اُس نور کا ذائقہ آئے گا جو کلام الہی میں رکھا ہوا ہے اور اس کے بعد دوسرے مزے آئیں گے جن کی کیفیت ناقابل بیان ہے الغرض روح اپنے تمامی جواہر و اجزاء سے مزہ لیتی ہے، اور نیز تمامی حواس کے ذریعہ ذائقہ پاتی ہے، برخلاف جسمانی کے کہ صرف زبان ذائقہ لے گی، اور اس ذائقہ کا واسطہ بھی صرف زبان ہی بنے گی۔ مثلاً اگر شہد کو دیکھیں یا اُس کا لفظ سنیں تو اس سے زبان میٹھی نہ ہوگی۔ اور اگر شہد کو زبان پر رکھیں تو زبان کو مٹھاس ضرور محسوس ہوگا مگر آنکھ اور کان کو نہ مٹھاس آئے گا نہ کوئی مزہ معلوم ہوگا۔ پھر تمامی ارواح بصفت مذکورہ نفس ذوق میں تو متفق ہیں مگر قوت و ضعف کے اعتبار سے ان کے مراتب بہت مختلف ہیں کہ کسی کا ذوق ضعیف ہے اور کسی کا اس سے قوی پھر قوی تر ہے پس جو روح سب میں قوی تر ہوگی اس کا ذوق تمامی عالم کو عرش سے لے کر فرش تک چاک کرتا چلا جائیگا کہ کوئی چیز بھی ادنیٰ ہو یا اعلیٰ اس کے ادراک سے باہر نہ نکل سکے گی۔ اور یہ قوت صرف روح محمدی کو حاصل ہے کہ وہ سلطان الارواح ہے اور ذات محمدی میں اس کی رہائش و سکونت بھی برضا و محبت بھی جس کی وجہ سے وہ پردہ اٹھ چکا تھا جو جسم و روح میں حائل تھا اس لئے جو ذوق غارق للعوالم آپ کی روح شریفہ کو حاصل تھا وہ آپ کی ذاتِ ترانی کو بھی حاصل ہو گیا تھا۔ اور یہی وہ کمال ہے جس سے بالا کوئی کمال نہیں۔



جیز دوم طہارت ہے۔ یعنی روح کی وہ فطری صفائی و ستھرائی جس پر وہ پیدا کی گئی ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں حسی اور معنوی۔  
 صفاء حسی کے روح میں ہونے کی وجہ تو ظاہر ہے کہ روح ایک نور ہے اور نور سب کا سب نہایت درجہ صاف ستھرا ہوتا ہے  
 یہی معنوی صفائی سواس کا مطلب یہ ہے کہ معرفت باطنیہ و معرفت ظاہریہ دونوں مخلوط و ممتزج ہو جائیں۔ اس کی شرح یہ ہے  
 کہ اپنے رب کی پہچان تو تمامی مخلوقات کو حاصل ہے کہ ناطق ہو یا صامت اور جامد ہو یا ذی حیات ایک چیز بھی ایسی  
 نہیں جس کے جز جز میں یہ باطنی معرفت موجود نہ ہو کیونکہ عدم سے وجود میں آنا موجب کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ لہذا جو شے بھی  
 نیست سے ہست ہوئی وہ اپنے خالق سبحانہ سے واقف و عارف ہوئی (جیسا کہ خوف تام کی بحث میں بیان ہو چکا ہے  
 پھر حق تعالیٰ جس بندہ پر مہربانی فرماتا ہے اس کے باطن کو ظاہر بنا دیتا ہے اور اس کا ظاہر اپنے رب کی اس معرفت سے  
 جو اس کے جز جز کو باطناً نصیب تھی باخبر و آگاہ ہو جاتا ہے کہ باطن کی طرح ظاہر بھی تمام اجزاء و احوال عارف بن جاتا ہے اور یہی معرفت کا  
 کا اعلیٰ درجہ ہے جو حق تعالیٰ نے تمامی ارواح کو بخشا ہے جو مجموعہ اجزاء اپنے رب واقف اور اللہ کی عارف ہیں۔ مگر باوجود اس  
 صفائی و عرفان میں متفق ہونے کے ذاتی چھٹائی بڑائی کے اختلاف سے باہم ان میں بہت فرق ہے کہ کسی روح کا حجم  
 چھوٹا ہے اور کسی کا بڑا۔ پس جس کا حجم بڑا ہوگا ظاہر ہے کہ اس کے اجزاء بھی کثیر ہوں گے اور اسی قدر اس کے عارف  
 زیادہ ہوں گے اور تمامی ارواح میں باعتبار مقدار کے بھی سب میں بڑی اور ضخامت و حجم کے اعتبار سے بھی سب اعظم و اکبر  
 روح محمدی ہے کہ ساتوں زمین اور ساتوں آسمان کو پرکٹے ہوئے ہے مگر با ایں وسعت آپ کی ذات مطہرہ نے اس  
 کو اپنے اندر لے لیا ہے اور اس کے تمامی اسرار پر حاوی ہو گئی ہے۔ سبحان اُس کی قدرت جس نے ذات محمدی کو یہ قدرت  
 بخشی۔ پھر روح کا قیام چونکہ ذات میں برضا و محبت ہے (کہ قیدی کی طرح گرانی کے ساتھ) اور دونوں کے درمیان کا وہ پردہ اٹھ  
 چکا ہے، اس لئے روح نے اپنی حسی و معنوی صفائی سے ذات کو مدد پہنچائی۔ کہ صفائی حسی سے ذات میں خون صالح  
 پیدا ہوتا ہے اور صالح خون میں چار باتیں ہوتی ہیں۔ اول ہلکا پن کہ خون کا ثقل جاتا رہے کیونکہ خون جتنا بھاری ہوگا  
 اسی قدر اس میں خباثت ہوگی اور اس کے ساتھ ساتھ شہوتیں بڑھیں گی۔ دوم بوجھ صاف ہو یعنی اُس میں گندھے ہوئے  
 آٹے کی سی بو آوے۔ کیونکہ خراب خون کی بو ایسی ہوتی ہے جیسے سٹری ہوئی گیچر کی بد بو۔  
 سوم۔ رنگ کی صفائی اور اس کی شناخت یہ ہے کہ زردی مائل ہو کہ خراب خون کا رنگ سیاہی مائل ہوا کرتا ہے۔  
 اور جتنا سیاہی کی طرف بڑھے گا اُسی قدر اس میں خبث زیادہ ہوگا۔ چہارم۔ مزہ صاف ہو اور اس کی  
 علامت یہ ہے کہ شیریں ہو کیونکہ خبث خون کا مزہ جلی ہوئی چیز کا سا ہوتا ہے۔ غرض جب جو ہر خون ہر طرح  
 صاف ہوگا تو تمام خطوط شیطانی اس سے نکل جائیں گے اور شہوات نفسانیہ کی رسیاں کٹ جائیں گی پھر جب ذات  
 کو یہ صفائی حاصل ہوگیتی ہے تب روح اس کو صفاء معنوی دیتی ہے اور اس کا ظاہر بھی مجموعہ اجزاء اپنے رب کا عارف  
 بن جاتا ہے۔ پس ذات محمدی چونکہ روح شریفہ پر محیط تھی اس لئے اس کی صفاء حسی و معنوی ذات مطہرہ کو حاصل



ہوئی۔ اور اس کے تمامی اسرارِ حید مبارک پر نمایاں ہوئے۔ فَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ صَلَوةً لَا تُعَدُّ وَلَا تُحْصَى۔

جز و سوم تمیز ہے اور وہ روح میں ایک نور ہے جو ہر شے کی نفس الامری حقیقت جانچ لیتا اور پوری طرح اسکو متمیز کر لیتا ہے اور ان میں پڑھنے یا سیکھنے کا محتاج نہیں ہوتا، بلکہ ہر شے کو دکھیتے ہی یا اس کا نام سننے ہی اس کے تمامی حالات اور مبتدا و منتہا کو سمجھ لیتا ہے، اور یہ کہ اس کا انجام کیا ہونا ہے، اور وہ کس کام کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ پھر اس نور میں بھی ارواح کے درجات مختلف ہیں کہ روح کو حقیقی خبر اور اطلاع ہوتی ہے اسی قدر اشیاء کو متمیز کرنے کی استعداد ہوتی ہے۔ اور اطلاع میں قوت و صنعت کا بہت کچھ فرق ہے پس روح محمدی چونکہ اطلاع میں بھی قوی ترین ہے کہ عالم کی کوئی چیز آپ سے محبوب نہیں رکھی گئی اور آپ کو عرش و فرش علو و سفلی دنیا و آخرت اور دوزخ جنت سب کی اطلاع دی گئی ہے کہ یہ سب کچھ پیدا ہی آپ کی وجہ سے ہوا ہے، لہذا آپ کی شان تمیز و حقیقت شناسی بھی تمامی عوالم پر حاوی یعنی آپ کو افلاک کے متعلق واقفیت ہے کہ کس چیز سے بنائے گئے ہیں، اور کب بنائے گئے ہیں، اور کبوں بنائے گئے ہیں اور ہر حرم فلک کا مرجع و منتہا کیا ہے۔ اسی طرح ہر آسمان کے فرشتوں کی حقیقت آپ کو معلوم ہے کہ کون فرشتہ کس فلک پر ہے، اور کہاں پیدا کئے گئے ہیں اور کس کام کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، اور انجام کار کیا ہوں گے۔ نیز ان کے اختلاف مراتب اور منتہا و درجات سے بھی واقف ہیں۔ اور آپ کو شتر حجابوں اور ہر حجاب کے فرشتوں کے متعلق بھی، نیز عالم علوی کے نورانی اجرام مثلاً ستاروں، چاند، سورج و قمر برزخ اور برزخی ارواح کے متعلق بھی تمیز حاصل ہے۔ اسی طرح ساتوں زمینوں اور ہر زمین کی تمامی مخلوقات، اور ہر بحر میں جو کچھ بھی آباد ہے۔ سبکی تمیز اسی تفصیل کے ساتھ حاصل ہے۔ اور اسی طرح جنتوں اور ان کے درجات اور ان میں رہنے والوں کی تعداد، اور جنت میں ان کے مقامات وغیرہ کی پوری حقیقت سے آگاہی حاصل ہے علیٰ ہذا دیگر عوالم کے متعلق بھی اسی کیفیت و صفت کے ساتھ آپ کو واقفیت حاصل ہے۔ اور اس میں اللہ جل جلالہ کے علم قدیم و ازل سے کہ اس کی معلومات غیر متناہی ہیں کوئی مزاحمت نہیں ہے اس لئے کہ اس کے علم قدیم کی معلومات ان عوالم ہی میں منحصر نہیں ہیں اور ربوبیت کے راز ہائے مخفیہ اور الوہیت کے اوصاف و کمالات کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے ان کو اس عالم سے کیا نسبت، پھر جب روح کذات کے ساتھ محبت ہوتی ہے تو وہ نور تمیز اسکو دے دیتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ذات محمدی (باوجود اُمّی ہونے کے تمام عوالم کی) ہر شے کو متمیز کرتی اور سب کی حقیقت سے آگاہ تھی۔ پاک ہے وہ ذات جس نے ذات مطہرہ کو یہ فضل و شرف بخشا اور اتنی طاقت عطا فرمائی جس سے یہ تفسیر آیت شریفہ فَلَا يُظْهِرُ غَلِيًّا عَلَيْهِ أَحَدًا إِلَّا مِنْ أَرْضِ تَضَى مِنْ دَسْوِلِ کی حق تعالیٰ نے اپنے علم ازلی کے معلومات غیر متناہیہ میں اول تاجی ارواح کو حقیقت شناسی و قوت تمیزی عطا فرما کر بہت کچھ مغیبات کو شہادہ اور غائب کو حاضر بنایا۔ اور پھر روح محمدی کو سید الارواح بنا کر تمامی عوالم کے بے شمار مغیبات پر مطلع کیا اور ہر شے کی حقیقت کو



دوسری سے جدا کرنے کی قابلیت بخشی کہ مثلاً ایمان کا نور ایک نور ہے مگر اس کی بیشمار انواع ہیں کہ ہر مومن کا نور جدا ہے اور اسی لئے ہر ایک کا مقام بہشت میں جدا ہو گا مگر عوالم شتر تو کیا معنی اگر مہاسنگھ بھی ہوں تب بھی متناسی ہوئے، اور ان کی معلومات بھی کتنی ہی شمار سے بیرون کیوں نہ ہوں بہر حال محدود ہوئیں، جن کو غیر متناسی معلومات الہیہ سے ایسی نسبت ہے جیسے سیدنا خضر علیہ السلام نے ایک سمندر سے چونچ بھر پانی لینے والے پرند کو دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ میری تمامی تکوینی معلومات اور آپ کی تمامی تشریعی معلومات ظاہر یہ و باطنیہ کو معلومات الہیہ سے یہ نسبت ہے جو اس پرند کے چونچ بھر قطرہ کو اس بحرنا پیداکنار کے لبریز پانی سے نسبت ہے اور یہ بھی محض سمجھانے کے لئے تھا ورنہ ظاہر ہے کہ سمندر کا پانی ایک قطرہ آب سے کتنا ہی بیشمار افزوں کیوں نہ ہو پھر بھی قطرہ کی طرح محدود و متناسی ہے، اور معلومات الہیہ کی نہ کہیں حد ہے نہ کوئی انتہا۔ لہذا معلومات محمدیہ تمامی مخلوقات کی معلومات سے بیشک بیش از بیش اور بے شمار سے اتنی بیون ہیں کہ دائرہ عقل انسانی میں بھی نہیں سما سکتیں مگر معلومات الہیہ کے سامنے بہت کم اور محدود ہیں۔ رہا یہ امر کہ متعدد واقعات اور ان کے عواقب سے آپ کی ناواقفیت احادیث میں آئی ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال کہ فات انسانی کے لئے معلومات کے استحضار میں توجہ اور التفات کی ضرورت ہے کہ ایک شخص معلوم ضرور ہوتی ہے مگر چونکہ اصرار توجہ نہیں ہے اور التفات مشغول ہے اس سے اہم دوسرے معاملہ میں، لہذا اس معلوم کا استحضار نہ ہو گا چنانچہ آگے عدم غفلت کی شرح میں موصوفت نے اس کو بیان کیا ہے یا ممکن ہے کہ ابتلاء و امتحان یا اور کسی مصلحت سے حق تعالیٰ نے اپنے محبوب کے لئے اس مغیب کو شہادہ نہیں بنایا اور جس طرح اپنی مخلوق کو متناسیہ میں بیشمار معلومات پر مطلع نہیں فرمایا ان چند جزئیات اور ان کے عواقب پر بھی مطلع نہیں فرمایا کہ مصالح خداوندی کا احاطہ کون کر سکتا ہے۔ لہذا اس میں شان محمدی کی تنقیص بھی نہیں اور آپ کی وسیع و لاثانی معلومات کا مخلوق میں کوئی ہم نگر بلکہ پاسنگ بھی نہیں) جزو چہارم بصیرت ہے اور اس کا یہ مطلب ہے کہ روح کے تمامی اجزاء میں فہم اس طرح سرایت کر جائے جیسے تمامی حواس یعنی لبّارت و سماعت اور قوت شامہ و لمس و ذوق، اجزاء و روح میں سرایت کئے ہوئے ہیں کہ علم بھی روح کے تمامی اجزاء میں قائم ہے اور بصیرت بھی تمامی اجزاء میں موجود ہے۔ اور سمیع بھی تمامی اجزاء میں پائی جاتی ہے حتیٰ کہ روح کا ایک جزو بھی ایسا نہیں جس میں علم و سمیع و بصیرت و ذوق و لمس موجود نہ ہوں چنانچہ وہ ہر جہت سے دیکھتی ہے، اور ہر جانب سے سنتی، سونگھتی، چمکتی، اور چھوتی ہے پس روح کو جب ذات سے محبت ہو جاتی اور وہ پردہ اٹھ جاتا ہے جو دونوں میں حایل تھا تو روح اس بصیرت کو ذات تک پہنچاتی ہے اور ذات بھی اپنے تمام اجزاء سے آگے اور نیچے اور اوپر اور نیچے اور دائیں اور بائیں ہر جہت سے دیکھنے لگتی اور سنتی اور سونگھنے اور چمکنے لگتی ہے۔ غرض جو شان روح کی تھی وہ ذاتِ ترابی کی ہو جاتی ہے



اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مطہرہ اور روح مبارک کا درمیانی پردہ بچپن ہی میں اُس روز اٹھ چکا تھا جس دن رشتوں نے آپ کا شوق صدر کیا تھا اس لئے آپ کی روح اور ذات کے درمیان خلا ملا اور اتحاد اسی وقت ہو گیا تھا اور آپ کی ذات ان چیزوں پر مطلع ہو گئی تھی جن پر روح مبارک مطلع تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آپ اپنے پیچھے سے ایسا ہی دیکھتے تھے جیسا آگے سے۔ چنانچہ آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ صاحبو! اپنے رکوع اور سجدہ کو ٹھیک ادا کیا کرو کہ میں تم کو اپنے پیچھے سے ایسا ہی دیکھتا ہوں جیسا سامنے سے واللہ اعلم۔ جزو پنجم عدم غفلت ہے یعنی جو مقدار روح کا مبلغ علم ہے اور جہاں تک روح کی نظر پہنچی ہے اس سے علم کی صدا اور جہل کی تمام کیفیات ایسی منتفی ہو جاتیں کہ شئی معلومہ میں نہ بھول چوک پیش آوے نہ غفلت لاحق ہو۔ اور روح کے لئے معلومات کا حصول تدریجی نہیں ہے بلکہ دفعی ہے کہ تمامی معلومات روح کی ایک نگاہ میں یک دفعہ حاصل ہو جاتی ہیں۔ نہ یہ کہ ایک شے کی طرف اگر توجہ کرے تو دوسری سے غافل ہو جائے چونکہ علوم اس کے فطری دخلقی ہیں کہ اس کی ابتدائی فطرت ہی میں یکدم اسکو علوم حاصل ہو چکے ہیں لہذا وہ جب ایک چیز کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو اسی کے ساتھ دوسری چیزوں کا علم اس کو فوراً حاصل ہو جاتا ہے اس کی ضرورت نہیں پڑتی کہ دوسری چیز کی طرف بھی توجہ کرے۔ پھر جب تک روح کا وجود قائم ہے، اس کے ساتھ اس کے علوم بھی قائم ہیں اور عدم غفلت سے بھی مراد ہے۔ یہ شان ہر روح کو حاصل ہے۔ مگر علوم کی مقدار میں فرق ضرور ہے کہ کسی کی معلومات تھوڑی ہوتی ہیں اور کسی کی زیادہ۔ اور چونکہ معلومات کی کثرت علوم کی عظمت اور نظر کی وسعت و قوت میں روح محمدی تمامی ارواح کی بادشاہ ہے۔ لہذا وہ تمامی عوالم کی موجودات پر بلا تدریج و ترتیب یک دفعہ مطلع ہو چکی ہے۔ اور پھر روح شریف اور ذات مطہرہ میں یگانگت و محبت ہے اس لئے ذات محمدی بھی غفلت لاحق ہوئے بغیر موجودات عالم پر مطلع ہے البتہ نوعیت اطلاع دونوں کی جدا ہے کہ روح کی اطلاع دفعی ہے بلا ترتیب اور ذات کی اطلاع یہ تدریج و بلا ترتیب ہے۔ کہ عوالم میں جس شے کی طرف بھی توجہ کرے گی اسکو معلوم کرے گی، یہ نہ ہوگا کہ توجہ کئے بغیر معلوم کرے۔ اسی طرح اول ایک چیز کی طرف توجہ کرے گی اور اس کے بعد دوسری چیز کی طرف حتیٰ کہ اسی ترتیب سے تمامی عوالم کی موجودات اس کے دائرہ علم میں داخل ہو جائیں گی۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ذات کا تسلط تمامی معلومات پر ہے مگر توجہ کا محتاج ہے۔ اور وہ بھی یکے بعد دیگرے یہ ترتیب کیونکہ دفعی حصول معلومات کی جو طاقت روح میں ہے وہ ذات میں نہیں ہے۔ اور اسی درجہ کا فرق دونوں میں عدم غفلت کے اندر ہے کہ ذات کو توجہ قائم رکھتے ہوئے بیشک بھول چوک پیش نہ آئے گی۔ نہ یہ کہ توجہ ہٹ جانے پر بھی سہو و نسیان لاحق نہ ہو۔ چنانچہ بخاری میں روایت آئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں ایک دفعہ سہو پیش آیا اور صحابہ نے آپکو (ادباً و نیز یہ سمجھ کر کہ حکم ہی بدل گیا ہوگا کہ آپ شارع ہیں) آپکو اس پر آگاہ نہ کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ بشریت میرے ساتھ بھی لگی ہوئی ہے۔ اور جس طرح تمکو بھول ہوتی ہے مجھے بھی بھول ہوتی ہے۔



یہی وہ حدیث جس میں حضرت کا یہ ارشاد مروی ہے کہ میں بھولتا نہیں بلکہ (منجانب اللہ) مجھ پر بھول ڈالی جاتی ہے۔ سو حفاظ حدیث مثلاً امام ابن عبدالبر نے تمہید میں اور ابن حجر نے فتح میں اور جلال الدین سیوطی نے مؤطا کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ اس حدیث کی سند جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک کسی حدیث کی کتاب میں بھی متصل نہیں ہے۔ اور ابن حجر نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ اس حدیث کے رد میں آپ کا یہی ارشاد کافی ہے کہ آپ نے اپنی صرف بشریت کے اظہار پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اپنے نسیان کو صحابہ کے نسیان کے ساتھ تشبیہ بھی دی واللہ اعلم۔ جزو ہفتم۔ قوت سریان ہے کہ حق تعالیٰ نے اجرام کے چاک کرنے اور ان میں داخل ہو جانے کی روح کو طاقت دی ہے کہ وہ پہاڑوں اور سخت پتھروں اور دیواروں کو پھاڑتی ہوئی ان کے اندر گھس جاتی (اور کھلے راستہ کی طرح) ان میں جہاں چاہتی ہے چلتی ہے (جیسے ایک سرے کی برق سخت ہڈی اور کھال کو پھاڑ کر اندرون شکم گھس جاتی اور اجزاء لحمیہ میں جہاں چاہتی ہے گشت لگاتی ہے کہ اس کے لئے مٹوس اجرام ایسے ہیں جیسے بدن کے لئے جو کی ہوا کہ جسم انسانی اسکو پھاڑتا ہوا آگے قدم بڑھاتا اور فضاء ارضی میں جہاں چاہتا ہے بے تکلف بھاگتا ہے) اور جب روح کی سکونت ذات تراپی میں محبت و یگانگت کے ساتھ ہوتی ہے تو روح یہ طاقت ذات کو دے دیتی ہے کہ کالبد خاکی بھی وہ کام کرنے لگتا ہے جو روح کیا کرتی ہے اسی قبیل سے ہے سیدنا یحییٰ علیہ السلام کا قصہ کہ آپ کی قوم نے آپ کو گرفتار کرنا چاہا تو آپ بھاگ کر ایک درخت کے اندر گھس گئے۔ کہ آپ کی روح نے بدن کو باہمی محبت کے سبب خرق اجرام کی طاقت دی اور ذات تراپی جرم شجر کو پھاڑ کر اندر داخل ہو گئی اور اسی قبیل سے ہیں حضرات اولیاء کے واقعات کہ دروازہ کھلے بغیر مکان میں داخل ہو گئے اور بند مکانوں میں موجود باٹے گئے اور اسی قبیل سے ہیں اہل اللہ کے یہ قصے کہ ایک قدم مشرق میں رکھا تو دوسرا قدم مغرب میں۔

ذات تراپی میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ افق مشرق اور افق غرب کے درمیان جو ہوا بھرئی ہوئی ہے اس کو ایک لحظہ میں قطع کر سکے کیونکہ ہوا اس کا جوڑ توڑ پھینکے گی، ایک ایک عضو کا چورا کر دے گی، اور بدن کے سارے خون اور رطوبتوں کو سکھا دے گی۔ مگر چونکہ روح نے اس کو یہ قوت دیدی لہذا یہ واقعات صادر ہوئے۔ اور اسی قبیل سے ہے معراج کا واقعہ کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم آن کی آن میں پہنچے جہاں بھی پہنچے اور واپس بھی ہو گئے کہ یہ سب کچھ روح کا فعل تھا اور اس نے اپنی قوت سریان سے ذات مضمرہ کو مدد پہنچائی تھی واللہ اعلم۔

جزو ہفتم۔ جسم کو تکلیف پہنچانے والی چیزوں کا عدم احساس ہے کہ روح کو نہ بھوک پیاس اور گرمی سردی وغیرہ کا احساس ہوتا ہے، اور نہ جیب وہ کسی تیز چیز میں نفوذ کرتی ہے تو اس کی تیزی یا تکلیف محسوس ہوتی ہے، نہ کسی متعفن جگہ پر عبور کرنے سے اس کو کلفت لاحق ہوتی ہے بر خلاف فرشتوں کے کہ صرف صورت آخرہ ان کے لئے تکلیف کا سبب ہے۔ کیونکہ ان کی فطرت خوشبو کی طرف جھکتی ہے اور بدبو سے گھنپاتی ہے۔



لیکن روح میں اگر یہ عدم احساس نہ ہو تو وہ ذات تراپی میں ایک لمحہ بھی نہ ٹھہر سکے کہ کالبدِ خاکی تو ہر قسم کی گرم و سرد کلفتوں کا مجسمہ اور سنگِ بھوک بول و برآز کی مختلف عقونوں کا پھیلا ہے۔ لہذا قدرت الہیہ نے روح کو بے حس بنا دیا کہ اجلِ مقرر تک اس کو سکون کے ساتھ اپنا مسکن بنائے رہے، غرض ان ساتوں باتوں کا ہونا ہر روح میں ضروری ہے، اور اس لئے ہم نے ان کو اجزاء روح بتایا ہے۔ مگر ان امور میں قوت و ضعف کے لحاظ سے چونکہ ارجح مختلف ہیں اور سب میں اعلیٰ درجہ روح محمدی کا ہے اس لئے ساتوں قوتیں بدرجہ کمال ذاتِ محمدی کو حاصل ہیں۔ اب ان ساتوں انوار پر آدمیت و قبض و بسط اور نبوت کے اٹھائیس انوار کا اضافہ کر دو کہ مثلاً پہلا نور ذاتِ محمدیہ میں ذوقِ الانوار ہے، اور وہ گذشتہ اٹھائیس انوار میں مندرج ہو کر گویا انیس انوار کا مرکب مجموعہ ہو گیا۔ اور پھر دوسرا نور یعنی طہارت شامل ہوئی نورِ ذوق اور دیگر انوار میں کہ تیس انوار کا مرکب ذاتِ محمدی میں پایا گیا اور پھر اسی طرح تیسرا جو تھا حتیٰ کہ ساتواں نور یعنی عدم الاحساس سابقہ چونتیس انوار پر آتا اور مجموعہ پنتیس ہو گیا۔ اس کے بعد سوچو اور دیکھو کہ بنی اُمی کی کیا شان رفیع ہے۔ چھٹا جزو نورِ علم ہے اور علم سے مراد علمِ کامل ہے جو طہارت و صدقائی میں انتہاء پر پہنچا ہوا ہو کہ سات خوبیاں جن کو ہم بیان کریں گے اسی میں جمع ہوں گی (نہ کہ مطلق علم میں)، اور اس سے قبل علم کی حقیقت بھی سمجھ لو کہ علم درحقیقت عقل کا نور ہے، اور عقل روح کا نور ہے اور روح ذات کا نور ہے اور پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ جب پاک ذاتِ تراپی کے اندر اس کی روح کے درمیان کا پردہ اٹھ جاتا ہے تو جو حقیقت نورِ عقل کے لئے ثابت ہے اور اسی کا نام علم ہے وہی صفت ذاتِ تراپی میں آ جاتی ہے۔ لہذا علم روح پر جو اپنے انوارِ سبعہ سے متصف تھی اب علم کے ساتوں انوار کا اضافہ ہوتا ہے اور یہ بھی اس کی صفات بن جاتے ہیں اور علم کے سات اجزاء یہ ہیں اول معلوم کا بار اٹھانا اور وہ ایک نور ہے جس کا مقتضایہ ہے کہ معلوم اس درجہ حاصل ہوں کہ آنکھ کو اپنی دیکھی ہوئی اور کان کو اپنی سنی ہوئی غرض حواسِ خمسہ کو اپنی ادراک کی ہوئی چیزوں کا جتنا حصول ہوتا ہے ان سب پر فوقیت لے جائے۔ غرض نورِ علم میں اشیاء کا حصول بمنزلہ ذات کے ہوتا ہے اور نورِ نظر و سماعت وغیرہ میں اشیاء کا حصول بمنزلہ ظل اور خیال کے ہوتا ہے۔ یعنی علم میں اشیاء کا حصول حقیقی ہوتا ہے اور حواسِ خمسہ میں خیالی ہوتا ہے اگرچہ عام لوگوں کے نزدیک اس کا عکس ہے کہ وہ نورِ بصیر میں آئی ہوئی چیزوں کو اصلی سمجھتے ہیں اور نورِ علم کی حاصل کردہ چیزوں کو خیالی قرار دیتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عام لوگوں میں نورِ علم بہت کم حتیٰ کہ بالِ برابر ہے اس لئے ان کا اعتماد صرف حواسِ خمسہ پر ہوتا ہے مگر جبکہ حق تعالیٰ علمِ کامل عطا فرماتا ہے اس کے نزدیک نظر و دیگر حواس کی معلومات بمقابلہ اس علم کے جو اس کو حاصل ہے مثل خیال کے معلوم ہوتی ہیں۔ وضاحتِ حال کے لئے ایک مثال سمجھو کہ فرض کرو ایک شخص نے مکان تعمیر کیا اور بنیاد سے نیکو اور ہر چھوٹا اور بڑا کام خود اپنے ہاتھوں کیا کہ مٹی بھی خود ہی لایا ات کی انیسویں بھی خود ہی بنائی خود ہی پکائی



پھر پھر بھی خود لایا اور خود ہی اس کو پھونکا۔ اور خود ہی اس کا چونہ بنایا اور پس۔ پھر خود ہی ککڑی لایا خود ہی اس کو  
چیرا اور خود ہی چوکھٹ اور کواڑ بنائے۔ پھر خود ہی چنائی کی اور رڈے رکھے غرض مضبوط بنیادوں پر مستحکم ستونوں کا خوبصورت  
مکان مکمل کر لیا اور ازاں اول تا آخر کسی ایک کام میں بھی کسی سے کوئی مدد نہیں لی، اور جو کچھ بھی کیا وہ اپنے فکر اپنے  
فکر اپنے دماغ اپنے ارادہ اپنی تجویز اور اپنی قابلیت سے کیا حتیٰ کہ مکان کا ہر جزو اور ہر شئی ایسی ہو گئی گویا اس کی طبعی  
و فطری ہے اور اس کے فکر و دماغ میں ہر وقت حاضر ہے کہ کبھی غائب نہیں ہوتی۔ اب فرض کرو کہ وہ کچھ دنوں کے  
لئے باہر چلا گیا اور اپنے ساتھ ایک اور شخص کو لے کر واپس آیا، اور دونوں اس مکان کو دیکھنے لگے۔ ہر چند کہ آنکھ سے  
دیکھنا دونوں کا یکساں ہے، مگر پہلے شخص کو اس مکان کا جتنا علم ہے وہ اس دوسرے شخص کے علم سے بدرجہا بڑھا  
ہوا ہو گا کہ اس کو مکان اور اس کے تمامی اجزاء کے اجزاء اور عمل کی تفصیل اور تفصیل کی تفصیل سب ہی کچھ معلوم  
ہے۔ کیونکہ خود اسی نے بنایا ہے اس لئے مکان کے ظاہر و باطن اور بیرون و اندرون کا جتنا اسے علم ہے  
دوسرے کو ہرگز نصیب نہیں۔ یہی حال علم کامل کا ہے کہ وہ شئی کے ظاہر و باطن اور اجزاء و اجزاء امداد اجزاء  
اور تفصیل و تفصیل التفصیل کو محیط ہوتا ہے۔ اور نور بھر گھر کی سطح میں بھی صرف ظاہر تک پہنچتی ہے  
اندر نفوذ کر کے باطن تک پہنچنا تو بڑی بات ہے اور یہ مثال بھی محض تقریبی ہے کہ علم کامل کی حقیقت کسی  
تمثیل میں آہی نہیں سکتی، جسے حق تعالیٰ نصیب فرماتا ہے وہی خوب سمجھتا ہے میں نے دریافت کیا کہ اشیاء نور  
علم میں آتی کیونکر ہیں؟ فرمایا کہ نور علم بمنزلہ برتن کے ہے جس میں سفید و صاف اور ایسا خالص پانی ہو جیسا کہ وہ اپنی  
اصل خلقت میں ہے۔ اور فرض کرو دوسری برتن میں مختلف قسم کے متبائن قطرات آب سے مرکب پانی موجود ہے  
کہ ایک قطرہ کھاری اور ایک شیریں اور ایک ترش اور ایک گرم اور ایک ٹھنڈا وغیرہ وغیرہ۔ پھر ہم اس مرکب پانی کو اس  
خالص پانی کے برتن میں ڈال دیں تو یہ دونوں مخلوط اور آمیز ہو کر بمنزلہ ایک پانی کے بن جائیں گے یا نہیں؟ میں نے  
کہا کہ ہاں بن جائیں گے فرمایا بس پہلا برتن گویا علم ہے اور دوسرا برتن بمنزلہ معلومات کے ہے کہ معلومات و مختلف قطرات  
کی طرح متبائن و مختلف ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ یہ مختلف قطرے مل جل کر ایک ہو جاتے ہیں یا ہر قطرہ متمیز و علیحدہ  
رہتا ہے؟ فرمایا سب خلط ملط ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد آپ نے پانی اپنی ہتھیلی پر ڈالا اور فرمایا دیکھو مثلاً یہ تو علم ہے۔ اس  
کے بعد دوسرے پانی کا ایک قطرہ لے کر اس پر ڈال دیا اور فرمایا بتاؤ یہ قطرہ اس میں خلط ملط ہو گیا یا جدا ہے؟ میں نے کہا  
کہ خلط ملط ہو گیا۔ فرمایا یہ گویا منجملہ معلومات کے ایک معلوم ہے۔ پھر دوسرا قطرہ لیا اور اس کو بھی اس پر ڈال دیا اور فرمایا  
بتاؤ یہ بھی مل جل گیا یا علیحدہ ہے؟ میں نے کہا سب میں مخلوط ہو گیا۔ فرمایا یہ گویا دوسرا معلوم ہے۔ پھر تیسرا قطرہ لیا  
اور اس کو بھی ڈال کر یہی فرمایا۔ اور کہا بس علم میں معلومات کے آنے کی یہی شان ہے کہ نور علم ابتداء میں ہر  
شے سے بالکل خالی ہوتا ہے اور پھر تدریجاً اس میں معلومات آتے رہتے ہیں اور نور علم بڑھتا رہتا ہے کہ علم بمنزلہ



غلات کے ہے۔ اور شے اگر چھوٹی ہے تو اس کا غلات بھی چھوٹا ہوگا۔ اور چیزیں جتنی زیادہ ہوں گی اسی قدر غلات بڑا ہوگا۔ البتہ اس غلات میں یہ عجیب خاصیت ہے کہ پہلے قطرہ پر بہت چھوٹا یعنی صرف اتنا ہے جس میں فقط ایک معلوم سما سکے، اور جب دوسرا معلوم آتا ہے تو اسی مقدار پر وہ بڑھ جاتا ہے اور جب تیسرا معلوم حاصل ہو جاتا ہے تو اتنا اور بڑھ جاتا ہے۔ حتیٰ کہ معلومات کی کوئی حد شمار نہیں لہذا نور علم کی وسعت اور بڑھوتری کی بھی کوئی حد نہیں رہتی۔ جزو دوم عدم اضاعت ہے اور وہ ایک نور ہے جس کا مقتضایہ ہے کہ معلومات میں سے ایک بات بھی نہ جانے دے مگر مستحق کے پاس یعنی اول تو علمائے کے پاس جاتے ہی سے اُسے محفوظ رکھے۔ اور اگر بر تقدیر تا اہل کے پاس چلی جائے تو اس کے پاس قائم نہ رکھے بلکہ خزانہ میں واپس لے آئے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی شان تھی کہ انوار علوم کا تکلم فرماتے اور نیک و بد مومن و منافق سب ہی ان کو سنتے تھے۔ مگر جو منافق و بد طینت ہوتے تھے ان پر جوں بھی نہ رنگیتی تھی کیونکہ یہ نور نبوت ان انوار علم کو نا اہلوں کے پاس چھوڑتا نہ تھا بلکہ اپنی اصل طاہر یعنی ذات محمدی کی طرف واپس لے آتا تھا اور جو انوار علم کے مستحق تھے جن کے متعلق حق تعالیٰ فرماتا ہے: **وَكَاؤُوا الْحَقَّ بِحَقِّهَا فَطَهَّرَهَا** انوار علوم ان کے پاس پہنچ کر قائم و برقرار رہتے تھے۔ غرض علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک پاک علم کہ جس کے نور میں سفیدی ہے، اور دوسرا ناپاک علم جس کی روشنی میں (گندھک کی سی) نیلگوئی ہے اور پھر ہر ایک کی دو قسمیں ہیں ایک کامل دوم ناقص۔ پس فرض کرو کہ چار شخص ہیں۔ ایک کا علم طاہر ہے اور کامل بھی ہے دوسرے کا طاہر ہے مگر تھوڑا ہے اور تیسرے کا علم کامل ناپاک ہے اور چوتھے کا ناپاک ہے مگر تھوڑا۔ اگر چاروں کسی ایک مجمع میں بیٹھ کر باتیں کریں گے تو طاہر ناقص علم والا نفع اٹھائے گا طاہر کامل علم والے سے اور ناپاک علم کا کچھ بھی اثر نہ لے گا کیونکہ وہ ناخمس ہے اور ناپاک ناقص علم والا مستفید ہوگا ناپاک کامل علم والے سے اور پاک علم کا کچھ بھی اثر نہ لے گا کیونکہ وہ اس کا ہم جنس نہیں، اور چونکہ مطلق علم کی شان ہے عدم اضاعت اس لئے علم طاہر کبھی علم نجس کے پاس نہ ٹھہر سکے گا۔ اور اسی طرح علم نجس کبھی علم طاہر کے پاس قرار نہ پاسکے گا بلکہ ہر ایک اپنے ہم جنس کی طرف لپکے گا کہ خبیث، خبیث کے پاس جایا کرتا ہے اور طیب طیب کے پاس۔ جزو سوم معرفت لغات و اصوات ہے یعنی چونکہ علم کامل میں تمامی چیزیں آتی ہیں اور مع اپنے حقائق و لوازم اور ذاتیات و عرضیات کے آتی ہیں اس لئے تمامی مختلف زبانیں اور حیوانات کی بولیاں اور حادثات کی آوازیں بھی اس کو معلوم ہوں گی کہ معلومات کی دو قسمیں ہیں حیوان اور جاد، جاد کی بھی مختلف آوازیں ہوتی ہیں۔ مثلاً پانی کی سراسر اہٹ جدا ہے۔ اور دروازہ کی کھڑکھڑاہٹ جدا۔ پھر حیوان کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ناطق اور غیر ناطق۔ ناطق یعنی انسان کی مختلف زبانیں ہیں۔ اور مختلف لغات اسی طرح غیر ناطق یعنی پرند اور دیگر حیوانات کی بھی جدا جدا بولیاں ہیں کہ انسان ان کو سن کر فوراً معلوم کر لیتا ہے کہ تلاں جانور بول رہا ہے۔ اور صاحب علم کامل ان سب لغات و اصوات سے



واقفیت رکھتا ہے۔ اس بارہ میں حضرت ممدوح سے بہتیری حکایتیں میرے سننے میں آئیں جن میں چند کا تذکرہ اس کتاب میں بھی آئے گا۔ ہاں صامت مخلوق جس کی کوئی آواز نہیں مثلاً دیوار، پہاڑ، درخت وغیرہ ان کی گفتگو کا علم صرف اللہ جل جلالہ کو ہے کہ ان کا لفظ باطنی ہے جو خالق و مخلوق کے درمیان مخصوص ہے، اور حق تعالیٰ کسی نبی کے لئے معجزہ بنا کر اور کسی ولی کے لئے کرامت کی صورت میں کبھی اس کو ظاہر فرما دیتا ہے جز و چہارم انجام سے واقفیت ہے کہ اجزاء روح میں نور تمیز کے متعلق بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ ہر شے کی حقیقت نفس الامری کو دوسری شے سے متمیز و جدا کر دیتی ہے۔ پس جب درجہ بدرجہ تمامی اشیاء متمیز ہو کر اپنے انجام و اختتام پر پہنچتی ہیں تو نور تمیز کا کام ختم اور اس جز و علم یعنی معرفت عواقب کا کام شروع ہو جاتا ہے کہ یہ شے کا نفس الامری انجام تفصیل وار نظر کے سامنے لے آتا ہے اور انجام صرف دو ہیں۔ یا عالم آخرت میں فنا و عدم جیسا کہ عبادات وغیرہ کے بارہ میں تجویز ہوا ہے، اور یا بقا و وجود جیسا کہ (انسان و جنات وغیرہ) مکلفین کے بارہ میں ہے۔ پس یہ نور واضح کر دیتا ہے کہ فنایت کب ہوگی اور کس طرح ہوگی اور یہ سے درجہ بدرجہ کو کیونکر قبول کرے گی۔ اور اس کے اجزاء کم ہو کر نیست و نابود کیے ہوتے چلے جائیں گے حتیٰ کہ انجام کار معدوم محض بن جائیں گے۔ اور یہ فنایت کس جگہ ہوگی اور فنا کے اسباب اور ان کے مقتضیات کیا ہوں گے۔ حتیٰ کہ ہر شے کے متعلق یہ فنایت ایک امر واضح اور معقول بن جائے گی کہ نہ وہ خرق عادت رہے گا۔ نہ اس میں کوئی بعد اور اشکال۔ اسی طرح دوسری نوع جس کے متعلق اخروی بقا و تجویز ہوئی ہے اول نور تمیز ان کے ہر فرد کو متمیز کر کے جنت یا دوزخ تک پہنچا دے گا اور پھر یہ نور معرفت عواقب آکر واقعہ کے مطابق ہر جنبتی کے ثواب کی اور ہر دوزخی کے عذاب کی پوری تفصیل نظر کے سامنے لائے گا۔ اس کی شرح بہت طویل ہے اور ممکن ہے کہ حضرت ممدوح سے سننے ہوئے کچھ واقعات اس بحث کے ہم آئیدہ اثنا و کتاب میں بیان بھی کریں

جز و پنجم ثقلین یعنی جن و انس کے حالات سے تعلق رکھنے والے علوم کی معرفت ہے کہ احوال انسان سے متعلقہ علوم کی تعداد تین سو چھیالیس<sup>۳۶۷</sup> ہے اور احوال جنات سے متعلقہ علوم ان سے تین کم یعنی تین سو ترسیس<sup>۳۶۸</sup> ہیں۔ انہیں علوم میں ان کی معاشن ظاہری کے اسباب و ذرائع داخل ہیں جن پر جسم کا قیام اور زندگی کا بقا و موقوف ہے۔ خواہ وہ آربیل کب و اکتساب ہوں جیسے کھیتی کرنا، اہل چلانا اور لوہار کا کام بڑھتی کا کام وغیرہ یا ہاتھ کی صفت ہو جیسے زردوزی اور سینا اور مٹی و لکڑی وغیرہ کے برتن بنانا وغیرہ کہ اس نور و اے کو سبکی معرفت ضروری ہے نیز یہ بھی کہ کیا طریق ہے جس سے نفع حاصل ہو اور کیا صورت ہے جس سے نقصان ہو نیز انہیں علوم میں علم الادب داخل ہے جس کو فی زمانہ علم سیاست کہتے ہیں، کہ اس نور و اے کو اسباب معاشرت کی بھی واقفیت ہوتی ہے اور ان طریقوں کی بھی جن کو تعلقات کے استوار اور خلا ملا کے پائدار بنانے میں دخل ہے۔ اور اس کے ماتحت کثیرہ کشیر علوم ہیں۔ نیز اس نور و اے کے اسباب معاد کی معرفت بھی کامل ہوتی ہے جن کو ثقلین کی



معاش باطنی کہنا چاہیے یعنی وہ باتیں جو بندہ کو سمیٹ سمیٹ کر اُس کے رب کی طرف لائیں۔ ان کا راستہ بتائیں اور اُس کو اللہ والا بنائیں۔ انہیں علوم میں تمام شرعیات کی معرفت داخل ہے کہ ہر شریعت کے انوار اور ان اسرار سے واقفیت ہوتی ہے جو اللہ تک پہنچانے والے ہیں۔ کہ ہر واقعہ کے متعلق حکم الہی جانتا ہے اور یہ کہ اس کے مشروع ہونے میں حکمت و مصلحت کیا ہے، اور بندہ کو اس سے دنیا میں کیا نفع پہنچے گا اور آخرت میں کیا نفع۔ اس بحث میں حضرت سے جو باتیں سننے میں آئیں اگر ہم ان کو درج کتاب کریں تو بے شمار عجائب و غرائب کا مجموعہ بن جائے۔ نیز اس نور والا حکم شرعی کو سننے ہی سمجھ جاتا ہے کہ بے شک یہی حق اور بلحاظ وقت و موقع بہترین و انسب ہے چنانچہ میں نے حضرت ممدوح سے اول اُس اختلاف میں بحث کی جو ر علماء و متاخرین، شیوخ مذہب میں مسائل شرعیہ کے متعلق واقع ہوا ہے۔ اور پھر اُس اختلاف میں بحث کی جو امام ابو حنیفہ و شافعی (وغیرہ) ائمہ مذہب میں واقع ہوا ہو۔ اور پھر اس اختلاف میں بحث کی جو دیگر انبیاء علیہم السلام کی شرائع سابقہ (مثلاً شریعت موسویہ و عیسویہ و ابراہیمیہ وغیرہ) میں واقع ہوا ہے اور برسوں اس تحقیق کو جاری رکھا تو وہ وہ اسرار و حکم سننے میں آئے جو شمار سے بیرون ہیں نیز انہیں علوم میں ان عوارض و آفات کی واقفیت داخل ہے جو معاش ظاہری و معاش باطنی کو پیش آتی رہتی ہیں کہ وہ امور کیا کیا ہیں، اور اُن سے بچنے کی صورت کیا ہے غرض ان کے تمامی اسباب سے پوری آگاہی ہوتی ہے کہ کون چیز اور کون سا عمل دین اور دنیا میں کیا خاص نفع پہنچاتا ہے، اور کون سا فعل اور کیا شے دنیا و دین میں کیا خاص نقصان پہنچاتی ہے اسی طرح پورا علم طب اس میں داخل ہے کہ ظاہری و جسمانی بوجہ جس کا اثر معاش ظاہری پر پڑتا ہے یا باطنی و روحانی جس کا اثر معاش باطنی پر پڑتا ہے اور ان کے معالجات و اصلاحات بھی دنیوی طبیب و ڈاکٹر کی طرح قیاسی و ظنی نہیں بلکہ نفس الامری اور حقیقی ہوتے ہیں اگر کو یا مرض کی علت آنکھوں سے دیکھی اور دوا کی خاصیت کو مشاہدہ کر لیا ہے، لہذا اثر بھی باذن اللہ یقینی ہوتا ہے، جزو ششم کونین یعنی عالم علوی و عالم سفلی سے تعلق رکھنے والے علوم کی واقفیت، عالم سفلی میں صرف سات چیزیں ہیں عناصر اربعہ یعنی پانی۔ مٹی۔ آگ اور ہوا۔ اور مرکبات ثلاثہ یعنی نباتات (اشجار و گھاس و سبزی وغیرہ) اور معاون (پتھر سونا چاندی لوہا وغیرہ) اور حیوانات (پرند و گزند و درند و انسان و جن وغیرہ) پس علم کامل کے لئے ضروری ہے کہ ان سب کی حقائق و مہیات معلوم ہوں، ان کے خواص سے جو کہ مابہ الہتیا ز ہیں واقفیت ہو، ان کے منافع و مضار سے آگاہی ہو ان کی قوتوں کا علم ہو، اور قوتوں میں تمامی افراد کے اختلاف کا علم ہو، کہ ایک آگ کا جرم مثلاً وسیع ہے مگر قوت اُس کی کمزور ہے، اور دوسری آگ اس کے برعکس ہے کہ جرم چھوٹا ہے مگر اس کے قوی بہت قوی ہیں جزو ہفتم تمامی جہان کا صرف سامنے کی ایک جانب میں منحصر ہو جاتا ہے کہ علم ایک نور ہے جو ہر جانب دیکھ کر اشیاء کا ادراک کرتا ہے مگر جب حق تعالیٰ کسی کو زائد قوت بخشا ہے تو دوسری جانبوں کی چیزیں بھی اس کو بے کم و کاست ایسی ہی نظر آتی ہیں جیسے سامنے



کی چیز۔ پس اُس وقت اس کی نگاہ میں صرف سامنے کی ایک جہت رہ جاتی ہے اور باقی جہات اس کی نظر میں محو ہو جاتی ہیں۔ یہ حالت علم کامل کہلاتی ہے جو صرف صاحب فتح کو نصیب ہوتی ہے اور یہی مفہوم ہے اُس حدیث کا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میں تم کو اپنے پیچھے سے بھی ایسا ہی دیکھتا ہوں جیسا اپنے سامنے سے دیکھتا ہوں، کہ باوجودیکہ صحابہ آپ کے پیچھے ہوتے تھے مگر ان کو اپنے سامنے کے رُخ دیکھتے تھے جیسا کہ سامنے کے رُخ کی چیزوں کو دیکھتے تھے۔ پس اگر صاحب علم اطراف و جوانب میں کچھ بھی فرق محسوس کرے تو اس کا علم ناقص ہے کامل نہیں۔ ساتواں حوت نور رسالت ہے اور اس کا پہلا جزو روح کا ذات انسانی میں برضا و محبت کا قیام کرنا ہے اس کی شرح یہ ہے کہ پاک ذوات میں انوار ہوا کرتے ہیں جو ان کے ایمان باللہ سے مدد پاتے ہیں۔ اور ان انوار کے صنعت قوت پر مدار ہے روح کے قیام و سکونت میں صنعت اور قوت کا کہ ہر نور میں مادہ ہے کشش کا اور ارواح خود انوار مجسم ہیں البتہ ایمان کا نور ان کے انوار سے بہت زیادہ صاف اور چمکدار ہے لہذا روح جب کسی ذات میں اس نور ایمان کو دیکھتی ہے تو اُس کی طرف کھیتی اور اس کو شیریں و خوشگوار پار لذت لیتی ہے پھر جس ذات میں نور ایمانی مثلاً ایک ہاتھ برابر ہے اس میں روح کی سکونت جس محبت و رضا کے ساتھ ہوگی اس کے بدرجہا زیادہ اس کی سکونت بالرضا اُس ذات میں ہوگی جس کے اندر نور ایمان مثلاً دو ہاتھ کی برابر ہے۔

دعویٰ بذالقیاس۔ علاوہ ان میں ایمان کا نور بڑھا کرتا ہے اعمال صالحہ کے اجور سے، کہ ہر عمل صالح کے اجر کا ایک خاص نور ہے، اور ان اجور کے انوار کا عکس ذات پر پڑتا ہے جس کی وجہ سے اس کو دنیا میں بھی نفع پہنچاتا ہے کہ نور ایمان قوی و عظیم ہو جاتا ہے۔ اور اخروی نفع تو ظاہر ہی ہے کہ یہی اجور حبت کی نعمتیں بن جائیں گے اور عامل ان سے مستمتع ہوگا۔ فرض کرو کہ دو شخص ایمان میں باکل مساوی ہیں۔ مگر ایک نے دن بھر اعمال حسنة کئے اور دوسرے نے کوئی نیک عمل نہیں کیا۔ تو جس وقت دونوں سو جائیں گے نیکو کار کا نور ایمان زائد چمکے گا اور پھیلے گا اور دوسرے کے نور ایمان کی نسبت (کہ صاحب بصیرت ان انوار کو دیکھتے ہی سمجھ لے گا کہ اُس نے اعمال حسنة کئے تھے نیز یہ کہ فلاں فلاں نیک کام کئے تھے کہ ہر عمل نیک کا نور بھی جدا ہوتا ہے) اور ظاہر ہے کہ رسالت یعنی حق تعالیٰ کی پیام رسانی سے بڑا کوئی کام نہیں اس لئے اس کے اجرا اور نور سے بڑا کسی اجلا بھی نور نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضرات رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ایمان کے لگ بھگ بھی کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ پھر حضرات انبیاء میں متبعین کی قلت و کثرت کے لحاظ سے بھی فرق مراتب ہوتا ہے (کہ چونکہ متبعین کی ہدایت و صلاح کا واسطہ پیغمبری بنا ہے اس لئے ان کے ایمان اور تمامی اعمال صالحہ بمقتضاء الدالُّ عَلَى الْحَيٰوةِ كَفَا عَلَيْهِ پیغمبر کے نامہ اعمال میں لکھے جاتے ہیں لہذا جس کے متبعین جتنے زیادہ ہوں گے اُسی قدر اس کے اجور و اعمال صالحہ زیادہ ہوں گے) اور ظاہر ہے کہ کثرت متبعین میں کوئی رسول بھی بارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درجہ پر نہیں پہنچا (بلکہ عجیب نہیں کہ امت



محمدیہ تمامی مرسلین کے متبعین کے مجموعہ سے بھی زائد ہو اس لئے آپ کا اجر تمامی پیغمبروں کے اجور سے مافوق ہے اور اس لئے آپ کے ایمان کا نور بھی اتنا ضخیم اور عظیم ہے جس کی کیفیت نہ بیان ہو سکتی ہے نہ کوئی اس حد تک پہنچ سکتا ہے۔ غرض انبیاء و مرسلین کی ذوات میں ان کی ارواح کی رہائش جس محبت و رضا کے ساتھ ہے وہ دوسروں کی ارواح کو نصیب نہیں۔ اور یہی خاص رہائش ہے جس کو ہم نے اجزاء و رسالت میں شمار کیا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو چکا کہ ذات محمدی میں روح محمدی کی رہائش تمامی مرسلین سے بھی مافوق ہے، لہذا یہ جزو رسالت بھی ذات محمدی میں انتہا و کمال پر تھا۔ نیز روح کی رہائش میں اس اعتبار سے بھی فرق مراتب ہوا کرتا ہے کہ کسی کا نور ایمان جسم روح کے مساوی ہوتا ہے، اور کسی کا جھوٹا، اور کسی کا بڑا۔ پس جس کا نور ایمان جسم روح سے بڑا ہوتا ہے اس مومن کی ذات میں اس کی روح کا قیام زیادہ قوی ہوتا ہے بہ نسبت مساوی اور کم نور والوں کے۔ اور جن میں مطلق نور ایمان نہیں یعنی ذوات کفار ان کے اندر ارواح کی رہائش نہ برضا نہیں بلکہ قیدی کی طرح، قہری و جبری ہے بحکم تقدیر۔ ورنہ درحقیقت ان کی ارواح کو ان سے انتہا درجہ کا بغض و تنفر ہے۔ جزو دوم۔ علم کامل ہے ان چیزوں کا جن کا تعلق حق تعالیٰ کی ذات و صفات کی معرفت سے ہے اور ان چیزوں کا بھی جن کا تعلق مخلوق کے ساتھ ہے۔ پس وہ علوم جن کا تعلق احوال کو نیت سے ہے (کہ یہ عینوں علوم اجزاء علم میں بیان کئے جا چکے ہیں) وہ سب اس علم کامل میں داخل ہیں۔ مگر پھر علم کامل کو جدا بیان کرنا اس لحاظ سے ہے کہ یہاں ان تمامی علوم ثلاثہ کی کمال معرفت مراد ہے۔ کہ علوم مذکورہ کا انتہائی کمال منجملہ اجزاء رسالت کے ہے لہذا وہ ہر رسول میں ہونا لازمی ہے۔ اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں وہ کمال انتہا بر انتہا درجہ پر ہے۔

جزو سوم ہر شخص کے ساتھ قول و فعل میں سچائی کا برتاؤ ہے کہ اقوال ہوں یا افعال سب ہی حق تعالیٰ کی محبت و رضا کے موافق ہوں۔ کیونکہ مخلوق کو حضرات مرسلین کے اقتدا کا حکم ہے لہذا ان حضرات کی ہر قول و فعل میں یہ شان ضروری ہے کہ جو بات کہتے ہیں حق ہی کہتے ہیں، اور بولتے ہیں تو سچ ہی بولتے ہیں، اور خوش طبعی میں بھی واقعہ کے مطابق وہی بات زبان سے نکالتے ہیں، اور جب کسی بات کی خبر دیتے ہیں تو وہ ضرور ہو کر رہتی ہے اور اگر کہیں بظاہر اس کا خلاف نظر آوے تو اس کی صحیح تاویل کی جائے گی کہ حقیقت یہی نکلے گی جو ہم نے بیان کی ہے، اور اس قسم کے چند واقعات اثناء کتاب میں بھی مذکور ہوں گے۔ الحاصل حضرات انبیاء علیہم السلام کی شان کلام کے بارہ میں وہ ہے جو جنبتوں کی شان حبت میں خواہشات کے بارہ میں ہوگی کہ۔

جس طرح اہل حبت جس شے کی بھی خواہش کریں گے وہ ضرور پوری ہو کر رہے گی۔ اسی طرح حضرات انبیاء علیہم السلام جب کوئی بات زبان سے نکالیں گے وہ ضرور واقع ہو کر رہے گی۔ اور یہی مضمون صدق میں جو کہ جزو رسالت ہے زائد ہے حق گوئی سے جو کہ جزو نبوت ہے اور اس کا بیان نور نبوت کے اجزاء میں ہو چکا ہے



کہ یہ صدق جس کا ذکر ہو رہا ہے حکایت و نقل ہے امر مقدر کی (کہ گویا لوح محفوظ میں دیکھ کر مومنوں کے واسطے واقعہ کی وقوع کی خبر دی ہے) لہذا اس کا قائل گویا مسلوب الاختیار ہے۔ برخلاف حق گوئی کے (کہ وہاں واقعہ کے مطابق زبان سے بات نکلنے میں اختیار و ارادہ کا دخل ہوتا ہے) پس سچائی میں بہ نسبت حق گوئی کے ایک نور زائد ہوا۔

جہز و جہاز سکینت و وقار ہے۔ اور وہ قلب میں ایک نور ہے جو اللہ پر اطمینان اور اعتماد کو ضروری کر دیتا ہے کہ بندہ ہر قسم کی طاقت اور زور کو خدا کی طرف پھیرتا ہے اور کسی غیر اللہ کی پروا ہی نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ اس نور والے پیغمبر کو جب حق تعالیٰ کسی امر کی تبلیغ کا حکم دیتا ہے تو ساری دنیا مل کر بھی براہِ ضد و عداوت اس کا مقابلہ کرے تو اس کو مطلق پرواہ نہ ہوگی۔ اور وہ سب کو معدوم محض سمجھے گا۔ ساری دنیا اس کی موافقت کرے اور یار مددگار بنے یا مخالفت و عداوت کرے، دونوں حالتیں اس کے نزدیک برابر ہوتی ہیں کہ نہ موافقت میں کسی کی طاقت پر اس کی نظر جاتی ہے اور نہ مخالفت میں کسی کی قوت اس کی نگاہ میں سماتی ہے۔ اور جس کو یہ سکینت نصیب نہ ہو وہ جب سُنے گا کہ کوئی شخص اس کے ساتھ بدی کا ارادہ رکھتا ہے اور ضرر پہنچانا چاہتا ہے تو اس کی نظر اپنی طاقت پر بھی جائے گی، اور دشمن کی قوت پر جلتے گی۔ کہ دشمن کی مدافعت کے متعلق تدبیریں سوچے گا اور طرح طرح کے خیالات سوچیں گے کہ کبھی فکر ہوگا اگر دشمن سے مقابلہ ہو گیا تو بھاگنے کی کیا صورت کروں گا اور اس سے بچاؤ کی کیا صورت ہوگی۔ اور کبھی خیال آئے گا کہ یوں اس کو دفع کروں گا۔ اور اس طرح اس کو بچاؤ دکھاؤں گا حتیٰ کہ دشمن سے ٹکڑھ بھڑھ ہو جائے گی اور اس کا دل پیچ و تاب میں مبتلا اور حیلہ و تدبیر میں غلطان پہچان ہوگا کہ نہ کچھ بن پڑے گا نہ کچھ ہو سکے گا اور یہی وجہ ہے کہ سکینت کو جزو رسالت قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ صاحبان رسالت کو حکم دیا گیا ہے کہ ساری دنیا کے باشندوں سے عداوت رکھیں جب تک کہ وہ اپنے کفر سے باز نہ آجائیں اور طریق باطل کو چھوڑ نہ دیں۔

لہذا نہ ان کو پرواہ کرنی چاہیے ان کی توجہ پر اور نہ ان کی بے توجہی پر۔ اور نہ ان کی نظر پڑنی چاہیے ان کی محبت پر اور نہ ان کی روگردانی پر۔ چنانچہ حضراتِ مرسلین کی یہی حالت تھی کہ باشندگانِ روئے زمین نے ان کے دشمن بن کر متفقہ کوشش سے ان کا مقابلہ کیا۔ مگر ان حضرات پر اس کا مطلق اثر نہ ہوا۔ اس سکینت کا تذکرہ قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں آیا ہے مثلاً ثُمَّ أَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَةً عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ۔ اللہ نے سکینت نازل فرمائی اپنے رسول پر اور مومنین پر رسول پر انزال سکینت کا مطلب ہے اس کا اظہار (کہ جو سکینت جزو رسالت بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے سے دی ہوئی تھی) اس کے آثار کا مشاہدہ اور کثیر در کثیر دشمنوں کے مقابلہ پر آپ کا ثبات قدم مخلوق نے آنکھوں سے دیکھ لیا اور صحابہ پر انزال سکینت سے مراد حقیقی انزال اور بہ برکت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ان کو طمانیت قلب کا عطا فرمانا ہے۔

اس کے بعد حضرت مدوح سے گفتگو ہوتے ہوئے اس سکینت کا تذکرہ آیا جو بنی اسرائیل کے تابو میں تھی جس کا تذکرہ آیت شریفہ اَنْ يَّاتِيَكُمْ التَّابُوتُ



فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَبِّكُمْ میں آیا ہے اور اس سکینت کا جو حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مذکور ہے۔ اور اس سکینت کا جو دیگر احادیث میں آئی ہے۔ پس حالانکہ مجھے معلوم تھا مفسرین و محدثین نے اس کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے مگر حضرت ممدوح نے جو شرح فرمائی وہ ایسی تھی جیسے کوئی آنکھوں سے دیکھ کر شرح کر رہا ہے۔ حتیٰ کہ سلسلہ گفتگو حضرت جبریل کے وحیہ کلیبی کی شکل میں (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس) تشریف لانے کی کیفیت تک پہنچا اور اندیشہ طوالت نہ ہوتا تو میں ان تمام مضامین کو بیان کرتا۔ جزو پنجم مشاہدہ کاملہ ہے۔ اور اس کی شرح کی تو کوئی صورت ہی نہیں کیونکہ عقول سے بالا ہے، جیسے معرفت الہیہ کی شرح کہ اجزاء نبوت میں سے ہے کسی طرح بیان میں نہیں آ سکتی۔ جزو ششم موت بحالت حیات ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بحالت حیات اُن تمام امور کا مشاہدہ فرماتے تھے جن کا مشاہدہ مردوں کو مرنے کے بعد ہوتا ہے۔ اور اس کے جزو درست ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حضرات انبیاء دنیا میں ترغیب اور ترہیب کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ اور یہ اسی سے انجام پا سکتی ہیں جو احوال آخرت کا خود معائنہ کرے کہ لوگوں کو رغبت دلائے دار ثواب یعنی جنت کی اور ڈرائے دار عذاب یعنی جہنم سے، اور تفصیل بیان کرے قبر کے عذاب کی، اور یہ کہ ارواح کا عالم برزخ میں جانا کس طرح ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ، تمام وہ باتیں جو محض عقل سے معلوم نہیں ہو سکتیں۔ میں نے عرض کیا کہ ان امور میں پیغمبروں پر وحی الہی کا آجانا کافی تھا۔ مشاہدہ کی کیا ضرورت تھی۔ فرمایا کہ وحی ایک خطاب ہے، اور خطاب کلام ہے، اور کلام اُسی سے ہوا کرتا ہے جو اس کے معنی سے بھی واقف ہو۔ پس یہ مشاہدہ پیغمبر پر معاد کے حالات کو کھول دیتا ہے اور وہ ان سے عینی واقفیت حاصل کر لیتا ہے پھر وحی کے ذریعے اللہ کی طرف سے صرف ان باتوں کی تبلیغ کی اجازت ملتی ہے جن کی عقل متحمل ہو سکتی اور کان ان کو سن سکتے ہیں۔ ورنہ وہ باتیں جن کو عقل برداشت نہیں کر سکتی اور جن کے سننے سے جگر پھٹ جائیں گے اُن میں میں تو پیغمبر اپنے مشاہدہ سابقہ ہی پر رہتا ہے اور اس کے متعلق وحی نہیں ہوا کرتی۔ اور اگر کلام ایسے شخص سے کیا جائے جو معنی سے واقف ہو اُسے اس کا سمجھنا اور سمجھانا ہی محال ہو جائے گا۔ جزو ہفتم۔ جنتیوں کی سسی زندگی نصیب ہونا ہے کہ حضرات مسکین کو اُن (انوار معارف و رضا) سے سیراب کیا جاتا ہے جس نے اہل جنت کو جنت میں داخل کرتے کے بعد سیراب کیا جائے گا۔ لہذا فوات انبیاء کی شان دنیا میں وہ ہوتی ہے جو اہل جنت کی شان ہوگی جنت میں اس کی شرح یہ ہے کہ عالم دو ہیں۔ دار فنا اور دار بقا، پھر ہر ایک کی دو قسمیں ہیں۔ یعنی ظلماتی اور نورانی اور حجب حجاب زائل ہو جاتا ہے تو دار بقا کی ہر قسم، دار فنا کی ہم جنس نوع کو مدد پہنچاتی ہے کہ آخرت کی نورانی نوع یعنی جنت قوت پہنچاتی ہے۔ دنیا کی نورانی جنس یعنی ایمان و صلاح کو، اور ظلماتی قسم یعنی جہنم قوت پہنچاتی ہے اپنے ہم جنس ظلماتی نوع یعنی کفر و معصیت کو۔ مگر زوال حجاب کی صورتیں مختلف ہیں کہ حضرات انبیاء کی فات میں یہ پردہ پہلے سے اٹھایا ہوا ہوتا ہے (اور یہ نورانی مدد ان کو اسی عالم دنیا میں



حاصل ہوتی ہے، بر خلاف دیگر ذوات کے کہ ان کے لئے یہ پردہ بروز قیامت اٹھ جائے گا۔ اور اس وقت عام آخرت میں یہ استعداد واقع ہوگی کہ اہل ایمان مستفیض ہوں گے انوارِ حنیت سے اور اہل کفر و طغیان مستفید ہوں گے۔ آتش دوزخ سے۔ المحاصل ہر جنس کا اپنے ہم جنس سے استفادہ موقوف ہے پردہ اٹھنے پر۔ اور چونکہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے حق میں یہ پردہ اسی دنیا میں اٹھ جاتا ہے اس لئے ان کی دنیوی زندگی اہل حنیت کی اخروی زندگی جیسی ہوتی ہے۔

یہ ہے تفصیل حروفِ سبعہ میں ہر حرف کے اجزاء سبعہ کی جن کو بطور خلاصہ دوبارہ بیان کرتے ہیں تاکہ اختلاف کی تفریع واضح اور حدیث کا مطلب میں کے متعلق حضرت ممدوح سے سوال کیا تھا مکشوف ہو جائے، اور وہ یہ ہے کہ حروفِ سبعہ سے مراد سات انوار ہیں۔ یعنی آدمیت قبض لبط نبوت روح علم رسالت۔ اور ہر ایک کے سات اجزاء ہیں کہ آدمیت کے اجزاء کمال حسن ظاہری کمال حساس ظاہری کمال حسن باطنی کمال حواس باطنی ذکریت نزاع حظ شیطان کمال عقل ہیں۔ اور قبض کے اجزاء ہیں وہ حالت جس سے خیر میں لذت اور باطل سے کلفت حاصل ہو۔ انصاف صحت سے نفرت امتثال امر حلیس کی طرف میلان انقیاض کی قوت کاملہ حق گوئی سے شرم نہ کرنا اور لبط کے اجزاء ہیں فرح کامل ذات میں خیر کا قیام۔ فتح حواس ظاہری۔ فتح حواس باطنی رفعت حق تجاوز انکسار اور نبوت کے اجزاء ہیں حق گوئی۔ صبر رحمت معرفت الہیہ خوت تمام بغض باطل عقو اور روح کے اجزاء ہیں ذوق انوار طہارت تمیز بصیرت عدم الغفلت قوت سرایت تکلیف دینے والے اجرام سے بے حس اور علم کے اجزاء ہیں حل علوم عدم اصناعت معرفت لغات انجام سے واقفیت احوال کوئین سے تعلق رکھنے والے علوم سے آگاہی احوال ثقلین سے تعلق رکھنے والے علوم کی واقفیت تمام بی جہات کا صرف سامنے کی جہت میں منحصر رہنا اور رسالت کے اجزاء ہیں ذات میں روح کا قیام برضا و محبت، علم کامل ہر شخص کے ساتھ سچائی سکینت وقار مشاہدہ کاملہ موت بحالت حیات اہل حنیت کی سی زندگی۔ اب صحابہ و دیگر قراء میں جو اختلافات تلفظ قرآن کے متعلق وارد ہوئے ہیں ان کا مذکورہ انوار سبعہ باطنیہ پر متفرع ہونا معلوم کرو کہ حروفِ تنجی جن سے عربی کلام مرکب ہوتا ہے انیس ہیں اور ہر حرف کے لئے انوار مذکورہ میں سے ایک نور ہے کہ اس کے لئے امتثال ہے جو قبض کے اجزاء میں ہے جب کے لئے سکینت ہے کہ اجزاء رسالت میں ہے صحت کے لئے مال حواس ظاہری ہے کہ اجزاء آدمیت میں ہے صحت کے لئے انصاف ہے کہ اجزاء قبض میں ہے صبر ہے کہ اجزاء نبوت میں ہے حق کے لئے رحمت کاملہ ہے کہ اجزاء نبوت میں ہے حق کے لئے ذوق الانوار ہے کہ اجزاء روح میں ہے ذوق طہارت ہے کہ اجزاء روح میں ہے ذوق کے لئے معرفت لغات ہے کہ اجزاء علم میں ہے مشا کے لئے حسن تجاوز ہے کہ اجزاء لبط میں ہے نہال کے لئے ہر شخص کے ساتھ سچائی ہے کہ اجزاء



رسالت میں ہے۔ س کے لئے انکسار ہے کہ اجزاء لبط میں ہے۔ ث کے لئے انقباض کا مل ہے کہ اجزاء قبض میں ہے  
ص کے لئے عقل کا مل ہے کہ اجزاء آدمیت میں ہے ص کے لئے حق گوئی ہے کہ اجزاء نبوت میں ہے ط کے لئے  
تمیز ہے کہ اجزاء روح میں ہے ط کے لئے نزع حظ شیطان ہے کہ اجزاء آدمیت میں ہے ع کے لئے عفو ہے کہ اجزاء  
نبوت میں ہے ع کے لئے کمال صورت ظاہری ہے کہ اجزاء آدمیت میں ہے ف کے لئے حمل علوم ہے کہ اجزاء علم میں ہے  
ق کے لئے بصیرت ہے کہ اجزاء روح میں ہے ق کے لئے معرفت الہیہ ہے کہ اجزاء نبوت میں ہے ل کے لئے علم  
کا مل ہے کہ اجزاء رسالت میں ہے م کے لئے ذکرِ موت ہے کہ اجزاء آدمیت میں ہے ی کے لئے فرح کا مل ہے کہ اجزاء  
لبط میں ہے و کے لئے موت بحالت حیات ہے کہ اجزاء رسالت میں ہے لا کے لئے مند سے نفرت ہے کہ اجزاء قبض  
میں ہے لا کے لئے عدم غفلت ہے کہ اجزاء روح میں ہے اور آخری حرف ی کے لئے خوف تام ہے کہ اجزاء  
نبوت میں سے ہے پس انچاس اجزاء میں حروف تہجی کے اُن تیس اجزاء نکل کر باقی رہے بیس ان میں اٹھارہ اجزاء  
متفرع ہوں گی حروف مدولین یعنی آؤی پر کہ ہر حرف کے لئے چھ اجزاء ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ  
علیہ وسلم نے ان پر مد کیا ہے چھ مراتب تک یعنی کبھی ایک الف کی مقدار اور کبھی دو الف کی مقدار اور کبھی تین الف کی مقدار اور کبھی  
چار الف کی مقدار اور کبھی پانچ الف کی مقدار اور کبھی چھ الف کی مقدار اور یہ مقدار تحقیقی نہیں بلکہ تقریبی ہے چنانچہ شیخ القراء  
علامہ ابن الجوزی نے انشور میں اس کی تفصیل کی ہے کہ پہلا مرتبہ قصر کہلاتا ہے یعنی مد کرنا بقدر ایک الف کے اور وہ  
قرأت ہے ابن کثیر اور ابو جعفر کی۔ دوسرا مرتبہ فوق القصر ہے یعنی مد کرنا بقدر دو الف کے جو کہ قرأت ہے دوری اور  
قانون کی۔ تیسرا مرتبہ توسط ہے یعنی مد کرنا بقدر تین الف کے کہ قرأت ہے کسائی کی۔ چوتھا مرتبہ ہے فوق التوسط  
ہے یعنی مد کرنا بقدر چار الف کے کہ قرأت ہے عاصم اور ابن عامر کی۔ پانچواں مرتبہ اس سے اوپر ہے یعنی مد کرنا بقدر پانچ  
الف کے کہ قرأت ہے حمزہ اور ورش کی چھٹا مرتبہ تمطیط ہے یعنی مد کرنا بقدر چھ الف کے کہ ابو القاسم کے نزدیک  
قرأت ہے ورش کی اور پانچواں مرتبہ مخصوص کیا ہے حمزہ کے ساتھ حاصل کے لئے بلحاظ مراتب مدات چھ اجزاء  
یہ ہیں۔ کمال صورت باطنی قیام روح برضا و محبت حائز التذاذ بالخیر والکفایت بالشر۔ کمال حواس باطنی لغرض باطل  
اور ذات میں خیر کا قیام پھر مدوائے الف کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو ایسے کلمہ میں ہو جس سے نفس متکلم مراد ہے  
مغلاً اَنَا اَمَّنَا کہ ضمیر متکلم میں واقع ہوا ہے دوئم ایسے کلمہ میں واقع ہو جو ذات متکلم سے خارج ہے  
جیسے مِنْ السَّمَاءِ مَاءٌ کہ سماء اور مائیں مد آیا ہے جو ذات متکلم سے خارج چیزیں ہیں۔ پس اگر مد ایسے کلمہ میں  
آیا ہو جو متکلم کی طرف اشارہ کر رہا ہے تب تو اجزاء ستہ کی تفریع اس طرح ہوگی کہ مد کے پہلے مرتبہ یعنی قصر کے لئے  
کمال حس باطنی ہے، اور دوسرا مرتبہ یعنی مد بقدر دو الف کے لئے اس کمال حس باطنی پر اضافہ ہوگا قیام روح  
برضا کا اور تیسرے مرتبہ کے لئے ان دونوں اجزاء پر زیادتی ہوگی حائز التذاذ بالخیر کی۔ اور چوتھی مرتبہ یعنی مد بقدر چار



چار الف کے لئے یہ تینوں اجزاء ثابت ہوں گے مع کمال حواس باطنیہ کے۔ اور پانچویں مرتبہ کے لئے یہ چاروں اجزاء مع بغض باطل کے اور چھٹے مرتبہ یعنی مد بقدر چھ الف کے لئے ان پانچوں اجزاء میں شامل ہوگا ذات میں خیر کا قیام۔ اور اگر الف محدود ایسے کلمہ میں آئے جو ذات متکلم سے خارج ہے تو تفریع اس طرح ہوگی کہ مرتبہ اولیٰ میں کمال صورتہ باطنیہ ہوگا۔ اور دوسرے مرتبہ میں یہ مع بغض باطل کے۔ اور تیسرے مرتبہ یعنی مد بقدر تین الف میں یہ دونوں اجزاء مع سکون خیر ذات۔ اور چوتھے مرتبہ میں یہ تینوں مع حاسنہ التذاذ کے۔ اور پانچویں درجہ میں ان چار پر اضافہ ہوگا کمال حس باطنی کا اور چھٹے مرتبہ یعنی مد بقدر چھ الف میں یہ پانچوں اجزاء مع سکون روح برضا و محبت کے اور پہلی صورت میں ابتداء کمال حس باطنی سے اور دوسرے میں ابتداء کمال صورتہ باطنی سے ہونیکا راز یہ ہے کہ مد والا الف جب کلمہ نفس متکلم میں آیا تو باطن کی طرف اشارہ ہوا اور کمال حس باطنی ظاہر ہوا۔ برخلاف مثلاً ما اور سماء کے کہ غیر متکلم ہونے کے سبب وہ الفاظ میں داخل ہیں، اور الفاظ کی خوش آوازی کو تخلیق باطنی سے تعلق ہے۔ لہذا کمال صورتہ باطنیہ کی طرف اشارہ ہوا کہ حس باطنی کا مرجع قوامی نفسانیہ کی تکمیل ہے اور صورتہ باطنیہ کا مرجع خلقی و غیر اختیاری محاسن مثلاً آوازی وغیرہ ہیں۔ اور و کے لئے بلحاظ مراتب ذات چھ اجزاء یہ ہیں۔ حق بات میں نہ شرانا ہم جنس کی طرف میلان۔ حواس ظاہری کی کشود۔ حواس باطنی کی کشود۔ اجسام موزیہ کا عدم احساس اور اجرام میں گھس جانے کی طاقت سمجھ اگر مد والی داؤ نفس سے خارج کلمہ میں ہے جیسے لیسو دؤ او جو ہکھکھت تب تو مد کے پہلے مرتبہ یعنی قہر کے لئے نہ شرانا اور دوسرے مرتبہ یعنی دو داؤ کی مقدار کے لئے مع ہم جنس کی طرف میلان کے۔ اور تیسرے مرتبہ یعنی تین داؤ کی مقدار کے لئے یہ دونوں مع فتح حواس ظاہری کے اور چوتھے مرتبہ یعنی مد بقدر چار داؤ کے لئے تینوں مع فتح حواس باطنی کے اور پانچویں مرتبہ کے لئے یہ چاروں مع عدم احساس کے اور چھٹے مرتبہ یعنی تمطیط کے لئے یہ پانچوں اجزاء مع قوت سریان کے کہ ہر مرتبہ میں ماقبل پر ایک کا اضافہ ہوتا جائے گا۔ اور اگر داؤ محدودہ نفس متکلم میں ہونگی۔ جیسے قانواکامنا تو پہلے مرتبہ یعنی قہر کے لئے فتح حواس باطنی دوسرے مرتبہ کے لئے باضافہ فتح حواس ظاہری تیسرے مرتبہ کے لئے یہ دونوں مع میلان پسوٹے ہم جنس چوتھے مرتبہ کے لئے یہ تینوں اور حق گوئی میں شرم کھانا پانچویں مرتبہ کے لئے باضافہ عدم احساس اور چھٹے مرتبہ یعنی تمطیط کے لئے یہ پانچوں اجزاء مع قوت سریان کے ثابت ہوں گے کہ ہر مرتبہ میں ماقبل پر ایک بڑھتا رہے گا اور اس اضافہ کا سبب ظاہر ہے کہ بقدر دو داؤ کے مد میں گویا دو داؤ ہیں اور بقدر تین داؤ کے میں گویا تین داؤ ہیں۔ اور یہی حال الف اور یا کا ہے کہ جتنا مد کھچے گا اسی قدر گویا اس میں الف اور بڑھ جائیں گے۔ چنانچہ حق کے لئے بلحاظ مراتب ذات یہ چھ جزو ہیں عدم اضمات جہات کا صرف سامنے کی جہت میں انحصار۔ انجام سے واقفیت۔ احوال ثقلین کی معرفت۔



علوم احوال کونین سے واقفیت۔ اور اہل جنت کی سی حیات پھر اگر مد والی یا متکلم میں ہے جیسے اِنِّیْ اُلْقِیْتُ تَب  
تو تفریع اس طرح ہوگی کہ مرتبہ اولی کے لئے علوم احوال کونین کی معرفت دوسرے مرتبہ یعنی مد بقدر دویا کے  
لئے مع عدم اضاعت کے تیسرے مرتبہ کے لئے یہ دونوں مع واقفیت انجام کے چوتھے مرتبہ کے لئے یہ تینوں  
مع انحصار جہات کے۔ پانچویں مرتبہ کے لئے یہ چاروں باضافہ معرفت علوم احوال الثقلین کے۔ چھٹے مرتبہ یعنی  
تمطیط کے لئے کہ بقدر چھ یا کے مد ہوگا یہ پانچوں مع اضافہ اہل جنت جیسی حیات کے۔ اور اگر سی خارج از متکلم  
ہوگی جیسے وَفِیْ ذٰلِکُمْ تَوْبٰتٌ مَّرْتَبَہ کے لئے انحصار جہات۔ دوسرے مرتبہ کے لئے باضافہ علوم ثقلین۔ تیسرے  
مرتبہ کے لئے باضافہ اہل جنت جیسی حیات کے۔ چوتھے مرتبہ کے لئے باضافہ معرفت انجام۔ پانچویں مرتبہ کے لئے  
باضافہ عدم اضاعت۔ اور چھٹے مرتبہ یعنی تمطیط کے لئے باضافہ علوم احوال کونین یہ ہے تفصیل اٹھارہ اجزا کی اور  
اُن پر متفرع ہونے کے مراتب کا خلاصہ۔ باقی رہے دو جزو یعنی مشاہدہ اور کمال رفعت سوان کے انوار و اسرار پر  
قرآن مجید کی کتابت مرتب ہوئی ہے۔ یعنی وہ حررت جو لکھنے میں آتے ہیں مگر پڑھے نہیں جاتے۔ جیسے الصلوۃ  
کی و اور موسیٰ کی تح و غیرہ کہ ہر ایک میں مذکورہ دو اسرار میں سے کوئی ستر رکھا ہوا ہے۔ یعنی اگر کلمہ کا مدلول  
امر محسوس اور نظر آنے والا ہے مثلاً مَوَسٰی عَلَیْہِ السَّلَام کے نام ہیں دو پیغمبروں کے جو محسوس و مشاہد ہیں اور ان میں ی  
مکتوب ہے مگر مَقْرُوٰہ نہیں ہے اور مثلاً مَلٰٓئِکَہٗ مَعْنٰی جماعت کہ ا مکتوب ہے مگر پڑھا نہیں جاتا اور مثلاً مَنُوٰۃ اور  
مَشْکُوٰۃ کہ منات نام ہے بت کا اور مَشْکُوٰۃ بمعنی فیتل سوز کہ دونوں نظر آنے والی چیز ہیں اور ان میں د لکھی جاتی ہے  
مگر پڑھی نہیں جاتی تو ان میں ستر مشاہدہ ہے۔ اور اگر کلمہ کا مدلول غیر محسوس کوئی امر معنوی ہے تو اس میں مقام  
رفعت کا نور ہوگا۔ جیسے هٰذَا هُمۡ بمعنی ہدایت، کہ نظر آنے والی شے نہیں اور اس میں ی مکتوب ہے مگر پڑھی  
نہیں جاتی اور جیسے سَاۤوِرٌ بِکُمۡ جس کا ترجمہ ہے عنقریب میں تم کو دکھاؤں گا۔ اس میں و مکتوب ہے غیر مَقْرُوٰہ  
اور مدلول کلمہ امر محسوس نہیں ہے۔ اور جیسے بِاٰیٰتِہٖ مَعْنٰی قوت کہ غیر محسوس ہے اور ی لکھنے میں آتی ہے مگر پڑھنے میں  
نہیں آتی۔ تو ان میں ستر رفعت رکھا ہوا ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ کلام اللہ کی اس طریق پر کتابت کا صدور کہ بعض  
حررت کو باوجودیکہ پڑھا نہیں جاتا مگر لکھا جاتا ہے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہوا ہے یا حضرات  
صحابہ کی طرف سے فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہوا ہے کہ آپ نے صحابہ کو اسی طریق پر قرآن مجید لکھنے  
کا حکم فرمایا۔ اور صحابہ نے بلا کمی بیشی جیسا سنا اسی کے موافق لکھا۔ (حالانکہ بعض علماء نے اسکو صحابہ کی اصطلاح بتایا اور قرآن نے تو  
یہاں تک لکھا ہے کہ قریش نے کتابت اہل حیرہ سے سیکھی تھی اور اہل حیرہ لفظ الربو اکو واؤ کے ساتھ پڑھتے ہیں اس لئے قریش  
نے باوجودیکہ وہ الف کے ساتھ پڑھتے ہیں کتابت میں اُن کی تقلید کی ہے۔ اور قاضی ابوبکر باقلانی نے اپنی کتاب الاتصاف  
میں طویل بحث لکھی ہے کہ کتابت کے نقوش محض علامات ہیں مبنیہ اشارات و رموز کے کہ ہر نقش



ایک کلمہ پر دلالت کرتا اور بتلاتا ہے کہ اس کو اس طرح پڑھنا چاہیئے۔ پس جس صورت میں یہ مقصود حاصل ہو جائے وہ ٹھیک ہے خواہ صورت کچھ ہی ہو۔ پس جس طرح قرآن مجید کی کتابت خواہ بخط کوئی ہو یا بخط قدیم یا بخط نستعلیق یا نسخ جس قوم اور جس ملک میں خط کا رواج ہو وہ صحیح ہے، کہ کوئی خاص خط مامور شرعی نہیں ہے۔

اسی طرح التزیوا وغیرہ کی کتابت بغیر او اور تلفظ کو درست کرنے کے موافق جس طرح بھی ہو صحیح ہے کوئی خاص طریق مامور شرعی نہیں۔ مگر حضرت شیخ کی تحقیق یہ ہے کہ قرآن مجید کا یہ رسم الخط تو فیقی ہے اور بارگاہِ نبوت سے اس کی تعیین ہوئی ہے، نہ حضرات صحابہ کا اس میں بال برابر دخل ہے نہ کسی اور کا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے امر فرمایا تھا کہ فلاں کلمہ میں فلاں حرف کا اضافہ ہو اور فلاں کلمہ میں فلاں حرکت کی کمی۔ کہ اس اضافہ و کمی میں وہ اسرار پوشیدہ ہیں جن تک عقل کی رسائی نہیں ہو سکتی اور نہ اہل عرب بزمانہ جاہلیت ان سے واقف تھے۔ نہ دیگر امتیں اپنے ادیان و ازمنہ میں ان سے آگاہ تھیں اور نہ اب یا آئندہ اپنی عقل کے ذریعہ اس کے ایک ستر کو بھی کوئی سمجھ سکے کہ ان اسرار کو حق تعالیٰ نے خاص اپنے کلام مجید کے ساتھ مخصوص رکھا ہے اور یہ رسم الخط نہ توریت و انجیل میں پائی گئی نہ زبور یا صحف انبیاء میں اور جس طرح نظم قرآن باعجاز ہے کہ اس کا مثل لانے سے مخلوق عاجز ہے، اسی طرح اس کا رسم الخط بھی معجز ہے کہ ساری دنیا مل کر بھی ان اسرار کی رعایت حروف میں لانا تو درکنار ان کو سمجھ بھی نہیں سکتی اور عقل کیا سمجھے کہ مائتہ میں الف زائد فلاں ستر کی وجہ سے ہے جو کہ فئتہ میں نہیں ہے (حالانکہ پڑھنے میں دونوں یکساں ہیں نیز کوئی کیا سمجھے کہ والسماء ونبینا کھایا یئد میں ی زائد ہے اور اس میں کیا راز ہے۔ اور سورہ حج میں والذین سئو فی ایتینا معجزین کے لفظ سئو میں الف زائد ہے اور سورہ سباء میں بھی یہی ہے والذین سئو فی ایتینا معجزین مگر سئو میں الف نہیں ہے، اس میں راز کیا ہے اور فَعَفُوا النَّاقَةَ وَعَتُوا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ کے لفظ عتوا میں الف مکتوب ہے اور وَعَتُوا عَتُوا کبیراً میں الف نہیں ہے اس میں کیا راز ہے اور آیت اَوْ يَعْفُوا الْزَيْتِیَّ بَیْدَةً عُقْدَةً اِذْکَاجٍ میں لعفوا کے آگے الف ہے اور اُولَئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّعْفُو عَنْهُمْ میں نہیں ہے اس میں کیا راز ہے اور اَمِنُوا - کَفَرُوا - خَسِرُوا میں الف ہے اور بَاوُجَاوُ تَبَرُّوْا وَاِنْ نَّادُوْا مِنْ نَحْنٍ میں نہیں ہے اس میں کیا راز ہے۔ نیز بیجاری عقل کیا سمجھے اور کیسے سمجھے کہ صرث سورہ یوسف اور سورہ زخرف میں لفظ فُشِّرْنَا میں الف کیوں حذف کیا گیا۔ اور باقی جہاں یہ لفظ آیا الف کے ساتھ کیوں آیا۔ یا سورہ فعلت میں لفظ سَمَوْتُ میں الف آیا اور دوسری جگہ اس لفظ میں اس کو حذف کیا گیا۔ اور لفظ اَلْمِیْنَعَاد میں سب جگہ الف آیا مگر سورہ انفال میں اس کو حذف کر دیا گیا۔ اور سِرَّ جہاں کہیں آیا الف کے ساتھ آیا مگر سورہ فرقان میں بغیر الف کے آیا ان میں کیا اسرار ہیں۔ نیز زُحْلَةٌ رَنْجَمَةٌ قُرَّةٌ شَجَرَةٌ بعض جگہ بصورت ہا لکھے گئے اور بعض جگہ می قی قی کی صورت میں۔ اسی طرح لفظ الصلوٰۃ



الحیاء بعض جگہ بصورت الف آئے جیسے قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ لَا تَبْخُسُ  
بِصَلَاتِكَ۔ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِیْ حَیَاتِكُمُ الدُّنْیَا وَغَیْرَہَا۔ اور بعض جگہ بصورت و لکھا گیا ہے جیسے  
اَقِیْمُوا الصَّلَاةَ ۙ اَلْحِیٰوَةُ الدُّنْیَا وَ عَلٰی حَیٰوَةِ الْاٰخِرَةِ۔ ان سب میں اسرار الہیہ اور اغراض نبویہ مستور ہیں جن کو لوگوں  
سے اس لئے مخفی رکھا گیا ہے کہ باطن اسرار بغیر فتح ربانی کے ادراک نہیں ہو سکتے۔ ان کی شان شروع سورتوں  
کے حروف مقطعات کی سی ہے کہ ان میں بڑے بڑے اسرار اور کثیر معانی رکھے ہوئے ہیں حتیٰ کہ سورۃ ق میں چٹنے  
مضامین ہیں وہ سب حروف ق میں موجود ہیں جو شروع سورت میں آیا ہے۔ اسی طرح سورۃ ن کے سارے  
مضامین حروف ن ہیں، اور سورۃ ص کے سارے مضامین حروف ص ہیں سمائے ہوئے ہیں وغیر ذلک۔

مگر اکثر آدمی نہ ان اسرار سے واقف ہیں اور نہ ان معانی الہیہ کو سمجھ سکتے ہیں جن کی طرف ان حروف میں اشارہ  
کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ بعض لوگوں کا تو یہ خیال ہے کہ یہ ان سورتوں کے نام ہیں جن کے اول میں آئے ہیں۔ اور ایک جماعت  
کا خیال ہے کہ ان سے اعداد مراد ہیں مثلاً الف کا ایک اور لام کے تیس اور میم کے چالیس، لہذا الحمد سے مراد  
ہے اکہتر اور تمامی حروف مقطعات کے مجموعی اعداد سے اشارہ ہے۔ اس مدت تک دنیا میں مذہب اسلام  
کا بقا اور ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ یہ حروف مہملہ ہیں جن کے کوئی معنی نہیں (اور بعض سورتوں کے شروع میں حرف  
اس پر متنبہ کرنے کی غرض سے ان کو لایا گیا ہے کہ قرآن مجید بھی ان ہی حروف ہیجائیہ سے مرکب ہے جن سے ہر شخص  
کا کلام ترکیب کھاتا ہے مگر باوجود اس کے معجز ہے اور ساری دنیا ملکر بھی اس جیسی ایک سورۃ نہیں لاسکتی)  
غرض حروف مقطعات میں معانی عجیبہ کو مستور کر دیا گیا اور کوئی عقل وہاں تک نہ پہنچ سکی۔ بالکل یہی شان قرآنی  
رسم الخط کی ہے۔ ورنہ اس کو اگر صحابہ کی اصطلاح قرار دیا جائے تو قرآن مجید پر سے اعتماد ہی اٹھ جائیگا  
کیونکہ ظاہر ہے کہ قرآن مجید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور آپ کی موجودگی میں کسی ہیئت اور شکل پر ضرور  
کہا گیا۔ پس اب ہم پوچھتے ہیں کہ بعد میں حضرات صحابہ نے جب اس کی کتابت کی تو اسی شکل و ہیئت پر کی یا  
اس کے خلاف؟ اگر اسی شکل پر کی تب تو اس کو اصطلاح صحابہ کہنا ایسا ہی غلط ہے جیسے کوئی کہے لگے کہ مثلاً فرض  
نمازیں پانچ ہیں، اور رکعات ظہر کی تعداد چار ہے، یہ صحابہ کی اصطلاح ہے مصلیٰ پہلے سے معین شدہ چیز کو ان کی  
اصطلاح کہنے کا کیا مطلب ہوا۔ اور اگر کہو کہ زمانہ محمدی کی کتابت کے خلاف کتابت کی گئی۔ تو اس پر دو اعتراض  
ہیں اول مشاعل ہدایت حضرات صحابہ کی طرف مخالفت رسول کا انتساب جن کی بدولت ہمیں نور اسلام نظر آیا دوم  
صحابہ سے لے کر آج تک تمامی امت محمدیہ کا اس پر اجماع و اتفاق ہے کہ قرآن مجید میں نہ کسی حرف کا بڑھاتا  
جائز ہے نہ کسی حرف کا گھٹانا۔ تو جب مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے الرحمن اور العلمین میں الف زیادہ کیا اور  
پڑھنے کی رعایت رکھ کر اس طرح لکھا تھا الرحمن اور العلمین) اور مائتہ میں الف نہیں بڑھا یا بلکہ مائتہ



لکھا) نیز کُفْرٌ وَاخْرَجُوا میں الف نہیں لکھا تھا۔ اور بَابِ یَدِ میں ایک یا نہیں لکھی تھی (بلکہ باید لکھا تھا جیسا کہ پڑھا جاتا ہے) اور اَفَیْنِ مَتَّ وَغیرہ میں ی نہیں لکھی تھی (بلکہ اَفَیْنِ مَتَّ لکھا تھا) تو لازم آیا کہ حضرات صحابہ نے نعوذ باللہ قرآن مجید میں تصرف کیا اور کوئی حرف گھٹایا اور کوئی بڑھایا۔ اور ایسے فعل کے مرکب ہوئے جس کی بحکم اجماع کسی کو بھی اجازت نہیں تھی۔ علاوہ اس کے جب اس قرآن پر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اور آپ کے علم میں تھا ایسے حروف کا اضافہ ہو گیا جو وحی میں نازل نہیں ہوئے تھے تو شک پیدا ہو گیا کہ کیا عجب ہے نازل شدہ وحی میں کچھ حروف کم بھی کر دیئے گئے ہوں کہ جو شان اللہ کی طرف سے آئے ہوئے کلام میں اضافہ کی ہے وہی کم کرنے کی بھی ہے۔ پس اسلام کا شیزہ ہی منتشر ہو جائے گا کہ اسلام کا اصل الاصول ہی محرف اور ناقابل اعتماد بن گیا۔

ہاں صحابہ نے وفات محمدی کے بعد قرآن کی کتابت کی ہوتی تو ممکن تھا کہ اس کو اصطلاح صحابہ کہہ دیتے۔ مگر اب تو محقق یہی ہے کہ موجودہ رسم الخط تو فیعی ہے اور اس شکل پر قرآن مجید کی کتابت کا حکم بارگاہ محمدی سے صادر ہوا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو اُمی تھے اور لکھنا نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ قرآن میں مذکور ہے وَمَا كُنْتَ تَتْلُو مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذْ لَا رُقَا بَ الْكُتُبِ لَوْلَا نَ تَمَّ يَلِّهِ كَرَفَى كِتَابٍ پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھ سکتے تھے۔ ایسا ہوتا تو اہل باطل کو شک کا موقع تھا کہ چونکہ پڑھ لکھے ہیں اس لئے قرآن تصنیف کر لیا ہے (حضرت نے جواب دیا کہ اس آیت میں اصطلاحی کتابت اور لوگوں سے سیکھنے کی نفی کی گئی ہے نہ یہ کہ فتح ربانی کی جہت سے بھی آپ کتابت سے ناواقف تھے۔ اور ایسا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ آپ کی امت کے اولیاء میں صد ہا امی موجود ہیں جو بروئے فتح ربانی لطیف و برکت نعال محمدی زبانہ آدم سے لے کر اب تک ہر قوم اور ہر امت کی زبان اور رسم الخط اور قلم سے واقف ہیں۔ پھر آپ کی ذات مبارکہ کا تو کیا پوچھنا۔ واقعہ یہ ہے کہ جس کو حق تعالیٰ نے فتح نصیب فرمائی ہے اور اُس نے قرآن مجید کے اوراق میں موجودہ رسم الخط اور شکال حروف پر نظر ڈالی ہے اور پھر اُس نے (جسٹیم بصیرت) اُس کتابت قرآن مجید کو دیکھا ہے جو لوح محفوظ میں ہے تو دونوں میں بہت کچھ مشابہت پائی ہے، اور کفروا اور امنوا وغیرہ میں وہاں بھی الف زائد لکھا ہوا دیکھا ہے اور اس کے ساتھ ہی اُن کے اسرار سے واقف ہوا اور یہ معلوم کیا ہے کہ یہ اسرار عقول سے بالا ہیں۔

مچھر میں نے بطور امتحان آپ سے دریافت کیا کہ مایید میں پہلی ہی زائد ہے یا دوسری؟  
فرمایا دوسری۔

میں نے آپ کو شیعہ میں بھی ڈالا مگر آپ یقین کے ساتھ یہی فرماتے رہے کہ دوسری ی نائد ہے۔ چنانچہ ابو عبد اللہ خراز نے بھی یہی لکھا ہے۔ پھر میں نے دریافت کیا کہ مَلَدِیْہ میں الف نائد ہے جو لام سے ملا ہوا ہے یا معزہ جو بصورت ی مکتوب ہے فرمایا الف نائد ہے۔ غرض اس بحث میں متعدد سوال کئے اور حضرت نے ایسے جواب



دیئے جیسے بڑا ماہر حافظ قرآن جواب دیتا ہے۔ اور نیز رسم الخط کے اکثر حروف زائدہ کے اسرار بھی میں نے سنے اور ائمہ رسم الخط کے اقوال سے مقابلہ کیا تو اصابت و واقعیت حضرت ممدوح ہی کے قول میں پائی اور وہ اشکال جو رسم الخط کے متعلق سالہا سال سے مجھے پریشان کئے ہوئے تھا بالکل رفع ہو گیا۔ حالانکہ آپائی محض تھے اور حزب سبج بھی آپ کو حفظ نہ تھا۔ پھر میں نے عرض کیا کہ مانا قرآن مجید کا رسم الخط توفیقی ہے۔ مگر مخالفت یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر قیاسی رسم پر قرآن مجید کو لکھ لیا جائے اور مثلاً الف زائدہ کو حذف کر دیا جائے تو آٹھ اس میں حرج کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ کلام اللہ میں بہت کچھ اسرار ہیں۔ اور کتابت کو بھی اُن اسرار میں دخل ہے لہذا جس نے توفیقی رسم کے موافق رالف زائدہ وغیرہ کو قائم رکھتے ہوئے (الفاظ قرآنی لکھے تو اُس نے اسرار کلام الہیہ کا حق ادا کیا اور جس نے اس کو چھوڑ کر قیاسی رسم کے موافق الفاظ لکھے تو اس نے بعض اسرار کو چھوڑ دیا اور الیسا ہوا گویا اپنی طرف سے الفاظ لکھ رہا ہے نہ کہ وہ الفاظ جو کہ اللہ کی طرف سے نازل ہوئے تھے۔ اس کی مثال ایسی سمجھو مثلاً کسی شخص نے لفظ کان جو کہ افعال ناقصہ میں سے ہے (الصلوۃ کی طرح) واو کے ساتھ اس طرح لکھا کوان اور اس میں کوئی راز رکھا جس کی اطلاع بعض کو ہے اور بعض کو نہیں۔ اب ایک شخص آیا جو راز پر مطلع نہ تھا اور کہنے لگا کہ میں تو اس کو (واو کے ساتھ نہیں بلکہ) الف کے ساتھ لکھوں گا۔ کیونکہ معنی دونوں کے ایک ہیں اور اصل کتابت الف ہی کے ساتھ ہے تو جو شخص راز پر مطلع ہے وہ کہے گا کہ ایسا کرنے میں لفظ کے اسرار ناقص ہو جائیں گے اور تمہارا یہ لفظ کان وہ نہ ہوگا جو اس شخص کا مقصود تھا بلکہ دوسرا کان ہوگا جس کو تم نے اپنی طرف سے گھڑا ہے کیونکہ واو کے ساتھ کوان لکھنے میں ایک چیز کی ہستی وجود کے ساتھ ایجاد اور تکوین کی طرف بھی اشارہ تھا۔ اور کوان کا مطلب یہ تھا کہ فلاں سے موجود ہوئی اور نیز اس کو اللہ نے وجود بخشا کہ و کو باوجود نہ پڑے جانے کے کتابت میں لانے سے تکوین کی طرف اشارہ ہوا، اور و کے حذف کرنے سے وہ خوبی فوت ہو گئی۔ بس یہی حال ہے الصلوۃ الزکوۃ الربو وغیرہ کا کہ جب ان میں سے و حذف کر کے کتابت اس طرح کی الصلوۃ الزکاۃ الربا تو اسرار الہیہ میں کمی کر دی۔ میں نے کہا کہ اگر یہ رسم الخط توفیقی ہے اور بذریعہ وحی کے مامور ہے تو الفاظ قرآن کی طرح یہ بھی بطریق تواتر منقول ہونا چاہیے تاکہ نہ اختلاف باقی رہے نہ شک و شبہ، حالانکہ اس فن کی تمام کتابوں سے ثبوت ملتا ہے کہ رسم الخط خبر واحد کے ذریعہ منقول ہے۔ اور اسی لئے اس میں اختلاف بھی ہوا ورنہ کیسے ممکن ہے کہ اُمت محمدیہ وحی الہی کا ذرا حصہ بھی ضائع کرے۔ فرمایا امت نے وحی الہی کو بال برابر بھی ضائع نہیں کیا اور الحمد للہ قرآن مجید بلحاظ الفاظ اور بلحاظ رسم الخط ہر طرح محفوظ ہے کہ اہل عرفان نے جن کو عینی مشاہدہ کی بصیرت حاصل ہے رسم الخط کو محفوظ رکھا اور لوح محفوظ کی کتابت سے بال برابر بھی فرق نہ آنے دیا، اور ان کا یہ ادراک جو مشاہدہ و معائنہ سے حاصل ہوا ہے خبر متواتر سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے



اور دوسروں نے الفاط کو محفوظ کیا بذریعہ اخبار متواترہ کے۔ نہ بعض الفاط میں رسم خط کا اختلاف سو یہ ایسا ہی مضر  
 ہیں جیسا کہ عوام کا الفاط قرآنی سے جہل اور الفاط کا حافظ نہ ہونا نہ مضر ہے نہ تواتر کے خلاف ہے اور ناصی ابو بکر  
 کا یہ کہنا کہ رسم الخط کے انبار کا وجوب نہ کتاب اللہ سے ثابت ہے نہ کلام الرسول سے یہ اجماع سے نہ قیاس سے  
 لہذا اختیار ہے جس طرح چاہے لکھے، صحیح نہیں ہے کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے جو کچھ بھی تم کو رسول دین وہ  
 ادھر سے منع فرمائیں اس سے باز آؤ۔ اور یہ واضح ہو چکا کہ رسم الخط توفیقی ہے صحابہ کی اصطلاح نہیں ہے  
 لہذا رسول کا دیا ہوا ہے۔ اور اس کا لینا واجب ہے، اور اگر یہ شبہ کرو کہ حضرت نے اس طریق پر کتابت قرآن  
 کا حکم نہیں فرمایا، تو آپ کے زمانہ میں صحابہ کا اس طریق پر لکھنا اور حضرت کا اس کو قائم و برقرار رکھنا ہے  
 حکم کے درجہ میں ہے۔ اور آئمہ مجتہدین کے اقوال تو عام طور پر متفق ہیں کہ قرآن مجید کے رسم الخط میں تغیر جائز  
 نہیں۔ چنانچہ ابو عمر رانی نے مقنع میں روایت کی ہے کہ امام مالک سے کسی نے دریافت کیا کہ قرآن مجید کی کتابت  
 اگرچہ جدید حروف تہجی کے موافق کی جائے تو آپ کی رائے میں کیسا ہے؟ فرمایا میں اس کو جائز نہیں سمجھتا۔  
 کتابت قرآن بطریق قدیم ہوتی چاہیے۔ دوسری روایت ہے کہ کسی نے امام مالک سے پوچھا کہ قرآن میں جہاں  
 واو یا الف زائد ہیں اگر وہ لکھے جائیں تو کوئی حرج نہیں؟ فرمایا صحیح نہیں۔ ان کو لکھنا چاہیے مثلاً اُولَئِكَ اُدِی  
 اُولَاتٍ وَغیرہ کی واؤ۔ اِرْلُوْا قَتْلُوْا اَوَلَا اَوْضَعُوْا اَوَلَا اَوْ تَجْنَهُ بِاَمَلَةٍ مَّائِیْنِ لَا تِیَا سُوْا یَبْدُوْ  
 اَلِیَعْبُوْا وَغیرہ کا الف۔ اور مِنْ بَنِیْ اَلْمُرْسَلِیْنَ مَلَائِیْہِ وَغیرہ کی می۔ اور امام جعفری نے عقیلہ کی شرح  
 میں یہ روایت نقل کر کے لکھا ہے کہ چاروں آئمہ کا یہی مذہب ہے۔ اور صرف امام مالک کا نام اس  
 لئے آیا کہ مولف مقنع مالکی المذہب تھے۔ لہذا اپنے امام کا فتویٰ نقل کر دیا۔ الحاصل انچاس انوار پر انتیس  
 حروف ہجائے اور تینوں حروف مدہ اور رسم الخط میں حروف زوائد کی تفریع تو مفصل مذکور ہو چکی ہے رہیں حرکات  
 مثلثہ یعنی زیر زبر پیش اور چوتھا جزم سوان کا تفرع انوار سبعہ پر مستقل ہے کہ پیش اور جزم سبجملہ قبض  
 کے ہو پیش یا جزم والا ہوگا تو اس میں قبض کے دونوں ہوں گے۔ ایک بلحاظ حرف اور دوسرا بلحاظ اعراب۔  
 اور اگر قبض کے علاوہ دوسرے حروف ہوں تو حروف اپنے نور کی طرف منسوب ہوگا۔ اور اعراب  
 قبض کی طرف منسوب ہوں گے مثلاً ت ت ت ت ت ت قبض کے حروف ہیں، لہذا اگر مضموم یا مجزوم آئیں گے  
 تو اس میں دوہرے قبض ہوگا۔

اور ت ت ت ت غیر قبض کے حروف ہیں، اگر یہ مضموم یا مجزوم ہوں گے تو حروف اپنے نور  
 کی طرف جائے گا۔ اور اعراب قبض کی طرف۔ یہی حکم فتح اور کسرہ کا ہوگا کہ حرف رسالت اگر مفتوح  
 ہوگا تو اس میں دو نور ہوں گے رسالت کے۔ اور اگر حرف آدمیت مکسور ہوگا تو اس میں دو نور ہوں گے آدمیت کے



اور دیگر حروف اگر مفتوح یا مکسور ہوں گے تو حرف میں اُس کا نور ہوگا اور اعراب میں رسالت یا آدمیت کا نور اس سے ظاہر ہو گیا کہ قبض و رسالت و آدمیت کا نور کہ حرکات ثلثہ و جزم کا مرجع ہیں) باقی چار حروف یعنی روح و علم و لبس و نبوت کے انوار پر داخل ہوں گے (کیونکہ ان کے حروف پر بھی یہی اعراب آئیں گے) پھر رفع جو کہ قبض کے لئے ہے اجزاء قبض کے لحاظ سے سات قسم کا ہوگا کہ هُدٰی تَسْتَقِيْكَ يَوْمَئِذٍ الْمُنُوْنَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَعْبُدُكَ نَسْتَعِيْنُكَ وغیرہ کا رفع حاشہ التنازع بالخیر و تالم بالشر کے لئے ہے اور کفر و الکافر و ن هُمُ الظّٰلِمُوْنَ وغیرہ کا رفع نفرت از حد کے لئے۔ اور اُنزول وغیرہ کا رفع امثال کے لئے اور اُولٰٓئِكَ جہاں بھی آئے اس کا رفع میل لبوئے ہمجنس کے لئے۔ اور خَرَجُوا اٰخِرُ جَوْهَرٍ تَنْذِرُهُمْ وغیرہ کا رفع قُوۃ القیاض کے لئے۔ اور اِنَّكَ لَعَلٰی خَلَقْتَ وغیرہ کا رفع انصاف کے لئے اور تَالِ اللّٰهُ وغیرہ کا رفع حق گوئی سے شرم نہ کرنے کے لئے۔ اسی طرح جزم کی بھی سات قسمیں ہیں کہ الْحَمْدُ وغیرہ کا جزم حاشہ التنازع بالخیر کے لئے اور الْعَلَمِیْنَ کا جزم انصاف کے لئے اور الرَّحْمٰن کا امثال کے لئے اور نَعْبُدُكَ کا انقباض کے لئے اور اِصْدٰفًا کا نفرت از حد کے لئے اور غَلَبَ کا حق گوئی سے شرم نہ کرنے کے لئے اور رَجَعُوْهُمُ وغیرہ کا جزم لبوئے ہمجنس کے لئے اسی طرح زیر کی بلحاظ اجزاء رسالت کے سات قسمیں ہیں کہ الْحَمْدُ کے ہمزہ کا زیر مشاہدہ کے لئے ہے اور ح کا زیر سکنت کے لئے اور الْعَلَمِیْنَ کے ن کا زیر حیات اہل جنت کے لئے اور مَلٰٓئِکَ یَوْمَ الدِّیْنِ کے م راوری کا زیر صدق کے لئے اور اِیَّاكَ کے ل کا اور عَلَیْهِمُ الدِّیْنِ کے ع اول کا زیر علم کامل کے لئے اور نَسْتَعِيْنُکَ کی ت کا اور الصّٰطِحٰطِ کا زیر روح کی رہائش برضا و محبت کے لئے اور اُولٰٓئِكَ عِبَادُكَ وغیرہ کے ل کا زیر موت بحالت حیات کے لئے اسی طرح زیر کی بلحاظ اجزاء آدمیت کے سات قسمیں ہیں کہ اللّٰہ کے لا کا زیر فکوریت کے لئے اور سَبِّحْ بِحَمْدِکَ کا زیر عقل کامل کے لئے اور الْعَلَمِیْنَ کی مِم کا زیر کمال حسن ظاہری کے لئے اور الرَّحْمٰن کی ن کا کمال صورۃ باطنی کے لئے اور مَلٰٓئِکَ کے ک کا زیر کمال صورۃ ظاہری کے لئے اور الدِّیْنِ کے ن کا نزاع حظ شیطان کے لئے۔ اب حدیث کا مطلب واضح ہو گیا کہ تلفظ قرآن مجید کے اختلاف سے انوار حروف میں اختلاف ہوگا۔ اور قراء کی تمام روایات مشہورہ و غیر مشہورہ اسی پر متفرع ہوں گی مثلاً الْحَمْدُ لِلّٰهِ میں آدمیت کے تین اجزاء ہیں ایک م کہ ذکریت کے لئے ہے دوم لا کا زیر کہ وہ بھی ذکریت کے لئے ہے سوم کا زیر کہ کمال حسن باطنی کے لئے ہے۔

اور ایک جز و نبوت کا ہے یعنی ح کہ وہ رحمت کے لئے ہے اور ایک جز و روح کا ہے یعنی د کہ وہ طہارت کے لئے ہے اور پانچ اجزاء قبض کے ہیں یعنی اکر امثال کے لئے ہے اور ل کا جزم اور م کا جزم اور د کا پیش کہ وہ قینوں حاشہ التنازع کے لئے ہیں (سورۃ فاتحہ میں ہر پیش اسی حاشہ التنازع کے لئے ہے) اور لا نفرت از حد کے لئے ہے اور جہ



اجزاء رسالت کے ہیں اُن کا زیرِ مشاہدہ کے لئے ہے اُن مجزوم و مکتوم و مشدّد تینوں علمِ کامل کے لئے۔ ح کا زیرِ  
 سکینت کے لئے۔ اور اُن کا تشدید مفتوح مشاہدہ کے لئے کہ سورہ فاتحہ میں جہاں بھی فتح مع تشدید آیا ہے وہ  
 مشاہدہ کے لئے ہے، پس آ میں بروے حرف نور قبض ہے اور بروے حرکت نور رسالت، اور لام میں اس کے بعکس  
 ہے کہ حرف کی جہت سے نور رسالت ہے اور جزم کی رو سے نور قبض۔ اور ج میں بروے حرف نور نبوت ہے اور  
 بروے حرکت نور رسالت، اور د میں بروے حرف آدمیت ہے اور بروے جزم نور قبض۔ اور د میں بروے حرف  
 نور روح ہے اور بروے حرکت نور قبض اور پہلے لام میں بروے حرف نور رسالت ہے اور بروے حرکت  
 نور آدمیت۔ اور دوسرے لام مشدّد میں بروے حرف نور رسالت ہے اور بروے حرکت بھی نور رسالت۔ اور  
 لا میں بروے حرف نور قبض ہے اور بروے حرکت نور آدمیت۔ اور دوسری قراءتوں میں اختلاف تلفظ سے  
 انوار بدل جائیں گے مثلاً زید بن روبہ اور عتکی کی قراءت سبعہ سے فارح اور شاذہ وال مفتوحہ کے ساتھ ہے  
 الْحَمْدُ لِلّٰہ جس کی لفظی توجیہ تو یہ ہے کہ مفعول مطلق ہے بمعنی احمد اللہ حمداً۔ اور قراءت مشہورہ میں  
 رفع بنا پر مبتداء ہونے کے تھا۔ اور باطنی توجیہ تابع ہے پیش اور زیر کے نور کے کہ پیش حالت التذاذ کے لئے  
 تھا۔ لہذا یہ مطلب ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے لئے حمد کا استحقاق زبان مبارک سے بھی  
 ظاہر فرمایا اور آپ کی ذات مطہرہ نے تکلیف ہو کر اس کا التذاذ دمرہ بھی لیا۔ اور زیر چونکہ علمِ کامل کے لئے ہے  
 لہذا یہ مطلب ہو گا کہ آپ کو اس کا علم کامل حاصل تھا کہ ہر قسم کی حمد و ثنا کا اللہ ہی مستحق ہے۔ باقی یہ کہ آپ کی  
 ذات بھی اس سے تکلیف و ملتذ ہوئی یا نہیں تو آیۃ شریفہ اس سے ساکت ہے اسی بناء پر پیش کی قراءت  
 مشہورہ اصرح و افضل ہوئی۔ اگرچہ بلحاظ ترکیب لفظی و سر باطنی دونوں قراءتیں صحیح ہیں۔ یا مثلاً قراءات شاذہ  
 میں امام حسن بصری کی قراءت ہے د اور ن دونوں پر زیر الْحَمْدُ لِلّٰہ ظاہر کی توجیہ میں لام کا نصب  
 اتباعاً ہے کہ وال کے تبعاً لام کو بھی فتح دے دیا۔ اور باطنی توجیہ یہ ہے کہ زیر کی حرکت تو کمال  
 حسنِ باطنی کے لئے تھی جس کا یہ مطلب تھا کہ حمد الہی کو وجدان نے بھی محسوس کیا اور اس کے  
 مفہوم سے متاثر ہوا۔ برخلاف نصب کے کہ وہ علمِ کامل کے لئے ہے جس کا مفہوم یہ ہوا کہ اللہ کا مستحق  
 حمد ہوتا معلوم کیا۔ اور تکلیف و تاثیر سے سکوت ہے لہذا قراءت مشہورہ اصرح و احسن ہوئی۔ یا مثلاً  
 قتیبہ کی قراءت ہے لِلّٰہ میں لام مشدّد پر انا کہ خفیف ساحب کا و کسرہ کی طرف ہوا، انا میں چونکہ کسرہ کا  
 جزو آگیا اور کسرہ جہاں بھی لام پر شروع یا درمیان میں آئے گا وہ کمال حسنِ باطنی کے لئے ہو گا لہذا اس  
 میں اگرچہ وجدان کا تاثر و احساس ضرور ظاہر ہوا ہے کہ شانِ تعظیم و تبلیغ کے زیادہ مناسب ہے مگر چونکہ یہ احساس  
 کلمہ کے تمام ہونے سے قبل (درمیانِ فی لام سے) ہوا ہے لہذا اس کا مرجع صرف لفظ ہو گا کہ لفظ کا احساس



آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی کبھی یعنی صرف اس وقت ہوتا تھا جبکہ طبع شریف کو نشاط ہوتا اور ذاتی تلاوت کے درجہ میں قرآن مجید پڑھتے تھے ورنہ عام طور پر امت کی تبلیغ اور تعلیم کے لئے آپ کی قرأت ہوا کرتی تھی اور اس وقت آپ کے باطن شریف کا اشتغال خالص الفاظ کی طرف نہ رہتا تھا۔ لہذا قرأت مشہورہ افضل ہوتی کہ آپ کی عادت غالبہ پر متفرع ہے اسے اسی طرح جامع کتاب نے تمامی سورۃ فاتحہ کی شرح کی ہے اور قراءات سبعہ متواترہ و قراءات شاذہ کے تمامی اختلافات لفظیہ بیان کر کے ان کی ظاہری توجیہ جدا کی ہے اور معنوی توجیہ جدا۔ اس کے بعد انوار باطنیہ کی تفریع میں قراءات مشہورہ کی وجہ ترجیح بیان کی ہے جس کو نمونہ کے طور پر ہم نے بیان کر دیا اور پوری شرح کو بخوف طوالت چھوڑ دیا کہ اول تو اس بحث کا سمجھنا مشکل ہے اور اگر سمجھ میں آ بھی جائے تو ہر نور کی تفریع حروف پر یا درہنی دشوار ہے، اور اگر یاد ہو جائے تو ایک ذکی و فہیم شخص کو اتنے نمونہ ہی سے ساری سورت بلکہ تمامی قرآن مجید کے لفظ لفظ کا انوار سبعہ پر مرتب کرنا ممکن ہے۔ لہذا اس بحث کو کہ صرف ایک حدیث کی شرح نے باوجود اختصار کے مستقل رسالہ کی صورت لی چند نتائج پر ختم کرتے ہیں جن پر جامع کتاب نے خاص طور پر تنبیہ فرمائی ہے اور وہ تو ہیں۔ اول اس تقریر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے باطن شریف کی شرح اور آپ کی رفعت شان نظر آئی کہ انچاس ٹٹا اجزاء کے ہر نور کو پاس پاس رکھتے جاؤ اور نور بھی انتہائی کم دنیا میں کسی بڑی سے بڑی ہستی کو اس درجہ اور مقدار کا نصیب نہیں ہوا۔ پھر انچاس ٹٹا انوار کو ان کی پوری تفصیل کے ساتھ مرکب کر کے دیکھو کہ کتنا بڑا نور ہے، اور وہ باطن محمدی میں رکھا ہوا دیکھ رہا ہے اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور آپ کی صورت ظاہریہ و باطنیہ کا علم نصیب ہوگا۔ دوم اس تقریر سے روح کی تفسیر اور اس کے خصائل حمیدہ اور اوصاف غریبہ معلوم ہوئے یعنی ذوق انوار طہارت و صفائی تمیز بصیرت عدم غفلت قوت شریان اور اجزائے مولمہ کا عدم احساس۔

ان اوصاف کا علم اور ان کے معانی و مفہوم سے پوری واقفیت جس کو حاصل ہو جائے گی اس کو روح اور اس کے لوازم اور خواص کا علم کبیر نصیب ہوگا کہ علماء کا اس میں بہت اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس بارہ میں گفتگو اور غور و خوض ہی نہ کرنا چاہیئے۔ اور بعض نے غور و خوض کو جائز رکھا ہے مگر خواص روح کچھ بھی بیان نہیں کئے جس کی وجہ سے عقول اس بارہ میں بدستور متحیر و پریشان رہیں۔ مگر شیخ کی تقریر میں روح کے خواص کا بھی ذکر ہے۔ اور یہ امور کہ روح کیا چیز ہے، اور اس کی ماہیت کیا ہے، اور باہم ارجاع کا توافق و مخالفت کیسے ہوتا ہے اور اجسام میں داخل ہونے سے قبل ان کی کیا کیفیت تھی وغیرہ انشاء اللہ اکتب میں مذکور ہوں گے۔

سوم اس تقریر سے اولیاء اللہ کے علوم و معارف کا پتہ چلا کہ معرفت و ولایت کیا چیز ہے، یعنی یہ کہ وہی وہ ہے جس کی ذات اور روح کا درمیانی پردہ اٹھ جائے اور روح اپنے اسرار کو ذات پر کھولے۔ ورنہ اگر ذات



محبوب ہے روح سے تو وہ عارف نہیں بلکہ عامی ہے اگرچہ آسمان پر اڑتا اور پانی میں چلتا ہو کہ خوارق عادت محض مشقی و سطحی چیزیں ہیں جو مجاہدہ و ریاضت سے کفار کو بھی حاصل ہو سکتی ہیں، چہاں تک اس تقریر میں حدیث شریفہ انزل القرآن علی سبعة احرث کی شرح اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اسرار قلبیہ و انوار باطنیہ پر اس کی تفریع مذکور ہے۔ کہ نبی کریم اور رسول عظیم کے قلب کو قرآن کریم اور فرقان عظیم کے نزول کی خاطر جتنا کبیر اور صاحب انوار ہونا چاہیے وہ شیخ ہی کی تقریر سے مکشوف ہو اور نہ عام طور پر ظاہر عیارت اور عربی زبان کے لحاظ سے جو معنی اس حدیث کے بیان کئے گئے ہیں ان کو مقام ثبوت سے نہ کوئی مس ہے نہ واسطہ۔ کیونکہ محض تلفظات کا اختلاف جس میں اسرار باطنیہ کا دخل نہ ہو باطن سے بے بہرہ محروم کا کلام ہوا کرتا ہے نہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسے سید الانبیاء پر نازل ہونے والا کلام اللہ۔ یا مثلاً یہ تفسیر کہ سات حروف سے مراد قرآن مجید کے سات مضامین ہیں، حلال حرام وعدہ وعید خبر استخبار اور نداء۔ بھلا اس کے متعلق یہ کہنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ قرآن سات مضامین پر نازل ہوا ہے۔ لہذا جس طرح آسان سمجھو پڑ ہو۔

نیز اس بارہ میں صحابہ کا اختلاف و باہمی نزاع کس طرح صحیح ہو سکتا ہے جبکہ یہ مضامین سب کے نزدیک مسلم ہیں۔ یا مثلاً یہ تفسیر کہ حروف سبعة سے مراد امر، نہی وعدہ وعید وغیرہ ہیں (کہ قرآن مجید کی کسی آیت میں حکم ہے کہ کسی کام کے کرنے کا، اور کسی میں ممانعت ہے کسی کام کی وغیرہ) کہ یہ امور صحابہ کے درمیان مخاصمت کا سبب نہیں ہو سکتے۔ پیچم ائمہ قرآن نے قراءات سبعة و شاذہ کی جو توجیہات کی ہیں ان کو اور حضرت شیخ کی تقریر کو سامنے رکھ کر مقابلہ کرو تو دونوں کا فرق واضح ہو جائے گا کہ قراء کی توجیہات میں اگرچہ صحیح ہیں مگر عام ہیں، ان کی کوئی خصوصیت ذات محمدی کے ساتھ ثابت نہیں ہوتی۔ مثلاً مَلَّکُ یُؤْخِذُ الدِّینَ لَام کے سکون کی قراءت کے متعلق قراء کہتے ہیں کہ غَضْدُ اور کُتْفُ کی طرح تخفیف کے لئے ہے (کہ اہل عرب ان کو بھی غَضْدُ اور کُتْفُ پڑھ دیتے ہیں) حالانکہ ظاہر ہے کہ غَضْدُ اور کُتْفُ قرآن مجید کے الفاظ نہیں ہیں۔ عام عربی زبان کے الفاظ ہیں جن کو تمامی اہل عرب بولتے ہیں پس اس کے سکون بغرض تخفیف کو ثبوت اور کلام اللہ کے ساتھ کیا تخصیص ہوئی۔ اسی طرح مثلاً اِیَّاکَ یُعْبُدُ کی قراءت میں (کہ تیری ہی عبادت کی جاتی ہے) توجیہ فرمائی ہے کہ اس میں صنعت التفات ہے حالانکہ التفات (یعنی غائب کے صیغے استعمال کرتے کرتے خطاب کا صیغہ آنا یا اس کا برعکس) عام طور پر عربی کلام میں مستعمل ہے۔ اس کو ثبوت محمدیہ سے کیا خصوصیت، ہاں شیخ کی تقریر سے معلوم ہو گا کہ تی کا ضمہ اور ق کا جزم انقباض کے لئے ہے۔ اور انقباض اس مقام پر حروف تی اور ع کے معنی کی ضد سے ہو گا کہ تی خوف من اللہ کے لئے ہے جس کی ضد ہے نہر ہونا یعنی ارتکاب معصیت، اور ع عفو کے لئے ہے جس کی ضد ہے ظلم کرنا۔ گویا اس کلمہ کا ادا کرنا والا اول ہر دو حروف کے معنی خوف خدا اور ثانی عفو و درگزر



سے متصف ہو کر معصیت اور ظلم سے منعقبض ہوا۔ اور انقیاض بھی اتنا قوی ہوا کہ عارفین میں سے بن گیا جن کی زندگی اہل جنت کی سی ہوتی ہے، یعنی اہل باطن، جو تمامی مخلوق کی عبادت اللہ کے لئے اور ہر شے کی تسبیح ذات باری کے لئے مشاہدہ کرتے ہیں۔ جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے: **وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يَسْبِّحُ بِحَمْدِهِ** کہ کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو اللہ کی تسبیح و حمد نہ کرتی ہو، مگر ان کی یہ حمد و تسبیح عوام الناس کو سنائی نہیں دیتی البتہ خواص اور عارفین و اولیاء اللہ کو سنائی دیتی ہے، اور یہ اہل حبت کی کسی حیاتِ بے کے زیر سے معلوم ہوئی جو اس قرأت کے اختلاف کا جزو و سہم ہے کہ وسط کلام میں حرف ساکن کے بعد وائے حرف کا زیر حیات مثل اہل حبت کے لئے ہوا کرتا ہے پس یہ قرأت کسی عارف ہی کی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کی یہی قرأت تھی کہ اکابر عارفین میں سے تھے۔ بر خلاف قرأت مشہورہ **إِيَّاكَ تَعْبُدُ** کہ (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں) کہہ کر متکلم نے اپنے نفس کو عبادت میں داخل کر لیا کہ عارف کو اگرچہ اس کی حاجت نہیں کیونکہ وہ ہر شے کو خدا کی عبادت میں دیکھ رہا ہے اور شے میں اس کا نفس بھی داخل ہے مگر غیر عارف کو ضرورت ہے کہ قولاً و قراراً اپنے آپ کو داخل عبادت کرے۔ لہذا قرأت مشہورہ اصح و افضل ہوئی کہ وہ شامل ہے عوام اور خواص دونوں کو، بر خلاف قرأت شاذہ کے کہ مخصوص ہے عارف کے ساتھ، دونوں تقریروں کا مقابلہ ایسا ہے جیسے زمین و آسمان کا راند اور مخلوق خدا دونوں میں مگر دونوں میں بے حد فرق ہے) ششم: یہ خیال نہ کرنا کہ باطنی حروف سبعہ ہی قرآن مجید کی تفسیر ہیں کہ ایسا خیال صحیح نہیں۔ قرآن مجید کی ہر آیت کا ایک مفہوم ہے۔ اور تمامی علوم اولین و آخرین اس میں درج ہیں یہ حروف سبعہ اس مفہوم کے لئے بمنزلہ لباس کے ہیں۔ اور مفہوم دوسری چیز ہے اور اس کا لباس دوسری شے۔ چنانچہ الحمد للہ کی تفسیر سے یہ بات واضح ہو چکی ہے۔ پس اگر قرآن مجید کی تفسیر اس کے حقیقی مفہوم و معنی میں کی جائے تو قرآن کا ظاہر و باطن منکشف ہو جائے۔ اور باطن سے یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اجسام میں داخل ہونے سے قبل ارجح کی کیا کیفیت تھی۔ اور مفارقت اجسام کے بعد ان کی کیا صورت ہوگی۔ نیز معلوم ہو جائے کہ قرآن سے تمامی علوم کیسے مستخرج ہوتے اور شریعت محمدیہ بلکہ تمامی شرائع سابقہ و لاحقہ اس سے کس طرح اخذ کی جاسکتی ہیں۔ اور یہ سب کچھ علم کے اجزاء سابقہ یعنی انجام سے واقفیت احوال کونین سے تعلق رکھنے والے علوم۔ احوال ثقلین سے تعلق رکھنے والے علوم اور تمامی لغات کی معرفت وغیرہ میں داخل ہے جو کہ باطن محمدی کے سمندر کا ایک قطرہ ہے۔ پس اگر قرآن مجید کو اس طریق پر سمجھا جائے اور پھر اس تفسیر کو ان حروف سبعہ کے انوار سے مرکب کیا جائے اور معانی کو ان کا لباس پہنایا جائے تو وہ معارف ظاہر ہوں گے جن کو سنکر عقل حیران ہو جائے گی۔ اور اس وقت معلوم ہوگا کہ بے شک تمام آسمانوں اور زمینوں کی مخلوق سب مل کر بھی قرآن مجید کی ایک سطر برابر لانا چاہیں تو ہرگز نہیں



لا سکتے۔ مفتی۔ الفاظ قرآن کے اسرار کی واقفیت اور ہر حرف کے ایک سر خاص کے ساتھ مخصوص ہونے کی وجہ مثلاً یہ کہ آتشال کے لئے ہے تب سبکیت کے لئے اور ت کمال حس ظاہری کے لئے وغیرہ وغیرہ بجز اہل فتح اور صابر عرفان واریاب شہود کے کسی دوسرے کو معلوم نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح اعرابی حرکات کا خاص خاص اسرار کے ساتھ مستصفت ہونا بغیر فتح و عرفان کے ناممکن ہے۔ کیونکہ اگر اس کا کوئی خاص ضابطہ و قاعدہ ہوتا تو ہر شخص مذکورہ اسرار کو معلوم کر لیتا۔ لہذا اگر کوئی اس سے واقف ہونا چاہے تو ارباب شہود سے گفتگو کرے اور ہر حرف دہر اعراف کا راز دریافت کرے۔ انشاء اللہ حق تک رسائی نصیب ہوگی۔ ہشتم رسم الخط کے متعلق مذکورہ تقریر کو توفیق اور بامربوبی ہے اور اس میں خاص اسرار ہیں۔ تمامی اشکالات کو دور کر دے گی کہ جن لوگوں نے اس کو صحابہ کی اصطلاح قرار دیا ہے ان میں بھی دو گروہ ہیں۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ یہ اصطلاح صحیح ہے اور اس میں اسرار رکھے ہوئے ہیں جن میں بعض کو ہم سمجھ سکتے ہیں اور بعض کو نہیں سمجھ سکتے۔ پس جن کو سمجھ سکتے ہیں۔ ان کا اتباع بلحاظ معقول کرنا چاہیے۔ اور جن کو نہیں سمجھ سکتے ان کا اتباع تعبدی طور پر ہو اور محض اطاعت کے درجہ میں کرنا چاہیے، اس فریق نے رسم الخط کو اگرچہ محفوظ طور رکھا مگر اتنا نہ سمجھے کہ تعبدی اتباع صرف احکام الہی میں ہوتا کرتا ہے۔ انسانوں کی تجویز کردہ اصطلاح میں نہیں ہوتا کہ یہ منصب صرف حق تعالیٰ کا ہے کہ اس کے کسی حکم کی مصلحت اگر سمجھ میں نہ آئے تب بھی اس کو تسلیم کیا جائے کہ عبیدت و غلامی کا تقاضہ یہی ہے۔ اور اسی لئے ایسے حکم کے ماننے کو تعبدی کہا جاتا ہے، پس اس فریق کی تقریر اگر امر معقول اور امر تعبدی کے متعلق صحیح کہی جاسکتی ہے تو اسی وقت کہی جاسکتی ہے جبکہ رسم الخط کو توفیقی قرار دیا جائے۔ اور دوسرا فریق وہ ہے جس نے اصطلاح کی کوئی رعایت ہی نہیں رکھی اور کہہ دیا کہ چونکہ اہل عرب خود لکھتا نہیں جانتے تھے اس لئے الصلوٰۃ وغیرہ کو بجائے الف کے واو کے ساتھ لکھ دیا۔ چنانچہ فراء کا کلام اس پر دلالت کر رہا ہے۔ اور ولی الدین ابن خلدون نے بھی اپنی مشہور تاریخ کے مقدمہ میں یہی خیال ظاہر کیا ہے نہم شیخ کی تقریر میں میں نے دو شبہ پیش کئے تھے ان کو بھی مع جواب کے یہاں بیان کر دینا مناسب ہے۔ اول میں نے عرض کیا کہ حروف تہجی کو جب ہم نے انوار باطنیہ پر تقیم کیا تو ت ث ظ ص ض ع ۵ آدمیت کے لئے نکلے اور آ ث ش ۶ حروف قبض کے لئے اور ث ن ۷ حروف لب کے لئے اور ج ۸ حروف ذل و ۹ حروف رسالت کے لئے مگر یہی حروف جمعی کلام الناس بھی موجود ہیں۔ قرآن مجید کے ساتھ مخصوص نہیں کہ ہر بشر کا کلام انہیں حروف سے ترکیب کہاتا ہے۔ پس لازم آیا کہ ہر کلام سات حروف پر آیا اور یہی انوار سبعہ ہر بشر کے کلام میں پائے گئے۔ حالانکہ یہ شان صرف قرآن مجید کی ہے۔ دیگر کتب آسمانی کی بھی نہیں۔ چہ جائیکہ ہر بشر کا کلام۔ چنانچہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ میں نے اسرار قرآن کو دریافت کیا ہے اور اس میں سات حروف ہیں جن سے تمام کلام قرآن مجید ترکیب ہوا ہے۔



سے فرمایا کہ آسمانی کتابیں ایک دروازہ سے اور ایک حرف پر نازل ہو کر تھیں۔ اور قرآن مجید سات دروازوں سے اور سات حروف پر نازل ہوا ہے، حضرت شیخ نے جواب دیا کہ حروف بھی کی یہ تقسیم صرف قرآن مجید کے حروف کے ساتھ مخصوص ہے۔ دوسرے کلام کے حروف کے لئے ثابت نہ ہوگی۔ یعنی یہ نہیں کہ ہر الف قبض کے لئے ہے اور نہ یہ کہ ہر ب سکنت کے لئے اور نہ یہ کہ ہر ت کمال حسن ظاہری کے لئے۔ اور نہ ہر ج صبر کے لئے ہے اور نہ ہر ح رحمت کے لئے اور نہ ہر خ ذوق انوار کے لئے۔ بلکہ یہ انوار حروف مذکورہ کے لئے اُس وقت ہیں جبکہ قرآن مجید میں اویں اور اگر یہ حروف قرآن کے علاوہ دوسرے کلام میں آئیں گے تو ان کی تقسیم دوسری ہوگی۔ اور وہ یہ ہے کہ انتیس کے انتیس حروف، آدمیت کے سات اجزاء میں محصور ہیں کہ کمال صورت باطنی تو ہر حرف کے لئے ہے، اور ذکوہت پیش کے لئے اور کمال صورت ظاہری زیر کے لئے، اور کمال عقل زیر کے لئے، اور کمال حس باطنی جزم کے لئے۔ اور نزع خط شیطان الف کے مد کے لئے، اور کمال حسن ظاہری یا کے مد کے لئے۔ رہا واؤ کا مد مووہ کچھ حصہ نزع خط شیطان کا لیتا ہے اور کچھ حصہ کمال حسن ظاہری کا۔ پس یہ تقسیم آسمانی کتابوں اور احادیث قدسیہ اور انسانوں کے عام کلام میں موجود ہے باقی حروف ستم یعنی قبض لبسط نبوت روح علم اور رسالت کے انوار ان کلاموں میں راکد و ساکت ہوں گے کہ ان میں اشتعال نہ ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ انوار ستم جب ذوات انبیاء علیہم السلام میں موجود ہیں تو ان پر نازل شدہ کتاب بھی ان انوار پر نازل ہونی چاہئے۔ ان کے معطل و بیکار ہونے کا کیا سبب؟ فرمایا کہ بے شک جعبوں انوار فعات انبیاء میں موجود ہیں۔ مگر اس طرح جیسے فعات محمدی میں حدیث قدسی وغیرہ کے تکلم کے وقت میں موجود ہیں کہ موجود ہونے کے لئے مشغول ہونا اور اسرار کا قیام ضرور نہیں رہیے لال ٹین کی بتی بجی کر دی جائے کہ روشنی ضرور موجود ہے مگر مشعل نہیں، یہ اشتعال انوار ستم کا بس قرآن مجید کے ساتھ مخصوص ہے۔ دوسرا سوال شیخ کی تقریر اور اس بارہ میں جو احادیث آئی ہیں ان میں تطبیق کے متعلق تھا۔ کہ میں نے چند حدیثیں پڑھ کر عرض کیا کہ ان حدیثوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سبعة احرف سے مراد تلفظ کے اختلافات ہیں۔ خصوصاً ترنی کی حدیث کا یہ مضمون کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل امین سے کہا کہ۔

لے جبریل مجھے ان پڑھ لوگوں اور امت اُمیہ کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہے جس میں بوڑھے بوڑھیں لڑکے لڑکیاں اور وہ مرد جنہوں نے کوئی کتاب کبھی نہیں پڑھی سب ہی شامل ہیں۔ تو حضرت جبریل نے کہا ان سے کہہ دیجئے کہ سات قراءتوں میں جس کو آسان سمجھیں اس کو پڑھ لیا کریں یا اتن حبان اور حاکم کی حدیث کے یہ الفاظ کہ عبد اللہ بن مسعود نے ایک شخص کو اپنی قراءت کے خلاف پڑھتے سنا تو اُسے خدمت نبویہ میں لے گئے۔ اور آنحضرت نے فرمایا کہ ہر شخص کو اپنے علم کے موافق پڑھنے کی اجازت ہے اس پر حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں کہ اس کے بعد ہر شخص اپنی قراءت جو دوسرے کی قراءت کے خلاف تھی (آزادی کے ساتھ بلا نزاع و مخالفت) پڑھنے لگا۔



پس ظاہر ہے کہ اس سے مراد الفاظ قرآن کے تلفظ ہی کا اختلاف ہے کہ مثلاً کوئی پڑھتا تھا مَالِکِ یَوْمَ الْمَدِیْنِ اور کوئی پڑھتا تھا حَذَفَ الْمَلِکِ یَوْمَ الْمَدِیْنِ وغیرہ جس پر قراءات سبعہ مشہورہ یا دیگر قراءات شاذہ کا مدار ہے، کہ اگر حروف باطنیہ یعنی قبض و لب و رسالت و نون وغیرہ سات انوار مراد ہوتے تو نہ ان میں صحابہ کا اختلاف ممکن تھا۔ اور نہ یہ ترتیب جو مسلم کی حدیث بروایت اُبی بن کعب میں آئی ہے کہ حضرت جبریل نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ حق تعالیٰ حکم فرماتا ہے کہ آپ اپنی اُمت کو ایک حرف پر قرآن پڑھائیں۔ مگر جب آپ نے اللہ سے درخواست کی کہ میری اُمت اس کو برداشت نہیں کر سکتی تو وہ حرف کی اجازت ملی۔ اور پھر تین کی حتیٰ کہ آخر میں سات حرف پر قراءت کرنے کی اجازت ہوئی، کہ حروف سبعہ باطنیہ تو ذات محمدی کے امور طبعیہ تھے انکا یکے بعد دیگرے آنا یا اس میں کسی صحابی کا ایک کو لینا اور کسی کا دوسرے کو لینا بالکل بے معنی ہے خصوصاً جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حق تعالیٰ سے یہ درخواست کہ قرآن مجید کو سات حرف پر نازل فرمایا جائے مدینہ منورہ میں ہوئی تھی اور ظاہر ہے کہ انوار باطنیہ آپ کو ولادت ہی کے وقت سے نصیب تھے۔ مدینہ میں ان کی درخواست کا کوئی مطلب ہی نہیں ہو سکتا، حضرت شیخ نے فرمایا کہ انوار باطنیہ کی شان بمنزلہ جسم کے ہے اور تلفظی اختلافات بمنزلہ سایہ کے۔ تو جو شخص سایہ کو ثابت کرے گا وہ جسم کا منکر نہیں بلکہ درحقیقت جسم ہی کو ثابت کر رہا ہے (کہ سایہ نام ہی جسم کے عکس کا ہے) پس سایہ کی وحدت جسم کی وحدت چاہتی ہے اور سایہ کا تعدد و جسم کا تعدد چاہتا ہے۔ لہذا جس نے ایک حرفِ ظل یعنی ایک تلفظ لیا اس نے ایک حرفِ جسم لیا۔ یعنی قراءت کے لئے ایک نور باطنی معین کیا اگرچہ اس کا وجود ذات محمدی میں پہلے سے تھا اور جسے ظل کے دو حرف لئے اُس نے دو حرفِ جسم لئے یعنی جس نے دو تلفظ اختیار کئے اُس نے قراءت کے لئے انوار طبعیہ کے دو نور معین کئے اگرچہ موجود پہلے سے تھے۔ علیٰ ہذا جس نے سات حرفِ ظل لئے اُس نے سات انوار جسم لئے یعنی ساتوں تلفظی اختلافات پر قادر ہوا تو ساتوں انوار باطنیہ محمدیہ کو جو کہ طبعیتہ محمدیہ میں قدیم سے موجود تھے اخذ کرنے کے طاقت پائے پس اختلاف تلفظی کا ثبوت عین اختلاف انوار باطنیہ کا مثبت ہے اور اس پر قدرت و ضعف ہی تحمل انوار باطنیہ کے طاقت و کمزوری کا کشف و منظر ہے۔ تب میں نے عرض کیا کہ حضرت کی برکت و عنایت سے الحمد للہ انوار سبعہ باطنیہ تو خوب سمجھ میں آگئے مگر سبعہ اختلافات تلفظیہ بھی اگر حضرت دالہ سمجھا دیں تو بیٹا کرم ہوگا۔ کہ اس سے مراد اختلافات لغات ہے جیسا کہ بعض علما کا قول ہے مگر پھر اس میں مختلف اقوال ہیں کہ کسی نے سات لغات کچھ بیان کئے اور کسی نے کچھ یا اختلافات احکام مراد ہے جیسا کہ دیگر علماء کا قول ہے اور انہوں نے اپنی دلیل حضرت عبد اللہ بن مسعود کی یہ حدیث مرفوعہ قرار دی ہے کہ قرآن سات حرف پر نازل ہوا ہے یعنی زجر و مر۔ حلال حرام محکم متشابہ اندھ ضرب امثل۔ لہذا حلال کو حلال سمجھو اور حرام کو حرام، اور جس بات کا



اس پر اس کو کروا اور جس سے زجر و ممانعت ہے اس سے بچو اور محکم (و صریح المعنی آیات) پر عمل کرو اور متشابہ (مثلاً) حروف مقطعات یا جن آیتوں میں اللہ کے لئے وجہ اورید وغیرہ ثابت ہے، ان پر ایمان لاؤ اور کہہ دو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے، یہ سب اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے (کہ جو کچھ بھی ان سے اللہ کی مراد ہے وہ حق ہے اور ہمیں اس کی کریمہ کرنے کی ضرورت نہیں) اور ضرب المثل سے عبرت کا سبق پورا جیسے ارشاد ہے "کافرون کی مثال جانوروں کی سی ہے کہ صرف آواز اور پکار کو سمجھتے ہیں" انکا مقصود اور مفہوم کچھ نہیں سمجھتے، وغیرہ۔ یا اختلاف قرأت مراد ہے جیسا کہ دیگر علماء کا قول ہے۔ مگر پھر اس کی تعبیر میں اختلاف ہے اور بعض کی رائے یہ ہے کہ سات سے مراد خاص عدد نہیں بلکہ توسیع اور تسہیل ہے کہ تلاوت قرآن میں گنجائش ہے جس طرح سہولت ہو اس طرح پڑھو۔

اس میں مشہورہ سبع قرأت کے علاوہ سب قراءات شاذہ بھی داخل ہو جائیں گی جن کی تعداد چودہ سے بھی زائد ہے حضرت ممدوح نے فرمایا کہ وجوہ قراءات کے اختلافات مراد ہیں جن کی تعداد سات ہے مگر میں تم کو کس طرح سمجھاؤں جبکہ میرے گھروالوں نے بچپن میں مجھے قرآن پڑھا یا ہی نہیں کہ اصطلاحی نام سمجھ لیتا اور اب سمجھا سکتا۔ اس لئے اتنا کہہ سکتا ہوں کہ وہ سات صورتیں مراد ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد قراءتوں سے ظاہر ہوئیں مگر وہ طریق مجھے معلوم نہیں جس سے تم کو بتلا اور سمجھا سکوں۔ اس کے بعد حضرت ممدوح اپنے اس مشاہدہ کو مثالوں وغیرہ کے ذریعہ سمجھاتے اور سات اقسام کرنے کی سعی فرماتے رہے حتیٰ کہ آپ کی مراد ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اختلاف وجوہ قرأت سات صورتوں میں منحصر ہے اول اختلاف قراءت بنا بر حرکت و سکون مثلاً لَعَلَّكُمْ عَذَابٌ مُّثْنٌ رَّحِمْنَا بِكُمْ میں ایک قرأت ہے الیم کی مد پر کسرہ کی تنوین کے ساتھ (کہ صفت ہے رَحْمَتِہِ کی) اور دوسری قرأت میں ہے مد پر ضمہ کی تنوین (کہ صفت ہے عَذَابِہِ کی) دوم اختلاف قرأت بنا بر زیادتی و کمی حروف مثلاً وَسَارِعُوا اور وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا اور دوسری قرأت ہے وَسَارِعُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا یعنی بجزت واو۔ سوم اختلاف بکمی و زیادتی کلمات مثلاً اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ اور دوسری قرأت ہے بجزت کلمہ هُوَ چہاں اختلاف بنا بر تقدیم و تاخیر جیسے وَقَتْلُوْا وَاْتَلُوْا اور دوسری قرأت ہے وَقَاتِلُوْا وَقَتْلُوْا اسی طرح فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ پہلا کلمہ بصیغہ معروف۔

اور دوسرا بصیغہ مجہول اور دوسری قرأت ہے اس کے برعکس کہ اول بصیغہ مجہول اور دوسرا بصیغہ معروف یا مثلاً وَجَاءَتْ سَكْرَةٌ اَنْتُمْ بِالْحَقِّ اور سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی قرأت ہے وَجَاءَتْ سَكْرَةٌ اَلْحَقِّ بِالْمَوْتِ

پنجم اختلاف قرأت بنا پر مخارج مثلاً اَنْصُرْهُمْ بَخْرَجِ صُ اور دوسری قرأت میں اَشْمَام کے ساتھ کہ بوسیدہ ہو ض کی کہ اس کا مخرج دوسرا ہے اسی طرح قَبْلِ خَبْلٍ حَبْلٍ سَبْعٌ اور سَبْعٌ میں کسر اور دوسری



قراءت میں اشمام، کہ بوب پیدا ہو ضمہ کی۔ یا الصلوة کے لام میں تفخیم اور ترقیق کا اختلاف ششم اختلاف قراءت بنا بر فتح اور امالہ رکوب پیدا ہو کسرہ کی جیسے موسیٰ علیہ السلام اذما سجداً وغیرہ میں دونوں طرح قرآن پڑھا ہے) مثلاً اختلاف بنا بر اظہار وادغام رکب قرآن کے پڑھنے کو سونگے تب سمجھ میں آئے گا۔

ہفتم اختلاف قراءت بالبطو والسرع کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ترتیل کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر تلاوت فرماتے تھے۔ اور کبھی روان جس کو حد کہتے ہیں۔ بس یہ ہیں وجوہ اختلافات جو علاوہ گذشتہ تینم حروف و حرکات کے مستقل طور پر انوار باطنیہ کے ساتھ مربوط ہیں کہ ترتیل پیدا ہوتی ہے روح سے اور حد و روانی بشرطیکہ حروف کٹنے نہ پائیں پیدا ہوتی ہے قبض سے اور امالہ کا منشا ہے نبوت اور فتح کا رسالت۔ اور اشمام ہر قسم کا مخصوص ہے روح کے لئے، اور عدم اشمام نبوت کے لئے۔ اور زیادتی حروف کو تعلق ہے قبض سے، اور کمی حروف

کو روح سے۔ اور بیشی کلمات کو رسالت سے، اور کمی کلمات کو علم سے۔ اور تقدیم کو نور آدمیت سے، اور تاخیر کو نور علم سے۔ اور حرکات کا تعلق جن میں اختلاف نہیں مثلاً وَ جَدَّكَ ضَا لَّا فَحَدَّیْ نَور لبطو سے ہے واللہ

اعلم (۳) میں نے ایک مرتبہ عرض کیا بخاری میں مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نیک شخص کی اچھی خواب نبوت کے چھپا لیں اجزاء میں ایک جزو ہے اور مسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ پچاس

اجزا میں میں ایک جزو ہے اور طبری میں امام احمد نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص سے روایت کی ہے انچاس اجزاء میں کا ایک جزو اور شرح قرطبی میں منقول ہے سینتالیس اجزاء میں کا ایک جزو، اور طبری نے حضرت عبادہ بن صامت سے روایت کی ہے چوالیس اجزاء میں کا ایک جزو۔ اور ابن عبدالبر نے حضرت انسؓ سے موقوفاً روایت کی ہے چھیالیس اجزاء میں کا ایک جزو، اور شرح نووی میں آیا ہے چوبیس

اجزاء میں کا ایک جزو، اور شرح ابن ابی حبرہ میں آیا ہے پچاس اجزاء میں کا ایک جزو۔ اور اسٹی میں آیا ہے ستائیس اجزاء میں کا ایک جزو، اور دوسری روایتیں اور ہیں جن میں ایک روایت سنتر کی ہے ایک بہتر کی۔ ایک چھیتر کی۔ ایک پچاس کی ایک چالیس کی۔ ایک بیالیس کی۔ یہ کل پندرہ روایتیں ہوئیں جن میں صحیح ترین روایت چھیالیس کی ہے اور پھر پچاس کی۔ اور باقی روایتوں میں کلام ہے بجز بہتر کی

روایت کے کہ اس کو مسلم نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے۔ میں نے یہ حدیثیں سنا کر حضرت مدوح سے دریافت کیا کہ اجزاء نبوت سے کیا مراد ہے اور ان روایتوں کے اختلاف میں کیا حکمت ہے۔ اور ان میں تطبیق

کس صورت سے ہوگی۔ علماء کی عقلیں اس میں حیران ہیں اور ان کی تقریروں سے کوئی تسکین بخش نتیجہ نہیں فرمایا اجزاء نبوت سے مراد وہی آدمیت اور قبض و لبط اور خود نبوت کے اجزاء ہیں جو گذشتہ بحث میں مذکور ہو چکے ہیں۔ یعنی آدمیت کے سات اجزاء۔ کمال صورت ظاہر یہ۔ کمال حواس ظاہر یہ



کمال صورت باطنیہ کمال حواس باطنیہ۔ ذکریت۔ نزع حظ شیطان۔ کمال عقل اور قبض کی سات اجزاء حالت  
التزاد بالخیر۔ انصاف۔ نفرت۔ اذہد۔ حق بات سے نہ شرانا۔ امتثال امر۔ ہم جنس کی طرف میلان۔  
قوت انقباض اور بسط کے سات اجزاء فرح کامل۔ ذات میں خیر کا قیام۔ حواس ظاہری کی کشود حواس  
باطنی کی کشود۔ مقام رفعت در گذر۔ انکسار۔ اور نبوت کے سات اجزاء حق گوئی۔ صبر۔ رحمت۔ معرفت الہیہ  
خوف تمام۔ بغض باطل۔ عقو کہ مجموعہ اٹھائیس ہوگا۔ اور ہر جزء کی شرح پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہو  
چکی ہے۔ اس کو دوبارہ دیکھ لو۔ پھر چونکہ خواب میں ذکریت کی خصوصیت نہیں کہ مرد ہو یا عورت دونوں کو  
اچھی خواب نظر آتی ہے۔ لہذا اس کو ساقط کر دو تو ستائیس اجزاء باقی رہے اور ابن ابی جبرہ کی روایت اس  
پر محمول ہوگی۔ اور اگر کمال صورت ظاہریہ کو بھی ساقط کر دو کہ اگرچہ اجزاء نبوت میں سے ہے مگر خواب کے ساتھ  
اس کا کوئی خصوصی تعلق نہیں ہے (کیونکہ خوب صورت ہو یا بد صورت دونوں کو خواب مساوی نظر آیا کرتی ہے) تو پچیس  
اجزاء باقی رہ جائیں گے۔ اور اس کو ابن عبد البر کی روایت کا محمل قرار دیں گے اور اگر کمال صورت باطنیہ کو بھی  
اسی بنا پر ساقط کر دیں کہ خواب کے ساتھ جگر و معدہ وغیرہ کے حسن و قبح کا بھی تعلق نہیں) تو پچیس باقی  
بچیں گے اور ابن ابی جبرہ کی دوسری روایت اس پر محمول ہو جائے گی۔ اور اگر کمال حواس ظاہریہ کو بھی  
اسی سبب سے ساقط کر دو کہ سماعت و بصر و غیرہ کے قوت و ضعف کو بھی خواب میں کوئی دخل نہیں) تو چوبیس  
باقی رہیں گے اور نووی کی روایت کو اس پر محمل کریں گے۔ یہ تفصیل تو اس صورت میں ہوگی جبکہ صرت نبوت کے اجزا  
لئے جائیں گے بغیر رسالت کے۔ ورنہ روح و علم اور رسالت تینوں کے سات سات اجزاء جن کی تفصیل و شرح گذر چکی  
ہے اس پر اضافہ ہوں گے اور اجزاء نبوت پورے انچاس ہو جائیں گے۔ اس پر طبری اور امام احمد کی روایت محمول  
ہوگی۔ اور اگر ذکریت کمال صورت ظاہریہ کو ساقط کر دیا جائے گا تو سببائیس باقی بچیں گے اور اس پر قرطبی کی  
روایت محمول ہوگی اور اگر کمال صورت باطنیہ کو بھی ساقط کر دیا جائے گا (کہ ان تینوں کا خواب میں کوئی خاص دخل نہیں)  
تو چھائیس بچیں گے اور اس پر محمل ہوگی روایت مشہورہ و متفق علیہ جس کو بخاری نے نقل کیا ہے اور اگر کمال  
حواس ظاہریہ کو بھی ساقط کر دیں تو پچائیس بچیں گے جو محمل ہوگا مسلم کی روایت کا۔ یہ تو جہات ہیں  
سات روایتوں کی۔ اور باقی روایات کی صحت میں کلام ہے۔ لہذا ان کی توجیہ فضول ہے۔ میں نے عرض  
کیا کہ حضرت والا کی تقریر سے یہ ثابت نہ ہو کہ اچھی خواب منجملہ اجزاء نبوت کے ہے، کیونکہ انچاس اجزاء میں  
خواب کہیں نہیں آئی۔ حالانکہ حدیث کا مقتضا یہ ہے کہ خواب کا شمار اجزاء نبوت میں ہے۔ فرمایا کہ روایا وصالہ  
اجزاء آدمیت میں سے ایک جزو یعنی نزع حظ شیطان، اور اجزاء روح میں سے ایک جزو یعنی بصیرت سے  
مستفید ہوتی ہے، کہ جب بصیرت کا نزول ہوتا ہے شیطان فی حصہ کے نکل جانے پر اچھی خوابیں نظر آیا کرتی ہیں



جن کو دیا مصالحہ کہتے ہیں (لہذا اجزاء نبوت میں داخل ہوئی) میں نے کہا کہ اس بناء پر تو دو جز ہوئے اجزاء نبوت کے۔ لہذا حدیث میں یہ ہونا چاہیے تھا کہ اچھی خواب دو جز ہیں منجملہ اجزاء نبوت کے۔ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اجزاء نبوت کا ایک جز قرار دیا ہے۔ فرمایا کہ خواب کا مدار درحقیقت نزع حظ شیطان پر ہے کہ جزو آدمیت ہے۔ باقی بصیرت کہ جزو روح ہے اس کی موافقت کرتی اور مددگار بنتی ہے (جیسے دور بین سے کسی چیز کو دیکھیں تو دیکھنا درحقیقت کام صرف نظر اور قوت باصرہ کا ہے۔ دور بین مدد پہنچاتی اور نگاہ کی موافقت کی ہے۔ لہذا دو جز نہیں بلکہ ایک ہی جزو ہوا کہ) حق تعالیٰ شانہ، جب کسی بندہ سے شیطانی حصہ نکال لیتا (اور مادہ ظلمت سلب فرمالیتا) ہے تو اس کے افکار و تخیلات سب امور خیر میں گھوما کرتے ہیں لہذا اس کو اچھی خوابیں نظر آتی ہیں۔ اور جن میں یہ شیطانی حصہ موجود ہوتا ہے اس کے افکار اس کے برعکس ہوتے ہیں لہذا اس کو بُری خوابیں نظر آیا کرتی ہیں۔ شیخ کی یہ تقریر محض کشف اور صفاء معرفت ہے ورنہ علماء میں کسی ایک نے بھی نبوت کے اجزاء بیان نہیں کئے۔ بلکہ ان کی شمار کو حقائق نبوت کی معرفت رکھنے والوں پر محمول کر دیا ہے

البتہ علامہ حلیمی نے خواب کو نبوت کا چہیا لیسواں جز وثابت کرتے کے لئے حضرات انبیاء علیہم السلام کے علمی خصائص کی ایک نہرست دی ہے اور چہیا لیس کی شمار پورا کرنے کے لئے بہت کچھ تکلف سے کام لیا ہے کہ کہتے ہیں نبوت کا سبب بالآخر جزو اللہ پاک سے بلا واسطہ کلام کرنا ہے اور پھر الہام جس میں کلام نہ ہو سوئم وحی بزبان فرشتہ چہارم فرشتہ کا قلب میں الفا و پنجم کمال عقل سوئم قوت حافظہ کہ ایک بار سنکر پوری سورت یاد ہو جائے۔ ہفتم اجتہادی مسائل میں غلطی نہ کھانا۔ ہشتم زیر کی فہم کہ ایک حکم منصوص سے کثیر در کثیر مسائل استنباط کر کے نہم کمال بصیرت کہ وہ چیز دیکھ سکے جو دوسروں کو نظر نہ آوے۔ دہم کمال سماعت کہ منتہائے زمین کی وہ باتیں سن سکے جن کو دوسرے نہ کر سکیں یا ز دہم کمال شہم حبیب کہ یعقوب علیہ السلام سے ثابت ہوا کہ حضرت یوسف کے کرتہ کی بو کو (مسافت بعیدہ سے) سونگھ لیا، دوازدہم بدنی طاقت کہ ایک شب میں مہینہ بھر کی مسافت طے کر سکے۔ سیزدہم آسمانوں پر عروج رحبیا کہ شب معراج میں ظاہر ہوا) چہار دہم وحی کا آنا گھڑیاں کی گونج کی طرح۔ پنجدہم بکری کا کلام کرنا (حبیب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خیبر کی ایک یہودی عورت نے بکری کے گوشت میں زہر ملا کر دیا اور خود گوشت نے آپ کو خردی کہ میرے اندر زہر ملا ہوا ہے) نہاتات کا بولنا کہ جس شب میں جنات نے قرآن مجید سنا تھا اس کی اطلاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک درخت تے دی تھی) کھجور کا بولنا رحبیا کہ ممبر کی تیاری کے وقت وہ تنہ بچوں کی طرح رویا جس سے سہارا لگا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطنہ پر پھا کرتے تھے۔) پچھتر کا بولنا کہ حضرت علیؑ سے روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جو بھی درخت یا پتھر پڑتا تھا وہ آپ کو سلام کرتا تھا) پچھتر یوں کی بولی کا سمجھنا رحبیا کہ مروی ہے



ایک مرتبہ تقریباً تئو بیٹھنے کے بعد نماز فجر مسجد نبوی کے پاس آ بیٹھے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ کھانا مانگتے ہیں ان کو کھلاؤ (اونٹ کی بولی کا سمجھا) جیسا کہ ایک مرتبہ ایک اونٹ نے حضرت سے شکایت کی کہ مجھ پر طاقت سے زیادہ بوجھ لادنا جاتا ہے، آواز سننا بولنے والے کی جس کا متکلم نظر نہ آوے (جیسا کہ جنات کی باتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنیں) جنات کو دیکھتا۔ نظر سے اونچل چیزوں کا سامنے آ جانا۔ جبے شب معراج ثقی صبح کو بیت المقدس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لا رکھا گیا کہ آپ اس کو دیکھتے جائے اور سوال کرنے والوں کو اس کے طاق و کڑی وغیرہ بتاتے جاتے تھے) کسی واقعہ کا پیش آنا جس سے انجام کا علم حاصل ہو مثلاً غزوہ حدیبیہ کے راستہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی چلتے چلتے بیٹھ گئی تو آپ نے اس سے نتیجہ نکالا کہ اشارہ ہے اندرون حرم جنگ نہ کی جائے۔ اور فرمایا کہ میری اونٹنی کو اس اندیشہ نے روکا جس نے اصحاب فیل کے (محمود نامی) ہاتھی کو روکا تھا (کہ وہ بھی گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور حرم محترم کے ادب کا اشارہ کر رہا تھا) نام سے کسی معاملہ پر استدلال کرنا جیسا کہ حضرت سہیل بن عمرو حبش حاضر خدمت ہوئے تو آنحضرت نے صحابہ سے فرمایا تمہارے معاملہ میں سہولت نصیب ہوئی۔ کسی آسانی چیز کو دیکھ کر زمین کے کسی واقعہ پر استدلال کرنا مثلاً بادل کو دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ قبیلہ بنی کعب کی فتح و نصرت کا اعلان کر رہا ہے۔ پشت کی طرف سے دیکھنا۔ کسی کی زندگی میں ایسے واقعہ کا معلوم ہو جانا جو اس کے مرنے کے بعد اس کو پیش آئے گا جیسے حضرت حنظلہ کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ان کو دیکھ رہا ہوں کہ فرشتے غسل دے رہے ہیں (چنانچہ بحالت جنابت ان کو شہادت نصیب ہوئی اور یہاں بلا غسل بحکم شہداء دفن ہوئے مگر وہاں ملائکہ نے غسل جنابت دیا) ایسی صورتوں کا ظہور جن سے آئندہ کی فتوحات پر استدلال کیا جائے جیسا کہ غزوہ خندق میں ظاہر ہوا (کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بڑے پتھر کو توڑنے کے لئے کھدال ماری تو اس سے ایک چمک پیدا ہوئی جس میں نارس کے شہر نظر آئے اور آپ نے فرمایا کہ ملک کسریٰ مسلمانوں کے ہاتھ فتح ہوگا۔ اور پھر دوسری ضرب لگائی تو چمک پیدا ہوئی تو بلا درؤم نظر آئے اور آپ نے فرمایا کہ ملک روم اہل اسلام کا مفتوح بنے گا) دنیا میں جنت اور دوزخ کا مشاہدہ کرنا۔ فرشتے (کو نور قلب سے نامعلوم شے معلوم ہو جائے) درخت کا میٹھ ہونا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طلبی پر درخت اپنی عروق اور شاخوں سمیت (آدمی کی طرح چل کر) ایک جگہ سے دوسری جگہ آئے اور فقہاء حاجت کے لئے حضرت کے واسطے پردہ کر لیا) ہر نئی شکایت کرنا کہ بچوں کو بھوکا چھوڑ کر صیاد کے جال میں مقید ہو گئی ہوں (اتنی رہائی دلا دیجئے کہ ان کو دودھ پلاؤں) خواب کی تعبیر کا علم کہ بالکل اور کبھی غلطی واقع نہ ہو۔ کھوکھٹ سے واقفیت (کہ تخمینہ عین حقیقت کے موافق پڑے) مخلوق کو احکام الہی کی تعلیم امت کو دینی و دنیوی انتظام کا سلیقہ



سکھانا۔ نیکیوں اور خوبیوں کی رہبری۔ طبعی طریق سے اصلاحِ جسمانی کی تعلیم۔ قربِ الہی کے طریقہ تعلیم کرنا۔ مفید  
 صنعتوں کی تعلیم۔ نظر سے ادھل چیزوں کا علم جو کسی نے نہیں بتایا۔ آئینہ پیش آنے والے واقعات کا علم۔  
 لوگوں کے مخفی معاملات سے واقفیت۔ استدلال کے طریقوں کی تعلیم اور برتاؤ میں طریقِ لطف و کرم کی اطلاع  
 کہ فضائلِ نبوت کی تعداد چھیالیس پوری ہوگئی۔ جن میں ہر خصلت اس قابل ہے کہ رو یا د صالح اس کے ساتھ مل جائے  
 اور اس طرح پر نبوت کے چھیالیس اجزاء میں کا ایک جزو بن جائے۔ اور گو فضائل میں (تعبیر و اجتہاد و کلام وغیرہ) غیر  
 بنی میں بھی پائے جاسکتے ہیں مگر (اجزاءِ نبوت میں ان کا شمار اس لحاظ سے کیا گیا ہے کہ) بنی سے اس میں کبھی  
 غلطی واقع نہ ہوگی۔ اور غیر بنی کبھی غلطی کھائے گا اور کبھی مصیب رہے گا یہ علامہ حلیمی نے بہت کچھ دماغ سوزی  
 سے چھیالیس کی گنتی کو پورا کیا لیکن ذرا غور کرو کہ مقصود تھا مطلق نبوت کے اجزاء بیان کرنا مگر ان میں بہت سے  
 خصائل وہ ہیں جو صرف ذاتِ محمدی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مثلاً بکری کا کلام کرنا۔ پتھر کا سلام کرنا۔ تنہ درخت  
 کا آہ کرنا۔ گرگ اور شتر اور ہرنی کی بات کا سمجھنا۔ بیت المقدس کا سامنے آجانا۔ آپ کا یہ فرمانا کہ فیصل کو  
 جس نے روکا تھا اسی اپنے میری ناقہ کو روکا ہے۔ سپہ سالار کے آنے پر سہولت امر کا اظہار۔ بادل کی نصرت قبیلہ  
 بنی کعب کے متعلق اعلان کا ارشاد خندق کھودتے وقت چمک کا واقعہ۔ درخت کا اپنی جگہ سے دوسری جگہ  
 انتقال وغیرہ کہ جزئیات اور واقعات ہیں جو ہو چکے اور گزر چکے۔ ان کو اجزاءِ نبوت میں کا ایک جزو ہونے سے  
 کیا تعلق۔ پھر ان میں ما لغات و ما صرف ایک جزو نبوت یعنی معرفت لغات میں مندرج ہیں اور ما سے  
 لے کر آخر تک انجام سے واقفیت میں شامل ہیں لہذا گیارہ خصائل میں صرف ایک جزو یعنی علم کامل میں داخل ہیں  
 کہ علم کامل کی جو شرح بیان ہو چکی ہے اس کو دیکھو اور نتیجہ نکال لو۔ الحاصل علامہ حلیمی نے اس سے زیادہ  
 کچھ نہیں کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چند معجزات جو باریق خرق عادت آپ کے ہاتھوں پر ظاہر ہوئے تھے  
 ان کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کیا اور مطلق نبوت کے اجزاء میں جس کا وجود ذاتِ محمدی اور دیگر تمامی انبیاء علیہم السلام  
 کی ذوات میں مشترک ہے، ان کو شمار کر لیا۔ علاوہ ازیں ان معجزات کی نشان یہ ہے کہ ممکن ہے سب یا اکثر ان  
 میں اولیاء امت کی کرامت بنجائیسی۔ کیونکہ اہل سنت و الجماعہ کا مذہب ہے کہ جو واقعہ حضراتِ انبیاء  
 کے لئے معجزہ کہلاتا ہے وہی اولیاء سے صادر ہو کر کرامت کہلاتا ہے پس جب یہ واقعات غیر بنی کے لئے بھی ثابت  
 ہو سکتے ہیں تو ان کا اجزاءِ نبوت میں سے ہونا کسی حال بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم حکیم الامتہ امام غزالی  
 رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں۔ یہ نہ خیال کرنا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں کوئی مقدار  
 ظاہر فرمائی ہے مثلاً یہ کہ رو یا د صالح نبوت کے چھیالیس اجزاء میں کا ایک جزو ہے۔ وہ اتفاقہ طور پر آپ کی



زبان سے نکل جاتا تھا۔ نہیں بلکہ یہ واقعی اور حقیقی ہے مگر دوسرے لوگ بجز تخمینہ کے اس کی حقیقت کو سمجھ نہیں سکتے اس لئے کہ نبوت اُس مرتبہ کا نام ہے جو کسی نبی کے ساتھ مخصوص ہے اور وہی نبی اور غیر نبی کا ماہہ الفرق والامتیاز ہے اور اس کے چند خواص ہیں مثلاً اللہ کی ذات و صفات اور ملائکہ و دار آخرت سے متعلق امور کی حقیقی معرفت جو نبی کو حاصل ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کو حاصل نہیں ہو سکتی، نہ نبی کے مثل کثیر معلومات اور نہ اتنی زیادہ تحقیق اور قوت یقین۔ نیز نبی کے ایک خاص نور ملتا ہے جس کے ذریعہ وہ ملائکہ کو دیکھتا اور عالم ملکوت کا ایسا مشاہدہ کرتا ہے کہ اس میں اور دوسروں میں ایسا فرق ہوتا ہے جیسا بنیا اور نابینا میں۔ نبی کو وہ نور ملتا ہے جس کے ذریعہ وہ آئندہ ہونے والے واقعات کا ادراک اور لوح محفوظ کی کتابت کا ایسا مطالعہ کرتا ہے کہ اس میں اور دوسروں میں زکی الطبع اور بلید الطبع کا سارق ہوتا ہے۔ نبی کی ایک خاص شان ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس کے لئے خوارق عادات اور ایسے بن جاتے ہیں جیسے دوسروں کے لئے اختیاری افعال۔ پس ممکن ہے کہ ان خواص نبوت کی افواخ اور پھر ان کے اجزاء نکالے جائیں۔ مگر اول تو کیا ضرور ہے کہ چھیا لیس ہی نکلیں۔ ممکن ہے چالیس نکلیں یا پچاس نکلیں۔ دوم اگر چھیا لیس پورے ہی کر لیں اور خواب کو اس کا جزو بنادیں تو ظاہر ہے کہ وہ محض تخمینی اور عقلی ہوں گے۔ نہ وہ جو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد تھی، نیز علامہ مازری لکھتے ہیں کہ عالم کے لئے ضروری نہیں کہ وہ ہر شے کا اجمالاً و تفصیلاً علم ہی رکھتا ہو کیونکہ حق تعالیٰ نے ہر عالم کے لئے ایک حد تجویز فرمادی ہے جہاں پہنچ کر وہ ٹھہر جاتا ہے (اور آگے اس کا علم کچھ کام نہیں دیتا) پس بعض مسائل وہ ہیں جن کی مراد ہی معلوم نہیں، نہ اجمالاً نہ تفصیلاً (جیسے حرمت مقطعات وغیرہ) اور بعض تو وہ ہیں جن کی مراد اجمالی کا ہمیں علم ہے مگر تفصیلی کا علم نہیں۔ اور یہ مسئلہ کہ ریاض صالحہ نبوت کے چھیا لیس اجزاء میں کا ایک جزو ہے، اسی قبیل سے ہے کہ اجمالی علم حاصل ہو گیا۔ مگر چھیا لیس کی تفصیل معلوم نہیں، اور ابو سعید سفاقی نے لکھا ہے کہ بعض اہل علم نے اس کی یہ توجیہ کی ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بزمانہ ابتداء رسالت چھ مہینہ تک خواب میں وحی فرمائی (کہ خواب میں جو کچھ دیکھتے صبح ہی اس کا ظہور ہو جاتا)، پھر اس کے بعد لقیۃ عمر تنیس سال تک بیداری میں وحی نازل ہوتی رہی۔ لہذا وحی منامی کی مدت، وحی بیداری کی مدت کا چھیا لیسواں حصہ ہوا ہے مگر اس تقریر میں چند اعتراض ہیں۔ اول یہ کہ وحی منامی کے بعد کی مدت میں علماء کا اختلاف ہے۔ کسی کے نزدیک پچیس سال ہے اور کسی کے نزدیک بیس سال (تنیس سالہ مدت متفق علیہ نہیں ہے دوم اگر تنیس سال تسلیم بھی کر لی جائے تو چھیا لیس کی روایت کے متعلق یہ توجیہ صحیح ہوئی۔ مگر دیگر روایات کا (جن میں ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰) کیا جواب ہو گا۔ سوم وحی منامی کی مدت کا چھ ماہ ہونا بھی بے دلیل ہے اول یہی محتاج نبوت ہے۔ چہارم وحی منامی کے بعد کی مدت تنیس سال بھی خالص وحی بیداری



کے لئے نہ تھی۔ بلکہ اس میں بھی آنحضرتؐ کو سچی خوابیں نظر آئیں۔ لہذا اس وحی منامی کا اتنا حصہ ادھر سے نکال کر ابتدائی چھ ماہ میں شامل کر دو گے تو بنایا ہوا تناسب بھر جاتا رہے گا۔ الحاصل ان اعتراضات مذکورہ کے جواب دینے کی بھی اگرچہ کوشش کی گئی ہے مگر سب میں بڑا اشکال تو یہ ہے کہ اس حدیث سے مقصود تو مومن کی رویاء صالحہ کا شرف و فضل بیان کرنا ہے کہ اس کو نبوت کے ساتھ ایسی مناسبت ہے جیسی ایک کو چھالیس کے ساتھ ہے) اور اس توجیہ کا مطلب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات شریفہ میں جو صورت اتفاقیہ پیش آئی (کہ چھ مہینے صرت سچی خوابیں نظر آتی رہیں اور پھر تا وفات بواسطہ جبریل امین نزول وحی ہوتا رہا، محض اس کا ظاہر کرنا ہوا حسی کا مفہوم یہ ہوا کہ (خود رویاء صالحہ نہیں) بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سچی خوابیں دیکھنے کا زمانہ آپ کی بیداری کی وحی کے زمانہ کا چھالیسواں حصہ تھا۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر صالح کی ہر خواب میں یہی نسبت ہوا کرے۔ چنانچہ ابن ابی جبرہ نے بھی اس کو رد کیا اور لکھا ہے کہ اس میں ردین یا دنیا کا کون سا بڑا فائدہ حاصل ہوا۔ اور ایسا کلام ایسے فیصیح و بلیغ پیغمبر کی طرف منسوب کرنا حسیں کا جامع الکلم ہونا مسلم ہو کس طرح مناسب ہو سکتا ہے۔ شاید اس قائل کا مقصود صرت اتنا ہے کہ نبوت میں اور رویاء صالحہ میں فی الحیل مناسبت ثابت کر دے اور اجزاء کا عدد کسی طرح کھپا دے (مگر یہ سید الاولین و الآخرین کی شان کے شاید نہیں) پھر روایات مذکورہ کے اختلافات رفع کرنے میں علماء نے بہت کچھ تکلفات کئے ہیں کہ امام طبری نے تو یہ لکھا ہے کہ ستر اجزاء کی روایت ہر سلمان کی سچی خواب کے بارہ میں ہے اور چالیس کی روایت سچے مومن دیندار کی خواب کے بارہ میں اور اس کی درمیان کی روایتیں بلحاظ مراتب صلاح و دینداری درمیان مومنین کے بارہ میں اور ابن لہلال کہتے ہیں کہ اعداد میں صحیح ترین روایتیں دو ہیں: ایک چھالیس اجزاء والی اور دوسری ستر اجزاء والی۔ اور خواب کی بھی دو قسمیں ہیں ایک صلی و واضح۔ مثلاً خواب میں دیکھا کہ کسی نے اس کو پھل دیا ہے اور صبح کو بیداری میں یہی صورت پیش آوے کہ کوئی شخص اس کو پھل دے جائے۔ دوسری قسم وہ خواب ہے جس میں تعبیر کی ضرورت ہو، پس محتاج تعبیر خواب نبوت کے ستر اجزاء میں سے ایک جزو ہوگی، اور واضح خواب چھالیسواں جزو۔ کہ جتنے عدد کم ہوں گے اسی قدر خواب غلطی سے بعید اور صدق سے قریب ہوگی۔ اور بعض علماء نے اس پر اتنا اختلاف کیا ہے کہ وحی کی بھی یہی دو صورتیں ہوتی تھیں کہ کبھی حضرت جبریل وحی لاتے اور آپ اس کو بلا کلفت اخذ فرمالتے، اور کبھی وحی آتی تو آپ کو سخت سردی میں پسینہ آ جاتا تھا۔ واللہ اعلم۔

(۴) میں نے حضرت ممدوح سے اس حدیث کے متعلق دریافت کیا کہ کوئی خواب اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور کوئی خواب شیطان کی طرف سے۔ فرمایا کہ ذات انسانی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو ہر وقت حق میں مشغول اور حق کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اور دوسرے وہ جو ہر وقت باطل میں منہمک اور باطل سے وابستہ ہیں۔ اور ان میں



قسم ہمیشہ وہی چیز لاتی ہے جو اس کے مناسب ہوتی اور اس کی حالت کو قائم رکھتی ہے مثلاً دس کل دس دس  
 دینار کا سوال کرتے ہیں اور جب سوال جب ان کو دیا جاتا ہے تو دونوں خوش ہوتے ہیں۔ مگر ایک کی خوشی کا  
 تعلق تو صاحب عطا کے ساتھ ہے کہ دس دینار ملنے سے عطا کنندہ کی اپنے اوپر توجہ و عنایت کا اندازہ کیا  
 اور اس خوشی میں بھولا نہیں سماتا اور یہی اس کی ہمیشہ کی عادت بن گئی کہ جب کبھی کچھ ملتا ہے اس کی نظر  
 عطا کنندہ پر جاتی ہے اور اس کے لطف و کرم اور اپنے اوپر اس کی شفقت کا ادراک ہو کر فرح و سرور کا  
 شب و روز یہی معمول ہو گیا ہے۔ پس اس شخص کو تو کہا جائے گا کہ حق میں مشغول اور حق کے ساتھ وابستہ ہے  
 اور دوسرے شخص کا تعلق نفس عطا یعنی دنیاؤں کے ساتھ ہے کہ اُن سے میری ضرورت پوری ہوگی اور فلاں  
 فلاں مزے اُڑاؤں گا، غرض جب دینار اس کے ہاتھ میں آئیں گے تو فوراً اس کا خیال ان ضروریات کی طرف  
 جائے گا جن کو پورا کرنا ہے، اور جب وہ ختم ہو جائیں گے تو پھر دوبارہ ہاتھ پھیلائے گا کہ اے میرے پروردگار  
 مجھے دس دینار اور دیدے اس شخص کا دل تو ضروریات میں مبتلا اور اسی دھیان میں منہمک ہے مگر زبان پر اللہ کا  
 نام برائے نام جاری ہے کہ قلب اس کے معنی سے خالی اور بے تعلق و حجاب سے لبریز ہے پس اس کو کہا جائیگا  
 کہ باطل میں منہمک اور باطل کے ساتھ وابستہ ہے۔ لہذا پہلے شخص کی خوابیں بھی اللہ کی طرف سے ہوں گی (کہ سوتے  
 جاگتے) اس کو تعلق اپنے اللہ سے ہے، اور دوسرے شخص کی خوابیں شیطان کی طرف سے ہوں گی کہ اس کا تعلق  
 شیطان کے ساتھ ہے اور خوابیں تو سب اللہ کی ہی طرف سے ہیں مگر شیطان کی طرف اتنا بے احتساب صرف اس بنا  
 پر ہے کہ وہ اُن سے راضی ہوتا اور بنی آدم کے لئے ان کو پسند کرتا ہے۔ کیونکہ ان کا منشا ظلمت ہے اور ظلمت  
 شیطان کو محبوب ہے فقط۔ ائمہ حدیث ابن حجر ابن العربی اور ابن بطل وغیرہ نے بھی یہی لکھا ہے کہ خوابیں کسی قسم  
 کی بھی ہوں سب خدا کی طرف سے ہیں کہ متصرف و خالق بجز اس کے کوئی نہیں، مگر شیطان کی طرف نسبت صرف  
 اس لئے ہے کہ وہ ان سے راضی ہوتا ہے۔ پھر میں نے سچی اور جھوٹی خواب کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا کہ سچی  
 خواب اس کی ہوتی ہے جس کا قلب سونے کی حالت میں بھی اللہ تعالیٰ کے مشاہدہ میں رہتا ہے جیسا کہ اکثر جاگتے  
 میں رہتا ہے اور جھوٹی خواب اس کے برعکس حالت والے کی ہوتی ہے کہ اس کا قلب سونے میں ایسا ہوتا ہے جیسے  
 عام لوگ کہا کرتے ہیں کہ مجھے فلاں خیال آیا، اور اس کو یہ دھیان تھا غرض جس طرح بجاالت بیداری وہ مشاہد حق  
 سے محبوب ہوتا ہے، بجاالت خواب میں بھی ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ بعض اہل ظلمت (کافروں) کی خواب بھی کبھی سچی ہوتی ہے کیا  
 ان کا قلب محبوب نہیں ہوتا؟ حالانکہ محقق ہو چکا ہے کہ اہل ظلمت کی خوابیں شیطان کی طرف سے ہوتی ہیں۔ اور جو شیطان  
 کی طرف سے ہوگی اس میں حجاب لازمی ہے چنانچہ بادشاہ مصر نے جو خواب دیکھا وہ قرآن مجید میں مذکور  
 ہے کہ سات فریہ گائے کھائے جاتی ہیں سات لاغز گائیوں کو اور حضرت یوسف علیہ السلام نے



تعبیر دی کہ سات سال کی سپیدار کو خشک سالی کے سات سال کھا جائیں گے اور ایسا بھی ہوا۔ فرمایا چونکہ اس میں حصہ تھا سیدنا یوسف علیہ السلام کا کہ آپ کی شہرت اور جیل خانہ سے رہائی اور ملک پر تسلط کا یہی سبب ہوا لہذا اس کی خواب سچی ہو گئی۔ علاوہ ازیں کافر کو بھی خواب سچی نظر آ جاتی ہے بشرطیکہ دوسروں کے ساتھ اس خواب کا تعلق ہو۔ اور بادشاہ مصر کی اس خواب کا تعلق تمامی رعایا اور اہل ملک کے ساتھ تھا کہ قحط کی مصیبت سب ہی پر پڑنے والی تھی۔ لہذا اس خواب کا واقعہ کے موافق نظر آنا دوسروں کی غرض سے ہوا۔ نہ کہ خاص دیکھنے والے کی خاطر۔ میں نے کہا اچھا مصری جیل خانہ کے قیدیوں کی خوابیں تو ان ہی کے لئے خاص تھیں۔ غیر کا ان سے کوئی تعلق نہ تھا حالانکہ وہ واقعہ کے موافق اور سچی ہوئیں۔ فرمایا وہ اس لئے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کا حق اس میں شامل تھا کہ جیل خانہ سے رہائی اور فن تعبیر میں کمال یوسفی کی شہرت اور تقریر پر تسلط کامل کا سبب وہی خوابیں بنیں۔ الحاصل اہل ظلمت کی خواب کبھی سچی نہ ہوگی مگر جبکہ اس میں کسی دوسرے کا حق شامل ہو یا اس میں خواب دیکھنے والے کے لئے مذہب حق کے حق ہونے کی شہادت ہو۔ یا اس کی توبہ و اصلاح کا سبب بنے وغیرہ۔ پھر میں نے پریشان کن خواب کے متعلق دریافت کیا کہ کونسی (واقعی ہوتی اور) نقصان پہنچاتی ہے اور کونسی دمعن پریشان کرتے کے لئے شیطان کی طرف سے ہوتی اور کسی قسم کا بھی نقصان نہیں پہنچاتی۔

نیز وہ قصہ بھی سنایا جس کو دارمی نے سلیمان بن لیسا سے روایت کیا ہے کہ ایک عورت نے جس کا شوہر بغرض تجارت پردیس میں گیا ہوا تھا خواب دیکھا گویا اس کے گھر کا ستون گر گیا اور اس کے کانابچہ پیدا ہو گیا۔ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر خواب بیان کیا۔ آپ نے فرمایا انشاء اللہ تمہارا شوہر بعافیت واپس آئے گا اور تمہارے بطن سے دیندار بچہ پیدا ہوگا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ آئی اور حضرت تشریف فرما نہ تھے اس لئے حضرت عائشہؓ سے اپنی خواب بیان کی حضرت عائشہؓ نے فرمایا اگر تمہاری خواب سچی ہے تو تعبیر یہ ہے کہ تمہارا شوہر انتقال کر جائے گا۔ اور تمہارے پیٹ سے بددین بچہ پیدا ہوگا، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ نے اس خواب کا اور اپنی تعبیر کا آپ سے تذکرہ کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار گذرا اور فرمایا اے عائشہؓ جب کہی مسلمان کو تعبیر دیا کرو تو اچھی تعبیر دیا کرو کہ خواب اپنی تعبیر کے موافق ظہور پکڑتی ہے، ”فمن حی طرح پانی تابع ہے ظرت کا کہ گول یا لمبے یا چوکور جیسے برتن میں بھی پانی کو ڈالو گے پانی اسی شکل پر ہو جائے گا اسی طرح خواب میں حق تعالیٰ نے یہ خاصیت رکھی ہے کہ تعبیر دینے والا بُری یا بھلی جیسی بھی تعبیر دے گا وہ اسی شکل پر ہو جائے گی۔ پھر ممکن ہے کہ صحیح تعبیر ہی خیر و خوبی والی ہو جو معبر نے دی ہے اور اگر معبر کے نزدیک صحیح تعبیر اس کے خلاف ہے تب بھی اس کو بدل کر اطمینان بخش تعبیر دینا کذب میں داخل نہ ہوگا۔ اور اس کی ایسی مثال ہوگی جیسے دق کے مرہق کو یہ یقین کرتے ہوئے کہ حباں بر نہ ہوگا



یوں کہا جائے کہ انشاء اللہ تندرست ہو جاؤ گے، کہ اول تو علم الہی کے سامنے ہمارا علم ولیقین ہی کیا۔ دوم اس کی تبدیلی پر حق تعالیٰ کو پوری قدرت حاصل ہے خصوصاً جبکہ ہونا تو وہی ہے جو مقدر ہو چکا پھر ہم اپنی مسلمان بھائی کو قوی و مطمئن بنانے کے لئے کم از کم ڈوبنے کو تھکے کا سہارا بن کر شفقت و درد کا آخری برتاؤ کیوں نہ کر گزریں۔

بالخصوص جبکہ عالم خواب کا یہ قانون بھی ہمیں معلوم ہو گیا کہ واقعہ کو تعبیر کے موافق بدل دیا جاتا ہے۔ داری میں یہ قصہ مفصل مذکور اور خود حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ اس عورت کا شوہر تاجر تھا۔ دو تین مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ اس کو حاملہ چھوڑ کر سفر میں گیا اور اس کو یہی خواب نظر آئی۔ ہر مرتبہ وہ پریشان ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تعبیر لیے آئی اور حضرت نے خوش کن تعبیر دی اور اسی کے موافق ظہور ہوا۔ مگر امر مقدور ہو کر رہتا ہے۔ چوتھی مرتبہ اس کو پھر یہی خواب نظر آئی اور وہ حسب عادت حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئی تو حضرت کو موجود نہ پایا اور حضرت عائشہؓ نے اصرار فرمایا کہ آخر کیا کام تھا مجھے تو سناؤ۔ اس نے اپنی خواب ان کو سنادی اور انہوں نے بیوہ ہونے اور بدکار بچہ کی ماں بننے کی تعبیر دی جس کو سنتے ہی وہ کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گئی اور زار، زار رونے لگی۔ اتنے میں حضرت تشریف لے آئے اور قصہ سنا تو انوس فرمایا اور حضرت صدیقہؓ کو اس قانون الہی سے باخبر کیا کہ واقعہ کو تعبیر کے سانچہ میں ڈھال دیا جاتا ہے اس لئے ہمیں اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ شفقت و درد کا برتاؤ کرنے میں کوتاہی نہ کرنی چاہیے

امت محمدیہ کو حضرت عائشہؓ کا احسان مند ہونا چاہیے کہ آپ ہی کے اس قصہ سے ہم کو بہترین سبق ملا۔ واللہ اعلم۔

حضرت شیخ نے فرمایا کہ پریشان کن خواب حق تعالیٰ کی طرف سے بندہ کے لئے تنبیہ اور آزمائش ہوتی ہے کہ یہ خواب دیکھ کر بھی اپنے رب کے ساتھ رہتا ہے یا نہیں۔ پس اگر بندہ کو حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق ہوتا ہے تو جب وہ پریشان کن خواب دیکھتا ہے نہ اس کی پرواہ کرتا ہے نہ اس طرف توجہ۔ کیونکہ جانتا ہے کہ یہ خواب بھی اسی کی طرف سے ہے جس کے ہاتھ میں رُکھ سکھ کے (تمامی معاملات ہیں، اور ہر امر میں تبدیل و تغیر کا اس کو اختیار ہے، اور اس کی جو مشیت ہے اور جیسا کچھ وہ تقدیر میں لکھ چکا ہے وہ بہر حال ہو کر رہے گا۔ لہذا وہ اس خواب کی طرف التفات ہی نہیں کرتا پس ایسے شخص کے لئے تو یہ خواب باذن الہی کچھ بھی مضرت نہیں ہوتی۔ اور جس بندہ کا تعلق اپنے رب کے ساتھ نہیں ہوتا اور اس کو پریشان کن خواب نظر آتا ہے تو اس کو فکر و اہتمام ہو جاتا اور یہی دھیان ہمہ وقت اس کی نظروں کے سامنے جبار رہتا ہے اپنے رب سے غافل بن جاتا اور یقین رکھتا ہے کہ پریشانی ضرور پیش آکر رہے گی۔ تقدیر کو بھول جاتا اور مشیت و قدرت الہی سے غافل ہو جاتا ہے۔ اور قاعدہ ہے کہ انسان جس چیز سے ڈرتا ہے وہ اس پر مسلط ہو جاتی ہے۔ لہذا اس کو یہ خواب مضرت پہنچاتی ہے۔ یس نے عرض کیا کہ پھر ایسی خواب دیکھنے والے کو یہ حکم کیوں کیا گیا کہ اعوذ پڑھے اور شیطان کے اور اس خواب کے شر سے اللہ کی پناہ مانگے۔ اور بائیں جانب کو عین بار محو تھو کر دے۔ فرمایا کہ مومنین کے قلوب اللہ ہی کے دھیان میں سوتے اور اسی کے دھیان میں جاگتے



ہیں کہ جب سوتے ہیں تب بھی انکار ان کے دلوں میں ہوتا ہے اور جب بیدار ہوتے ہیں تب بھی ان کا رب ان کے دلوں میں ہوتا ہے۔ لہذا جب ان میں کسی کو پریشان کن خواب نظر آتی اور پھر آنکھ کھلتی ہے تو ان کا قلب جس حالت پر سویا تھا اس سے (باقضاء و بشریت) متزلزل ہو جاتا ہے۔ لہذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی حالت پر رجوع کرنے کا حکم فرمایا اور اس کا طریق یہی ہے کہ اللہ کی طرف رجوع کرے اور اپنے اور پریشان کن خواب کے درمیان اپنے رب کو کہے کہ اَعُوْذُ کا یہی مطلب ہے۔ ایسا کرنے سے وہ تذبذب رفع اور خواب سے تعلق قطع ہو کر اللہ سے دالیتہ ہو جائے گا۔ اور چونکہ شیطان کو اس کا اللہ کی طرف رجوع کرنا پسند نہیں آتا اور وہ کوشش کرتا ہے کہ ایسا نہ کرے، لہذا اس سے اللہ کی پناہ مانگنے کا حکم ہوتا ہے کہ اللہ کو اپنی سپر بنا کر شیطان سے بے تعلق اور اللہ سے با تعلق بن جائے۔ اور محنتکار نے کا حکم اس حالت سے گھنپانے کا اظہار ہے کہ اس میں اللہ سے بے تعلق ہو رہی تھی اور بائیں جانب اس کے لئے بائیں سبب معین کی گئی کہ شیطان کی آند بائیں جانب سے ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے ہر قسم کی خیر و خوبی کے لئے داہنی جہت جو نر فرائی ہے اور محافظ و ترسیندہ اعمال فرشتہ جس کا نور قوی ہے داہنی جانب ہے، اور دوسرا محافظ و ترسیندہ جس کا نور ضعیف ہے وہ بائیں جانب ہے۔ جنت بھی بجانب یمن ہے، اور جہنم بجانب شمال حضرت جبریل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب آئے داہنی جانب سے آئے اور شہداء کی ارواح کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیکھا داہنی جانب دیکھا کہ غزوات بدر و احد وغیرہ میں دنیا سے رخصت ہونے والے صحابہ کے متعلق آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی پریشانی لاحق ہوئی تو آپ ان کو اپنی داہنی جانب دیکھتے کہ گھوڑوں پر سوار جنگ کفار میں مشغول ہیں عرش بھی بجانب یمن ہے اور زمین بجہت شمال جس قطعہ زمین پر مومنین بنی آدم آباد ہیں وہ بجانب راست ہے اور جس حصہ زمین پر جنات آباد ہیں وہ بجانب چپ ہے داہنی جانب جو رگیں ہیں وہ اللہ کی تسبیح زیادہ کرتی ہیں بر خلاف ان رگوں کے جو بائیں جانب ہیں کہ وہ گونگی اور خاموش ہیں۔ نور حق بھی جہت یمن سے آتا ہے اور باطل جہت شمال سے غرض خیر تمامہ بجانب یمن ہے اور شر تمامہ بجانب شمال۔ میں نے عرض کیا کہ داہنی جانب سے مراد کیا ہے؟ فرمایا جس کو حق تعالیٰ فتح نصیب فرماتا ہے وہ ہر قسم کی خیر اپنی داہنی جانب دیکھتا ہے اور ہر قسم کا شر اپنی بائیں جانب۔ پھر جب وہ دوسری جانب رخ پھرتا ہے تو صورت حال بھی پھر جاتی ہے حتیٰ کہ فرض کرو اس کا منہ مشرق کی طرف ہو تو ہر قسم کی خیر شمال جنت و عرش و ارواح شہداء سب اس کو داہنی جانب یعنی جنوبی سمت نظر آئیں گی، اور بائیں جانب یعنی سمت شمال جہنم و شیاطین و ارواح اشقیاء وغیرہ ظلمانی چیزیں دکھائی دیں گی۔ اور جب وہ اپنا رخ پھر کر مغرب کی جانب منہ کرے گا تو اس کی داہنی جانب سمت شمال ہو جائے گی اور بائیں



جانب سمت جنوب۔ اور اب تمامی خیر مشلا حبت وغیرہ سب اس کو شمالی سمت میں نظر آئیں گی اور تم ہی اقسام شر و ذرخ وغیرہ جنوبی سمت میں اسی طرح اگر شمال یا جنوب کی طرف منہ پھرے گا۔ تو چیزوں کا بھی رخ بدل جائے گا کہ ہر چہار جانب میں جس رخ بھی اُس کا داہنا پڑے گا اُدھر اُمور حسنہ نظر آئیں گے اور جس رخ اس کا بایاں پڑے گا اُدھر اُمور قبیحہ دکھائی دیں گے اور اس میں راز یہ ہے کہ صاحب معرفت کو دیکھنے کے لئے حق تعالیٰ نے دو آئینہ عطا فرمائے ہیں کہ ایک سے صرف نورانی چیزیں دیکھتا ہے اور دوسرے سے صرف ظلمانی چیزیں۔ اور چونکہ اس کے داہنی جانب نورانیت ہے یعنی اس کا نور ایمان اور بائیں جانب ظلمانیت ہے یعنی نفس خبیث کی شہوات کہ اس کا خبیث بلحاظ نور ایمان ہے اور نہ عارف کے نفس میں شہوات کا غلبہ تو رہتا ہی نہیں) لہذا جب بجانب راست دیکھے گا تو یہ دیکھنا نور ایمان سے ہوگا اس لئے ایمان کی تمام ہمشکل چیزیں کہ جن میں تقانیت اور نور ہے اس کو نظر آئیں گی۔ اور جب بجانب چپ دیکھے گا تو یہ دیکھنا ظلمت شہوات نفس سے ہوگا۔ اس لئے اس کی تمام ہم شکل باطل اور مظلم چیزیں اس کو نظر آئیں گی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا یہ دیکھنا طبیعت ذات کی نگاہ سے ہوتا ہے (نہ کہ آنکھوں کی بصارت سے) کیونکہ دو چیزیں ہیں ایک روح اور ایک ذات۔ اور چونکہ ذات میں اس کی روح کا قرار برضا و محبت ہے بمعیت ایمان، لہذا دونوں کے ساتھ نور قائم ہے۔ یعنی اس کا نور ایمان اور وہ ذات میں مل جل کر ایک ہو گیا ہے۔ اور دیکھنے والی چیز سے عقل۔ لہذا جس وقت نور روح کے آئینہ سے دیکھتا ہے تو پاکیزہ چیزیں نظر آتی ہیں، اور جب نور ذات کے آئینہ میں دیکھتا ہے۔ تو مظلم و تاریک چیزیں نظر آتی ہیں اور اسی پر وہ حدیث مہمل ہے جس میں آتا ہے کہ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج میں آسمان پر حضرت آدم علیہ السلام کو دیکھا کہ ایک جماعت ان کی داہنی جانب بیٹھی ہوئی ہے اور دوسری جماعت ان کی بائیں جانب) حضرت آدم جب داہنی طرف نظر فرماتے تو سنیں دیتے تھے اور جب بائیں جانب نگاہ ڈالتے تو رو پڑتے تھے، کیونکہ داہنی جانب والی جماعت ارواح صالحہ کی تھی اور بائیں جانب والی جماعت ارواح الشقیاء کی (رض) اس کی حقیقت تو وہی سمجھو جسے حق تعالیٰ معرفت نصیب فرمائے۔ مگر توضیح کے لئے اتنا سمجھانا ضروری ہے کہ تم نے دیکھا ہوگا شیشوں کی خاصیتیں جدا جدا ہوتی ہیں۔ فرض کرو عینک میں داہنا شیشہ ایسا لگایا جائے جس سے صرف سفید چیز نظر آئے اور دوسرے رنگ کی کوئی چیز نظر نہ آوے۔ اور بایاں شیشہ اس خاصیت کا لگایا جائے کہ اس سے صرف سیاہ رنگ کی چیز نظر آئے اور دوسرے رنگ کی کوئی چیز نظر نہ آوے۔ تو جس وقت ایک بینا شخص اس عینک کو لگائے گا تو داہنی طرف اس کو صرف سفید اور چمکتی چیزیں نظر آئیں گی۔ خواہ قلعی ہو یا کپڑا یا سنگ مرمر یا سفید بارل۔ اور بائیں طرف صرف سیاہ اور تاریک چیزیں نظر آئیں گی خواہ تو ہوا یا قہل یا دھواں یا سیاہ کپڑا وغیرہ۔ مگر یہ دیکھتے ہو واسطہ



چشم ہے جو محدود ہے۔ اور اس کے لئے سمت معین ہے کہ نظر ان اشیاء کی تابع ہے۔ مگر عقل کی بصارت نہ کسی سمت کی تابع ہے نہ گوشت و پوست میں محدود ہے۔ بلکہ اشیاء اس کی تابع ہیں کہ شرقی ہوں یا غربی اور شمالی ہوں یا جنوبی اور بعید ہوں یا قریب اور گرم ہوں یا سرد اور اجسام ہوں یا اعراض اور ماضی ہوں یا مستقبل سب کی سب حال بن کر اس کے سامنے کے رُخ بے یک وقت آ جاتی ہیں۔ اور جب اس پر دو خاصیتوں والے دو شیشوں کی علیک چڑھ جائے گی تو اس کے داہنے شیشے سے بلا پابندی جہت و بلا قید قرب و بعد ہر نورانی چیز خواہ حیت ہو یا نورانیان اور ارواح صلیحہ ہوں یا سحر و غلمان سب داہنی جانب نظر آئیں گی کہ اس کی خاصیت ہی صرت نورانی چیزوں کا نظر آنا ہے اور بائیں شیشے سے بلا قید جہت و سمت ہر تاریک و منظم شے خواہ جہنم ہو یا ظلمت کفر و طغیان اور ارواح کفار و شیاطین ہوں یا تاریکی عذاب و عصیان، سب بائیں جانب نظر آئیں گی۔ کہ اس شیشے کی خاصیت ہی صرت ظلمانی چیزوں کا دکھلانا ہے۔ لہذا اس کی رویت میں بدن کے رُخ بدلنے کو دخل نہ ہوگا۔ واللہ اعلم۔ اور محقق کار نامہ تین مرتبہ بایں وجہ ہے کہ پہلا ذات کی طرف سے ہے اور دوسرا روح کی طرف سے کہ دونوں جدا جدا اس حالت سے گھنیا ہٹ کا اظہار کرتی ہیں اور تیسرا بندہ کی حق تعالیٰ سے اعانت چاہنے کی خاطر ہے۔ اور یہ جو حکم ہے کہ آنکھ کھلنے پر کر دٹ بدلے۔ تو اس لئے ہے کہ پہلی نیند کا حکم بدل جائے اور ایسا ہو جائے گویا ابتداء سویا (اور حسب تقاضا ایمان اللہ کے دھیان میں سویا) ہے اور نماز پڑھنے کا حکم ایک بار تو فرمانا اور وہ بخاری کی روایت ہے) اور ایک مرتبہ نہ فرمانا (اور وہ مسلم کی روایت ہے) اس لئے ہے کہ جس کا دل چاہت پڑھے اور جس کا دل نہ چاہے نہ پڑھے۔ اور نماز کے حکم میں رازیہ ہے کہ پریشان خواب کی وجہ سے ذات میں جو ظلمت آگئی ہے وہ نماز سے دور ہو جائے گی اور ذات مومن پاک صاف بن جائے گی۔ یہ ہیں پریشان کن خواب کے آداب جن میں چار تو ضروری ہیں یعنی اَعُوذُ بِرُحْمٰنِ الرَّحْمٰنِ کے شر سے اللہ کی پناہ چاہنا۔ بائیں جانب تین مرتبہ محقق کار نامہ اور کر دٹ بدل لینا ہے کہ یہ چاروں حکم عام روایتوں میں آئے ہیں۔ اور ایک اختیاری ہے یعنی نماز پڑھنا کہ کر لے یا نہ کرے کیونکہ اس کا حکم کسی روایت میں آیا ہے اور کسی میں نہیں اور دو آداب علماء نے اور بھی بیان کئے ہیں ایک یہ کہ آنکھ کھلنے پر آیتہ الکرسی پڑھے مگر یہ کسی حدیث میں نہیں آیا۔ دوم یہ کہ کسی سے اس خواب کا تذکرہ نہ کرے، اور یہ بخاری میں مذکور ہے۔ اور اَعُوذُ کے متعلق حدیث میں یہ الفاظ منقول ہیں اَعُوذُ بِمَا اَعَاذَتْ مَلَائِكَتُ اللّٰهِ وَرُسُلُہُمْ مِنْ شَرِّ رُؤْیَا و یَا هٰذِہٖ اَنْ یَّصِیْبَنِیْ مِثْہَا۔ اور ڈراؤنی خواب میں نظر آویں تو سوتے وقت یہ پڑھے بِسْمِ اللّٰهِ اَعُوذُ بِاللّٰهِ وَ بِالْکَلِمَاتِ اللّٰهِ الْقَاتَمَاتِ مِنْ غَضَبِ اللّٰهِ وَعَذَابِہٖ وَمِنْ شَرِّ عِبَادِہٖ وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّیْطٰنِ وَاَعُوذُ بِكَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُنِیْ ۔



(۵) میں نے حضرت مدوح سے اس خواب کے متعلق سوال کیا جس کی تعبیر حضرت ابوبکرؓ نے دی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کچھ ٹھیک بتائی ہے اور کچھ غلط۔ چنانچہ بخاری میں مفصل قصہ مذکور ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص آیا اور کہا کہ رات میں مجھے یہ خواب دیکھی ہے، ایک بادل ہے (سائبان کی طرح سرور پر چھایا ہوا) جس سے گھی اور شہد ٹپک رہا ہے اور لوگ ہاتھ پھیلا کر اس کو لے رہے ہیں۔ کسی نے زیادہ لے لیا ہے اور کسی نے کم۔ پھر دیکھتا ہوں کہ ایک رستی ہے جو زمین سے آسمان تک پہنچی ہوئی ہے۔ چنانچہ آپ اس کو پکڑ کر اوپر پہنچ گئے۔ پھر اس کو ایک شخص نے تھاما اور وہ بھی اوپر چڑھ گیا۔ پھر تیسرے نے اس کو پکڑا اور وہ بھی چڑھ گیا پھر چوتھے شخص نے اس کو پکڑا تو رستی ٹوٹ گئی اور پھر اس کو جوڑا گیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ مجھے توقع ہے کہ آپ مجھ کو اس کی تعبیر بیان کرنے دیں گے۔ حضرت نے فرمایا بہتر ہے تعبیر دوں حضرت صدیقؓ سے کہا وہ سائبان تو اسلام (کی صورت مثالیہ) ہے اور اس سے گھی اور شہد جو ٹپک رہا ہے وہ قرآن ہے کہ اس کی حلاوت (مخلوق پر) ٹپک رہی ہے اور کوئی زیادہ لے رہا ہے کوئی کم۔ اور جو وہ رستی ہے کہ زمین سے آسمان تک پہنچی ہوئی ہے وہ طریق حق ہے جس پر آپ قائم ہیں کہ آپ اس کو (حاکمانہ و مبلغانہ درجہ میں) تھامے ہوئے ہیں اور حق تعالیٰ آپ کو اوپر چڑھا رہا (اور غالب و کامیاب بنا رہا ہے) پھر آپ کی وفات کے بعد اس کو دوسرا شخص تھامے گا اور اوپر چڑھے گا اور پھر تیسرا اس کو تھامے گا اور اوپر چڑھ جائے گا اور پھر چوتھا شخص اس کو تھامے گا تو وہ ٹوٹ جائے گی (کہ چلتے کام میں رکاوٹ لاحق ہوگی) اور پھر وہ اس کے لئے جوڑی جائیگی (کہ عارضی رفع ہو کر سیاست دوبارہ قائم ہوگی) اور وہ اوپر چڑھ جائے گا (کہ اعلا و کلمۃ الحق میں کامیاب ہو کر دنیا سے اٹھے گا)۔ یا رسول اللہ! آپ پر میرے ماں باپ قربان مجھے اطلاع بخشیں کہ میں نے ٹھیک تعبیر دی یا غلط؟ حضرت نے فرمایا کچھ ٹھیک دی ہے اور کچھ غلط۔ عرض کیا۔ کہ یا رسول اللہ! آپ کو قسم ہے اللہ کی مجھے ضرور بتائیے کہ میں نے کیا غلطی کی۔ حضرت نے فرمایا قسم نہ دو۔ علماء کے اقوال اس بارہ میں کہ حضرت صدیقؓ کی تعبیر میں کیا غلطی تھی بہت مختلف ہیں۔ ابوالمہلب اور ان کے تابعین تو کہتے ہیں غلطی اس رستی کے جوڑے جانے میں ہوئی کہ تعبیر حضرت صدیقؓ نے یہ دی کہ اس چڑھنے والے کے لئے اس کو جوڑا جائیگا (جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہی شخص رکاوٹ کے بعد پھر کامیاب ہوگا) حالانکہ خواب میں رستی کے صرف جوڑنے کا تذکرہ ہے۔ لہذا حضرت صدیقؓ کو چاہیے تھا کہ خواب میں جتنا لفظ ہے اسی کی تعبیر پر اکتفا فرماتے اور اس کا اضافہ نہ کرتے کہ وہ رستی کس کے لئے جوڑی جائے گی۔ کیونکہ تعبیر کی صورت وقوع میں یہ آئی کہ حضرت عثمانؓ کے لئے رستی ٹوٹی (کہ شہید کئے گئے) اور دوسرے کے لئے جوڑی گئی (یعنی سیاست حقہ حضرت علیؓ



کے ہاتھ میں آئی، مگر امام عیاض نے اس کا جواب دیا کہ لفظ لہ کا (جس سے رسی کا کسی کے لئے جوڑا جاتا ثابت ہوا جس کے لئے وہ ٹوٹی تھی، اگرچہ اس حدیث میں نہیں آیا مگر مسلم ترمذی نسائی ابن ماجہ مستد احمد اور دارمی کی متعدد روایتوں میں یہ لفظ آیا ہے۔ لہذا تعبیر صدیقی نہ کا محل خطا اس کو قرار دینا اپنی خطا ہے۔ اور اب مطلب یہ ہوگا کہ حضرت عثمانؓ پر ایسے ایسے اعتراض اور بلوے ہوئے کہ قریب تھا ان کی رستی ٹوٹ جائے اور وہ اپنے دونوں ساتھیوں (یعنی حضرت صدیق و فاروق) سے جدا ہو جائیں مگر حق تعالیٰ نے فضل فرمایا اور ان کو شہادت نصیب ہوئی (کہ جس جنت عالیہ میں صاحبین پہنچے اُسی میں یہ بھی داخل ہوئے)۔ اور حضرت قتیبہ بن سعد ابو محمد بن ابی زید۔ ابو محمد اصیلی ابو بکر اسماعیلی اور احمد بن نصر دادی وغیرہ علماء اس طرف گئے ہیں کہ حضرت صدیق کی غلطی (تعبیر میں نہ تھی بلکہ) اس عجلت میں تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعبیر بیان فرمانے کا انتظار نہ دیکھا اور خود بیان کرنے میں سبقت کی، لہذا کچھ صحیح اور کچھ غلط ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ تعبیر تو صحیح بتائی مگر سبقت و عجلت میں غلطی کھائی، لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت صدیقؓ نے تعبیر کے متعلق اول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگی اور حیب اجازت مانگی تب تعبیر دی تھی، لہذا نہ یہ سبقت و عجلت ہے، نہ خطا و غلطی۔ نیز حضرت کے ارشاد کچھ ٹھیک بتائی کچھ غلط، کلمات مطلب ہیں کہ تعبیر کا کچھ حصہ ٹھیک ہے اور کچھ غلط ہے، نہ یہ کہ تعبیر تو ساری صحیح ہے مگر فعل سبقت و عجلت میں غلطی کھائی اور امام طحاوی و خطابی اور ابن المونی و ابن الجوزی وغیرہ کی ایک جماعت علماء کا یہ قول ہے کہ گھٹی اور شہد کی تعبیر قرآن کے ساتھ دینے میں حضرت صدیقؓ نے غلطی کھائی کہ دو چیزوں کی تعبیر ایک شے سے دیدی۔ حالانکہ چاہیے تھا کہ تعبیر بھی دو چیزوں سے دی جاتی۔ جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عمر بن عاصؓ نے جس کو امام احمد نے نقل کیا ہے مروی ہے کہ میں نے خواب میں دیکھا گویا میری ایک انگلی میں گھٹی لگا ہوا ہے اور دوسری انگلی میں شہر، اور میں دونوں کو چاٹ رہا ہوں۔ جب صبح ہوئی تو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا خواب بیان کیا۔ آپ نے فرمایا کہ تم توریت اور قرآن دونوں پڑھو گے۔ چنانچہ یہ دونوں آسمانی کتابوں کے قاری ہو گے۔ پس جس طرح اس حدیث میں گھٹی اور شہد کی تعبیر دو چیزوں سے کی گئی اسی طرح اس حدیث میں بھی دونوں کی تعبیر دو چیزوں سے ہونا چاہیے تھی کہ قرآن اور سنت یا علم و عمل یا حفظ کرنا اور سمجھنا وغیرہ۔ اور بعض علماء کہتے ہیں کہ خطا واقع ہوئی بادل کو اسلام کے ساتھ تعبیر دینے میں کہ اس کی مناسب تعبیر ذات محمدیؐ تھی (جس کا نور عالم پر سایہ انگن اور فیضان حسب استعداد مستفیض قلیل اور کثیر برس رہا ہے)، اور گھٹی و شہد کی تعبیر دینے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ خطا بمعنی ترک ہے کہ اسے ابو بکر خواب کے کچھ حصہ کی تعبیر تم نے چھوڑ دی اور بیان نہ کی۔ یعنی وہ تین آدمی معین



نہ کئے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حق کو تھا میں گے۔ اور اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق کے قسم دلانے کی پروا نہ کی اور اس کو پورا نہ فرمایا کہ دوسرے کی قسم دلانے کو پورا کرنا شرعاً صرف اس وقت محبوب ہے جبکہ اس پر کوئی مفسدہ مرتب نہ ہو۔ اور جہاں کسی مفسدہ کا اندیشہ ہو وہاں دوسرے کا قسم دلانا کوئی چیز نہیں۔ اور یہاں مفسدہ عجب نہیں یہ ہو کہ حضرت عثمانؓ کی رسی کا کٹنا جو کہ اُن کی شہادت اور اشتعالِ آتش جنگ اور طرح طرح کے فتنوں کی صورت میں ظاہر ہوا قبل از وقت بیان کرنا اور اس کا چرچا لوگوں میں پھیلانا خالی از مضرت نہ تھا۔ نیز اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صدیقؓ کی قسم کو سچا فرماتے تو ضروری تھا کہ خلفاء ثلاثہ کی تعیین فرماتے۔ اور تعیین فرماتے تو خلافت بایں ترتیب منصوص ہو جاتی۔ حالانکہ مشیت الہیہ پہلے سے طے کر چکی تھی کہ خلافت بغیر تنہیص کے اسی ترتیب سے ہوگی رچنا پختہ تینوں حضرات کی عمریں اس کا ثبوت دے رہی ہیں کہ حضرت صدیقؓ کی جگہ اگر خلیفہ اول حضرت فاروقؓ بنائے جاتے تو حضرت صدیقؓ زندہ ان کی زندگی میں انتقال فرما جاتے اور خلافت کا وقت ہی نہ پاتے۔ علیؓ ہذا حضرت عثمانؓ خلیفہ اول ہوتے تو اُن کی زندگی میں حضرات شیخین بلا خلافت کے دنیا سے رخصت ہو لیتے۔ اور اگر حضرت علیؓ خلیفہ اول بنادے جاتے تو خلفاء ثلاثہ میں کسی کو بھی خلافت کا موقع نہ ملتا کہ چاروں حضرات اپنے رب کی طرف سے عمریں ہی اس ترتیب سے لے کر آئے تھے، اور چاروں کو خلافت کا موقع ملتا ہی اسی ترتیب پر ہوتا تھا، لہذا اس مفسدہ کے اندیشہ سے آنحضرت نے تعیین کو چھوڑ دیا اور اسی بنا پر حضرت صدیقؓ کا تعبیر خواب میں تینوں کے نام وغیرہ کی تعیین کو چھوڑنا غلطی نہیں ہے۔ اگرچہ ایک قسم کی کمی ضرور ہے اور اسی لئے لفظ خطا سے اس کو تعبیر کر دیا گیا مگر صورت خطا اور شے ہے اور حقیقت خطا دوسری چیز، اور ایک گروہ علماء حضرت صدیقؓ کے ادب و احترام کا پہلو ملحوظ رکھتے ہوئے اس مسئلہ میں غور و فکر سے باز رہنے کا مسلک اختیار کئے ہوئے ہے۔ حتیٰ کہ ابو بکر ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک عارف سے جو فن تعبیر کی خاص مہارت بھی رکھتے تھے۔ دریافت کیا کہ حضرت صدیقؓ کی تعبیر میں غلطی کیا تھی؟ تو فرماتے لگے بھلا یہ کون بتا سکتا ہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے موجود ہوتے ہوئے تعبیر بیان کرتے میں حضرت صدیقؓ کی غلطی پکڑنے میں کسی شخص کی دلیری و سبقت اس سے بدرجہا بڑی غلطی و خطا ہے۔

لہذا احتیاط اور تدبیر کا مفتضا اس بحث میں سکوت ہی کرنا ہے۔ الحاصل حضرت شیخ نے میرے سوال

کا اس طرح جواب دیا کہ سایہ دار بادل کی تعبیر مذہب اسلام ہے اور شہد و گھٹی جو اس سے ٹپک رہا ہے وہ صرف تلاوت قرآن نہیں بلکہ مطلقاً بندوں کے اعمال مقبولہ ہیں خواہ نماز روزہ ہو یا حج و زکوٰۃ اور صدقات و موئن کی حاجت براری ہو یا شرکت جنازہ و رہائی قیدیان وغیرہ کہ یہ ظاہری اعمال برترخ کی طرف



چڑھتے ہیں اور وہاں تمامی ارواح ان کا مشاہدہ کرتی اور کہتی ہیں کہ یہ فلاں ابن فلاں کا عمل صالح ہے جو کہ  
فلاں دن ہمارے پاس آجائے گا۔ غرض ہر شخص کے عمل صالح کو اس کا باپ دادا پر دادا (اور اس کے سارے  
جان پہچان والے اعزہ و احباب) دیکھتے ہیں اور اس مشاہدہ میں جو روحیں اب تک زمین پر نہیں آئیں وہ اور جو  
اجسام میں آکر (بعد الموت) برزخ کی طرف واپس گئیں وہ سب مساوی ہیں حتیٰ کہ طفل شیر خوار بھی اگر حق تعالیٰ  
اس کو فتح نصیب فرمائے اور ظلمت فات نے جو پردہ روحانی معلومات پر ڈال دیا ہے وہ اٹھ جائے گا۔  
تو لوگوں کو ان کے اعمال صالحہ مقبول سے آگاہ کر دے کہ اے فلاں ترا فلاں عمل صالح فلاں دن  
ہمارے پاس پہنچا تھا جبکہ ہم برزخ میں تھے، اور اے فلاں تیرا فلاں عمل مقبول و صالح ہمارے برزخ  
میں رہنے کے وقت فلاں دن ہمارے پاس پہنچا تھا۔ مگر حق تعالیٰ کی مشیت نے چونکہ اس کو پوشیدہ  
رکھنا طے فرمایا ہے اس لئے ارواح کو جب اجسام میں داخل کیا تو تمامی برزخی مشاہدات ان کو بھلا دیئے  
پھر اعمال ظاہرہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق محض اللہ کے ساتھ ہے اور مخلوق کو ان سے کوئی ظاہری  
نفع نہیں پہنچتا۔ مثلاً رکوع، سجدہ، نماز روزہ اللہ کا خوف اور اسی کی طرف رغبت و توجہ۔ یعنی وہ عبادتیں جو  
بندہ اور اللہ کے درمیان ہیں۔ دوم وہ اعمال جن سے مخلوق کو ظاہری نفع پہنچتا ہے۔ مثلاً بردہ آزاد کرنا  
صدقہ و خیرات۔ تعزیت۔ مسکین کی حاجت روائی اور قیدیوں کا چھڑانا یعنی وہ قربات جن سے مخلوق مستفیع ہوتی  
ہے۔ پہلی قسم کے اعمال کا صلہ حق تعالیٰ کی طرف سے بندہ کے لئے یہ ہے کہ اپنے ہاں سے ایک تو اس کو عطا  
فرماتا ہے جس کی وجہ سے اس کے ایمان میں ترقی ہوتی اور اس کی معرفت کو وہ قوت پہنچتی ہے جو اس کے  
قلبی خطرات کو محو اور شکوک و شبہات کو مضمحل کر دیتی ہے۔ اور دوسری قسم کے اعمال کا بدلہ ہے ذات کی  
اصلاح کہ رزق اس کا کثیر ہو جاتا اور مصائب نازلہ اس پر سے دفع کر دئے جاتے جس سے اس کی ذات کو نفع پہنچتا  
ہے کیونکہ جب مصیبتوں کو اس سے دور کر دیا گیا اور رزق وافر اس کو عطا کیا گیا تو ذات اس سے متمتع ہو کر دنیا  
میں ثواب نشوونما پائے گی۔ اور آخرت میں یہی اس کے صدقات جن سے مخلوق نے نفع اٹھایا تھا اس  
کی رعیت و خواہش والی نعمتیں بن جائیں گے۔ مثلاً بریائی۔ متجنّب۔ سچل۔ لذیذ گوشت والے پرند۔ اور جماعت  
کے لئے صاحب جمال حوریں وغیرہ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قسم اول کا صلہ مفید ہے ایمان کے لئے۔ اور قسم دوم کا صلہ نافع  
ہے اصلاح اجسام کے لئے۔ قسم اول کی طرف خواب میں اشارہ کیا گیا ہے شہد سے، اور قسم دوم کی طرف  
اشاہہ ہوا ہے گھئی سے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ شہد مقوی بدن ہے اور قوت جسمانی کے لئے جو چیزیں مانع  
ہیں ان کو دور کرتا ہے، مگر نہ گوشت پیدا کرتا ہے نہ فریہ بناتا ہے۔ لہذا قسم اول کے مشابہ ہوا کہ عبادتوں سے نور  
ایمانی بڑھتا ہے۔ رزق میں وسعت اور جسمانی راحت میں ترقی نہیں ہوتی۔ اور گھئی کا نفع



خاص قسم کے لئے ہے کہ پر فان چڑھاتا اور بدن کو موٹا کرتا ہے۔ اگرچہ وہ طاقت نہیں لاتا جو شہد سے حاصل ہوتی ہے۔ لہذا قسم دوم کے مشابہ ہے کہ صدقات و قربات سے فراخی معاش نصیب ہوتی اور مصائب و حوادث دور ہوتے ہیں۔ نورانی میں ترقی نہیں ہوتی۔ خلاصہ یہ ہے کہ شہد سے اندرونی قوت آتی ہے اور گھٹی سے بیرونی فریبی اور جسمانی نشوونما۔ اسی طرح قسم اول سے نورانیان و عرفان میں قوت آتی ہے اور قسم ثانی سے بدنی عیش و لذت اور جسمانی تازگی و فرحت حاصل ہوتی ہے، لہذا شہد کی تعبیر ہوئی۔ عبادات خالصہ اور گھٹی کی تعبیر ہوئی صدقات و تبرعات، میں نے عرض کیا کہ ان دونوں میں افضل و بہتر کون سی چیز ہے؟ فرمایا تم کس صورت کو اپنے لئے پسند کرتے ہو، آیا یہ کہ گھاس کی طرح دُبلے پتلے ہو مگر طاقت ہو چالیس آدمیوں کی برابر یا یہ کہ موٹے ہو مگر گھٹی کی طرح مگر طاقت نہ ہو چلنے اور اٹھنے کی بھی۔ میں نے کہا کہ پہلی صورت بدرجہا بہتر ہے کہ گوتے کی طرح دُبلے پتلے ہوں مگر طاقت چالیس مردوں کی برابر۔ فرمایا اسی پر قیاس کر لو اعمال ظاہری کو کہ ایک قسم مقوی ایمان ہے اور دوسری قسم مسکین ابدان ہے۔ پھر میں نے عرض کیا کہ اعمال کی دونوں قسمیں تو زمین سے آسمان کی طرف چڑھتی ہیں اور خواب میں شہد اور گھٹی ٹپک رہا تھا۔ آسمان سے زمین کی طرف پھر ضدیت کا اختلاف ہوتے ہوئے تعبیر میں مماثلت کیسے صحیح ہوئی۔ فرمایا کہ چڑھنا اور اترنا تو امر اضافی ہے کہ ایک چیز ہمارے لئے (جبکہ ہم نیچے ہوں) اوپر چڑھ رہی ہے، اور وہی چیز دوسرے کے لئے (جبکہ وہ اوپر ہی نیچے اتر رہی ہے) پس ممکن ہے کہ خواب دیکھنے والے کی روح خواب دیکھتے وقت آسمان میں ہو ہمارے مقابل جہت میں کہ اس کا سر ہمارے سروں کی طرف ہو اور پاؤں آسمان دوم کی جانب، لہذا ہمارے نزدیک یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اعمال چڑھ رہے ہیں زمین سے اوپر آسمان کی طرف اور اس کے نزدیک یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اعمال اتر اور ٹپک رہے ہیں زمین سے میرے سر پر آسمان کی طرف۔ اور چونکہ خواب کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ خواب دیکھنے والا اس کو سمجھ لے اور خوب آنکھ سے دیکھ لے۔ پس اگر اسلام کا سائبان زمین پر ہمارے سروں سے اونچا رکھا جاتا تو وہ اعمال جو اُس سے نکل کر اوپر چڑھ رہے تھے اس کو نظر نہ آتے (کہ سائبان نے آڑ بن کر ان کو خواب دیکھنے والے کی نظر سے اوجھل کر دیا) اس ضرورت سے چڑھنے کو اترنے کی صورت دے دی گئی کہ صعود اور نزول میں بھی تعبیر کی ضرورت ہوئی نہ یہ کہ نزول و صعود حقیقی اور اپنی حالت پر ہے اور وہ رستی جو آسمان سے زمین تک کھچی ہوئی ہے ایمان کامل ہے مگر ایمان کامل مراد نہیں بلکہ خاص ایمان جو سلاطین و امراء میں ہوتا ہے کہ اپنی ذات کے متعلق بھی وہ بے رو رعایت پوری پوری حدود شرعیہ قائم کرتے ہیں اور عام رعایا کے متعلق بھی۔ اور اس شرط کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ وہ رستی ملی ہوئی ہے یا دل سے، اور سبب و وسیلہ بنی ہوئی ہے اس میں سے شہد اور گھٹی ٹپکوانے کا



کہ وہ لوگوں پر برستا ہے اور کوئی کم مقدار میں لے رہا ہے اور کوئی زیادہ تعداد میں۔ اسی طرح وہ ایمان کامل جو لوگوں کے ہر دستہ اعمال ظاہریہ کی مقبولیت عند اللہ کا سبب بنتا ہے وہی ہے جس کے ساتھ حکومت بھی ہو کہ مومن سلطان ہی اتن عامہ قائم رکھے گا۔ اور حدود شرعیہ جاری کرے گا۔ اور ضعفاء کا مددگار بنے گا ظلم کی درست درازی کا سد باب کرے گا اور اللہ و رسول کے فیصلہ کو نافذ کرے گا کہ اس کے ایمان کامل کا مقتضی ہی یہ ہے اور جب ایسا ہوگا تو ملک میں حسنات زیادہ ہوں گے اور معاصی کا صدور بہت کم کہ نہ لوگ زنا کر سکیں گے نہ چوری نہ ڈکیتیاں ہوں گی نہ باطل خون ریزی۔ بلکہ مساجد آباد ہوں گی نمازیوں سے بازار لبریز ہوں گے صلیا اور متبعین شریعت سوداگروں سے کوچہ کوچہ چرچا ہوگا علم اور عمل کا اور گوشہ گوشہ سے صدا بلند ہوگی عبادت خدا و اطاعت رسول کی غرض تمامی رعایا اختیار و ابرار ہوگی۔ اور سلطان بمنزلہ اس کے ہوگا جو لوگوں کے لئے اسلام کا ستون مضبوط کر رہا اور ان پر حسنات و خیرات کا مینہ برسار رہا ہے۔ یہ حالت پورے کمال کے درجہ پر صرف زمانہ سرور عالم و عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم میں تھی۔ (جیکہ خواب دیکھنے والے نے خواب دیکھا تھا)

رہتی یہ بات کہ وہ امراء ثلاثہ کون حضرات ہیں جن کا خواب میں تذکرہ ہے (اور ان کا شاہانہ نور ایمان بھی عہد نبوی کا نمونہ ہے) سو اولیاء و عارفین کا اس میں اختلاف ہوا ہے۔ ایک گروہ جن کا لقب طائفہ صدیقیہ ہے کہ وہ متبعین ہیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اور میرے شیوخ بھی اسی طائفہ میں سے ہیں اس کی رائے تو یہ ہے کہ خلفا ثلاثہ یعنی ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم مراد ہیں اور تیسرے کی رستی کٹنے یعنی حضرت عثمان کے متعلق قطع رسن سے مراد وہ بلوہ اور اعتراضات ہیں جو آپ پر کئے گئے اور اس کے مجڑ جانے سے مراد آپ کی شہادت ہے (کہ خلافت حقہ ہی پر وفات پائی۔ دست بردار یا معزول نہیں ہوئے) اور ایک گروہ کی جن کا لقب طائفہ حسینیہ ہے کہ وہ متبعین ہیں حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے رائے یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریت اور اہل بیت رسالت کے وہ اشرف مراد ہیں جن میں دو کی خلافت پر امت اسلامیہ کا اتفاق ہوگا اور تیسرے پر پہلے تو سب متفق ہوں گے مگر پھر اختلاف و افتراق ہوگا اور اُس کے بعد پھر سب متفق ہو جائیں گے۔ رستی کٹنے اور پھر اُس کے جوڑے جانے سے مراد یہی ہے۔ اور درحقیقت یہی رائے صحیح ہے اور خواب سے مقصود آلِ رسول ہی کے تین حضرات ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ بہت بڑا ہے اور آپ کی جگہ پر بیٹھنا اور آپ کی سیڑھی پر چڑھنا صرت نبی کا کام ہے یا اولاد نبی کا اور جب خواب میں نظر آنیوالی، رسی ایک ہی تھی اور اس پر تین امراء اسی طرح چڑھے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چڑھے تھے تو اس میں گویا اطلاع ہے کہ امراء ثلاثہ ہم جنس ہوں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا یہ معلوم ہی ہو چکا ہے



کہ آپ کے ایمان کامل میں آپ کا ہم جنس کوئی نہیں ہو سکتا۔ لہذا نسبی ہم جنسی باقی رہ گئی اور وہ آلِ رسولِ اشرف  
 ہی کے لئے ثابت ہے۔ (ممکن ہے کوئی شبہ کرے کہ یہ دلیل چاہتی ہے حضرت علیؓ کی خلافت بلا فضل کو کہ حضرت  
 ابوبکر صدیقؓ و حضرت عمر فاروقؓ چونکہ آلِ رسول نہ تھے لہذا خلیفہ نہیں بن سکتے۔ سو اس کو یاد رکھنا چاہیے کہ اس قاعدہ پر  
 تو حضرت علیؓ بھی خلیفہ نہیں بن سکتے کہ وہ بھی ذریتِ رسول اور اولادِ محمدیؐ میں نہیں تھے۔ دوم یہاں بحث خواب  
 کی رسی کی تعبیر میں ہے جس کا مقتضی عروج میں مجالستِ نسبہ کا ہے جیسے مثلاً گھر میں بے تکلف آنا جانا صرف اولاد  
 کا منصب ہے اگرچہ نا سمجھ اور معذور ہو۔ اور غیر کتنا ہی زیادہ محبوب و مقرب اور امور خانہ داری سنبھالنے کا  
 سلیقہ و قابلیت کیوں نہ رکھتا ہو مگر بلا اجازت گھر میں نہیں آ سکتا اس لئے اصلاحِ امت و سیاست دینیہ کے  
 سنبھالنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم مقامی کو اس سے کوئی تعلق نہیں کہ اس کا مدار مجالستِ نسبہ پر  
 نہیں بلکہ استعدادِ ملک گیری و قابلیتِ نیابت پر ہے۔ جیسے نماز کی امامت میں آنحضرت کو کسی صحابی کا اپنی  
 جگہ کھڑا کرنا کہ اس کو نسبی مجالست سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ سوم فضل و شرف کے اسباب و وجوہ مختلف  
 اور جدا جدا نشان رکھتے ہیں کہ مثلاً نسبی مجالست جو تمامی ذریتِ محمدیہ اور اشرف و سادات کو حاصل ہے خواہ  
 کسی زمانہ میں بھی پیدا ہوں اور بلحاظ تقویٰ و طہارت کسی حال میں بھی ہوں، ایک جدا اور مستقل شرف و فضل ہے۔ اور  
 مثلاً رویتِ جمالِ محمدی و صحبتِ نبویہ ایک جدا مستقل شرف و فضل ہے پس صحابی کو اگرچہ وہ روم یا حبش کے  
 باشندہ ہوں جدا نوعیت کا شرف ہے، اور شریف النسب سید کو اگرچہ وہ چودہویں صدی میں پیدا ہو جدا  
 نوعیت کا فضل حاصل ہے۔ دونوں کا باہم مقابلہ عقل کے ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ پس حضرت صدیقِ مدنی کی قائم  
 مقامی کے لئے اتنا کافی ہے کہ حضرت علیؓ و عباسؓ و حسنین رضی اللہ عنہم کے موجود ہوتے ہوئے آنحضرت  
 صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض وصال میں ان کو نماز پڑھانے کے لئے اپنی جگہ محراب میں کھڑا کر دیا۔ اور حضرت فاروقؓ کی  
 قائم مقامی کے لئے اتنا کافی ہے کہ رسول کے قائم مقام شخص نے ان کو اپنا قائم مقام بنا دیا حضرت شیخ کی تقریر کا رخ  
 صرف خواب کی تعبیر میں رسی کے متعلق ہے کہ خلفاء و ثلثہ مراد ہیں یا امرا و آلِ رسول نہ کہ مطلق قائم مقامی کے  
 استحقاق و عدم استحقاق کے متعلق) نیز اگر خلفاء و ثلثہ مراد ہوتے تو خواب دیکھنے والا چونکہ اُن سے واقف تھا  
 لہذا صاف ان کا نام لے کر ذکر کرتا کہ آپ کے بعد ابوبکرؓ نے اس رسی کو پکڑا اور اوپر چڑھ گئے اور پھر حضرت  
 عمرؓ نے رسی کو پکڑا اور وہ بھی چڑھ گئے۔ اور پھر حضرت عثمانؓ نے رسی کو پکڑا اور وہ ٹوٹ گئی اور پھر جوڑی گئی حالانکہ  
 بیان کیا ان لفظوں میں کہ آپ کے بعد ایک شخص نے رسی کو پکڑا اور پھر دوسرے نے اور پھر تیسرے نے۔ اس سے صاف  
 ظاہر ہے کہ ان تینوں چڑھنے والوں سے خواب دیکھنے والے صحابی واقف نہ تھے۔ لہذا خلفاء و ثلثہ مراد نہیں  
 غرض میں نے اس کے متعلق حضرت مدوح سے بہت ہی بحث کی اور بار بار طرح طرح سے مناظرہ کیا



مگر آپ نے حیب فرمایا یہی فرمایا کہ خلفائے ثلاثہ مراد نہیں بلکہ امراء اشرف مراد ہیں (جو غالباً زمانہ خلافت فاطمیین میں ہوئے) اس کے بعد یہی دو دلیلیں بیان فرمائیں اور کہا کہ میں حالانکہ صدیقینہ گروہ میں سے ہوں مگر بات وہی کہتی چاہیے جو حق اور واقعی ہو۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے تعبیر میں غلطی کیوں ہوئی؟ مانا کہ اصابت تعبیر بھی اللہ کا فضل ہے، جسے چاہے عطا فرمادے مگر حضرت ابوبکرؓ تو امام الاولیاء ہیں اور صحابہ میں بھی سب سے افضل و برتر۔ اور آپ نے بھی بار بار فرمایا ہے کہ عرفان الہی اور معرفت باطن محمدی میں جو درجہ سیدنا ابوبکرؓ کا ہے وہ امت محمدیہ میں کسی کو نہیں نصیب ہوا۔ پھر ایسے سید العارفین اور امام المجتہدین کا کا صحیح تعبیر سے ناواقف رہنا بڑے تعجب کی بات ہے۔ فرمایا کہ سیدنا ابوبکرؓ کو تعبیر کا علم تو اس سے بھی ہزار ہا درجہ بڑھا ہوا تھا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حاضری کے سبب وہ سب غائب ہو گیا تھا کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف فرما ہونے کی حالت میں تمامی حاضریں مجلس کے انوار غائب ہو جایا کرتے تھے اور ان میں اشتغال باقی نہ رہتا تھا رجب سورج کے سامنے چاند اور ستاروں کی روشنی غائب ہو جاتی ہے اور اس میں شعاع و چمک باقی نہیں رہتی) اور اس کا سبب یہ تھا کہ تمامی علوم کے انوار صرت محبت کے نور پر پڑتے لگتے تھے اور ان تمام شعاعوں کے ایک جگہ پڑنے سے آتش شوق بھڑک جاتی تھی۔ لہذا قوت فکریہ اس میں مشغول ہو جاتی اور سارے باطن و اندرون کو جمال و کمال محمدی میں محو کر دیا کرتی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ محبت و شوق کے انوار جب مشتعل ہوتے اور انوار علم غائب ہو جاتے ہیں تو اس وقت علمی مبحث میں گفتگو کرنے والے کی حالت ایسی ہو جاتی ہے جیسے بھولا ہوا انسان (کہ علم تھا مگر غائب ہو گیا) کیونکہ قلب کی توجہ ایک ہی شے کی طرف ہو سکتی ہے جب ایک چیز کی طرف متوجہ ہو جائے گی تو دوسری تمام چیزوں سے قطعاً بے تعلق ہو جائے گا۔ اور عارفین کے لئے جن کے سردار سیدنا ابوبکر صدیقؓ ہیں ذات محمدی سے بڑا کوئی مقصود نہیں اس لئے جب وہ ذات مطہرہ نظروں کے سامنے ہوتی تھی تو نہ علم کی طرف التفات جاتا تھا نہ کسی دوسری طرف اور اس کی وجہ یہ ہے کہ علم خود ذات محمدی کا ایک نور ہے۔ لہذا ذات جب نظروں سے اوجھل ہوتی تو اس کے انوار سے تعلق ہوتا تھا تا کہ وہ صاحب انوار ذات تک پہنچا دیں۔ مگر جب خود ذات سامنے موجود ہے تو واسطہ و وسائل سب ساقط ہو گئے اور ساری توجہ ذات میں مستغرق ہو گئی۔ میں نے عرض کیا کہ ذات کی طرف توجہ کس شے سے نصیب ہوتی ہے؟ فرمایا تین باتوں سے۔ محبت اور تعظیم اور حق تعالیٰ نے جو کمال آنحضرتؐ کو عطا فرمایا ہے اس پر تعجب کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کو دیکھ جب عورتیں بے اختیار بول پڑیں مدیہ تو انسان نہیں ہے یہ تو بڑی خوبیوں والا فرشتہ ہے، تو کیا پوچھنا سید الوجود صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ آپ کو دیکھ کر عارفین کیا کہیں گے۔ ہاں یہ تینوں امر کامل نہیں ہوتے جب تک کہ عارف کو ذات محمدی کے متعلق سات باتیں حصر کے درجہ میں حاصل



نہ ہو جائیں کہ ساتوں میں بجز ذات محمدی کے کوئی دوسری چیز مقصود نہ ہو اور وہ یہ ہیں فکر نفس خیال یعنی نفس کی نظر عقل مثال یعنی عقل کی نظر ذات روح اور علم کہ ان ساتوں چیزوں کا دھیان طرت ذات محمدی میں محصور ہو۔ اگر ان میں کسی ایک کے دھیان و تصور میں بھی کچھ کمی ہوگی تو توجہ ناقص کہلائے گی۔ اور جب ساتوں کے انوار محض ذات محمدی میں منحصر ہوں گے تو اب محبت و تعظیم اور تعجب کے ساتھ ذات محمدی کی طرت توجہ نصیب ہوگی اور (وہ لطف و حظ آئے گا کہ) اس کے سوا کسی چیز کی تمنا نہ رہے گی۔ جب عادت اس حالت میں ہو۔ کہ اس کا فکر و خیال اور روح و علم وغیرہ سب ذات محمدی کی طرت متوجہ و مستغرق ہو، تو اس سے اگر اس کے فرزند کا رنگ بھی دریافت کیا جائے کہ گورا ہے یا کالا تو وہ حیران ہو جائے گا اور کچھ نہ بتا سکے گا۔ اور اگر کچھ جواب دے گا بھی تو سمجھ کر نہ دے گا۔ (ایسا دے گا جیسے مست و مدہوش کی زبان سے بات نکلتی ہے) پس اگر جواب ٹھیک ہوگا تو محض عادت کی وجہ سے ہوگا جیسے بعض حافظ قرآن سونے کی حالت میں بھی سورتیں کی سورتیں پڑھ جاتے ہیں، پس یہ سب تھا کہ حضرت ابو بکرؓ سے تعبیر خواب میں غلطی واقع ہوئی ورنہ یہی سائل اگر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس ان کے زمانہ خلافت میں آتا کہ ذات محمدی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی اور اسی خواب کی تعبیر دیتا کرتا تو عجائب و غرائب باتیں سناتا۔ اور میں نے اس خواب کے متعلق جو کچھ بیان کیا وہ مجھے بواسطہ سیدنا صدیق رضا ہی تو معلوم ہوا ہے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ ہمیں تو ایک بات معلوم ہو۔ مگر ہمارے آقا و سردار کو معلوم نہ ہو تو امر محال ہے ہاں بات وہی تھی کہ حضوری ذات محمدی نے علوم صدیقی کو گویا معدوم کر دیا تھا۔ (کہ تعبیر خواب جتنی صحیح بھی دی وہ بھی سنا پر عادت ہے خیری کے ساتھ زبان سے نکل گئی ورنہ آتش محبت کے اشتعال نے کسی طرف توجہ و التفات کے قابل ہی نہ رکھا تھا)۔

(۶) میں نے حضرت ممدوح سے خواب کے متعلق دریافت کیا کہ کیا چیز ہے اور کیسے نظر آتی ہے، اور کس وجہ سے دکھائی دیتی ہے۔ کہ لوگوں کی رائے اس بارہ میں بہت مختلف ہے۔ اطیاء کی رائے تو یہ ہے کہ وہ اخلاط الاربعہ ہیں جس کے مزاج میں بلغم کا غلبہ ہوتا ہے چونکہ بلغم کی طبیعت کو پانی سے مناسبت ہے اس لئے وہ سوتے ہیں دیکھتا ہے گویا پانی پر تیر رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور جس میں صفرا کا غلبہ ہوگا اس کو آگ اور ہوا میں اڑنا یا فقہا میں چڑھنا وغیرہ پریشان کن صورتیں نظر آئیں گی۔ اور جس میں خون کا غلبہ ہوگا وہ سودا ویت کی باتیں اور ترش چیزیں دیکھے گا۔ مگر علامہ مازری نے اس کی تردید کی ہے کہ گو عقل اس کو جائز رکھتی ہے کہ ایسا ہو مگر اس پر کوئی دلیل قائم نہیں ہوئی۔

اور جہاں یقین کی ضرورت ہو وہاں ظن اور تجویز سے کام لینا صحیح نہیں ہے۔ اور اہل فلسفہ کا قول یہ ہے کہ جو واقعات سطح زمین پر ہو رہے ہیں وہ عالم علوی میں نقوش کی طرح منقش ہیں۔



لہذا نفس کے سامنے ان میں سے جو شے بھی آجاتی ہے اس کا نقشہ نفس میں اتر آتا ہے، مگر علامہ مازری نے اس کی بھی تردید کی ہے کہ یہ بھی دعویٰ بلا دلیل ہے اور انتقاش صفت ہے اجسام کی (کہ نقشہ جسم ہی کا کھچتا ہے۔ بڑا کی۔ چھٹائی، قرب، بعد صلاح و صلاح وغیرہ اعراض کا نہیں کھچ سکتا) حالانکہ عالم علوی میں اکثر چیزیں از قسم اعراض ہیں۔ اور معتزلہ کی رائے یہ ہے کہ وہ محض خیالات ہیں جن کی نہ کوئی اصلیت ہے نہ بنیاد۔ اس سے مقصود ان کا خواب کی حقیقت کا انکار کرنا ہے۔ جیسا کہ عذاب قبر کا انکار کر دیا ہے (کہ جو بات سمجھ میں نہیں آتی اس کے منکر ہو جاتے ہیں) چنانچہ ابن العربی نے لکھا ہے کہ خواب کے متعلق بھی معتزلہ اپنے اصول پر چلے کہ عوام پر ملمع کاری کر کے اصول شرع کا انکار کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کا قول ہے کہ نہ جنات کوئی چیز ہیں نہ ان کا باتیں کرنا کوئی چیز ہے اور نہ فرشتے یا انکا باتیں کرنا کوئی چیز ہے حتیٰ کہ جبریل علیہ السلام کے متعلق کہتے ہیں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے باتیں کرتے تو حاضرین مجلس بھی تو سستے ران کے نزدیک رسول اور اس کے ارشاد کی کوئی وقعت ہی نہیں۔ جو بات ان کی عقول قاصرہ سے بالا ہوئی اس کا انکار کر دیا، اور بعض علماء کا قول یہ ہے کہ قلب کو بھی حق تعالیٰ نے دکان اور دوا آنکھیں دی ہیں۔ ان کے ذریعہ جو بات سنائی یا دکھائی دیتی ہے وہ خواب کہلاتی ہے غرض انشراح حاصل نہیں ہوتا کہ خواب کی حقیقت و سبب کیا ہے فرمایا کہ جس طرح بیداری میں بشر کے لئے دو چیزیں ہیں ایک خواطر یعنی وہ خیالات جو دل پر گزرا کرتے ہیں دوئم ادراکات یعنی وہ علوم جو عقل کے ذریعہ معلوم ہوتے یا وہ محسوسات جن کو حواس کے ذریعہ ادراک کیا جاتا ہے اسی طرح سونے کی حالت میں خواب نظر آتی ہے کبھی خواطر کے ذریعہ جن کو حق تعالیٰ قلب میں ڈالتا ہے۔ اور کبھی کسی چیز کے ادراک اور مشاہدہ کے ذریعہ۔ لہذا خواب کی بھی دو قسمیں ہو گئیں۔ اور اکات۔ اور خواطر۔ پھر ادراکات کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو منسوب ہیں روح کی طرف اور دوسری وہ جو منسوب ہیں ذات کی طرف۔ اور اسکی وجہ یہ ہے کہ دیکھنے والی شے درحقیقت روح ہے، اور اس کا دیکھنا بواسطہ بصیرت ہوتا ہے اور بصیرت کی تحقیق سبعة احرف کی حدیث میں منجملہ اجزاء روح کے مفصل ہو چکی ہے۔ پس جو شے روح کو بصیرت کے ذریعہ نظر آتی ہے وہ تو منسوب ہے روح کی طرف۔ اور جو ذات انسانی اور اس کے قلب کی نگاہ سے روح کو نظر آتی ہے کہ مقتضائی عادت خواب میں مکان یا مسجد یا باغ وغیرہ دیکھتا ہے، وہ منسوب ہے ذات کی طرف۔ وضاحت کے لئے یہ سمجھو کہ روح کو دو قسم کی سماعت نصیب ہے، ایک بدن میں محبوس ہونے سے قبل کی کہ مشرق ہو یا مغرب ہر جگہ کی ہر بات اس کو سنائی دیتی ہے۔ دوسری بدن میں مقید ہونے کے بعد کی کہ صرف کان کے ذریعہ سن سکتی ہے اور وہ بھی ایک معین مسافت تک کی، اسی طرح اس کو دو نگاہیں حاصل ہیں۔ ایک حجاب ذات سے قبل کی جو کہ



بصیرت سے ہوتی ہے اور روح کے ہر جزو سے ہوتی ہے کہ ایک لمحہ میں تمامی معلومات اس کے سامنے آ جاتے ہیں اور نزدیک و دور کا کوئی فرق اس درجہ میں نہیں رہتا۔ حتیٰ کہ خود اس کا بدن اور عرش اس کے نزدیک مساوی ہوتے ہیں۔ اور دوسری حجاب ذات سے بعد کی جو صورت قلب کے ذریعہ ہوتی ہے کہ قلب جن معلومات کو غور و فکر کے ذریعہ اپنے اندر لاسکتا ہے وہی ملو اک ہوتے ہیں، پس انسان جب سو جاتا اور کوئی شے دیکھتا ہے تو کبھی روح کی نظر سے دیکھتا ہے، اور کبھی نظر قلب سے اور ان دونوں میں فرق صرف صفائی و ستھرائی کا ہوتا ہے کہ جو دیکھنا منسوب ہے روح کی طرف وہ پاک صاف ہوتا ہے۔ پس اس کو یا تو مطلق ہی تعبیر کی ضرورت نہیں ہوتی اور یا ہوتی ہے تو بہت قریب تعبیر کی ہوتی ہے اور جو منسوب ہے ذات کی طرف کہ قلب ہی کا ایک مضغہ گوشت ہے، اس میں صفائی نہیں ہوتی۔ بلکہ اشارہ ہوتا ہے اور وہ بھی دور کا اور خفی کہ اس کی تعبیر دقیق اور مشکل پڑ جاتی ہے۔ مثلاً فرض کرو زید نے عمر کو زخمی کر دیا۔ اب یہی واقعہ قبل از وقوع عمر کو خواب میں نظر آیا۔ پس اگر بنگاہ روح دیکھا تب تو بعینہ ہی صورت نظر آئے گی اور اگر بنگاہ قلب دیکھے گا تو اس طرح دیکھے گا کہ مثلاً راستہ میں جا رہا ہے اور کوئی لکڑی لگی جس سے زخم آگیا۔ چونکہ پہلی صورت میں صفائی و ستھرائی تھی کہ نور روح سے دیکھا اور نور ہر شے کا صحیح نقشہ اُتار کرتا ہے لہذا واقعہ اپنی اصل حقیقت پر دکھائی دے گیا۔ اور دوسری صورت میں نور ذات سے دیکھا ہے اور ذات کے نور میں باطل شریک ہے اور باطل کسی شے کا اصل نقشہ نہیں اُتار سکتا بلکہ اس کو متغیر و متبدل کر دیتا ہے۔ لہذا انوش خواب میں بصورت منیدک اور پرند بصورت پتھر اور انسان لکڑی دکھائی دے گا۔

اور چونکہ بحر بنی کے کہ اس کی ذات معصوم ہے اور کوئی ذات خالی از ظلمت نہیں ہے اس لئے اُمتی کے ہر خواب میں کم و بیش تغیر ہونا اور تعبیر کی ضرورت پیش آتی ہے اور ظلمت کے کئی درجے ہیں۔ پہلا درجہ وہ ظلمت ہے جو فعل کردہ کے سہواً مرتکب ہونے سے ذات پر آتی ہے مثلاً بامیں ہاتھ سے کھانا کھایا بھول کر کہ اس سے اس کی ذات میں ایک خفیف سی ظلمت ضرور آئے گی کہ گناہ ہونا تو ارادہ پر موقوف ہے۔ مگر خاصیت ہر چیز کی بہر حال اثر کرتی ہے۔ جیسے کسی نے بھولے سے تمباکو کھالیا تو معصوب بیشک نہ ہوگا مگر چپکراور قے آنے سے تو نہ بچے گا) پس یہ شخص جب قلب میں اس ظلمت کو لئے ہوئے سوئے گا اور کوئی چیز دیکھے گا تو ضرور اس میں خفیف سا تغیر آئے گا۔ مثلاً اس نے خواب میں جنت کو دیکھا اور اس کے اندر جاتے کا ارادہ نہیں کیا، تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ نفل کے درجہ میں کسی نیک کام کرنے کا ارادہ کرے گا اور پھر اس سے روک جائے گا۔ چونکہ کار نیک سبب ہے دخول جنت کا لہذا خواب میں وہ بصورت جنت نظر آیا۔ اور اس کے اندر جانے کا ارادہ نہ کرتا اشارہ ہے کار خیر سے باز آنے کی طرف۔ ورنہ واقعہ نظر آتا تو صاف



نظر آتا کہ کار خیر کا ارادہ کیا اور عمل میں نہ لایا۔ مگر خواب میں خفیف تغیر آگیا۔ اور اس کا سبب وہی ظلمت خفیفہ ہے جو سہو کردہ سے قلب میں آئی تھی۔ دوسرا درجہ وہ ظلمت ہے جو سہواً حرام کے ارتکاب سے فات میں آتی ہے، جیسے کسی نے بجاالت صوم بھول کر کھاپی لیا کہ گو سہو کی وجہ سے گناہ نہ ہوگا مگر اس کی ظلمت پہلے درجہ سے زیادہ ہوگی اور اس کی خواب میں تغیر نسبتاً زیادہ ہوگا۔ مثلاً خواب میں دیکھا کہ جنت ہے اور وہ اس میں جانے کا ارادہ کر رہا ہے مگر کسی نے اندر جانے سے روک دیا ہے، اس کی تعبیر یہ ہے کہ فرض کفایہ (مثلاً نماز جنازہ وغیرہ پڑھنے کا) ارادہ کرتا ہے مگر رک جاتا ہے اور ادا نہیں کرتا۔ وجہ تعبیر وہی ہے کہ فرض کفایہ سبب دخول جنت ہے، اور اس میں ظلمت قوی ہے کہ جنت میں داخلہ سے روکنے کی صورت نظر آئی جو گویا وہ ظلمت ہے جو فرض کفایہ سے روک رہی ہے اور وہ پیدا ہوئی ہے سہواً حرام سے مرتکب ہونے سے تیسرا درجہ وہ ظلمت ہے جو فعل مکروہ کے قصد ارتکاب سے آتی ہے مثلاً کوئی بامیں ہاتھ سے قصداً کھائے پئے تو اس قصد کی وجہ سے ظلمت نسبتاً سہو حرام سے بڑھ جائے گی اور خواب میں تغیر زیادہ ہوگا۔ مثلاً دیکھے کہ شیاطین اس کے گھر میں گھس آئے۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس کی عورت زانیہ ہے۔ کیونکہ شیاطین سے مراد ہے زانی، اور گھر سے اشارہ ہے عورت اور اس میں گھسنا گویا زنا کرنا ہے۔ یہاں اگرچہ تعبیر میں زیادہ تغیر نہیں مگر خواب کے مقصود میں جنت و ظلمت زیادہ ہے کہ بے غیرتی و تہکارت اور آبروریزی سب شامل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ظلمت کا اثر کبھی نفس تعبیر پر پڑتا ہے کہ تعبیر دقیق و خفی ہوتی ہے، اور کبھی خواب میں دیکھی ہوئی چیز پر پڑتا ہے کہ وہ گندی اور مخش ہوتی ہے۔

چوتھا درجہ وہ ظلمت ہے جو بالقصد ارتکاب حرام سے آتی ہے۔ مثلاً کوئی قصداً زنا کرے یا روزہ رمضان توڑ دے کہ یہ قصد حرام پہلے درجوں سے زیادہ ظلمت لائے گا۔ مثلاً خواب دیکھا کہ ایک بوڑھے مسلمان کے آگے چل رہا ہے اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس شخص کا ایمان صحیح ہے مگر معاصی کا مرتکب ہو رہا ہے کیونکہ معمر مسلمان اس خواب دیکھنے والے کا ایمان ہے کہ کبر سنی و بڑھاپا دلالت کر رہے ہیں بصیرت و تجرید پر۔ لہذا ایمان کی پختگی معلوم ہوئی۔ مگر اس کے آگے چلنا دلالت کر رہا ہے معاصی پر کہ یہ صاحب ایمان اپنے ایمان کا اتباع نہیں کرتا۔ اور یہ پروائی برتا ہے۔ پس اس خواب کی تعبیر میں ظلمت قوی ہوئی۔ کہ نہ بوڑھے مسلمان کا اطلاق ایمان صحیح پر واضح ہے، اور نہ آگے چلنے کا اطلاق ارتکاب معاصی پر کھلا ہوا ہے۔ دونوں میں خفا اور بعد ہے نیز نفس خواب میں بھی ظلمت قوی ہے کہ معصیتوں کا معاملہ گندگی و خباثت میں کوئی معمولی چیز نہیں۔ پانچواں درجہ وہ ظلمت ہے جو عقیدہ خفیفہ میں جہل بسیط کی وجہ سے پیدا ہوا کہ عقیدہ دو طرح کا ہے۔ ایک ثقیلہ۔ دوم خفیفہ۔ خفیفہ وہ ہے



جس کی سزا دائمی جہنم نہیں مگر عذاب ہے مثلاً عقیدہ ہے کہ آخرت میں حق تعالیٰ کا دیدار ہوگا۔  
 جزاء و سزا اللہ پر واجب نہیں بلکہ ثواب اس کا فضل و کرم ہے اور عذاب اس کا عدل و انصاف نیز  
 اللہ جل جلالہ اپنے افعال میں کسی سبب اور واسطہ کا محتاج نہیں بلکہ وسائل خود مجملہ افعال الہیہ کے ہیں  
 پس آگ (کہ واسطہ ہے جلانے کا) اور جلاؤ اور طعام (کہ سبب ہے پیٹ بھرنے کا) اور پیٹ بھرنے کا، اور تلوار  
 (کہ آلہ ہے کاٹنے کا) اور کاٹنا سبب اللہ کا ہی فعل ہے۔ نیز جنت و دوزخ اس وقت بھی موجود ہیں (یہ نہیں  
 کہ بعد قیامت پیدا کی جائیں گی) اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ نہ دنیا میں نہ آخرت میں یہ سب عقائد خفیفہ میں  
 داخل ہیں کہ ان کا معتقد سچا مسلمان اور کامل الایمان ہے اور جو اس سے جاہل ہو مثلاً اس کا عقیدہ  
 ہو کہ دیدار خدا نہ ہوگا یا یہ کہ جزا اس پر واجب ہے یا یہ کہ وہ اپنے افعال میں آلات و وسائل کا محتاج  
 ہے۔ یا یہ کہ جنت و دوزخ اس وقت موجود نہیں، تو اس کو برود قیامت عذاب دیا جائے گا۔ اور وہ غیر  
 اعتقادی اعمال معاصی سے زیادہ ہوگا۔ اور عقیدہ ثقیلہ وہ ہے جس کے خلاف کی سزا خود جہنم ہے  
 مثلاً عقیدہ ہے کہ اللہ موجود ہے۔ اس کا وجود قدیم ہے کہ نہ اس کی ابتداء ہے نہ انتہا۔ وہ غافل مختار ہے  
 کہ جو کچھ کرتا ہے ارادہ و اختیار سے کرتا ہے نہ اس کا فعل یا قضا و طبیعت ہے نہ کسی وجہ اور سبب کا ضررت  
 مند ہے کہ ان دونوں صورتوں میں اختیار سلب ہو جاتا ہے اور ہی ہمارے افعال کا خالق ہے اور اس میں ہمارا  
 کوئی دخل نہیں اگر دخل ہے تو صرف کسب اور ان کے انتساب میں ہے، اس کے ملک میں اس کا کوئی شریک نہیں  
 نہ اہل زمین کی بڑی سے بڑی سہتی جیسے ملوک و وزراء اور نہ آسمانی مخلوق کا کوئی فرد مثلاً چاند، سورج، ستارے  
 اور فرشتے وغیرہ۔ وہ سب کی سنتا ہے، سب کچھ دیکھتا ہے، ہر چیز کا علم رکھتا ہے، پس یہ عقائد ثقیلہ ہیں  
 کہ ان کا معتقد کامل الایمان کہا جائے گا اور جو ان میں کسی ایک عقیدہ سے بھی جاہل رہا وہ ہمیشہ دوزخ میں  
 رہنے کا مستحق ہوا۔ یہ سمجھ لینے کے بعد اصل محبت کو کہ عقیدہ خفیفہ میں جہل لپیٹ وہ ظلمت پیدا کرے گا  
 جو درجات سابقہ سے مافوق ہوگی اور خواب میں تغیر بہت زیادہ ہوگا۔ مثلاً خواب میں کسی مردہ کو دیکھا  
 اور جان بھی رہا ہے کہ یہ مر چکا ہے اور اس سے پوچھ رہا ہے کہ کہو کیا حال ہے اور کیسی گزری۔ اور مردہ  
 اس سے اپنی بد حالی و تکالیف کا اظہار کر رہا ہے، اس کی تغیر یہ ہے کہ خواب دیکھنے والا دیندار ہے  
 اور آخرت اس کی آسن اور بہتر ہے اور جن گناہوں میں مبتلا ہے عنقریب ان سے توبہ کرے گا۔ اس تغیر کی  
 وجہ یہ ہے کہ خواب کی حالت کا وعظ بہت زیادہ موثر ہوا کرتا ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کو دھوکا دینے اور ڈانٹنے  
 کے قائم مقام بنایا ہے۔ اور جو چیز اللہ کی طرف سے ہوا کرتی ہے وہ پوری ہو کر رہتی ہے۔ اور مردہ سے  
 ملاقات کرنا اور اس کا حال پوچھنا آدمی کی طاقت سے باہر ہے پس یہ جو کچھ بھی ہوا اللہ کی طرف سے



ہوا کہ مردہ سے ملا اور سنا جو کچھ بھی اس نے کہا۔ یہ علامت ہے کہ حق تعالیٰ کی اس پر رحمت ہے ورنہ اس طرح خواب میں اس کو تنبیہ نہ ہوتی اور اپنی اندھی حالت میں ڈوبا رہتا۔ پس اس تعبیر میں ظلمت قوی ہوتی کہ اشارہ بہت خفی اور تعبیر بہت دقیق ہو گئی۔ چھٹا درجہ عقیدہ خفیہ میں جہل مرکب ہے۔ کہ مثلاً عقیدہ ہو دیدار خدا نہ ہوگا، اور پھر اس پر اڑ بھی ہو کہ میرا یہ عقیدہ بالکل ٹھیک ہے پس وہ ظلمت جو ذات میں اس جہل مرکب سے آئے گی پہلی تمام ظلمتوں سے بڑھی ہوئی ہوگی مثلاً خواب میں دیکھ کہ آتش دوزخ کا زقوم کھا رہا اور کھوتا پانی پی رہا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ داخل و خارجاً ہر طرح حرام میں ڈوبے گا کہ حرام ذریعہ سے روپیہ کمائے گا اور پھر مستحق پر خرچ بھی نہ کرے گا۔ اور وجہ تعبیر یہ ہے کہ حرام فعل بے جانے والا ہے جہنم کی طرف اور سبب ہے اس کے سینڈھ کھانے اور گرم پانی پینے کا اور اس کی ظلمت بلحاظ تعبیر یہی ہے کہ زقوم اور کھوتا پانی دونوں چیزیں طبعاً مکروہ ہیں۔ اور مال و زر طبعاً محبوب چیز ہے۔ لہذا یہ تعبیر بالاضداد ہوئی۔ نیز مال تو دنیا کی چیز ہے اور زقوم و گرم پانی آخرت کی چیزیں اور دار دنیا سے دار آخرت بہت دور اور مبائن ہے۔

نیز جہنم اور اس کا زقوم و آب گرم مکروہ اور وحشت ناک چیزیں ہیں اس لئے یہاں تین وجہ سے ظلمت قوی ہو گئی کہ پہلی ظلمتوں میں ایک وجہ بھی اتنی قوی نہ تھی۔ ساتواں درجہ وہ ظلمت ہے جو عقیدہ ثقیلہ میں جہل بسیط کی وجہ سے ذات پر داخل ہو۔ مثلاً وجود باری وغیرہ کے خلاف کسی کا عقیدہ ہو۔ مگر ایسا کہ کوئی اس کو سمجھا دے تو مان لے اور اس کا یہ جہل بدل جائے علم سے (کہ بسیط ہونے سے ہی ناقضیت محضہ مراد ہے جس پر اڑ نہیں ہوتی) اس کی ظلمت درجات سابقہ سے زائد ہوگی۔ مثلاً خواب دیکھا کہ جہنم میں داخل ہوا ہے۔ تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ نافرمانی والدین وغیرہ کسی کبیرہ گناہ میں مبتلا ہے اس کی ظلمت کا قوی ہونا بلحاظ تعبیر بھی ہے کہ فعل کبیرہ دار دنیا میں ہے اور جہنم دار آخرت میں۔ اور دونوں میں تباہی ہے نیز بلحاظ خواب بھی ہے کہ حقوق والدین کا جث کسب حرام کی گندگی سے بھی زیادہ ہے اور بلحاظ جزا بھی ہے کہ جہنم بڑی تکلیف داند وہ کی جگہ ہے لہذا اس میں ہر تہ جہت سے ظلمت آئی اور اس کی قوت درجات سابقہ سے بڑھ گئی۔ آٹھواں درجہ وہ ظلمت ہے جو عقیدہ ثقیلہ میں جہل مرکب کی وجہ سے ذات پر آوے مثلاً یہ عقیدہ ہو کہ بندہ اپنے افعال کو خود پیدا کرتا ہے اور پھر اس کا بھی معتقد ہو کہ یہ عقیدہ حق اور صواب ہے اس کی ظلمت سب سے مافوق ہو کر خواب کو بہت زیادہ بدے گی مثلاً آپ نے آپ کو دیکھا کہ فرشتہ نے پکڑ کر جہنم میں ڈال دیا۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ تقدیر اس کو معصیت کی طرف کھینچ کر لائے گی اور وجہ تعبیر یہ ہے کہ فرشتہ اشارہ ہے تعبیر کی طرف، اور جہنم اشارہ ہے معصیت کی طرف۔ اور اس میں ظلمت اس لحاظ سے ہے کہ فرشتہ سے اشارہ تقدیر کی طرف نہایت خفی اور مجید دقیق ہے نیز بلحاظ خواب بھی ظلمت زیادہ ہے کہ فرشتہ کا



بندہ کو قہراً پکڑنا اور روزخ میں جھونکنا از خود زقوم کھانے اور گرم پانی پینے سے زیادہ شدید ہے کہ وہاں کوئی جابر و قاصر تو نہ تھا۔ نواں درجہ وہ ظلمت ہے جو بارگاہ نبوت میں جہل بسیط سے ذات میں آتا ہے مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں (صدور خطا وغیرہ) ایسی بات کا معتقد ہو جس سے آپ کی ذات مقدسہ پاک صاف ہے مگر محض ناواقف کے سبب ہو کہ کوئی تیار سے تو باز آ جائے اس کی ظلمت درجہ مذکورہ سے بھی بڑھی ہوئی ہے، کہ آپ دروازہ الہی ہیں۔ اور جو شخص دروازہ سے ناواقف اور اس کے راستہ سے جاہل ہو گا اس کے اندرون مکان داخل ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہوتے تو ہمیں نہ اللہ پر ایمان نصیب ہوتا نہ دنیا یا آخرت کی کوئی خوبی ہاتھ آتی۔ مثلاً کسی بوڑھے شخص نے خواب دیکھا کہ جوان بن گیا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ دنیا بہت کچھ ملے گی مگر طاعت الہی میں کام نہ آئے گی۔ اور اس تعبیر کی وجہ یہ ہے کہ بڑھاپا اشارہ ہے فقر کی طرف، اور جوانی کی طرف عود کرنا اشارہ ہے تو نگر می کی طرف۔ اور یہ اشارہ چونکہ بہت دقیق ہے کہ کہاں اعداد شباب۔ اور کہاں غنا و ثروت کا حصول) اس لئے تعبیر میں ظلمت قوی ہوئی۔ نیز نفس خواب میں بھی ظلمت قوی ہے کہ دنیا اصل ہے ہر گناہ کی۔ خصوصاً جبکہ بکثرت ملے کہ مالدار ہو کر آدمی کیا کچھ نہیں کر گزرتا)۔ اور اس لحاظ سے بھی ظلمت ہے کہ وہ طاعت خدا میں صرف نہ ہوگی اور اس کے ذریعہ کوئی نیک کام عمل میں نہ آئے گا۔ دسواں درجہ وہ ظلمت ہے جو ذات میں داخل ہو بارگاہ محمدیہ میں جہل مرکب کی وجہ سے کہ خلاف شان کسی صفت کا معتقد ہو اور یہ بھی اعتقاد ہو کہ عقیدہ یہی صحیح ہے اس کی ظلمت سب سے بالا ہے مثلاً خواب میں دیکھے کہ جوان کے پیچھے چل رہا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اغلام کرے گا وجہ تعبیر ظاہر ہے اور ظلمت تو یہ نفس خواب میں ہے کہ لواطت اکبر الکبائر ہے۔ یہ ہیں اس ظلمت کے درجات عشرہ جو نگاہ ذات کی طرف منسوب ہیں رہتے درجات طہارت جو روح کی طرف منسوب ہیں وہ بھی دس ہیں یعنی ان کی تقاضیں اور مذکورہ درجات عشرہ کا عدم اور اسی لئے درجات طہارت کا حال ثقل اور خفت میں درجات ظلمت کے برعکس ہو گا کہ ظلمت ذات میں ثقیل ترین اور آخری درجہ بارگاہ محمدیہ میں جہل مرکب کا ہے اور یہاں درجات طہارت میں نور روح کا خفیف ترین اور پہلا درجہ یہی بارگاہ عالیہ میں جہل مرکب سے پاک صاف ہونے کا ہے کہ بجز کفار کے شاید ہی کوئی روح اس طہارت سے خالی ہو)۔ اور ظلمت ذات کے لئے سہو مکروہ خفیف ترین و پہلا درجہ تھا (کہ شاید ہی بجز انبیاء کے کوئی ذات اس سے خالی ہو) مگر نور روح کے لئے سہو مکروہ کا عدم ثقیل ترین اور آخری درجہ ہے کہ ممکن ہے یہ صفائی و طہارت دوسری ظلمتوں مثلاً جہل بسیط یا مرکب کے ساتھ جمع ہو جائے پھر یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ روح جب اپنی بصیرت اور صاف نگاہ سے کوئی چیز دیکھتی ہے تو اصلی حالت پر دیکھتی ہے کہ نہ تعبیر ہوتا ہے نہ ضرورت تعبیر۔ مگر جب وہ اُسے ذات کے حوالہ



کرنے لگتی ہے تو ذات اگر معصوم اور ظلمت سے من کل الوجہ پاک ہوتی ہے تب تو بجنسہ بلا تبدیل و تغیر اس کو دے دیتی ہے (اور صبح کو جب آنکھ کھلتی ہے تو وہی ظہور ہوتا ہے، اور اگر ذات میں کم یا زیادہ ظلمت ہوتی ہے تو روح جب اپنی دیکھی ہوئی خواب اس کے حوالہ کرتی ہے تو حسب مقدار ظلمت اس میں تبدیل و تغیر آجاتا اور اسی درجہ کی جلی یا خفی تعبیر کی ضرورت پڑ جاتی ہے اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ روح اور ذات کی جدا جدا نظر سے جس طرح خواب کی دو قسمیں ہوں، اسی طرح روح کے اس خواب کو ذات کے حوالہ کرتے وقت بھی دو قسمیں ہو جائیں گی۔ کہ اگر ذات معصوم ہے تو روح کا دیکھا ہوا خواب اپنی اصل صورت پر ذات کو مل جاتا ہے اور جیسا خواب میں دیکھا تھا وہی واقعہ کی صورت میں پیش آ جاتا ہے اور اگر ذات منظم ہے تو روح کا دیکھا ہوا خواب اگرچہ اصل واقعہ اور غیر محتاج تعبیر تھا مگر ذات کو جب ملتا ہے تو حسب درجات ظلمت متغیر اور محتاج تعبیر ہو کر ملتا ہے کیونکہ ممکن ہے ایک اعتبار سے ذات میں ظلمت ہے مگر دوسرے لحاظ سے اس میں نور ہے۔ لہذا صفائی کی کبھی دو قسمیں ہو گئیں۔ ایک صفا و کلی اور یہ ذات معصومین یعنی حضرات انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ دوم صفا و جزئی۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک وجہ سے ہو اور دوسری وجہ سے نہ ہو۔ اور اسی لئے اس کے کبھی دس درجہ ہیں۔ پہلا درجہ بارگاہ عالیہ میں عدم جہل مرکب کا ہے کہ اس جہل سے صفائی تمام صفائیوں سے بالا ہے۔ اور اسی لئے اس کی خواب کو گویا تعبیر کی ضرورت ہی نہیں۔ مثلاً حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھا کہ اس سے خوش ہے اور تبسم فرمایا ہے اس کی تعبیر واضح ہے کہ اللہ اس سے راضی ہے اور اس کے اعمال پاک صاف ہیں۔ دوسرا درجہ جو اس کے بعد ہے بارگاہ محمدیہ میں عدم جہل بسیط کا ہے کہ اس کی صفائی پہلے درجہ سے نسبت کم ہے مگر قریب قریب ہے اور اسی لئے اس میں قلیل تعبیر کی ضرورت ہے مثلاً خواب میں دیکھے کہ فرشتوں کے ساتھ لڑ جھگڑ رہا ہے۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس کے پھوڑے پھنسیاں نکلیں گی یا کھجلی لاحق ہوگی یا بلا سبب عادی اس کا کوئی عضو یا ہڈی ٹوٹے گی۔ اس کی تعبیر کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ دیکھنے والی درحقیقت روح ہے اور اس نے جن فرشتوں کو دیکھا ہے وہ اس کی ذات کے حفاظت کرنے والے فرشتے ہیں، لہذا وہ ان سے مخاصمت کر رہی ہے۔ یعنی روح نے جب (بواسطہ بصیرت) بدن پر نکلنے والی پھنسیاں وغیرہ کا واقعہ دیکھا تو محافظین بدن فرشتوں سے جھگڑنا شروع کر دیا۔ گویا کہنے لگی کہ یہ (مرض) حفاظت بدن میں تمہاری کوتاہی کا نتیجہ ہے پس یہ خواب گویا ایسا کلام ہے جس میں ایک لفظ عذت کر دیا گیا ہے کہ جس وقت اس کو مقدر مان لیا گیا تو فوراً کلام صحیح اور مطلب واضح ہو گیا۔ تیسرا درجہ جو اس کے بعد ہے عقیدہ ثقیلہ میں عدم جہل مرکب کا ہے کہ یہ صفائی ماقبل سے کچھ کم ہے اور اس لئے اس کو تعبیر کی احتیاج ہوگی۔ مثلاً خواب میں دیکھا کہ حق تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہے خوف زدہ و پریشان۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ کسی



مصیبت میں گرفتار ہوگا۔ مگر حق تعالیٰ اس سے نجات بخشیگا اور اس میں اس کو اجر عظیم ملے گا۔ وجہ تعبیر یہ ہے کہ اللہ کے سامنے کھڑا ہونا صرف آخرت ہی میں ہوگا اور صرف مومنین کے لئے ہوگا۔ پس اگر خواب دیکھنے والے کی ذات ظلمتوں سے پاک صاف نہ ہوتی تو ضرور خواب میں دھمکائی اور ڈرائی جاتی اور اس کے بعد انجام ہوتا رہائی اور دخول جنت۔ مگر جب اُس نے اپنے آپ کو رب کے سامنے کھڑا ہوا اس حالت میں دیکھا کہ گو گھبرا رہا ہے مگر زبرد تو بیخ نہیں ہوئی) تو تعبیر وہ ہوئی جو اوپر ذکر کی گئی۔ اس کی دیکھنے والی حقیقت وہی روح ہے اور تعبیر کی ضرورت ذات کے حوالہ کرتے وقت ہوئی ہے۔ نہ یہ کہ روح کی نگاہ میں کوئی ظلمت تھی۔ اور اس لئے تعبیر کی حاجت ہوئی) پس اگر خواب کا دیکھنے والا کوئی عارفین و اولیاء میں سے ہوگا۔ یا حضرات انبیاء و مرسلین میں سے تو اس کی تعبیر دوسری ہوگی کہ وہاں ذات کے حوالہ ہوتے وقت بھی کسی ظلمت کا دخل نہیں ہوا، چوتھا درجہ عقیدہ ثقیفہ میں عدم جہل بسیط کا ہے۔ اور اس کی صفائی نسبتاً اُس سے بھی کم ہے مثلاً حضرت عزرائیلؑ کو دیکھا کہ اسے دیکھ کر ہنس رہے اور خوش ہو رہے ہیں۔ اس کی تعبیر درازی عمر ہے کہ اس شخص کے لئے ملک الموت کی خوشی کی وجہ اس کی درازی عمر ہی ہو سکتی ہے۔ مگر ذات کے حوالہ کرتے وقت اس میں ظلمت آئی اور تعبیر میں وقت واقع ہوئی کہ ملک الموت کے ہنسنے کا اشارہ درازی عمر کی طرف ایک خفی اور دقیق اشارہ ہے۔ پانچواں درجہ عقیدہ خفیفہ میں عدم جہل مرکب کا ہے اور یہ صفائی ماقبل سے بھی نیچے درجہ کی ہے مثلاً خواب میں حضرت ابوبکرؓ صدیق کو دیکھا۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ خواب دیکھنے والے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت زیادہ محبت ہے۔ کہ حضرت ابوبکرؓ میں اور خواب دیکھنے والے کی آنحضرت کے ساتھ محبت عظیمہ میں کوئی تلازم نہیں ہے اس لئے یہ اشارہ بہت خفی ہوا اور ذات کے حوالہ ہوتے وقت ظلمت کی وجہ سے خفا لاحق ہوا اس لئے اس کی ظلمت پہلے سے زیادہ ہوئی۔ چھٹا درجہ عقیدہ خفیفہ میں عدم جہل بسیط کا ہے کہ یہ عدم اپنے ماقبل کے قریب قریب ہے مثلاً کسی مقام پر فرشتوں کو موجود دیکھا تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ عنقریب اس جگہ مسجد تعمیر ہوگی جس میں اللہ کی عبادت اور تسبیح و تہلیل ہو کرے گی وجہ تعبیر تو ظاہر ہے مگر ظلمت، ذات کے حوالہ ہوتے وقت آئی کہ کہاں عالم انوار کے فرشتے اور کہاں عالم انوار کی مسجد۔ پر خلافت ماقبل کے کہ وہاں بھی اگرچہ حضرت صدیق اور محبت محمدیہ میں تلازم نہ تھا مگر عالم تو ایک ہی تھا۔ ساتواں درجہ بالقصد ارتکاب حرام کا عدم ہے مثلاً کسی جگہ پر حضرت اسرافیلؑ کو دیکھا تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ وہاں کوئی بڑا فتنہ واقع ہوگا یا بڑے درجہ کی خوشی وجہ تعبیر یہ ہے کہ حضرت اسرافیلؑ کی تعیناتی نتن اور افراح کے معاملات پر سے اور اس میں حوالہ ذات ہونے کے وقت کی ظلمت ماقبل سے زیادہ قوی اس اعتبار سے ہے کہ فتنہ و سرور کے ساتھ حضرت اسرافیلؑ کا تعلق اتنا مشہور نہیں جتنا عزرائیلؑ کا تعلق



عمر و زندگی کے ساتھ معروف و مشہور ہے اور باوجود اس کے عالم انوار و انکسار کا بعد بھی اس میں موجود ہے لہذا اس میں ماقبل سے زیادہ ظلمت ہوئی۔ آٹھواں درجہ بالقصد ارتکاب مکروہ کا عدم ہے مثلاً خواب میں شیطان کو دیکھا کہ اُسے گھرے کھڑے ہیں۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ چوروں کا اس پر حملہ ہوگا یا مال اس کا چوری جائے گا یا لوگ اس کی بلا وجہ عنایت کریں گے۔ وجہ تعبیر ظاہر ہے اور ظلمت تو یہ نفس خواب میں ہے کہ مال چوری جاتا اور غیبت ہونا اس خواب دیکھنے والے کے لئے پریشان کن اور ناگوار امر ہے جو کہ پہلی صورت میں نہ تھا۔ تو اُن درجہ عدم سہو حرام ہے مثلاً کسی مقام پر دیکھا کہ قیامت برپا ہوئی ہے۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس جگہ کی حالت تبدیل ہو جائے گی کہ ظلم ہو رہا تھا تو عدل ہونے لگے گا اور عدل ہو رہا تھا تو ظلم ہونے لگے گا۔ اس میں ظلمت ذات کے حوالے ہوتے وقت تعبیر میں آئی ہے کہ حقیقی قیامت سے تبدیل حالت کی طرف اشارہ اول تو دقیق ہے پھر عدل سے ظلم کی طرف انتقال تو بہت ہی بعید ہے کہ قیامت کے دن ظلم بالکل نہ ہوگا اس لئے حضرت اسرافیلؑ کو دیکھتے کی نسبت اس میں زیادہ ظلمت ہوئی کہ ان کا تعلق فتنہ و فزع دونوں حالتوں کے ساتھ یکساں تھا۔ دسواں درجہ عدم سہو مکروہ ہے کہ ظلمت و ثقل کے لحاظ سے سب میں آخری درجہ ہے مثلاً خواب دیکھا کہ شیطانوں کا دوست اور یار بنا ہوا ہے اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس کے احباب و ہم نشین بُرے لوگ ہیں۔ وجہ تعبیر تو ظاہر ہے مگر یہ روح کا دیکھا ہوا واقعہ جب ذات کے حوالہ ہوا تو اتنی ظلمت آئی کہ نگاہ ذات سے دیکھی ہوئی خواب کے قریب پہنچ گئی۔ کیونکہ ہر شخص اپنے دوست کی روش پر چلا کرتا ہے۔ پس جب اس کے دوستوں میں صلاح نہیں تو خود اس میں صلاح نہیں۔ گویا خواب کی یہ ظلمت ذات کی خباثت و بدکاری کا اشارہ کر رہی ہے جیسے وہ ظلمتیں جو ذات کی طرف منسوب ہونے والے درجات عشرہ میں تھیں کہ ان میں بھی ہر ظلمت ذات کی گندگی کی طرف اشارہ کر رہی ہے اگرچہ درجات بلحاظ قوت و ضعف کے مختلف تھے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت کی اس تقریر کا نتیجہ تو یہ نکلا کہ تعبیر کا سبب وہ ظلمت ہے جو ذات میں ہوتی ہے اور ذات کے دیکھے ہوئے میں تعبیر کی ضرورت نفس خواب میں ہوئی۔ لیکن جب کسی ذات میں ہر طرح معصوم ہونے کے سبب ظلمت بھی نہ ہو جیسا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی ذوات مقدسہ ہیں تو اُن کی خواب کو احتیاج تعبیر مطلق نہ ہونی چاہیے کہ جو تعبیر واقع ہوئی ہے مثلاً سیدنا یوسف علیہ السلام کی خواب جو قرآن میں مذکور ہے کہ گیارہ ستاروں اور چاند و سورج کو سجدہ کرتے دیکھا۔

حالانکہ سجدہ کرنے والے ان کے گیارہ بھائی اور ماں و باپ تھے۔ اسی طرح سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی خواب کہ بیٹے کو ذبح کر دیکھا۔

حالانکہ واقعہ یہ ہوا کہ مینڈھے کو ذبح کیا تھا۔ یا مثلاً سیدنا و مولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم



کا خواب کہ گلے کو دیکھا کہ ذبح کی جا رہی ہے جس کی تعبیر صحابہ کا شہید ہونا تھا۔ بقرہ اشارہ تھا جماعت صحابہ کی طرف۔ یا اپنے اپنی تلوار کو دیکھا کہ اس کی دھار میں شکستگی ہے تو تعبیر بیان فرمائی کہ اہل بیت میں کسی شخص کی وفات ہوگی۔ اور مہبوط زہ آپ نے خواب میں دیکھی جس کی تعبیر فرمائی کہ مدینہ مراد ہے کہ اگر اس میں رہ کر دشمن کا مدافعت کریں گے اور اس سے یاہر نہ نکلیں گے تو زہ پوش کی طرح محفوظ رہیں گے اور کوئی گزند نہ پہنچے گا۔ اسی طرح آپ کا خواب کہ لوگ آپ پر پیش کئے گئے جن میں کوئی قمیص پہنے ہوئے تھا۔ صرف اپنی چھاتیوں تک، اور کوئی اس سے نیچا، اور حضرت عمرؓ کو دیکھا ان کا گرتہ اتنا نیچا ہے کہ اس کو زمین پر کھینچتے ہیں۔ صحابہ نے عرض کیا کہ اس کی تعبیر کیا ہوئی یا رسول اللہ۔ فرمایا دین رکھ جس طرح قمیص ستر عیوب جسمانی و محافظ بدن ہے اسی طرح صلاح و بیداری ستر عیوب روحانی و محافظ روح ہے، غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد خوابیں ہیں جن میں تعبیر کی ضرورت پیش آئی پھر ایسا کیوں ہوا فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام کا سونا دوسروں کا سونا نہیں ہے۔ وہ بحالت نوم بھی مشاہدہ حق میں رہتے ہیں اور یہی مطلب ہے اس کا کہ صرف ان کی آنکھیں سوتی ہیں مگر دل نہیں سوتا۔ لہذا ان کی خوابوں کی دو قسمیں ہیں: یعنی معائنہ اور وحی۔ معائنہ تو یہ ہے کہ بنی کو سوتے میں کوئی چیز نظر آوے اور بیداری میں اس کا بعینہ ظہور ہو کہ نہ مطلق کسی ہودہ پیشی اور نہ تبدیل ہودہ تغیر۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ آپ مع صحابہ کے با من و امان مسجد حرام میں داخل ہوئے اور کسی نے (عمرہ پورا کر کے سر کا) حلق کرایا ہے اور کسی نے بال کتر دائے ہیں، چنانچہ حق تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس کا ذکر فرمایا۔ لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ دَسْوَلَهُ الدُّوَيَا بِالْحَقِّ ذَا آتِیَہ (اور چند ماہ بعد اس کا مجنبہ ظہور ہوا کہ باطنیان عمرہ نصیب ہوا) اس خواب کو نہ صرف روح کی طرف منسوب کریں گے اور نہ صرف ذات کی طرف۔ بلکہ دونوں کی طرف اس کا انتساب ہوگا کیونکہ صفائی و ستھرائی دونوں میں یکساں ہے اور اس لئے نہ اس میں ظلمت آئی نہ تعبیر کی حاجت ہوئی (نیز اسی قبیل سے ہے جو آپ نے شب معراج میں دیکھا کہ جس طرح آپ کو جسمانی معراج ہوئی کہ اسی جب اظہر سے افلاک کی سیر فرمائی اسی طرح کہیں آپ کو روحانی معراج بھی ہوئی کہ بحالت خواب آپ نے دیکھا جو کچھ بھی عالم بالا پر ہے۔ اور یہ روایت روح کی تھی جس میں نہ تعبیر کی ضرورت تھی نہ تاویل کی۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس قسم کی خواب ایسی ہے گویا آنکھ نے دیکھ لیا۔ لہذا اس طرح آنکھ سے دیکھی ہوئی چیز میں تبدیلی نہیں ہوتی اسی طرح اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ دوسری قسم یعنی وحی حضرات انبیاء کی وہ خوابیں ہیں جن میں تعبیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی خواب میں کسی خارجی وجود والی چیز کا نظارہ نہیں ہوتا اور نہ اس کی طرف روح یا فات متوجہ ہوتی ہے بلکہ حق تعالیٰ شانہ جو بھی حکم یا ممانعت فرمانا یا کسی بات کی خبر دینا چاہتا ہے تو ایک شے پیدا فرما کر بنی کو دکھاتا اور



اس کو کلام کا قائم مقام بنا دیتا ہے کہ وہ وحی الہی کے معلوم کر لینے کا واسطہ بن جاتی ہے۔ اس کی صورت ایسی ہوتی ہے جیسے کوئی رمز اور اشارہ سے باتیں کرے۔ غرض یہ چیزیں (جو نبی کو خواب میں نظر آتی ہیں) وہ امور ہیں جن کو حق تعالیٰ نے نبی کے ساتھ مخاطبت کرنے کے لئے وضع فرمایا ہے۔ اور حضرات انبیاء اس کی مراد ایسی ہی سمجھ لیتے ہیں جیسے ہم مخصوص اشاروں اور رمز و غمز کو سمجھ لیتے ہیں کہ کسی کام کا حکم دینا ہوتا ہے تو آنکھ یا ہاتھ سے ایک خاص اشارہ کرتے ہیں اور اگر منع کرنا ہوتا ہے تو دوسرا خاص اشارہ کرتے ہیں۔

اور اسی لئے حضرات انبیاء بے تامل اس کی تعمیل کرتے اور اس کو بیداری کی وحی کے مثل واجب العمل سمجھتے ہیں اور اس میں راز یہ ہے کہ نبی کو خطاب اسی شے میں واقع ہوتا ہے جس میں مشاہدہ حق ہو رہا ہے۔ اور حضرات انبیاء بیداری میں ہوں یا بحالت نوم ہمیشہ وہ وقت مشاہدہ ہی میں رہتے ہیں کہ مخلوقات عالم میں ان کے مشاہدہ حق کی مثال پرند کی سی ہے کہ کبھی سکون سے نہیں بیٹھتا۔ کبھی درخت کی اس شاخ پر ہے کبھی اس شاخ پر، اور کبھی زمین پر ہے کبھی فضا میں۔ اسی طرح ان حضرات کو کبھی مشاہدہ حق حاصل ہوتا ہے آسمان و زمین کے دیکھتے وقت اور کبھی حاصل ہوتا ہے ستاروں اور سورج چاند پر نظر جانے کے وقت۔ کہ جب کسی چیز پر نگاہ جاتی ہے تو خالق برتر کی عظمت و جلالت شان کا استحضار ہوتا اور ناقابل بیان مشاہدہ عظیم الشان حاصل ہوتا ہے۔ پس جب حق تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس مشاہدہ کی حالت میں ان کو کسی اجنبی چیز پر مطلع فرمائے تو وہ چیز ان کو اسی شے میں دکھلاتا ہے جس میں ان کو مشاہدہ حق ہو رہا ہے۔

چنانچہ سیدنا یوسف علیہ السلام کی روح بحالت نوم آسمان کی طرف چڑھی اور آپ کی نظر کو اکبت اور شمس و قمر پر پڑی تو آپ کو (ان نورانی احبارم کے خالق قدیر کا) مشاہدہ حاصل ہوا۔ اور حق تعالیٰ نے ان کو اس پیش آنے والے واقعہ سے باخبر بنانا چاہا کہ ان کے والدین اور ان کے گیارہ بھائی ان کو سجدہ کریں گے (کہ شریعت یعقوبیہ میں اظہار عقیدت کے لئے سجدہ کرنا جائز تھا) لہذا کو اکبت اور شمس و قمر ہی میں سجدہ کی صورت ان کو دکھلائی۔ کیونکہ اسی میں ان کو مشاہدہ حق ہو رہا تھا۔ تاکہ باطن جس مشاہدہ میں مشغول ہے بدستور مشغول رہے اور حضرت یوسف کا قصد ارادہ اس کے سوا کسی دوسری شے کی طرف نہ جائے۔

اسی طرح سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی نظر جب لڑکے پر گئی تو نعمت الہیہ کا مشاہدہ ہوا کہ اللہ کریم کا کتنا بڑا انعام ہے۔ لہذا جب حق تعالیٰ نے چاہا کہ مینڈھا زبح کرنے سے جو واقعہ بن کر پیش آنے والا ہے، اُن کو مطلع فرمائے، تو اسی مشاہدہ یعنی صاحبزادہ حضرت اسمعیلؑ، اور اس انعام کی عظمت کے اشتعال میں اس کو دکھایا۔ یہی حال ہے تمامی انبیاءؑ کی خوابوں کا جن میں تعبیر کی ضرورت نہ تھی۔

الحاصل یہ تفصیل تو قسم اول کے متعلق ہے جن کو ادراکات کہتے ہیں۔ رہتی دوسری قسم جس کا



نام خواطر ہے۔ سو اس کی حقیقت یہ ہے کہ طرح طرح کی خوابوں کا نظر آنا اس کا اثر ہے کہ خواطر ذات قسم قسم کے ہوتے ہیں۔ اور خواطر کے مختلف الاقسام ہونے کا سبب ایک امر غیبی ہے جس سے اکثر مخلوق کو مطلع نہیں کیا گیا میں نے دریافت کیا کہ وہ کیا ہے؟ فرمایا وہ فعل ہے اللہ سبحانہ کا بندہ کے قلب میں کہ خواب ہو یا بیداری جب تک بدن میں روح موجود ہے قلب میں حق تعالیٰ کا فعل جاری ہے کہ کسی حال بند نہیں ہوتا۔ اور بندہ کے ابتداء وجود سے لے کر مرتے دم تک قلب کی حرکت (اور ہر خیال) اثر و نتیجہ ہے اللہ تبارک و تعالیٰ کے اسی فعل کا کہ وہ قلب سے جو امر معین و مخصوص چاہتا ہے اس کا گذر قلب پر ہوتا ہے اور جب دوسری حرکت ہوتی ہے تو دوسرا امر معین خطور کرتا ہے۔ اور جب تیسری حرکت ہوتی ہے تو تیسرے امر کا خیال قلب پر گزرتا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے کہ میرے قلب میں فلاں بات کی حرکت پیدا ہوئی۔ مثلاً یہ کہ دوست سے ملنے جاؤں یا کھانا کھاؤں یا سو رہوں وغیرہ (حتیٰ کہ عمر بھر یہی ہوتا رہتا ہے کہ ایک حرکت ختم ہوتی ہے اور دوسری پیدا ہوتی ہے) پس اگر حق تعالیٰ بندہ کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو پہلی حرکت قلب کا خیر کی ہوتی ہے اور دوسری و تیسری بھی (کہ یکے بعد دیگرے نیک کام کرنے کے خیالات آتے رہتے ہیں) اور اگر بندہ کے ساتھ بُرائی کا ارادہ فرماتا ہے تو قلب کی پہلی حرکت بھی اس کا ربد کی ہوتی ہے جس کا حق تعالیٰ نے ارادہ فرمایا اور پھر دوسری حرکت بھی کا ربد کی جس کا اُس وقت کے لئے ارادہ فرمایا۔ غرض قلب کی تمام حرکات ایسی ہوتی رہتی ہیں حتیٰ کہ حق تعالیٰ کرم فرمائے اور اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا چاہیے تو یہ خاطر بد تبدیل ہو جاتے ہیں خطرات خیر سے اور پھر خیالات نیک ہی قلب پر آنے لگتے ہیں) خلاصہ یہ ہے کہ بندوں کے تمامی اعمال تابع ہیں خواطر کے، اور خواطر تابع ہیں حرکات قلب کے، اور حرکات قلب تابع ہیں اللہ کے افعال اور ارادہ کے جو قلوب میں جاری ہیں۔ میں نے کہا کیا مطلب ہے اس حدیث کا کہ بندہ کا قلب اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ہے کہ جس طرح چاہتا ہے اس کو پلٹ دیتا ہے فرمایا ہاں یہی مراد ہے۔ تب مجھے حرکات قلب اور ان کے تغیرات کے دھیان سے بڑا خوف و لرزہ پیدا ہوا اور مجھے علم ہوا کہ تمامی سعادت و خوش حالی کا اور ہر قسم کی شقاوت و بد حالی کا مدار ان ہی حرکات قلب پر ہے جو خیالات بن کر دل میں پیدا ہوتے اور محرک عمل بنتے رہتے ہیں، دعا و سوال ہے اللہ سے جس کے ہاتھ میں ہمارے قلوب اور جس کے تحت قہر و حکومت ہمارے تمامی معاملات ہیں کہ ہمارے دلوں کو اپنے پسندیدہ افعال میں حرکت دے اور ان میں اعمال حسنہ کی تحریک ڈالے۔ حضرت ممدوح نے فرمایا پھر ان نیک اور بد حرکات قلبیہ کے ثمرات کی عمر سات دن ہنے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ حرکت سے حق تعالیٰ کی جو مراد ہوتی ہے یا تو



فوراً ہی بندہ سے صادر ہو جاتی ہے۔ یا تھوڑی دیر بعد یا اور کچھ تاخیر سے جس کی انتہا سات دن ہیں۔ چنانچہ ایسا ہوتا ہے کہ بندہ ایک کام آج کر رہا ہے حالانکہ دل میں اس کی حرکت ایک یا دو دن پہلے پیدا ہوئی تھی مگر حرکت اور عمل میں سات دن سے زیادہ کا وقفہ نہ ہو گا، اس کی مثال نباتات کی سی ہے کہ باوجودیکہ سب کا ذریعہ ایک ہے مگر کوئی چیز بیج ڈالنے سے ایک دن بعد اُگتی ہے، اور کوئی اس سے بھی قبل، اور کوئی اس کے بعد۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ خواطر کا مدار قلب میں ارادہ الہی پر ہے تو اب یہ سمجھو کہ انسان کی دو حالتیں ہیں حالت نوم اور حالت بیداری۔ حالت بیداری میں تو ذات اصل ہے اور روح اس کی تابع۔ اور ذات کا حکم ہے حقیقت سے جہل اور اشیاء کی ناواقفیت۔ لہذا بندہ کے قلب پر بحالت بیداری مثلاً حج کا خیال گزرا تو فقط حج ہی کا گزرے گا کوئی زائد امر نہ آئے گا۔ یا مثلاً آسمان یا جنت یا دوزخ کا خیال آیا تو فقط ان چیزوں کا شعور آئے گا نہ آسمان پر چڑھنا یا جنت کی سیر، مگر حالت نوم میں حواس معطل ہو جاتے ہیں اور اعضاء کو سکون و آرام ملتا ہے اور فعل الہی قلب میں ہر وقت جاری ہے کہ نہ جاگنے میں بند ہو جاتا ہے نہ سونے میں لہذا اب جو قلب پر اشیاء مذکورہ میں سے کسی شے کا خیال گزرے گا تو روح اس کی طرف متوجہ ہوگی۔ کیونکہ ذات کا حکم منقطع ہو چکا ہے اور روح فطری طور پر ہر شے سے واقف پیدا کی گئی ہے لہذا توجہ کرتے ہی اس کو ایسا ادراک کر لیتی ہے گویا آنکھ سے دیکھ لیا۔ پس اگر خواب میں اپنے آپ کو دیکھا کہ مثلاً آسمانوں کے اوپر ہے یا حج میں ہے یا کسی خاص جگہ پر ہے تو اس کی حقیقت یہی ہے کہ قلب پر آسمان یا حج کا خیال گزرا اور روح نے متوجہ ہو کر آسمان اور حج کی حقیقت تک رسائی پائی اور نظر آیا کہ آسمان پر ہوں یا حج کر رہا ہوں، غرض ادراک تو خواطر اور ادراک دونوں میں ہوتا ہے۔ مگر فرق اتنا ہے کہ ادراک سے پہلے اگر خیالات کا قلب پر ورود ہوا ہے تب تو اضطراب احلام ہیں (جن کو پریشان خیالات کہتے ہیں)، اور ان کی کچھ تعبیر نہیں ہوتی۔ اور اگر خیالات کی طرف سے کوئی تحریک نہیں ہوئی بلکہ ذات یا روح کی طرف سے ابتداء توجہ واقع ہوئی ہے تو وہ خواب ہے اور اس کی بیس قسمیں ہیں جن کا بیان مفصل کیا جا چکا ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب میں نظر آنے کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن میں تعبیر کی ضرورت نہیں، اور وہ یہ ہے کہ ذات محمدی کی رویت ہو یعنی لعینہ وہ ذات مسطرہ نظر آوے جس کا حضرات صحابہ نے آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا۔ پھر اس کی بھی دو صورتیں ہیں کہ خواب دیکھنے والا اگر اہل فتح اور عارف ہوتا ہے تو عین ذات محمدی کو دیکھتا ہے (کہ آپ دنیوی حیات کی طرح اپنے مقام رفیع میں تشریف فرما ہیں) اور اگر اہل فتح نہیں تو کبھی تو اس کو بھی عین ذات کی رویت نصیب ہو جاتی ہے ورنہ اکثر اسکو عین ذات کی نہیں



بلکہ صورت ذات کی رویت ہوتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ذات سے ایک نور جیدا ہو کر سارے عالم میں  
 لبریز ہو گیا ہے۔ اور اس نور میں آپ کی صورت اس طرح منقسم ہوئی ہے جیسے آئینہ کے سامنے کوئی کھڑا  
 ہوا ہو تو وہ خود آئینہ کے اندر نہیں آیا بلکہ اس کی صورت اس میں اُتر آئی ہے اور جتنے آدمی بھی آئینہ پر  
 نظر ڈالیں گے وہ صورت بے وقت سب کو نظر آئے گی) یہی وجہ ہے کہ بے شمار مخلوق ایک ہی وقت میں مختلف  
 جگہوں پر خوابوں میں آپ کی زیارت سے مشرف ہوتی ہے کہ کوئی مشرق میں ہے اور کوئی مغرب میں اور ایک  
 شمال میں ہے تو دوسرا جنوب میں (مگر سارا عالم چونکہ ذات محمدی کا آئینہ بنا ہوا ہے اس لئے اپنے اپنے  
 مقام پر بیٹھے ہوئے سب نے صورت مبارکہ کو دیکھ لیا نہ یہ کہ آپ کی ذات مظہرہ بے وقت اماکن مختلفہ میں  
 سب کے پاس پہنچ گئی) پس صاحبِ فتح جب اس صورت مبارکہ کو دیکھتا ہے (خواہ حالت بیداری میں ہو یا نجات  
 خواب) تو اس کی بصیرت پیچھے پیچھے چلتی (اور چشمِ قلب کو جس نے صورت محمدیہ دیکھی ہے قوت اور مدد پہنچا کر)  
 نورِ عالم کو بھارتی ہوئی ذات مبارکہ تک پہنچتی (اور عین ذات کے مشاہدہ سے فیضاب ہوتی) ہے۔ اور جو  
 شخص بصیرت سے محروم ہے اگر حق تعالیٰ فضل و احسان فرمائے تو کبھی وہ بھی عین ذات کا مشاہدہ کر لیتا  
 ہے کہ ذات مظہرہ اس مقام پر خود تشریف لے آتی ہے۔ کیونکہ اپنے متعلق اس کی کمال محبت اور سچے تعلق  
 کو معلوم فرمالتی ہے غرض یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی پر موقوف ہے کہ جس کو چاہیں اپنی ذات مظہرہ  
 کا نظارہ کرا دیں اور جس کو چاہیں صرف اپنی صورت شریفہ دکھائیں۔ نیز آپ کی صورت اصدیہ کا ظہور دوسری  
 صورتوں میں بھی ہوا کرتا ہے کہ تمامی انبیاء علیہم السلام اور آپ کی امت مرحومہ کے تمامی اولیاء کی صورتیں  
 آپ کی صورت شریفہ کے مظاہر ہیں (کہ اپنے زمانہ کا ہر نبی اس لحاظ سے کہ آپ ہی کے انوار و فیضانِ روحی  
 سے مستفیض ہو کر بنی بنا ہے اور آپ کی امت کا ہر ولی اس اعتبار سے کہ آپ ہی کی روح مع الجسد کی تعلیم و  
 تربیت سے ولی بنا ہے) معنوی لحاظ سے گویا ذات محمدی کی صورت مثالیہ ہے) اور یہی سبب ہے کہ اکثر مریدوں  
 کو خواب میں آپ کی زیارت اپنے شیخ کی صورت میں ہوتی ہے۔ حضراتِ انبیاء کی تعداد کے متعلق صحیح تو یہی ہے کہ کسی کو صحیح  
 معلوم نہیں مگر بعض کا قول ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار ہیں۔ اور اتنی ہی تعداد اولیاء امت (بلکہ صرف حضراتِ صحابہ کی بھی  
 جنہوں نے بلا واسطہ جسمِ اطہر سے استفادہ فرما کر انبیاء بنی اسرائیل کا سادہ درجہ حاصل کیا۔ اور قیامت تک  
 بعد کے آنے والے اولیاء میں ہر ولی انہیں حضرات میں کسی ایک کے رنگ پر آیا اور سب گویا صحابہ ہی کی صورتوں  
 کی صورت مثالیہ بنتے رہے) لہذا صورت محمدیہ کے ظہور کے لئے دنیا میں دو لاکھ اڑتالیس ہزار صورتیں ہوئیں (کہ  
 جس طرح کسی کے پاس دو لاکھ اڑتالیس ہزار لباس ہوں کہ جس لباس کو چاہے پہن لے سب اسی کے ہیں  
 اسی طرح ذات محمدی کو اختیار ہے کہ جس بنی یا جس ولی کی صورت میں چاہے مقصور ہو جائے کہ سب آپ



ہی کے روحانی بچے ہیں اور سب کی صورتیں آپ ہی کے ثمرات فیضان و تاسخ جو ذکر کم ہیں) چنانچہ جامع کتاب کہتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے شیخ (عبدالعزیز) کی صورت میں دیکھا اور گود میں لے کر چاہا کہ آپ کو اپنے اندر داخل کر لوں۔ صبح کو حضرت شیخ سے تعبیر پوچھی تو فرمایا کہ یک دفعہ نہیں ہو سکتا۔ تھوڑا تھوڑا کر کے تدریج ہو گا۔ مطلب یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار و تجلیات خاصہ کا اپنے اندر لینا تدریجی طور پر نصیب ہوا کرتا ہے۔ واللہ اعلم۔

دوسری قسم وہ ہے جس میں تعبیر کی حاجت ہوتی ہے۔ اور تعبیر اس میں نفس خواب کے اندر نہیں ہوتی کہ جس نے خواب میں آنحضرت کو دیکھا درحقیقت دیکھا تو آپ ہی کو ہے کہ شیطان آپ کی صورت نہیں لے سکتا لہذا خواب محتاج تاویل نہیں) البتہ ظلمت کے درجات میں تعبیر ہوگی کہ جس درجہ کی دیکھنے والے کے قلب میں ظلمت ہے اسی درجہ پر صورت مبارکہ میں تغیر نظر آئے گا۔ جیسے بعض شیشوں کی خاصیت ہے کوئی صورت لمبوتری دکھاتا ہے اور کوئی شیشہ چوڑی یا موٹی دکھاتا ہے۔ اصل شیشہ میں صورت تو وہی آتی جو اصل شے کی تھی مگر شیشہ کی مادیت نے اس کو بدل دیا ہے) اور ظلمت کے درجات جو اس میں واقع ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ مثلاً کسی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ اس کو دنیا کمانے کی ترغیب دے رہے ہیں یہ علامت ہے کہ خواب دیکھنے والے کی ذات میں ظلمت پہلے درجہ یعنی سہو مکروہ کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذات محمدی کی طبعی شان تو حقیقیہ کے راستہ کی رغبت دلانا ہے نہ کہ دنیا فانی کی اور جس نے آپ کو خواب میں دیکھا کہ اس کو مال و زر عطا فرما رہے ہیں، تو اس کی ذات میں ظلمت دوسرے درجہ یعنی سہو حرام کی ہے۔ اور یہاں ظلمت کے قوی ہونے کا سبب یہ ہے کہ آپ کا فانی چیز عطا فرمانا اور اس پر فیض دلانا اس کی ترغیب دینے سے بڑھا ہوا ہے اور جس نے مثلاً آپ کو کسی غصے جگہ پر دیکھا تو اس کی ظلمت ذات تیسرے درجہ یعنی عمدہ مکروہ کی ہے۔ اور جس نے آپ کو جوان بچہ کی شکل میں دیکھا، اس کی ظلمت چوتھے درجہ یعنی عمدہ حرام کی ہے اور جس نے بڑی عمر والا دیکھا مگر بغیر داڑھی کے، اس کی ظلمت پانچویں درجہ یعنی عقیدہ خفیہ میں جہل بسیط کی ہے اور جس نے آپ کو سیاہ نام دیکھا، اس کی ظلمت چھٹے درجہ یعنی عقیدہ میں جہل مرکب کی ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ خواب اور اس کے عجائبات کی پوری تحقیق فن تعبیر کی پوری واقفیت پر موقوف ہے اور فن تعبیر ایک مخفی خدا داد علم ہے جس کا راز میں رکھنا ضروری ہے۔ اور برسوں یہ قصہ رہا کہ میں فن تعبیر کے متعلق حضرت ممدوح سے بار بار استفسار کرتا رہا لیکن حضرت یہی جواب دیتے رہے کہ جو بھی تمہارا دل چاہے مجھ سے دریافت کرو مگر فن تعبیر کی بابت کچھ نہ دریافت کرنا کہ راز ہائے مخفیہ میں سے ہے۔ اور اصل یہ ہے کہ علم تعبیر سیکھنے اور پڑھنے سے نہیں آتا کیونکہ اس میں ضرورت ہے خواب دیکھنے والے کے بیرونی حالات سے واقف ہونے کی۔



کہ وہ شہر میں رہتا ہے یا گاؤں میں اور اہل علم میں سے ہے یا عوام میں سے اور اس کا پیشہ کیا ہے مثلاً کاشتکار ہے یا سوداگر ہے یا کاریگر اور تو نگر و خوش حال ہے یا میکین و مفلوک الحال وغیرہ وغیرہ۔

پھر اس کے باطنی حالات سے بھی آگاہ ہونے کی ضرورت ہے کہ روح نے اس کی ذات کو اپنے تمامی اجزاء عطا کر دیئے جن کی تعداد تین سو چھیاسٹھ ہے یا بعض اجزاء دئے اور بعض نہیں دیئے۔ اور اگر بعض دیئے ہیں تو آیا وہ اقل ہیں یا اکثر۔ اور یہ کہ خواب دیکھنے والے کے افکار و تخیلات کس امر میں دوڑتے رہتے وغیرہ وغیرہ۔ حتیٰ کہ فرض کرو فن تعبیر کے عالم ماہر کے پاس اگر ستوا آدمی آویں اور ہر ایک یہی کہے کہ میں نے خواب میں اپنے آپ کو شہید دیکھا ہے تو ربا و جو یکہ سب کی خواب ایک ہے مگر ہر ایک کی حسب تعبیر دے گا کہ ایک کی تعبیر دوسرے سے میل نہ کھائے گی۔ اور اس کی وجہ وہی ہے کہ تعبیر موقوف ہے ظاہری و باطنی حالات پر اور ان میں دو شخص بھی بالکل یکساں اور متفق الحال نہ نکلیں گے۔

(۷) میں نے حضرت ممدوح سے دریافت کیا کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ہذا احسان یہ ہے کہ اللہ کی عبادت کرے گویا اس کو دیکھ رہا ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا فرض کرو ایک شخص کسی میدان میں آکر جہاں کوئی بھی نظر نہ آتا ہو کسی سخی کا وہاں موجود نہیں نام لے کر پکارے کہ اے میرے سردار فلاں مجھے روٹی دے دے، مجھے کپڑے دیدے، میری مصیبت دور کر دے، مجھے ضرورت ہے ٹوپی کی، مجھے حاجت ہے رہنے کے لئے گھر کی، تو ظاہر ہے اس کو سائل اور درخواست کرنے والا نہیں بلکہ کھیل اور مذاق کرنے والا کہا جائے گا۔ اور جو بھی اس کو دیکھے گا وہ ہنسے گا اور اس کو احمق بتائے گا۔ اور اگر اس کا یہ خیال ہو کہ بس یہ کھیل کر لینا ہی درخواست کرنا ہے تو یہ دوسری حماقت اور گمراہی پر گمراہی ہے۔ ہاں اگر اس کا یہ رنگ ہو کہ اس سخی کے سامنے آکھڑا ہو گا اور اب زبان سے سوال کرے گا تو ظاہر ہے کہ اس کا بدن اس کے سامنے جھک جائے گا اس کے اعضا میں تذلل کی شان ہوگی اس کے حضور جہاں تک بھی ہو سکے گا خشوع و خضوع کرتا ہوا زمین پر پہنچ جائے گا اور عاجزی کی کوئی بات ایسی نہ ہوگی جس کو ظاہر نہ کر دے۔ اس وقت بے شک سخی کی نگاہ کرم اس کی طرف جھکے گی اور اس کو اس کے حال پر ترس آئے گا اور جو کچھ بھی اسکی درخواست ہے منظور فرما کر منہ مانگا اس کو عطا فرمائے گا۔ دیکھنے والا تو سمجھے گا کہ اس کو جو کچھ بھی ملا ہے وہ اس کے زبانی سوال کرنے پر ملا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ اس کے باطنی خشوع و خضوع پر ملا ہے جو اس کے عضو عضو سے ظاہر ہو رہا تھا۔ غرض محال ہے کہ اس وقت اس سائل کے دل میں اس سخی کے سوا کسی دوسرے کا دھیان برائے نام بھی باقی رہے جس ان دونوں حالتوں کے فرق کی طرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا کہ جس نے حضور کی شان پر اللہ کی عبادت کی اس نے احسان کیا۔ یعنی اپنی عبادت کو حسین بنایا اور جس نے البیان کیا یعنی اپنی عبادت



غفلت و بے توجہی سے پورا کیا تو اس کی عبادت میں مطلق حسن نہ آیا اور حضور و تعظیم کی علامت یہ ہے کہ عبادت کرنے والے کے باطن پر نظر ڈالی جائے۔ اگر وہ عبادت کے وقت دنیوی معاملات میں مشغول اور امور دنیویہ سے معمور ہے تب تو پہلے شخص کی طرح ہے، اور اگر وہ غیر اللہ سے خالی ہے اور صرف اللہ کی طرف متوجہ ہے تو دوسرے شخص کی مثل ہے۔ میں نے عرض کیا کہ بخاری نے تو اہل ایمان بیان کیا ہے اور پھر اسلام اور پھر صفت احسان۔ اور مسلم نے پہلے اسلام بیان کیا ہے اور پھر ایمان اور بعدہ احسان فرمایا میرے نزدیک بخاری کا فعل مستحسن ہے کیونکہ اسلام گویا ایمان کے کپڑے ہیں لہذا ایمان پہلے ہے اسلام سے (کہ بدن کا وجود پہلے ہوتا ہے کپڑوں کی تیاری سے) میں نے کہا کہ قرآن مجید میں ہے قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا۔ قُلْ لَّكُمْ تَوَكُّلٌ وَلَٰكِنْ تَقُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَكِنَّا يَدْخُلُ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ۔

اہل لہجہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ اے محمد ان سے کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے۔ بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے۔ کیونکہ ایمان ابھی تک تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام مقدم ہے ایمان سے۔ فرمایا بخاری گفتگو حقیقی اسلام کے بارے میں ہے جو حضرت جبریلؑ والی حدیث میں مذکور ہوا کہ وہ گویا ایمان کا لباس ہے۔ اور بخاری و مسلم کا اختلاف تقدیم و تاخیر بھی اسی میں ہے رہا محض زبان سے اقرار کرنا اور اسلام لسانی (حس) کا آیت میں تذکرہ ہے، تو وہ تو ساقط و بیکار محض ہے کہ اس سے اس کو کچھ بھی حاصل نہیں۔ اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے ایک شخص فوجی سپاہیوں کو دیکھے کہ بند دتیں چلا رہے اور گولیاں برس رہے ہیں۔ نشانہ کی طرف تال تال تانے ہوئے کھڑے اور آنکھ بھینچ کر تاک لگا رہے ہیں کہ کہیں نشانہ چوک نہ جائے۔ ان کی دیکھا دیکھی یہ شخص بھی اُن کی نقل و تارنے لگے کہ ایک ہاتھ آگے بڑھا کر گریا۔ اس کو بندوق قرار دے اور دوسرے کو سمیٹ کر اس کی جڑ میں لے آئے (گویا گھوڑا داب کر گولی چلا رہا ہے) اور آنکھ کو کمان کی طرح بنائے۔ (جیسا شہرت باندھتے وقت بند دتچی کیا کرتا ہے) اور پھر دیکھنے لگے کہ نشانہ پر لگتا ہے یا نہیں۔ سہلا اس نقائی سے کیا نفع جبکہ اس کے پاس بندوق ہی نہیں۔ یہی مثال ہے اس شخص کی جو صرف زبان سے اسلام لایا کہ نماز پڑھتا ہے مگر اس کا اندرون کہتا ہے کہ تیری نماز کچھ نہیں اور روزہ رکھتا ہے مگر اس کا باطن کہتا ہے کہ روزہ کوئی چیز نہیں۔ غرض زکوٰۃ و حج و جہاد سب کچھ کرتا ہے مگر اس کا دل اندر سے شہادت دے رہا ہے کہ محض صورتہ کیا ہے۔ اس کا ظاہر ایک میدان میں ہے اور باطن دوسرے میدان میں۔ جیسے وہ نقال خوب سمجھتا ہے کہ میرے ہاتھ میں بندوق نہیں بلکہ محض ایک مذاق اور مخول کر رہا ہوں اسی طرح منافقین بھی خوب سمجھتے ہیں کہ اسلام کی کوئی بات بھی ان کے ہاتھ میں نہیں۔ کیسی سچی مثال بیان فرمائی حضرت مدوح نے کہ حق تعالیٰ نے منافقین کا یہی حال ظاہر فرمایا ہے وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شُيَاطِينِهِمْ



قَالَ لَوْ اَنَّكُمْ اِنَّمَا كُنْتُمْ مُسْتَكَفِرُونَ ط کہ جب یہ لوگ اپنے شیطانوں (اور مشرک و کافر دوستوں) سے غلط کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ہی ساتھ ہیں (رہا نماز روزہ سو) اس میں تو ہم صرف مذاق اور محول کر رہے ہیں۔ اس تمثیل میں ذکر ان کے نماز روزہ کو محول سے تشبیہ دی) حق تعالیٰ نے ان کا خُبث باطن واضح فرمایا اور اندرونی گندگی کھول دی شیخ کی اس تقریر سے پہلے میرا خیال ہوا کرتا تھا کہ منافقوں کا نماز روزہ حج زکوٰۃ اور جہاد وغیرہ ہے تو قلب اور باطن سے مگر اس کا قبول نہ ہونا ان کے کفر کی وجہ سے ہے۔ لیکن اس مثال سے کھل گیا کہ درحقیقت ان کا نماز روزہ ایک مذاق و محول ہے (جو مستقل خیانت اور گندگی طبیعت ہے) اور یہی وجہ ہے کہ وہ کفار سے بھی زیادہ خبیث اور خلیث ہیں (کہ کفار نے اسلام اگر قبول نہیں کیا تو اس کا مذاق بھی نہیں اُڑایا) واللہ اعلم۔

(۸) میں نے حضرت ممدوح سے اس حدیث کا مطلب دریافت کیا جس کو ترمذی و بخاری اور امام احمد بن حنبل نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے اپنی اُمت کے گناہوں پر نظر ڈالی تو اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں پایا کہ کسی شخص کو (قرآن مجید کی) کوئی آیت دی گئی اور وہ اس کو بھلا بیٹھا۔ آپ نے فرمایا یہ حدیث تو صحیح ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نور اس میں موجود ہے مگر ایسے کے بارہ میں نہیں جس نے کوئی آیت یاد کی اور پھر اس کے الفاظ کو بھول گیا اگرچہ اس کے مضمون پر عمل کرتا رہا۔ بلکہ اس کے بارہ میں ہے جس کو قرآن پہنچا مگر اس نے بے رخی برتی اور اس کے فورے اپنے آپ کو محرم رکھا اور نور کے بدلے اس کی ضد یعنی ظلمت کو اختیار کیا کہ جو امر حق آیت قرآنی میں مضمون تھا اس سے منہ پھیر کر ظلمت کا اتباع کیا جو کہ دنیا و آخرت میں اللہ سے دور کرنے والی چیز ہے۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں منافقین کا حال تھا۔ پس یہ حدیث انہیں کے بارہ میں وارد ہوئی اور انہیں کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ کیونکہ ظاہری اعتبار سے وہ بھی آنحضرتؐ کی خاص اُمت یعنی اُمت اجابت میں داخل ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اُمت اجابت میں نفاق اور کفر باطنی سے پرہیز کر کوئی گناہ نہیں۔ میں نے دریافت کیا کہ وہ نور قرآن کیا ہے جس کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا (کہ منافقین اس سے محروم رہے) فرمایا قرآن میں تین نور ہیں۔ ایک اللہ کی طرف رہبری کا نور۔ دوئم تعمیل احکام کا نور اور تیسرا ممنوعات سے پرہیز کرنے کا نور۔ پس جو شخص قرآن مجید سنے اور ان تینوں انوار سے اپنے آپ کو محرم رکھے، وہ اس حدیث سے مراد ہے نیز آپ نے فرمایا آیت صادق آتی ہے الفاظ پر بھی جن کے ساتھ حفظ اور تلاوت کا تعلق ہے اور معنی پر بھی صادق آتی ہے جس کے ساتھ عمل اور امتثال کا تعلق ہے اور یہ دوسرا مصداق عین انوار ثلاثہ ہیں اور وہی حدیث میں مراد ہیں نیز فرمایا کہ آیت قرآن مومن کے پاس اللہ کی طرف سے گویا چمک (اور سرکاری نوٹ) ہے جس میں اس کا حق درج ہے۔



اور حقدار اپنے چک کو کھویا نہیں کرتا۔ اگر اس کو کھو دیا اور کوتاہی کی تو اس کا حق ضائع ہو گیا۔ اسی طرح آیت میں مومن کا حق ہے۔ اگر اس کو محفوظ رکھا اور آیت کے حکم پر عمل کیا تو عند اللہ اس کا حق ثابت ہوا اور دخول جنت کا مستحق بنا اور اگر اس میں کوتاہی کی اور استہزاء و تحقیر کی صورت میں اس سے بے رحمی برتی تو وہ اس بڑے گناہ کا مرتکب ہوا جس کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے۔

(۹) میں نے حضرت ممدوح سے اس حدیث کی بابت سوال کیا کہ جنت اور دوزخ میں باہم مناظرہ ہوا تو دوزخ کہنے لگی میں مامور ہوں متکبر لوگوں پر دکر فرعون و شداد جیسے سلاطین و صاحبانِ سطوت کی میزبانی کروں گی جنت بولی میرا کیا پوچھنا ہے میرے اندر تو بجز ضعفا اور ساکین کے کوئی بھی داخل نہ ہوگا۔

میں نے عرض کیا کہ جنت تو اپنی تقریر میں گویا خود اقرار کر لیا کہ فلیہ دوزخ کو ہے کہ وہ مخصوص ہے بڑے لوگوں کے لئے۔ اور یہ صرف ضعیف الحال لوگوں کے لئے ہے فرمایا عالم آخرت میں مسکن کا حال اس کے ساکنین کے احوال کا تابع ہوگا کہ اگر مکان کے مکین کبر و نخوت اور خود پسندی والے ہوں گے تو مکین کے کچھ اوصاف اس مکان میں بھی سراست کریں گے اور اگر ساکنین اہل تواضع اور منکسر المزاج فراء ہوں گے تو ان کے کچھ اوصاف اس مسکن میں بھی سراست کریں گے۔ اور ظاہر ہے کہ جہنم میں جانے والے اہل تکبر و جبارین ہیں۔ اور جنت میں جانے والے اہل تواضع و انکسار ہیں لہذا جنت پر اس میں رہنے والوں کے اوصاف ظاہر ہوئے۔ اور جنت پر اس میں رہنے والوں کے اوصاف نمودار ہوئے پس ظاہری الفاظ میں تو مناظرہ ہمدوزخ اور جنت کا مگر مقصود ہے اظہار دوتوں کے یاسندوں کی حالت کا۔ لہذا دوزخ نے اپنی دلیل وہ بیان کی جس میں شیخی و انانیت اور ڈینگ مارنا تھا۔ اور جنت نے اپنی وہ دلیل پیش کی جس میں عجز و انکسار و تواضع ہے اگر بغور دیکھو تو دوزخ کے مقابلہ پر غلبہ درحقیقت جنت ہی کی دلیل کو ہوا کہ مناظرہ کا حاصل یہ ہے گویا جنت نے کہا میرے اندر کوئی نہ آسکے گا بجز ان کے جو اللہ کے مخلص بندے ہیں صاحبان تواضع ہیں خشوع و خضوع والے ہیں، اور اپنے رب کے عارف ہیں، اور گویا دوزخ نے کہا میرے اندر کوئی نہ آسکے گا بجز ان کے جو متکبر ہیں، جابر و ظالم ہیں، اپنے رب سے ناواقف و جاہل ہیں، اس کے آستانہ سے مردود اور بارگاہِ رحمت سے دور پھینکے ہوئے ہیں، خلاصہ یہ ہے گویا جنت نے کہا کہ میرے اندر صرف محبوبین الہی داخل ہوں گے۔ اور گویا دوزخ نے کہا کہ میرے اندر صرف دشمنانِ خدا داخل ہوں گے، ماشاء اللہ کتنا پیارا جواب ہے کہ یہ اشکال ریعنی دوزخ کی جیت کا، بھی دفع ہو گیا اور ساتھ ہی ایک اور اشکال رفع ہو گیا کہ کوئی کہہ سکتا ہے جنت نے (مناظرہ میں دلیل پیش کرتے وقت) یہ کیوں نہ کہا کہ میرے اندر اللہ کے انبیاء و رسل اور ملائکہ و مومنین داخل ہوں گے کہ اس طرح کہنے سے اس کی جیت ہوتی دوزخ پر اور کمزوری کے گھرے



ہوئے الفاظ کیوں برتے کہ میرا کیا پوچھتے ہو میرے اندر تو ضعیف، اور نیچے درجہ والے ہی جائیں گے جس سے غلبہ مترشح ہو جہنم کا۔ جنت کو چاہیے تھا کہ بہترین مخلوق و افضل ترین حضرات یعنی انبیاء و رسل کا ذکر کرتی۔ کہ میرے اندر اشرف الناس داخل ہوں گے۔ یہ اشکال رفع اس طرح ہوا کہ جنت کا مقصود تو یہی تھا اور گویا اس نے یہی کہا بھی۔ مگر عاجزانہ و خاشعانہ کہا کہ بہترین حضرات کا ذکر کرنے میں پھر وہی تفاخر و بڑائی کا اظہار تھا، اور یہ محض لغرض اظہار مسکنت کیا کہ اس مکان کا ہر ملک تمام مخلوقات میں اپنے سے زیادہ کسی کو محتاج دیکھتا ہی نہیں۔ لہذا اپنے آپ کو ضعیف ترین اور سب سے زیادہ اپنے رب کا فقر و محتاج سمجھنے لگے۔

(۱۰) بزمانہ ابتداء وحی حضرت جبریل علیہ السلام کے آنے میں تاخیر ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت ہوئی کہ آپ لقاء رب کی شوق میں پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جاتے اور اپنے آپ کو نیچے گرانے کا ارادہ فرمایا کرتے تھے۔ فوراً حضرت جبریلؑ نظر آتے اور عرض کیا کرتے کہ آپ تو پیغمبر ہیں پروردگار عالم کے (اور فراموش نہ رہتے) انجام دینے کے لئے بقا و حیات کی ضرورت ہے) یہ سنکر آپ رُک جایا کرتے تھے، میں نے دریافت کیا کہ اپنے آپ کو پہاڑ سے گرانا خودکشی ہے جو کہ کبیرہ گناہ ہے اور اس فعل کا قصد اور لپکا ارادہ معصیت ہے اور انبیاء علیہم السلام خصوصاً سید الوجود صلی اللہ علیہ وسلم لعبت سے قبل اور بعد ہر زمانہ میں تمامی معصیتوں سے معصوم ہوا کرتے ہیں فرمایا ایک شخص کا یہ واقعہ میرے علم میں ہے کہ اس نے بزمانہ ابتداء سلوک ایک دن کے اندر اپنے آپ کو دروازہ مکان کے کڑے سے نوٹے مرتبہ زمین پر پھینکا اور اس کا کچھ نہ بگڑا۔ ایسا رمل جیسے انسان بچھونے پر لیٹ جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدائی حالتوں میں روح کو ذات پر غلبہ ہوا کرتا ہے۔ اور روح کے لئے ساری کائنات بدرجہ مساوی ہے کہ وہ ہوا میں چار زانو بیٹھتا ہے جیسا زمین پر بیٹھتا ہے اور ہوا میں چپ لیٹ کر سوتا ہے جیسے آدمی اپنے بستر پر سوتا ہے۔ بے ضرر ہونے میں اُس کے لئے پتھر اور ریشم اور پانی، اُون سب برابر ہیں۔ لہذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اگر اپنے آپ کو پہاڑ سے گرا بھی دیتے تو اس میں فرقہ برابر تکلیف و مصرت نہ ہوتی چہ جائیکہ ہلاکت۔ لہذا اس کے عزم میں آپ پر کوئی بھی گرفت نہیں۔ شیخ نے بالکل صحیح فرمایا۔ اہل حال کو ہم دیکھتے ہیں کہ جب اُن پر غلبہ شوق) میں وجد طاری ہوتا ہے تو دیوار پر اپنا سر دے دے مارتے ہیں اور ان کے سر میں گھرنٹ بھی نہیں آتی۔ وہ شخص جنھوں نے نوے مرتبہ اپنے آپ کو گرا دیا وہ خود حضرت ممدوح ہی تھے حضرت نے یہ بھی فرمایا کہ یہ حضرات خوب جانتے ہیں کہ اپنے آپ کو گرانے میں کوئی مصرت بھی نہیں۔ نیز جو اضطراب اس کا محرک ہوتا ہے وہ بھی رفع نہیں ہوتا۔ صرف ایک طبع اقتضا ہوتا ہے جو ایسا کرتا ہے جیسے وہ شخص کہ کھونٹا گاڑتے وقت پوٹ مارے تو کچھ درد لینے کی خاطر حلق سے ایک آواز نکالا کرتا ہے جو قریب قریب آکا کے ہوتی ہے حالانکہ جانتا ہے



کہ اس سے کوئی نفع نہیں مگر وہ اس کا طبعی اقتضا ہوا کرتا ہے۔

(۱۱) حدیث میں آیا ہے کہ محشر میں حق تعالیٰ مومنین کے سامنے ایسی صورت میں آئے گا کہ وہ اس کو پہچانیں گے نہیں۔ پس اس سے پناہ چاہیں گے اور کہیں گے کہ ہم تو اپنی جگہ سے نہ ہٹیں گے جب تک ہمارا رب نہ آئے اور وہ جب آئے گا تو ہم اسے پہچان لیں گے اس کے بعد حق تعالیٰ ایسی صورت میں آئے گا کہ وہ اس کو پہچان لیں گے اور فوراً سجدہ میں گر جائیں گے۔ میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ پہلی اور دوسری صورت سے کیا مراد ہے۔ کیونکہ ابن العربی حاکمی نے امام فخر الدین کو خط لکھا تو اس میں ذکر کیا ہے کہ اس کی حقیقت بجز اولیاء اللہ کے کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ آپ نے فرمایا کہ صورت سے مراد حالت ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کی دو حالتیں ہوں گی۔ پہلی حالت میں مومنین اس کو نہ پہچانیں گے اور دوسری حالت میں اس کو پہچان لیں گے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دوست جب اپنے دوست سے باتیں کیا کرتا ہے تو اس کے منہ سے نرمی و یگانگت اور شفقت و تعلقات باہمی کے انوار نکلا کرتے ہیں۔ اور جب کوئی اپنے دشمن سے بات کرتا ہے تو ان انوار میں سے کچھ بھی نہیں نکلتا، بلکہ ہر لفظ روکھا اور بے تعلقی کا نکلتا ہے چنانچہ ہر شخص کی عادت ہے کہ دوست سے گفتگو کرنے میں لہجہ نرم ہوگا پیار کا طرز ہوگا۔ انبساط و بشاشت سے لفظ لفظ لبریز ہوگا۔ اور دشمن سے بات کرنے میں اتقباض ہوگا۔ ترشروئی ہوگی۔ اور گرفتگی و رکھاوٹ لفظ لفظ میں بھری ہوگی۔ جب یہ سمجھ میں آگیا تو اب سمجھو کہ پہلی حالت میں تو حق تعالیٰ نے خطاب فرمایا تمامی اُمت کو کہ ان میں اس کے دوست یعنی مومنین اور دشمن یعنی منافقین سب شامل تھے، اس لئے وہ انوار برآمد نہ ہوئے جن کو مومنین اپنے رب کے کلام میں پایا کرتے تھے۔ اور ان انوار سے ان کو واقفیت اس لئے تھی کہ ان کی قات اور روح میں وہ انوار موجود تھے اور حق تعالیٰ نے عالم دنیا میں ان کو نصیب فرما رکھے تھے۔ لہذا جب انہوں نے وہ خطاب سنا جو انوارِ محبت سے خالی تھا، تو اُغوٹ پڑ بھی اور کہا کہ تو ہمارا رب نہیں ہے کہ ہمارے اور رب کے درمیان تو ایک خاص علامت ہے (جو کہ اس کی شناخت کا ذریعہ ہے) یعنی وہی انوار جو اس کے خطاب میں ہوا کرتے ہیں۔ تب حق تعالیٰ نے خطاب کا مقصود صرف مومنین کو بنایا اور وہ انوار جاری فرما دیئے لہذا وہ ان کو محسوس کرتے ہی سجدہ میں گر پڑے۔ یہ تھی وہ دوسری حالت کہ کلام الہی میں انوارِ محبت پا کر اس کو پہچان لیا۔ پہلی حالت میں انوارِ محبت اس لئے جاری نہیں فرمائے کہ مخاطبیت میں دشمن یعنی منافقین بھی شامل تھے۔ اور دوسری حالت میں دشمنوں پر پردہ حوال کر خطاب کو دوستوں کے ساتھ مخصوص فرما دیا۔ لہذا کلام کے ساتھ وہ انوار نکلے جن کا وہ اپنے ظاہر و باطن میں مشاہدہ کیا کرتے تھے۔

میں نے دریافت کیا کہ جن مومنین نے پہلی حالت میں رب کو نہیں پہچانا ان سے مراد مستامی



مؤمنین ہیں یا صرف عوام؟ فرمایا صرف عوام، کہ عارفین تو کسی حالت میں بھی ناواقف نہیں رہ سکتے۔

میں نے کہا اور پہلی حالت میں جو خطاب تھا وہ سب کو تھا یا صرف عوام کو؟ فرمایا وہ بھی صرف عوام کو تھا۔  
قیامت کے دن ساری باتیں خرق عادت ہوں گی کہ ایک شخص سے حق تعالیٰ کلام فرمائے گا تو صرف اسی کو سنائی دے گا۔ دوسرا شخص کتنا ہی قریب بلکہ اپنی گود میں اس کا سر رکھے کیوں نہ سمیٹا ہو بالکل نہ سنے گا۔  
غرض جس سے کلام کرنا مقصود ہوگا بس وہی سنے گا اور دوسروں پر پردہ ڈال دیا جائے گا۔ کتنا ہی اس سنے والے کے پاس کیوں نہ کھڑا ہو۔ ماشاء اللہ شیخ کی تفسیر سے یہ شبہ کہ حق تعالیٰ کے لئے آنا اور جانا اور صورت وغیرہ کا ثبوت ہو رہا ہے، بالکل رفع ہو گیا اور عقل کے موافق تفسیر صاف ہو گئی۔ علامہ ابن العربی نے بھی یہی لکھا ہے کہ عارفین پہلی حالت میں بھی انجان نہ رہیں گے۔ یہ ناواقفیت صرف عوام مجذوبین کو ہوگی۔ واللہ اعلم۔

(۱۳) میں نے اس حدیث کی بابت دریافت کیا کہ بندہ کا قلب اللہ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہے، فرمایا کہ معنوی انگلی مراد ہے یعنی تصرف جو انگلی کے ذریعہ ہوا کرتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ بندہ کا قلب تصرفات خداوندی میں سے دو تصرف کے درمیان ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ دو تصرف سے کیا مراد ہے؟  
فرمایا کہ ایک ذات کا مقتضا اور دوسرا روح کا مقتضا کہ ذات بنی ہے مٹی سے لہذا شہوات کی طرف مائل ہوتی ہے اور روح پیدا کی گئی ہے نور سے۔ لہذا معارف اور حقائق کی طرف جھکتی ہے۔ اس لئے دونوں میں ہمیشہ تضاد و مخالفت رہتا ہے۔ میں نے کہا کہ دونوں میں غالب کون ہے؟ فرمایا کہ حرکات میں تو تصرف چلتا ہے روح کا اور اسرار میں تصرف چلتا ہے ذات کا لہذا حرکت کے لحاظ سے روح غالب رہتی ہے اور اپنے سرخلیث کے اعتبار سے ذات غالب رہتی ہے اور اسی لئے بندوں میں شکر گزار کم ہیں۔  
دونوں کی مثال چکی کے دو پاٹوں کی سی ہے کہ روح بمنزلہ اوپر کے پاٹ کے ہے، کیونکہ حرکت وہاں کرتا ہے اور ذات بمنزلہ نیچے کے پاٹ کے ہے کہ اندرونی سوزش و شورش اسی کا کام ہے اوپر کے پاٹ کی ایسی مثال ہے جیسے دیگچی کے اوپر کی چپنی کہ ظاہری طور پر چپنی اثر کرتی ہے دیگچی میں رکھ بھاپ روک کر کھانا پکاتی ہے اور باطنی درجہ میں دیگچی اثر کرتی ہے چپنی پر (کہ اندر ہی اندر اس کو تپاتی اور جھلساتی ہے)۔ میں نے عرض کیا کہ علماء نے اس کی تفسیر فرشتہ کی تحریک اور شیطان کی تحریک کی ہے فرمایا یہ دونوں تو عارضی اور تابع ہیں، اور اصل وہی ہے جو ہم نے تفسیر کی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر فاسد کے لئے خواہ پاک ہونا یا ناپاک خواطر ضروری ہیں کہ لچھے یا برے خیالات کا قلب پر ورود ہوتا ہے اور یہی خواطر نجات اور ہلاکت کا سبب ہیں۔ اور فرشتہ و شیطان دونوں تابع ہیں انہیں خواطر کے کہ اگر وہ مستحسن ہوتے ہیں تو اس کے



بیچھے فرشتہ چلتا ہے اور پسندیدہ فعل کرتا ہے۔ اور اگر خواطر بُرے ہوتے ہیں تو شیطان اُس کے پیچھے لگتا اور اپنی خواہش کے موافق کام کراتا ہے۔ کیونکہ ہر خطرہ کا تعلق ذات سے ہے کہ ذات اگر پاک صاف ہوتی ہے تو اس کے خطرات بھی پاک صاف ہوتے ہیں اور اگر ذات ناپاک (اور خیانت پسند) ہوتی ہے تو خطرات بھی گندے کتے ہیں۔ محسوسات میں اس کی مثال ایسی سمجھو جیسے سیر بھر جوئے لو اور سیر بھر چنا اور سیر بھر باقلا۔ اور علیحدہ علیحدہ ہر ایک کو پس کر ایک ایک روٹی پکا لو اور پھر کڑھائی میں رکھ کر ان کو جلاؤ۔ اب غور سے دیکھو گے تو ہر روٹی کی بھاپ دوسرے سے جدا ہوگی اور ہر ایک کا دھواں پتہ دے گا کہ میں فلاں غلہ ہوں پس خواطر کی شان ذات کے ساتھ وہی ہے جو بھاپ کی شان اس روٹی کے ساتھ ہے کہ ہر خطرہ پتہ دے گا کہ خطرہ والی ذات خلیث ہے یا طاہر، پس خواطر کا معاملہ بڑا مہتمم بالشان ہے کہ (شقاوت و سعادت کا) سارا مدار انہیں پر ہے اور فرشتہ و شیطان انہیں کے تابع ہیں۔ بہتر سے خواطر ہیں جو انسان کو اسفل السافلین میں پہنچا دیتے ہیں اور اچھے خواطر مقتضائے روح ہیں کہ روح طاہر چیز ہے اور گندگی خواطر ذات انسانی اور خواہشات نفسانی کے مقتضائے طبعی ہیں۔

(۱۳) میں نے اس حدیث کے متعلق سوال کیا کہ حجر اسود حق تعالیٰ کا دانہا ہاتھ ہے زمین میں، فرمایا یہ تشبیہ کے طور پر استعمال ہوا ہے کہ جو شخص شاہی دربار اور سلطانی بارگاہ میں داخل ہونا چاہتا ہے وہ جلدی کرتا ہے اور سب سے پہلے بادشاہ کا دانہا ہاتھ چومتا ہے اسی طرح جو شخص رحمت الہیہ اور حفاظت و ظل خداوندی میں داخل ہونا چاہے اس کو لازم ہے کہ حجر اسود کو بوسہ دے کہ اس کا درجہ اللہ کے نزدیک وہ ہے جو دانہا ہاتھ کا درجہ ہے بادشاہ کے نزدیک (امام غزالی نے بھی حرفاً حرفاً یہی لکھا ہے جس کا دل چاہے کتاب التفرقہ میں دیکھ لے)

(۱۴) میں نے حضرت سے اس حدیث کا مطلب دریافت کیا کہ (قیامت کے دن) موت کو لایا جائے گا مینڈھے کی صورت میں، اور پھر اس کو ذبح کر دیا جائے گا۔ فرمایا یہ حدیث صحیح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک سے نکلی ہے، اور مراد فرشتہ ہے مینڈھے کی شکل میں کہ اس کو اہل جنت کی لذت اور اہل دوزخ کی تکلیف و عذاب کے اضافہ کی خاطر ذبح کر دیا جائے گا اور فرشتوں کی سب میں بڑی مراد یہی چیز ہے اور وہ سجدہ میں پڑ کر دعائیں مانگتے ہیں کہ الہی ہمیں اپنے مومن بندوں کے لئے نعمت اور ان پر نزول رحمت کا سبب بنا۔ اور مومن کا مرتبہ فرشتہ ہی خوب پہچانتا ہے اور حدیث مذکور کی یہ تاویل ہم نے اس لئے کی کہ موت نام ہے دوست سے دوست کے بچھڑ جانے کا کہ بدن مٹی میں جا ملا اور روح چلی گئی اپنے عالم کی موت پس دونوں میں جو اتصال و اجتماع تھا وہ معدوم ہو گیا۔ اور مینڈھے کی صورت میں فرشتہ کا ذبح ہونا چونکہ



بصیرت سے نظر آ رہا ہے لہذا عدم اتصال کو اسی پر عمل کیا جائے گا۔ نیز آپ نے فرمایا کہ جنتی جب جنت میں داخل ہوں گے تو عالم دنیا میں جو تکلیفیں ان کو پہنچی تھیں خصوصاً مرنے کی تکلیف کا آپس میں تذکرہ کریں گے لہذا ان پر انعام فرمانے اور ان کو خوش کرنے کے لئے حق تعالیٰ اس کو منیڈھے کی صورت میں لا کر ذبح کر دے گا کہ تو تمہاری تکالیف کا خاتمہ کر دیا گیا اور اب کوئی کلفت پیش آنے کا احتمال بھی نہ رہا) اور حقیقت میں جس کو ذبح کیا گیا وہ فرشتہ تھا کہ عدمی شی کو معدوم کرنے کا کوئی مطلب ہی نہیں) واللہ اعلم

(۱۵) جن حدیثوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات مثلاً کنکریوں کا (دست مبارک میں آکر) سبحان اللہ پڑھنا۔ تہ کھجور کا آہ کرنا اور سبکیاں لینا۔ درخت کا سلام کرنا وغیرہ آئے ہیں۔ ان کے متعلق حضرت مدوح نے فرمایا کہ یہ ان چیزوں کی وہی تسبیح اور گویائی ہے جو دائمی ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی درخواست اپنے پروردگار سے صرف یہ تھی کہ حاضرین سے پردہ اٹھا دیجئے کہ یہ بھی اس تسبیح کو ان سے سن لیں نہ یہ کہ گونگی چیز کو گویائی بخش دیجئے چنانچہ درخواست منظور ہوئی اور خلافت عادت پردہ اٹھ جانے کی بناء پر معجزہ کہلایا)

میں نے کہا کیا ان چیزوں میں بھی حیات اور روح ہے؟ فرمایا، حیات و روح تو نہیں ہے لیکن تمامی مخلوقات خواہ بولنے والی ہو یا خاموش، جس وقت بھی اس سے خالق کی بابت سوال کیا جائے گا تو فصیح زبان سے کہے گی کہ اللہ ہی ک ذات ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ پس مخلوقات میں یہ تفریق کہ کوئی ناطق ہے (جیسے انسان) اور کوئی صامت ہے (جیسے درخت) اور کوئی حیوان ہے (جیسے بکری ذہیل) اور کوئی جبار ہے (جیسے پتھر اور دیوار) محض باعتبار مخلوقات ہے یا بھی شناخت کے درجہ میں ورنہ بالنسبۃ الی الخالق سب اللہ سے واقف، اس کے عبادت گزار، اس کے سامنے خشوع و خضوع کرنے والے ہیں کہ عبادات کے لئے دو پہلو ہیں ایک رُخ بسوی خالق، اور اس میں وہ اللہ سے واقف، اللہ کے مطیع، اور اس کے عبادت گزار ہیں۔ اور دوسرا رُخ بسوی مخلوق ہے اور اس میں وہ کچھ جانتے ہیں نہ سنتے ہیں نہ بولتے ہیں اور یہی جہت تھی جس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ سے دعا مانگی کہ حاضرین سے اس کو دور کر دیجئے تاکہ دوسرا رُخ جو بسوی خالق ہے اُن پر ظاہر ہو جائے اور جہت بسوی خالق کے اعتبار سے حق تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ فرمایا ہے کہ کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو حمد کے ساتھ اللہ کی تسبیح نہ پڑھتی ہو، یہی جواب حضرت مدوح نے سیدنا داؤد علیہ السلام کے قصہ کا دیا جو منیڈک کے ساتھ پیش آیا تھا کہ حضرت مدوح کو جب خیال ہوا کہ میں اللہ کا ذکر بہت زیادہ کرتا ہوں تو ایک منیڈک کو دیکھا جس نے عمر بھر اللہ کی تسبیح پڑھی اور ایک لمحہ بھی چپ نہ ہوتا تھا اس وقت آپ کو اپنا ذکر اللہ جس کو کثیر سمجھ رہے تھے بہت ہی تھوڑا معلوم ہوا۔

حضرت کا جواب یہ تھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو منیڈک کی حالت کے اُس رُخ کا مشاہدہ ہوا جو



بجانب خالق تھا اور وہ وہی باطنی حالت ہے جس میں ہر شے کی تسبیح دوامی ہے کہ کسی حال بھی اس میں منف و کس نہیں آتا۔ اور اسی قبیل سے ہے حضرت محمد لہوواج کا وہ قصہ جس کو خود حضرت نے ذکر فرمایا۔ اول حسبِ عادت تقریب کی ایک تمہید اٹھائی اور فرمایا کہ زمین کو بھی علم نصیب ہوا ہے جس سے وہ آگاہ ہے اور اس کو اٹھائے ہوئے ہے جیسے ایک انسان قرآن مجید کو اٹھاتا ہے اور اس سے آگاہ ہوتا ہے، اور ایسے ہی ہر جبار کو علم حاصل ہے اور وہ اس کو اٹھائے ہوئے ہے، میں نے کہا اس سے معلوم ہوا کہ اس میں عقل اور علم ہے اور پھر اس کو جبار کیسے کہا؟ فرمایا کہ جبار تو ہماری نظروں میں ہے مگر بالنسبہ الی الخالق تو عارف ہے اور مخلوق کا کوئی فرد بھی یہ کہنے سے خالی نہیں کہ اللہ میرا رب ہے، یہ مضمون ہر مخلوق میں سرایت کئے ہوئے ہے اسی طرح مخلوق کا کوئی فرد بھی اپنے خالق سبحانہ کے سامنے جھکنے اور اس کے خوف و خشیت اور اس کی سطوت سے لرزنے اور کانپنے سے خالی نہیں مگر لوگ چونکہ زمین اور جادات کی اصل حالت سے ناواقف ہیں اس لئے سمجھتے ہیں کہ ہم بے حس پتھروں پر چل رہے ہیں اور بے جان زمین پر آ جا رہے ہیں اور اسی نے ان کو تباہ و ہلاک کیا ورنہ زمین جس حالت پر ہے اگر ان کو معلوم ہو جائے تو ناممکن تھا کہ کوئی شخص بھی اس پر کبھی اللہ کی نافرمانی کرے۔ اس کے بعد فرمایا کہ میں فتح نصیب ہونے سے قبل ایک مرتبہ خولان کے اس نخلستان کی جانب جو علی بن حرز کے روضہ پر وقف تھا خام کھجوریں توڑنے کی نیت سے اپنے شیخ حضرت محمد لہوواج کے ساتھ چلا اور ان کو فتح نصیب ہو چکی تھی۔ جب باب الفتوح کے باہر ابن عمر کے گھر پر گزر ہوا اور وہاں ایک چھال واقع تھی تو میں نے کانٹا لے کر اس میں روٹی کا ٹکڑا لگایا اور مچھلی کا شکار کرنا چاہا کہ چھال میں مچھلیاں بکثرت تھیں شیخ نے منع فرمایا مگر میں نے قسم کھالی کہ شکار ضرور کروں گا چنانچہ شیخ میرے ساتھ پانی پر آئے اور میں نے اس میں کانٹا ڈالا۔ اصل پانی کے قریب ایک گنڈ تھا جس میں سے مجھے اللہ اللہ کی آواز آئی میری آنکھ نہ کھلنے پانی تھی کہ جتنے پتھر وہاں پڑے تھے ہر ایک نے باواز بلند کہا اللہ اللہ۔ اور پھر ہر مچھلی نے کچھ الفاظ کہے سب اس مچھلی کے جس نے کانٹے میں لگا ہوا ٹکڑا کھا رکھا اور کانٹا اس کے حلق میں پھنسا ہوا تھا۔ اور اس صدا کا مطلب یہ تھا کہ اللہ سے ڈر، اللہ سے ڈر اے شکار میں مشغول ہونے کی بجائے خوفِ خدا نہیں آتا۔ اس وقت مجھے اتنا ڈر لگا کہ اگر کسی کو رستی میں باندھ کر بہت اونچا اٹھایا جاوے اور نیچے آنکڑے میں سوئی قائم کر دی جائے کہ وہ متعدد کے راستہ بدن کے پار ہو جائے گی تو اس کا خوف بھی اس سے نیچے کے درجہ پر ہوتا۔ میں نے کہا کہ اس درجہ آپ کو شدید خوف کیوں ہوا؟ فرمایا جس شخص نے نہ کبھی بیل کو دیکھا ہو اور نہ سنا ہو اور وہ آنکھیں مل کر دفعۃً کھولے اور دیکھے کہ بے شمار بیلوں کے سامنے کھڑا ہوں تو بھلا اس کا کیا حال ہوگا۔ میں نے عرض کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ خلافِ عادت ایک امر کے دیکھنے سے یہ خوف لاحق ہوا۔ فرمایا ہاں اس خوفِ عادت معاملہ کے مشاہدہ سے یہ خوف لاحق ہوا تھا۔ میں نے پوچھا کہ ان کا یہ فارق عادت کلام



آپ نے عربی زبان میں سنا تھا یا جاد کی زبان میں؟ فرمایا جاد کی زبان میں کیونکہ ان کے جاد ہونے کے لحاظ سے ان کے مناسب لغات اور زبانیں ان کو دی گئی ہیں۔ اور ان کی سماعت بھی ہمارے تمام جسم سے ہوتی ہے نہ کہ فقط کانوں سے۔ اس کے بعد فرمایا کہ یہ منظر وہی کو صرف ابتدائی حالت میں پیش آیا کرتا ہے ورنہ بعد میں تو صرف فعل الہی کا مشاہدہ رہ جاتا ہے کہ وہ دیکھتا ہے حق تعالیٰ نے اس جاد میں گویا ٹی اور کلام تسبیح وغیرہ پیدا فرمادی ہے، اور یہ خود بمنزلہ خانی برتنوں اور محض تصویروں کے ہیں۔ میں نے کہا کہ جاد ہی کی کیا خصوصیت ہے یہ مشاہدہ تو انسان وغیرہ ذی العقول میں بھی ہوتا ہوگا۔ فرمایا ہاں بلا امتیاز سب ہی چیزوں میں ہوتا ہے۔ نیز فرمایا کہ جادات میں اپنے خالق کی معرفت کا جو حال ہم تے بیان کیا ہے اس کو صرف وہ شخص سمجھتا جو عالم زمین و آسمان سے باہر نکل گیا اور اتنا دور چلا گیا ہو کہ آسمان و زمین اس کو اپنے سامنے ایک کرہ رکھا ہوا نظر آوے۔ ایسا شخص جب اپنی قوی نگاہ سے جو ہر چیز کو پھاڑتی چلی جائے کسی شے کو دیکھے گا تو اس کو صفات نظر آئے گا۔ اور وہ جادات کی تمامی مخلوق کو دیکھے گا کہ کوئی اللہ کو سجدہ کر رہی ہے اور کوئی بصورت رکوع اس کے خوت سے سر جھیکائے اس کے سامنے کھڑی ہے اور سب سے پہلے خود زمین بھی اس کو رکوع کی صورت میں کھڑی دکھائی دیگی۔ نیز فرمایا کہ ایک روز تین باب الفتح سے باہر حضرت احمد مہدی کے مزار کے قریب درخت زیتون کے نیچے بیٹھا ہوا تھا کہ دیکھتا کیا ہوں کہ سارے پتھر کیا چھوٹا اور کیا بڑا اور تمامی درخت اور ان کی ٹہنیاں اپنی زبان میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی تسبیح پڑھ رہی ہیں۔ اس کے سننے سے قریب تھا کہ میں (دور کے مارے) بھاگ جاؤں۔ پھر میں نے ایک پتھر کی طرت غور سے کان لگائے تو مجھے چند مختلف آوازیں سنائی دیں۔ مجھے تعجب ہوا کہ پتھر تو ایک مگر آوازیں کئی۔ اس کا کیا سبب۔ پھر میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ وہ کئی پتھروں سے ترکیب کھا کر ایک ہو گیا تھا اور ہر پتھر سے جدا آواز آ رہی (اول) اس لئے متعدد آوازیں ہو گئی تھیں۔ یہ واقعات حضرت ممدوح کو فتح ہونے کے شروع زیارت میں پیش آئے تھے۔ اور اسی کے قریب وہ تذکرہ ہے جو آپ نے جانوروں کے بارہ میں فرمایا کہ ایک بیل جب دوسرے بیل کو دیکھتا ہے تو دن بھر میں اسے جو کچھ پیش آیا ہے وہ اس سے ذکر کرتا اور کہتا ہے کہ میں نے فلاں فلاں گھاس کھائی، اور فلاں فلاں پانی پیا، اور فلاں فلاں خیال مجھے آیا وغیرہ وغیرہ۔ اور دوسرا بیل بھی اسی طرح اس کو جواب دیتا ہے۔ اور دونوں اس طرح باتیں کرتے رہتے ہیں جیسے ہماری گفتگو میں حروف اور مخارج ہوتے ہیں ان کی گفتگو میں حروف کا، مقدود محذوف ہونا اور لفظوں کا جدا جدا ہونا پایا جاتا ہے مگر وہ ہم سے مخفی کر دیا گیا ہے اور بجز آواز اور ان کی چیخ یا ڈروک کے اور کچھ سنائی نہیں دیتا۔ یہی حال تمامی جانوروں اور درختوں اور پتھروں کے کلام کا ہے کہ ہم اس کو سمجھتے نہیں، جیسا کہ ان سے ہمارے کلام کی



سماعت جو محتاج اور حروف تہجی سے مرکب ہوتا ہے پوشیدہ رکھی گئی ہے مگر جس کو حق تعالیٰ نے فتح نصیب فرمائی ہے وہ اُن کی ساری باتیں سنتا اور ان کا مطلب سمجھتا اور جدا جدا فقرہ کو محسوس کرتا ہے کہ یہ سمجھتا روح سے ہوتا ہے اور روح مقاصد و اغراض کو اس سے پہلے سمجھ لیتی ہے کہ ان کو زبان سے ظاہر کیا جائے تم دیکھو گے کہ ایک صاحب فتح ملک عرب کا ہے اور دوسرا صاحب فتح ملک عجم کا اور تمام دن دونوں باتیں کرتے رہتے ہیں کہ یہ بات کرتا رہتا ہے اپنی عجمی زبان میں اور دوسرا اس کو جواب دیتا رہتا ہے اپنی عربی زبان میں۔

میں نے آپ کو یہ فرماتے بھی سنا کہ بسا اوقات قضا و حاجت کی غرض سے میں بیت الخلا میں جاتا ہوں اور پانی کو ذکر کرتے اور اللہ جل جلالہ کا نام لیتے ہوئے سنتا تو حاجت رفع کئے بغیر باہر نکل آیا کرتا تھا یہ راز ہے جارات کے ذکر اللہ اور باطنی تسبیح کو مخلوق کی سماعت سے محبوب رکھنے کا کہ نام خدا کا قصداً ہتک حرمت کر کے روحانی امراض میں مبتلا ہوں گے۔ یا ذکر و شغل بحق کو نجاست میں آمیز کرنے سے دشت کھا کر قضا و حاجت نہ کر سکیں گے تو حیوانی امراض کا شکار بنیں گے، واللہ اعلم۔

(۱۶) ہزار میں حضرت انسؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ رب العزت کے کلام کی کیفیت ہم سے بیان فرمائیے اور یہ کہ آپ نے اس کو کیسے سنا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ شدید ترین کڑک اور گرج کی آواز کو فوراً (کلچہ شق کر کے) دم نکال دے، اعلیٰ درجہ کی حلاوت میں، اگر سنی جائے تو وہ تمثیل ہے اللہ جل جلالہ کے کلام کی نیز موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے رب العزت کیا آپ نے اپنے تمامی کلام سے میرے ساتھ کلام فرمایا تھا؟ ارشاد ہوا کہ تمہارے ساتھ صرف دس ہزار زبان کی قوت سے کلام کیا تھا۔ اور اگر تمامی کلام سے بات کرتا تو اسی وقت تم رانگ کی طرح، پگھل جاتے (اور برداشت نہ کر سکتے) میں نے حضرت محدوح سے اس حدیث کی بابت دریافت کیا تو فرمایا کہ گرج اور کڑک کی آواز سے مراد حقیقت نہیں کہ وہ اللہ کے حق میں محال ہے (کیونکہ تجدّد و حدوث کو چاہتی ہے جس سے ذات باری منزہ ہے) بلکہ اس کا لازم یعنی خوف مراد ہے کہ یکدم روح نکال لیتے وانی کڑک اور گرج کی آواز سننے وقت جو ناقابل بیان خوف انسان کو لاحق ہوتا ہے، اتنا ہی خوف اور ہیبت متاعی اجزاء بدن میں اس کو لاحق ہوتی ہے جو اللہ کے کلام سنتا ہے۔ حتیٰ کہ ذات انسانی کے ہر جوہر کو تنہا تنہا اتنا خوف لاحق ہوتا ہے جتنا پورے انسان کو لاحق ہوتا ہے۔ کہ ہر رگ اور اس کا ہر جز لرزتا ہے اگر حق تعالیٰ کا لطف و کرم شامل حال نہ ہو تو عجیب نہیں لگپھل جائے۔ اور اعلیٰ حلاوت سے مراد وہ اللہ وسیع اور رحمت کا ملہ اور انعامات جلیبہ ہیں جو اُس وقت موسیٰ علیہ السلام کو حاصل ہوئے نیز وہ لذت مراد ہے جو اس کلام ازلی کے سننے والگی ہر ہر رگ کو نصیب ہوا کرتی ہے۔ اور یہ ارشاد کہ میں نے دس ہزار



زبان کی قوت سے کلام کیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے حجاب (جو زیادہ قوت والے کلام کی سماعت سے مانع تھا) اٹھا دیا کہ کلام باری تعالیٰ کے اتنے مدلولات انہوں نے سن لئے جن کو اگر ہزار زبانیں ایک لمحہ کے اندر ادا کرتیں تو ان کی مقدار ان مدلولات کلام الہی کے برابر ہوتے۔ اس کی نظیر وہ ہے جو صاحب فتح ولی کے بارہ میں آئے گی کہ یہ مختلف آوازیں اس پر مخلوط ہوتی ہیں اور نہ ایک آواز کی سماعت دوسری آواز سننے سے مانع ہوتی ہے (بلکہ سب جدا جدا سنائی دیتی ہیں)، لہذا مطلب یہ ہوا کہ فرض کرو دس ہزار زبانیں موسیٰ علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوں اور موسیٰ علیہ السلام ان کی طرف کان لگائیں اور ایک لحظہ میں سب کو سمجھ لیں (کہ ایک کو پہلے سمجھنا اور دوسرے کو بعد میں یہ ترتیب اس میں کچھ نہ ہو) تو یہ شان تھی اس کلام کی جس کی طرف حدیث مذکور میں اشارہ ہوا ہے۔ مگر یہ سماعت روح کی تھی نہ کہ ذات کی۔ اس لئے کہ روح ہی کے علوم ہیں جن میں ترغیب نہیں ہوتی۔ جب وہ کسی علم مثلاً نحو یا فقہ کی طرف توجہ کریگی تو اس کے تمامی مسائل ایک لحظہ کے اندر حاضر ہو جائیں گے اور یہی حال روح کی قرات کا ہے کہ مثلاً جس وقت ارادہ کرے گی قرآن مجید کی تلاوت کا تو اس کو تمامی حروف کے ساتھ ان کے صحیح مخارج اور دیگر ساری خوبیوں کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے ایک لحظہ کے اندر پڑھ جائے گی۔ یہ جواب میں نے حضرت محدوح سے آپس کے شروع زمانہ میں سنا تھا کہ میں مدینہ منورہ لے ہوئے مسجد علویں میں بیٹھا ہوا تھا اچانک اس حدیث پر نظر گئی اور میں نے اپنے دل میں کہا کاش حضرت شیخ موجود ہوتے تو اس حدیث کا مطلب دریافت کرتا زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ حضرت تشریف لائے اور میرے سامنے بیٹھ گئے۔ میں نے کتاب کھولی اور عرض کیا کہ حضرت میں تو تنہا ہی کر رہا تھا کہ آپ سے اس کتاب کی ایک حدیث کا مطلب دریافت کروں۔ فرمایا ہاں پوچھو میں تو جواب ہی کی غرض سے آیا ہوں۔ چنانچہ میں نے حدیث پڑھی اور حضرت نے جواب دیا۔

(۱۷) مسلم میں جبریلؑ والی حدیث ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان اور اسلام اور احسان کی بابت دریافت کیا آخر میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب وہ چلے گئے تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اس شخص کو جو سوال آ کر رہا تھا واپس لاؤ۔ چنانچہ صحابہ نے تلاش کیا مگر ان کا پتہ نہ لگا تب حضرتؐ نے فرمایا کہ یہ جبریلؑ تھے اور وہ مجھ سے کبھی نہیں چھپ سکے۔ بجز اس مرتبہ کے کہ اس وقت میں نے ان کو بالکل نہ پہچانا، اس کے متعلق حضرت محدوح نے فرمایا کہ حضرت جبریلؑ کے چھپے رہنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کمال عظمت و رفیع مرتبت کا اظہار ہے جس کی حقیقت ناقابل بیان ہے اور صرف وہی سمجھ سکتا ہے جس پر حق تعالیٰ کرم فرمائے اور یہ اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض وقت حق تعالیٰ کے شاہدہ میں اتنا استغراق ہوتا تھا کہ ذاتِ مطہرہ مع اپنے تمامی تعلقات اور احبزاء و عروق کے اس عالم سے بے تعلق ہو جاتی تھی اور



ذات محمدی نور حق سبحانہ میں محو ہو جاتا تھا کہ ماسوا سے انقطاع کلی ہوتا تھا۔ مگر اس بے تعلقی میں بھی ذات مطہرہ (غلطی و خطا سے) محفوظ رہتی تھی کہ حق کے سوا کوئی فعل صادر نہ ہوتا تھا اور بجز صدق کے کوئی لفظ زبان مبارک سے نکلتا نہ تھا۔ فرشتے جب دیکھتے تھے کہ یہ حالت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر طاری ہوئی اور وہ جانتے ہیں کہ اللہ کی مخلوقات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی دوسرا اس کی طاقت نہیں رکھتا۔ نیز یہ کہ اس حالت میں حضرت کو ہمارا ادراک و شعور نہ ہو سکے گا تو وقت کو غنیمت سمجھ کر جلدی کرتے اور حاضر خدمت ہو کر آپ سے ایمان کی حقیقت معلوم کیا کرتے اور آپ کو اپنا شیخ بنا کر ایمان اخذ کیا کرتے۔ چنانچہ بدوی شکل میں فرشتہ آتا اور عرض کرتا تھا کہ یا رسول اللہ میں آپ پر ایمان لانے اور آپ کے سچے رسول ہونے کا اقرار کرنے کے لئے آیا ہوں لہذا مجھے تعلیم فرمائیے کہ اللہ و رسول پر کس طریق سے ایمان لاؤں۔ چنانچہ حضرت اس کو بتلاتے (اور انوار سے مالا مال فرمایا کرتے) تھے۔ میں نے عرض کیا کہ فرشتوں کو ایمان سیکھنے اور حضرت سے اخذ کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ وہ اللہ کے برگزیدہ بندے اور مقرب فرشتے ہیں؟ فرمایا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بہت ہی بڑی ہے اور جس نے بھی حضرت سے ایمان اخذ کیا اور پھر اس کو بدلا نہیں دیکھا (بجانب محفوظ رکھا ہے) نہ اس کو پلصراط دیکھنی پڑی ہے اور نہ موزخ لہذا فرشتے اس وقت کو غنیمت سمجھتے تھے۔ میں نے کہا کہ کسی دوسرے وقت دریافت کیوں نہیں کرتے تھے؟ فرمایا جب استغراق کی حالت ختم ہو جاتی اور آپ اپنے حق و ادراک کی طرف لوٹ آتے اور فرشتے اس حالت شعور کو معلوم کر لیتے اور سمجھتے تھے کہ اب حضرت ہم کو پہچان لیں گے تو وہ بدوی شکل نہ بنا سکتے تھے کہ چھپا رہنا ناممکن ہے) اور اس صورت میں ذات محمدی سے خاص نور اور مدد ملے ہوئے جواب نہ نکلے گا۔ بخلاف حالت انقطاع لبومی خالق کے جبکہ ذات محمدی کو بات کرنے والے کی صرف آواز اور بول چال مسموع ہوتی ہو، اور بوجہ استغراق تمام کے اس کا ادراک نہ ہوتا ہو کہ بات کرنے والا کون ہے) تو اس حالت میں آپ کا جواب اُن کی حسبِ خواہش حسبِ مراد نکلے گا۔ میں نے پوچھا کیا فرشتے پہچان لیتے ہیں کہ یہ حالت ہے جس میں حضرت اپنے حق کی طرف لوٹ آئے؟ اور یہ وہ حالت ہے جس میں اللہ کی طرف انقطاع تمام ہے؟ فرمایا یہ نہ فرشتوں پر چھپا رہ سکتا ہے، نہ اُن (اولیاء امت) پر جنہیں حق تعالیٰ نے بصیرت عطا فرمائی اور قلب کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ واللہ اعلم۔

(۱۸) حدیث میں ہے کوئی بنی ایسا نہیں جسے ایسا (معجزہ) نہ دیا گیا ہو جو بشر کے ایمان لانے کو کافی ہے اور مجھے جو چیز عطا کی گئی ہے وہ خالص وحی ہے جس کی تلاوت ہوتی ہے، اس کا مطلب حضرت ممدوح نے بیان فرمایا کہ تمامی انبیاء علیہم السلام کے معجزات اُن کی ذاتِ ترائی ہی کی جنس اور اسی کے متعلقات



میں سے تھے جن میں بعض کی قوت کبر سنی میں عطا کی جاتی تھی اور بعض کی قوت صغیر سنی ہی میں ذات کے ساتھ بڑھتی رہتی تھی اور اس کا ظہور بڑی عمر ہو جانے پر ہوا کرتا تھا اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ خالص حق تعالیٰ کی طرف سے اور اس کے نور اور شاہدہ اور ہم کلامی کی نوع میں سے ہے جس کا سبب یہ ہے کہ حضرت میں ذات اور عقل اور نفس اور روح اور سر غرض ہر اعتبار سے قوت اتنی زیادہ تھی کہ جو شاہدہ آپ تنہا کو عطا ہوا تھا اگر تمامی انبیاء علیہم السلام پر تقسیم کیا جاتا تو وہ متحمل نہ ہو سکتے۔ اسی لئے آپ نے فرمایا کہ مجھے جو معجزہ دیا گیا ہے وہ خالص وحی ہے جس کی تبادلت کی جاتی ہے یعنی میرا معجزہ دیگر انبیاء کے معجزات کا ہم جنس نہیں بلکہ محض شاہی صفات میں سے ایک صفت ہے یعنی کلام اگرچہ ان حضرات کے معجزات بھی اتنے جلیل القدر اور عظیم الشان تھے کہ تمامی بشر کو مومن بنادینے کے لئے کافی و کافی ہیں۔ الخاصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ (یعنی قرآن مجید) سب کے معجزات سے بالا و مافوق ہے کہ آپ کی ذات سے نہیں بلکہ ذات حق سبحانہ سے ہے اس کے بعد آپ نے ایک تمثیل بیان فرمائی کہ ایک بادشاہ ہے اور جب اس کے گھر میں کوئی لڑکا پیدا ہوا تو اس نے کسی مقام پر اس کو بھیج دیا کہ تربیت پاوے اور پچھلے بھوے مگر ہر ایک کے ساتھ نشانی کے طور پر ایک قیمتی لعل پایا تو بھی بھیجتا رہا جس سے رعایا کو علم ہوا کہ یہ شاہزادہ ہے اور ہمارے بادشاہ کا بیٹا ہے آخر میں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کو بادشاہ نے اپنے پاس رکھ لیا اور خود ہی اس کی تربیت اور تمامی معاملات کی نگہداشت فرمائی۔ دیکھو اس شاہزادہ کو باپ کی معرفت اور اس کے مرتبہ و شان کی واقفیت، جتنی کا لبیب ہوگی اور باپ کے اسرار چھپنے اس میں سرایت کریں گے کھلا در سر کھائیوں کی معرفت و سر پردی سے اس کا کیا مقابلہ ہو سکتا ہے۔ بعض صحابہ خواہش کیا کرتے تھے کہ آپ سے بھی کوئی معجزہ دیا جائے اور انبیاء علیہم السلام کے معجزات کی قسم میں سے ظاہر ہو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر ادھر تو ان کی خواہش پر جاتی اور ادھر اس مخصوص عنایت الہی پر جو خاص آپ کی ذات پر مبذول ہوئی تھی، اس لئے آپ کو بڑی شرم آتی اور اس کی مثال ایسی ہو جاتی تھی جیسے کسی کو بادشاہ نے اپنا سارا ملک سپرد کر دیا اور اختیار دیدیا کہ جو چاہے تصرف کرے اور اس کا کوئی رفیق اس سے خواہش کرے کہ فلاں گاؤں میں کچھ تصرف اور عزل و نصب کر کے دکھلائیں نیز ایک مرتبہ فرمایا کہ جو انوار و اسرار قرآن مجید میں رکھے ہوئے ہیں اور جن مقامات عالیہ و احوال صافیہ پر یہ مشتمل ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص نے کپڑا تراش کر کڑتہ پا جامہ ٹوپی عمامہ غرض جو کپڑے بھی پہنے جاتے ہیں سب ہی سلوائے اور تیار کر کے سامنے رکھ دیئے اب ایک نگاہ ڈالو! ان کپڑوں پر اور ایک نگاہ ڈالو تمامی مخلوقات پر، تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ ان سب کے پہنے اور متحمل ہونے کی طاقت بجز سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی میں بھی نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ وہی قوت ہے جو خصوصیت سے آپ کی ذات پر مقدمہ



کو دی گئی ہے۔ نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدہ کا دوسروں کے لئے ناقابل برداشت ہونا بیان کرتے ہوئے ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ مشاہدہ بمقدار معرفت ہوا کرتا ہے اور معرفت الہیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آفرینش عالم سے بھی قبل، اُس وقت حاصل ہوئی جبکہ صرف محبوب اپنے حبیب کے پاس تھا اور تبسرا کوئی نہ تھا۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اول المخلوقات ہیں اور اسی وقت آپ کی روح شریفہ کو انوار قدسیہ اور معارف ربانیہ سے اس درجہ سیراب کیا گیا تھا کہ ہر طالب نور کے لئے اصل اور ہر مستند ضیاء کے لئے مادہ بن گئی تھی جو شرح ہے اس حدیث کی کہ میں بنی بن چکا تھا اور حضرت آدمؑ ابھی مٹی اور پانی میں یعنی پتلہ ہی بنے ہوئے تھے، پھر جب ر دنیا میں آپ کے ظہور اور ولایت کا وقت آیا اور آپ کی روح مطہرہ آپ کی ذات مقدسہ میں داخل ہوئی تو چونکہ کمال محبت و رضا کے ساتھ اس کی رہائش ہوئی اس لئے روح اپنے معارف و اسرار اسکو عطا کرتی رہی اور ذات مقدسہ بحسن ہی سے تدریجی طور پر معارف و معارج میں ترقی کرتی رہی اور عروج پاتی رہی حتیٰ کہ عمر شریف چالیس سال کی ہوئی تو وہ پردہ جو ذات اور روح کے درمیان تھا اٹھ گیا اور دونوں کا باہمی حجاب بالکل محو ہو گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ مشاہدہ حاصل ہوا جو دوسرے کے لئے ناقابل برداشت ہے حتیٰ کہ آپ آنکھوں سے دیکھنے کی طرح اس کا مشاہدہ فرماتے تھے کہ تمامی مخلوق کو حرکت دینے والا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے والا صرف وہی حق سبحانہ و تعالیٰ ہے کہ ساری مخلوق ایسی ہے جیسے خالی ظروف اور آوے میں پکائے ہوئے مٹی کے برتن، جو نہ اپنے آپ کو نفع پہنچا سکتے ہیں نہ کسی قسم کا کوئی نقصان۔ اس وقت حق تعالیٰ نے آپکو پیغمبر بنایا اور غار حرا میں خلوت نبوت پہنچا کر اصلاح خلق کے لئے مبعوث فرمایا، کہ آپ اس مشاہدہ میں تھے اور تمامی مخلوقات آپکی نظروں میں خالی اجسام اور محض تصویریں بنی ہوئی تھیں تاکہ آپ ان کے لئے مجسمات بنیں اور ایذا و رسائی و سب و شتم کا کوئی فعل ان کی طرف سے نہ سمجھیں کہ سبب ہو بددعا دینے کا اور وہ ہلاک ہو جائیں۔ جیسا کہ آپ سے پہلے دیگر انبیاء علیہم السلام کا اپنی امتوں کے ساتھ برتاؤ ہوا، اور اسی لئے حضرت نے فرمایا ہے کہ دیگر انبیاء نے اپنی دعاؤں کو دنیا میں پورا کر لیا کہ قوم کے ہلاک ہو جانے کی بددعا فرمائی، اور میں نے اپنی اس دعا کو قیامت کے دن شفاعت کے لئے محفوظ رکھ چھوڑا ہے۔ کہ آپ کی وہ دعا بھی رجوع بقوت شاہی پر وانہ ہر بنی کو عطا ہوئی ہے، رحمت بنی اور ارشاد خداوندی وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ کا مصداق اور ارشاد رسالت ابِ انہما اَنَا رَحْمَةٌ صَحْدَاةٌ لِّلْخَلْقِ کا مصداق ظاہر ہوا۔ اور یہ تو اس مشاہدہ کے ابتدائی زمانہ کا حال تھا چہ جائیکہ ہر لحظہ آپ کو ترقی ہوتی رہی اور ہر لمحہ آپ بے کیف مقامات میں اوپر چڑھتے رہے میں نے عرض کیا کہ اب اوپر کوئی درجہ بھی باقی ہے؟ فرمایا ہمارے حق تعالیٰ سبحانہ کے کمالات کی تو کوئی انتہاء نہیں۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے اس زمانہ تک بھی زندہ رہتے تو رکنتے نہیں بلکہ ہر



لحظہ ترقی ہی کرتے رہتے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ مشاہدہ تو تمامی انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہوگا اور کسی وقت بھی نہ ہٹتا ہوگا ورنہ اگر اس کا کہ اللہ ہی خالق ہے ہمارا اور ہمارے افعال کا محض ایمان بالغیب ہوتا تو بے اثر عام مومنین ہی کے نہ بنجاتے۔ فرمایا بیشک مشاہدہ ان حضرات کو بھی تھا مگر پردہ بالکلیہ دور نہ ہوا تھا اور ہمارے بنی صلی اللہ علیہ وسلم میں بالکلیہ اٹھ گیا تھا۔ اس کے بعد حضرت ممدوح نے کشفی حقائق بیان فرمائے جو عقل سے بالا ہیں۔ آخر میں فرمایا کہ قرآن مجید میں انوار تفسیر اور معارف ربانہ اور اسرار ازلیہ اس درجہ بالا از طاقت ہیں کہ سیدنا موسیٰ صاحب توراۃ اور سیدنا عیسیٰ صاحب انجیل اور سیدنا داؤد صاحب زبور علیہم الصلوٰۃ والسلام اگر زندہ رہتے اور نزول قرآن کا زمانہ پاتے اور اس کو سننے تو قرآن کا اتباع اور تمامی اقوال و افعال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اقتداء کرتے بغیر نہ رہتے۔ بلکہ سب سے پہلے دعوت محمدیہ پر لبیک کہتے اور آپ پر ایمان لاتے اور جہاد کے لئے تلوار لے کر آپ کے آگے آگے ہوتے، ابن حجر نے بھی متعدد طرق سے اس مضمون کی حدیث نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام زندہ ہوتے تو ضرور میرا اتباع کرتے۔

(۱۹) قبیلہ اشعریتین ایک جماعت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سواری کے لئے چند اونٹوں کا سوال کیا تو آپ نے فرمایا واللہ میں نہ تم کو سواری کے اونٹ دوں گا اور نہ میرے پاس ہیں کہ تم کو دیدوں اس کے بعد آپ نے ان کو اونٹ عطا فرما دیئے۔ دریافت طلب یہ امر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے حق کے خلاف اور صدق کے سوا کوئی کلام نکل ہی نہیں سکتا رہمیر اختیار می شے کا انکار فرمانا اور قسم کھا کر کہنا کہ نہ میں دوں گا اور نہ میرے پاس ہیں، کیونکر صحیح ہو سکتا ہے) فرمایا بیشک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول حق ہے اور ہر کلام سچا مگر آپ کا کلام حسب مشاہدہ اور حسب باطن نکلا کرتا تھا اور مشاہدہ کی تین قسمیں ہیں کہمیں تو آپ ذات الہی کے مشاہدہ میں ہوا کرتے تھے اور اس کی لذت و کیفیت ناقابل بیان ہے کہ دنیا میں کوئی چیز بھی اس کے مماثل نہیں۔ یہ وہ لذت ہے جو اہل جنت کو دیدار خدا کے وقت، جنت میں نصیب ہوگی۔ اور کہمیں ذات باری اور اس کی طاقت اور غلبہ اقتدار کے مشاہدہ میں ہوتے تھے اور اس حالت میں مشاہدہ قوت و غلبہ سکتا کے سبب ایک خوف اور قلق و اضطراب ہوتا تھا ان دونوں مشاہدوں میں آپ مخلوق سے غافل ہو جاتے اور کسی کو بھی نہ دیکھتے تھے اور اس کی کچھ تشریح حضرت جبرئیلؑ کو نہ پہچان سکنے کی حدیث میں گزر چکی ہے اور کہمیں آپ ممکنات کے اندر قوت الہیہ کے مشاہدہ میں ہوتے اور قدرت کو تمامی ممکنات میں ساری و جاری دیکھتے تھے اس حالت میں آپ کی ذات مطہرہ باطن سے غافل ہو جاتی اور ذات کے افعال باقی رہ جاتے تھے۔ اس فیصلہ مشاہدہ میں احکام شرعیہ کی تعمیل اور مخلوق کی تربیت و تعلیم اور ان کو اللہ تک پہنچانے کی خدمت



انجام پاتی تھی۔ پس جو کچھ ہم زبان مبارک سے نکالتے تھے ان تین مشاہدوں سے باہر نہ ہوتا تھا۔ کہ کلام فرات  
وقت کبھی آپ پہلے مشاہدہ میں ہوتے اور کبھی دوسرے مشاہدہ میں اور کبھی تیسرے مشاہدہ میں۔  
اور یہ حدیث دوسرے مشاہدہ سے تعلق رکھتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت ذات باری اور اس کی  
قوت و قدرت کے مشاہدہ میں اپنی ذات سے بھی غافل تھے چہ جائیکہ دوسرے۔ اشعریین کی درخواست کہ ہمیں  
سواری کے لئے اونٹ دید دیجئے اتفاق سے اس مشاہدہ کی حالت میں واقع ہوئی اس لئے آپ نے فرمایا کہ  
نہ میں اونٹ دوں گا اور نہ میرے پاس ہیں۔ اور بات بالکل سچی فرمائی۔ مگر جب آپ مشاہدہ کائنات کی طرف  
آئے اور اتفاق سے اسی وقت آپ کے پاس اونٹ آگئے تو آپ اس مشاہدہ کے حکم پر چلے اور جو اس کا مقتضا  
تھا کہ اتباع ہو احکام الہی کا اور ادا ہوں حقوق خلق اللہ کے وہ جاری ہوا چنانچہ آپ نے پوچھا کہ اشعرتوں کو  
گئے۔ اس پر وہ بلائے گئے اور حضرت نے ان کو اونٹ عطا فرمائے۔ انہوں نے کہا بھی کہ یا رسول اللہ آپ  
نے تو قسم کھائی تھی کہ ہمیں عطا نہ فرمائیں گے اور پھر عطا فرمادیتے۔ مگر حضرت نے وہ جواب دیا جو بتا رہا  
کہ اول قسم کھانا اس حالت کے موافق تھا جس کو اس وقت کا مشاہدہ مقتضی ہو رہا تھا کہ آپ اپنے  
ہی نفس پر اختیار نہ رکھتے تھے چہ جائیکہ اونٹوں کا دنیا چنانچہ فرمایا کہ میں نے تم کو سواری کے لئے اونٹ نہیں  
دیئے بلکہ اللہ نے دیئے ہیں یعنی میں نے قسم یہی تو کھائی تھی کہ میں نہ دوں گا اور نہ میرے پاس اونٹ ہیں  
جن پر تم کو سوار کروں، اور یہ واقعہ ہے کہ تم کو سواری کے اونٹ دینے والا حق تعالیٰ ہے نہ کہ میں یہ تو اس کی  
اطلاع ہے کہ وہن مبارک سے جو نکلا تھا وہ حق اور سچ تھا۔ میں نے عرض کیا کہ پھر آپ نے قسم کا کفارہ کیوں  
دیا جیسا کہ اس حدیث کے آخر میں ہے کہ آپ نے فرمایا میں نے کبھی ایسی قسم نہیں کھائی کہ اس کے خلاف کو بہتر سمجھوں  
اور اس کا کفارہ نہ دوں، اور اس کو اختیار نہ کروں جو بہتر ہے۔ حضرت مدوح نے فرمایا اس قسم میں حضرت نے کفارہ  
قسم نہیں دیا۔ اور حدیث میں اس کا ذکر ایک مستقل کلام اور مسئلہ کا اظہار اور قاعدہ شرعیہ کی تعلیم ہے۔  
باقی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس واقعہ میں قسم کا کفارہ دینا قطعاً صحیح نہیں ہے حضرت حسن بصریؒ و غیرہ  
اکابر علماء کی بھی یہی تحقیق ہے اس کے بعد حضرت مدوح نے فرمایا کہ پہلے مشاہدہ کی مثال حسین کے متعلق  
ہم نے کہا ہے کہ اس کی لذت اہل جنت کی سی لذت ہے، ایسی ہے جیسے ایک بادشاہ آئے جس کا سطوت و  
جلال مشہور ہو اور اس کے پاس ہتھیار اور ہر قسم کے آلات قتل موجود ہوں مگر بادشاہ اپنے ہتھیار علیحدہ  
کر دے اور آلات قتل کو پرے رکھ دے اور گھوڑے سے اتر آدے اور اپنی رعایا میں ایک شخص کو بلادے  
اور اس کے ساتھ امنیاط و خوش طبعی کرنے لگے، اور فرح و سرور کے تمامی سامان انتہائی درجہ پر پہنچا دے  
حتیٰ کہ اس کو اپنے ساتھ لے کر ایک کپڑے میں سو جا دے۔ نہیلا کس زبان سے اس شخص



کی خوشی اور لذت کا واقعہ ادا کیا جائے۔ اس کی قدر و منزلت کا اندازہ کون کر سکتا ہے اور کون سے لفظ ہیں جن سے اس کی اصل حقیقت ظاہر کی جاسکے۔ اس مثال سے اس مشاہدہ کی لذت کا برائے نام کچھ اشارہ نکلے گا ورنہ حقیقت میں وہ کہاں اور یہ کہاں۔ چہ نسبت خاک را عالم پاک۔ اس مشاہدہ والے کو ایک سکون و فرح اور خوشدینی و انشراح صدر کے علاوہ ایسی عجیب لذت حاصل ہوگی جو اس کی رگوں میں، گوشت میں، خون میں، ہڈی میں، امدیاں <sup>بال</sup> میں اور دینیں روئیں میں، عظمیٰ تمامی جو اہر ذات میں سرایت کئے ہوئے ہوگی۔ حتیٰ کہ اگر اس کا ایک بال بے کر اس لذت پر نظر ڈالیں جو اس میں موجود ہے تو وہ مادی ہوگی اس لذت کے جو اس کی عقل اور اس کے قلب میں موجود ہے کچھ بھی کم نہ ہوگی۔ پھر سب سے بڑی لذت مثلاً محاسن کو اس لذت مشاہدہ کے لاکھویں حصہ کا لاکھواں حصہ بھی بنائیں، اور پھر اس مجموعہ کو ستر کر دے گا ایک جزو قرار دیں، اور یوں کہیں کہ مشاہدہ کی لذت اس کا عشر ہے تب بھی اس لذت کے قریب قریب نہ کہ پہنچے گی۔ اور دوسرے مشاہدہ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص یا دشاہ کے سامنے حاضر ہوا مگر اس وقت جبکہ وہ اپنے اسلحہ اور قہر و سطوت میں تھا تو گو پہلی لذت کا کچھ اثر اس مشاہدہ میں بھی موجود ہوگا مگر آخر مشاہدہ ہے سلطان ذی شان کا، مگر اس کے ساتھ ہی ایک ناقابل برداشت ہیبت و خوف اور دہشت بھی ہوگی کہ جو شخص یا دشاہ کو گھوڑے پر سوار، ہاتھ میں نیزہ لئے ہوئے، اس کو حرکت دیتے، اور ڈراتے، دھمکاتے ہوئے دیکھتا ہے تو جو ڈر اور دہشت اس پر طاری ہوتی ہے اس کا حال کچھ نہ پوچھو پہلے مشاہدہ میں کچھ نمونہ ہے خواب کا اور دوسرے مشاہدہ میں مشابہت ہے بیداری سے کہ اس میں مشاہدہ جلدل و سطوت کی وجہ سے قلق و اضطراب ہوتا ہے مگر اغیار سے بے خبری و غریبوں میں ہوتی ہے اور تیسرے مشاہدہ کی طرف اشارہ ہے اس حدیث میں کہ میرے قلب پر ایک بادل سا چھا جایا کرتا ہے یعنی مشاہدہ ذات مستور ہو کر مشاہدہ قدرت در کائنات کی طرف آنا ہوتا ہے پس میں استغفار کیا کرتا ہوں، چونکہ ساری مخلوق کو بھی جمع کر لیا جائے تو ان میں طاقت نہیں کہ پہلے اور دوسرے مشاہدہ میں دائمی رہ سکیں اور ضروری ہے کہ راحت پانے کے لئے تیسرے مشاہدہ کی طرف نزول کریں لہذا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس مشاہدہ کی طرف اترتے تھے تو اس کو گناہ قرار دیتے اور استغفار کیا کرتے تھے۔ واللہ اعلم۔

(۲۰) حب میں نے حضرت ممدوح سے ہر کہ مشاہدہ کی تقریر سنی اور یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی کلام ان سے باہر نہیں نکلتا اور یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں اشکال اسی کو پیش آتا ہے جو اس کی حقیقت سے ناواقف ہوتا ہے نیز یہ کہ حضرت کا ہر قول سچا اور ہر کلام کسی بارہ میں بھی ہو بہر حال حق ہوتا ہے تو میں نے تا بہر نخل دانی حدیث پیش کی جس میں مجھے اشکال رہا تھا کہ صحیح مسلم میں ہے حضرات صحابہ



درختہائے کھجور کی تابیر کر رہے (یعنی تروخت کے پھول مادیں درخت پر ڈال رہے) تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان پر گزر ہوا تو دریافت فرمایا یہ کیا کر رہے ہو؟ عرض کیا کہ یا رسول اللہ اس سے پھل اچھا آتا ہے فرمایا اگر یہ ذکر و تبت بھی پھل اچھا آدے۔ چنانچہ صحابہؓ نے تابیر نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کھجور اچھی نہ آئی بلکہ ردی آئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کھجوروں کو دیکھا تو فرمایا کھجور کو کیا ہوا کہ ایسی آئی۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ نے ایسا ایسا فرمایا تھا۔ تب آپ نے فرمایا تم اپنی دنیا (کی تدبیروں سے) زیادہ واقف ہو۔

حضرت ممدوح نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: "اگر تابیر نہ کرو تب بھی پھل اچھا آدے" بالکل حق اور سچا کلام ہے مگر دہن مبارک سے اُس کے لئے نکلا ہے جس کو نچتہ یقین ہو کہ حق تعالیٰ ہی فاعل مطلق ہے اور یہ نچتگی یقین اس پر مبنی ہے کہ فعل الہی کا تمامی ممکنات میں بذات خود بلا واسطہ و بلا سبب ساری ہوتا مشاہدہ کرے کہ نہ کسی ذرہ کو سکون ہوتا ہے نہ بال کو حرکت، نہ قلب کو اضطراب ہوتا ہے نہ رگ میں پھرک نہ پلک کی کوئی جھپک، اور نہ آبرو کا اشارہ مگر کہ فاعل بلا واسطہ حق تعالیٰ ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کا ایسا مشاہدہ فرماتے تھے جیسے عام لوگ امور محسوسہ کا مشاہدہ کیا کرتے ہیں کہ یہ مضمون آپ کی نظر سے نہ بیدار می میں غائب ہوتا تھا نہ بحالت خواب۔ اس لئے کہ آپ کا قلب جس میں یہ مشاہدہ تھا کبھی سوتا نہیں تھا اور ظاہر ہے کہ اس مشاہدہ والے کی نظر سے اسباب گر جائیں گے اور ایمان بالغیب سے ترقی کر کے شہود و عیاں تک پہنچے گا۔ لہذا اسکو واللہ خلقکم و ما تَعْمَلُونَ میں مشاہدہ دائمی ہوگا جو نظر سے اوجھل نہ ہوگا۔ اور وہ یقین نصیب ہوگا جو اس مشاہدہ کے مناسب ہے یعنی آیت شریفہ کے معنی پر کہ بیشک اللہ ہی نے ہیں پیدا کیا ہے۔ اور وہی ہمارے تمامی اعمال و افعال کا خالق ہے، ایسا نچتہ یقین ہوگا کہ غیر اللہ کی طرف کسی فعل کے منسوب ہونے کا قلب پر جیونٹی کے سر کی برابر بھی دسوسہ نہ گزرے گا۔ پھر کوئی شک نہیں کہ اس کیفیت کا صدور اشیاء کے لئے فارق العادۃ بنجاتا ہے اور تمامی اشیاء از خود ظہور میں آنے لگتی ہیں کہ یہ ایک سر اللہ ہے جس کے ہوتے ہوئے نہ سبب باقی رہتا ہے نہ واسطہ۔ پس اس مقام والا شخص اگر اسباب کے ساقط اور فعل کے رب الارباب کی طرف منسوب ہونے کا کوئی اشارہ فرمائے تو لا محالہ اس کا قول بالکل حق اور اس کا کلام مجسم صدق ہوگا۔ البتہ جس کو محض ایمان بالغیب حاصل ہو اس کے نزدیک واللہ خلقکم و ما تَعْمَلُونَ میں مشاہدہ نہیں بلکہ اس کا مشاہدہ یہ ہے کہ فعل منسوب ہے اس کی طرف جس کے ہاتھوں اس کا ظہور ہوا اس کو آیت شریفہ کے معنی اور فعل کو خدا کی طرف منسوب کرنے کی جانب صحت اس کا وہ ایمان کہینچتا ہے جو حق تعالیٰ نے اسے بخشا ہے پس اس کے لئے توجہ جاذب ہیں۔ ایک من جانب اللہ یعنی اس کا ایمان کہ اس کو کہینچتا ہے حق کی طرف اور دوسرا من جانب الطبیعت۔ یعنی آنکھوں کا مشاہدہ



اور فعل کا غیر کی طرف سے ظہور اس کو کھینچتا ہے باطل کی طرف۔ پس وہ ہر وقت ان دو باتوں میں الجھا رہتا ہے کہ کبھی جاذب ایمانی قوی ہو جاتا ہے تو گھڑی دو گھڑی کے لئے آیت مذکورہ کا مفہوم مستحضر ہو جاتا ہے اور کبھی جاذب طبعی قوت پکڑتا ہے تو ایک دن دو دن کے لئے آیت کے معنی سے غافل ہو جاتا ہے۔ اور اس غفلت کے زمانہ میں وہ یقین جو خارق عادت تھا جاتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمودہ اگر تا بیر نہ کرو تب بھی کھجور اچھی آئے گی، وقوع میں نہ آیا کیونکہ وہ یقین خارق للعادة جس پر قلب محمدی مشتمل تھا حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو حاصل نہ تھا اور جب حضرت کو علم ہوا کہ عمدہ کھجور پیدا نہ ہونے کا سبب یہ ہے اور اس کا ازالہ صحابہ کی طاقت سے باہر ہے تو ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا اور فرمایا کہ تم اپنی دنیا کے معاملات سے زیادہ واقف ہو رہا جس پابندی اسباب کے عادی ہو وہ کئے جاؤ۔ سبب ایسا پیارا جواب تم نے کبھی کسی سے سنا یا کسی کتاب میں دیکھا بھی ہے حالانکہ حدیث وہ ہے جو جمال الدین بن الحاج سیف الدین آمدی اور صفی الدین ہندی اور ابو حامد غزالی رحم جیے اکابر علماء اصول کو مشکل نظر آئی ہے ایک شخص نے بجلی کی روشنی کبھی نہیں دیکھی مگر صد ہا لوگوں نے اس سے بیان کیا کہ تیل بتی اور دیا سلائی کے بغیر ہزاروں قمقمے یکدم روشن ہو جایا کرتے ہیں اور ایک شخص اتفاق سے دہلی گیا اور آنکھوں سے دیکھ آیا کہ سارے شہر کے گھر گھر میں برقی روشنی ہو رہی ہے ان دونوں صورتوں کے یقین میں جو فرق ہے وہی عقائد مذہب کے اعمال بالعبادہ کے یقین میں فرق ہے۔ کہ ایمان بالعبادہ کے یقین لوگوں کے اعتراضات سے مسترزل ہو جاتا اور محض کسی مصلحت کے لحاظ سے اوپری اور مارے باندھے کا رہ جاتا ہے اور جو یقین آنکھوں سے دیکھنے پر حاصل ہوا ہے اگر ساری دنیا بھی اس کے خلاف کہے تو یہ ہنستا اور جواب دیتا ہے کہ میں کیسے مان لوں جبکہ میں نے خود مشاہدہ کر لیا ہے۔ پھر اس مشاہدہ کے یقین میں بھی درجات ہیں کہ ایک یقین ہے لوہار کا جس نے برقی روشنی کو دیکھ پایا اور ایک یقین ہے اس انجینیئر کا جو بجلی کے فن میں ماہر اور اس کے جز جز کی خاصیت و اثر و کیفیت سے آنا واقف ہے کہ دنیا میں اپنی نظر نہیں رکھتا۔ دونوں کے درمیان بلحاظ کمی و بیشی یقین کے صد ہا مراتب نکلیں گے جن کا سمجھنا بھی مشکل ہے۔ مقامی مغیبات کا جن کی اطلاع اللہ و رسول نے دی ہے باوجودیکہ نظروں سے اوجھل ہیں ایسا یقین کہ تا کہ دنیا بھر بھی ان کی منکر ہو جائے تو تزلزل نہ آئے ایمان کہلاتا ہے اور اسی کا نام اصطلاح شریعت میں عقیدہ ہے جس کا ماننا اللہ و رسول کی تہدیق اور ان کو سچا ماننا ہے یہی ایک عقیدہ ہے کہ اللہ ہی نے ہمیں پیدا کیا اور اسی نے ہمارے افعال کو پیدا کیا ہے کہ زید نے مثلہ عمر کو قتل کیا یا مثلاً اس کو اشرنیاں دیکر مالا مال بنا دیا تو بظاہر فعل قتل اور فعل عطا کا خالق زید نظر آ رہا ہے مگر درحقیقت اس کے اندر ایک بڑی طاقت کام کر رہی ہے جس کو مشیت الہیہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ نہ چاہتا تو نہ قتل وجود میں آتا نہ عطا کیونکہ عدم سے وجود میں لانا اور نیست کو هست کرنا ہی تو تخلیق ہے اگر یہ کام خود تاتل اور معطی کا ہے تو یہ خالق ہوا اپنے فعل کا اور صفت خلق میں حکماً ذال اللہ شریک خدا قرار پایا۔ جب تک اس عقیدہ کا محض ایمان بالعبادہ ہوگا تو قسم قسم کے



شبہات پیدا ہوں گے۔ مثلاً یہی کہ بچہ اس کو جزا و سزا کیوں دی جائے گی؟ اگرچہ اس کا جواب دیا جائے گا کہ زید اپنے فعل کا خالق بیشک نہیں مگر کاسب ضرور ہے۔ مثلاً چھری سے گلے کو ذبح کیا تو بظاہر یہ فعل یہ فعل چھری کا ہے مگر حقیقت کارفرما اس کی وہ قوت بازو ہے جو نظر نہیں آتی۔ ورنہ یہی چھری اگر افیونی یا طفل شیرخوار کے ہاتھوں میں ہوتی تو کھال بلکہ بال بھی نہ کاٹ سکتی۔ با ایں ہمہ چھری کی جانب کسب منسوب ہے اور اس لئے اگر خون آلودہ ہوگی تو یہی ہوگی اور ٹوٹے گی تو یہی ٹوٹے گی، اور پھر قابل مرست ہوگی تو جوڑنے کے لئے اسی کو آگ میں تپایا جائے گا اور ناتاہل مرست ہو جائے گی تو کوٹری پر بھی اسی کو پھینکا جائے گا کہ بول و پرز میں پڑی سڑتی رہے اور انسان میں تو یہ حال حس و ارادہ بھی رکھا ہوا ہے جو لوہے کی چھری میں نہ تھا۔ بہر حال کسب اور مصدر فعل ہونا خود ایسی چیز ہے جس پر فعل کا اثر بصورت خاصیت ہر چیز پر پڑتا ہے اس کا مدار ارادہ پر بھی نہیں ہے سنکھیا کوئی یا ادھ خود کھائے یا کوئی اس کو جبراً قہراً کھلا دے بہر حال اس کے پیٹ میں جاتے ہی اپنا اثر دکھائے گا یہ تو فصل ہے موئے کریم کا کہ جس معصیت میں عامی کے ارادہ کا دخل نہ ہو اس کی خاصیت بد کو سلب فرما کر سزا کو اٹھایا چہ جائے کہ جن افعال میں واسطہ پڑ گیا اس کے قصد و ارادہ بلکہ عزم و جزم کا تم چاہتے ہو کہ وہاں بھی زہر اس کے لئے مہلک نہ رہے با ایں ہمہ یہ جواب بھی چونکہ اسی کا ہے جس کو مشاہدہ نہیں صرف ایمان بالغیب ہے اس لئے ممکن ہے کہ دو عقلوں کی کشتی میں یہ اس کو بچھاڑ دے یا وہ اس کو چت کر دے۔ مگر اس وقت مقابلہ ہے مشاہدہ کا کہ سوالا کھ انبیاء اور ان گنت صلی و اولیاء اس حقیقت کا مشاہدہ کر چکے ہیں کہ کیا صورت یہ ہے کہ قائل و کاسب ہونے کی اور کیا صورت یہ ہے حق تعالیٰ کے مقدر و خالق ہونے کی جس سے نہ افعال کی تخلیق سے خالق پر عیب آتا ہے اور نہ بندہ کاسب کے اوپر سے سزا و جزا کا استحقاق اٹھتا ہے۔ ان حضرات کا یقین چونکہ علمی نہیں بلکہ عینی ہے اس لئے یہ اعتراضات و شبہات ذرہ برابر بھی خلیجان میں نہیں ڈال سکتے، اور دنیا بھر بھی اس عقیدہ کا انکار کرے تو ان کے نور یقین پر بال برابر بھی غبار نہیں پڑ سکتا پس یا تو حق تعالیٰ ہم سب کا روں کو بھی مشاہدہ مغیبات نصیب فرمائے تاکہ عین البیقین حاصل ہو، ورنہ ہماری بھٹکی یقین کے لئے اتنا کافی ہے کہ جب ہم نے باوجود آنکھوں سے نہ دیکھنے کے لندن کا یقین کر لیا کہ واقعی وہ ایک شہر ہے کیونکہ اس کے وجود کا اقرار کرنے والے گو عوام الناس ہیں جن کے سچے ہونے کی کوئی دلیل نہیں مگر اتنے کثیر ہیں جن کے ایک غلط بات پر متفقہ کمیٹی بنالینے کو عقل تسلیم نہیں کرتی، تو اللہ کے خالق افعال ہونے کو جس کا منجر خود حق تعالیٰ اور جس کے راوی حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک سوالا کھ انبیاء اور قہرمان کے ہزاران ہزار صلی و اولیاء ہیں، جن کے مجسمہ صدق ہونے کا دشمنوں نے بھی اعتراف کیا ہے، کیسے یقین نہ کریں خصوصاً جبکہ اس کے ناقل بالعموم اہل مشاہدہ ہیں کہ جو کچھ کہہ رہے آنکھوں سے دیکھی ہوئی کہ رہے ہیں اب اتنا اور سمجھ لو کہ مشاہدہ سے یقین حاصل ہونے کا اثر یہ ہے کہ اسباب و وسائل سے نظر



اٹھ جاتی اور ساری مخلوق بمنزلہ ظرورت خالیہ کے نظر آتی ہے کہ حقیقتہً کوئی بھی کچھ نہیں کر رہا۔ سب میں کار فرما صرف  
 مشیت الہیہ اور ارادہ خداوندی ہے لہذا مدح ورم ان کے نزدیک مساوی ہو جاتی اور ذاتی ریزاؤں کا داعیہ انتقام  
 سلب ہو جاتا ہے مگر پھر اس میں دو قسمیں ہوتی ہیں کہ اکثر حضرات تو باوجود اس یقین کے کہ اسباب ہیج اور غیر موثر  
 بالذات ہیں اسباب کا پابند رہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اللہ کی عادت جاریہ کا توڑنا ادب کے خلاف ہے مگر بعض پر غیر  
 اختیاری غلبہ ہوتا ہے اور وہ تارک اسباب بن جاتے اور فرع کو چھوڑ کر بالکل اصل کی طرف تکیہ ہو جاتے ہیں چونکہ  
 حق تعالیٰ کی بمقتضائے اَکَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ بِیْ عَادَتِ ہے کہ جیسا بندہ کا برتاؤ اُس کے ساتھ ہوتا ہے ایسا ہی  
 اُس کا برتاؤ بندہ کے ساتھ ہوتا ہے اس لئے پہلی جماعت کے لئے یہ قانون ہے کہ اسباب اختیار کریں گے تو نتیجہ مرتب  
 ہوگا ورنہ نہیں اور دوسرے فریق کے لئے خارق عادت برتاؤ ہوگا کہ جب انہوں نے بشری عادت کو توڑ کر اسباب  
 کو چھوڑ دیا تو مشیت بھی اپنی عادت جاریہ کو چھوڑ کر ان کے لئے ترک اسباب ہی پر نتیجہ مرتب فرمائے گی اسی کا  
 نام معجزہ اور کرامت ہے مگر ترک اسباب کا درجہ اگر کوئی بہ تکلف و تصنع اختیار کرے گا تو یہ ثمرہ ہرگز مرتب  
 نہ ہوگا کہ بناوٹ بناوٹ ہے اور حقیقت حقیقت۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ ترک اسباب کا امر طبعی بنجانا جو مصدر کرامت  
 بناتا ہے انسان کا کسی اختیاری فعل نہیں بلکہ منجانب اللہ وہی واضطراری ہے اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ کرامت یا معجزہ  
 دلی یا نبی کا اختیاری فعل نہیں ہے بلکہ من اللہ ہے۔ لہذا کسی کو اگر یہ کیفیت حاصل نہ ہو تو نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ناقص  
 اور کمزور ہے اور نہ یہ کہ اس کو بختہ یقین حاصل نہیں اور اسی لئے اس کی تحصیل مامور نہیں حضرات صحابہ کی طبیعت  
 نے چونکہ تائید کو عمر بھر کے تجربہ کی وجہ سے خود دلوش کا درجہ دے رکھا تھا کہ کھانا اور پانی اگرچہ سیری و سیرابی میں موثر حقیقی  
 نہیں مگر عادت اللہ کی بنا پر نتیجہ کا ترتیب ان کے استعمال ہی پر موقوف ہے اس لئے باشارۃ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم  
 جب اس کو انہوں نے بہ تکلف چھوڑا تو سبب کا ترتیب نہ ہوا اور کھجور ناقص پیدا ہوئی۔ لیکن اگر طبیعت ان کی دوسرے رنگ پر  
 چلنے والی ہوتی اور اختیار اسباب سے گریز کرنے سے اُنس ہوتا جو کہ مقتضا تھا اس وقت طبیعت ان کی دوسرے  
 رنگ پر چلنے والی ہوتی اور اختیار اسباب سے گریز کرنے سے اُنس ہوتا جو کہ مقتضا تھا اس وقت طبیعت محمدیہ کا قولہ محالہ خرق عادت کا  
 ظہور ہوتا اور جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ترک غذا کے وقت بھی تغذیہ انوار شمس کی سیری ہو جاتی تھی اسی طرح ان کو بھی تائید کے  
 بغیر عمدہ کھجور ضرور عطا ہوتی خلاصہ یہ ہے کہ قوت یقین کی صرف قسموں کا فرق تھا کہ اگر غیر اختیاری داعیہ ترک اسباب پیدا ہو جاتا تو مصدر کرامت  
 بن جاتے مگر ان کا حصول ان کی طاقت سے باہر تھا اور اس کی ہوس بھی انکو نہ تھی تربیت رسول نے عبدیت ہی کے سبق زیادہ دئے تھے  
 اس لئے ان کی قوت یقین کا درجہ یہ رہا کہ ملک اسباب کا کلی انقطاع تھا اور اعضا بدن سے ان کا پورا اخذ و انقباض اور اس لئے بجائے مصدر کرامت بننے  
 کے جامع ہر دو صفات اور مخزن کمال بننے ورنہ عرف میں جس کا نام منفع یقین ہے اہل تو صحبت محمدیہ میں وہ قائم نہیں رہ سکتا تھا اور اگر بڑا نام ہوتا  
 بھی تو آنحضرت اُن کو ان کی حالت پر کبھی نہ چھوڑتے بلکہ قولاً یعنی فوراً اصداًج فرماتے اور عملاً و عملاً بھی وہ اُن کے قلوب میں ضرور ڈالتے جس سے کمزوری کا فوراً  
 ہو جاتی۔ واللہ اعلم۔



(۲۱) میں نے حضرت سے اس حدیث کا مطلب دریافت کیا کہ جب مؤذن اذان دیتا ہے تو شیطان بھاگتا ہے اور اُس کے مقدسے آواز کے ساتھ رنج نکلتی ہے۔ فرمایا شیطان بھاگتا اس لئے ہے کہ کلمات اذان جب صاف ستھری ذات سے نکلتے ہیں تو جہاں تک آواز پہنچتی ہے تمامی فضا اُن کے نور سے بریز ہو جاتی ہے چونکہ نور میں خنکی ہے اور شیطان پیدا ہوا ہے مثلاً آگ سے اور خنکی و آگ میں ضد ہے اس لئے اس کا بھاگنا ایسا ہے جیسا تاریکی کا بھاگنا روشنی سے اسی کے قریب وہ مضمون ہے جو ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ جنات کو دوزخ میں آگ کا عذاب دیا جائے گا۔ کیونکہ وہ تو ان کی طبیعت ہے کہ پیدائش ہی ان کی آگ سے ہے اور طبعی چیز سے تکلیف نہیں ہوا کرتی۔ لہذا ان کو سردی اور زہریلا کا عذاب دیا جائے گا پس نار کی دھیمیں ہوں گی۔ ایک نارِ حارہ کہ ٹھنڈی کر کوئلہ بنا دے دوسرا نار بارود کہ ٹھنڈی کر ہلاک کر دے اور جنات دنیا میں بھی خنکی سے بہت ڈرتے ہیں حتیٰ کہ موسم گرما میں بھی ٹھنڈی ہوا ان کے لئے اندیشہ ناک ہے اور جب ٹھنڈی ہوا چلتی ہے تو ایسے بھاگتے ہیں جیسے جنگلی گدھے اور پانی میں تو جنات اور شیطان کبھی داخل ہی نہیں ہو سکتے اور اگر کسی کو پکڑ کر پانی میں ڈال دیا جائے تو بھیکرا ایسا پارہ پارہ ہو جائے گا جیسے ہم میں سے کوئی آگ میں گھر گھل جاتا ہے اور اگر تم سمجھنا چاہو کہ حق کیا ہوتا ہے تو ایک گاڑھی ظلمت والی آگ پر تم نظر ڈالو جس میں دھواں بہت زیادہ ہو جیسے مکہار کے آدے میں ہوتا ہے پھر جس شکل پر حق تعالیٰ نے جنات کو پیدا کیا ہے وہ اپنے متخیلہ میں لا کر اس دھوئیں والی آگ میں کھڑا کر دے یہ کچھ شبہ ہوگی جنات کی۔

(۲۲) میں نے حضرت سے اس حدیث کا مطلب دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صوم وصال رکھتے ہوئے دیکھ کر صحابہ نے بھی روزہ پر روزہ رکھنا شروع کر دیا آپ نے فرمایا کہ دو روزوں کے درمیان کچھ کھا لیا کرو ورنہ کمزور ہو جاؤ گے۔ میری حرص نہ کرو کہ میں تو اپنے رب کے پاس اس حالت میں شب گزارتا ہوں کہ وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے، فرمایا رب کے پاس سے مراد اس کی معیت ہے (کہ ذات باری جگہ سے منزہ ہے) اور کھلانے پلانے سے مراد حق تعالیٰ کا اپنے نبی کو قوت عطا فرمانا ہے (مطلب یہ ہوا کہ مجھے اللہ کی معیت نصیب ہے اور وہ مجھے بغیر کھائے وہ قوت بخشتا ہے جو تم کو غذا کے واسطے عطا ہوتی ہے) لہذا مجھے صوم وصال سے صنعت جسمانی لاحق نہیں ہوتا، میں نے عرض کیا کہ ذات تراپی کے لئے کیا انوار و تجلیات کا ذوق کافی ہو جاتا ہے اور غذا کی ضرورت نہیں رہتی؟ فرمایا کافی نہیں ہوتا فرض کرو نبی کو کوئی شخص پکڑے اور کھانا پانی بند کر دے تو نبی کا ضرر انتقال ہو جائے گا کیونکہ مٹی کے پتلا کو مٹی سے پیدا ہونے والی غذاؤں کے بغیر چارہ نہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ تم حضرات انبیاء کو دیکھتے ہو کہ کھاتے بھی ہیں، پیتے بھی ہیں اور ان کو بھوک بھی لگتی ہے، باقی صوم وصال میں حضرت پر صنعت کا اثر نہ ہوتا اور غذائے روحانی کا کسی وقت غذا جسمانی کے قائم مقام بن جانا یا اثر ہے محبت کا کہ محبوب کے ساتھ رہتے ہوئے محب کو اکثر بھوک نہیں لگتی اور نہ فاقہ کی کمزوری محسوس ہوتی ہے یا اس کی نوعیت معجزہ کی ہے (واللہ اعلم)

نہ: اسی سے یہ نکل آیا کہ شیطان کا گونا گونا بھی بوجھ غم ہوتا ہے جیسے کہ عاجب شیر سے بھاگتا ہے تو بے اختیار گرز نکلتے جلتے ہیں اسکا لئے اذان کے لئے بلند آواز سے کہ اس کی آواز دہنی دور تک جاتے گی فلاورنگ منور ہوگا۔ ۱۲ ترجم



(۲۳) میں نے حضرت ممدوح سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شب میں ہوئی جیسا کہ ایک جماعت علماء کی رائے ہے اور ان کی دلیل یہ تھی کہ یہ روایت ہے کہ حضرت عثمان بن ابی العاصؓ اپنی والدہ فاطمہ بنت عبد اللہ ثقفیہ سے نقل فرماتے ہیں کہ انہوں نے ذکر فرمایا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے وقت موجود تھی تو آپ کی ولادت کے وقت میں نے دیکھا کہ سارا گھر نور سے بھر گیا اور تاروں کو دیکھا کہ آسمان سے اتر کر اتنے قریب آگئے ہیں کہ مجھے گمان ہوا میرے سر پر آپڑیں گے، اور تارے صرف رات ہی میں نظر آیا کرتے ہیں یا ولادت شریفہ دن میں ہوئی کہ علماء نے اسی کو صحیح بتایا اور مسلم وغیرہ کی حدیث کو دلیل بنایا ہے۔ ہاں یہ ضرور کہا ہے کہ صبح صادق نمودار ہوتے سے کچھ ہی بعد ولادت ہوئی جیسا کہ ایک حدیث میں منقول بھی ہے اور اگرچہ وہ حدیث ضعیف ہے مگر فضائل و مناقب میں ضعیف بھی قابل عمل ہے۔ اور پہلی حدیث کا یہ جواب دیا ہے کہ تارے تو پو پھٹنے کے بعد بھی نظر آتے رہتے ہیں۔ لہذا اس سے قبل از فجر یعنی شب میں ولادت کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔

حضرت ممدوح نے فرمایا کہ واقعہ اور نفس الامریہ ہے کہ ولادت شریفہ تو آخر شب میں طلوع صبح صادق سے کافی وقت پہلے ہوئی، مگر ماں سے چھوٹا طلوع فجر پر ہوا۔ اور وہ زمانہ جو آپ کے لطن مادر سے باہر آنے اور رائل نال خارج ہونے پر) ماں سے علیحدہ ہونے کے درمیان (قریب دو گھنٹہ یعنی سوس الیل) کا تھا۔ وہی ساعت قبولیت دعا ہے جس کی فضیلت بکثرت حدیثوں میں آئی اور اس کی عظمت و فحمت ظاہر کی گئی ہے حتیٰ کہ قیامت تک کے لئے اس کا حکم ممتد کر دیا گیا تاکہ قیامت تک کے لئے جو کوئی بھی اس مبارک وقت میں دعا مانگے گا وہ قبول ہوگی اور وہی ساعت ہے جس میں اطراف عالم کے اہل دیوان اولیاء اللہ یعنی غوث اور ساتوں قطب اور اہل دائرہ وعدہ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین مکہ سے باہر غار حرا میں جمع اور نور اسلام کا ستون ہاتھوں میں اٹھائے ہوتے ہیں کہ تمامی امت انہیں سے استعاذہ کرتی ہے اور اس ساعت میں جس شخص کی دعا اہل دیوان کی دعا سے اور جس کا تہجد ان کے تہجد سے موافقت کھاتا ہے حق تعالیٰ اس کی دعا قبول اور اس کی حاجت پوری فرماتا ہے حضرت ممدوح اکثر ہمیں اس ساعت سے عین وقت پر کہ دیکھو یہ ہے وہ ساعت مبارکہ، آگاہ کیا کرتے تھے اور ہم سے فرمایا کرتے تھے کہ فاس میں صبح صادق مکہ کی صبح صادق سے کچھ بعد طلوع کرتی ہے (کہ کئی سو میل غرب میں واقع ہے) لہذا اپنے قیام شب میں مکہ کے طلوع فجر کا لحاظ رکھا کرو اور اسی کو اپنا معمول بناؤ۔ میں نے دریافت کیا کہ شہر فاس کے طلوع فجر سے کتنی مدت پہلے مکہ میں فجر طلوع کرتی ہے فرمایا مسجد قروین کا موزن ابن جمہور وقت اذان دیتا ہے مکہ میں اس کچھ پہلے صبح صادق ہو جاتی ہے میں نے کہا تو ساعت قبولیت کا صبح وقت وہ ہوا جس میں وردی اٹھتا ہے اور اس کے فنادیر بعد سلاوی فرمایا ہاں۔ چنانچہ حضرت ممدوح کی خدمت میں حاضری سے قبل تقریباً سولہ برس میرا یہ معمول رہا کہ سورہ کہف کی آخر آیت اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے اَحَدًا تک اس نیت سے پڑھ کر



سویا کرتا تھا کہ ساعت قبولیت میں آنکھ کھل جائے تو اکثر میری آنکھ وردی کے وقت میں کھلا کرتی تھی اور کبھی کچھ دیر بعد سلازی کے وقت میں۔ بلکہ دیگر بلاد کے ان حضرات سے بھی جن کو ساعت قبولیت کا اہتمام تھا میں نے یہی سنا کہ وہ اس عمل کو پڑھ کر سوتے ہیں تو ان کی آنکھ اس وقت کھلتی ہے جتنا ان کے مطلع سے مکہ کا مطلع مقدم ہے (یہ ایک مجرب عمل ہے کہ جو بھی اس کو سوتے وقت پڑھے گا وہ جس وقت اٹھنے کا ارادہ کرے گی اسی وقت آنکھ کھلے گی)

(۲۴) پھر میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ کا مہینہ دریافت کیا کہ اس میں بھی علماء کا بہت اختلاف ہے۔ کوئی کہتا ہے صفر کا مہینہ تھا کوئی کہتا ہے ربیع الثانی کوئی ماہِ رجب بتاتا ہے کوئی ماہِ رمضان اور کوئی روزِ عاشورا (محرّم) اور کوئی کہتا ہے کہ صحیح مہینہ کسی کو معلوم نہیں۔ حضرت نے فرمایا ماہِ ربیع الاول تھا پھر میں نے تاریخ دریافت کی کہ اس میں بھی اختلاف ہے کوئی کہتا ہے دوسری تاریخ تھی کوئی کہتا ہے ساتویں تھی اور کسی کو علمائے اکثر ترجیح دی ہے اور کوئی کہتا ہے نویں تھی اور کوئی کہتا ہے بارہویں تھی۔ فرمایا ساتویں ربیع الاول تھی اور یہی واقعہ نفس الامری ہے کہ ساتویں ربیع الاول کی شب میں ولادت شریفہ ہوئی۔ پھر میں نے پوچھا سنہ ولادت میں بھی علماء کا اختلاف ہوا ہے کوئی کہتا ہے عام الفیل (یعنی جس سال ابرہہ مہینی نے ماکھتوں سے مکہ پر چڑھائی کی تھی) اس واقعہ سے بچا جس دن بعد ولادت شریفہ ہوئی اور کوئی کہتا ہے واقعہ فیل سے پچپن مہینہ بعد اور کوئی کہتا ہے چالیس مہینہ بعد کوئی کہتا ہے دس برس بعد اور کوئی کہتا ہے واقعہ فیل سے پندرہ سال بعد حضرت نے فرمایا عام الفیل ہی میں ولادت ہوئی مگر ماکھتوں کی چڑھائی سے پہلے اور آپ ہی کے وجود یا مسعود کی برکت سے کہ آپ غریب تشریف لانے والے تھے، حق تعالیٰ نے مکہ سے ماکھتوں کا حملہ دور فرمایا اور اہل مکہ کو نجات بخشی۔ پھر میں نے حضرت سے یہ نہ پوچھا کہ واقعہ فیل سے کتنے دن پہلے ولادت شریفہ ہوئی۔ اگر یہ دریافت کرتا تو آپ اس کا بھی تعین فرما دیتے۔ پھر میں نے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حمل (اور لطن مادر میں رہتے) کی مدت کتنی تھی؟ فرمایا دس مہینہ۔ پھر میں نے پوچھا کہ بغل شریف میں بال تھے یا نہیں کہ علماء کا اس میں بھی اختلاف ہے۔ فرمایا اتنے بال نہ تھے جن کو نوچا جاسکے بہت ہی قلیل تھے اور اسی کا نام عُقرت (جس کا ذکر احادیث میں آیا ہے) یعنی سپیدی جس میں قلیل سیاہی مخلوط ہو اور اس میں بال کم ہونے کا سبب یہ تھا کہ آپ کے سینہ مبارک پر اور دونوں مونڈھوں پر بال زیادہ تھے اس لئے دونوں بغلوں میں بال بہت کم ہوئے، بعض روایات میں دیکھا کہ حضرت کے ہر دو شانہ مبارک پر بال تھے مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا تھا کہ حضرت ممدوح سے سنا اور وجہ معلوم ہوئی کہ بغل کی جگہ شانہ پر بال نمودار ہوئے، تب انشراح ہوا۔ پھر میں نے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آبروئے مبارک دونوں ملی ہوئی تھیں یا دونوں میں فصل تھی؟ فرمایا ملی ہوئی نہیں تھیں۔ پھر میں نے حضرت کی



رفتار کا سوال کیا کہ داہنے اور بائیں مائل ہو کر چلتے تھے جیسا کہ بعض روایتوں میں آتا ہے یا جس طرح  
اوپر سے نیچے اترتے ہوئے آگے کو جھکتے ہیں جیسا کہ دوسری روایتوں میں آیا ہے۔ فرمایا کہ دائیں اور بائیں جانب  
جھکاؤ لے کر چلتے تھے اور چونکہ اس وقت ہمارے ساتھ کوئی تیسرا شخص نہ تھا اس لئے آپ نے فرمایا آؤ میں تم کو  
دکھاؤں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے اندر حیات شریفہ میں کسی طرح چلا کرتے تھے۔ اس کے بعد تقریباً  
ساتھ قدم آپ تیز چلے کہ دائیں اور بائیں جانب جھکاؤ ایسا پیارا کہ عقل اڑی جاتی تھی اور اس کے حس و حال  
پر دل لوٹا جاتا تھا۔ پھر میں نے سوال کیا کہ ریش مبارک کے متعلق کہ اس کی کیفیت میں بھی اختلاف ہے فرمایا آپ کی  
ڈاڑھی ذقن میں بھری ہوئی گنجان تھی متوسط درجہ کا طول لئے ہوئے، اور جہاں رخسارہ ذقن ملتے ہیں وہاں کے  
بال زیادہ گنجان نہ تھے۔ پھر میں نے موائے مبارک کے متعلق دریافت کیا امدہ بالوں کی سپیدی کے متعلق اور  
خضاب کرنے کی بابت اور یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رحیم کے بال اڑانے کے متعلق کیا کبھی چوہہ کا استعمال  
فرمایا تھا؟ فرمایا سر مبارک کے بال ایک حالت پر نہیں رہتے تھے کبھی میسرہ جاتے اور لمبے ہو جاتے اور کبھی رکتے رہتے۔  
تو بالائے کان تک چھوٹے ہو جاتے تھے مگر پیشانی سے ملے ہوئے بال آپ نہ چھوڑتے بلکہ کتر دیا کرتے تھے۔ اور  
اوسر کا حلق بجز حج کے آپ نے کبھی نہیں کرایا امدہ سفید بال صرت لب زیریں اور ذقن کے درمیان ریش بچہ  
میں تھے تقریباً پانچ بال اور چند بال دونوں کنبی میں، البتہ ذقن شریف میں کچھ زیادہ تھے۔ اور خضاب اپنے منہ کی  
کا کیا ہے مگر بہت کم۔ ایک مرتبہ جبکہ آپ (فاتح بنکر) میں داخل ہوئے اور صرت چند بار مدینہ میں اور نورہ  
کا استعمال درمیان میں فرمایا کہ حضرت خدیجہ اور حضرت عائشہؓ لگایا کرتی تھیں۔ پھر میں نے شوق صدر کے  
متعلق دریافت کیا کہ کتنی مرتبہ ہوا۔ کیونکہ اس میں احاریت مختلف آئی ہیں۔ فرمایا تین مرتبہ۔ اول حضرت  
صلیہ کے ہاں، امداس وقت (وہ مصنفہ) نکالا گیا جو شیطان کا حصہ ہے کہ ذاتِ ترابی جس مخالفت حکم الہی  
اور اتباع خواہش نفسانی کو چاہتی ہے اس کا تعلق اسی سے ہے دوبارہ دس سال کی عمر میں، اور اس وقت  
خطراتِ ردیہ کی جڑ نکال دی گئی کہ جوانی کے زمانہ میں کسی خطرہ یدانے کا خطرہ ہی نہ رہا، تیسری مرتبہ نبوت کے وقت  
ہوا۔ مگر میں نے یہ نہ پوچھا کہ اس وقت کیا چیز نکالی گئی۔ میں نے کہا کہ اکثر احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ شبِ موع  
میں بھی شوق صدر ہوا۔ فرمایا یہ صحیح نہیں اور فرمایا کہ شوق صدر میں نہ کوئی آلم استعمال کیا گیا، نہ خون نکلا، اور نہ شوق کا  
بھر جانا بذریعہ ٹانگے لگانے کے ہوا نہ سوئی وغیرہ سے کام لیا گیا امدہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی  
تکلیف ہوئی کہ یہ خاص فعل ربانی تھا۔ پھر میں نے عرض کیا لوگ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشت شہادت  
بیچ کی انگلی سے بڑی تھی۔ فرمایا آپ کے پاؤں کی انگشت شہادت بڑی تھی بیچ کی انگلی سے اور ہر دو دست مبارک کی  
انگشت شہادت تو برابر تھی بیچ کی انگلی کے۔ پھر میں نے عرض کیا کہ آنحضرت کو تین مرتبہ



پہنچنے کے متعلق دریافت کیا کہ جب اقترأ باسمک الذی خلق لے کر آئے تو حضرت نے فرمایا میں تو بڑھا ہوا نہیں ہوں۔ تب حضرت جبریلؑ نے آپ کو بغل گیر ہو کر اتنا بھینچا کہ حد کردی حضرت مدوح نے فرمایا حضرت مدوح نے فرمایا حضرت جبریلؑ کا پہلا بغل گیر ہونا تو اس لئے تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بارگاہ الہی میں وسیلہ بنائیں کہ اللہ کی وہ دائمی خوشنودی حاصل ہو جس کے بعد ناراضی کا وجود ہی نہ ہو۔ اور دوبارہ بغل گیر ہونا اس عرض سے تھا کہ جاہ محمدی میں داخل اور آپ کے جلال مبارک کی پناہ میں آجادیں اور سربارہ اس لئے تھا کہ آپ کی امت مرحومہ میں شمار ہو جائیں اور روح الامین کا یہ کہنا کہ پڑھئے، اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کلام قدیم کو رامت تک پہنچا دیئے بذریعہ حادث (یعنی زبانِ جہانی) کے، کہ سارا قرآن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اسی جگہ نازل ہو لیا تھا اور یہی مراد ہے شَکُّوْهُ كَصَفَاتِ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْآنُ سے۔ حضرت جبریلؑ علیہ السلام چاہتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید کے معانی قدیمہ اور اس اور مکالمہ ازلیہ کی جو اس وقت آپ کو حاصل ہوئی تبلیغ فرمائیں پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں قاری نہیں ہوں یعنی مجھ میں طاقت نہیں کہ کلام قدیم اور قول ازلی کو اپنی حادث زبان سے دوسروں تک پہنچا سکوں تب حضرت جبریلؑ نے آپ کو بتایا کہ حادث زبان سے تبلیغ کس طرح ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبریلؑ سے بہت محبت تھی کہ وہ طریق تبلیغ کی تعلیم کا واسطہ بنے تھے، واللہ اعلم

(۲۵) میں نے حضرت مدوح سے اس حدیث کے متعلق دریافت کیا کہ اَنْتُمْ لَنْ یَنْتَکُمُ الْخَرِیْسُ میں آل حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا کہ یہ قرن پورے سو برس پر ختم ہو جائے گا، فرمایا اس حدیث کا تکلم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے کچھ ہی قبل فرمایا ہے اور یہ روح شریفہ کا کلام ہے کہ ذات کریمہ کی تعزیت کر رہی ہے اور اس کو تسلی دے رہی ہے کہ تم ہی کیا سارا قرن زیر زمین جانو والا ہے چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرب وفات کا علم ہو گیا تھا اس لئے ذاتِ تراوی سے کلمات تعزیت کہے تاکہ ذاتِ مطہرہ کو تسلی حاصل ہو اور مفارقت کا صدمہ ہلکا ہو جائے حضرت مدوح نے سچ فرمایا امام مسلم نے حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے کہ یہ ارشاد وفات شریفہ سے ایک ماہ قبل فرمایا تھا۔ پھر میں نے عرض کیا اور حدیث کے سوال سے اصل مقصود بھی یہی سوال تھا کہ اس قرن (یعنی پوری صدی) گزر جانے کے بعد جنہوں نے اپنے صحابی ہونے کا دعویٰ کیا تو اس حدیث سے کیا ان کی غلط بیانی پر استدلال ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ نو صدی گزر جانے پر جس نے صحابی ہونے کا دعویٰ کیا اس کو علماء نے چھوٹا قرار دیا ہے۔ علیٰ ہذا جس نے چھ سو برس بعد اس کا دعویٰ کیا چنانچہ عکراش اور معتر مغربی اور تین ہندی کے قصے مشہور ہیں۔ اور اصحابہ میں ان کے متعلق علامہ ابن حجر نے لمبی بحث بھی کی ہے اور پھر ان کے شاگرد شمس الدین سخاوی شرح الفیہ میں اور



امام سیوطی الحادی فی الفتاویٰ میں اس بحث کو لائے ہیں۔ حضرت مدوح نے فرمایا کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی پوری شمار کوئی نہیں کر سکتا خصوصاً جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے اور بعد میں بہترے حضرات ادھر ادھر منتشر ہو گئے اور ایک جماعت قواطرات زمین میں دورہ کرتی دور تک چلی گئی پھر کیسے پتہ چلے کہ کس نے کس سن میں وفات پائی اور سنہ ایسے کوئی بچایا نہیں) اور حدیث مذکور کے لفظ اگرچہ عام ہیں مگر مراد وہ خاص صحابہ ہیں جن کا صحابی ہونا مشہور اور عام لوگوں کو معلوم ہے۔ مکاشفہ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے پھر میں نے حضرات حرام کے متعلق تذکرہ کیا کہ لوگوں کا گمان ہے وہ صحابہ تھے اور حضرت کی حیات شریفہ میں حاضر خدمت ہوئے تھے اور حضرت نے ان سے بربری زبان میں گفتگو فرمائی تھی۔ چنانچہ ان کا قصہ علامہ شہاب نے شرح شفا میں لکھا ہے مگر کوئی سند نہیں بیان کی اور دیگر آئمہ نے اس کو ضعیف کہا ہے۔ فرمایا وہ صحابی نہ تھے اور صحابی کا نور اہل بصیرت پر ہرگز چھپ نہیں سکتا۔ بلکہ تمام ملک مغرب میں کوئی صحابی نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

## دوسرا باب آیات قرآنیہ اور سریانی زبان اور اہل تہذیب و فہم کے متعلق تفسیرات

(۱) حق تعالیٰ نے حضرت آدم اور حوا علیہما السلام کے قصہ میں فرمایا ہے فَلَمَّا آتَاهُمَا صَاحِبًا وَحَبَلًا لَّهُ شُرَكَاءُ فَمِمَّا آتَاهُمَا فَتَعَا كِي اللَّهُ عَمَّا يُشِيرُ كُودًا جب حق تعالیٰ نے ان کو صالح رط کا عطا فرمایا تو انہوں نے اللہ کے دئے ہوئے میں اس کے شریک بنا لئے۔ اللہ کی ذات بلند تر ہے لوگوں کے تجویز کردہ شریک سے) میں نے عرض کیا کہ سیدنا آدم علیہ السلام تو اللہ کے نبی اور پیارے ہیں وہ اللہ کے لئے شریک کیسے تجویز کر سکتے ہیں اگرچہ بعض علماء نے اس کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ شیطان کے کہنے میں آکر اپنے اپنے نوزائیدہ بچہ کا نام بعد الحاش رکھ لیا کہ عبدیت بجائے اللہ کے عارث کی طرف منسوب کی اور یہ شرک فی التسمیہ ہے کہ گو شرک فی العبادت کی طرح اس پر غلو و جہنم نہیں ہے مگر شان نبوت اور عصمت کے منافی ضرور ہے، فرمایا کبھی اولاد کے کروت پر باب سے گرفت ہوا کرتی ہے جیسے کسی کو باغ میں پھل پھول لگے ہوئے ہوں اور زید کے بچے اس میں گھس کر نقصان کریں کہ پھل توڑ کر پھینکیں اور شاخیں توڑ دیں تو باغ کا مالک زید کے پاس آئے اور اس پر عتاب و غصہ کرے کہ تو نے میرے باغ کا ناس کر دیا۔ میرے پھل کھا لئے اور میرے درخت اٹھاؤ دے وغیرہ۔ اسی اسلوب پر یہ قصہ قرآن مجید میں آیا ہے کہ شرک کیا بنو آدم نے اور عتاب کا رخ ہوا ابو البشر کی طرف تاکہ اولاد اگر غیر متمند ہو تو شرمائے کہ ہم ایسے کروت نہ کرتے تو ہمارے بے خطا باپ کو دھکیا کیوں سننا پڑتیں) جبرالامہ حضرت عبد اللہ بن عباس کا بھی یہی قول ہے جیسا کہ امام سیوطی نے درمنثور میں نقل کیا ہے اور اسی قول کو سید جرجانی نے شرح مواقف میں لیا ہے۔ اور دلیل یہ بیان کی ہے کہ آیت کا اسلوب بتا رہا ہے کہ اس کا تعلق کسے ساتھ ہے دیکھو کہ عَمَّا يُشِيرُ كُودًا لِبَصِغَةِ جِج ہے اور خود لفظ شرکاء لِبَصِغَةِ جِج بھی کفار ہی کے بارہ میں صحیح ہو سکتا ہے کہ سیدنا آدم علیہ السلام کا



تو قصہ ہی ایک تھا اس میں بہت سے شریک بنا لینا کیسے کہہ سکتا ہے) واللہ اعلم

(۲) حق تعالیٰ نے فرشتوں کا قول نقل فرمایا ہے کہ (جب آدم کو زمین میں خلیفہ بنانے کا حق تعالیٰ نے اظہار فرمایا تو فرشتوں نے کہا) کیا آپ ایسے کو خلیفہ بناتے ہیں جو زمین میں فساد برپا اور خونریزی کرے گا حالانکہ ہم آپ کی تسبیح و تحمید اور تقدیس کرتے رہتے ہیں۔ میں نے کہا اس میں ایک قسم کی غیبت ہو رہی ہے کہ حضرت آدم کی عدم موجودگی میں ان کے عیوب ظاہر کر رہے ہیں) حالانکہ حضرات ملائکہ محصوم ہیں (اور گناہ کا صدور ان سے ناممکن ہے) فرمایا یہ غیبت نہیں اور نہ غیبت کا ارتکاب فرشتوں سے ہو سکتا ہے کہ وہ اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ ان کی اس تقریر کا مطلب یہ تھا کیا آپ دنیا میں ایسی مخلوق کو آباد کرنا چاہتے ہیں جو صاحب حجاب (اور آپ کے مشاہدہ سے محروم) ہے حالانکہ دنیا آباد کرنے کے قابل آپ کے پاس وہ بندے موجود ہیں جن پر حجاب مطلق نہیں یعنی ہم کہ ہر وقت آپ کا مشاہدہ کرتے اور آپ کا مرتبہ پہچانتے ہیں اور اس کے لئے آپ کے حکم کا خلاف نہیں کر سکتے اور جسے مشاہدہ نصیب نہ ہو وہ چونکہ آپ کی شان نہ پہچان سکے گا لہذا آپ کے حکم کا خلاف کرے گا گویا یوں عرض کر رہے تھے کہ ان کو آپ کی معرفت حاصل نہیں اور ہمیں آپ کی معرفت حاصل ہے (پس غیر عارف کو غیر عارف بنانا ایسا ہے جیسے کوئی ولی کسی عامی شخص کو کہے کہ یہ ولی نہیں) اور یہ ان کی طرف سے محض اظہار تھا اپنے عندیہ کا اپنے منتہاء علم کے موافق۔ اسی لئے حق تعالیٰ نے جواب دیا اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ مجھے وہ معلوم ہے جو تمہیں معلوم نہیں)۔ یعنی یہ جو تمہارا خیال ہے کہ اہل حجاب میرے مرتبہ کو نہ پہچان سکے گا اور میرا مرتبہ شناس صرف وہی ہو سکتا ہے جو مجھے دیکھ بھی رہا ہو، یہ تمہارا منتہاء علم ہے اور میرا علم اس سے مافوق ہے کہ حجاب والے کو قوت بخش دوں گا اور میرے اس کے درمیان جو پردہ ہے اس کو دور کر دوں گا (جس کی وجہ سے دار دنیا میں رہتے ہوئے) اس کو میری معرفت حاصل ہوگی اور وہ صرف علم کے ذریعہ میرے قرب کے اس درجہ پر فائز ہوگا جس کی تم طاقت نہیں رکھتے۔ اور اسی لئے د علم عطا فرمانے کا اظہار کیا) وَعَلَّمَہُ الْاَسْمَاءَ كُلَّہَا کہ اللہ نے آدم کو تمامی اسماء کا علم دیا۔ میں نے کہا اس آیت میں خطاب تمامی ملائکہ کو ہے یا صرف زمین کے فرشتوں کو؟ فرمایا صرف زمین کے فرشتوں کو جبر الامۃ حضرت عبداللہ بن عباس و دیگر مفسرین رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے تفسیر ثعلبی وغیرہ دیکھ لو۔ نیز اپنے فرمایا کہ ملائکہ نے یہ امر کہ بنو آدم اپنے رب سے غافل اور خود رائے ہوں گے اور اپنے کو خود مختار سمجھیں گے لفظ خلیفہ سے سمجھا کہ جانشین کی شان استقلال و استبداد اور دوسروں سے استغناء و انفراد کی ہوا کرتی ہے لہذا فرشتوں نے نتیجہ نکالا کہ انسان تدبیر اور انجام بخیر اور مصلحتوں پر نظر رکھنے کو اپنی طرف منسوب کرے گا اور اپنے رب سے تعلق قطع کرے گا (کہ کوئی فعل بھی اللہ کی طرف منسوب نہ کرے گا اور حیب کہے گا یہی کہے گا کہ میں نے ایسا کیا تو یہ نتیجہ نکلا) اور اسی میں اس کی ہلاکت اور موت ہے (کہ پیدا کرنے والا مالک الملک تو کوئی چیز نہ رہا۔ جو کچھ ہوا اسی کی



اسی کی تدبیر اور عقل و سعی سے ہوا) غرض لفظ خلافت سے فرشتوں نے اخذ کیا کہ آدمی اللہ تعالیٰ سے غافل ہوگا۔

(۳) قرآن مجید میں ہے وَأَتَّبِعُوا احْسَنَ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ تَهْتَدُوا رَبُّكُمْ بِطَرَفٍ مِنْ رِجْلَيْهِ يَوْمَ يُنْزِلُ السَّحَابَ يَنْزِلُ فِي سَحَابٍ مُمِيزٍ (سجۃ) اس میں سے بہترین باتوں کا اتباع کرو) میں نے عرض کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نازل شدہ کتاب میں ایسے بھی مضامین ہیں جو (اگرچہ اچھے ہیں مگر) بہتر نہیں ہیں، حالانکہ سارا قرآن (اور اس کا ہر مضمون) بہتر ہے۔ پھر علماء نے اس کے جتنے جواب دیئے ہیں وہ بھی میں نے ذکر کئے کہ بعض نے کہا ہے جس پر ظلم کیا جاوے اس کو انتقام لینا جائز ہے چنانچہ ارشاد ہے فَاَعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَى عَلَيْكُمْ جُنُودَ اللَّهِ وَلِيُخْلِفَ فِي الْأَرْضِ الَّذِينَ خَلَوْا بِهِمْ وَلَا يَجْعَلِ اللَّهُ لِلظَّالِمِينَ سُلْطَانًا مِمَّا كَانُوا يَفْعَلُونَ (سجۃ) اس پر زیادتی کی ہے تم بھی اس پر زیادتی کرو (لہذا انتقام لینا جائز ہوا) مگر صبر کرنا اس سے بہتر ہے چنانچہ ارشاد ہے وَلْيُصْبِرُوا فَلَاحُ ظُهُورِهِمْ (سجۃ) اور اگر تم صبر کرو (اور انتقام نہ لو) تو یہ بہتر ہے صبر کرنے والوں کے لئے۔ لہذا آیت کا یہ مفہوم ہوا کہ عفو کا اتباع کروں کہ سزا دینے کا سزا دینا بھی جائز ہے مگر معاف کرنا بہت اچھا ہے، اور بعض نے کہا ہے کہ نسخ چونکہ احسن ہے منسوخ سے اس لئے مطلب یہ ہے کہ جس آیت کا حکم منسوخ ہو چکا (اگرچہ احسن اس آیت میں بھی موجود ہے مگر) آیت کا نسخ زیادہ اچھی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ مطلب یہ ہے جس کام کا حکم دیا گیا ہے اس کا اتباع کرو اور جس کی ممانعت ہوئی ہے اس کو نہ کرو۔ اور بعض نے یہ مطلب بتایا ہے کہ عزیمت پر عمل کرو، رخصت پر عمل نہ کرو مثلاً سفر میں روزہ رمضان چھوڑنے کی اجازت اور رخصت ہے۔ مگر ناقابل برداشت نہ ہو تو روزہ رکھنا عزیمت ہے) اور بعض نے کہا ہے کہ حق تعالیٰ نے (احکام قرآن کو نہیں بلکہ) اپنے بندوں کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں کہ بعض مطیع ہیں اور بعض نافرمان۔ لہذا حکم ہے کہ مطیع و فرمانبردار بندوں (یعنی انبیاء و صلحاء) کا اتباع کرو کہ وہ بہتر ہے پھر میں نے کہا کہ یہ سارے جوابات مخدوش ہیں اور ان کو آیت سے کچھ بھی مناسب نہیں۔ پہلا جواب اس لئے کہ آیت کے آخر میں یہ ہے جو شخص اس بہترین نازل شدہ کا اتباع نہ کرے گا اس پر اندیشہ ہے کہ اللہ کا ہولناک عذاب نازل ہو جائے اور وہ کافریں میں سے ہے۔ اور اللہ و رسول کا مذاق اڑانے والا ہے، حالانکہ جو شخص معافی نہ دے اور انتقام لے اس کا حکم یہ نہیں ہے رخصت عفو اور انتقام اس کی تفسیر کیسے ہو سکتی ہے) دوسرے جواب پر یہ اعتراض ہے کہ منسوخ کے مستحسن ہوتے سے اگر مراد یہ ہے کہ وہ بلحاظ اتباع مستحسن ہے تب تو غلط ہے کیونکہ حکم جب منسوخ ہو گیا تو اس کا اتباع جائز ہی نہ رہا رچہ جائیکہ مستحسن، اور اگر بلحاظ تلاوت مراد ہے کہ حکم اس کا اگرچہ منسوخ ہو گیا مگر تلاوت اب بھی مستحسن ہے) تو اس درجہ میں آیت کا نسخہ اور منسوخہ دونوں برابر ہیں راجح اور بہتر ہونے کا فرق نہیں ہے) تیسرا اور پانچواں جواب اس لئے غلط ہے کہ نافرمان بندوں کا اور نیز جس امر کی ممانعت کی گئی ہے ان کا تو اتباع ہی جائز نہیں چہ جائیکہ بہتر ہونا چوتھے جواب پر یہ اشکال ہے کہ مانا رخصت پر عمل کرنا جائز ہے لیکن جو نتائج اخیر آیت میں مرتب کئے گئے ہیں



(یعنی کفر و عذاب وغیرہ) وہ رخصت پر عمل کرنے والے کے لئے صحیح نہیں۔ اور جو اعتراض جواب اول پر تھا وہی اس پر بھی  
خلاصہ یہ ہے کہ پہلا اور پانچواں جواب آیت شریفہ کے آخر جزو سے مناسبت نہیں کھاتا اور باقی جوابات میں حسن  
اور آسن کا فرق قائم نہیں رہتا بلکہ غیر مستحسن اور آسن کا مقابلہ ہوا جاتا ہے) لہذا اشکال یکسور قائم رہا۔

حضرت ممدوح نے فرمایا کہ جوابات مذکورہ میں نہ آیت کے انوار آئے ہیں نہ اسرار صحیح مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے  
اے میرے بندو کتاب اور رسول کی جنس میں جو بھی تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے اس میں بہترین کتاب اور بہترین رسول  
کا اتباع کرو۔ یعنی کتابوں میں اتباع کرو قرآن مجید کا کہ وہ بہترین ہے اگرچہ دیگر کتب سماویہ (توراة و انجیل و زبور) بھی  
بشرطیکہ اصل اور غیر محترق نہ ہوں اچھی ہیں۔ اور رسولوں میں اتباع کرو ہمارے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ تمامی  
انبیاء اچھے ہیں مگر آپ بہترین پیغمبر ہیں میں نے عرض کیا کہ آیت میں اَنبِیَکُمْ آیا ہے جس کا خطاب امت محمدیہ کو ہے  
کہ جو تم پر نازل کیا گیا ہے اس کے بہترین کا اتباع کرو۔ اور تورات و انجیل ان پر نازل نہیں کی گئیں بلکہ ان سے پہلی  
امتوں یعنی یہود اور نصاریٰ پر نازل کی گئی تھیں۔ فرمایا سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو تمامی دنیا کی طرف مبعوث ہوئے  
ہیں، کیا عرب اور کیا عجم کیا یہود کے لئے توریت، اور نصاریٰ کے لئے انجیل۔ گویا دیگر کتابوں کا نزول بھی فی الجملہ سب پر  
ہوا۔ اور اس لئے ارشاد ہوا کہ اے بنی آدم کی مختلف قومو اور جماعتو پہلی کتابیں اور پہلے پیغمبر جو تم پر نازل کئے گئے تھے  
اگرچہ وہ سب اچھے اور خوبیوں والے تھے مگر اب جو کتاب اور جو نبی تمہاری طرف بھیجا گیا ہے وہ بہترین اور سب سے  
افضل ہے لہذا اس کا اتباع کرو کہ افضل کے ہوتے ہوئے مقبول کی طرف جانا عقل کے بھی خلاف ہے (بعض  
مفسرین کا بھی یہی قول ہے کہ احسن سے مراد قرآن ہے مگر پوری وضاحت حضرت ہی کی تقریر سے ہوتی اور آخر آیت  
کے ثمرات یعنی کفر و عذاب کا ترتیب بھی صحیح ہو گیا کہ جو اس بہترین کا اتباع نہ کرے گا وہ کافر جہنمی ہے کیونکہ  
شرعیۃ محمدیہ نے تمامی شرائع کو منسوخ کر دیا ہے، واللہ اعلم۔

(۴) میں نے دریافت کیا کہ عموماً آیات قرآنیہ میں سماعت کو مقدم کیا گیا ہے بصارت پر مثلاً وَحَبْلُ لَکُمُ  
السَّمْعِ وَالْأَبْصَارِ وَالْأَفْئِدَةُ لَکُمُ التَّشْکُورُ اور اَنْشَأْ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ اور  
اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولَئِکَ کَانَ عَنْتًا مِّنْکُمْ اُولَئِکَ حَالِکُمْ بِبَصَارِکَ  
فائدہ بڑا اور نفع عام ہے کہ دن اور رات کا فائدہ صرف صاحب بصارت ہی کا تھا۔

اور جس کی سماعت اگرچہ صحیح ہو مگر دیکھنا کچھ نہ ہو۔ اس کے لئے دن رات دونوں برابر ہیں۔

نور اور ظلمت کا احساس بھی صاحب بصارت ہی کر سکتا ہے۔

آفتاب و ماہتاب اور ستاروں سے راستہ معلوم کرنا صاحب بصارت ہی کا کام ہے۔



عجائبات مصنوعات کا زیادہ تعلق اشیاء کی صورتوں اور ان کی ہیت ترکیبہ ہی کے ساتھ ہے اور ان کا  
نظارہ صرف آنکھوں والے کو ہو سکتا ہے۔ کہ بنی آدم کی شکل جدا ہے اور حیوانات کی شکلیں حسب نباتات  
کی صورتیں بے حد مختلف ہیں اور پھولوں کے رنگ بے شمار متباہن۔ اسی طرح آسمان کی آفرینش،  
بائیں وجہ ہماری نظریں تو بصارت کو ترجیح ہے (کہ دنیا کے ساتھ دین کی بھی اکثر خوبیوں کا مدار اسی پر ہے) لہذا  
اس کا ذکر مقدم ہونا چاہیے تھا۔ فرمایا بصارت کے محاسن جو کچھ بھی تم نے گنوائے سب صحیح ہیں (اور اسی لئے  
اس کی عطا کا حق تعالیٰ نے احسان جنایا ہے) مگر سمع میں ایک فائدہ اتنا بڑا ہے جو ان سب کا قائم مقام  
ہو سکتا ہے بلکہ عجب نہیں سب پر غالب آجائے۔ اور وہ یہ ہے کہ بھیجا ہوا رسول، اور بھیجنے والا خدا، اور تمامی  
امور غیبیہ جن پر ایمان لانا واجب ہے، غیب کا ادراک سماعت ہی کے ذریعہ ہوتا ہے، اور اس لئے تمامی شریعتیں گویا  
موقوف ہیں قوت سامعہ پر۔ اس کی شرح یہ ہے کہ فرض کرو بنی آدم میں قوت سامعہ نہ ہو اور وہ کوئی بات  
سن نہ سکیں تو جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے پیغمبر آئے گا اور کہے گا کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور تمہاری طرف  
بھیجا گیا ہوں تو یہ ان کی آواز آنکھوں سے تو نظر نہیں آسکتی اور سننے کا ان میں مادہ نہیں ہے لہذا رسول کا آنا بیکار  
رہا پھر جب وہ کہے گا کہ میرے پیچھے ہونے کی علامت فلاں فلاں معجزہ ہے، تو چونکہ وہ سنتے ہی نہیں اس لئے  
بے سود ہوا۔ پھر جب وہ کہے گا کہ اللہ جل جلالہ تم کو حکم دیتا ہے کہ اس کو یگانہ نہ سمجھو اور کسی کو اس کا ساتھ بھی قرار نہ دو تو  
عدم سماعت کی وجہ سے پیغمبر کا کام معطل رہا۔ پھر وہ کہے گا کہ اللہ کا حکم ہے کہ ایمان لاؤ مجھ پر اور اس  
کے تمامی رسولوں پر اور اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور قیامت کے دن پر، مگر انہوں نے چونکہ کچھ  
سنا ہی نہیں لہذا رسول معطل رہا۔ پھر وہ کہے گا کہ اللہ کا حکم ہے نماز پڑھو، روزہ رکھو، اور یہ کرو، وہ کرو،  
فلاں کام اس نے فرض بنایا ہے اور فلاں کام حرام کیا ہے، فلاں شے مباح ہے اور فلاں مستحب، مگر چونکہ  
حاضرین سب بہرے ہیں اس لئے رسول کی تعلیم معطل ہے اس سے معلوم ہوا کہ اگر قوت سامعہ نہ ہو تو رسول کی  
معرفت ہو سکتی ہے نہ مرسل کی، نہ غیب پر ایمان کا وقوع ہو سکتا ہے نہ شہادہ پر ایمان کا صدور، نہ اتباع  
شرعیہ کی کوئی صورت ہے نہ انتشار و طاعت الہی کا کوئی طریق اور اس سے لازم آتا ہے کہ نہ ثواب ہے  
نہ عذاب، اور اس لئے جنت بھی اٹھ گئی۔ اور دوزخ بھی، کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔  
وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ تَبْعَثَ رَسُولًا

ہم جب تک رسول نہ بھیج لیں کسی کو عذاب نہیں دیتے (اور جب رسول ہی کا آنا نہ آنا برابر ہو گیا تو عذاب کیا اور  
جہنم کس کے لئے) خلاصہ یہ ہوا کہ بنی آدم کے لئے سمع نہ ہو تو تکلیف شریعت ہی ساقط ہو جائے اور سب بمنزلہ  
جالوروں جو پائیوں اور ڈھوڑو ٹکروں کے بن جادیں۔ پس انسان اگر درجاتِ عالیہ کا مستحق ہوا اور ملا الاعلیٰ میں



جا شامل ہوا ہے تو صرف سماعت کی بدولت معلوم ہوا کہ سمع کا فائدہ زیادہ اور اس کا نفع عام ہے کہ اسرار ربوبیت اور تخلیق عوالم (کے مصالح) سب اسی پر موقوف ہیں اور اسی لئے آیات سابقہ میں کہ احسانات جبار کا موقع ہے سمع کو مقدم کیا ہے بصر پر کہ سماعت کی عطا کا احسان زیادہ قوی ہے بہ نسبت عطا و بصارت کے۔ واللہ اعلم۔

(۵) حق تعالیٰ فرماتا ہے وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا أَفْأَحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ تَاسْتَفِرُّوا لِيُذْهِبَ عَنْهُمْ مُوسِمِينَ کی شان یہ ہے کہ جب کوئی بُرا کام کر بیٹھتے یا اپنے نفسوں پر ظلم کر گزرتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے اور اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں نیز فرماتا ہے وَمَنْ يَعْمَلْ سُوءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللَّهَ يَجِدِ اللَّهَ غَفُورًا رَحِيمًا۔ جو شخص بُرے عمل کرے گا اور اپنے نفس پر ظلم کرے گا اور اس کے بعد اللہ سے معافی چاہے گا تو اللہ کو بخشنے والا مہربان پائے گا۔ میں نے عرض کیا کہ بد عملی اور نفس پر ظلم تو ایک ہی چیز ہے۔ پھر آیت شریفہ میں دو چیزیں کیوں بتائی گئیں۔ زیادہ سے زیادہ یوں کہیں کہ نفس پر ظلم تو ایک ہی چیز ہے۔ پھر آیت شریفہ میں دو چیزیں کیوں بتائی گئیں زیادہ سے زیادہ یوں کہیں کہ نفس پر ظلم کرتا عام ہے (کہ ہر گناہ ظلم پر نفس ہے) اور بد عملی خاص ہے مگر عام کا عطف لفظ یا کے ساتھ نہیں آیا کرتا۔

اگرچہ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ بد عملی اور فاحشہ سے مراد گناہ کبیرہ ہے اور ظلم پر نفس سے مراد گناہ صغیرہ اور میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ عمل بد اور فاحشہ سے مراد مطلق معصیت ہے (خواہ صغیرہ ہو یا کبیرہ) اور ظلم پر نفس سے مراد معصیت پر اڑ اور اصرار ہے کہ اصرار بر معصیت صورتہ کوئی عمل نہیں بلکہ عزم ہے کہ اس بد عملی اور فاحشہ کو چھوڑوں گا نہیں، لہذا اس اڑ اور اصرار کی وجہ سے اُس نے اپنی جان پر ظلم کیا کہ اپنی جان کو سزا کے لئے پیش کر دیا غرض دیر تک اس بحث میں حضرت سے گفتگو ہوتی رہی اور حضرت نے بھی تین جواب اس کے دیئے۔ مگر جب خوب بحث ہو چکی تو حضرت نے ذرا دیر سکوت کیا اور پھر فرمایا سیدی محمد بن عبد الکریم بصری یوں فرماتے ہیں کہ آیت شریفہ کا سبب نزول زمانہ جاہلیت کا طریق اور وہ لوٹش ہے جس پر اس وقت اہل عرب چل رہے تھے کہ انکا ہم قوم اگر کوئی خطا کرتا تو دوسرے اسکی حمایت لیتے اور اس کی صفائی و براہوت پر زور دیا کرتے تھے مثلاً کسی نے چوری کی تو باوجودیکہ جانتے تھے واقعی اس نے چوری کی ہے مگر اسکی طرفداری کرتے، اسکو بے قصور بتاتے شد و مد کے ساتھ چوری کا انکار کرتے اور جو اسکو سارق کہتا اس سے لڑتے اور جھگڑتے تھے۔ پس سرقہ تو عمل بد اور فاحشہ ہے کہ سارق اس کا مرتکب ہوا اور اس کی بے جا حمایت اور غلط بیانی و حلف دروغی ظلم پر نفس ہے کہ اس نے اپنی جان مفت ہونے کی راہ میں سکرانہ اپنی ناک کھائی، یہ تفسیر مجھے بہت پسند آئی کہ آیت کے سیاق و سباق سے بھی مناسب ہے کیونکہ حق تعالیٰ فرماتا ہے وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَلُونَ أَنْفُسَهُمُ الْآیہ۔ اے مخاطب جو لوگ



(محرّمات کا ارتکاب کر کے) اپنے نفسوں سے خیانت کرتے ہیں ان کی طرفداری نہ کر کہ آج دنیوی زندگی میں اگر تم ان کے حمایتی بن کر لڑ جھگڑ بھی لئے (اور اس کو سزا سے بچا بھی لیا) تو کل بروز قیامت خدا سے بچانے کیلئے ان کی طرفداری و دکالت کون کرے گا۔ جس وقت حضرت ممدوح سے اس آیت میں گفتگو ہو رہی تھی ہم اس وقت فاس کے دروازہ شہر یعنی باب الحدید کے باہر اور سیدی محمد بن عبد الکریم مذکور بصرفہ میں تشریف لے گئے مگر ربا و جود اس بعد مکانی کے) انہوں نے ہماری باتوں کو سن لیا اور ہمیں بھیجے ہوئے جواب بھی دیدیا۔

(۷) میں نے حضرت ممدوح سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا وَ اَلَّذِمْ مَعَهُمُ الْفٰتٰوٰی وَ کَا نُوْا اٰحْقَ بِجَہٰنَّمَ اَوْ اٰھْلَہَا اَوْ حَقِّ تَعٰلٰی نے فتویٰ کی بات (یعنی اسلام اور حق گوئی) کو ان کا جزو لازم بنا دیا، اور تھے ہی وہ اس کے مستحق اور اہل۔ اس میں اشکال یہ ہے کہ حضرات صحابہ (جن کا یہ حال ذکر فرمایا ہے) ظاہر ہے کہ قبل اسلام کفر و جہالت میں تھے اس وقت ان میں حق کی اہلیت اور احقیق کہاں تھی۔ فرمایا کہ اہلیت اور احقیق بلحاظ فضا سابق اور رد زالت کے تھی جبکہ مخلوقات پیدا بھی نہیں ہوئی تھی را اور عالم میں جو کچھ ہو رہا ہے سب اس وقت علم الہی میں تھا، واللہ اعلم۔

(۸) میں نے قَاتِلُ اَھْلِکَ عَادًا الْاَوَّلٰی کے متعلق پوچھا کہ اللہ نے ہلاک کیا پہلی قوم عاد کو تو کیا پھلی قوم عاد کوئی دوسری تھی؟ مفسرین کے کلام میں اس جگہ بہت اضطراب ہے۔ قوم عاد کی طرف جو پیغمبر مبعوث ہوئے وہ حضرت ہود علیہ السلام ہیں اور حضرت ہود کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بہت پہلے تھا۔ پھر اسی قوم عاد کی ہلاکت کے قصہ میں لکھتے ہیں کہ (امساک باران سے پریشان ہو کر) ان کا ایک وفد بارش کی دعا مانگنے کے لئے حرم الہی یعنی مکہ میں آیا، اور ظاہر ہے کہ مکہ کی بنا حضرت ابراہیم و اسمعیل علیہما السلام کے ہاتھوں ہوئی رک آپ سے قبل محض بن و دق بیابان تھا۔ پھر کہاں زمانہ ہود اور کہاں مکہ کا وجود اور اس میں ان کے نمائندہ کا ورود) اسی اشکال کو دیکھ کر بعض علماء اس طرف گئے کہ عاد دونوں ناموں کا نام ہے پہلی قوم عاد وہ ہے جن کی طرف حضرت ہود بھیجے گئے اور وہ ہوا کے عذاب سے ہلاک کی گئی۔ اور دوسری قوم عاد اور ہے جس کی طرف کوئی اور پیغمبر بھیجے گئے اور ان پر کوئی دوسرا عذاب آیا اور اسی عاد کا وفد مکہ میں آیا تھا مگر نہ بنی کا تعین کیا کہ کون آئے تھے اور نہ عذاب کا ان پر یہ اعتراض وارد ہو گا کہ یہ قصہ سورہ احقاف میں ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وفد اسی قوم عاد کا تھا جس کے پیغمبر حضرت ہود تھے اور جو ہوا کے عذاب سے ہلاک ہوئی۔ چنانچہ ارشاد ہے وَ اِذْ کُنَّا اَخٰی عَادَہُ اور دوسری آیت میں ہے وَ اِذْ کُنَّا عَادَہُ اَخٰی عَادَہُ ہم نے عاد کی جانب ان کے بھائی ہود کو بھیجا اور آگے چل کر تذکرہ ہے ان پر ہوا کے عذاب نازل ہونے کا سارے نمائندوں کی جماعت جو کہ آئی تھی وہ اسی قوم عاد کی تھی۔ اس کا ثبوت وہ حدیث ہے جو ترمذی و نسائی اور ابن ماجہ میں آئی ہے



جس کو ابن حجر نے سورۃ احقاف میں بیان بھی کیا ہے کہ حضرت حارث بن حسان بکری فرماتے ہیں۔ میں اور علاؤ بن الحضرمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس طویل حدیث میں یہ قصہ بھی مذکور ہے میں نے کہا اللہ اور رسول کی پناہ کہ میں عباد کے نمائندہ کی طرح بنوں داود و داود بنی ہاشم سے بچنے کا میاں بی کے ناکامی لے کر جاؤں) حضرت نے باوجودیکہ آپ زیادہ واقف تھے مگر لذت لینے کے لئے ان سے دریافت کیا کہ عباد کے نمائندہ کا کیا قصہ ہے؟ میں نے عرض کیا کہ قوم عادیہ شریہ میں مبتلا ہوئی تو انہوں نے (نمائندہ بنا کر) قیل بن عنترہ کو معاویہ بن بکر کے پاس بھیجا کہ حرم الہی میں بارش کی دعا مانگے اور ایک روایت میں ہے کہ قیل بن عنترہ اور مرثد بن سعد مہجد ستر سرداران قوم کے مکہ آئے اور مکہ میں اس وقت حکومت عمالہ کی تھی جن کا سردار معاویہ ابن بکر تھا۔ یہ لوگ ایک مہینہ معاویہ کے مہمان رہے۔ مرثد نے اپنے رفقاء سے کہا بھی تھا کہ صابو! بارش نہ برسیگی جب تک کہ ہود پر ایمان نہ لے آؤ مگر قیل نے یہ سن کر معاویہ سے کہا اس کو فید کر دیجئے کہ ہمارے ساتھ (دعا باران کے لئے) بیرون شہر نہ جاتے کیونکہ یہ ہود پر ایمان لے آیا اور ان کو سچا سمجھنے لگا ہے مرن مہینہ بھر بعد شہر سے باہر جا کر بارش کی دعا مانگی تو دو بادل نمودار ہوئے ایک سیاہ اور ایک سپید اور اس کو اختیار دیا گیا کہ جس بادل کو چاہے انتخاب کرے قیل نے یہ سمجھ کر کہ پانی سے خوب لبریز ہے سیاہ کو انتخاب کیا۔ تب ایک ندا آئی اچھا اسی کو لے کر رکھ بنا دیگی اور عادیہ میں کسی ایک کو بھی باقی نہ چھوڑے گی (معلوم ہوا کہ نمائندہ کے مکہ میں آنے کا واقعہ اور ہوا کے عذاب سے ہلاک ہونے کا سانحہ اسی قوم عادیہ کا ہے جس کے پیغمبر حضرت ہود تھے نہ کہ دوسری قوم عادیہ جس کے نہ بنی کا نام معلوم نہ صورت عذاب کا تعین) حضرت ممدوح نے فرمایا ہاں عادیہ دو قوموں کا نام ہے۔ یہ قوم عادیہ، عادیہ ثانیہ کہلاتی ہے جس کی طرف حضرت ہود بھیجے گئے مجدد بنا کر کہ شریعت سابقہ کو (بدعات سے صاف کریں اور اس کو) رواج دیں۔ اسی قوم عادیہ کا یہ قصہ ہے جو سورۃ احقاف میں آیا ہے، اور اسی کا نمائندہ مکہ میں آیا تھا اور اسی کو ہوا کا عذاب دیا گیا تھا اور یہ سیدنا اسمعیلؑ کی اولاد میں تھے اور نسب نامہ اس طرح ہے۔ ہود بن عابر بن شہاب بن اعرث بن الکلاب بن قیدار بن اسمعیلؑ مگر عادیہ ثانیہ ساری حضرت اسمعیلؑ کی اولاد میں نہ تھی۔ بلکہ صرف حضرت ہود علیہ السلام اور ان کا کنبہ تھا (اور نہ قوم عادیہ کا جدا مجدد کوئی اور تھا) قرآنی عادیہ اخاھم میں قوم کو ان کی برادری تغلیباً کہہ دیا گیا ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام مع اپنے کنبہ انہیں کے ساتھ رہتے رہتے اور انہیں کے ساتھ سفر کرتے اور آتے جلتے تھے۔ اسی قوم عادیہ میں شداد بن عادیہ تھا جس کے پاس ایک بڑا خیمہ ذات العمد (اونچے کھنبوں والا) تھا علماء کا خیال ہے کہ ادم ذات العمد ایک شہر تھا جو جنت کی شکل پر سونے سے تعمیر کیا گیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ مگر یہ صحیح نہیں اور نام ہے قبیلہ عادیہ کا اور کلمہ ذات العمد قبیلہ ہی کی صفت ہے، یعنی کھنبوں والی قوم ارم۔ خواہ رئیس قوم کے اعتبار سے کہ اس کے



خیمہ کے کھنے عالیشان تھے۔ یا ذاتی لحاظ سے کہ ساری قوم کے خیمے کھنبوں والے تھے۔ چنانچہ میں نے ان کا مقام سکونت دیکھا ہے اور وہ قریب قریب اسی کے ہے جو علماء نے احقاف کی صورت حال بیان کی ہے وہ جگہ اتنی طویل و عریض ہے کہ انودون میں ملے ہو سکے۔ ان کا بادشاہ بیج شہر میں رہتا تھا کہ چاروں کنارہ سے کوئی شخص اس تک جاتا چاہتا تو ساڑھے چار دن برہنہ سر اور برہنہ پا خیموں ہی میں چلتا تھا۔ کیونکہ عمارتیں بھی بکثرت تھیں۔ مگر آبادی اتنی زیادہ تھی کہ شہر میں سہارا نہ مل سکتی تھی (اس لئے خیموں میں رہائش تھی۔ اور چونکہ چلنے والے کو خیموں کے سایہ میں اور بچھے ہوئے فرش پر چلنا پڑتا تھا اس لئے ٹوپی اور جوتہ کی ضرورت نہ تھی، حق تعالیٰ نے ان کے لئے سطح زمین پر پانی کے دریا اور چشمے بہا دیے تھے جس نے زراعت اور آبپاشی کرتے تھے اور یہ دریا دندی نامی تھے ان کے شہر سے بہت دور مقامات سے آئے تھے۔ ان کے بادشاہ کے خیمہ نے زمین کی اتنی جگہ گھیری تھی جتنی دور تیر انداز کا تیر جاتا ہے۔ اس کے کھونٹے رجن سے رسیاں باندھی جاتی تھیں اور کھینے رجن پر خیمہ کھڑا کیا جاتا تھا) خالص سونے کے خول چڑھے ہوئے تھے اور خیموں کی رسیاں خالص ریشم کی تھیں میں نے ان کا بچا ہوا سونا دیکھا ہے جو اب تک ان کی زمین میں کہیں کہیں مدفون ہے اور عام طور پر ساری قوم کے خیمے طلائی اور زرین تھے۔ غرض اسی قوم کی طرف حضرت ہود علیہ السلام بھیجے گئے تھے جن کا نسب مذکور ہوا اور اسی کو عا د ثانیہ کہا جاتا ہے یہی عا د اولیٰ سودہ لوح علیہ السلام کی قوم ہے جس کی طرف حق تعالیٰ نے ایک نبی کو بھیجا تھا جن کا نام ھوئید تھا اور وہ رسول تھے اور مستقل شریعت لائے تھے۔ برخلاف حضرت ہود کے کہ وہ شریعت سابقہ کے مجدد تھے۔ نیز حضرت نے فرمایا کہ ہر رسول مستقل کے لئے کتاب لازمی ہے اور مجھے تمامی مسلمان کی کتابیں یاد ہیں اسی طرح حضرت ہوئید کی کتاب کا بھی حافظ ہوں۔ میں نے کہا کیا حضرت والا کتب مسلمان کے نام گنوا سکتے ہیں؟ فرمایا بھلا کتابیں حفظ ہوں اور گنوا نہ سکوں اس کے کیا معنی، سو سنا۔ اس کے بعد آپ نے ایک ایک کتاب گنوائی اور فرمایا ولی لودی ہی نہیں بنتا جب تک تمامی کتابوں پر تفصیلاً ایمان نہ لادے کہ اس کو دعوا کی طرح) اجمالی ایمان لانا کافی نہیں۔ میں نے کہا کیا تمامی ادبیا رجن کو فتح نصیب ہوتی ہے ایسے ہی ہوتے ہیں؟ فرمایا نہیں صرف ایک یعنی غوث، اس وقت مجھے پورا علم ہوا کہ حضرت ممدوح غوث ہیں۔ اور آپ کے علوم خود بھی اس کا پتہ دے رہے ہیں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ عا د اولیٰ یعنی قوم ہوئید کو حق تعالیٰ نے پتھر اور آگ کے عذاب سے ہلاک کیا کہ اول آسمان سے پتھر بر سے اور جب وہ بھاگنے لگے تو چار طرف سے آگ نے گھیر لیا نیز آپ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت لوح سے پہلے سات سو غیر ہو چکے ہیں اور ان کے واقعات میں بکثرت عجیب و غریب باتیں ہیں مگر حق تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں ان کا کوئی قصہ نہیں اس لئے نہیں سنایا کہ مابعد کے زمانہ نائے وحی میں ان قوموں کی شہرت درہی تھی (اور کوئی جانتا بھی نہیں تھا کہ وہ کون تھے اس لئے ان کے تذکرہ سے چندان نفع نہ تھا) میں نے کہا کہ شفاعت والی حدیث



میں تو حضرت نوحؑ کے متعلق آیا ہے کہ وہ اول المرسلین تھے پھر اُن سے قبل سات سو رسولوں کے آنے کا کیا مطلب ہوا؟ فرمایا جو پیغمبر کفار کی طرف بھیجے گئے اُن سب میں حضرت نوحؑ اول تھے اور ان سے پہلے جو رسول آئے وہ ایسی قوموں کی طرف آئے جن کے عقائد صحیح تھے (مگر یہ عملی پھیل گئی تھی جس کی اصلاح مقصود تھی) میں نے کہا پھر حضرت ہودؑ کی قوم پر آگ اور پھر کا عذاب کیوں نازل ہوا جبکہ وہ مومن تھے؟ فرمایا حضرت نوحؑ سے پہلے کی اقوام کے متعلق عادت اللہیوں ہی جاری تھی کہ گویا عقائد اُن کے صحیح ہوں لیکن قواعد و احکام میں اگر اکثر حصہ چھوڑ بیٹھیں تو سزا دیدی جاتی تھی۔

(۸) آیت شریفہ وداؤد و سلیمان اذ یحکمان فی الحرث الایۃ کے متعلق میں نے عرض کیا کہ اس قصہ کو ان علما نے اپنی دلیل قرار دیا ہے جن کا مذہب یہ ہے کہ دو مجتہدوں میں جن کے اجتہادی حکم متضاد ہوں (مضبوط) مصیب ایک ہی ہوگا اور دوسرے کو غلطی پر کہیں گے۔ اگرچہ معذور سمجھا جائے گا بلکہ ماجر قرار پائے گا جبکہ حق کی تلاش میں اپنی انتہائی کوشش پوری کر گزرے۔ قصہ یہ تھا کہ ایک شخص بکریاں دوسرے کے کھیت میں گھس گئیں اور کچھ کھایا اور کچھ برباد کیا کھیت والا بکریاں پکڑ کر سیدنا داؤد علیہ السلام کی عدالت میں لایا کہ آپ اس وقت کے نبی بھی تھے اور بادشاہ بھی۔ آپ نے فریقین کی روداد سن کر معاملہ کی باضابطہ تحقیق فرمانے کے بعد فیصلہ دیا کہ جتنا نقصان کھیتی کا کا ہوا ہے اس رقم کی بکریاں کھیت واکو دیدی جائیں۔ اس فیصلہ کے بعد دونوں فریق حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے کو گھرے تو آپ نے بلایا اور واقعہ کو سن کر فیصلہ اس طرح دیا کہ بکریوں پر کھیت واکو قبضہ دلایا جائے کہ ان کے دودھ وغیرہ سے نفع اُٹھائے اور کھیت بکری واکو کے حوالہ کیا جائے کہ اس کی خدمت کرے حتیٰ کہ ادھر کھیت واکو کا نقصان بکریوں کے منافع سے پورا ہو جاوے اور ادھر کھیت اپنی سابق حالت پر آجائے تو بکریوں والے کو اس کی بکریاں واپس دیدی جائیں اور کھیت واکو اس کا کھیت حوالہ کر دیا جائے اس قصہ کا حق تعالیٰ نے آیت مذکورہ میں ذکر فرمایا ہے کہ غور کرو اس واقعہ میں جبکہ داؤد و سلیمان دونوں باپ بیٹے کھیتی کے بارہ میں منسلک وے رہے تھے۔ کیونکہ مدرسوں کی بکریاں اس میں گھس گئی تھیں اور ہم ان کے فیصلہ کے وقت موجود تھے پس ہم نے معاملہ کی اصلیت (اصلیت) سلیمان کو سمجھا دی۔ اور یوں تو ہم نے دونوں کو علم و دانش عطا فرمائی تھی۔ وجہ استدلال یہ ہے کہ دونوں کے فیصلے اجتہادی تھے مگر حق تعالیٰ نے حضرت سلیمان کے فیصلہ کو صائب اور صحیح قرار دیا لہذا معلوم ہوا کہ مصیب صرف ایک ہے اور دوسرا غلطی۔ مگر گرفت اس پر نہیں کہ اجتہادی غلطی میں معذور بلکہ ماجر ہے (نیز انہیں حضرات کا دوسرا واقعہ بھی اسی کی دلیل ہے کہ دو عورتیں کھیتیں اور دونوں کے بچے تھے۔ اتفاق سے بڑی کے بچہ کو بھیڑیا لے گیا اُس نے چھوٹی کے بچہ پر قبضہ کر لیا اور کہا کہ بھیڑیا تیرے بچہ کو لے گیا ہے اور یہ بچہ میرا ہے۔ دونوں عورتیں عدالت داؤدی میں پہنچیں تو حضرت داؤد نے بچہ بڑی عورت کو دلایا کہ قبضہ



اسی کا تھا۔ مگر حضرت سلیمانؑ نے یہ فیصلہ دیا کہ جب دونوں کا دعویٰ بلا دلیل ہے تو بچہ کو نصف نصف دونوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ چھوٹی نے تقسیم کا سنا تو کہنے لگی اچھا یہ بچہ اس بڑی ہی کا ہے (اس تدبیر سے حضرت سلیمانؑ نے پتہ چلا لیا کہ یہ بچہ چھوٹی کا ہے کہ اس کے ٹکڑے ہونے کو مادری محبت گوارا نہیں کرتی اور دست برداری کو ترجیح دیتی ہے کہ جیتا تو رہے گا کو دوسری کا ہو کر جائے) لہذا آپ نے بچہ چھوٹی کو دلا دیا اور بڑی سے فرمایا کہ اگر یہ بچہ تیرا ہوتا تو اس کی تقسیم کی خواہش نہ کرتی (کہ ماں اپنے بچہ کو کبھی فروغ نہیں کر سکتی) اس قصہ میں بھی صاحبِ رائے حضرت سلیمانؑ کی ہوائی تیسرا قصہ اور ہے، ایک عورت پر دعویٰ کیا گیا کہ اس نے کتے کو اپنے نفس پر قدرت دی (اور اس سے زنا کرایا ہے) اور گواہوں نے گواہی دی، لہذا آپ نے عورت کی سنگساری کا حکم سنایا۔ حضرت سلیمانؑ تو عمر تھے اور بچوں میں کھیل رہے تھے کہ اسی قسم کا قصہ ان کے سامنے پیش ہوا تو انہوں نے فرمایا ایک گواہ کو دوسرے سے علیحدہ رکھو۔ چنانچہ علیحدہ علیحدہ سب کی شہادت لی تو شہادتوں میں اختلاف ہو گیا اور آپ نے دعویٰ خارج کر دیا۔ اس وقت حضرت داؤدؑ نے بھی تفریق گواہان کی طرف رجوع فرمایا جو تھا قصہ اور ہے کہ ایک عورت کی شرمگاہ میں رطوبت سیال پائی گئی اور اس پر دعویٰ دائر کیا گیا کہ یہ مرد کی منی ہے اور عورت نے زنا کیا ہے حضرت داؤد علیہ السلام نے اس کی سنگساری کا حکم دیدیا مگر حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ اس رطوبت کو پکانا چاہیے۔ اگر منجمد ہو جائے تو انڈے کی سپیدی ہے ورنہ منی ہے چنانچہ اس کو پکایا تو انڈے کی سپیدی ثابت ہوئی اور معلوم ہو کہ عورت پر بہتان باندھا گیا ہے۔ حضرت مدوحؑ نے فرمایا شاید تمہارا مطلب یہ ہے کہ (چاروں قصوں میں) حضرت داؤد علیہ السلام نے غلطی کھائی۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے صحیح حکم دیا کیا حضرات علماء بنیوں کے بارہ میں ایسا عقیدہ رکھتے ہیں۔ حالانکہ حضرات انبیاء ساری مخلوق میں اللہ کے انتخاب شدہ اور اللہ کے نزدیک ملائکہ سے بھی افضل ہیں۔ اگر خطا ان سے صادر ہو غلطی ان سے سرزد ہو سکتی ہے تو ان پر اعتماد وثوق ہی کہاں رہا وہ تو ہم جیسے بن گئے مافا اللہ حضرت داؤدؑ کا فیصلہ ہرگز غلط نہیں ہے جیسا کہ حضرت سلیمانؑ کا فیصلہ غلط نہیں، پہلے قصے کی توجہ یہ ہے کہ سیدنا داؤد علیہ السلام کا فیصلہ بالکل قانون الہی کے موافق اور خالص حق تھا یعنی نقصان رات کا تاوان۔ مگر بکریاں اس لئے دلائیں کہ اس زیاتہ میں لوگوں کے پاس نقد نہ تھے اور کتے بھی تو بہت کم۔ اس لئے ان کے معاملات اور لین دین سب بکریوں اور مویشی سے ہوا کرتے تھے کہ یہی ان کے پاس بکثرت تھے جیسے گاؤں میں ہر چیز کی خرید و غلہ سے ہوتی ہے کہ یہ ان کے پاس دافر ہے اور روپیہ پیسہ بہت قلیل) لہذا حضرت داؤد علیہ السلام نے بکریاں قیمت والے کے حوالے کرنے کا حکم دیا۔ اور سیدنا سلیمانؑ کا فیصلہ مہالحت کا درجہ تھا۔ لہذا انکی رائے ہوتی کہ کھیتی کے نقصان کا تاوان رجباً بکریوں کے اگر ان کی



مسفقت یعنی دودھ اور گھی اور اُون سے کر دیا جلٹے تو بکریاں بچ رہیں گی۔ بکری واسے کے لئے۔ اور اس مدت میں بکری والا کھیتی کی خدمت کرے گا جس میں انگور کی کاشت ہو رہی تھی تو کھیت اپنی حالت پر اگر قبضہ میں آجائے گا۔ اپنے مالک کے۔ مگر یہ اس پر موقوف ہے کہ دونوں فریق راہنی بھی ہوں ورنہ فیصلہ شرعی وہی ہے کہ تادان دلایا جائے بقدر نقصان سکے رائج الوقت) پھر کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جس نے قانون کے موافق فیصلہ دیا وہ غلط ہے اور جس نے صلح کے درجہ کا فیصلہ دیا وہ صحیح ہے باقی تینوں قصوں کی توجیہ یہ ہے کہ سیدنا داؤد علیہ السلام کا فیصلہ مقتضاً ظاہر کے موافق تھا کہ قبضہ یا شہادت یا قرینہ قویہ دلیل ثبوت یا قرینہ قویہ دلیل ثبوت ہے چاہے حقیقت اور واقعہ اس کے خلاف ہو مگر قانون کہتا ہے کہ ظاہری ثبوت کے موافق مقدمہ طے کرو) لہذا یہی واجب ہے اور حاکم کو جائز ہی نہیں کہ اس کے خلاف فیصلہ دے۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی تدبیر کی کہ چھپی ہوئی حقیقت کھل جائے اور باطن کسی طرح ظاہر بن جائے اور جب وہ ظاہر بن گیا تو آپ نے فیصلہ اس کے موافق دیا پھر پہلے فیصلہ غلط اور دوسرے کو صحیح کیسے کہہ سکتے ہیں جبکہ دونوں ظاہر پر متفرع اور ضابطہ قانونی کے موافق ہیں)۔

فیصلہ دونوں صحیح ہیں اگرچہ باطن کے ظاہر بن جانے پر پہلا فیصلہ واجب المنقض ہو گیا۔ مگر اس وقت اس کے غلط ہو جانے سے یہ کہاں لازم آیا کہ فیصلہ دیتے وقت بھی وہ غلط تھا۔ اس کی مثال تو ایسی ہے کہ چند جھوٹے گواہوں نے قاضی کے سامنے کسی معاملہ کی شہادت دی اور قاضی نے ان کی شہادت پر فیصلہ سنایا تو اس فیصلہ کو خطا اور غلط کوئی نہیں کہہ سکتا بلکہ قاضی پر واجب یہی ہے کہ شہادت پر فیصلہ دے اس کو غیب کی کیا خبر کہ شہادوں نے جھوٹ کو سچ کا جامہ پہنا دیا ہے اور وہ اس کا مکلف کہ ثقہ صورت دیکھ کر بھی بد گمانیاں کرے)

لیکن اس کے بعد اگر گواہوں (کو خوف آخرت نے لرزایا اور انہوں نے) توبہ کی اور قاضی کے سامنے آکر اپنی دروغ بیانی کا اقرار کر لیا اور شہادت سے رجوع کیا تو اب قاضی پر یہ واجب ہے کہ اُن کے رجوع کا جو مقتضاً اس کے موافق فیصلہ دے (پس ایک ہی قاضی کے دو فیصلے باہم متضاد ہیں مگر) یہ نہیں کہہ سکتے کہ پہلا فیصلہ غلط تھا اور قاضی مخطلی ہے اسی شہر فاس کا واقعہ ہے کہ میرا ایک واقف شخص (خود اپنا نفس مراد تھا) اپنے ایک دینی بھائی کے پاس گیا جو بصرہ کے رہنے والے اور قاضی شہر تھے (حضرت عبدالکریم بھری مراد ہیں جن کا ذکر اوپر گذرا ہے) ان کے پاس جا کر بیٹھا ہی تھا کہ دو شخص آئے اور ایک نے کہا اس شخص نے میرا ایک یا قوت مجھ سے چھین لیا جو نہایت ہی قیمتی تھا اور وہ اس کے پاس موجود ہے دوسرے نے کہا میں سامنے حاضر ہوں اور اس کو اختیار دیتا ہوں کہ سارے کپڑے اور جو کچھ بھی میرے بدن پر ہے سبک تلاش کرے۔ مزید برآں میں اللہ کی قسم بھی کھاتا ہوں کہ یا قوت میرے پاس نہیں ہے۔ قاضی نے ارادہ کیا کہ اس کے حق میں فیصلہ دیدے مگر نوادہ ہم نشین نے کہا ابھی حکم نہ سناؤ اور اس کے بعد دونوں فریق کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ یہ یعنی قاضی



صاحب ہمارے دینی بھائی ہیں اور انہوں نے ہمارے لئے کھانا تیار کیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں تم دونوں بھی شریک ماحضر ہو۔ جب کھانے سے فارغ ہو لیں گے تب قاضی صاحب تمہارے معاملہ میں غور کریں گے چنانچہ ہم سب قاضی صاحب کے ساتھ گئے اور جب کھانا سامنے آگیا تو اس وقت اس ہم نشین اور قاضی صاحب دونوں نے مدعا علیہ کو کتنے آنکھوں سے دیکھنا شروع کیا۔ دفعۃً اس نے ناک سنکی اور سینک کو رد مال میں لے لیا جو اس کے پاس تھا جلیس نے فوراً رد مال اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ دیکھا تو اس میں یا قوت موجود تھا۔ کہ سینک کے ساتھ (ناک سے) نکلا تھا۔ چنانچہ ہم نے اس کو مدعی کے حوالہ کر دیا۔ یہ ایک حیلہ تھا۔ باطن کو ظاہر بنانے کا دزنہ اگر ہم پہلے ہی تلاشی اور حلف کا حکم دیدتے تو وہ بھی صحیح تھا۔ اگرچہ کشف سے اس کا علم ہو بھی جاتا کہ یا قوت مدعا علیہ کے پاس موجود ہے (تب بھی ظاہر صورت پر حکم دینا غلط نہ ہوتا) کیونکہ حق تعالیٰ نے اس کا مکلف نہیں بنایا۔ مگر ہم نشین نے حسن تدبیر پر عمل کیا۔ اور باطن کو ظاہر بنادیا میں نے کہا کیا قاضی صاحب کو بذریعہ کشف معلوم ہو چکا تھا کہ یا قوت مدعا علیہ کے پاس موجود ہے؟ فرمایا ان کو بھی معلوم تھا اور ان کے ہم نشین کو (یعنی مجھے) بھی معلوم تھا یہی نوعیت تھی ان تینوں قصوں کی جو محترم نبیوں کے درمیان واقع ہوئے تھے کہ پہلے قصہ میں سیدنا داؤد علیہ السلام نے بچہ حوالہ کیا پڑی کہ بسبب قبضہ کے کہ قبضہ دلیل ملک ہے اور دوسرے قصہ میں سنگساری کا حکم فرمایا بوجہ شہادت کے اور تیسرے قصہ میں سنگساری کا حکم دیا بوجہ پائے جانے علامت کے۔ اور سیدنا سلیمان علیہ السلام نے تینوں میں تدبیر و حیلہ سے کام لیا حتیٰ کہ باطن کو ظاہر بنالیا۔ ابن حجر نے بھی ابن منیر کا یہی قول لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا فیصلہ کھیتی کے بارے میں صائب تھا۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے کتہہ دکھایا صلح کا اور حق تعالیٰ کا فرمانا وَكَلَّا اَتَيْنَا حُكْمًا وَعِلْمًا کہ دونوں کو ہم نے دانش اور علم سے نوازا تھا۔ یا تو عام ہے کہ ہر امر میں دونوں کی ہم و علمیت اپنا کام کرتی تھی) یا خاص ہے اسی کھیتی کے واقعہ کے ساتھ (کہ اس مقدمہ زراعت میں دونوں کا فیصلہ دانشمندانہ تھا) بہر حال دونوں صورتوں میں حضرت داؤد علیہ السلام کی صفت دانش و علم کے ساتھ حق تعالیٰ نے مدح و ثنائی فرمائی ہے۔ لہذا یہ اس قبیل سے نہیں ہو سکتا کہ مجتہد اگر غلط حکم بھی دی تو معذور ہے کیونکہ غلط حکم کو نہ دانش کہہ سکتے ہیں نہ علم۔ واللہ اعلم۔

(۹) میں نے حضرت سے یَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ میں سَاق کے معنی دریافت کئے تو فرمایا کہ سریانی زبان میں سَاق کے معنی واقفیت کے ہیں مخول کی ضد (لہذا ترجمہ یہ ہوا کہ جس دن حقیقت منکشف کر دی جائے گی) پھر میں نے دریافت کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام بیشنخا بھی ہے اس میں صحیح خ ہے یا ح؟ فرمایا خ صحیح ہے اور یہ لفظ سریانی ہے جس کے معنی ہیں بڑا شخص۔ پھر میں نے انجیل کے معنی پوچھے، فرمایا سریانی لفظ



اور اس کے معنی میں آنکھ کا نور پھریں نے تورات کے معنی پوچھے فرمایا یہ عبرانی لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں  
 شریعت اور حق پھر پیش نے پوچھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مُشْتَفَع ہے اس میں ت ہے یا ق کہ علماء  
 کا اس میں اختلاف ہے فرمایا سریانی لفظ ہے اور شتفع سے مشتق ہے بمعنی حمد (لہذا مشفع کا ترجمہ ہوا  
 محمد پھر میں نے آنحضرت کے اسم مبارک منحننا کی بابت دریافت کیا کہ تلفظ کس طرح ہے؟ فرمایا وہ کلمہ ہے  
 هَن حَمْنًا۔ من کے معنی ہیں سریانی زبان میں وہ نعمت جس کا نفع ظاہری بھی ہو اور باطنی بھی۔ اور  
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی شان بھی ہے کہ آپ نعمت الہیہ ہیں جس سے تمام عوالم و مخلوقات سب شفع  
 و سیراب ہوئے کہ اجسام کو نفع پہنچا عالم اجسام میں اور یہ ظاہری نفع ہے، اور ارواح کو نفع پہنچا عالم ارواح  
 میں اور یہ باطنی ہے اور حَمْنًا گویا صفت ہے پہلے کلمہ کی۔ یعنی وہ نعمت جو انتہا درجہ پر پہنچی ہوئی ہو مطلب  
 یہ ہوا کہ ذات محمدی تجسم نعمت ہے اور ایسی نعمت ہے جو منتہا پر پہنچی ہوئی ہے کہ اگلا بچھلا کوئی بھی  
 اس درجہ پر نہیں پہنچا۔ میرے ایک دوست شہر تلمسان کے صلحاؤ میں سے تشریف لائے اور ذکر کیا کہ خان  
 عبدالرحمن بن ابراہیم نے کہ تلمسان کے بڑے دیندار تاجر ہیں اور حج بیت اللہ کے لئے گئے تھے مجھ سے بیان کیا کہ میں  
 سیدی ابراہیم و سوتی کے مزار کی زیارت کے لئے گیا تو آپ نے مجھے یہ دعا تعلیم فرمائی بِسْمِ اللّٰهِ الْخَالِقِ الْاَكْبَرِ  
 وَهُوَ حَرِيذٌ مَّا نِعَ مَسْمَاً اَخَاتُ مِنْهُ وَ اَحْذَرُ لَا قُدْرَةَ لِمَخْلُوقٍ مَعَ قُدْرَةِ الْخَالِقِ يَلْجِئُ اِلَيْهَا مِرْقَدَةً  
 اَحْمِي حَمِيًّا اَطْمِي طَمِيًّا كَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا حَمِيًّا كَهَيْئَتِنَا كَهَيْئَتِنَا فَسَيُفِيْلُكُمْ اللّٰهُ وَهُوَ  
 السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ اور یہ ارشاد فرمایا کہ اس دعا کو پڑھو اور پھر کس چیز کا خوف نہ کرو۔ چونکہ حاج عبدالرحمن کو  
 احمی حمیشا اطمی طمیشا کے معنی معلوم نہ تھے اس لئے انہوں نے اس دعا کو پڑھنے میں احتیاط کی کہ ممکن ہے  
 خلاف شرع ہوں اور مجھ سے ان کے معنی دریافت کئے۔ مگر مجھے معلوم بھی معلوم نہ تھے کہ کس زبان  
 کے لفظ ہیں اور ان کا ترجمہ کیا ہے۔ تم بتاؤ ان کے معنی کیا ہیں۔ چنانچہ میں نے حضرت ممدوح سے ان کے  
 معنی دریافت کئے۔ فی البیدرہ فرمایا آج سطح زمین پر ان لفظوں کا بولنے والا کوئی بھی نہیں ہے یہ تم کو کہا  
 سے ہاتھ لگ گئے۔ تب میں نے سارا قصہ سنایا۔ فرمایا ہاں سیدی ابراہیم و سوتی بڑے درجہ کے ادبا  
 ہیں اور اہل فتح کبیر تھے۔ وہ اور اُن جیسے اکابر اولیاءِ ربیے شک ان دو کلموں کا تکلم فرما سکتے ہیں۔  
 یہ دونوں کلمے سریانی زبان کے ہیں اور احمی کا ترجمہ ہے یا مالک اور اس کے اسرار میں ہے اے  
 مالک بادشاہ با عظمت عظیم الشان حج و قیوم! اور حمیشا اشارہ ہے اس کی مملکت کی طرف۔ گویا اس  
 کا قائل کہہ رہا ہے اے مالک اسرار، اے مالک انوار، اے مالک لیل و نہار، اے پرستنے والے  
 بادلوں کے مالک، اے چاند اور سورج کے مالک، اے دینے اور نہ دینے کے مالک، اے پستی و بلندی







اسی طرح زید، عمر، مرد، عورت، گدھا، گھوڑا، (غرض فارسی، انگریزی، عبرانی، جرمنی، لاطینی، ہنگری، کسی زبان کا بھی کوئی لفظ کیوں نہ ہو ہر ایک کے لئے زبان سریانی مخصوص ترجمہ ہے۔ مثلاً المیار نلیط بزبان عبرانی نام ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور سریانی میں ہلا الف مفتوح جب بمعنی دے رہا ہے اور لب اس ق لی ط ہر حرف مفرد جدا معنی دے گا۔ الحاصل تمامی زبان کی اصل ہے یہی سریانی ہی زبان ہے اور تمامی لغات اسی پر متفرع ہوئے ہیں جس کا سبب وہ جہل ہے جو عام بنی آدم پر چھا گیا کہ سریانیت کی موضوعیت اور یاہمی مخاطبت کا مبنی اس صاف شفاف معرفت پر ہے جس میں جہل کا نام نہ ہو۔ حتیٰ کہ جو حضرات اس زبان میں گفتگو کرتے ہیں وہ زبان سے لفظ نکلنے کے پہلے بذریعہ اشراق روحی و نور قلبی اس کے مفہوم سے آگاہ ہوتے ہیں، اور اس لئے اپنا مافی الضمیر سامع کے ذہن میں گزارنے کے لئے مختصر اشارہ کر دینا ان کے لئے کافی ہوتا ہے۔ لہذا بخیال اختصار حروف مفردہ کا استعمال کرتے اور ایک حرف سے معانی کثیرہ کا اشارہ کر کے پوری عبارت کا کام لیتے ہیں۔ کیونکہ ان کو اصل مدلول یعنی معانی سے بحث ہوتی ہے نہ دلائل کثندہ حروف اور الفاظ سے۔ حتیٰ کہ اگر ان کے امکان میں ہوتا کہ ان حروف کے بغیر ہی مضمون کو دوسرے کے سامنے مستحضر کر دیں تو پھر سریانی لغت بھی وضع نہ ہوتا۔ اور اسی لئے سریانی زبان میں گفتگو صرف اہل کشف ہی کر سکتے ہیں کہ تکلم الفاظ سے پہلے ان کے معانی مفہوم کا بذریعہ کشف معلوم کرنا صاحبان کشف ہی کا کام ہے، یا ارواح سریانی میں باتیں کر سکتی ہیں کیونکہ فطری طور پر معرفت و ادراک سے نوازی گئی ہیں اور بلائیکہ کہ ان کی آفرینش ہی معرفت پر ہوئی ہے لہذا اگر تم ان کو باتیں کرتے دیکھو تو دیکھو گے کہ دوسرے لوگ جس مضمون کو ایک جُز یا دو جُز میں ادا کرتے ہیں وہ اس کو ایک حرف یا دو حرف اور حد ہے کہ ایک کلمہ یا دو کلمہ میں ادا کریں گے۔ اتنا معلوم کرنے کے بعد سمجھو کہ بنی آدم پر جب جہل کا غلبہ ہوا اور وہ ان کثیر معانی کو جن کے لئے حروف مفردہ وضع کئے گئے تھے نہ سمجھ سکے اور یہ حروف معطل دیے معنی بن گئے تو ان کو اپنا مفہوم ادا کرنے کے ان حروف کے ساتھ دوسرے حروف ملانے کی ضرورت ہوئی تاکہ اس مجموعہ سے جس کا نام کلمہ ہے وہ معنی ادا کریں جو سریانی کے حروف واحد سے ادا ہوا کرتے تھے۔ غرض حروف ہجائی کے معانی اور ان کے اسرار و رموز سے جہل اور نادانیت کی بدولت ایک بڑا علم ضائع ہو گیا۔ مگر یا اس ہمہ جب کہ زبان کا کوئی کلمہ لوگے تو اس میں کوئی حرف ضرور ایسا ملیگا جو اپنی سابق وضع (یعنی سریانیت کے درجہ) میں اس پورے مفہوم کو ادا کرے گا جس پر یہ کلمہ پورا ہو اس دوسری وضع میں دلالت کر رہا ہے۔ کیونکہ یہ کلمہ سریانیت ہی سے منتقل ہوا ہے لہذا کچھ نہ کچھ اس سے اتحاد ضرور لئے ہوئے ہوگا۔ پھر اس کلمہ کے باقی حروف ان کے نزدیک مہمسل دیے معنی رہیں گے۔ مگر



سریانیوں کے لئے ان میں کا بھی ہر حرف جدا معنی اور مستقل مفہوم ادا کرے گا مثلاً حاطط عربی لغت میں گھریا باغ کو گھیر لینے والی چیز یعنی چار دیواری کو کہتے ہیں۔ مگر سریانی زبان میں صرف ح جو اس کلمہ کا پہلا حرف ہے اس معنی کو ادا کر رہا ہے۔ اور باقی حروف یعنی آ ت ط عام لوگوں کے نزدیک مہمل و بے زائد ہیں۔ لیکن سریانیوں کے نزدیک یہ بھی ح کی طرح اپنے معانی جدا جدا بتا رہے ہیں۔ اسی طرح مثلاً ماء عربی زبان میں پانی کو کہتے ہیں مگر سریانی میں یہ معنی صرف سمندر سے ادا ہو رہے ہیں جو اس کلمہ کا آخری حرف ہے اسی طرح السماء کے معنی ہیں آسمان اور سریانی میں اس معنی کو صرف حرف س ادا کر رہا ہے۔ عرض غور اور تلاش کرو گے تو اکثر لغات اور کلمات کو اسی طرز پر پاؤ گے کہ ایک حرف سے معنی ادا ہوئے اور باقی حروف بے فائدہ ضائع گئے۔ نیز آپ نے فرمایا کہ سیدنا آدم علیہ السلام جب رحبت سے نیچے زمین پر اتارے گئے تو اپنی بیوی بچوں کے ساتھ سریانی لغت میں باتیں کیا کرتے تھے۔ کیونکہ رحبت کی سکونت کا زمانہ قریب تھا لہذا معانی کی معرفت ان کو نور و صفائی کے ساتھ حاصل تھی۔ چنانچہ سریانیت ان کی اولاد میں بلا تبدیل و تغیر اپنی اصل حالت پر باقی رہی حتیٰ کہ سیدنا ادریس علیہ السلام گذر لئے تو اس میں تغیر و تبدل شروع ہوا اور لوگ اس کو اصل سے منتقل کرنے اور نئے نئے لغات تراشنے لگے۔ سب سے پہلا لغت جو مستخرج ہوا وہ ہندی زبان ہے اور اسی لئے سریانی لغت کے قریب ترین ہے۔ غالباً سنسکرت مراد ہے اور اسی لئے اس کو قدیم زبان بتایا جاتا ہے۔ چونکہ ابوالبشر کی سکونت بعد مہبوط جنوبی ہند میں رہی اس لئے سریانی زبان سب سے پہلی تبدیل میں سنسکرت اور حضرت آدم علیہ السلام کا سریانی زبان میں باتیں کرنا اس لئے تھا کہ اہل جنت کی زبان یہی ہے اور آپ جنت میں چونکہ اسی زبان میں کلام کیا کرتے تھے لہذا زمین پر آئے تو اس کو ساتھ لے کر آئے۔ میں نے عرض کیا کہ مفسرین نے تو خَلَقَ الْإِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ کی تفسیر میں یہ لکھا ہے کہ انسان سے مراد حضرت آدم ہیں اور بیان سے مراد سات سو زبانوں میں کلام کرنا ہے جس میں افضل ترین لغت قرآنی ہے۔ فرمایا یہ صحیح ہے کہ حق تعالیٰ نے سات سو زبانیں حضرت آدم کو تعلیم فرمائیں اور وہ تمامی لغات بیانے اور سمجھتے تھے بلکہ آپ نے نیچے والے یعنی اولیاء امت محمدیہ راغوث و اقطاب بھی ان سب زبانوں کو جانتے اور سمجھتے ہیں۔ مگر گفتگو حضرت آدم علیہ السلام صرف سریانی میں فرماتے تھے جس پر پیدا ہوئے اور نشو و نما پائی تھی کہ آپ ہمیشہ رہتے جنت میں اور اہل جنت کی زبان سریانی تھی۔ جیسے ایک ہندوستانی شخص انگریزی فارسی عربی ہر معنی لاطینی وغیرہ واقف اور مہنت زبان ہو مگر بال بچوں سے گفتگو اپنی مادری زبان میں کرے، میں نے کہا اس پر حضرت ابن عباسؓ کی حدیث مرفوعہ سے اعتراض وارد کیا جاسکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عرب کیساتھ محبت رکھو تین وجہ سے کہ میں عربی ہوں اور قرآن بھی عربی ہے اور اہل جنت کی گفتگو بھی عربی میں ہوگی فرمایا یہ حدیث نہیں ہے اور نہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم



نے فرمایا ہے رچانچہ عقیلی نے بھی لکھا ہے کہ یہ حدیث بے اصل ہے اور ابن الجوزی نے بھی اس کو موضوعات میں شمار کیا ہے، نیز حضرت نے فرمایا کنجوں کے کلام میں غور کرو گے تو اس میں بہت کچھ سریانییت پاؤ گے اس کی وجہ یہ ہے کہ بچپن میں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ نقش کا الحجر ہو جاتی ہے چونکہ حضرت آدم علیہ السلام اپنے بچوں سے باتیں کیا کرتے (اور اگر وہ روتے تو) ان کو چپ کیا کرتے اور ان سے کھانے پینے کی مختلف چیزوں کے نام لیا کرتے، (اور یہ سب سریانی زبان میں ہوا کرتا تھا) لہذا اسی پر ان کا تشوہ نما ہوا۔ پھر بچوں کو اسی کی تعلیم دی۔ اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا کہ سب مادری زبان سیکھتے اور وہی بولتے چلتے رہے، لیکن جب زبان میں بعد زبان اور پس علیہ السلام) تبدیل واقع ہوئی تو وہ زبان بھولی لبری ہو گئی اور بڑوں کے پاس تو اس کا کچھ بھی نہ رہا البتہ بچوں کے پاس کچھ باقی رہ گئی۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ بچہ جب تک دودھ پیتا رہتا ہے اس کی روح کو ملا اٹلی کے ساتھ تعلق رہتا ہے اور بحالت رضا عت بچہ کو جو خواہیں نظر آتی ہیں اگر بڑے کو نظر آئیں تو خوف کے مارے مر جائے کیونکہ بچپن میں غلبہ روح کا رہتا ہے (اور وہ نورانی ہونے کے سبب فرشتوں کا نظارہ کر سکتی ہے اور بڑے ہو جانے پر غلبہ ذات کا ہو جاتا ہے) لہذا وہ خواب میں فرشتوں کا دراؤنی صورتوں کے نظارہ کو برداشت نہیں کر سکتا) اور پہلے معلوم ہو چکا کہ ارواح کی زبان یہی سریانی ہے۔ لہذا جس طرح بچہ عالم خواب میں جو کچھ مشاہدہ کرتا ہے بحکم غلبہ روح کرتا ہے اسی طرح بچہ عالم بیداری میں بزبان سریانی جو بات کرتا ہے وہ بحکم غلبہ روح کرتا ہے چنانچہ طفل شیرخوار کی زبان سے نکلتا ہے غغ غغ یہ نام ہے حق تعالیٰ شانہ کا کہ سریانی لغت میں دلالت کرتا ہے نہت و علو اور لطف و شفقت پر گویا اس کا مطلب ہوا یا علی یا رفیع یا لطیف یا حنان۔ اسی طرح تم نے دیکھا ہو گا کہ بچہ کو دودھ چھوٹنے کے بعد جب کوئی چنے یا باتلہ کا دانہ دیتے ہیں تو اس کا نام تجویز کرتے ہیں۔ بوبو کہ سریانی زبان میں وضع کیا گیا ہے کھانے کی میٹھی چیز کے لئے اور یہی وجہ ہے کہ ماں کی لپٹان پر بھی جس سے دودھ پیا جاتا ہے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ (اور یہ یقینہ اسی سریانی لغت کا ہے لہذا بچہ اس کو سمجھتا ہے اور پستان مادر کی طرح معقول سمجھ کر کھانے کی رغبت کرتا ہے۔ اسی طرح جب بچہ کو پاخانہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تو ماں اس کو کہتی ہے غغ جو سریانی زبان میں وضع کیا گیا ہے ذات کی نجاست خارج کرنے کے لئے گویا اسی کی سریانی زبان میں ماں اس کو پڑھاتی ہے کہ نجاست ذات یعنی پاخانہ خارج کر دے) اسی طرح بچہ کے پاس جب اس سے چھوٹا کوئی بچہ لایا جاتا ہے تو اس کا نام رکھتے ہیں مومو جس کے معنی سریانی زبان میں قلیل الجسم چھوٹی اور پیاری چیز کے ہیں (گویا بچہ سے سریانی زبان میں کہتے ہیں کہ یہ ننھا عزیز آگیا اس سے دل بہلا اور اسی لئے آنکھ کی پٹکی کو عربی میں مومو کہتے ہیں (کہ دانہ مسو کے برابر عزیز الوجود ہے) مگر عین معنی آنکھ کی طرف مضاف بنا کر بولتے ہیں یعنی مومو العین معروض تلاش کر دے تو بچوں کے کلام میں تم کو بکثرت الفاظ سریانی زبان کے ملیں گے



نیر حضرت نے فرمایا اس وقت کہ ۹ رزی الحجہ ۱۲۹۹ھ کا دن تھا (ملک مغرب میں کوئی ایک بھی سریانی زبان میں بات کرنے والا مجھے نظر نہیں آتا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت منصور (جن کا انتقال ہو چکا تھا) سریانی میں کلام کیا کرتے تھے یا نہیں۔ فرمایا ہاں کیا کرتے تھے۔ مگر ہمارے حضرت عبداللہ برناوی سریانی زبان میں ان سے بہت زیادہ اچھی گفتگو کرتے تھے۔ میں نے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا حضرت برناوی کو اہل دیوان (صحابیان خدمت سے) ملنے جلنے کا اتفاق زیادہ ہوتا تھا (کہ غوث زبانہ تھے) اور اہل دیوان کی ساری گفتگو سریانی میں ہوتی ہے بوجہ قلت الفاظ اور کثرت معانی کے ان کی گفتگو عربی زبان میں نہیں ہوتی۔ ہاں جس وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجلس میں تشریف لاتے ہیں تو براہ ادب و توقیر کہ حیات دنیویہ میں آپ کی زبان عربی تھی تمامی اہل مجلس عربی میں گفتگو کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ کیا حضرت عمر ہورری اور حضرت محمد لہواج بھی (کہ آپ کے شیوخ میں ہیں) سریانی زبان جانتے تھے فرمایا نہیں۔ پھر میں نے دریافت کیا کہ قبر میں منکر و نیکر کا سوال بلغت سریانی ہوگا یا کسی دوسری زبان میں؟ کیونکہ امام سیوطی اپنی نظم میں لائے ہیں سے

وَمِنْ عَرَبِيٍّ مَا تَسْوَى الْعَيْنَانِ بِإِنْ سُؤَالَ الْقَبْرِ بِالسُّرْيَانِي

عجیب بات جو آنکھوں سے نظر آئے گی یہ ہے کہ قبر میں سوال زبان سریانی ہوگا۔ مگر اس کو شیخ الاسلام علم الدین بلقینی کے فتاویٰ سے نقل کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ مجھے اس کی سند کہیں نہیں ملی اور علامہ ابن حجر سے بھی کسی نے اس کا سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا ہے کہ ظاہر حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ سوال قبر عربی زبان میں ہوگا مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہر شخص سے اسی کی زبان میں سوال ہو۔ حضرت ممدوح نے فرمایا ہاں سوال قبر خاص سریانی زبان میں ہوگا۔ کیونکہ ملائکہ اور ارواح کی زبان وہی ہے اور ملائکہ سوال (منکر و نیکر) گروہ ملائکہ ہی میں ہیں اور جواب دینے والی بھی روح ہی ہے۔ اور تمامی ارواح کی طرح اس کی زبان سریانی ہے۔ جب ذات کا مردہ (موت کے سبب) درمیان سے اٹھ گیا تو وہ اپنی اصلی حالت کی طرف لوٹ آئی۔ اور جس دلی کو حق تعالیٰ شانہ فتح کبیر عطا فرماتا ہے یعنی غوث کے درجہ پر پہنچاتا ہے جب وہ کسی سے سیکھے بغیر سریانی زبان میں باتیں کرتا ہے کہ اس پر حکم روح غالب ہے پھر مردہ کا تو کیا پوچھنا لہذا اس کو بھی (خواہ زندہ کی میں مادی زبان کچھ ہی ہو) سریانی میں باتیں کرنا کچھ دشوار نہ ہوگا میں نے عرض کیا کہ حضرت والا قبر کے سوال و جواب کی کیفیت بیان فرما کر ہمیں مرہون احسان بنائیں۔ فرمایا شفو۔ مَرَّازْ هُوَ اس کے اعراب ضبط کرو۔ اول میم مفتوح اور اس پر ہلکا سا تشدید پھر س مفتوح اور آگے الف پھر ز ساکن اور آخر میں لا مفہوم کے ساتھ و خفیف سکون لئے ہوئے اور دل چاہے لا پر وقف کرو اور اس کے بعد ذرا کھینچو (کہ ہلکی سی واہید ہو جائے) اب اس کا مطلب سمجھو کہ ہر حرف مفرد کی وضع سریانی میں خاص معنی کے لئے ہے پہلا حرف یعنی میم مفتوح بروئے وضع دلالت کرتی ہے تمامی



کائنات اور ساری مخلوقات پر اور دوسرا حرف یعنی س وضع ہوا ہے تمامی خوبیوں کے لئے جو اس کائنات میں موجود ہیں۔ جس وضع ہوئی ہے برائیوں کے لئے جو اس کائنات میں ہیں اور کائنات کے بعد شمس ہے وضع ہوئی ہے تاکہ دلالت کرے اس ذات مقدسہ پر جس نے تمامی عوالم کو پیدا فرمایا ہے پس حرف اول سے اشارہ ہوا ہے تمامی کائنات کی طرف اور حرف دوم سے اشارہ ہوا تمامی خوبیوں کی طرف جو کائنات میں موجود ہیں اور ان میں سید الوجود صلی اللہ علیہ وسلم، حضرات انبیاء و فرشتے، آسمانی کتابیں جنت، لوح، قلم، تمامی انوار جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں اور جو کچھ عرش میں اور اس کے اوپر اور اس کے نیچے ہیں سب داخل ہو جائیں گے اور حرف سوم سے اشارہ ہوا تمامی شرور کی طرف کہ اس میں جہنم اور ہر ذات خبیثہ، مثلاً شیطان، اور ہر وہ چیز جس میں شر اور گندگی ہو، سب داخل ہو جائیں گی۔ اور حرف چہارم یعنی ک پہنچا رہی ہے حق تعالیٰ سبحانہ کی طرف اور سرائی لغت کی عادت ہے کہ بعض معانی کے صرف ارادہ پر اکتفا کرتی ہے اور اس پر دلالت کرنے والے حرف کی محتاج نہیں رہتی جیسے دیگر زبانوں میں بھی، استفہام اور قسم اور تمسبی وغیرہ کے لئے لفظ نہیں لاتے بلکہ لہجہ کے طرز یا سیاق عبارت سے اس کو ادا کر دیتے ہیں لہذا یہاں اس قرینہ سے کہ وہ سوال کرنے آئے ہیں استفہام مراد ہوگا۔ گویا پوچھتے ہیں کہ تمامی کائنات اور انبیاء، ملائکہ، کتب سماویہ، جنت، اور تمامی خوبیوں کا، اور شیاطین، اور تمامی برائیوں کا، خالق وہ اللہ سبحانہ ہے یا کوئی اور؟ پس اگر مردہ مومن ہوتا ہے تو جواب دیتا ہے مراد از یہ مراد اول میم مفتوح اور پھر اس پر ہلکا سا تشدید پھر می مفتوح ادا گئے الف پھر د ساکن اس کے بعد ہمیزہ مفتوحہ اور پھر ز نکسہ اور پھر ی اور اس پر ہلکا سا سکون پھر ت ساکن اور اس کے آگے حسب سابق ک مضموم اور و ہلکے سے سکون والی اس کے مطلب کی توضیح یہ ہے کہ میم مفتوح حسب سابق اشارہ کر رہی ہے تمامی کائنات کی طرف اور حرف دوم یعنی ک سے اشارہ ہے نور محمدی اور تمام انوار کی طرف جو آپ سے مستخرج ہوئے مثلاً انوار ملائکہ، انوار انبیاء مرسلین، انوار لوح و قلم، نور برزخ اور ہر وہ چیز جس میں نور پایا جاتا ہے اور یہ فرق کہ یہاں ت سے مراد ہم نے نور محمدی وغیرہ لئے اور سوال میں اسی حرف سے مراد تمام خوبیاں لی جھیں، اس بنا پر ہے کہ جواب دینے والا چونکہ امت محمدیہ میں سے ہے لہذا چاہتا ہے کہ سلک محمدی میں داخل اور تحت لوام محمدی شامل ہو جاوے، اس لئے خاص نور محمدی مراد ہوتا ہے ہم یہ تفسیر سابق کے مخالف بھی نہیں ہے کہ ہر خوبی اور خیر یعنی جنت و عرش اور زمین و آسمان وغیرہ سب اسی اصل یعنی نور محمدی کی شاخیں ہیں اگر فرق ہوا تو صرف عموم و خصوص کا ہوا اور حرف سوم یعنی د سے اشارہ ہے تمام ان چیزوں کے حق ہونے کی جانب جو پہلے حرف میں داخل جھیں گویا جواب دیتا ہے کہ ہاں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم برحق ہیں، تمام انبیاء برحق ہیں تمام فرشتے برحق ہیں اور تمام کتب سماویہ برحق ہیں ان میں اور جو کچھ بھی حرف سابق میں داخل ہے سب حق ہے، اس میں کوئی شک اور کسی قسم کا بھی شبہ نہیں ہے پھر حرف چہارم یعنی ہمزہ مفتوحہ



اشارہ کر رہا ہے اپنے مابعد کے مدلول کی طرف کیونکہ سہمزہ مفتوحہ سریانی زبان میں منجملہ حروف اشارہ کی ہے جیسے ہذا اور ہذا عربی زبان میں راویہ اور وہ اردو زبان میں، اور حرف پنجم یعنی نر حسب الباقی شر اور برائی پر دلالت کر رہی ہے کہ دروخ اور ہر چیز جس میں ظلمت و شر ہے اس کے تحت میں داخل ہو جائے گی اور حرف ششم یعنی مں ساکنہ سے اشارہ ہے ہر اس چیز کے حق ہونے کا جو حرف سابق یعنی نر میں داخل ہے جس کو کسی کے ساتھ اشباع دیا ہے یعنی زیر کو کھینچ کر بصورت یا پڑھا گیا ہے اور لا جس میں ضمہ کے کھینچنے سے ہلکی واؤ پیدا ہو گئی ہے حسب الباقی اشارہ ہے ذات علیہ کی طرف، بایں لحاظ کہ وہ خالق ہے مالک ہے متصرف ہے قاهر ہے۔ پس حاصل جواب یہ ہوا کہ کہتا ہے تمامی کائنات کا اور ہمارے بنی برحق کا اور تمامی انبیاء کا جو کہ برحق ہیں، اور تمام فرشتوں کا جو کہ برحق ہیں، اور تمام انوار کا جو کہ برحق ہیں، اور عذاب جنہم کا جو کہ برحق ہے اور ہر قسم کے شر کا جو کہ برحق ہے، سب کا پیدا کرنے والا، سب کا مالک اور سب کا با اختیار حاکم متصرف وہی اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہے جس کا نہ کوئی سہیم ہے نہ شریک، اور نہ کوئی اس کے حکم کا ٹالنے والا ہے نہ اس کی مشیت کو روکنے والا جب مژدہ یہ صحیح اور حق جواب دیتا ہے تو فرشتے کہتے ہیں خاص یعنی نون مفتوحہ جس کے بعد الف ہے اور زیر کے کھینچنے سے پیدا ہوا ہے دلالت کر رہا ہے نور پر جو ذات میں دمک رہا ہے اور صداد مکسورہ اشارہ کر رہا ہے مٹی کی طرف۔ اور رائے ساکنہ دلالت کر رہی ہے ماسبق کے حق ہونے کی طرف۔ مطلب یہ ہوا کہ ہاں تیرا نور ایمان جو تیری ذات ترا بی میں جس کی اصل مٹی ہے قائم اور دمک رہا ہے وہ حق اور صحیح ہے، واقع کے مطابق ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ گویا اس حدیث کا مفہوم ہے جس میں مذکور ہے کہ مومن کا جواب سنکر فرشتے کہتے ہیں اچھا اب آرام سے سو جاؤ ہمیں علم ہو چکا تھا کہ تم اہل یقین اور صاحب ایمان ہو پھر میں قرآن مجید کے چند الفاظ کی بابت دریافت کیا جن کے متعلق علما کا اختلاف ہے کہ وہ سریانی ہیں یا اور کسی زبان کے مثلاً اَمْتَعَادَا کہ علامہ واسطی نے رسالہ ارشاد میں لکھا ہے کہ سریانی لفظ ہے بمعنی کتب اور ابن ابی ماتم نے صنحاک سے نقل کیا ہے کہ قبطنی زبان کا لفظ ہے بمعنی کتب فرمایا واسطی کا قول صحیح ہے کہ سریانی لفظ ہے بمعنی کتب اور تفصیلی معنی یہ ہیں کہ سہمزہ مفتوحہ حسب الباقی اشارہ ہے مابعد کی طرف اور مں ساکن وضع ہوا ہے محاسن اشیاء کے لئے اور ن مفتوح اس چیز کا نام ہے جو طاقت بشری سے خارج ہو اور س مفتوح دوسرا اشارہ ہے محاسن کی طرف۔ مطلب یہ ہوا کہ وہ کتابیں جن میں یہ یہ خوبیاں ہیں جو بشری طاقت سے باہر ہیں یا مثلاً رَبَّانِیُّونَ کہ جو الیقین کہتے ہیں مجھے معلوم نہیں یہ سریانی ہے یا عبرانی فرمایا سریانی لفظ ہے اور اس کا ترجمہ ہے وہ حضرات جن کو حق تعالیٰ نے فتح نصیب فرمائی علم کے متعلق بغیر سیکھے اور یہ مرکب ہے تین کلموں سے یعنی مں یا اور فی اور یوں مں سے اشارہ ہے خیر کثیر کی طرف جس پر بارشدد



دلالت کر رہی ہے۔ پھر تفسیر مفسرہ اشارہ ہے قرب کے لئے اور تفسیر کی وضع اس شے کے لئے ہے جسے سکون و قرار نہ ہو۔ مثلاً بجلی اور نور تفسیر مفتوح اشارہ ہے اس خوبی کی طرف جو ذات میں قائم اور مشغول ہو۔ ترجمہ یہ ہوا کہ یہ خیر و خوبی جو میرے قریب ہے اور اہل فتح کی ذات میں ہوا کرتی ہے وہ ایک نور ہے انوار الہیہ میں سے اور سر ہے اسرار الہیہ میں سے اور وہ ان کی ذات میں قائم و مشغول رہا کرتا ہے یا مثلاً نصیت لک کہ ابن ابی حاتم نے قبلی زبان کا لفظ کہا ہے۔ اور حسن نے سریانی، اور عمرہ نے حورانی، اور ابو زید انصاری نے عبرانی بمعنی آؤ۔ فرمایا سریانی نہیں ہے۔ یا مثلاً شکر کہ جو الیقینی نے اس کو سریانی لغت بتایا ہے۔ فرمایا سریانی نہیں ہے۔ اور سریانی زبان میں تو شہر کے معنی پانی کے ہیں۔ یا مثلاً عدن کہ ابن جریر نے نقل کیا ہے، حضرت ابن عباس نے حضرت کعب احبار سے دریافت کیا جنات عدن کا کیا ترجمہ ہے۔ کعب نے فرمایا کہ سریانی زبان کا لفظ ہے یعنی انگوروں کے باغات۔ اور ابن جریر نے اس کو رومی زبان کا لفظ بتایا ہے فرمایا سریانی لفظ ہے اور اور پھر اس کی تفسیر میں اپنے درجہ کی بات کہی (حس کا اظہار مناسب نہیں) یا مثلاً کَفُوَا کہ داسطی نے سریانی لفظ بتایا ہے بمعنی ساکن۔ اور ابو القاسم نے قبلی لفظ کہا ہے بمعنی سہل۔

فرمایا سریانی لفظ ہے اور دلالت کر رہا ہے قوت مالا لیطاق پر کہ مثلاً ہم کہیں گے فلاں شخص رہو ہے۔ یعنی اتنا قوی ہے کہ دوسروں میں یہ قوت نہیں۔ اور مثلاً ہم کہیں گے یہ شخص رہو قوم کا ہے یعنی ایسی جماعت کا ہے جس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ غرض اسی قسم کے بہت سے لفظ ہیں نے حضرت ممدوح سے دریافت کئے جن کو بخوف طرالت چھوڑتا ہوں نیز حضرت ممدوح نے فرمایا کہ سریانی زبان سے واقفیت صرف غوث کو ہوتی ہے یا اس کے ماتحت سات قطبوں کو۔ اور مجھے یہ زبان ۲۵ سالہ میں حضرت احمد بن عبد اللہ نے سکھائی تھی تقریباً ایک مہینہ میں۔ پھر حضرت ممدوح نے حروف تہجی کا ہر حرف جس معنی کے لئے وضع کیا گیا ہے ۸ رذی الحجہ ۲۲۵ھ میں مجھے تعلیم فرمایا۔ بعد اللہ میں ایک دن سب سمجھ گیا تو فرمایا میں نے تو ایک مہینہ میں سیکھی تھی اور تم نے ایک ہی دن میں سیکھ لی۔ میں نے آپ کے ہاتھ کو بوسہ دے کر کہا کہ یہ حضرت ہی کی برکت اور پڑھانے و سمجھانے کا سلیقہ ہے۔

دہل قرآن مجید کی بابت میں نے حضرت ممدوح سے دریافت کیا کہ وہ لوح محفوظ میں بلغت عبرانی مکتوب ہے؟ فرمایا اور بعض حصہ بلغت سریانی۔ میں نے پوچھا وہ بعض حصہ کونسا ہے؟ فرمایا بعض سورتوں کے شروع میں جو حرف مقطعات ہیں۔ چونکہ برسوں سے جس چیز کی مجھے تلاش تھی وہ آج ہاتھ آئی۔ میں بہت خوش ہوا اور استفسار کیا کہ ص وَالْقُرْآنِ ذِی الذِّکْرۃ کے کیا معنی ہیں؟ فرمایا اگر لوگوں کو ص کے معنی اور اس کی حقیقت کا علم ہو جائے تو کسی کو بھی اللہ کے حکم کی مخالفت پر کبھی جرأت نہ ہو۔ مگر اس کی تفسیر



بیان نہ فرمائی۔ پھر میں نے کھلیعص کے معنی دریافت کئے۔ فرمایا اس میں بڑا عجیب راز ہے اور جو کچھ بھی سورہ مریم میں (جس کے شروع کا یہ کلمہ ہے) مذکور ہے مثلاً حضرت زکریا، حضرت یحییٰ، حضرت مریم، حضرت عیسیٰ، حضرت ابراہیم، حضرت اسمعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت موسیٰ، حضرت ہارون، حضرت ادریس، حضرت آدم، اور حضرت نوح، علیہم وعلیٰ بنینا السلام کے قصے۔ نیز ہر قصہ جس کا اس کے بعد سورہ میں تذکرہ ہے وہ سب کھلیعص کے معنی میں داخل ہے اور اس سے زیادہ حصہ اس کے معنی کا ابھی باقی رہ گیا ہے۔ اور یہ رموز (یعنی حروف تہجی مثلاً ک ی ع ص)، لوح محفوظ میں اس طرح لکھے ہوئے ہیں کہ ہر ایک کی تفسیر اس کے ساتھ مکتوب ہے۔ رموز کی شکل بہت بڑی ہے اور اس کی تفسیر کہیں اس کے اوپر لکھی ہوئی ہے اور کہیں اس کے نیچے اور کہیں اس کے پیٹ میں۔ اس کی مثال کچھ ہو سکتی ہے تو یہ کہ دستاویز کی تحریر میں جب کوئی بات یاد آتی ہے تو اسی جگہ لکیر کھینچ کر وہ متروکہ مضمون لکھ دیتے ہیں اور کاغذ مکمل کر دیا کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ شروع حروف بمنزلہ نشان کے ہیں اور ساری سورت میں جو کچھ مذکور ہے وہ اس کی شرح اور تفسیر ہے اور لوح محفوظ کا قاعدہ یہی ہے کہ اہل رمز آئے گا اور پھر اس کی تفسیر اور جب تفسیر ختم ہو جائے گی تو پھر رمز آئے گا اور اس کے بعد اس کی تفسیر اسی طرح آخر تک سلسلہ چلے گا۔ پس اگر حرف (دائرہ اور کشش والا) ہو گا جیسے ص تو اس کی تفسیر اس کے اندر لکھی جائے گی۔ اور یہی وجہ ہے کہ ص کی شکل لوح محفوظ میں اتنی طبعی نظر آتی ہے کہ کوئی چلے تو کم و بیش ایک دن میں اس کی مسافت کوٹے کرے۔ شروع سورتوں کے ان رموز کا علم صرف دو شخصوں کو ہوتا ہے۔ ایک وہ جو لوح محفوظ کو دیکھتا ہے۔ اور دوسرا وہ جو اہل تصرف اولیاء کی مجلس میں آمد و رفت رکھتا ہے ان دو کے علاوہ کسی کو ان کے علم و معرفت کی طمع رکھنا بالکل فضول ہے پھر میں نے دریافت کیا کہ الحمد جو سورہ بقرہ کے شروع میں ہے اور وہ الحمد جو سورہ آل عمران کے شروع میں ہے، دونوں کا اشارہ ایک ہی شے کی طرف ہے یا دونوں کے معنی جدا جدا ہیں؟ فرمایا دونوں کے معنی جدا جدا ہیں سارے ہر ایک کی شرح وہی مضامین ہیں جن کا اس سورہ میں تذکرہ ہے۔ یہ تقریب میں نے آپ سے ابتدائی ملاقات کے وقت سنی تھی اور سمجھ گیا تھا کہ آپ اکابر اولیاء میں سے ہیں۔ کیونکہ میں نے دیکھا تھا کہ اکابر صوفیہ نے جہاں بھی سورتوں کے حروف مقطعات کی بحث چھیڑی ہے وہاں اس کی تصریح کی ہے کہ ان حروف مقطعات کے معانی سے کوئی واقف نہیں بجز اقطاب و اوتاد ارض کے۔ یہ میرے لئے بڑی شہادت تھی حضرت مسدوح کے ولی کامل (اور قطب وقت) ہونے کی خصوصاً جبکہ آیات قرآنیہ کی عجیب عجیب تفسیریں آپ سے سُننا اور غور کرتا تھا کہ آپ نے اس علم کو نہ بچپن میں سیکھا دے ہو کر بلکہ قرآن مجید بھی نہیں پڑھا اور نہ حفظ کیا۔ بجز رنا کے قابل، چند سورتوں کے۔ چنانچہ امام ترمذی نے نو اور الاصول میں لکھا ہے کہ سورتوں کے مقطعات



میں اشارہ ہے تمام ان مضامین کی طرف جو اس سورۃ میں بیان کئے گئے ہیں۔ اور ان کا علم مجبُز اوتاد کے کسی کو نہیں کہ وہ حکماء خداوندی ہیں اور اللہ ہی سے انہوں نے اس حکمت و دانش کو (بلا تسلیم و تعلیم ظاہری کے) حاصل کیا ہے۔ اس کا نام علم الحروف ہے اور ان ہی حروف سے تمام علوم کی تعبیر ہوتی ہے اور ان ہی سے اسماء الہیہ کا ظہور ہوا کہ مخلوق اپنی زبانوں سے اُن کو ادا کر سکی۔ اور غوثِ زمانہ حضرت ابوالحسن شاذلی رح کی حزبِ کبیر کے تحشیہ میں ولی کامل حضرت ابوزید عبدالرحمان قاسی نے بیان کیا ہے کہ حروف اور اسماء کی معرفت خصوصیاتِ علوم انبیاء میں سے ہے بلحاظ اولیاء ہونے کے۔ بنی میں شانِ نبوت جدا ہے اور شانِ ولایت جدا، اور یہی وجہ ہے کہ اس علم میں انبیاء اور اولیاء میں مشارکت ہو جاتی ہے (کہ اولیاء کو بھی حسب مراتب ان علوم کا حصہ مل جاتا ہے) کیونکہ یہ کشفی علوم میں سے ہے۔ لہذا عقل کی پونجی کا اس بازار میں لانا بے سود ہے۔ جس کو علم نصیب ہو گیا ہے وہ ناواقف نہیں رہ سکتا، اور جو ناواقف رہا اس کا دماغ اس میں چل نہیں سکتا۔ نیز امام اور تنجی تحریر فرماتے ہیں کہ ان رموز کے معانی بجز علماء و ربانیین کے کوئی نہیں جانتا۔ الحاصل <sup>۲۹</sup> اللہ کا یومِ ترویہ (۸ ذی الحجہ) تھا جب میں نے آپ سے یہ مضمون سنا کہ قرآن کا کچھ حصہ لوح محفوظ میں بزبانِ سریانی مکتوب ہے وہ یہی حروف مقطعات ہیں جو سورتوں کے شروع میں آئے ہیں تو میں نے فرداً فرداً تمامی حروف مقطعات کی تفسیر اور ان رموز کی شرح کا حضرت ممدوح سے سوال کیا اور الحمد للہ کہ میری پوری درخواست منظور ہو گئی مگر سب کو تحریر میں لانے کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے اس لئے کچھ حصہ ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔

ص ۱ کی تفسیر کے متعلق آپ نے فرمایا کہ اس سورۃ میں ص سے مراد وہ خلا ہے جس میں بروزِ حشر انسان اور تمام مخلوق کا اجتماع ہوگا اور آیت میں اس کا ذکر بصورتِ وعدہ و وعید لایا گیا ہے گویا ارشاد ہے قسم ہے نصیحت سے بھرے ہوئے قرآن کی کہ وہ ص ہے یعنی وہ (ہونا ک منظر) جس سے میں تم کو ڈراتا ہوں اور (وہ پُر فضا، منتظر) جس کی میں تم کو بشارت سناتا ہوں وہ ص (یعنی حشر کا خلا اور میدان وسیع ہے)۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جس شخص کے اعمال و افعال جس حالت کو مقتضی ہوں گے وہ خلا اسی رنگ کو قبول کرے گا۔ مثلاً ایک کافر پر (بمقتضا و کفر) ایک عذاب تم کو نظر آئے گا، اور اُسی کے پہلو میں ایک مومن کھڑا ہوگا اس پر (بمقتضا و ایمان) ایک رحمت ہوگی۔ پھر اس کی بغل میں ایک کافر کھڑا ہوگا اس پر دوسری قسم کا عذاب ہوگا کہ کفر کے مراتب بھی جدا ہیں اس لئے ہر کافر پر اس کے کفر کے موافق عذاب بھی جدا ہوگا، پھر اس کے قریب ایک مومن کھڑا ہوگا اور اس پر رحمت ہوگی مگر دوسری قسم کی کہ ایمان کے بھی درجات مختلف ہیں اس لئے ہر مومن پر رحمت کی نوعیت بھی جدا ہوگی اسی طرح ہر شے پر جتنے بھی محشر میں جمع ہوں گے جب اقسام کی رحمت ہوگی



اور جب اقسام کا عذاب کہ باوجودیکہ دیکھنے میں خلا ایک ہے اور دنیا کی طبیعت جس کو مقتضی ہے کہ گرمی ہے تو سب پر اثر ہے اور بارش ہے تو سب پر برس رہی ہے، وہاں ایسا نہ ہوگا۔ بلکہ ہر شخص کی باوجود پہلو پہلو ہونیکے رات یا تکلیف مستقل ہوگی اور ایک کی جگہ دوسرے کی جگہ کے کچھ بھی مشابہ نہ ہوگی۔ اور اہل فتح تو اب بھی اس کو آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ زید اپنی تقدیر کی تکھت کے موافق اپنے مقام میں نظر آ رہا ہے۔ اور عمر حسب نوشتہ تقدیر اپنے خلا میں گویا سب اللہ جل جلالہ کے سامنے اپنے اعمال نیک و بد کے موافق عذاب یا رحمت کے جو میں کھڑے ہیں۔ اور اسی لئے ہم نے کہا کہ اگر لوگوں کو علم ہو جائے کہ ص سے کیا مراد ہے اور یہ کس چیز کی طرف اشارہ کر رہا ہے تو کسی ایک کو بھی اللہ پاک کے حکم کی مخالفت پر کبھی جرأت نہ ہو۔ کیونکہ اگر ان کی نظروں سے پردہ اٹھایا جائے اور محشر کے خلا میں ان کو اپنا اپنا مقام و مرتبہ نظر آ جائے تو مبطع کو رشک ہو کہ کاش بڑے مرتبہ والے پر پہنچتا، اور عامی براہ تاسف مر رہے اور ظاہر ہے کہ اس خلا میں کفار بھی ہوں گے اور مومنین بھی۔ انبیاء بھی ہوں گے اور ملائکہ بھی۔ جنات بھی ہوں گے اور شیاطین بھی لہذا شروع سورۃ میں حق تعالیٰ نے اشارہ فرمایا کفار کی طرف کہ ان کی چند جماعتوں کا تذکرہ فرمایا اور پھر اشارہ فرمایا انبیاء کی طرف کہ ان میں چند حضرات کا تذکرہ فرمایا۔ نیز اشارہ فرمایا مومنین کی طرف کہ انبیاء ہی کے اثناء تذکرہ میں ان کا حال بیان فرمایا اور سورۃ کے آخر میں ملائکہ کا تذکرہ فرمایا اور نیز جنات و شیاطین کا کہ دنیا میں ان کی جو حالتیں ہیں ان کو ظاہر فرمایا اور چونکہ ان کے یہی دنیوی حالات بروز محشر اس خلا میں تغیر احوال کا سبب ہیں اس لئے ان کے کفر و تہمید کا تذکرہ گویا اُس خلا ہی کے انواع عذاب کا تذکرہ ہے اس کے علاوہ سورۃ کے متعلق اس میں اور بہت اسرار باقی رہ گئے جن کا اظہار مناسب نہیں ہے اب تفسیر نو کھیلے جس کی کہ ہر حرف کے معنی بلحاظ وضع جدا ہیں۔ چنانچہ کات اگرچہ ایک حرف ہے مگر اس کے تلفظ میں الف اشباع کا ہے اور دو حرف مستقل ہیں (ا و ت) کات مفتوح کے معنی ہیں بندہ اور قاساکن فاعل مفتوح کے معنی کو محقق کرنے کے لئے آیا کرتا ہے اور فاعل مفتوح کے معنی ہیں لایطابق پس قاساکن نے جب اس کو محقق کیا تو اس کا ترجمہ یہ ہوا کہ اس کا بیرون از طاقت ہونا محقق ہے جس میں کسی قسم کا بھی شک و شبہ نہیں۔ اودۃ برزے وضع دلالت کرتی ہے رحمت ظاہرہ صافیہ جس میں نام کو بھی کدورت وغیرہ نہ ہو۔ اور یاندا کے لئے ہے اور عین بلحاظ تلفظ مرکب ہے تین حرف سے کہ (ح مفتوح دلالت کرتا ہے کو جمع کرنے اور ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہونے پر۔ اور ی ساکن دلالت کرتی ہے تداخل اور اختلاط پر۔ اور آن ساکن فاعل مفتوح کے معنی کو محقق کرتا ہے اور فاعل مفتوح کے معنی ہیں خیر و خوبی جو ذات میں قائم و شامل ہو، اور فاعل ساکن نے اس کو محقق کیا کہ اس میں اس میں کوئی شک و شبہ نہیں اور اس میں بھی



بلحاظ تلفظ دو حرف ہیں پس ص مفتوحہ دلالت کر رہا ہے خلا و محشر پر۔ اور ساکن صداد کے معنی محقق کرنے کے لئے ہے۔ کیونکہ حروف اشارہ میں سے ہے اور حروف اشارہ اپنے ماقبل کو محقق کیا کرتا ہے۔

لہذا کھلیعص اعلان ہے حق تعالیٰ کی طرف سے تمام مخلوقات کے لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا ہے اور اس کا احسان ہے تمام مخلوق پر کہ انہوں نے اس نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم کے نور سے انوار کا استفادہ کیا۔ اس کی شرح یہ ہے۔ کائنات نے دلالت کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بندہ ہیں۔ قاساکن نے دلالت کی کہ آپ بیرون از طاقت ہیں نیز اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں اور بیرون از طاقت ہوتے کا یہ مطلب ہے کہ آپ کے مرتبہ کو نہ کوئی پہلا پاسکا اور نہ کوئی پچھلا پاسکے۔ اس درجہ تک رسائی سب کی طاقت سے باہر ہے۔ اس لئے کہ آپ سید الوجود صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور لا مفتوحہ نے دلالت کی کہ آپ رحمت صافیہ ہیں یعنی خود بھی طاہر و پاک اور دوسروں کے لئے بھی مطہر اور طہارت بخش۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے وَمَا أَدْنٰی سُلٰتٰکَ اِلَّا دَحْمَتُہٗ لِلْعٰلَمِیْنَ ؕ اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اِنَّمَا اَنَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّحْمٰتِہٖ اَوْ لَتَخْلُقْ اَوْ یَا اسی بندہ مذکور کو ندا ہے۔ اور جس غرض کے لئے پکارا گیا ہے وہ رحلت و انتقال مکانی ہے جس پر حق نے دلالت کی اور یاد ساکنہ نے کہ حرف اشارہ ہے اس کو محقق کیا نیز یہ بتایا کہ کوچ کرنا اور اختلاط و تداخل لازم و ضروری ہے اور جس غرض کے لئے اختلاط ضروری ہے اس پر دلالت کر رہا ہے لون ساکن یعنی وجود باوجودی کا نور جس سے تمامی موجودات کا بقا ہے اور کس کی طرف کوچ کرنا ہے اس پر دلالت کر رہا ہے ع۔ لہذا مطلب یہ ہوا کہ اے میرے ذی عزت و احترام بندہ تم کو ضرور جانا پڑے گا ان سب کی جانب جن کو خلا و محشر میں جمع ہوتا ہے، وہ انوار کے کرن کی بدولت ان کے وجود کا قیام ہے تاکہ وہ تم سے مستفیض ہوں کہ سبکی اصل تم ہی سے ہے اب معانی حروف کی ایک اچھی ترتیب قائم ہو گئی اور کلام منظم بن گیا کہ جس طرح ہر زبان کی عبارت چند کلمات سے مرکب ہوتی اور ان کو باہم ایک خاص ترتیب دینے سے عبارت درست ہوا کرتی ہے اسی طرح ہر زبان اپنے کلمات کے معانی کی ترتیب میں اس کی محتاج ہوتی ہے کہ کسی کلمہ کو مقدم کر دے اور کسی کو مؤخر اور کہیں ایک کلمہ دوسرے سے متصل ہوتا ہے مگر دونوں کے بیچ میں ایک اجنبی کا فعل لانے کی ضرورت ہوتی ہے جس کا مقدر ماننا ہے کہ اس کے بغیر معنی درست ہوتے۔ اسی طرح سریانی کلام جب حروف سے ترکیب کھاتا ہے تو صحیح معنی نکالنے کے لئے اس کو بھی تقدیم و تاخیر اور صحت و اضمار کی ضرورت ہوتی ہے۔

الحاصل یہ ہے تفسیر انیموز کی جواہل کشف کو آنکھوں سے نظر آتی ہے کہ وہ سید الوجود صلی اللہ علیہ وسلم کا اور جو کلمات اور بیرون از قدرت خوبیاں حق تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی ہیں ان کا مشاہدہ کرتے۔ اور دیگر مخلوقات



یعنی حضرات انبیاء و ملائکہ کا۔ اور جو بزرگان حق تعالیٰ نے ان کو عطا فرمائی ہیں ان کا بھی مشاہدہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ (بقیہ وجود کا) مادہ ساری مخلوق کی طرف ذات محمدی سے چلا ہے نور کے دُوروں میں کہ نور محمدی سے نکل کر (دہاری بن کر) انبیاء و ملائکہ اور دیگر مخلوقات تک جا پہنچا ہے اور اہل کشف کو اس استفاہتہ نور کے عجائب و غرائب کا نظارہ ہوتا ہے ایک صالح شخص نے کھانے کے لئے روٹی کا ٹکڑا اٹھایا اور اس میں غور کیا تو روٹی میں نور کا ایک دُور نظر آیا۔ اس پر نگاہ دُور اتنا چلا گیا تو وہ اس نور کے دُور سے ملا ہوا تھا جو نور محمدی سے جا ملا تھا۔ اس نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نور مکرم سے ملا ہوا ایک دُور اہی ہے کہ کچھ دور تک رتنہ درخت کی طرح، اکیلا چلا گیا ہے اور پھر اس میں سے نور کی شاخیں نکلتی شروع ہوئی ہیں۔ ہر شاخ ایک نعمت سے جو ذوات مخلوق کو منجملہ نعمتوں کے عطا ہوئی ہے جا ملی ہے یہ صالح شخص خود حضرت شیخ تھے) ایک بد نصیب کا واقعہ ہے کہ وہ کہنے لگا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے صرف ایمان کی رحمتی ہوئی ہے (کہ حق کا راستہ تبا دیا)، باقی رہا ایمان سودہ اللہ کی طرف سے ہے (زات محمدی کو اس سے کوئی تعلق نہیں) صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کہا اچھا اگر وہ تعلق جو تمہارے نور ایمان اور نور محمدی میں قائم ہے، اگر تم اس کو قطع کر دین اور محض راستہ دکھانا جو تم کہہ رہے ہو باقی رہنے دیں تو کیا اس پر راضی ہو؟ اس نے کہا ہاں راضی ہوں۔ بات ختم نہ کرنے پایا تھا کہ صلیب کو سجدہ کیا اور اللہ و رسول کا انکار، اور اسی پر دم تکل گیا (کنجوت یہ نہ سمجھا کہ عطا تو سب اللہ ہی کی طرف سے ہے حتیٰ کہ ہدایت جس کا رسول کی طرف سے ہونا تسلیم کیا ہے وہ بلکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی خدا ہی کی طرف سے ہیں مگر مسبب الاسباب نے جس طرح ہر نتیجہ کا تعلق سب کے ساتھ رکھا ہے کہ کھائے گا تو پیٹ بھرے گا ورنہ نہیں اسی طرح نور ایمان بلکہ ہر نعمت کے نور کو وابستہ کیا ہے نور محمدی کے ساتھ کہ جہاں یہ تعلق عیاناً باللہ قطع ہو فوراً ہی نور ایمان سلب ہوا) الحاصل او یہاں اللہ ان تمام واقعات مذکورہ کو آنکھوں سے دیکھتے ہیں جس طرح دنیا کی چیزوں کو دیکھتے ہیں بلکہ اس سے زیادہ کہ نظر بھارت زیادہ قوی ہے بہ نسبت نظر بھارت کے۔ چنانچہ وہ دیکھتے ہیں سیدنا زکریا علیہ السلام کو اور ان کے احوال و مقامات کو اللہ کی طرف سے ہیں اور ممتد ہوئے ہیں ذات محمدی سے بسوئے زکریا علیہ السلام۔ اور اسی طرح جو حالات و مقامات اس سورۃ میں سیدنا یحییٰ علیہ السلام کے مذکور ہوئے اور جو حالات و مقامات حضرت مریم کے مذکور ہوئے اور جو حالات و مقامات حضرت عیسیٰ، حضرت ابراہیم، حضرت اسمعیل، حضرت یوسف، حضرت ہارون، حضرت ادریس، حضرت آدم، حضرت نوح، علیہم السلام کے مذکور ہوئے اور نیز ہر نبی جس پر حق تعالیٰ نے انعام فرمایا، سب کا یہی حال ہے کہ ان کے انوار کا سلسلہ جا ملا ہے نور محمدی سے منبع و معدن تمام احوال و مقامات کا وہی ذات مطہرہ ہے، یہ کچھ حصہ معانی رموز کا ورنہ جو مصنفین ابھی ان میں باقی رہ



گئے ہیں وہ بے شمار ہیں کہ تمامی موجودات خواہ ناطقہ ہوں یا صامتہ، اور ذوی العقول ہوں یا غیر ذوی العقول اور ذی روح ہوں یا غیر ذی روح، سب ہی ان رموز میں داخل ہیں (کیونکہ محشر میں جتنی بھی مخلوق حاضر ہوگی وہ سب اس میں شامل ہے کہ ہر ایک وجود اور اوّل تا آخر ہر نعمت کا نور ممتد ہوا ہے نور محمدی سے مگر ان کا جدا جدا تذکرہ سورۃ مذکور میں نہیں ہے) اسی لئے ہم نے کہا ہے کہ سورۃ میں جو کچھ بھی مذکور ہے وہ بعض البعض (اور بہت قلیل حصہ ہے) اس کا جو رموز مذکورہ میں موجود ہے۔ حضرت ممدوح سے جب میں نے یہ پیاری تفسیر سنی تو حضرت محمد بن سلطانؒ کی امام شافعی قدس سرہ کے خواص میں سے ہیں بیان کردہ تفسیر کا تذکرہ کیا کہ وہ فرماتے ہیں میں نے خواب میں دیکھا چند علماء سے کھلی حص جمعہ کی تفسیر کے متعلق گفتگو کر رہا ہوں کہ یہ اسرار ہیں اللہ اور اس کے رسول کے درمیان رحمن سے بحر خواص کے کوئی واقف نہیں) دفعۃً حق تعالیٰ نے میری زبان پر جاری کیا گویا حق تعالیٰ فرماتا ہے (ک) اے محمد تم کہتے الوجود اور مخلوق کی وہ جائے پناہ ہو جس میں ہر موجود کو ٹھکانا ملتا ہے (ح) ہم نے تم کو ملک ہبیہ کیا اور تمہارے لئے ملکوت مہیا کیا (ی) اے علین العیون اور سبکی آنکھوں کی پتلی (ص) تم میری صفات میں سے ہو کہ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی (ح) ہم تمہارے حامی و محافظ ہیں۔ (د) ہم نے تمہیں ملک بخشا (ع) ہم نے تمہیں علوم نصیب فرمائے (س) ہم نے تم پر اسرار کھول دیئے (ق) ہم نے تم کو مقرب خاص بنایا۔ اس پر علماء نے مناظرہ شروع کر دیا۔ میں نے کہا اچھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چلو حضرت فیصلہ فرمائیں گے۔ چنانچہ حاضر خدمت بارگاہ ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا محمد بن سلطان کا قول صحیح ہے، حضرت ممدوح نے فرمایا بیشک مقامات محمدیہ کے اعتبار سے محمد بن سلطان کا قول بالکل صحیح ہے باقی وضعیت الفاظ کے اعتبار سے ان رموز و حروف مقطعات کی جس کو تفسیر کننا چاہئے وہ وہی ہے جو میں نے بیان کی ہے۔ درحقیقت حضرت ممدوح کی بیان کردہ تفسیر بہت عالی ہے کہ ملک کا ہر وغیرہ مہوب اور مہوب لہ میں مغائرت کو چاہتا ہے کہ جدا جدا دو چیزیں ہیں اور حضرت کی تفسیر کے موافق ملک و ملکوت اور تمامی مخلوقات ص میں داخل ہو چکی ہے، اور سب پر یہ حکم لگ چکا ہے کہ ہر ایک کی اصل اور مادہ چلا ہے سید الوجود صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مطہرہ سے جیسا کہ مقتضا ہے حروف و اربعہ کا لہ یہی مطلب ہے کہ ہفت الوجود ہونے کا کہ ہر وجود کا منبع و مصدر ذات محمدی ہے (پس اس کو اور ملک بخشنے کو کہ غیر ذات محمدی ہے کیا مناسبت) پس حضرت محمد بن سلطان نے جو کچھ فرمایا تھا وہ حسب تفسیر شیخ حروف و اربعہ اور ص میں مندرج ہے۔ غرض میں نے تمامی حروف و مقطعات کو فرداً فرداً حضرت سے دریافت کیا۔ اور حضرت نے ان کی تفسیر بیان فرمائی جن کا تذکرہ بہت طویل ہے۔ لہذا صرف دو جواب کے نقل پر اکتفا



کرتا ہوں جن کو حضرت ممدوح نے بعض علماء کے استفسار پر لکھوایا تھا۔ پہلا سوال جو ایک عالم نے محض  
 حضرت کا امتحان لینے کے لئے کہ علوم لدنیہ کے متعلق آپ کی شہرت کہاں تک صحیح ہے علامہ حاتمی وغیرہ کی  
 کتابوں سے اقتباس کر کے لکھا تھا اور خیال تھا کہ حضرت ممدوح اس کا جواب کبھی نہ دے سکیں گے، یہ تھا کہ مولانا  
 ہمیں بتلائیے حروف مقطعات میں ق کے اندر رکھا ہوا وہ سِرّ الہی کیا ہے جس کے متعلق عارفین کا قول ہے کہ  
 اس میں دائرہ حضرت قدیمہ اور دائرہ حضرت حادثہ دونوں جمع ہیں؟ حضرت ممدوح نے باوجود اُمتی ہونے کے اس کا جواب  
 دیا کہ حضرت قدیمہ سے مراد ان انوار حادثہ کا زمانہ و منظر ہے جو ارواح واجسام اور آسمانوں اور زمینوں کی آفرینش سے  
 قبل پیدا کئے جا چکے ہیں۔ وہ قدیم حقیقی مراد نہیں کہ بس اللہ تھا اور اس کے ساتھ کوئی شے نہ تھی۔ اور حضرت حادثہ  
 سے اس کا مابعد یعنی ارواح واجسام کا شہود مراد ہے اور یہ واقعہ ہے کہ ارواح مع الاجسام ہیں ایک  
 قسم (مومنین کی) ہے جن سے اللہ نے جنت کا وعدہ فرمایا ہے، اور دوسری قسم (کافروں کی) ہے جن  
 سے اللہ نے جہنم کی وعید فرمائی ہے۔ پھر جس نوع سے حق تعالیٰ نے جنت کا وعدہ فرمایا ہے وہ بھی ایک  
 فرع ہے انوار حضرت الانوار کی پہلی نوع ہے۔ وعید فرمائی ہے جہنم کی وہ فرع ہے انوار حضرت الانوار  
 کی لہذا دوسری قسم حضرت الانوار (یعنی انوار عالم ارواح واجسام) فرع ہوئی پہلی حضرت الانوار (یعنی انوار  
 مابعد تخلیق عالم) کی اور ہر دو حضرت میں ہر معاملہ کی دو قسمیں ہو گئیں پسندیدہ و محل رضایا ناپسندیدہ و محل ناپسند  
 جب یہ سمجھ میں آگیا تو اب حرف مقطع کی مراد میں غور کرو کہ تلفظ کے لحاظ سے ق میں تین حرف ہیں۔  
 تات مفتوح اور الف اور فاک ساکن۔ پس قات جس میں الف ملا ہوا ہے سریانی زبان میں وضع کیا گیا ہے  
 ہر دو شہود میں تصرفات باری تعالیٰ کے لئے چاہے خیر ہو یا شر اور فضل ہو یا عدل۔ اور فاک ساکن کی  
 وضع سریانی زبان میں ماقبل سے قبض کو علیحدہ کرنے کے لئے ہے۔ اور ہر دو نوع مذکور میں قبض ہے  
 وہ نوع جس سے شر کی وعید فرمائی گئی ہے (اور جب یہ نوع بمقتضا و فاک ساکن علیحدہ کر دی گئی) تو ہر دو  
 شہود میں صرف خاصاں خدا اور مومنین مطہیین کی نوع (باقی رہ گئی۔ اور یہ حرف مقطع (یعنی ت) ان  
 ہی خاصاں خدا اور ان العامات و افضال کی طرف اشارہ کر رہا ہے جن سے حق تعالیٰ نے ان کو توانا اور  
 جو ان پر مبذول فرمائے ہیں۔ اور یہی ہے سِرّ حضرتین (جو اس حرف میں رکھا ہوا ہے) کہ وہ اسماء الہیہ  
 میں کا ایک اسم ہے جس کی اضافت اُس نوع کی طرف کی گئی ہے جو عند اللہ معزز و محترم ہے جیسے عربی زبان  
 میں سلطان اور اردو میں پادشاہ کا لفظ اشارہ کر رہا ہے ملک اور رعیت کی طرف خواہ رعیت دنیدار ہو جیسے  
 مسلمان یا بدین ہو جیسے اہل ذمہ کفار۔ لیکن جب بادشاہ کی کوئی مدح کرے گا تو سلطان المسلمین کے لفظ سے  
 کرے گا۔ کہ (مضاف یعنی) لفظ مسلمین سے براہ ادب و تعظیم اہل ذمہ کفار کو نکال دے گا۔ اگرچہ حقیقت کے



اعتبار سے وہ بھی داخل ہیں گے (کہ بادشاہ و حاکم تو دونوں ہی فریق کا ہے)، لہذا ق کی یہ شان ہوئی گویا بندہ عرض کرتا ہے کہ اے رب محمدؐ اور اے انبیاء و ملائکہ اور تمامی اہل سعادت کے پروردگار کہ اہل سعادت فریق میں کی ایک ایک نوع گنتے جاؤ اور ان کے ساتھ رب کا لفظ لگاتے جاؤ۔ نیز سب کے مقامات اور احوال مع اللہ شمار کرتے جاؤ حتیٰ کہ اہل جنت پر آؤ۔ اور ان کے تمامی منازل و درجات جنت کا جدا جدا نام لو اور اس کو رب کی طرف مضاف کرو کہ اے اس نعمت کے پروردگار اور اے اس منعم علیہ کے پروردگار جب ایک ایک کا اس طرح ذکر کر چکو کہ بال برابر بھی (کوئی نعمت یا منعم علیہ) نہ چھوٹے تو سمجھو کہ یہ ہے ق کا ترجمہ۔ پس ظاہر ہے کہ اس میں تمامی اسرار رسالت موجود ہیں تمامی اسرار نبوت موجود ہیں، تمامی اسرار ولایت موجود ہیں، تمامی اسرار سعادت موجود ہیں، تمامی اسرار جنت موجود ہیں اور تمامی انوار و انعامات کے اسرار موجود ہیں جن سے مخلوقات نوازی گئی ہے اور جن کی شمار بحز اللہ جل جلالہ کے کوئی نہیں جانتا۔

وَمَا يَعْلَمُ خَبْرُ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ رُبَّكَ (اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے)، اور سریانی زبان کا قاعدہ ہے کہ فاء ساکن چونکہ علیحدہ کرنے کے لئے آتی ہے اس لئے کتابت میں خود بھی علیحدہ کر دی جاتی ہے اور لکھت میں نہیں آتی، تاکہ کتابت اور معنی دونوں ہم شکل و موافق بن جائیں۔ واللہ اعلم۔ اور دوسرا سوال وہی اشکال تھا جس کی طرف حزب شاذلیہ کے محشی حضرت عبد الرحمن فارسیؒ نے ارشاد فرمایا ہے کہ متعدد سورتوں کے شروع میں ایک ہی حروف مقطعات لانے کا کیا مطلب ہے جب یہ حروف ان ہی تمام مضامین کی طرف اشارہ کیا کرتے ہیں جو اس سورۃ میں مذکور ہیں تو اس کا اقتضایہ تھا کہ دو سورتوں کے حروف مقطعات متحد نہ ہوتے کیونکہ مضامین ہر دو سورت کے جدا ہیں۔ چہ جائیکہ وہی السد ہے جو سورۃ بقرہ کے اول میں آیا ہے، اور وہی السد سورۃ آل عمران کے شروع میں ہے اور اسی السد سے سورۃ عنکبوت کا افتتاح ہوا ہے، حضرت ممدوح نے اس کا جواب دیا کہ آیات قرآنیہ کے انوار تین قسم کے ہیں سفید اور یہ رنگ ان کلمات کا ہے جس کے فاعل بندے ہوتے ہیں اور جن کا اپنے رب سے سوال کرتے ہیں مثلاً رَبِّ زِدْنِي علماً کہ الہی میرے علم میں ترقی بخش، سُبْحَنَكَ جس کا فاعل خود حق تعالیٰ ہو۔ مثلاً اقیموا الصلوٰۃ نماز پڑھو اور زبرد کہ جس کو تعلق ہو اس جماعت سے جن پر حق تعالیٰ کا غصہ ہے مثلاً سورۃ فاتحہ میں۔ سُبْحَنَكَ صرحت الحمد للہ کا ہے کہ یہ قول ہے حق تعالیٰ سبحانہ کا اور سفید رنگ ہے رب العالمین سے لے کر غیوالمغضوب تک کا ہے کہ (اگرچہ یہ بھی کلام حق تعالیٰ کا ہے مگر) قول ہے بندوں کا اور درخواست ہے ان کی کہ ہمیں سیدھا راستہ دکھائیے، اور زرد رنگ ہے المغضوب علیہم سے آخر سورۃ تک کا کہ تذکرہ ہے گمراہوں کا اور اس گروہ کا جن پر حق تعالیٰ کا غضب نازل ہوا، اور یہ تینوں انوار



ہر سورۃ میں ہوں گے۔ البتہ کسی میں کوئی نور کم ہوگا اور کسی میں کوئی نور زیادہ جیسا کہ سورۃ فاتحہ میں۔

تم نے دیکھا کہ سبز رنگ زیادہ ہے، اور اس سے کم زرد رنگ ہے اور اس سے کم سفید رنگ (اور ہر سورۃ انوار کے رنگ مختلف ہونے کا سبب لوح محفوظ کا تین مختلف جہتوں کی طرف رخ ہوتا ہے۔ کہ ایک رخ اس کا دنیا کی طرف ہے، یعنی اس کو تعلق ہے دنیا اور اہل دنیا کے حالات سے اور اس میں وہی مکتوب ہے جو دنیا اور اہل دنیا سے متعلق ہے اور دوسرا رخ اس کا جنت کی طرف ہے اور اس میں جنت اور اہل جنت کے حالات و کیفیات لکھے ہیں اور تیسرا رخ اس کا جہنم کی طرف ہے اور اس میں دوزخ کے حالات اور دوزخوں کے مصائب و تکالیف کا اندراج ہے۔ پس وہ رخ جو دنیا کی طرف ہے سفید رنگ کا ہے اور جو رخ جنت کی طرف ہے وہ سبز رنگ کا ہے اور جو رخ جہنم کی طرف ہے وہ زرد رنگ کا ہے۔ کہ حقیقت میں تو وہ سیاہ ہے مگر مومن کی نگاہ میں زرد نظر آتا ہے کیونکہ مومن کا نور بصیرت جب کسی سیاہ چیز پر پڑتا ہے تو اس کی نظر میں اس کو سیاہ بنا دیتا ہے حتیٰ کہ مومن محشر میں کھڑا ہوگا اور اس کو حسب نوشتہ تقدیر اس کا نور علم رجو دور بین کی طرح مسافت لبیدہ کو عبور کرتا چلا جائے، ملا ہوا ہوگا، اور اس سے دور کوئی کافر کھڑا ہوگا جس کو چاہو، طرف سے سیاہی نے گھیرا اور ظلمت نے ڈھانپ رکھا ہوگا تو یہ مومن جس وقت اس کو دیکھے گا تو زرد نظر آئے گا۔ اور اسی سے پہچان جائے گا کہ یہ کسی کافر کا بدن ہے مگر کافر (محشر میں) کسی چیز کو بھی نہ دیکھ سکے گا۔ کیونکہ ظلمت اور تاریکی نے چار طرف سے اس کو ڈھانپ رکھا ہے اور سیاہی ہی بمنزلہ پردہ اور آڑ کے بن گئی ہے۔ لہذا اس کو ہر طرف تہ بہ تہ سیاہ ہی سیاہ نظر آئے گا اللعنه احفظنا منہ۔ میں نے عرض کیا کہ جب اُسے سارے میدان محشر میں اپنے ہی جیسے مظلم نظر آئیں گے (اور کسی مومن یا اُس کے نور کو دیکھنے کا یقین نہیں) تو مومن کی حالت کا اپنے سے بہتر ہونا اور تمنا کرنا کہ کاش کہ میں بھی دنیا میں اسلام لے آیا ہوتا کیسے ہوگا؟ فرمایا حق تعالیٰ جنت اور اہل جنت کے حالات کا علم ضروری اس کے قلب میں ڈال دے گا (جیسے پھر کے قلب میں اس کا علم ڈال دیا ہے کہ ماں کی چھاتی کو چوسنے اور دودھ کو نگل لینے سے زندگی قائم رہے گی اس کے لئے مشابہ کی یا تعلیم کی ضرورت نہیں) غرض جب اس کو تم سمجھ چکے تو اصل بحث کر لو کہ آیت شریفہ کو جب اس رخ سے لوگ جو جنت کی طرف ہے تو آیت کا نور سبز ہوگا اور جب اس رخ سے لوگ جو دوزخ کی طرف ہے تو اس کا نور زرد ہوگا۔ اور جب اس رخ سے لوگ جو دنیا کی طرف ہے تو اس کا نور سفید ہوگا۔ پھر ہر رخ میں اتنی تفصیلات ہیں کہ ان کا احاطہ سبب حق تعالیٰ کے کوئی نہیں کر سکتا اور یہ حروف مقطعات جو سورتوں کے شروع میں ہیں لوح محفوظ میں بھی اسی طرح لکھے ہوئے ہیں البتہ وہاں ہر حرف کی شرح بھی بزبان سریانی لکھی ہوئی ہے لہذا جب شرح پر نظر ڈالو گے تو (گو تلفظ میں ایک ہیں مگر) ان کا حسب جدا ہونا صاف



معلوم ہو جاتے گا۔ اس کی شرح یہ ہے کہ الحمد رموز ہیں (اللہ و رسول کے درمیان) جن سے اشارہ کیا گیا ہے نور محمدی کی طرف جس سے تمامی مخلوقات استفادہ کرتی ہے۔ پس اگر اس نور پر نظر ڈالو بائیں لحاظ کہ مخلوقات میں وہ بھی ہیں جو ایمان لائے اور وہ بھی ہیں جنہوں نے کفر کیا، اور ایمان لانے والوں کے حالات کیا ہیں اور کفر کرنے والوں کے حالات کیا۔ اگر کلام کا سیاق ان امور اور ان کے متعلقات کے لئے ہے تب تو وہ سفید رنگ والا اور وہ الحمد ہے جو سورہ بقرہ کے شروع میں ہے اور وہ اسی مقصود کے لئے نازل بھی ہوئی ہے۔ چنانچہ دیکھ لیا ساری سورہ میں یہی مضامین بھرے ہوئے ہیں) اور اگر نور محمدی پر نظر ڈالی جائے باعتبار ان نعمتوں کے جو مخلوق کو آپ سے حاصل ہوئیں اور ان کے حصول کی کیفیت اور طریقہ کے تو اس کا رنگ سبز ہے اور وہ الحمد ہے جس سے سورہ آل عمران شروع ہوئی ہے اور وہ اسی غرض کے لئے نازل بھی ہوئی ہے اور اگر نور محمدی پر نظر ڈالی جائے تو باعتبار ان مصائب و آلام کے جو عالم دنیا میں نااہل لوگوں پر نازل ہوئے (تو وہ زرد رنگ والا) الحمد ہے جو سورہ عنکبوت کے شروع میں آیا ہے۔ اور جس سورہ کے بھی شروع میں یہ دوز آئے گا وہاں یہی تقریر جاری ہوگی کہ جس کو لوح محفوظ کا عینی مشاہدہ نصیب ہے وہ ہماری اس قول کو خوب سمجھے گا اس پر میں نے ایک اعتراض اور کیا اور حضرت والا نے اس کا جواب دیا۔ مگر چونکہ عقول عامہ اس کی مستعمل نہیں ہو سکتیں لہذا ہم نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ اب میری رائے یہ ہے کہ تمامی حروف تہجی کے متعلق یہ بیان کر دوں کہ سریانی زبان میں وہ کس معنی کے لئے وضع کئے گئے ہیں کیونکہ ان کی کبھی قدرت بڑھ جاتی ہے (اور لقیہ حروف مقطعات کی شرح بھی ان کے ذریعہ معلوم ہو سکتی ہے) لہذا غور سے سنو ہمزہ اگر مفتوح ہے تو اس کا مطلب ہے جمیع اشیاء خواہ قلیل ہوں یا کثیر۔ اور کبھی اشارہ ہے نفس متکلم کی طرف مگر اس اشارہ میں قیض مطلق نہیں اور اگر مضموم ہے تو وہ شے جو قریب ہو اور قلیل مقدار ہو اور اگر مکسور ہے تو وہ چیز جو قلیل بدرجہ مناسب ہو یا اگر مفتوح ہے تو وہ شے جو نہایت درجہ یا عزت ہو یا نہایت درجہ ذلیل اور اگر مکسور ہے تو وہ شے جو ذات پر داخل ہو یا داخل ہونے والی ہو، اور اگر مضموم ہے تو اشارہ ہے مگر اس کے ساتھ قیض ہے یا اگر مفتوح ہے تو ترجمہ ہے خیر کثیر و عظیم اور اگر مکسور ہے تو وہ مصنوع جو ظاہر ہو اور اگر مضموم ہے تو قلیل چیز جو ظاہر ہو اور کبھی اجتماع ضدین کے لئے بھی آتا ہے۔ مثلاً اگر مفتوح ہے تو فوراً ظلمت اور اگر مضموم ہے تو اشارہ ہے کسی شے سے کچھ زائل ہو جانے کا اور اگر مکسور ہے تو اشارہ ہے ایک شے کا دوسری شے پر تقرر یا جمع اگر مفتوح ہے تو نبوت یا ولایت بشرطیکہ اس کے قبل یا بعد حرف ہو جو اس پر دلالت کرے، ورنہ خیر دائم جسے زوال نہ ہو اور اگر مضموم ہے تو بہترین چیز جو کھانے میں آوے، یا جس سے لوگ نفع اٹھائیں اور اگر مکسور ہے تو قلیل و ضعیف نور ایمان مثلاً اگر مفتوح ہے



تو وہ اشیاء کے احاطہ اور تمام چیزوں کے شمول پر دلالت کرے گا اور اگر مضموم ہے تو تعداد کثیر بنی آدم کے سوا مثلاً ستارے اور اگر مکسور ہے تو ذات پر داخل ہونے والی چیزیں، یا جن پر ذات کا تسلط ہو مثلاً غلام اور درہم و دینار، خ اگر مفتوح ہے تو حد درجہ کا طول جس کے ساتھ رقت بھی ہو اور اگر مضموم ہے تو وہ کمال جو حیوانات میں ہو۔ اور اگر مکسور ہے تو وہ کمال جو جمادات میں ہو۔ اگر مفتوح ہے تو وہ شے جو ذات سے خارج ہو۔ اور اگر مکسور ہے تو وہ کشفیہ جو ذات میں داخل ہو، یا ذات سے قریب، یا ذات پر داخل ہو اور اگر مضموم ہے تو قلیل یا قلیح چیز جن میں غصہ ساتھ ہو۔ اگر مفتوح ہے تو شے اندرون ذات اور ساتھ ہی اس شے کی عظمت کا اظہار جس پر ذات کا قبضہ ہو اور اگر مضموم ہے تو وہ شے جس میں بالذات خشونت ہو یا شے یا عظمت یا قلیح۔ اور اگر مکسور ہے تو ایسی ذات قلیح جس پر بالذات غصہ نہیں۔ مثلاً اگر مفتوح ہے تو تمامی خوبیاں ظاہر اور باطنی اور اگر مضموم ہے تو وہ شے جو اکیلی ہو اور ظاہر ہو اور اگر مکسور ہے تو روح یا ذی روح غیر بنی آدم مثلاً اگر مفتوح ہے تو وہ شے جو ذات پر داخل ہو تو مضرت پہنچائے یا قابل احتراز۔ اور اگر مضموم ہے تو وہ قلیح جس میں مضرت ہو مثلاً کبیرہ گناہ۔ اور اگر مکسور ہے تو وہ قلیح جس میں عیب ضرور ہے مگر مضرت نہیں جیسے صغیرہ گناہ اور شبہات مثلاً اگر مفتوح ہے تو قلیح شے جو طبعاً رقیق ہو اور اگر مضموم ہے تو قلیح اور کھڑی شے یا سیاہ چیز ظاہر و باطناً اور اگر مکسور ہے تو طبعی کمال۔ مثلاً عقل کامل یا علم و عفو مثلاً اگر مفتوح ہے تو رحمت جس کے پیچھے عذاب نہ ہو یا وہ شخص جس سے عذاب دور ہو اور رحمت نے داخل ہو کر اس کو پاک صاف بنادیا ہو اور اگر مضموم ہے تو اس شخص کی اظہار عظمت کے لئے ہے جو بالذات بلند مرتبہ ہو یا جس میں عقل مستحضر ہو، یا آنکھ کو تکلیف نہ دے مثلاً کنک، اور اگر مکسور ہے تو قلب میں چھپی ہوئی چیز، یا جس سے کو پاؤں وغیرہ تے کچلا ہو اور وہ ظاہر نہ ہو مثلاً اگر مرقق ہے کہ حسب قواعد تجوید باریک پڑھنے کا مقام ہے تب تو مفتوح ہونے کی صورت میں زمین کے تمام ذرات جو محشر میں محضو حق جل شانہ حاضر ہوں گے رمئی سے پیدا ہوئی ہر چیز اس میں داخل ہے، اور اگر مکسور ہے تو ساتوں زمین اور اگر مضموم ہے تو تمامی پیداوار زمین اور اگر مضموم ہو کہ پڑ پڑھنے کا مقام ہے تو مفتوح ہونے کی صورت میں وہ شے جس پر غضب الہی ہو۔ اور اگر مکسور ہے تو زمین جس میں نبات نہ ہو، یا وہ ذات جس میں کوئی خوبی نہ ہو۔ اور اگر مضموم ہے تو وہ شے ضرور جو ہر دو مذکورہ چیزوں سے پہلے پہلے صفت اگر مضموم ہے تو صحت اور عدم بلا اور اگر مضموم ہے تو وہ شے جس میں مطلق نور یا مطلق ظلمت نہ ہو اور اگر مکسور ہے تو خشوع و خضوع ط اگر مفتوح ہے تو نہایت پاک صاف چیز اور اگر مضموم ہے تو اس کی ضد یعنی نہایت جنیت و گندی شے اور اگر مکسور ہے تو وہ شے جس کا اثر طبعی ہو سکون، یا جس کو سکون کا حکم دیا جائے ط اگر مفتوح ہے تو وہ شے جو فی نفسہ پڑی ہو اور اس کی ضد کا وجود نہ ہو سکی



مثلاً شرفا ہیں جو دروغساز کہ بڑی خوبی ہے اور بقا و شرافت بخل و تنگدلی کا وجود نہیں ہو سکتا) یا مثلاً قوم یہود میں دھوکا دہی (کہ بڑا عیب اور گویا خاصہ یہودیت ہے کہ صفائی ان میں آہی نہیں سکتی) اور اگر مضموم ہے تو وہ شے جو تحریک نفسانی کا اتباع کرے اور وہ اس کی تباہی میں ساعی ہو۔ اور اگر مکسور ہے تو وہ شے جس سے بندہ کو مفرت پہنچے اور ضرر رسانی اس کا امر طبعی ہو <sup>۱۹</sup> اگر مفتوح ہے تو مسافر کا آنا یا مقیم کا سفر کرنا اور اگر مضمون ہے تو وہ شے جو ذات میں قائم ہو اور اسی سے ذات کا اقوام و بقاء ہو۔ اور اگر مکسور ہے تو ذاتی خبث یا عبودیت کی گندگی <sup>۲۰</sup> اگر مفتوح ہے تو وہ نگاہ جو شے کی حقیقت کو پہنچ جائے اور اگر مضموم ہے تو اللہ کا نام ہے (جیسا بچے غوغو کہتے ہیں) اور اس میں شفقت پر دلالت ہے اور اگر مکسور ہے تو سوال ہے نامعلوم کا کہ دوسرا جواب دے اپنی معلومات سے <sup>۲۱</sup> اگر مفتوح ہے تو خبث کی نفی ہے جبکہ معلوم ہو کہ اس کی جنس میں خبث ہے۔ یعنی اظہار ہے کہ یہ خود ظاہر ہے مگر اس کی جنس خبیث ہے اور خبیث سے مراد معاصی وغیرہ ہیں اور اگر مکسور ہے تو اشارہ ہے ذات کی طرف اور جس پر ذات مشتمل ہو اور کبھی اس کے ساتھ اظہار قلت بھی شامل ہوتا ہے اور اگر مضموم ہے تو خبث زائل کرنے کے لئے ہے <sup>۲۲</sup> اگر مفتوح ہے تو تمامی خوبیاں یا تمامی انوار اور اگر مضموم ہے تو اصل آفرینش یا علم قدیم اور اگر مکسور ہے تو اشارہ ہے ذلت کی طرف <sup>۲۳</sup> اگر مفتوح ہے تو حقیقت عبودیت کا ملہ اور اگر مضموم ہے تو سیاہ نام غلام یا قبیح اور اگر مکسور ہے تو عبودیت کے تمہارے طرف منسوب ہونے کا اشارہ ہے <sup>۲۴</sup> اگر مفتوح ہے تو متکلم کو کسی بڑی چیز کا حصول اور اشارہ کسی با عظمت چیز کی طرف اور اگر مضموم ہے تو ایسی چیز جس کی انتہا نہیں اور اگر مکسور ہے تو متکلم کی طرف اشارہ ہے اپنی ذات کی طرف یہ تو اس صورت میں ہے کہ لام کو باریک پڑھا جائے اور اگر لام کو پڑھا جائے تو اس میں قلق یا قبیح بھی شامل ہوگا <sup>۲۵</sup> اگر مفتوح ہو تو تمام کائنات مراد ہے۔ اور اگر مکسور ہو تو ذات کا ظاہر ہی نور جیسے آنکھ کی روشنی اور باطنی نور جیسے قلب کی بصیرت اور اگر مضموم ہے تو پیاری چیز اور قلیل جیسے آنکھ کا پانی (جس پر مبنیائی کا مدار ہے) اور اسی سے ہے <sup>۲۶</sup> جو شیر خوار بچوں سے کسی چھوٹے بچہ کو پاس بٹھا کر کہا کرتے ہیں۔) <sup>۲۷</sup> اگر مفتوح ہے تو خیر و خوبی جو ذات میں مستقر اور مشتعل ہے۔ اور اگر مضموم ہے تو خیر کامل یا پھیلا ہوا نور۔ اور اگر مکسور ہے تو وہ چیز جو متکلم کو ملے گی یا ملی ہوئی ہے <sup>۲۸</sup> اگر مفتوح ہے تو وہ چیزیں جن کا انسان میں جال پھیلا ہوا ہے، جیسے رگیں وغیرہ اور اگر مضموم ہے تو وہ چیزیں جو بنی آدم سے مباہن ہیں جیسے آسمان اور پہاڑ وغیرہ۔ اور اگر مکسور ہے تو پھیلی ہوئی چیزیں گھناؤنی جیسے آنتیں وغیرہ۔ (کہ محل ہزار ہیں) <sup>۲۹</sup> اگر مفتوح ہے تو رحمت پاک صاف ہے انتہا اور اگر مضموم ہے تو نام ہے اللہ پاک کا۔ اور اگر مکسور ہے تو وہ نور جو مخلوق سے نکلتا یا خاص مومنین سے خارج ہوتا ہے۔



۲۸ اگر مفتوح ہے تو ندا کے لئے ہے اور کبھی خبر کے لئے بھی آتا ہے جس ضمناً ندا ہو مثلاً لَمْ یَلِدْ کہ جلد خبر یہ ہے مگر مطلب یہ ہے کہ اے وہ ذات جو ولادت سے منزہ ہے اور اگر مفہوم ہے تو وہ چیز جیسے قرار نہ ہو جیسے بجلی وغیرہ اور اگر مکسور ہے تو وہ چیز جس سے حیا آوے مثلاً شرمگاہ۔ یہ ہیں اسرار حروف اور پھر ہر حرف کے سات اسرار ہیں جو معانی مذکورہ کی مناسبت سے پیدا ہوتے ہیں نیز سات اسرار اور بھی ہیں جن سے مناسبت ہے عربی زبان کو اور اگر کلام عجیب ہو تو اس کے مناسب دیگر سات اسرار ہیں۔ واللہ اعلم۔

حضرت ممدوح کی خدمت میں میری حاضری کا پہلا مہینہ تھا کہ آپ نے فرمایا لو ان کلمات کو خوب سمجھ لو اور بھونامت سینو سینو ۴ کما ذر۔ میں نے دریافت کیا یہ کونسی زبان ہے فرمایا سریانی اور چند لوگوں کے سوا اس زبان سے کوئی واقف نہیں کہ اس میں باتیں کر سکے۔ میں نے پوچھا کبھی کہ اس فقرہ کا مطلب کیا ہے، مگر آپ نے بیان نہ فرمایا۔ اب سریانی حروف کی وضع معلوم ہونے کے بعد سمجھ میں آیا کہ آپ مجھ سے یہ ارشاد فرماتے تھے دیکھو اس نور کو جو میری ذات میں قائم اور چمک رہا ہے میرے ظاہر میں بھی اور میرے باطن میں بھی۔ دیکھو اس بڑی خیر و خوبی کو جس پر میری ذات نے قبضہ پایا اور اسی سے اس کا قوام ہے کہ تمامی کائنات کا شعور سے محفوظ رہنا اسی کی بدولت ہے اور آسمان و زمین جتنی بھی ظاہری و باطنی خوبیاں ہیں وہ اسی نور سے مستفید ہوتی ہیں جو میری ذات میں موجود ہے۔ گویا حضرت ممدوح را اپنی غوثیت کا اظہار فرما رہے تھے کہ حق تعالیٰ نے تصرفات عالم کا آپ کو واسطہ بنایا۔ واللہ اعلم

۲۹ (۱) حق تعالیٰ فرمایا ہے وَلْيَعْلَمِ الَّذِينَ الْكَاذِبُونَ اَتَكْفُرُونَ مِنْكُمْ شَهَادَاتُ ۵ تاکہ اللہ معلوم کرے (حقیقی) ایمان والوں کو، اور تاکہ تم میں بعض کو درجہ شہادت بخشے اور فرماتا ہے وَكُنْتُمْ تُكْفِرُونَ حَتَّىٰ كَعَلِمُ الْبُحَاثِينَ مِنْكُمْ وَالصَّابِرِينَ ۵ ہم تم کو آزمائیں گے تاکہ جان لیں کہ کون کون تم میں مجاہد اور صابر ہے، میں نے دریافت کیا کہ حق تعالیٰ کا علم تو قدیم ہے پھر اس کا کیا مطلب ہے، تاکہ جان لیں اور معلوم کر لیں،؟ فرمایا جس طرح لوگوں کی عادت ہے اپنے کلام میں اسی کے موافق قرآن مجید کا نزول ہوا ہے کہ فرض کرو کسی بادشاہ کا کوئی مقرب ہو جس سے زیادہ کوئی مقرب نہ ہو اور بادشاہ نے اپنی رعایا کے سارے معاملات اور ملک کے تمامی انتظامات اس مقرب کے سپرد کر دیے ہوں اور رعایا پر اس مقرب کی اطاعت کو واجب بنا دیا ہو، اور خود لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا ہو، اور داخلہ کی اجازت صرف اسی مقرب کے لئے مخصوص کر دی ہو کہ بجز اس کے حرم سرا میں کوئی نہ جا سکتا اور بادشاہ تک نہ پہنچ سکتا ہو تو ظاہر ہے کہ رعایا پر بادشاہ کی اطاعت و خدمت کے متعلق بھی جتنے بھی احکام ہوں گے یہی مقرب اُن کو لے کر آئے گا۔ اور جب ان کو جاری کرے گا تو اس طرح کہے گا کہ بادشاہ سلامت تم کو یہ حکم فرماتے ہیں اور تم سے فلاں خدمت لینا چاہتے ہیں۔ اور انکی خواہش ہے



کہ تم یہ کرو اور یہ کرو۔ اس مقرب کی تمام خطابات میں یہی عادت ہوگی حتیٰ کہ جن امور کا تعلق اس کی ذات سے ہوگا اور وہ بادشاہ کی طرف سے منسوب ہوں گے۔ ان میں بھی اس کا یہی طرز ہوگا کہ کہے گا بادشاہ کے ساتھ چلو، فلاں مقام پر بادشاہ کے ساتھ یہ برتاؤ کرو اور اس سے مراد اپنا نفس ہوگا کہ میرے ساتھ چلو، اور میرے ساتھ یہ برتاؤ کرو اور اس کا سبب وہ لگانگت ہے جو بادشاہ اور اس کے مقرب کے درمیان ہے (کہ اس کے ساتھ کوئی برتاؤ کرنا لعینہ بادشاہ کے ساتھ کرنا ہے۔ یہی شان اس آیت میں مفہوم کی ہے جو حق تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ مراد ہے نسبت الی الرسول یعنی تاکہ پیغمبر جان لے تم میں کون کون مجاہد اور صابر ہے اور تاکہ رسول کو معلوم ہو جائے نچتہ ایمان والا۔ اس کے بعد آپ نے ایک عالی مضمون بیان فرمایا جس میں حق تعالیٰ کے ارشاد اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَاۗءُوْۤنَکَ اِنَّمَا یُبَاۗءُوْنَ اللّٰہَ۔ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْہِمْ کے مطلب کی طرف اشارہ تھا مگر یہ موقع اس کے اظہار کا نہیں)

(۱۲) میں نے حضرت ممدوح سے مسئلہ غرائیق کے متعلق استفسار کیا کہ اس میں حضرت عیاض حق پر ہیں جو اس قصہ کا انکار فرماتے ہیں یا علامہ ابن حجر جو اس کو صحیح واقعہ قرار دیتے اور لکھتے ہیں کہ ابن ابی حاتم اور طبری اور ابن المنذر (آئمہ محدثین) نے متعدد طرق سے بروایت شعبہ از ابوبشر از حضرت سعید بن جبیر نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی اَفْسَ اَیْمِ اللّٰتِ وَالْعِزِّ وَمَنَاةَ الْاُثْلٰثِ الْاٰخِرٰی کہ دیکھو تو سہی لات اور منات اور تمہارا تیسرا عزمی۔ اس کے آگے شیطان نے آپ کی زبان مبارک پر یہ کلمات جاری کر دیئے تِلْکَ الْغَرَائِیْقُ الْعَلٰی وَاِنْ شَفَاعَتُہُنَّ لَتَرْتَجِیْ بِہِ بَرِّہٖ الْاَیْمِ الْاُثْلٰثِ الْاٰخِرٰی ان کی شفاعت کی ضرورت توقع رکھتی چاہیے، اس کو سنکر مشرکین مکہ نے کہا کہ آج سے پہلے محمدؐ نے ہمارے معبودوں کو مصلحتی کے ساتھ کبھی یاد نہ کیا تھا (مگر اس وقت ان کی مدح و ثنا کی ہے) لہذا آنحضرت نے سجدہ کیا۔ اور مشرکین نے بھی (خوش ہو کر موافقت میں سجدہ کیا) اس ثبوت کے ہوتے ہوئے عیاض کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس حدیث کی روایت نہ کسی ثقہ سے ثابت ہے اور نہ اس کی سند متصل یا صحیح ہے اور جن طریقوں سے یہ روایت ان میں اکثر ضعیف اور ناقابل اعتماد ہیں پھر بروئے روایت بھی اعتراض کیا ہے کہ ایسا واقعہ اگر پیش آتا تو بہترے مسلمان بھی مرتد ہو جاتے (اور ارشاد نبوی کے موافق لات و منات اور عزی کا کہ مشرکین مکہ کے بت کے احترام کرنے لگتے۔ اور جب ثابت نہیں کہ کوئی مسلمان اس عقیدہ پر آیا ہو تو ثابت ہو کہ قصہ بالکل بے اصل ہے) یہ لکھ کر علامہ ابن حجر نے منکرین قصہ کے دلائل کو رد کیا ہے، کہ یہ قصہ چونکہ مختلف طریقوں سے منقول ہوا ہے اس لئے معلوم ہوا کہ اس کی اصل ضرور ہے اور گو روایت مُرْسَل ہے کہ سند متصل نہیں ہے مگر جن کے نزدیک حدیث مُرْسَل قابل حجت ہے ان کو تو تسلیم کرنے میں دریغ ہی نہ ہوگا۔ لیکن جن کے نزدیک مُرْسَل حدیث



قابل حجت نہیں ہے چونکہ طرق روایت اس کے متعدد ہیں اور کئی ضعیف مل کر ایک قوی کا حکم لے لیتے ہیں لہذا اب ان کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ واقعہ من گھڑت نہیں ہے البتہ جتنی بات اس میں باطل اور شرعاً قبیح ہے اس کی تاویل کی جائے گی۔ اور پھر چھوڑنا ویسے بھی بیان کی ہیں۔ میں نے حضرت محدث سے دریافت کیا کہ آپ کی رائے اس بارہ میں کیا ہے اور آپ کے نزدیک کونسا مسلک صحیح و صائب ہے؟ فرمایا ابن العربی اور حضرت عیاض کی رائے بالکل صحیح ہے۔ غرانیق کا مسئلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قطعاً وقوع میں نہیں آیا اور مجھے بعض علماء کے قول پر کبھی بڑا تعجب ہوا کرتا ہے جیسے یہی قول جو علامہ ابن حجر سے صادر ہوا ہے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی قصہ کا ذرا سا حصہ بھی ثابت ہو تو نہ شریعت پر اعتماد قائم رہے گا نہ عصمت کا حکم باقی رہے گا اور رسول کی شان عامی انسان کی سی رہ جائے گی کہ آپ اور آپ کے کلام پر شیطان کا تسلط ہوا اور اتنا تسلط ہوا کہ جس بات کے زبان سے نکالنے کا نہ حضرت نے ارادہ فرمایا اور نہ وہ آپ کو پسند یا گوارا تھی وہ شیطان نے آپ کی زبان سے نکلوا دی اور حیرت و قہراً بادل خواستہ آپ کو اس کا متکلم بنا چھوڑا۔ اتنی بڑی بات وقوع میں آئے تو پھر رسالت پر وثوق کیسے رہے (کیونکہ اللہ کا جو پیام بھی آپ پہنچائیں گے اس میں احتمال ہوگا کہ ممکن ہے شیطان نے زبان مبارک سے جاری کرایا ہو) اور اس کا یہ جواب دینا کہ اسی آیت میں آگے مذکور ہے پھر حق تعالیٰ اس کو محو فرما دیتا ہے جو شیطان نے ڈالا تھا اور اپنی آیات کو قائم رکھتا ہے اور اس طریق عمل سے جب القاء شیطانی والقاء رحمانی میں خلط نہ ہو سکا تو رسالت پر کوئی حرف نہ آیا۔ کسی طرح صحیح نہ ہوگا کیونکہ اس میں بھی تو وہی احتمال ہے کہ ممکن ہے یہ کلمات آپ کی زبان پر شیطان نے جاری کرائے ہوں۔ اس لئے کہ جب مسئلہ غرانیق میں شیطان کا وحی پر تسلط جائز ہو گیا کہ اس نے ان کلمات کا اضافہ کر دیا تو یہ بھی جائز ہے کہ اس ساری آیت کا وحی الہی پر شیطان نے اضافہ کر دیا۔ اور اس طرح یہ احتمال تمامی آیات میں دوڑتا چلا جائے گا (اور کسی آیت پر بھی وحی الہی ہونے کا اعتماد نہ رہے گا) مومن پر واجب ہے کہ اس قسم کی حدیثوں سے جو دین میں ایسا شبہ پیدا کریں قطعاً منہ پھریں اور ان کو دیوار پر پھینک دیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معصومیت کا وہ عقیدہ رکھیں جو آپ کو شایان ہے خصوصاً جبکہ آپ کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ اس سے بالا کسی مخلوق کا مرتبہ نہیں رہے کہ آپ کا زلمت و خطا سے معصوم ہونے کا درجہ ملے اور کہاں شیطان کا بتوں کی مدح و ثنا کو آپ کی زبان مبارک سے نکلوانا (علامہ ازیں ارشاد باری و مَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُسُولٍ إِلَّا وَحْيًا لَا يَخْفَىٰ لَكَ الْإِلَهِ كَمَا اسے محمد تم سے پہلے ہم نے کوئی نبی یا رسول ایسا نہیں بھیجا جس کے ساتھ یہی قصہ نہ پیش آیا ہو، اس کو چاہتا ہے کہ عیاذاً باللہ تمامی گروہ انبیاء میں ہر نبی اور ہر رسول کی وحی پر شیطان تسلط ہوتا چلا آیا ہے بلکہ مستر آن مجید سے زیادہ، (کہ خاص



کلام اللہ میں جب دست اندازی پر اس کو قدرت ہو گئی تو کلام الرسول یا کلام ملائکہ پر دست اندازی کی قدرت کا کیا پوچھنا، لہذا ان کی تفسیر کے موافق تو آیت کا اقتضا یہ ہو کہ شیطان ملعون کی عادت ہی برگزیدہ خلق خاصان خدا حضرات رسل و انبیاء کے ساتھ ہمیشہ یہ رہی ہے۔ پھر اس کے باطل ہونے میں بھلا کس کو شبہ ہو سکتا ہے؟ دیکھو حضرت مدروح کی باوجود اُمی ہونے کے ماشاء اللہ کتنی دقیق نظر تھی۔ انا م بیضا دی نے بھی لکھا ہے کہ بعض علماء کا قول ہے تمنی کے معنی قرأت کے ہیں، اور یہ مطلب ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت شریفہ کو پڑھا تو شیطان نے غرائیق کا مضمون القا کیا۔ یعنی خود باوازا بلند اس کلمہ کو پڑھا جس کو سننے والوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی قرأت کا جزو سمجھا۔ مگر یہ قول بالکل صحیح نہیں کیونکہ اس سے وحی پر وثوق جاتا رہے گا اور فی نسخ اللہ الخ سے بھی اس کا جواب دینا صحیح نہ ہو گا کیونکہ خود اس میں بھی یہی احتمال نکلے گا کہ ممکن ہے یہ بھی شیطان ہی کا اضافہ ہو۔

یقین کہتا ہوں کہ اس پر ایک اعتراض یہ بھی وارد ہو گا کہ تمنی کی ضمیر چونکہ راجع ہے بنی اور رسول کی طرف لہذا آیت کا ترجمہ یہ ہو جائے گا کہ اے محمد تم سے پہلے جو بھی بنی اور رسول آیا ہے اس کی قرأت میں شیطان نے یہی مسئلہ غرائیق شامل اور القا کیا ہے جو تمہاری قرأت میں القا کیا ہے۔ اور اس کا غلط ہونا ظاہر ہے کہ ہر نبی کے قول میں اسی مسئلہ غرائیق کا اضافہ واقعہ کے بالکل خلاف ہے، علاوہ ازیں حضرات انبیاء علیہم السلام کی معصومیت کا مسئلہ منجملہ عقائد کے ہے اور عقیدہ نام ہے یقین اور اذعان کا لہذا حسب قواعد علماء اصول جس خبر واحد سے اس یقین پر اثر پڑتا ہو وہ خود غلط ہے رہا علامہ ابن حجر کا یہ کہنا کہ حدیث مرسل بعض کے نزدیک قابل حجت ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ صرف امور علیہ یعنی حلال و حرام کے مسائل میں قابل حجت ہے نہ کہ علمیہ اور عقائد کے بارہ میں جہاں دلیل مثبت کا یقینی ہونا ضروری ہے کہ خبر واحد سے تو کوئی عقیدہ ثابت بھی نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ عقیدہ کثانیہ کا ابطال و منہدم۔ پھر اس خبر واحد سے اگر اس کو صحیح بھی ثابت کر دیا جائے تو عقیدہ کو عقیدہ بھی عصمت رسول کا مدار اسلام ہی ہے کیسے توڑ سکتے ہیں اور یہ حدیث تو بواسطہ علی بن ابی صالح مروی ہے جو لیث کا میر منشی تھا۔ اور محققین نے اس کو بلا اتفاق ضعیف کہا ہے۔ غرض اس کے بعد میں نے حضرت مدروح سے دریافت کیا کہ آپ کے نزدیک اس کی صحیح تفسیر کیا ہے تو فرمایا سنو۔ حق تعالیٰ نے جو رسول اور نبی بھی کسی امت کی طرف مبعوث فرمایا وہ اپنی امت کے ایمان لے آنے کی تمنا کیا کرتا تھا۔ اسی کو ان کے لئے پیارا سمجھا، اسی کی ان کو ہمہ وقت ترغیب دیتا، اسی کا کمال درجہ حریص و متوقع، اور رات دن اسی فکر اور اسی جدوجہد میں لگا رہتا تھا۔ ہمارے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی جماعت میں تھے بلکہ سب کے سردار



اس لئے آپ کی یہ حرص و تمنا تو اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے (اے محمد) اگر یہ لوگ اس قرآن پر ایمان نہ لائے تو عجب نہیں تاسف و قلق میں تم اپنی جان ہلاک کر ڈالو گے، نیز فرمایا (اے محمد) تم کتنی ہی زیادہ حرص کیوں نہ کرو بہتر ہے ان میں ایمان نہ لائیں گے۔ نیز فرمایا (اے محمد) کیا تم لوگوں کو مجبور کر دو گے کہ وہ مومن بن جائیں، وغیرہ ذلک (اس سے اندازہ کرو کہ امت کے ایمان لانے کی تمنا اور حرص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنی بڑھی ہوئی تھی) پھر ہمیشہ ایسا ہوا کہ بنی کے آنے کے بعد امت کے دو ٹکڑے ہوئے یعنی ایک فریق ان پر ایمان لایا اور دوسرے فریق نے انکار کیا۔ کیونکہ بنی کے آتے ہی راہزن (شیطان) نے لوگوں کے قلوب میں طرح طرح کے دھوکے ڈالنے شروع کئے۔ پس جن کے دلوں میں وہ جم گئے ان کے لئے موجب کفر بن گئے۔ اور جن پر حق تعالیٰ نے فضل فرمایا ان کے خطرات کو مٹا دیا اور وہ اپنی نشانیوں جو وحدانیت و رسالت پر دلالت کر رہی تھیں ان کے قلوب میں مستحکم کر دیں (کہ ان کی بدولت ان کا قدم ایمان سے نہ ڈگے) اس سے معلوم ہوا کہ ابتداءً شیطان کی طرف سے دسائس و خطرات تو دونوں فریق کے دلوں میں ڈالے جاتے ہیں مگر فرق اتنا ہوتا ہے کہ جن پر حق تعالیٰ فضل فرماتا ہے ان کے قلوب سے شیطان کے القا کئے ہوئے دسائس و دُر نہیں ہوتے (اور لاکھ معجزے کیوں نہ دیکھیں سحر ہی سحر پکارے جاتے ہیں) اب آیت کا مطلب کھل گیا کہ آپ کی آرزو یعنی امت کے ایمان لانے کے بارے میں شیطان نے حسب عادت (مستمر) تمامی امت دعوت کے دلوں میں دسائس و خطرات کا القا کیا۔ پھر حق تعالیٰ جس قلب سے چاہتا ہے القاء شیطانی منسوخ اور خطرات دسائس کو محو فرما دیتا ہے (اور یہ جماعت سے مومنین کی) کہ دلائل توحید و رسالت ان کے دلوں میں پہاڑ کی طرح اُٹھ اُٹھ کر مستحکم بنا دیتا ہے اور جس کو چاہتا تھا القاء شیطانی پر قائم رکھتا ہے (اور فضل نہیں فرماتا کہ فضل ایک احسان ہے جس پر جبر کا کسی کو حق نہیں اور اس لئے فضل نہ زمانا ظلم نہیں) واللہ اعلم۔ پھر میں نے ہاروت و ماروت کے قصہ کی بابت دریافت کیا کہ اس میں بھی حضرت عیاض اور ابن جبر کا یہی اختلاف ہے۔ حضرت عیاض انکار فرماتے ہیں اور ابن عمر واقعہ بتاتے (اور ان کے عاشق ہونے اور بہ سرائے معصیت چاہ بابل میں اُلٹے لٹکائے جانے وغیرہ کا ثبوت دیتے ہیں)۔

فرمایا اس میں بھی حق حضرت عیاض کے ساتھ ہے اور قصہ بالکل غلط ہے (کیونکہ حضرات ملائکہ معصوم ہیں اور ان سے صدور معصیت نہیں ہو سکتا)۔

(۱۳) آیت شریفہ وَیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ جِبَالٍ مِّنْ بَرُورٍ کے متعلق میں نے حضرت سے دریافت کیا۔

کہ حق تعالیٰ اولا برساتا ہے آسمان کے پہاڑوں سے تو کیا آسمان پر برت کے پہاڑ ہیں؟ فرمایا نہیں بلکہ ہر وہ چیز جو تمہارے سر سے اونچی ہو (عربی زبان میں) آسمان کہلاتی ہے۔ لہذا مطلب یہ ہے کہ جانب



بالا کے سرد پہاڑوں سے ژالہ یاری فرماتا ہے، میرے استفسار کا سبب یہ ہوا تھا کہ ایک صاحب نے  
 حضرت ممدوح کا محض امتحان لینے کے لئے، میرے پاس ایک تحریر بھیجی جس میں اسی قسم کے متعدد سوالات  
 تھے۔ مثلاً برت کی اصل کیا ہے کہ دھویں اور پھوار کی طرح برستا ہے اور اولہ کی اصل کیا ہے کہ پتھر کی طرح جمی ہوئی  
 کنکر برستے ہیں؟ پھر وہ اپنی جگہ سے ایسا ہی جما ہوا چلتا ہے یا دراصل پانی ہے اور ہم پر برستے وقت برت یا اولہ  
 بن جاتا ہے؟ اور یہ آتا کہاں سے ہے یعنی برسنے والے بادلوں سے یا آسمان میں سے؟ اور کیا آسمان میں  
 برت کے پہاڑ ہیں جیسا کہ آیت شریفہ سے معلوم ہوتا ہے؟ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ صرف ٹھنڈے ملک  
 میں پڑتا ہے گرم ملک میں کیوں نہیں پڑتا۔ (آسمانی پہاڑوں کے لئے ملکی تقسیم کیسی؟ پھر اونچے پہاڑ ہی  
 اس کے لئے کیوں مخصوص ہیں۔ نشیبی زمین اور کھلے جنگلوں میں برت کیوں نہیں پڑتا؟ اور اگر کبھی پڑتا بھی  
 تو جلد کیوں لپھل جاتا ہے؟ پھر اولہ کبھی بارش کے ساتھ برستا ہے اور کبھی خالص کہ پانی کا ایک قطرہ بھی  
 اس کے ساتھ نہیں ہوتا اس کی کیا وجہ ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سرد اور گرم جگہ میں صرف سولہ سترہ میل  
 کا فصل ہوتا ہے مگر باوجود اتنے عقوڑے فصل کے اُدھر برت پڑتا ہے اُدھر نہیں پڑتا؟  
 نیز صاعقہ یعنی گرنے والی بجلی بھی صرف ٹھنڈے ملکوں اور پہاڑوں اور ان مقامات کے لئے مخصوص ہے  
 جہاں درخت ہوں کیا وجہ ہے کہ چٹیل بیا بانوں میں نہیں گرتی؟ حتیٰ کہ ایسے مقامات دے جانتے بھی نہیں  
 کہ صاعقہ کس چیز کا نام ہے۔ امید ہے کہ صحیح راستہ دکھا کر ہمارے شکوک و شبہات رفع فرمائیں۔

میر سی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب لکھوں میں نے تفاسیر و احادیث و علم کلام کی تمام کتابیں جہاں جہاں اس  
 بحث کا مسئلہ تھا میں نے چھان ماریں مگر کہیں اس مسئلہ کا پتہ نہ لگا۔ اور تعجب سے علامہ سیوطی پر ہوا کہ باوجود  
 احادیث و آثار میں اس درجہ وسیع النظر اور مستبحر ہونے کے اس مسئلہ کو انہوں نے بھی کہیں بیان نہیں کیا نہ  
 اپنی کتاب البتہ السنیۃ فی الہیۃ السنیۃ میں حالانکہ وہ اسی قسم کے مسائل ہیئت میں انہوں نے لکھی ہے اور  
 نہ بیضاوی کے حاشیہ پر اس سے کچھ تعرض کیا۔ حالانکہ علامہ بیضاوی نے بطریق حکماء اس مسئلہ کو  
 آیت مذکورہ کے تحت میں لیا ہے جس کا طرز وہی قادر مطلق جل جلالہ سے اعراض اور فاعل متعرف  
 سبحانہ و تعالیٰ شانہ، سے حوادث عالم کی نفی ہے جیسا کہ فلاسفہ کی عادت و مقتضا طبیعت ہے یعنی  
 سورج وغیرہ کی گرمی سے ہوا اور پانی کے اجزاء جو خلا کی طرف چڑھتے ہیں ان کا نام بخار ہے اور آگ  
 اور مٹی کے جو اجزاء چڑھتے ہیں وہ دھواں ہے کہ دھواں صرف اسی سیاہ جسم کا نام نہیں جو آگ  
 سے جلی ہوئی چیز سے نکل کر اوپر چڑھا کرتا ہے اور عرف میں اس کو دھواں کہا جاتا ہے۔ پھر ان دونوں  
 چیزوں کا صعود اکثر باہم مخلوط ہو کر ہوتا ہے، اور اسی سے تمامی آثار علویہ پیدا ہوتے ہیں کہ بخارات



اگر قلیل ہوئے اور ہوا میں گرمی شدید ہوئی تو وہ پانی کے اجزاء کو تحلیل کر کے ہوائی اجزاء میں دے گی اور اس کا نام آندھی ہے۔ اور اگر بخارات زیادہ ہوئے اور ہوا میں اتنی گرمی نہ ہوئی جو ان کو تحلیل کر سکے تو یہ بخارات اوپر چڑھتے چڑھتے طبقہ زمہر تک پہنچ جاتے ہیں جو نہایت درجہ ٹھنڈا ہے اور وہاں پہنچ کر انتہائی خشکی کی وجہ سے وہ منجمد ہو جاتے ہیں، اس کا نام بادل ہے۔ پھر یا تو اس میں سے پانی کے اجزاء جبے بغیر ٹپک جاتے ہیں جس کا نام بارش ہے۔ اور اگر برودت شدید ہے تو جبکہ نیچے گرنے لگتے ہیں پھر اگر جمود قبل تقاطع ہوا ہے تو اس کا نام برف ہے، اور اگر ٹپکنے کے بعد ان قطرات کو برودت نے منجمد کر دیا ہے تو اس کا نام اولہ اور ثلہ ہے کہ بوندوں کے چھوٹے بڑے حسب برودت ڈھبے بندھ گئے اور زمین پر آگرے وغیرہ وغیرہ۔ لہذا محشی یعنی حافظ جلال الدین کو لازم تھا کہ اسلالت کے کلام سے اس کی تردید کرتے نیز درمنثور وغیرہ دیگر کتب تفاسیر کو بھی میں نے بغور دیکھا۔ مگر بجلی گرج بارش بادل وغیرہ سب کی بحث اس میں موجود ہے لیکن برف اور ثلہ کی تحقیق سے انہوں نے بھی سکوت کیا اور کچھ نہیں لکھا۔ اس لئے اول میں نے حضرت محدوح سے سوال کیا جو اوپر مذکور ہوا اور پھر وہ تحریر سلنے رکھ دی چنانچہ اس وقت حضرت نے جواب لکھوایا اور میرا نام ڈال کر سائل کے پاس بھیج دیا اور وہ یہ ہے الحمد للہ وحد لا و صلی اللہ علی سیدنا محمد وآلہ وصحبہ اجمعین۔ جواب دھوا لموفق للصواب بيمينه برف در حقیقت پانی ہے جس کو ہوا نے جمادیا ہے۔ اور اس کی اصل اس سمندر کا پانی ہے جو زمین کو محیط ہے۔ کہ اس پانی میں تین خصوصیتیں ایسی ہیں جو دوسرے پانی میں نہیں پائی جاتیں۔ اول انتہا درجہ کی خشکی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہوا اس کے بہت قریب ہے اور حرارت آفتاب سے وہ بہت دور ہے اور اسی لئے بہت جلد جم جاتا ہے دوم انتہا درجہ کی صفائی کہ اپنی اصل خلقت پر قائم ہے اور اجزاء رضیہ سے بالکل مخلوط نہیں ہوا لہذا نہایت سفید اور شفاف ہے۔ سوم انتہائی لجبہ کہ ہم سے بہت دور ہے اور ہمارے اور اس کے درمیان بے حد فاصلہ ہے۔ جب یہ سمجھ میں آگیا تو سنو کہ حق تعالیٰ شانہ کا جب ہوا کو حکم ہوتا ہے کہ پانی اٹھائے تو وہ فوراً تحلیل کرتی اور پانی کو اس طرح اٹھاتی ہے جس کا کچھ نمونہ طوفان کے وقت سمندر میں نظر آتا ہے کہ پہاڑ کے پہاڑ پانی سے اٹھ کر ہوا کے ہاتھوں میں ایسے کھلونے بن جاتے ہیں جیسے بڈ کے سامنے گنبد، وہ پانی فطرت برودت کی وجہ سے فوراً لیتہ ہو جاتا (اور برف کا پہاڑ بن جاتا ہے) پھر ہوائی اس برف کو جہاں بھی پہنچانے کا حکم ہوتا ہے، پھیڑے مارتی اور پیستی ہوئی بیکر چلتی ہیں حتیٰ کہ اس طویل مسافت کے طے کرنے میں جو ہمارے اور بحر محیط کے درمیان واقع ہے اس کی بندش بیکر کھل جاتی ہے اور تری کی وجہ سے محض اجزاء کا اتصال باقی رہ جاتا ہے یہ برف جو ہمارے اطراف میں بھی موسم سرما کی چلے



میں علی الصباح گرتا ہے، اور یہی سبب ہے کہ کبھی باریک سوت کی صورت میں گرتا ہے اور کبھی سوت سے بھی  
 زیادہ باریک۔ برخلاتِ نزالہ کے رحب کو اولہ اور کنکر بھی کہتے ہیں) کہ وہ ان سمندروں کا پانی ہے جو اسی زمین  
 پر واقع ہیں (جیسے بحر ہند و بحرِ قلزم وغیرہ) یا ان بڑے تالابوں اور جھیلوں کا پانی ہے جو مہینہ برسنے کی وجہ  
 سے نشیبی حصوں میں از خوردین جاتے ہیں۔ چونکہ ان کی مسافت زیادہ طویل نہیں اور ان کے پینے اور  
 ہم پر برس جانے میں بہت کم وقفہ ہوتا ہے (اس لئے ہوا کو ان کے پینے کا وقت نہیں ملتا اور وہ) حیا جام پر  
 برس جاتا ہے اور یہی سبب ہے کہ اولہ کے پیڑ میں سے زمین کے اجزاء مٹی اور سوت وغیرہ برآمد ہوتے ہیں  
 کیونکہ وہ اسی زمین کا پانی ہے اور جھیل میں سے اٹھ کر ہوا کی برووت سے منجمد ہوا ہے (چنانچہ اولہ توڑ کر  
 حبس کا جی چاہے دیکھ لے۔ نیز چونکہ چار طرف سے اس پر ہواؤں کے تھپیڑے پڑتے رہتے ہیں اس لئے  
 وہ گول اور ایسا بناؤ لے ہوتا ہے جیسے گوندھے ہوئے سخت آٹے کا پیڑا کہ اس کو عورت برتن میں مت  
 کر یا محلوں سے گولہ بناتی ہے، اور اولہ کے اجزا کو ہوا کے جھونکے ممتھ کر پیڑا بنا دیتے ہیں۔

چنانچہ اولہ گرتے ہی فوراً اس کو غور سے دیکھو تو اس کی تصدیق ہو جائے گی۔ یہی اولہ اگر اس کے گرنے میں دیر  
 لگے (اور ہواؤں کو اس کے پینے کا وقت مل جائے تو جھاؤ ڈھیل ہو کر) برت بن جائے گا۔ اور یہی سبب ہے  
 اولہ کی حسابت میں فرق ہونے کا) کہ جتنا جلدارے گا اسی قدر پیڑا ہوگا کہ ہوا کو تھپیڑے مار کر اس کو گولہ کا  
 وقت بہت کم ملا) یہی بات کہ برت اور اولہ کے لئے سرد مقامات اور پہاڑ کی چوٹیاں کیوں مخصوص ہیں  
 سو اس کا سبب یہ ہے کہ برت کا انجماد جب تک کوئی مانع پیش نہ آئے اپنی حالت پر قائم رہا کرتا ہے  
 البتہ جس وقت مانع پیش آتا ہے تو وہ پانی بن جاتا ہے اور مانع اس کے لئے یہی بخارات ہیں جو زمین  
 سے اوپر کی جانب چڑھتے ہیں اور ان میں چونکہ حرارت ہے اس لئے جب وہ برت سے جا کر ملتے ہیں تو اس کی  
 برووت کو توڑتے ہیں اور اس لئے اس کا جماد جاتا رہتا ہے۔ چونکہ یہ بخارات گرم ملکوں اور نشیبی میدانوں  
 میں زیادہ ہوتے ہیں اس لئے وہاں برت کا وجود نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو دیر یا نہیں ہوتا (بہت جلد  
 پگھل جاتا ہے) برخلاتِ ٹھنڈے ملکوں اور پہاڑی چوٹیوں کے (کہ مقامی خنکی یا بلندی و قرب ہوا کے۔  
 سبب، وہاں برت کے انجماد کا مانع مفقود ہوتا ہے) لہذا جمایا برت نیچے آ پڑتا ہے اور دیر یا نہیں ہوتا  
 ہے کہ مدت تک نہیں گھلتا، رہا یہ امر کہ کبھی بارش کے ساتھ گرتا ہے اور کبھی خالص، سو بارش کے ساتھ  
 گرنے کی دو وجہ ہیں۔ یا یہ کہ منجمد برت ہی کے کچھ اجزاء ان بخاراتِ زمین سے پگھل کر پانی بن جاتے  
 ہیں کہ جو حصہ گھل گیا وہ پانی بن کر برس گیا اور جو نہ پگھلا وہ اولہ بنا ہوا اس کے ساتھ آپڑا اسی  
 وجہ سے اس قسم کی بارش بہت ہلکی کمزور، اور باریک بوندوں والی، پسے ہوئے برت کی شکل میں ہوا



کرتی ہے۔ اور یا یہ دجہ ہوتی ہے کہ پانی پورا بمخند نہیں ہونے پاتا اور برستا شروع ہو جاتا ہے۔ کیونکہ  
ہوائیں جب پانی کو اٹھاتی ہیں تو وہ جھنے لگتا ہے اور ہوائیں اس کو پسینا شروع کر دیتی ہیں پھر دوسرا  
پانی اٹھاتی ہیں اور اب حق تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے کہ دونوں پانی زمین پر اتر جائیں لہذا پہلا پانی چونکہ خشک  
ہو میں دیر تک رہا اس لئے) ٹالہ بنا ہوا گرا جاتا ہے۔ اور دوسرا پانی (جو اٹھاتے ہی چھوڑ دیا گیا) وہ پانی کی صورت  
میں برس جاتا ہے رہا آپ کا یہ سوال کہ سولہ سترہ میل کے قلیل فاصلہ میں کونسی دیوار کھڑی ہو گئی کہ ادھر برت گرتا ہے  
اور ادھر نہیں گرتا تو اس کا جواب ظاہر ہے کہ مدار فرق (قرب و بعد مسافت نہیں بلکہ) مانع کا وجود و عدم ہے لہذا  
محضہ سے مقام پر چونکہ مانع مفقود تھا اس لئے برت گرا، اور گرم جگہ پر مانع موجود تھا اس لئے برت نہ گرا اسی  
سے آپ کا اس سوال کا جواب نکل آیا کہ پہاڑ کی چوٹیاں اور اونچے مقامات پر برف باری کے لئے کیوں  
مخصوص ہوئے؟ اس لئے کہ آسمان و زمین کے درمیان اس خلا سے جس میں ٹھنکی حد درجہ کی ہے اونچے مقامات  
کو قرب حاصل ہے (لہذا خشکی غالب رہتی ہے) اور نیچے مقامات کو اس سے بعد ہے (لہذا یہاں بخارات زمین  
کی حرارت غالب رہتی ہے) رہا صاعقہ کے متعلق آپ کا اعتراض کہ گرم ملکوں میں کیوں نہیں گرتی؟ یہ خود  
دعوئے بے دلیل ہے بلکہ غلط ہے اور شاہدہ کے بھی خلاف ہے ہم نے خود اپنے شہر سلیمان میں  
ایک دو دفعہ نہیں بلکہ بارہا بجلی گرتے ہوئے دیکھی ہے حالانکہ وہ نشیبی جگہ ہے سطح مستوی ہے جنگل ہے  
اور گرم مقام ہے شرح مواقف میں بھی ایک واقعہ لکھا ہے کہ کھلے جنگل میں ایک بچہ پر بجلی گری اور پنڈلی نکلا اس کی دونوں  
ٹانگیں جدا کر دیں کہ مطلق خون نہیں نکلا اور دیگر مفسرین نے بھی آیۃ شریفہ *وَيُؤَسِّلُ الْهَوَا عَقَّ ذَنْبِهِ يَكْفُرُ*  
کی تفسیر کے تحت صحرا میں بجلی گرنے کا ذکر کیا ہے واللہ اعلم ف یہ ہے حوادث عالم کی تحقیق کے متعلق اہل حق کا طریق کہ  
متصرف و نا معل حقیقی ذات حق سبحانہ کو قرار دیتے ہیں اور اسباب کو صرف آلات اور اوزان کا مرتبہ دیتے ہیں اور مد نظر  
رکھتے ہیں کہ یہ بھی اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور ان کے توسط پر بھی وہ مجبور نہیں ہے بر خلاف فلاسفہ کے کہ معتقدین  
نے ان کا نام حکما رکھا ہے اور حقیقت تک رسائی نہ پاسکے اور پھر اپنی تحقیقات پر یقین و اعتماد رکھنے کا بنا پر عاشقانِ رسولؐ کو  
حمقا سمجھتے ہیں انکی کوثر نظری ظاہری اسباب کو متصرف سمجھتی اور خالق کی طرف سے بالکل غافل بلکہ منکر ہوتی ہے یا کم از کم  
معطل سمجھتی ہے کہ اسباب کو پیدا کر کے تصرفات عالم کا ان کا مختار بنا دیا اور خود عیاذ باللہ غالی و بیکار ہو بیٹھا زیادہ سے  
زیادہ ان کا مسلک یہ ہے کہ مشین کے پرنزے اپنا اپنا کام کرتے ہیں مگر از خود نہیں بلکہ ڈرائیور کے تحت تصرف اور زیرِ شیت  
کہ جب چاہی کھوے گا تو سنڈر چلے گا در نہ بند ہا پڑا ہے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ڈرائیور اور مشین دونوں ایک خدا کی مھنوتا  
میں ہیں اس لئے وہاں یہ تمثیل بالکل غلط ہے۔

۱۰ میرا خیال ہے کہ کتابت کی غلطی یا مولف کی ذلت قلم سے بہت سکوس ہو گئی بنیادوں ہونا چاہیے کہ پہلا پانی چونکہ جھنے کے بعد سواکن نے پیدا کیا ہے اس  
لئے پھر پانی بن گیا اور دوسرا پانی جو ہوا کے اٹھاتے ہی جم گیا اور اس وقت اتا رہا گیا ہے وہ میخدر اور بنا ہوا گر گیا۔ مترجم







زمین میں پیدا ہو کر تحت زمین محبوس ہو جاتے ہیں اور (ہوا کی) برودت ان کو توڑ نہیں سکتی کہ پانی بناد اور نہ وہ زیادہ مقدار ہونے کے سبب معمولی حرارت سے تحلیل ہو سکتے ہیں اور سطح زمین اس جگہ ہوتی ہے سخت کہ بخارات کو باہر نکلنے کے لئے اس میں کوئی راستہ نہیں ملتا لہذا زمین پھر پھر اٹھنے لگتی ہے جیسے کسی کو بخار چڑھتا اور حرارت کے بخارات اُس کے بدن میں محبوس ہو جاتے ہیں تو اس کا بدن پھر پھر اٹھنے لگتا ہے جس کو جاڑہ چڑھنا بولتے ہیں) اور بعض دفعہ زمین پھوٹ جاتی ہے اور مواد محتبسہ باہر نکل جاتے ہیں۔ اور فساد رائے کی وجہ یہ ہے کہ ان کا دعویٰ بلا دلیل ہے بلکہ اس کے خلاف پر دلیل قائم ہے (یعنی تو پیغمبر کہ سب زلزلہ تجلی حق ہے بسوئے زمین) فہ عوام میں مشہور ہے کہ زمین گائے کے سنگ پر قائم ہے اور جب گائے سنگ بدلتی ہے کہ یہ سنگ بوجھ سے ٹھک گیا ہے تو زمین کو اپنے دوسرے سنگ پر لیتی ہے۔ اس سے زلزلہ آتا ہے میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس میں اور فلاسفہ کے قول میں کیا فرق ہے اگر اُن کی وہ تجویز عقلی صحیح ہے تو عوام کی یہ تجویز عقلی بھی صحیح ہے اور اگر یہ بے دلیل و ساقط الاعتیار ہے تو وہ بدرجہ اولیٰ ساقط الاعتیار ہے۔ پھر تعجب یہ ہے کہ کوئٹہ جیسے ٹھنڈے شہر کی زمین میں اتنی حرارت محبتس ہو جائے کہ بھرت ناک منظر دکھائے اور دیگر شہروں میں احتباس بخارات اس کا عشر بھی نہ ہو علاوہ ازیں اگر صورت یہی رہی اور اسباب واسطہ بنائے گئے تو پھر سوال پیدا ہوگا کہ صرف اسی مقام پر بخارات جمع ہونے کا کیا سبب؟ اسی جگہ کی برودت کمزور ہونے کی کیا وجہ؟ اسی جگہ زمین ایسی سخت کیوں ہے کہ بخارات کو راستہ نہ ملے؟ وغیرہ وغیرہ کہ سبب اور سبب السبب کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے آخر ٹھکنا پڑے گا اور تم کہو گے کہ اتفاق سے ایسا ہو گیا۔ اور ہم کہیں گے کہ مالک الملک خدا حکم سے ایسا ہوا۔ لہذا پہلے ہی کیوں نہ تسلیم کر لیں کہ خدا نے اپنے پیغمبر کے واسطہ سے زلزلہ وغیرہ کا جو سبب بیان فرمایا ہے وہی حق صریح اور صواب و صحیح ہے باقی سب عقلی ڈھکوسلے اور من گھڑت قیاسات ہیں جن کو دوسری عقلیں مقابلہ میں آکر شکست بھی دے سکتی ہیں۔

پھر میں نے خفت کا سبب دریا نت کیا کہ کبھی زمین کا کوئی حصہ پھٹ جاتا ہے اور آدمی و دیگر اشیاء جو زمین پر ہوتی ہیں اس میں دھنس جاتی ہیں، اور یہ صورت آخر زمانہ میں بکثرت ہوگی، اس کا کیا سبب ہے؟ فرمایا زمین پانی (بحر محیط) پر ہے، اور پانی ہوا پر، اور ہوا اس بڑے میدان سے نکلتی ہے جو آسمان اور بحر محیط کے درمیان واقع ہے فرض کرو ایک آدمی برابر چلتا رہے تو چلتے چلتے وہ منہائے زمین پر پہنچے گا اور اب اس کو بحر محیط نظر آئے گا فرض کرو اس پر بھی برابر چلتا رہے تو چلتے چلتے آخر وہ بھی ختم ہو جائے گا اور اب اُس کے اور آسمان کے درمیان صرف ایک خلا ہوگا جو بہت ہی بڑا ہے اور ہوائیں اس سے نکلتی ہیں۔



اُن ہواؤں کی طاقت اور کیفیت ناقابل بیان ہے (کہ بڑی سے بڑی آندھی جو بھر میں کسی نے دیکھی ہو وہ مضبوط سے مضبوط درخت کو جڑ سے اکھڑ پھینکے گے وہ ان ہواؤں کا بہت ہی قلیل ترین حصہ ہے) یہی ہوائیں بحکم خداوندی پانی اور زمین کو اٹھائے ہوئے ہیں اور یہی آسمان کو تھامے ہوئے ہیں پھر برصغرت الہی وہ ہر وقت کام میں لگی ہوئی ہیں کہ ایک لمحہ کے لئے بھی ان کو سکون نہیں ہوتا اور آسمان کی طرف چڑھتی رہتی ہیں جب حق تعالیٰ کسی قوم پر بارش برسانا چاہتا ہے تو ان ہواؤں میں سے بہت ہی قلیل حصہ کو حکم فرماتا ہے کہ (بجلئے آسمان کی طرف چلنے کے زمین کی طرف آئیں) لہذا وہ اپنا رخ لیوئے زمین پھرتی ہیں اور بحر محیط کی سطح پر عبور کرتی ہوئی اتنا پانی اُٹھا کر جتنا حق تعالیٰ کو منظور ہے اس مقام پر پہنچتی ہیں جہاں کا ان کو حکم ہوا ہے (اور پانی کو چھوڑ دیتی ہیں) کہ وہ بارش کی صورت اُن پر ساتا ہے بارہا ایسا ہوا کہ میں بحر محیط کے کنارے پر نظر ڈالی جو اُس خلا سے ملا ہوا ہے جس میں ہوائیں ہیں تو میں نے برف کے اتنے بڑے پہاڑ دیکھے جن کی بڑائی بس خدا ہی کو معلوم ہے۔ خدا دیر بعد دیکھتا ہوں کہ وہ پہاڑ منتقل ہو کر بحر محیط کے اُس کنارہ پر پہنچ گئے جو کوہ قاف کے متصل ہے یہ کارنامہ اُن ہواؤں ہی کا تھا کہ اتنے بڑے پہاڑوں کو اٹھا لیا اور اتنی جلد اس کنارہ سے اس کنارہ پر پہنچا دیا) اور جب حق تعالیٰ کسی قوم کو دھنسانا چاہتا ہے تو یہ ہوائیں زمین کے اُن سوراخوں اور گڑبھوں میں گھس جاتی ہیں جو زمین اور بحر محیط کے درمیان واقع ہیں اور اس وجہ سے زمین (کے اجزاء میں جو اتصال ہے وہ کٹ جاتا اور) اٹھلا پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی کا نام خسف ہے (کہ زمین پر جو کچھ تھا وہ شکاف میں سما گیا) اور اقرب قیامت (آخر زمانہ میں زمین کے سوراخ اور گڑبھ زیادہ ہو جائیں گے لہذا خسف کا بھی وقوع زیادہ ہوگا حتیٰ کہ زمین کا نظام ہی دہم برہم ہو جائے گا اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور مشیت سے ہو رہا ہے اور ہوگا۔) الحاصل ہوائیں لیوئے زمین اس کو برباد کرنے کی نیت سے متواتر آتی رہیں گی حتیٰ کہ زمین کی حالت ہواؤں کے ہاتھوں ایسی ہو جائے گی جیسے غلہ میں سے مٹی اور کنکر نکلنے والے کے ہاتھ میں چھلج کی حالت ہوتی ہے (کہ بے درپے اور جلد جلد اس کو جھٹکتا اور زیر و زیر کرتا رہتا ہے) زمین کے چھلج کا غلہ بنی آدم کی ریٹھ کی ہڈیاں ہیں جن سے ذات آدمی نے ترکیب پائی ہے (کہ دیگر اجزاء زمین کو پھٹک پھٹک کر ان سے جدا کر دیا جائے گا) اور پھر حق تعالیٰ ان کو زمین کی گہرائیوں، سمندر کی تہوں، اور غاروں کے اندرون، اور پہاڑوں کے نیچے سے غرض جہاں اور جس جگہ بھی یہ ہڈیاں ہوں گی نکال کر ایک جگہ جمع فرمائے گا۔ وہ دن ہوگا کہ پہاڑوں سے ان کی جگہ چھوٹ جائے گی اور ہوا کی قوت سے کہیں کہیں پہنچ جائیں گے اور پھر دھنسی ہوئی روئی کی طرح اڑیں اس کے بعد آسمان پھٹ جائے گا اور ریٹھ کی ہڈیوں پر پانی برسے گا جس سے



وہ ہڈیاں آہستہ آہستہ پرورش پائیں گی۔ جیسے تربوز و کدو وغیرہ بڑھتا اور زمین میں چھپا ہوا گننام دانہ آب پاشی سے پھوٹا پھلتا اور بڑا ہو کر زمین کے اوپر نمودار ہو جاتا ہے اسی وجہ سے ہمارے حضرت عبدالوہاب بڑا دمی فرمایا کرتے تھے کہ اس دن کو یاد کرو جب زمین اٹھے گی اور پھر ریڑھ کی ہڈی کو سیسے کی اس کے بعد جب اس کا نشوونما کامل ہو جائے گا تو پھٹ جائے گی اور بنی آدم اس سے باہر نکل آئیں گے جیسے انڈا پھٹ جاتا ہے اور پرند اُس سے باہر نکل آتا ہے نیز فرمایا کہ نال (ناف طفل) اُس روز پیٹ کی طرف نہیں بلکہ پیٹ کی طرف ہوگی پھر حق تعالیٰ روحوں کو حکم فرمائے گا کہ اپنے اپنے جہنم میں داخل ہو جائیں گے پس جب روہیں اُن میں داخل ہو جائیں گی تو سب سیدھے کھڑے ہو جائیں گے اور نال کٹ جائے گی پھر جہنم میں کالبد میں داخل ہو چکیں گی تو حق تعالیٰ اُس نور کو جس نے جہنم کو اہل دنیا کی طرف آنے سے روک رکھا ہے حکم فرمائے گا کہ بسوئے جنت روانہ ہو جائے۔ اور وہ نور ہے ہمارے آقا سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اس وقت جہنم کا خروج ہوگا اہل دنیا کی طرف کہ ہر جانب سے ان پر لپکے گی اُس روز بندوں پر جو خوف و ڈر تھا بچائے گی اس کی مقدار کا اندازہ میں خدا ہی کر سکتا ہے نیز آپ نے فرمایا کہ اس روز روحوں کے اجسام میں داخل ہوتے وقت ارواح میں بجلی کی سی گرج، اور ٹرپ، اور ایسا شور ہوگا کہ اُن آوازوں کو سن کر دل ہیبت سے لرزے اور کلیے و دھڑکتے سے جاگ ہو جائیں گے۔ اس کے بعد آپ نے اُس دن کے دیگر واقعات بیان فرمائے جن میں چند کا تذکرہ اللہ آئندہ آئے گا۔ واللہ اعلم

(۱۵) میں نے دریافت کیا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے یُرْسِلُ عَلَيْكُمْ شُطُوطًا مِّنْ تَارٍ وَّ تَحْمَسُ مِنْهُ فَلَا تَقْصِرَ اَنْ اَكْغُرُوهُ اَنْسَانَ وَجَنَاتٍ تَمْرٍ مَّجْجُورًا جَائِے گا آگ کا شعلہ اور دھواں پس تم مقابلہ نہ کر سکو گے یہ واقعہ میدانِ حشر میں ہوگا یا جہنم میں ڈال دیے جانے کے بعد؟ فرمایا میدانِ حشر میں ہوگا اور اس سے مراد وہی آگ ہے جو اہل حشر پر خروج کرے گی اور ہر طرف سے ان کو گھیرے گی۔

(۱۶) كُوْنُكُمْ نَظُّوْا السَّمَاءَ كَطَيِّ السَّجْلِ لِلْكِتٰبِ۔ اُس دن ہم آسمان کو لپیٹ لیں گے جیسے کتاب کا سجل لپیٹ لیا جاتا ہے میں نے پوچھا کہ سجل سے کیا مراد ہے؟ امام بخاری کہتے ہیں کتاب کا ورق مراد ہے جس طرح ورق اپنی تحریر پر لپیٹ جاتا ہے اس طرح آسمان تم ہو جائے گا اور حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ سجل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک کاتب کا نام ہے جو وحی و خطوط وغیرہ لکھا کرتے تھے اور سہیلی نے لکھا ہے کہ آسمان دوم پر ایک فرشتہ ہے جس کا نام سجل ہے، اور مخلوق کے اعمال نامے پر درخشہ اور پنجشہ کہ ان کے حوالہ کئے جائیں گے حضرت نے فرمایا کہ رحل (یا ٹوٹاں میز) مراد ہے جس پر وہ کتاب رکھی جاتی ہے جس سے کاتب نقل کیا کرتا ہے اور نقل سے فارغ ہو جانے کے بعد اس کو تہ کر کے ایک طرف رکھ دیتا ہے



اور للکتاب بقاعدہ نحو حال واقع ہوا ہے اور غالباً یہ بھی فرمایا کہ شریانی لفظ ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جس طرح کتاب کی رحل کو تہ کر کے ایک طرف رکھ دیا جاتا ہے اسی طرح بروز قیامت آسمانوں کو تہ کر دیا جائے گا۔ اس وقت مجھے یہ دریافت کرنا یاد نہ رہا کہ رحل اور آسمان میں من و چہ مشابہت کیا ہے، اور آسمان کے تہ کئے جانے صورت کیا ہوگی اور رحل ہی کے تہ کئے جانے سے تشبیہ کیوں دی گئی، اور کیا کتاب کے سوار رحل کسی اور چیز کے لئے بھی ہوا کرتی ہے؟ یہ سوالات کرتا تو ان کی بھی صحیح معلومات ہو جاتی کہ آپ جو کچھ فرماتے تھے عینی مشاہدہ بیان فرمایا کرتے تھے۔

۱۷۱۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے قَالَ رَبِّ ارْنِيْ اَنْظُرُ اَيْنِكَ قَالَ كُنْ تَوَانِيْ وَلٰكِنْ اَنْظُرْ اِلَى الْجِبْلِ فَاِنْ اَسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَوَانِيْ ۝ موسیٰؑ نے عرض کیا اے میرے پروردگار مجھے اپنی زیارت کرا دیجئے۔ ارشاد ہوا کہ تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے لیکن اس پہاڑ کی طرف دیکھ لو پس اگر یہ اپنی حالت پر قائم رہا تو ممکن ہے تم بھی مجھے دیکھ سکو۔ میں نے عرض کیا کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام تو عارف باللہ جماعت میں بڑے رُتیبہ والے ہیں اور عارف حیب تک مشاہدہ کے سمندر طے نہ کرے عارف ہی نہیں بن سکتا پھر حضرت کلیم اللہؑ نے باوجودیکہ دائمی مشاہدہ آپ کو حاصل تھا رویت کا سوال کیسے کیا؟ اور کیا رویت کا درجہ مشاہدہ سے بڑھا ہوا ہے؟ فرمایا کہ اہل مشاہدہ کوفات باری کا مشاہدہ افعال باری سے خالی و صاف ہو کر کبھی نہیں ہو سکتا مگر اس وقت جبکہ حق تعالیٰ اپنے افعال کو اس سے منقطع فرمائے۔ اور اگر کسی ذات سے افعال کا تعلق ایک لحظہ کے لئے بھی منقطع فرمائے تو ذات باقی نہیں رہ سکتی، فوراً ہلاک ہو جائے گی اور سارا نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جو بھی ہستی ہے کہ اس کو وجود ملا ہوا ہے اس میں عالم (ہر وقت و ہر لحظہ) حق تعالیٰ شانہ کا فعل (اور کوئی نہ کوئی تصرف) جاری ہے (کہ کُلُّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ۝) اور یہی فعل الہی اس موجود کا مادہ وجود اور سبب بقا ہے۔ اور یہی حجاب بنا ہوا ہے ذات فانی اور ذات حق سبحانہ کے درمیان (کہ ذات بحت کے مشاہدہ کے لئے گویا آڑ اور پردہ ہے) اور حق تعالیٰ اپنے افعال کو ذات فانی میں حجاب نہ بنائے تو عالم کا ہر حادث و فانی جل جائے (اس کی مثال بدلتی ہوئی ہے جیسے جرم آفتاب کسی وقت بھی ان شعاعوں سے خالی نہیں جو چار طرف دنیا کی ہر شے پر پڑتی رہتی ہیں اور یہی مانع بنی ہوئی ہیں کہ جرم شمس پر نظر نہیں جم سکتی اور فوراً تھک کر بند ہو جاتی اور واپس لوٹ آتی ہے اگر یہ شعاعیں مانع نظر نہ ہوتیں اور براہ راست تازنگاہ سورج کی ٹکیا پر جا کر پڑتا تو پھر آنکھ اور آنکھ کی بینائی قائم نہ رہ سکتی۔ فوراً جل کر ایسی معدوم ہو جاتی جیسے کبھی آتش شیشہ میں سورج کو دیکھا جائے اور اس کی اصل چمک جو بجلی سے زیادہ تیز ہو جاتی ہے پتلی پر پڑ جائے تو فوراً نگاہ میں نہ رہتا ہو جاتی ہے



پس جب اہل مشاہدہ کا مشاہدہ افعال باری سے صاف اور خالی نہ ہوا اور وہ افعال ایسے بن گئے جیسے آنکھ میں کُنک ہوتی ہے کہ تشک یا ذرہ پڑ جاتا ہے تو آنکھ پوری کھل نہیں سکتی اور بے حجاب ہو کر کسی چیز کو دیکھ نہیں سکتی اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی درخواست حق تعالیٰ سے یہی تھی کہ اپنے فعل کو جو کہ مانع رویت بنا ہوا ہے قطع فرما کر درمیان سے پردہ اٹھا دے کہ ذات بحت کا صاف نظارہ ہو۔ اس لئے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے موسیٰ اگر حادث و فانی ذات سے اپنے فعل کو قطع کر کے یہ درمیانی آڑ اٹھا، تو اس کی ذات ہی فنا ہو جائیگی دیکھو یہ پہاڑ جو بروئے ذات تم سے بہت زیادہ قوی اور بروئے جرم تم سے بہت زیادہ سخت ہے اپنا فعل اس سے منقطع کر کے تم کو دکھاتا ہوں، اس کی طرف نگاہ ڈالو اگر یہ میرے قطع فعل کے بعد اپنی حالت پر قائم و برقرار رہا تو سمجھنا کہ تم بھی مجھے دیکھ سکو گے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے پہاڑ پر بجلی فرمائی اور اپنے فعل کا تعلق جو اس کے لئے سطوت ذات حق سے حجاب بنا ہوا تھا اس سے قطع فرمایا۔ سورۃ قمر ۱۰ پارہ پارہ ہو گیا اور اس کے اجزاء و ذرات بن کر ہو گئے۔ اُٹ گئے۔ حتیٰ کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام بھی بے ہوش ہو کر گر پڑے واللہ اعلم (۱۸) حق تعالیٰ فرماتا ہے یَحْجُوا اللَّهَ كَمَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ وَعِنْدَ لَا اُكْدَ الْكِتَابِ هَ اللَّهُ مُتَدَيِّمٌ هُوَ جَوَّاهِتَا، اور قائم رکھتا ہے (جو جواتا ہے)، اور اسی کے پاس ہے اصل کتاب۔ میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ آیہ شریفہ کا کیا مطلب ہے (اور لوح محفوظ کی لکھت میں کیا مٹانا اور قائم رکھنا یعنی تغیر و تبدل ہوا کرتا ہے)؟ کہ علماء میں اس کے متعلق بہت اختلاف ہوا ہے (اور تقدیر مطلق و مبرم وغیرہ کی بحثیں ہوئیں ہیں، فرمایا اس کی وہ تفسیر تم کو سناتا ہوں جو کل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سنائی ہے اور وہ یہ ہے کہ واقعات عالم کے متعلق بندوں کے تنویر میں جو خیالات آیا کرتے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔ بعض کا وقوع ہو جاتا ہے خیال کے موافق، اور اس کی طرف اشارہ ہے یَحْجُوا اللَّهَ كَمَا يَشَاءُ سے اور بعض کا وقوع نہیں ہوتا اور اس کی طرف اشارہ ہے وَثَبَّتْ سے، اس کی شرح یہ ہے کہ کائنات کے آئندہ پیش آنے والے معاملات کے متعلق انسان کا خیال جو کچھ بھی قائم ہوتا ہے مثلاً یہ کہ زید پرسوں اپنے گھر آجائے گا یا مثلاً جمعہ کے دن بارش ہوگی، یا فلاں فلاں سلطنت میں جنگ ہوگی اور فلاں کا غلبہ ہوگا، وغیرہ وغیرہ اس کی دو قسمیں بن جاتی ہیں ایک وہ رجن کا وقوع مقدر ہے سو وہ تو ہو جاتی ہیں اور اس پر صادق آتا ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کو برقرار رکھا اور خیال کو مقدر کے موافق بنایا) اور دوسری قسم وہ ہے رجن کا وقوع مقدر نہیں سو ان کا وقوع نہیں ہوتا اور اس پر صادق آتا ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کو مٹا دیا اور خیال کو کہ غلط بنادیا، اور اصل کتاب (یعنی لوح یا اللہ کا علم قدیم) اللہ کے پاس ہے کہ اس میں کبھی تغیر نہیں آتا یہ ہے آیت کا مطلب جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے لہذا اس کو وثوق کے ساتھ لو اور باقی سب تفسیروں کو چھوڑ دو، اور حضرت ممدوح تھے یہ اس



بنا پر فرمایا کہ اس سے قبل کپ ہی نے اس آیت کی ایک اور تفسیر بیان فرمائی اور اس میں چند غنائی علوم کا تذکرہ  
 فرمایا تھا (اس لئے مطلب یہ تھا کہ وہ بھی قابل اعتماد نہیں) جسے خلاصہ تفسیر یہ ہے کہ خیالات بشریہ میں باوجود  
 وہ بھی القادس من اللہ ہے محو اثبات کا تہرت الہی جاری رہتا ہے مگر علم قدیم سے ارفع و اعلیٰ ہے کہ اس  
 کا کوئی حکم محو نہیں ہوتا۔ اور لوح محفوظ کی اصل بھی وہی علم قدیم ہے کہ اسی سے مستخرج ہے واللہ اعلم  
 (۱۹) وَإِذَا خَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَامَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلَى نِسَاءِ الْعَالَمِينَ  
 اور جب فرشتوں نے کہا کہ اے مریم اللہ نے تم کو برگزیدہ کیا اور تم کو رخصت کی گندگیوں سے پاک صاف  
 بنایا اور تم کو عورتوں کی جنس میں منتخب فرمایا کہ فضیلت بخش، تمام جہان کی عورتوں پر اے مریم اپنے رب  
 کی فرمانبرداری رہو اور سجدہ کرتی رہو اور خدا کے سامنے چھپکنے والوں کے ساتھ جھکی رہو، میں نے حضرت  
 ممدوح سے عرض کیا کہ اس آیت سے کیا حضرت مریم علیہا السلام کی نبوت پر استدلال کر سکتے ہیں؟ اور نیز  
 حضرت موسیٰ کی والدہ اور فرعون کی زوجہ حضرت آسیہ نیز حضرت سارہ حضرت ہاجرہ اور حضرت حوا علیہن  
 السلام کے بنی ہونے کی بابت جو بعض علماء کی رائے ہے وہ صحیح ہے یا غلط کہ بعض نے تسلیم کیا ہے اور  
 بعض نے انکار کیا ہے اور بعض نے حضرت مریم کی نبوت پر اجماع نقل کیا ہے اور بعض نے توقف کیا ہے کہ نہ  
 اقرار نہ انکار مثلاً امام اشعری رئیس اہل السنۃ والجماعت فریق اول کی دلیل یہ ہے کہ فرشتہ کا نزول بنی ہی  
 پر ہوا کرتا ہے، اور آیت شریفہ سے حضرت مریم علیہا السلام پر فرشتہ کا نزول ثابت ہوا لہذا ان کی  
 نبوت محقق ہوئی اس فریق کے نزدیک بنی اور ولی کے درمیان فرق یہی ہے کہ بنی وہ ہے جس پر فرشتہ نازل  
 ہو، اور ولی وہ ہے جس پر الہام ہو فرشتہ کا نزول نہ ہو حضرت ممدوح نے فرمایا دوسرے فریق کا قول صحیح ہے کہ  
 مریم بنی نہ تھیں، صدیقہ اور ولیہ کاملہ تھیں اور عورتوں کی نوع میں مطلق نبوت نہیں ہوتی اور نبوت ولایت  
 اتنی بات میں اگرچہ مشترک ہیں کہ ہر ایک نور ہے انوار الہی میں سے اور سر ہے اسرار الہیہ میں سے مگر دونوں  
 کے نور میں بڑا فرق ہے حقیقی فرق تو کشف ہی سے معلوم ہو سکتا ہے مگر سمجھانے کے لئے اتنا کہا جائے گا  
 کہ نور نبوت اصلی ہے، فاتی ہے، حقیقی ہے اور ذات بنی کے ساتھ اصل خلقت میں پیدا ہوا ہے اور اسی لئے  
 بنی رقبہ از نبوت ولایت از نبوت، معصوم ہوتا ہے اور نور ولایت کی یہ شان نہیں ہوتی۔ چنانچہ صاحب فتح ولی جب  
 کسی ایسے شخص کو دیکھتا ہے جو آئینہ ولی بننے والا ہے تو تمام لوگوں کی طرح اس کو بھی (نور سے خالی) دیکھتا ہے  
 مگر جب اس ذات پر نگاہ ڈالتا ہے جو آئینہ بنی بننے والی ہے تو اس میں نور نبوت پہلے سے رکھا ہوا نظر  
 آتا ہے اور ذات بنی کی طبیعت میں وہ ساتوں اجزا نبوت فطری طور پر موجود پاتا ہے جن کا تذکرہ حدیث  
 اُنْزِلَ الْغُرَاتُ عَلَى سَبْعَةِ آخِرِينَ میں کیا جا چکا ہے یعنی حق گوئی اس کی فطری ہوتی ہے



کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو نیز صبر جس کی بنا پر الم و کلفت نہ ہو۔ مخلوق پر رحمتہ کاملہ اللہ جل جلالہ کی معرفت تمام  
خوف تمام کہ خوف باطنی کے ساتھ خوف ظاہری بھی آمیز ہوا اور دائماً بہر صورت موجود رہے باطل کے ساتھ  
بغض دائماً اور عفو کامل کہ جو اس سے تعلق کو توڑے یہ اس سے جوڑے اور جو اس کو مفرت پہنچائے یہ اس کو  
منفعت پہنچائے۔ عرض ساتوں اجزائی کے لیے فطری ہوتے ہیں فتح (اور مشاہدہ ملک المملکت) سے قبل  
بھی اور بعد از فتح بھی مگر ذات ولی قبل از فتح مجملہ دیگر ذوات کے ہے کہ اس میں کوئی بات زائد نہیں ہوتی  
البتہ جب اس کو فتح نصیب ہوتی ہے اس وقت اس میں انوار آتے ہیں۔ لہذا اس کے انوار عارضی ہوتے  
اور اسی لئے ولی قبل از فتح اور بعد از فتح ہر حال میں خیر معصوم ہوتا ہے اور یہ فرق جو بیان کیا جاتا ہے  
کہ ولی پر فرشتہ کا نزول نہیں ہوتا اور نبی پر فرشتہ کا نزول ہوتا ہے، صحیح نہیں ہے کیونکہ جس کو حق تعالیٰ  
فتح نصیب فرماتا ہے خواہ وہ نبی ہو یا ولی وہ فرشتوں کو ان کی اصل صورت پر دیکھتا ہے وہ ان سے باتیں  
کرتا ہے اور اس سے باتیں کرتے ہیں اور جس نے کہا کہ ولی کو فرشتہ نظر نہیں آتا یہ دلیل ہے اس کی کہ اس شخص کو حق  
تعالیٰ نے فتح نصیب نہیں فرمائی اور ولایت کے لئے فتح لازمی نہیں اس لئے انہوں نے ہر ولی کو اپنی ولایت  
قیاس کر لیا۔

علامہ حاتمی نے بھی فتوحات مکیہ کے باب ۳۶ میں لکھا ہے کہ بعض اولیاء سے جن میں ابو حامد امام غزالی بھی  
شامل ہیں غلطی واقع ہوئی کہ انہوں نے نبی اور ولی میں یہ فرق بیان کیا کہ نبی پر فرشتہ اترتا ہے اور ولی کو اہام  
ہوا کرتا ہے فرشتہ اس پر نہیں اترتا۔ حالانکہ صحیح یہ ہے کہ فرشتہ ولی پر بھی اترتا ہے البتہ جو حکم لے کر  
اُترتا ہے اس میں فرق ہوتا ہے کہ نبی پر جدید احکام لاتا ہے کہ وہ صاحب شریعت ہوتا ہے اور ولی  
پر حکم لاتا ہے (شرعیۃ نبویہ کے) اتباع کا یا اطلاع دیتا ہے کسی حدیث کے صحیح ہونے کی جس کو علماء نے  
ضعیف کہہ دیا تھا یا بشارت من اللہ لے کر آتا ہے کہ تم اہل سعادت و ایمان ہو جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے  
لَكُمْ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۚ اِنَّ كُوْنَكُمْ شِجْرٰی (سنائی جاتی) ہے دنیا کی زندگی میں بھی اور  
آخرت میں بھی (سنائی جائے گی) اور ان حضرات کی غلطی کا سبب یہ ہوا کہ انہوں نے حق تعالیٰ کے طریق سلوک  
کو سبک لے لیا کہ جو نہ خود ان پر فرشتہ کا نزول نہیں ہوا اس لئے سمجھے کہ دوسروں پر بھی نہیں ہوا  
(اور اس بنا پر عام حکم لگا دیا کہ ولی وہ ہے جس پر فرشتہ کا نزول نہ ہو) اگر یہ حضرات کسی ثقہ و معتبر شخص سے سُن پاتے  
کہ ولی پر بھی فرشتہ اُترتا ہے تو ضرور اپنے قول سے رجوع کر لیتے۔ کیونکہ یہ خود بھی ولی تھے اور) کرامات  
ادبائے قائل و مصدق تھے۔ چنانچہ اکثر انہوں نے رثوت مل جانے کے بعد، ایسے قول کی طرف رجوع  
کیا ہے جس کے خلاف پہلے جیسے ہوئے تھے۔ اب ہم اس موقع پر حضرت ممدوح کے علوم میں دو باتیں



بیان کرتا مناسب سمجھتے ہیں۔ اول وہ چند چیزیں جن کا اہل فتح کو مشاہدہ ہوا کرتا ہے حضرت نے فرمایا کہ مقام اول میں جن امور کا مشاہدہ ہوتا ہے وہ یہ ہیں نیندوں کے افعال جن کو وہ خلوتوں کے اندر کرتے ہیں۔ (ساحب فتح کو سب نظر آتے ہیں) ساتوں زمین اور ساتوں آسمان کا مشاہدہ اس آگ کا مشاہدہ جو کہ پانچویں زمین میں ہے، اور یہ نار برزخی ہے کہ عالم برزخ ساتویں آسمان سے لے کر ساتویں زمین تک چلا گیا ہے اور روحیں اپنے اجسام سے نکلنے کے بعد اپنے اپنے درجہ کے موافق اسی برزخ میں رہتی ہیں اور اہل تقدیر کفار و منافقین کی روحیں اس آگ میں رہتی ہیں۔ اس کی شکل تنگ مکانات مثلاً کنوؤں، غاروں، گڑھوں اور گھونسلوں کی سی ہیں اور اس نار برزخی میں رہنے والے ہر وقت زیر و زبر رہتے ہیں کہ اوپر آکر تم سے ایک بات کہے گا تو پوری نہ کرتے پائے گا کہ نیچے جا پہنچے گا۔ یہ آگ جہنم کی آگ نہیں ہے کہ جہنم تو ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمین کے کرہ سے باہر ہے اور اسی طرح جنت بھی ساتوں ساتوں زمینوں کے باہر ہی اشتباک کا اور ان میں جو مخلوقات آبار ہے ان کا مشاہدہ کہ ایک زمین دوسری زمین سے کیونکر ملی ہے اور ایک زمین سے دوسری زمین تک جانے کی کیا صورت ہے، اور ہر زمین کا ماہ الامتیاز کیا ہے جو دوسری زمین میں نہیں پایا جاتا اسی طرح ساتوں آسمانوں کے باہر اشتباک کا مشاہدہ کہ ایک دوسرے سے کس طرح ملا ہے اور ان کے باہر کیا نسبت ہے اور ان میں ستارے کیونکر رکھے گئے ہیں شیاطین کا مشاہدہ اور یہ کہ ان کے توالد و تناسل کی کیا صورت ہے جنات کا مشاہدہ اور یہ کہ وہ کہاں رہتے ہیں شمس و قمر اور ستاروں کی سیر و رفتار کا مشاہدہ اور ہونک آوازوں مثلاً گرج اور گرنے والی بجلیوں کی کڑک کا مشاہدہ کہ وہ ہمیشہ ان کے کانوں میں پڑتی رہتی ہیں صاحب فتح ولی پر لازم ہے کہ ان میں سے کسی مشاہد کو بھی بڑی چیز نہ سمجھے بلکہ معمولی چیز سمجھے ورنہ وہیں ٹھہر جائے گا۔ بلکہ حالت برعکس ہونے لگے گی اور گونا گویا شروع ہو جائے گا وجہ یہ ہے کہ فتح کے زمانہ میں جبکہ مشاہدات ہونے لگتے ہیں، طبیعت شقات یعنی جاذب ہوتی ہے اور وہ جس چیز کو بھی اچھا سمجھتی ہے اس کو فوراً چوس لیتی ہے اور یہ تمام چیزیں جن کا مشاہدہ ہوتا ہے چونکہ ظلمت و تاریکیاں ہیں لہذا جب کسی ظلمت سے انس و قرار پائے گی وہیں ٹھہر جائے گی اور اللہ جل جلالہ سے جدا و بے تعلو رہن جائے گی اسی لئے کہا جاتا ہے کہ غیر مفتوح (ولی جس کا سلوک مشاہدات سے خالی) ہو بڑے امن میں ہے، اور جس کو (امناء سلوک میں) مشاہدات پیش آویں وہ بڑے خطرے میں ہے کہ خدا ہی حفاظت فرمائے تو محفوظ رہے ورنہ ظاہر ہے کہ جب طبیعت انسانیہ قبل از فتح درہم و دنانیر اور بیوی بچے تو درکنار بادام و کشمش اور چنے کے دانہ تک کی عاشق و گرویدہ ہے کہ ان میں مستغول اور مبتلا ہو جاتی ہے، تو بعد از فتح جب تمامی عالم علوی و سفلی کی چیزیں سامنے آئیں لگیں اور پھر ساتھ ہی شیطان بھی اپنی کوشش میں لگا ہوا ہو تو کس کی طاقت ہے کہ بچا رہے جز اسکے کہ حق تعالیٰ ہی



اس کو بچائے۔ نیز آپ نے فرمایا کہ سالک اگر امور مذکورہ میں کسی ایک چیز پر بھی ٹھہر گیا تو شیاطین اس کے ہر وقت ساتھی بن جاتے ہیں اور وہ اللہ بنیاد میں رکھے یا ساحر بن جاتا ہے یا کاہن۔ اور جس پر حق تعالیٰ فضل فرماتا ہے اس کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور اس کے قلب میں اپنا شوق اور دلی خواہش و طلب ڈال دیتا ہے کہ وہ ان مشاہدوں کو عبور کرتا ہو اور اللہ کی طلب میں آگے بڑھا جلا جاتا ہے پھر مقام ثانی میں اس کو انوار بایقہ کا مشاہدہ ہوتا ہے جس طرح مقام اول میں امور ظلمانیہ نانیہ کا مشاہدہ ہوا تھا کہ مشاہدہ کرتا ہے عام مدائیکہ کا اور ان فرشتوں کا جو محافظت خلق پر تعینات ہیں، مجلس اقطاب کا، اس مجلس کے اولیاء کا، سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے مقام کا اور اس جماعت کا جو حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب اور اُن سے متعلق ہے پھر مقام موسیٰ علیہ السلام کا اور اس جماعت کا جو ان کے ساتھ ہے، پھر مقام ابراہیم علیہ السلام کا اور ان کے ساتھ والی جماعت کا پھر مقام یوسف علیہ السلام کا اور ان کی جماعت کا، پھر تین رسولوں کا پیغمبران کے ساتھ سابقین میں سے جن میں بعض حضرت ادریس سے قبل ہوئے ہیں اور بعض ان کے بعد مگر ان کے نام لوگوں میں مشہور و معروف نہیں ہیں۔ اور اگر ہم انبیاء مذکورین کے مقامات کی شرح و تفصیل بیان کریں اور بتائیں کہ فرشتوں کو ان کی اصل صورت پر دیکھنے کی کیا صورت ہوتی ہے تو سننے والا حیران ہو جائے اور وہ باتیں اس کے سننے میں آدیں جن کا خطرہ و خیال بھی اس کے دل پر کبھی نہ گذرا ہوگا۔ ان امور کا مشاہدہ کرنے والے پر بھی ضروری ہے کہ ایک جگہ بھی نہ ٹھہرے۔ اور وجہ وہی ہے کہ اس کی ذات چونکہ شفاف ہے اس لئے جس مقام پر ٹھہر جائے گا وہ اس کے اسرار و انوار فوراً چوس لے گی حتیٰ کہ سیدنا عیسیٰ کے مقام کو پیارا سمجھ کر ذرا بھی اگر ٹھہر گیا تو اسرار عیسیٰ سے سلب ہوگا اور فوراً ہی ان کے مذہب پر یعنی مذہب اسلام چھوڑ کر عیاذ باللہ عیسائی بن جائے گا۔ غرض صاحب فتح و مشاہدہ ہر وقت ایک بڑے خطرہ میں اور ہلاکت کے نہایت قریب ہوتا ہے جب تک کہ مقام سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدہ تک نہ پہنچ جائے۔ ہاں جب مقام محمدی کا مشاہدہ ہوتا ہے تو ہر طرح کا اطمینان و سرور حاصل اور مبارکیا کا مستحق ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مطہرہ کے اندر اللہ جل جلالہ کی طرف کھینچنے والی ایک ایسی قوت رکھی ہوئی ہے جو تمامی انبیاء علیہم السلام میں آپ ہی کے ساتھ مخصوص ہے اور اسی وجہ سے آپ اعز المخلوقات اور افضل العالین ہیں۔ لہذا جب صاحب مشاہدہ مقام محمدی میں پہنچتا ہے تو اللہ جل جلالہ کی طرف اس کی کشش اتنی بڑھ جاتی ہے کہ انقطاع و بے تعلق سے مامون و بے خطر ہو جاتا ہے اب تیسرا مقام شروع ہوتا ہے اور ان انوار میں جن کا اوپر ذکر ہوا تقدیر کے اسرار و راز ہائے بے پایاں کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اور جو حقے مقام میں اُس نور کا مشاہدہ ہوتا ہے جس پر فعل الہی منبسط اور ایسا گھل مل گیا ہے



جیسے پانی میں زہر گھل جاتا ہے کہ فعل بہ منزلہ دہر کے ہے اور نور بہ منزلہ پانی کے۔ اس مقام میں بھی بہتیروں کو غلطی واقع ہوتی ہے کہ وہ اس نور کو نور الہی سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ وہ اس سے بدرجہا بلند و برتر ہے۔ پھر پانچویں مقام میں فعل الہی کی اس نور سے علیحدگی کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ نور نور نظر آتا ہے اور فعل فعل اس وقت اپنی غلطی کو محسوس کرتا اور سمجھتا ہے کہ پہلا گمان واقعہ کے خلاف تھا۔ ان مقامات کے نام رجو صوفیہ کی اصطلاح میں تجویز ہوئے ہیں اور ان کے معانی کی شرح اور ان کی تمامی اقسام، اور ان کی تفصیل سب ہم نے اس لئے بھڑدی کہ مقصود صرت صاحب مشاہدہ کو ڈرنا اور متنبہ کرنا ہے کہ پھونک پھونک کر قدم رکھے اور ایک لحظہ بھی استغانت خدا سے غافل نہ ہو۔ سودہ سجد اللہ حاصل ہو چکا۔

دوسری بات جس کا ذکر کرنا مناسب ہے وہ یہ ہے کہ بنی اور ولی کے درمیان جو فرق ہے وہ تو معلوم ہو گیا اب بنی اور فرشتہ کے درمیان جو فرق ہے وہ سمجھو کہ فرشتہ ایک نورانی ذات ہے جس حق تعالیٰ نے عقل اور حواس رکھ دیے ہیں۔ حضرت شیخ فرمایا کرتے تھے کہ ہر فرشتہ کو حق تعالیٰ نے پانچ ستر عطا فرمائے ہیں، اور ہر سر میں سات جوائب ہیں اور ہر جوائب میں نو منہ ہیں جن کا مجموعہ تریسٹھ ہوتا ہے لہذا پانچویں سر میں عین سو تین درہ منہ ہوئے اور ہر منہ میں کسی فرشتہ کو تین زبانیں عطا فرمائی ہیں اور کسی کو پانچ اور کسی کو سات لہذا کسی کو نو سو تین زبانیں ہوئیں، اور کسی کی ایک ہزار پانچ سو پچتر زبانیں اور کسی کی دو ہزار دس سو پانچ درہاں اور جب فرشتہ کلام کرتا ہے تو اس کی آواز اس کی ساری زبانوں سے نکلتی ہے۔ سبحان الملک الخلاق العظیم۔ اہل مشاہدہ کو اگر حق تعالیٰ شانہ، اپنی طرف سے خاص قوت کی مدد نہ پہنچائے تو فرشتہ کی آواز سنکر اس کا قلب پھٹ جائے اور دل پارہ پارہ ہو جائے۔ پھر کیا ہو چھٹا جبکہ اس کی شکل بھی اصل ہو۔ اور جو صورت ان کو اصل خلقت میں عطا فرمائی گئی ہے اس کا بھی مشاہدہ ہو جب یہ سچ چکے کہ فرشتہ ایک ذات اور نورانی ذات ہے جس میں عقل اور حواس مرکب ہیں تو اس کی مثال روح کی سی ہوتی کہ وہ بھی ایک نور ہے جس میں عقل بھی رکھی ہوئی ہے جس سے اللہ جل جلالہ کی معرفت ہوتی ہے اور دوسری طاقتیں بھی رکھی ہوئی ہیں جن کا ذکر روح کے اجزاء وسیعہ میں مفصل گذر چکا ہے، اور یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ ساتوں علوم اس کے فطری ہیں جو اس کی اصل آفرینش میں شامل ہیں بس یہی حال فرشتہ کا ہے کہ ابتدائی ہی سے کو فتح و مشاہدہ نصیب ہے اور یہ قوتیں اس کی فطری و خلقی ہیں اور بنی کی ذات پیدا کی گئی ہے مٹی سے اور روح کو مع اس کے تملک اسرار و قوی کے اس ذات تباری میں مستور کر دیا گیا ہے اور مٹی کا طبعی اقتضاء ہے حجابِ راز و ظلمت و کثافت، مگر بنی کو چونکہ حق تعالیٰ نے نواز اور اس کی اصل آفرینش میں نبوت کا نور رکھا ہے جس کی وجہ سے ظلمت بالکل دور ہو چکی ہے اور حجاب رقیق و باریک بن گیا ہے، اس لئے صاحب نبوت



گویا حقانیت کا دائمی جلس و ہم خواب ہے کہ قریب ترین ہے اللہ سے قریب ترین ہے حق سے، حرکت کرتا ہے تب امر حق میں، اور سکون کرتا ہے تب امر حق میں۔ بولتا ہے تب حق بات بولتا ہے، اور سکوت کرتا ہے تب مہمتا حق کرتا ہے اس کا ہر فعل اور ہر امر حق ہے، اور وہ مجسم حق ہے، حتیٰ کہ فرض کرو وہ ایسی جگہ اور ایسی قوم میں پیدا ہو جن کی پیدائش ضلال و گمراہی پر ہوئی ہو تب بھی یہ بنی ان کے تمامی افعال اور حرکات و سکنات سے نفرت کھائے گا، ان کا مد مقابل بنے گا، اور اس فطری حق کی وجہ سے جو اس کی ذات میں مبصر ہوا ہے ان کی ضد اور نقیض بن کر رہے گا۔ حالانکہ نہ شریعت اس کے کان میں پڑی ہے اور اس نے اللہ کے امر و نہی کا کوئی لفظ نہ سنا ہے۔ یہ ہے حالت ہر نبی کی اصل آفرینش اور فتح و شاہدہ سے بھی قبل ابتداء و شروع کی جہ جائیکہ جب اس کو فتح و شاہدہ نصیب ہوا اور اس کی ذات ترابی اور روح کے درمیان کا پردہ بالکل اٹھ جائے اور وہ ہمہ وقت حضور و بارگاہ شہود میں رہنے لگے تب تو اس کے حوزہ قرار اور دریائے ناپید اکنار کا حال بھی نہ پوچھو کہ اسکی بے ساختہ تونہ کوئی فرشتہ کر سکتا ہے نہ تمام مخلوقات میں کوئی چیز و فی اب دو باتیں مجھے بھی عرض کرنا ہیں جو گویا نتیجہ اور ثمرہ ہیں حضرت شیخ ہی کی تقریر کا اول آپ کو معلوم ہوا کہ خلاصہ سار سلوک کا بلکہ مقصود آفرینش عام اور تخلیق بنی آدم کا قرب من اللہ اور وصول الی اللہ ہے اور اس کا دروازہ صرت ایک یعنی وجود با وجود ہے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا آپکی ذات مطہرہ میں خصوصیت کے ساتھ قوت جاذبہ الی اللہ ایسی رکھی ہوئی ہے کہ محبت کے ساتھ آپ کا دامن پکڑ لینے والا قرب الہی سے محروم و ناکام نہیں رہ سکتا مگر اس کے پڑے راستہ و دیہیں ایک کا نام سیراجہالی ہے اور دوسرے کا نام سیر تفصیل ہے جیسے ایک ریل کا راستہ دہلی سے لاہور تک کا اور دوسرا راستہ سڑک اعظم کا جو شاہی سڑک کہلاتی ہے، باقی اس کی شاخیں بہت ہیں کہ چار طرے سے گھوم پھر کر ان ہی دو راستوں میں کسی جگہ آہلی ہیں۔ تفصیلی سیر کی مثال شاہی پختہ سڑک پر چلنا ہے کہ اس کا مسافر گھوڑے پر سوار راستہ کے تمامی مناظر دیکھتا اور لب سڑک سڑکے میں راتوں خہرتا اور جگہ جگہ کے پانی پیتا ہو، ایک کافی مدت میں منزل مقصود پر یعنی لاہور پہنچے گا۔ اس کو تالاب بھی راستہ میں پڑھیں گے اور ندیاں نلے بھی۔ کہیں پہاڑ نظر آئیں گے اور انہر چڑھتا اترتا ہوگا اور کہیں جنگل ہیا بان اور لوق و دوق ہیا بان نظر آئیں گے اور ان میں گزرنا ہوگا بنوں میں شیر اور چیتے بھی دکھائی دیں گے اور دریاؤں میں مچھلیاں اور نا کے بھی کہیں سبز باغات اور گنجان درختوں کی ٹھنڈی ہوا میں ہوں گی اور کہیں گرم لُکے ٹھانچے اور اندھیاؤ کے غبار۔ غرض ہر منظر کی تفصیل سیر کرتا ہوا جب برسوں میں لاہور پہنچے گا تو حالات سفر بیان کرتے کرتے خود بھی تھک جائے گا اور سننے والے بھی شروع شروع میں ذوق میں گے کہ ان دیکھے عجوبہ اور انوکھے واقعات کانوں میں پڑ رہے ہیں مگر آخر میں اکتا جائیں گے۔

با ایں ہمہ راستہ کے مناظر سننے کا نتیجہ بھی بجز اس کے کچھ نہ ملے گا کہ ذرا دیر کے لئے کانوں کو مزہ آگیا ورنہ جہاں



بیٹھا ہے خود وہیں بیٹھا ہوا ہے نہ اپنی برابر سرکار اور نہ محلہ بلکہ اپنے گھر سے باہر نکلا اور دوسرا راستہ چل گیا ہے کہ مسافر بعد مغرب گاڑی میں سوار ہو کر کھڑکیاں بند کر کے سو گیا اور صبح کو آنکھ کھلی تو گاڑی لاہور کے اسٹیشن پر کھڑی ہے اس کو نہ یہ خبر کہ راستہ میں کتنے دریا آتے نہ یہ اطلاع کہ کس کس جنگل کو عبور کیا، نہ اس کو کوئی دقت نظر آیا نہ جھاڑیاں۔ نہ اُس نے سانپ بچھو دیکھے نہ مویشی درندے اس سے پوچھو کہ راستہ میں کون کون سے شہر پڑے اور کون کون سی بستیاں تیرے کچھ جواب نہ دے سکے گا۔ دونوں مسافر چلے دہلی سے اور دونوں پہنچے لاہور مگر تفصیلی سیر اور اجمالی سیر کا جو فرق دونوں میں ہے وہی فرق اہل مشاہدہ اولیاء میں اور اُس گروہ اولیاء میں ہے جن کو مطلق مشاہدہ نہیں ہوا۔ پہلے زمانہ میں تو خطرہ اور امن ہی کا فرق تھا کہ تفصیلی سیر میں قدم قدم پر جان و ایمان جانے کا اندیشہ ہے مگر اس زمانہ میں تو چونکہ توجہ الی اللہ ہی کا قحط ہے کہ وصول الی اللہ کا ذوق اور شوق ہی قلوب سے نکل گیا اس لئے برسوں میں طے ہونے والی مسافت بتقاضاء وقت ریل کی سواری میں بدل گئی اور اتنی غالب آگئی کہ سڑک اعظم گویا ویران ہو گئی اور اس راستہ کا اختیار کرنے والا مسافر خالی خالی رہ گیا۔ اسی طرح اس زمانہ میں سڑک و وصول الی اللہ کا طریق بھی یہی اجمالی سیر رہ گیا کہ آنکھیں بند کر کے خلوتوں میں ذکر مشغل کریں اور قلب میں اُس داعیہ محبت کے پیدا ہو جانے کی دعا مانگیں جو دامنِ محمدی سے وابستہ کر دے اور پھر ذاتِ محمدی کی قوتِ جاذبہ الی اللہ کشاں کشاں آستانہ حق جل جلالہ پر لا ڈالے۔ اس لئے اس دوسرے کو قلب میں ہرگز جگہ نہ دینا کہ شیخ عبد العزیز رحمہ اللہ جیسا غوث و مرشد جب اس وقت نظر نہیں آتا تو دروازہ سلوک و تربیت ہی بند ہو گیا۔ یا جب اپنے پیر میں یہ کمال موجود نہیں تو اس کی پیروی اور اپنی مریدی نفی ہے۔ یاد رکھو کہ اولیاء ہی کے لہاد پر دنیا کا لہاد موقوف ہے کہ جس دن یہ ہستیاں سطح زمین سے اٹھ جائیں گی نہ زمین باقی رہے گی نہ آسمان، سب ٹوٹ بھوٹ جائیں گے اور قیامت آ جائے گی۔ پس جب ہم دیکھ رہے ہیں کہ دنیا ابھی موجود ہے تو ماننا پڑے گا کہ اس کے ستون یعنی اولیاء اللہ بھی موجود ہیں البتہ طریق سلوک بدل گیا ہے کہ جس بزرگ کے واقعات تم مطالعہ کر رہے ہو وہ اُس جماعت کا فرد تھا جن کی سیر تفصیلی تھی اور اس زمانہ میں غلبہ اسلام اور فرط توجہ الی اللہ اور عمومِ رغبت الی الدین کی وجہ سے تفصیلی سیر میں عمریں صرف کرنا پیارا بھی معلوم ہوتا تھا۔ اس لئے اکثر طبعتیں اس کو برداشت کر جاتی تھیں۔ مگر اس زمانہ میں اول تو اس تجارتِ اخروی کام میں ہی نہیں رہا، اور اگر برائے نام ہے تو محبت گویا جزو طبیعت ہے کہ سودا خرید و اور گھر آ بیٹھو۔ راستہ کی سیر و تفریح کی نہ رغبت ہے نہ گنجائش اس لئے بالعموم اس زمانہ کے اولیاء اس دوسری جماعت کے ہیں کہ خود بھی اجمالی سیر کے مسافر بہر منزل مقصود پر پہنچے ہیں اور دوسروں کو بھی اسی اجمالی



سیر کا مسافر بنا کر منزل مقصود پر پہنچا رہے ہیں۔ لہذا تریز رگوں سے بدگمان ہوؤ اور نہ اپنا کام چھوڑو۔ بلکہ اللہ کا شکر کرو کہ ہم ضعتھاؤ کے لئے مختصر اور بے خطر راستہ نکال دیا۔

کارکن کار بگزار از گفتارہ کا ندیں راہ کار آید کار

دوسری بات یہ ہے کہ امت محمدیہ کے اہل حق علماء چونکہ نفع متعدی کے لئے جو چیز کئے گئے ہیں اس لئے عموماً ان کا طرق وصول الی اللہ یہی سیر اجمالی ہے کہ جو وقت تفصیلی سیر میں خرچ ہوتا وہ ڈرائیو اور گارڈ بن کر دوسروں کو لاہور تک پہنچانے میں گذرے۔ اس لئے اگر وہ راستہ کے مناظر عجیبہ سے ناواقف ہوں اور باہم اختلاف کریں کہ ایک کہے لاہور کے راستہ میں کوئی دریا نہیں پڑتا اور دوسرا کہے کہ متعدد دریا پڑتے ہیں، تو نہ ان کے لئے عجیب ہے نہ سبب نقص، بلکہ خوبی ہے کہ علامت ہے سیر اجمالی کی۔ پس اگر کوئی پیادہ مسافر اپنے مشاہدہ کی رو سے سب کی تغلیط بھی کر دے تو اصل مقصود یعنی ان کے لاہور پہنچنے بلکہ آرام اور جلد پہنچنے پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ چنانچہ حکیم الامتہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کو اگر مشاہدہ ملائکہ نہ ہوا اور اس بناء انہوں نے اس مشاہدہ کو نبوت کے لئے مخصوص فرما دیا تو ان کی عملی و علمی شان اور قرب من اللہ میں کوئی فرق نہ آیا خصوصاً جبکہ دنیا دیکھ رہی ہے کہ مدت ہوئے عالم برزخ میں پہنچ گئے مگر ان کی تصانیف حقہ کا بحر زہار لاکھوں پیاسوں کو سیراب کر رہا ہے اور ہزار ہا مادہ پرستوں کو خدا پرست بنا رہا ہے ہاں ذات محمدی جو مکمل جامع کمالات تھی اس لئے ضروری تھا کہ آپ کی امت مرحومہ میں اہل مشاہدہ یعنی تفصیلی سیر والے بھی پیدا ہوں لہذا ہوئے اور بہت ہوئے اور مقامی خطرات سے محفوظ رہ کر منزل مقصود پر پہنچے ہیں۔ اس لئے باغ محمدی کے رنگ برنگ پھولوں میں اگر کسی ایک پر نہ لیٹے ہو گئے تو دوسرے کو عیب دار بنا کر باغ سے باہر نہ بھیجے گا۔ اندیشہ ہے کہ تم ہی باغ سے باہر نہ نکال دیئے جاؤ۔

فرا غور کرو کہ نبوت کا دروازہ بند ہو گیا۔ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم عالم بقا میں تشریف لے گئے۔ قیامت تک عالم دنیا میں جتنے بھی واقعات و جزئیات کا حدوث ہو گا ان پر جواز و عدم جواز کا حکم لگانا اسی صحت کا ذمہ ہے جو نہ حکم لگانے میں مستقل ہے کہ بنی نہیں ہے اور نہ یہ کہہ سکتی ہے کہ مجھے معلوم نہیں کیونکہ ناسب رسول ہے، اور نہ عالم برزخ میں جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر سکتی ہے اب اس کے سوا راستہ کو نسا رہا کہ خیر القرون کے واقعات کو اصول موضوعہ قرار دیکر جزئیات حادثہ کا حکم اپنی عقل کے ذریعہ اللہ سے مستخرج کرے اور اصلاح عالم کا وہ کام انجام دے جو گزشتہ زمانہ میں ایک صاحب شریعت پیغمبر کے نائب فکر انبیاء معصومین نے انجام دیا تھا۔ لہذا باہم اختلاف ہونا بھی ناگزیر ہے اور ہر اختلافی صورت پر اجر ملنا بھی صحیح انبیاء سابقین کے احکام میں فرشتہ واسطہ حکم نبیا تھا اور اس لئے ان کی شریعتوں کا باہمی اختلاف



عین اتحاد تھا اور نائین خاتم الرسل کے احکام میں واسطہ حکم ان کی عقل و ذکاوت اور فہم و فراست کو بنایا گیا ہے لہذا ان کے اجتہادیات کا باہمی اختلاف عین اتحاد ہے واللہ اعلم

(۲۷) وَإِذْ النُّونُ إِذْ ذُكِّبَ مُنَا ضِيًّا فَظَنَّ أَنْ لَنْ يَنْقُذَ عَلَيْهِ تَذَكُّرُهُ كُرُوفِ النَّونِ (یونس علیہ السلام) کا جبکہ وہ چلے غصہ میں بھرے ہوئے اور خیال کیا کہ ہم ان پر قابو نہ پاسکیں گے میں نے حقیرت و مدوح سے عرض کیا کہ اپنے اوپر حق تعالیٰ کا قابو نہ پانے اور پروردگار کے احاطہ قدرت سے باہر نکل جانے کا گمان تو ضعیف ترین مسلمان بھی نہیں کر سکتا چہ جائیکہ نبی پھر سیدنا یونس علیہ السلام کے اس خیال کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا مَقْصِدًا کے معنی ہیں عَصِيًّا عَلَيْنَا یعنی اپنی قوم پر غصہ آیا کہ انہوں نے ایمان اور ان کی اطاعت کو اختیار نہ کیا جس میں ان کی فلاح و ہیودی تھی حتیٰ کہ ان پر اللہ کا عذاب سامنے آنے لگا ہوا کہ ان کے گھروں کے اوپر اسپر تھا جب سیدنا یونس علیہ السلام نے یہ دیکھا تو ان پر غصہ کرتے ہوئے کہ اچھا ہوا جیسا کیا ویسا بھرو (کشتی کی طرف چلیے اور قَطْلَ أَنْ لَنْ يَنْقُذَ عَلَيْهِ کا یہ مطلب ہے کہ ان کو خیال ہوا کہ جس ہم ان کو اسی عذاب سے ہلاک نہ کریں جس سے ان کی قوم کو ہلاک کیا یعنی عذاب الہی کی علامت دیکھ کر اس خیال سے بھاگے کہ بچ جائیں گے اور جو آفت قوم پر آنے والی ہے ان پر نہ آئے گی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسی ایک شخص کو آگ نظر آئے کہ سامنے سے چلی آ رہی ہے یا پانی کا سیلاب ہے کہ اُمڈا چلا آ رہا ہے اور جو بھی سامنے پڑ جائے گا وہ جلے یا ڈوبے بغیر نہ رہے گا پھر یہ سمجھ کر اس سے بھاگے کہ یہاں سے بھاگ جانا مجھے اس آگ یا سیلاب سے بچائے گا۔ یہی حالت سیدنا یونس علیہ السلام کی تھی کہ جب قوم پر عذاب کو اترتا ہوا دیکھا تو خیال کیا کہ ان میں موجود رہا تو اسی عذاب سے میں بھی ہلاک ہو جاؤں گا جس سے وہ ہلاک ہوں گے لہذا بھاگنے میں بچاؤ سمجھ کر وہاں سے فرار ہو گئے پس حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کی دوسری صورت دکھائی (کہ دنیا میں غرق ہوئے اور مچھلی نے نگل لیا) اور اندھیرے میں اپنے رب کو پکارا کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے بے شک میں قصور وار ہوں تب حق تعالیٰ نے ان کو نجات بخشی، اور یہ قصہ کہ شمس قدرت بنا اہل ذکر کے لئے اور میر بنا رجوع کرنے والوں کے لئے اور سیب تسلی بنا مصیبت زدگان کے لئے اور روزہ کھلا سالکین کے لئے کہ ارشاد ہوتا ہے فَتَجِيئُكَ مِنَ الْغَمِّ وَكَذَلِكَ نُجِي الْمُؤْمِنِينَ ان کو ہم نے نجات دی غم سے اور اسی طرح ہم نجات دیا کرتے ہیں مومنین کو، الحاصل سیدنا یونس علیہ السلام کا فرار قوم پر نازل شدہ عذاب سے بچ جانے کا خیال پر تھا نہ کہ قدرت خدا کو عاجز اور اپنے کو آقا کے احاطہ طاقت سے باہر سمجھنے کی خاطر۔

فہم مطلب یہ ہے کہ اسباب یقینیہ سے متاثر ہوتا مثلاً سیلاب یا آگ کا پہاڑ اپنی طرف آتا ہو دیکھ کر بھاگتا کہ ڈوب یا جل نہ جاؤں انسان کا طبعی فعل ہے غلبہ خوف میں اس پر نظری نہیں جاتا کہ بھاگتا گویا اپنے آپ کو



قدرت الہی سے باہر سمجھنا ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے بچ اپنے باپ کو غصہ میں قہجی اٹھاتا ہوا دیکھ کر کانپ اٹھے اور بھاگ کر گھر کے کونہ میں جا چھپے، تو بچ کو اس کا وہم بھی نہیں گذرتا کہ باپ کے قابو سے باہر نکل جاؤں۔ محض خوف و ڈر ہے اس کو سمجھا دیا ہے مگر باپ اس کو وہیں جا کر پکڑتا اور کہتا ہے تو نے یہ سمجھا کہ بھاگ کر جان بچا لے گا اور میں تجھے پکڑ سکوں گا۔ اسی طرح سیدنا یونس علیہ السلام کا فرار یہ تقاضا و خوف تھا نہ کہ قدرت حق کو عاجز سمجھ کر مگر اصل اشکال یہ ہے کہ اقتضا و طبعی پر عتاب نہ ہونا چاہیے۔ خصوصاً جبکہ آیت شریفہ سورۃ انبیاء کی ہے جس میں حق تعالیٰ نے اکثر مشاہیر انبیاء کے مناقب اور کمالات کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اول سید المرسلین سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی سیرت سکتی اور زار و نمودی سے نجات پاتے کا مفصل ذکر ہے اور پھر حضرت لوط حضرت اسحاق حضرت یعقوب حضرت نوح حضرت داؤد حضرت سلیمان اور حضرت ایوب حضرت اسمعیل حضرت ادریس اور حضرت ذوالکفل علیہم السلام کے محامد مذکور ہیں۔ ان کے بعد حضرت یونس علیہ السلام کا یہ قصہ منقول ہے اور ان کے بعد پھر حضرت زکریا حضرت یحییٰ اور حضرت مریم قبول علیہم السلام کے محاسن بیان کئے گئے ہیں لہذا سیاق و سباق چاہتا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی بھی اس قصہ میں کوئی خاص منقبت ہے۔ حالانکہ صورت واقعہ ایک غلطی کا ارتکاب ظاہر کرتی ہے۔ اور غلطی بھی وہ حکوفظن ان کن نقید علیہ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ اپنے آپ کو اللہ کے قابو سے باہر سمجھنا ادنیٰ ترین موجد کا بھی کام نہیں۔ سوانح محمدیہ میں حضرات صحابہ کا بھی ایک قصہ اسی قسم کا گذر چکا ہے کہ غزوہ حنین میں کثیر تعداد دشمنوں کے فوری حملہ سے ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور صرف انہی مہاجرین و انصار کے ہر چند کہ نبی نہ تھے مگر ان کی بھی گرفت ہوئی اور اس فرار عن الزحف کو حفاظت جان یا غلبہ خوف کا طبعی اثر قرار دیکر عذر نہیں سمجھا گیا۔ ہاں سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے مشاہدہ قدرت الہیہ میں کمال کا بیشک ثبوت دیا کہ تیارہ جانے پر بھی گھبرانا یا پیچھے قدم ہٹانا تو درکنار سواری سے بھی نیچے اتر گئے اور یہ رجز پڑھتے ہوئے انا البنی لا کذب انا ابن عبد المطلب دشمنوں کے زور سے گھسے چلے گئے چونکہ مقصود محض امتحان تھا اور وہ چند لمحات میں پورا ہو لیا کہ دنیا نے دیکھ لیا نبی کی شان کیا ہونی چاہیے اس لئے صحابہ بھی جو تتر بتر ہو گئے تھے اس طرح لوٹ پڑے جیسے پرند اپنے بچوں پر برا کرتا ہے اور نتیجہ جنگ کا وہی نکلا جو قدرت الہیہ پر نظر رکھنے کا نکلنا چاہیے کہ فتح ہوئی اسلام کی اور غلبہ ہوا مسلمانوں کو۔ مانا کہ شان محمدی متامی انبیاء و رسل سے ارفع و اعلیٰ ہے مگر نفس نبوت کا تقاضہ ہے کہ مشاہدہ قدرت الہیہ سے ایک لمحہ بھی کسی حال ذہول نہ ہو جیسا کہ نبوت کے اجزاء و سبب کی بحث میں مفصل بیان ہو چکا ہے حضرات صحابہ کے فرار مذکور میں بھی اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ کمال شان محمدی کا ظہور اسی پر موقوف تھا۔ اگر یہ فرار پیش نہ آتا اور حضرت



کو یہ منظر پیش نہ آتا تو دنیا کو معلوم کیسے ہوتا کہ اعتماد علی اللہ کیا چیز ہے اور بحالت اضطرار جبکہ موت سامنے آکر ہی ہو قدرت الہیہ پر نظر رکھنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا شان ہے۔ گویا امتحان محمدی کا مقدمہ اور موقوف الیہ تھا اس لئے وہ خطا جو منظرِ شان محمدی اور سبب ارشاد و ہدایت خلق بنی ہو عجب نہیں عند اللہ صواب اور من جلد ان سیئات کے قرار پائے جنکو بروز قیامت حسنت بنایا جائے گا۔ الحاصل سیدنا یونس علیہ السلام کا یہ قصہ خصوصاً اور دیگر انبیاء علیہم السلام کے وہ قصے عموماً جن پر حق تعالیٰ کا عتاب ہوا ہے چونکہ اکثر موجب غلبان ہوا کرتے ہیں اس لئے دل چاہتا ہے کہ اپنی فہم کے موافق کچھ عرض کروں اِنْ کَانَ صَوَابًا فَمِنْ اِلٰہِ وَاِنْ کَانَ خَطَاً فَمِنْیْ وَرَاحِیْ سب سے مقدم سمجھنے کی بات یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں جس کا یہ مطلب ہے کہ ان سے نبوت سے پہلے بھی ہر قسم کی معصیت کا صدور محال ہے۔ اور بات بھی معقول ہے کہ نافرمانی کا وقوع غفلت پر موقوف ہے اور جس کے لئے شاہدہ دائمی ہوا اور وہ ہر وقت حق تعالیٰ شانہ کے سامنے حاضر اور دست لیتہ کھڑا ہو کیسے ممکن ہے کہ ذرہ برابر بھی نافرمانی کرے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں جگہ جگہ اس مجسم نور جماعت کی غلطیوں کا اور ان پر عتاب و گرفت کا تذکرہ ہے۔ پس اگر وہ غلطیاں نہیں تو عتاب کیسا، اور اگر عتاب صحیح ہے تو عصمت کیسی۔ اس لئے حقیقت سمجھ لو کہ معصیت وہ ہے جو ظلمت و تاریکی سے پیدا ہو اگرچہ صورت طاعت کی لئے ہو۔ مثلاً منافقین کی نمازیں اور روزے ان کا منشا چونکہ مسلمانوں کو دھوکا دینا اور اسلام کا مذاق اڑانا تھا اس لئے صورتِ اگرچہ پیاری عبادتیں ہیں مگر حقیقتِ بدترین معصیتیں ہیں۔ اسی طرح جس کا حدیث کسی نور سے ہوا ہو اگرچہ وہ صورتِ معصیت لئے ہوئے ہو مگر علین طاعت کے حکم میں ہے جیسے مغلوب الحال اولیاء کی غلطیاں اور چرواہہ کا وہ قصہ جس کو مولانا رومی نے مثنوی میں نقل فرمایا ہے۔ مگر اس کی علامت یہ ہے کہ صورتِ خطا کا علم ہوتے ہی گریہ و زاری کا وہ اثر مرتب ہو جو حقیقی معصیت کے مرتکب پر ہونا چاہیئے اور اول الذکر کی شناخت یہ ہے کہ حقیقتِ خطا کا علم ہونے پر بھی وہی سکون اور جرات و دیدہ دلیری ہو جو مطیع و صائب الرائے میں ہوتی چاہیئے۔ اور یہی وجہ ہے کہ انجام ہر دو فریق کا حقیقت کے موافق ہوتا ہے کہ صورتِ معصیت پر جس کا منشا نور ہے من جناب اللہ برکات و کامیابیاں مرتب ہوں گی اور صورتِ طاعت پر جس کا منشا ظلمت ہے ان جام کا رعب و عذاب و خزان اور دنیا و آخرت کی رسوائی مرتب ہوگی۔ الحاصل حضرات انبیاء علیہم السلام سے حقیقتِ معصیت کا نہ کبھی صدور ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ان کے قلوب میں ظلمت اور غفلت کا نام ہی نہیں جو سبب بنتا ہے معصیت کا۔ البتہ ان کی اطاعت کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کی صورت بھی حقیقت کے مطابق طاعت ہی کی ہوتی ہے اور بیشتر و عموماً ان کی طاعتیں اسی نوع کی ہیں۔ دوم وہ جو حقیقتِ طاعت ہیں مگر



صورت خطا کی لئے ہوئے ہیں، اور وہ نسبت بہت کم ہیں۔ مگر میں ضرور۔ اور ان کا ہونا ایک درجہ میں ضروری بھی ہے کہ بعض منافع اخروی ان ہی پر موقوف ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ اگر مخلوق گناہ نہ کرتی تو میں ان کو ہٹا کر دوسری مخلوق پیدا فرماتا جس سے گناہ صادر ہوں اور میں ان کو بخشوں، یعنی غفور کا منظر ہونا بھی ضروری ہے اور ظاہر ہے کہ مغفرت کے قابل وہی گناہ ہے جس کی ندامت و بے چینی ترکیب کے قلب میں موجود ہو۔ اور یہ داعیہ اُسی نور ایمان کا ہے جس نے قلب میں نور ڈال رکھا ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ وہ خطا جو نور معرفت قائم رہتے ہوئے صادر ہو مستحق مغفرت ہے کہ توبہ پر مجبور کرے گی، بلکہ من و چہ مطلوب ہے کہ غفور کی شان مغفرت کا ظہور اسی پر موقوف ہے۔ اور یہی راز ہے حضرت آدم کے مسجد ملائکہ اور حضرات انبیاء کے فرشتوں سے افضل و بہتر ہونے کا کہ ملائکہ میں صرف ان طاعتوں کا وجود ہے جو صورت و حقیقت دونوں طرح اطاعت ہیں اور اس لئے وہ ان طاعتوں کے برکات سے محروم ہیں جن کی صورت معصیت کا ہے۔ اور حضرات انبیاء علیہم السلام درجوں قسم کی طاعتوں سے مالا مال ہیں اور اس میں عجیب نہیں راز یہ ہے کہ غلام کی غلامی اور محب کی محبت آزمانے کے لئے مارا اور پیار دونوں کی حاجت ہے۔ کیا ضرور ہے کہ کوئی پیار کے وقت خدمت کر رہا اور محبت جبار بنا ہو تو وہ مار کے وقت بھی ایسی ہی خدمت کرتا رہے اور ایسا ہی آستانہ یوس اور دلدادہ بنا رہے، بلکہ سچ پوچھو تو امتحان کا موقع ہے صرف یہ ہے کہ بے رُخی برت کر بلکہ غصہ و عتاب کی صورت دکھا کر آزمایا جائے کہ اب مدعی محبت کا کیا رنگ ہے۔ کیونکہ کسوٹی ہی بتلا سکتی ہے کہ سونا کھرا ہے یا کھوٹا۔ میرا مطالبہ یہ ہے کہ ہمارے اذہان نے اس کو پہلے سے قبول کیا ہوا ہے کہ عتاب الہی کسی بڑی خطا کی سزا ہے اور اس لئے جس وقت بھی ہم حق تعالیٰ کے عتاب کا لفظ سنتے ہیں تو ذہن اس جرم و خطا کی تلاش میں دوڑنے لگتا ہے، اور پھر عصمت سے اس کا مزاحم ہوتا ہے تو تاویلوں کا دروازہ کھلتا اور پھر ساتھ ہی ساتھ شبہات و شکوک کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں اس لئے ذرا دیر کے لئے اس سے خالی الذہن ہو جائیں گے تو انشاء اللہ واضح ہوگا کہ حق تعالیٰ کا برتاؤ اپنے محبوبین کے ساتھ جدا ہے اور بیغضین کے ساتھ جدا۔ عوام کے ساتھ جدا ہے اور خواص کے ساتھ جدا۔ خود عذاب جہنم جو سب سے بڑی سزا ہے کفار کے لئے تعذیب ہے۔ مگر گنہگار مومنین کے لئے تہذیب و تصفیہ یعنی سونے کا سیل کچیل صاف کرنے کے لئے تپاتا ہے کہ دخول جنت کے قابل ہو جائیں۔ گویا دشمنوں کے لئے جو شے سزا و نعمت ہے وہی دوستوں کے لئے رحمت اور نعمت ہے اسی طرح دنیوی تکالیف بمقتضا و ما اصابکم من مصلیٰ فیما کسبت ایدیکم نہ گناہگاروں کے لئے پاداش ہے بد اعمال کی، اور اولیاء کیلئے یہی لطف الہی اور سبب ترقی درجات ہے۔ فقر و تنگدستی مجاہدین کے لئے سبب کفر ہے اور مقربین کے لئے وہی موجب فخر و سبب قبیل الی اللہ۔ طاعون ایک عذاب دنیوی ہے اللہ کی طرف سے، مگر صرف طلباء کے لئے اور یہی صلحاء کے لئے شہادت و پروانہ مغفرت ہے



اسی طرح عتاب خداوندی عوام کے لئے بے شک ثمرہ خطا و معصیت ہے کہ ان کے قلوب میں ظلمت ہے۔ لہذا ان کے افعال میں بھی ظلمت ہے مگر خواص یعنی انبیاء و معصومین کے لئے ثمرہ خطا نہیں بلکہ امتحان ہے ان کی محبت کا کہ مستجاب الدعاء اور مطاع قوم بن کر شانِ محبوبیت ظاہر کی ہے، تو بے رنجی پر تڑپیں اور گریہ و زاری دکھا کر محبت کا سماں دکھائیں اور تکمیل ہے تبلیغ کی رجا و رحمت الہیہ کا عملی نمونہ دکھایا ہے، تو خوف اور سخت الہی کا بھی عملی نمونہ پیش کریں تاکہ مخلوق کو معلوم ہو کہ اللہ سے اور اس کے عتاب سے ڈرنے کی حقیقت کیا ہے نیز اصلاح و ہدایت ہے اُمتِ اجابت کے لئے کہ واضح ہو جائے صاحبانِ معجزات و ہادیانِ دنیا و آخرت خدا ہیں خود خدا نہیں اور فاضلِ انعام و لطف ہے انبیاءِ معتبورین کے لئے تاکہ اُن رحمتوں سے مستفیض ہوں جو موقوفہ ہیں، اسی تڑپیں اور آہ و ناری پر کہ بچہ کو بیلانے پر ماں کی چھاتیوں کے دودھ میں جو اُبال آتا ہے وہ اس کے لاڈ پیارا اور تبسم و سرور کے وقت کبھی نہیں آتا اور یہی وجہ ہے کہ عتاب کے بعد جو ثمرات ہوتے ہیں وہ تقربِ مقبولیت عند اللہ کے بڑھانے والے اور دین و دنیا دونوں میں موجبِ برکات و ترقیات ہوتے ہیں۔ جنگِ بدر میں سرِ سردارِ قریش قتل ہوئے جن کی بوقیاس قلیب بدر میں بھینک دی گئیں اور ستر گرفتار ہوئے جن کو قیدی بنا کر مسجد نبوی کے ستونوں سے باندھ دیا گیا سگلے دن سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ فرمایا کہ ان کو مالی فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے یا قتل کیا جائے حضرت صدیقؓ اور اکثر صحابہ کی رائے اس جانب تھی کہ فدیہ قبول کر لیا جائے اس لئے کہ اس وقت مسلمانوں کو سامانِ حرب کی زیادہ ضرورت تھی مال سے اسلام کو قوت پہنچے گی اور ممکن ہے کہ اسیرانِ جنگ جاں بخشی پر از خود مسلمان ہو جائیں۔ اور اگر پھر بغاوت کریں گے تو جس خدا نے آج ان کو مغلوب بنایا ہے وہی کل کو ہماری مدد فرمائے گا مگر حضرت عمرؓ اس جانب تھے کہ میں اُن کے بارہ میں ترمی نہ کرنا چاہیے ہر شخص اپنے عزیز کی گردن اڑائے تاکہ معلوم ہو جائے کہ ہم لوگ اسلام پر کس قدر رنجتہ ہیں ہمیں اللہ و رسول کے مقابلہ میں اپنے عزیزوں کی بھی پرواہ نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ رحمۃ اللعالمین تھے اس لئے آپ کا میلان خاطر صدیقی رائے کی طرف ہوا اور اور تمام قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا اس پر حق تعالیٰ کی طرف سے عتاب ہوا کہ قتل پر مال دنیا کو ترجیح دینا مناسب نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ قیدیوں کا ر ہا کرنا اور فدیہ اسلام ہی کے مصالح پر مبنی تھا۔ مال کی طرف رغبت ہوئی بھی تو تقویتِ اسلام کے لئے پھر مسکے اجتہادی تھا کہ پہلے کوئی حکم نہ تھا جس کا خلاف ہوا ہو بلکہ مشورہ پر ہی چھوڑا ہوا تھا اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ عتاب کا سبب خطا کو قرار دیا جائے اور فدیہ لینے میں نقائص ثابت کرنیکی کوشش کی جائے نیز دوسرے پہلو یعنی انجام و نتیجہ پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ بھی برکات سے پریز نظر آتا ہے کہ جو رقم فدیہ میں آئی وہ کار ہائے خیر اور صدقات جاریہ میں صرف ہوئی۔



اور جتنے قیدی رہا کئے گئے وہ سب مشرف بہ اسلام ہوئے۔ یعنی ایک متنفذ بھی اسلام لانے سے محروم نہ رہا۔ اگر فدیہ لینا خطا و مجرم تھا تو اللہ کی ناراضی سے حاصل کئے ہوئے مال کا اول تو استعمال ہی جائز نہ ہوتا اور اگر چشم پوشی بھی ہوئی ہوتی تو اس میں برکت کبھی نہ ہوتی۔ اسی طرح جن نفوس کی جان بخشی پر حق تعالیٰ کی نافرمانی ہوئی وہ اول تو صیغہ سے زندگی نہ گزار سکتے اور اگر اس بارہ میں سماعت بھی ہوتی تو اسلام کی توفیق ہرگز نہ ہوتی۔ بہر حال ابتداء اور انتہا دونوں بتا رہے ہیں کہ عتاب نہ خطا کی سزا میں ہے، اور نہ گرفت کسی مجرم کے ارتکاب میں۔ بلکہ انعام کی تکمیل ہے کہ اسی جنگ بدر میں دنیا کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت دکھائی آسمانی فوج کے پانچ ہزار فرشتوں کا لشکر آتا کر کہ تین سو تیرہ مسلمانوں کو فتح مبین نصیب ہوئی ایک ہزار کافروں پر۔ اب دنیا کو آپ کی محبت دکھائی جائے فدیہ لینے پر گرفت و عتاب کا رنگ دکھا کر اور زار و قطار لڑا کر تاکہ دوبارہ ابر رحمت میں جوش آوے اور لئے ہوئے اموال اور چھوڑے ہوئے نفوس کو خیر مجسم اور وسیلہ خیرات بنایا جائے۔ کہ ان کی نسل میں لاکھوں مسلمان اور ان کی تبلیغ و تعلیم سے تاقیامت کافراں مومنین، صالحین پیدا ہوں۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت عتاب کے نزول پر روئے اور جب حضرت عمر سامنے آئے تو فرمایا اگر آج اللہ کا عذاب نازل ہو جاتا تو بجز عمر کے کوئی نہ بچتا۔ وہ محبوب پیغمبر جس کے بستی میں ہوتے ہوئے کافروں پر عذاب نازل نہ ہو آج اللہ کی بے نیاز ذات سے خائف ہو کر یوں کہتا ہے کہ اگر اللہ کا عذاب نازل ہوتا تو میں بھی نہ بچتا یہ ہے وہ کمال عبدیت جس پر محبوب کی طرف سے رحمت کی بارشیں ہوا کرتی ہیں۔ تمامی انبیاء علیہم السلام کی کم و بیش یہی شان ہے کہ مختلف صورتوں پر بصورت عتاب ان کا گریہ و اضطراب جانچا گیا ہے اور پھر جدید و مزید نعمتوں سے ان کو نوازا گیا ہے اسی قبیل سے سیدنا یونس علیہ السلام کا یہ قصہ ہے کہ حسب عادت انبیاء آپ نے اپنی قوم کی اصلاح و نلاح میں مدتوں کوشش کی مگر قوم اپنی ہند سے باز نہ آئی تو تنگ آکر آپ نے بددعا فرمائی چنانچہ عذاب نازل ہوا۔ مگر سروسے کچھ اوپر پہنچ کر مقیم کیا کہ اس میں امتحان کے متعدد مصالح مضمر تھے سیدنا یونس علیہ السلام کو طبعی خوف یا موت کا ڈر نہیں کہ یہ تو کہ یہ تو اولیاء کو بھی کم ہوتا ہے بلکہ عذاب الہی سے ڈر لائق ہوا کہ اللہ کا عذاب واقعی ڈرنے کی چیز ہے خصوصاً عارف کے لئے کہ جتنی معرفت سطوت الیہ زیادہ ہوگی اسی قدر عذاب الہی سے دور بھاگے گا۔ اور ہر قوم پر غصہ کہ جلد ہلاک ہوں اس کا متقاضی تھا کہ جب تک نبی اپنی قوم میں رہتا ہے اس پر عذاب نازل نہیں ہوتا۔ لہذا بستی سے خود باہر تشریف لے جائیں تو مانع عذاب ستون علیحدہ ہو۔ چنانچہ آپ روانہ ہو گئے اور فوراً آپ کا وہ امتحان شروع ہو گیا جو سنیہ حضرات کا ہوتا رہا ہے کہ گرفت ہو گئی یہاں سے قدم کیوں ٹہایا؟ اچھا یہ سمجھا کہ بستی سے باہر قابو نہ پاسکیں گے اور لفظی ہی گرفت نہیں بلکہ عملی مواخذہ بھی ہوا کہ آپ کو مچھلی کے پیٹ میں پہنچا یا گیا اور آپ کی قوم



کا ایمان قبول فرما کر آیا آدایا عذاب اُن سے اٹھایا یہ دنیا میں پہلا موقع تھا کہ نازل شدہ عذاب واپس ہوا اور یہ بھی پہلا ہی واقعہ تھا کہ خطا دار قوم نے رہائی پائی اور جس معصوم کی یہ دعا سے اُن پر عذاب آیا تھا وہ خود پکڑے گئے۔ مگر چونکہ صورت عذاب و گرفت میں پیارا اور رحمتیں مضمین تھیں اس لئے حضرت یونس علیہ السلام پر وہ گریہ زاری طاری ہوئی کہ حقیقی خطا دار پر اس کا عشر بھی طاری ہو جائے تو ولی بن جائے۔ لہذا یہ قصہ اتنا منہج حنات ہوا کہ قیامت تک ہونیوالے مومنین کو بارگاہ احدیت سے وکزائدک نئی المومنین کا پروانہ عطا فرما دیا گیا اور تجربہ بھی ہے کہ آیت کریمہ کا ورد سخت مشکلات میں سبب کامیابی ہے واللہ اعلم (۲۱) **هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَكُوْكَرَةُ الْمُشْرِكِيْنَ ۝**

”وہی اللہ ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دیکر بھیجا تاکہ اسے تمامی ادیان پر غالب کرے اگرچہ مشرکوں کو برا لگے۔“ میں نے حضرت ممدوح سے دریافت کیا کہ دین اسلام کو تمامی ادیان پر غلبہ بخشے سے کیا مراد ہے آیا ناسخ ہونے کے لحاظ سے غلبہ مراد ہے، یا حجت و دلیل کے واضح ہونے کی حیثیت سے، یا اور کسی اعتبار سے؟ فرمایا کہ اس دین مقدس کو حق تعالیٰ نے تمامی ادیان پر ہر وجہ سے غلبہ بخشا ہے۔ ناسخ ہونے کے لحاظ سے بھی، اور وضوح حجت ہونے کے اعتبار سے بھی، اور سطح زمین پر اس کی کثرت کے لحاظ سے بھی، کہ اہل اسلام کی شمار کے سامنے دوسرا اہل مذاہب بمنزلہ نہ ہونے کے ہیں چنانچہ حق تعالیٰ نے جس کی چشم بصیرت کھول دی ہے اور اس نے سطح زمین کے آباد اور غیر آباد مقامات کو دیکھا ہے تو اس کو ہر جگہ ایسی جماعت نظر آئی ہے جو اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور وہ دین محمدی پر ہیں کہ زمین بھر اللہ ان حضرات سے آباد ہے۔ واللہ اعلم میں بھی موجود ہیں اور دارلکفر میں بھی۔ غاروں میں بھی پہاڑوں میں بنوں میں بیابانوں میں، بستیوں میں جنگلوں میں غرض ہر جگہ موجود ہیں۔ ایک خصوصی شان اس دین اسلام کی خدا ہمیں اس میں شامل رکھے یہ ہے کہ اس میں ایک نور ہے جو امت مرحومہ کو ارتداد اور کفر کی طرف جانے سے مانع ہے اور یہ صفت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت کی وجہ سے ہے کہ حق تعالیٰ کو آپ کے ساتھ خاص محبت ہے لہذا آپ کے دین میں بکثرت ایسی خصلتیں جمع فرمادی ہیں کہ ان کا مجموعہ آپ کی امت کے لئے اتنا دے مانع و محافظ بن گیا ہے بر خلاف دیگر مذاہب کے کہ ان میں ارتداد سے بچانے والی خصلتیں پوری نہیں آئیں نیز آپ نے فرمایا کہ جس نے لوح محفوظ کو دیکھا اور اس میں حضرات انبیا اور ان کی شریعتیں پر جو اس میں موجود ہیں نظر ڈالا ہے تو اس کو شریعت محمدیہ کا رتاقیامت، بقا اور امت محمدیہ کا عدم ارتداد (کہ ساری امت کفر کی طرف دوسری امتوں کی طرح کبھی نہ لوٹ سکے گی) معلوم ہوا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اول پیدا فرمایا نور اور ظلمت کو اس کے بعد پیدا فرمایا نبدوں کو اور امتوں کو۔ پھر نور کے بھی متعدد دروازے رکھے کہ ان کے ذریعہ وہ نور ان امتوں کے



اجسام تک پہنچیں۔ اور ظلمتوں کے بھی متعدد دروازے رکھے کہ ان کے راستہ وہ ظلمت بندوں کی ذات پر داخل ہو۔ اس کے بعد شریعتیں بنائیں اور وہ پیغمبروں کو عطا فرما کر دنیا میں بھیجیں۔ تاکہ ان کے ذریعہ نور دروازے کھلیں اور ظلمت کے دروازے بند ہوں یعنی اوامر (مثلاً نماز روزہ وغیرہ) کے کرنے سے نور کے دروازے کھلتے ہیں اور نواہی (مثلاً زنا سرقت کذب و کبر وغیرہ) سے بچنے پر ظلمت کے دروازے بند ہوتے ہیں اور یہ امر و نواہی جس کثرت اور تفصیل کے ساتھ شریعت محمدیہ میں آئے ہیں کسی دوسری شریعت میں نہیں آئے یہی وجہ ہے شریعت محمدیہ کے تمامی سابقہ شریعتوں سے بالا و بہتر ہونے کی۔ اور یہی وجہ امت محمدیہ کے تمامی گزشتہ امتوں سے افضل و برتر ہونے کی۔ اور اسی کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے اس ارشاد میں کہ میری امت کبھی گمراہی پر جمع نہ ہوگی نیز حضرت ممدوح نے فرمایا کہ اہل مشاہد نے جب اُمم سابقہ پر نظر ڈالی اور جن لہستوں میں وہ اپنے اپنے زمانہ میں رہا کرتے تھے ان پر نگاہ کی ہے تو ان کی لہستوں کے اوپر دھویں کی طرح ایک سیاہ بادل چھایا ہوا نظر آیا ہے کہ آہستہ آہستہ وہ نیچے اترتا ہے اور پائے اپنا دین چھوڑتے جاتے ہیں حتیٰ کہ وہ ان پر آگرتا ہے اور ان کی ذات اس سے میراب ہو جاتی ہے اور سب کے سب اپنے دین سے خارج نظر آتے ہیں اور پھر کبھی ان کو ہدایت بھی نہیں ہوتی۔ دین اسلام کے دیگر ادیان پر غالب ہونے کی ایک وجہ منجملہ دیگر وجوہات کے یہ بھی ہے کہ دنیا بھر کے مذاہب میں کسی کو بھی بے نیچے بجز چند مامورات اور چند منہیات کی مختصر فہرست کے جن کو پڑھنے والا چند گھنٹوں میں سیکھ لے اور کچھ بھی نہیں ہے مگر شریعت محمدیہ کے دریائے ناپید کنار پر نظر ڈالئے تو علم کلام و علم فقہ و علم تصوف تینوں کی ضخیم کتابیں اسی فہرست مامورات و منہیات سے بھری ہوئی ہیں کہ آغوش مادر میں آنے کے وقت سے لے کر آغوشِ محمد میں جانے تک انسانی زندگی کا کوئی فعل کوئی قول کوئی حرکت کوئی سکون ایسا نہیں چھوڑا جس میں یہ ظاہر نہ فرما دیا ہو کہ اس کو کرنا چاہیے اور اس سے بچنا چاہیے۔ پھر صرف اتنا ہی نہیں بلکہ مامورات میں فرض، واجب، سنت، مستحب چار درجے قائم نہ کر کے نور کی مقدار بھی بتا دی کہ کدو بہتر ہے، کدو ضرور کرو، ضرور بالضرور کرو۔ اسی طرح منہیات میں حرام، مکروہ تحریمیہ، اور خلافتِ اولیٰ کے تین درجے قائم فرما کر ظلمت کی مقدار ظاہر کر دی کہ اچھا ہے مکروہ، ہرگز مکروہ، ہرگز مکروہ پاس نہ پھینکو۔ اول ایمان کے پانچ اجزاء کے عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت اور ہر ایک کے ماتحت صد باب فصول۔ کہ عقائد متعلقہ ذاتِ بحت متعلقہ صفاتِ الہیہ متعلقہ رسالت وغیرہ اور ہر ایک میں ثقیلہ و خفیفہ کے دو درجے ہیں عبادات میں ارکانِ اربعہ کی تفصیل اتنی لمبی ہے کہ عمر ختم ہو جاتی ہے مگر فہرست پوری یاد نہیں ہوتی شرائطِ الگ ہیں ارکانِ جُدا۔ مستحباتِ الگ ہیں واجباتِ جُدا۔ مکروہاتِ الگ ہیں اور مفسداتِ جُدا، پھر سر سے لے کر پاؤں تک بدن کا کوئی عضو کیوں نہ ہو ہر ایک کے لئے خاص عبادت ہے



جس کا وہ مامور ہے اور خاص معصیت ہے جس سے وہ روکا گیا ہے۔ معاملات کی فہرست تو اس سے بھی بیش از بیش  
 ہے کہ بادشاہ سے لے کر بھکے بکے فقیر تک جس طبقہ کا جو شخص بھی اپنی گزران کا کوئی طریق اختیار کئے ہوئے  
 ہے یا کر سکتا ہے خواہ تجارت ہو یا زراعت، اور حرفہ ہو یا صنعت، اور پھر ہر ایک کے ماتحت صد ہا اقسام ہیں مگر  
 کوئی ایک معاملہ بھی ایسا نہیں جس پر شریعت نے امر یا نہی مرتب نہ فرمادی ہو۔ پھر اخلاق میں تخیلات و شامک اور  
 عادات و خصائل کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس کو اندراج فہرست سے چھوڑ دیا گیا ہو بلکہ صرف بتا دینا ہی نہیں ذمہ  
 سے بچنے کی تدبیر اور حمیدہ سے آراستہ ہونے کا طریق بھی تعلیم کیا ہے۔ اسی طرح معاشرت میں دنیا کے ہر باشندے  
 بلکہ حیوانات و نباتات اور مجادات غرض تمامی مصنوعات عالم کے ساتھ جس قسم کا بھی برتاؤ انسان کر سکتا ہے  
 ایک بھی ایسا نہیں جس پر امر یا نہی کا حکم لگاتے میں فرد گزاشت ہوئی ہو۔ اور متعجب العقول کمال یہ ہے  
 کہ موجودات و واقعات ہی نہیں بلکہ فرضیات تک کی بھی یہی تفصیل ہے کہ انسان کا متخیلہ محال سے محال جز  
 ذہن سے اختراع کرتا ہے، مگر ناممکن ہے کہ شریعت محمدیہ اس پر جواز یا عدم جواز کا حکم نہ لگائے۔ حقیقت  
 شریعت محمدیہ کا یہ دائرہ فہم ابواب نور و ابواب ظلمت آنا و سیمع ہے کہ امت محمدیہ کے دس بیس افراد  
 نہیں بلکہ اول اس کے تین حصے بنائے۔ کلام وفقہ و تصوف اور ہر حصہ کو جدا گانہ فن قرار دیکر ہزار ہا افراد کی محنت  
 نے اس کی تفصیل کا بار اپنے سر لیا ہے اور وفات محمدیہ سے اب تک اس کی شرح کرتے چلے آئے ہیں مگر پورا نہیں  
 کر سکتے دنیا بھر کے مذاہب کی تمامی فہرستہائے امر و نہی کو جمع کر کے اسلامی فہرست سے مقابلہ کرو تو ایک کا کروا  
 حصہ بھی نہیں بن سکتا۔ مگر افسوس ہے ہم احسان فراموش امتیوں پر کہ یہی ملال و حرام کی تفصیل جو شریعت محمدیہ  
 کا مایہ ناز ہے ہماری نظر میں زنجیریں ہیں اور اس کو نہ ہی عس و سخت گیری سمجھتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی  
 اس امتیازی شان کو تفصیل سے دیکھنا چاہو تو میرا رسالہ ماتہاب عرب دیکھو جس کی قیمت ۴۰ روپے ہے۔  
 (۲۲) وَمَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَعُوذَ فِتْحًا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ وَرَبُّنَا ۚ اور ہمیں شاید انہیں کہ اس طریقہ کفر  
 میں لوٹ جائیں۔ البتہ ہمارا پروردگار اللہ ہی اگر چاہے (تو ہم مجبور ہیں) میں نے دریافت کیا کہ سیدنا شعیبؑ  
 کا یہ استثناء فرمانا کیسا جبکہ یہ شک اور حالت موجودہ پر استدلال نہ ہونے کو مقتضی ہے فرمایا یہ ریشیت الہیہ پر  
 محمول کرنا، محض رجوع الی اللہ ہے۔ اور یہی خالص ایمان ہے۔ کیونکہ اہل مشاہدہ خصوصاً رسل و  
 انبیاء دیکھتے ہیں کہ ان میں اللہ ہی کا فعل کام کر رہا ہے اور اپنے اندر ذاتی طور پر نہ کسی کام کی طاقت  
 سمجھتی ہیں نہ باز رہنے کی قوت۔ اور جو کچھ بھی ان کی ذات پر ظاہر ہو رہا ہے وہ سب اللہ پاک ہی کی طرف  
 سے ہے پس ایسی حالت والا شخص جب اللہ کی مشیت پر کوئی فعل محمول کرے تو ظاہر ہے کہ درجائے  
 معرفت میں غرق ہے اور ایمان ہو یا کفر سب پر اللہ کی قدرت و مشیت کو غالب سمجھتا ہے، اور یہ ایمان



اعلیٰ درجہ ہے (۲۳) اہل اعراف کے بارہ میں آپ نے فرمایا کہ وہ بڑے مرتبہ والے اہل مشاہدہ حضرات ہیں جیسے فلاں غوث اور فلاں قطب، جنت میں ان کے لئے اونچے اونچے محل ہوں گے جیسے ہمارے شہر فاس میں اونچا منار ہے کہ اس پر چڑھ کے جھانکتے ہیں تو نیچے کی آبادی سب نظر آتی ہے ان کے منازل عالیہ ہی کا نام اعراف ہے (امام جلال الدین نے اہل اعراف کے متعلق بدور سافرہ میں مختلف اقوال نقل کئے ہیں منجملہ ان کے یہ قول بھی ہے کہ وہ حضرت حمزہؓ و دیگر شہداء ہیں واللہ اعلم) (۲۴) **وَإِلَىٰ يُوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ إِنَّنِي كَافِرٌ بِالْعِصْيَانِ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ** اور فکر کرو ایوب کا جبکہ انہوں نے پکارا اپنے رب کو کہ مجھے آجھوا تکلیف نے (اسے دور فرما دیجیے) اور آپ سب سے زیادہ مہربان ہیں، میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ وہ تکلیف کیا تھی جو حضرت ابوب علیہ السلام کو پہنچی۔ اور مفسرین نے حضرت ممدوح کے مرض کی بابت جو کچھ لکھا ہے (کہ فساد خون اور بدن کے ہر حصہ میں زخم وغیرہ ہوئے) کیا وہ صحیح ہے؟ اور ایسے ہی آپ کے مرض کا امتداد (کہ مدت دراز تک رہا) کیا درست ہے؟ چنانچہ علامہ ابن حجر نے الفتح فی احادیث الانبیاء میں حالات سیدنا ایوب کی بحث میں جو بیان کیا ہے وہ سب میں نے سنا دیا فرمایا وہ تکلیف جو سیدنا ایوب علیہ السلام کو پہنچی توجہ الی غیر اللہ تھی۔ اور عارفین لعینہ انبیاء و مسلمین کے نزدیک سب سے بڑی تکلیف یہی ہے اور اسی کے رفع ہونے کی حضرت ممدوح نے اپنے رب سے دعا مانگی تھی نہ کہ بدنی تکلیف کی کہ وہ توبہ کو اللہ کا مقرب بناتی ہے۔ ہاں التفات الی ماسوی اللہ کہ خدا کو چھوڑ کر دوسری طرف توجہ و دھیان جائے اور اللہ سے ایک لحظہ کی بھی بے تعلقی بیشک اللہ سے دور کرنے والی تکلیف ہے، رہا وہ مرض جس کا تذکرہ مفسرین و مومنین نے کیا ہے آپ کو مطلق نہیں ہوا۔ اور مدت مرض بھی صرف دو مہینہ اور چند روز ہے پس جسمانی مرض کے رفع ہونے کی آپ نے دعا نہیں مانگی کہ وہ تو سبب قرب خدا ہے البتہ اس تکلیف بدنی میں جب اس کا اندیشہ ہوا کہ خیال بٹے گا اور علاج و تدبیر وغیرہ کی طرف دھیان جائے گا تو اس کے رفع ہونے کی دعا ضرور مانگی تھی خواہ وہ اس طرح مانگی جائے کہ جسمانی مرض ہی نہ رہے جو سبب دھیان ہونے کا یا مرض بدستور رہے مگر توجہ الی اللہ میں فرق نہ آئے اور دھیان دوسری طرف نہ جائے واللہ اعلم)

(۲۵) **وَمَنْ أَمْسَرَ ضَعْفٌ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَكَحْشًا كَذِبًا لِقَائِهِ أَعْمَى** اور جو بے رُخی کرے گا میری یاد سے تو اس کی معیشت تنگ ہوگی اور ہم اس کو حشر کے دن اندھا اٹھائیں گے، میں نے عرض کیا کہ اس تنگی معیشت سے کیا مراد ہے اگر تنگدستی مراد ہے تو مشاہدہ کے خلاصہ ہے کہ بہترے کفار مالدار ہیں ان کی معاش فراخ ہے نہ کہ تنگ اور آیت شریفہ چاہتی ہے کہ جو بھی ذکر اللہ سے بے رُخی برقی اس کی معاش ہو نہ پایا کہ ذات انسانی کو آخرت میں جو صورت پیش آتی ہے قلب پرکاش کا ورنہ دنیا ہی میں ہونے لگتا ہے چونکہ حق تعالیٰ نے کفار کے لئے ہمیشہ جہنم میں رہنا مقدور فرمایا ہے اس لئے یہاں دنیا میں اس کے ایک گھڑی بھی ایسی نہیں گزرتی کہ اس کے قلب پر تکرار اور بوجہ درہنہا ہو۔ ہر وقت اس کے دل پر دوسو سے آتے رہیں گے



اور ان وساوس و خطرات سے اس کی طبیعت مکرر و مغموم رہے گی۔ کم سے کم یہ دوسرے ضرور رہے گا کہ ممکن ہے تیسرا مذہب صحیح اور طریق صائب نہ ہو۔ پس یہ ہے وہ بات جو حق تعالیٰ کفار کے دلوں میں ڈال دیتا ہے اور اس کی وجہ سے ان کی زندگی تنگ ہو جاتی ہے سکون قلب اور انبساط طبع ایک لحظہ کے لئے بھی نصیب نہیں ہوتا اگرچہ کتنے ہی دولت مند بلکہ بادشاہ کیوں نہ بن جائیں۔ غرض تنگی گزران سے مراد قلوب میں تنگی و ضیق ہے نہ کہ ہاتھ کی تنگی۔ کہ ایک شخص کے ہاتھ میں کتنی ہی دنیا وسیع کیوں نہ ہو مگر اُسے علم ہو کہ انجام کار جہنم میں جانا ہے تو اس کی زندگی مکرر ہے اور وہ ضیق و تنگی میں ہے، حضرت ممدوح نے بڑی پیاری بات فرمائی علامہ بیضاوی نے بھی تنگی گزران کی یہ تفسیر فرمائی ہے کہ کفار کا سارا فکر و اہتمام اور سطح نظر چونکہ دنیا اور اس کا مال و متاع ہے کہ اُس کے بڑھانے میں پلا پڑتا ہے اور اس کی کمی کے اندیشہ سے مر جاتا ہے اس لئے ہر وقت اس کی زندگی ایک ضیق اور تنگی میں گذرتی ہے۔ برخلاف مومن کے کہ اس کو آخرت کی طلب ہے اس لئے سکون نصیب ہے، ایک عالم سات برس تک عیسائیوں کے ہاتھوں میں قید رہا وہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ طویل مدت میری ان کے مناظرہ و مباحثہ ہی میں گذری اور میں نے خواب ہی ان کو جانچا اور ان کے خیالات کو ٹٹولا مجھے اچھی طرح واضح ہو گیا کہ ان کے اکثر افراد کو اپنے مذہب کے متعلق شک و شبہ ہے اور اس قلبی مرض کے سبب ان کی حالت کھجلی کے مریض کی سی ہے کہ کھجانیو اے کو ڈھونڈتا رہتا ہے اسی طرح یہ شخص بیمار قلب ہے طالب علم کی تلاش میں رہتا اور جہاں اس کو پالیتا ہے اس سے مباحثہ شروع کر دیتا ہے کہ وہ اس کی قلبی غارتشت کو کھجائے اور اس کو رگڑ کر ذرا آرام پہنچائے، پھر نتیجہ اس سے زائد کچھ نہیں نکلتا کہ ذرا سی تقریر پر جال میں آ پھنستے ہیں اور نکل نہیں سکتے یہ تو متوسط درجہ کے لوگوں کی حالت ہے۔ رہے وہ لوگ جو ان میں بڑے سمجھے جاتے اور پادری کہے جاتے ہیں، بہتر سے مناظروں کے بعد مجھے پورا تجربہ ہوا ہے کہ وہ تو یقین اور وثوق کے ساتھ اپنے آپ کو مگر ہی اور باطل پر سمجھے ہوئے ہیں مگر دھرم بھی ایمان نہیں لاتے جس سے قدرت ظاہر ہوتی ہے اللہ کی کہ جو کام جس سے چاہتا ہے لیتا ہے اور اس کا حکم سب پر غالب ہے۔ چونکہ مجھے مناظرہ سے دلچسپی تھی اس لئے ایک دفعہ پتہ لگا کہ فلاں مقام پر ان کا بڑا پادری ہے جو کتب سابقہ کا منہ ہی ہے۔ چنانچہ میں اس کے پاس پہنچا تو واقعی اس کو دریا ئے ناپید اکسار پایا کہ توریت انجیل زبور قرآن مجید اور اکثر احادیث جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب اس کو مستحضر تھیں اور عرب کے مشہور شاعر امراء القیس کنڈی کے اشعار بھی اس کو خوب یاد تھے۔ میں اُس کے پاس بیٹھ گیا اور کہتے لگا کہ میرا آنا آپ کی خدمت میں ایک بات دریافت کرنے کے لئے ہوا ہے جس نے مجھے نہایت پریشان بنا رکھا ہے کہ نہ رات کو نیند آتی ہے اور نہ دن کو قرار ملتا ہے ہر وقت ایک گھٹن رہتی ہے۔ اس پر وہ میری طرف متوجہ ہوا اور کہہ سا کہ وہ کونسی بات ہے؟ میں نے کہا کہ جب تک میں اپنے ملک یعنی بلاد اسلام میں رہا تو



ہمیشہ ہی سُننا رہا کہ مذہب اسلام حق ہے اور نصاریٰ کا مذہب باطل ہے مگر جب سے تمہارے ملک میں آیا ہوں  
 تو معاملہ ہی پلٹ گیا۔ یہاں ہر جگہ یہی سُننا ہوں کہ نصاریٰ کا مذہب حق ہے اور اسلام باطل ہے۔ غرض میں نے  
 اس پر یہ غلطی ہر کیا کہ واقعی مجھے مذہب کے بارہ میں شبہ پڑ گیا ہے اور اس کے بعد کہا کہ میں نے بڑے بڑے پادریوں  
 سے دریافت کیا تو سب نے بالاتفاق آپ ہی کا پتہ بتایا اور دو شخصوں نے بھی اس بارہ میں اختلاف نہیں کیا کہ آپ  
 سب میں بڑے پادری اور اپنے مذہب کے متبر و محقق عالم ہیں۔ اور اللہ پاک نے جاہل پر فرض کیا ہے کہ عالم  
 سے پوچھے اور عالم پر فرض کیا ہے کہ جاہل کو بتائے اور واقف بنائے۔ اس وقت میں صرف اسی لئے حاضر ہوا  
 ہوا ہوں کہ آپ مجھے اس مسئلہ کا تسکین بخش جواب دیں اور آپ کے نزدیک جو حق ہو وہ صاف صاف  
 ظاہر فرمائیے۔ تاکہ آپ کے جواب کو بروز قیامت اپنے اور پروردگار کے درمیان حجت قرار دوں (اور عدالت عالیہ میں  
 پیشی کے وقت آپ کا نام لے کر عرض کر سکوں کہ فلاں شخص نے مجھے حق یہ بتایا لہذا میں نے اس کو اختیار کر لیا)  
 کیونکہ میں ناواقف ہوں اور آپ واقف ہیں اور ناواقف پر لازم ہے کہ واقف سے سوال کرے اور واقف  
 پر لازم ہے کہ اللہ واسطے مخلوق کی خیر خواہی کرے اور جوابات اس کے نزدیک واقعی حق ہو اس کو بے دروغی  
 بیان کر دے۔ میری تقریر اس کے دل میں اتر گئی اور اچھا خاصا اثر کر گئی۔ اس وقت نصاریٰ کا ایک مجمع اس  
 کے پاس بھرا بیٹھا تھا۔ اس نے اپنا سر جھکا کر اپنے ہاتھ پر رکھ لیا اور دیر تک بالکل خاموش رہا آخر اس نے سر  
 اٹھایا اور چپکے سے میرے کان میں کہا کہ مذہب تو بس مذہب اسلام ہی ہے اور وہی حق ہے کہ اس کے  
 سوا اللہ کے ہاں کوئی مذہب قبول نہیں۔ مگر تم میرے پاس سے اٹھ جاؤ اس سے قبل کہ ان نصاریٰ کو  
 اس کا علم ہو جو میں نے تم سے کہا ہے۔ اس سے حضرت ممدوح کے قول کی تائید ہو رہی ہے اور خود مجھے بھی  
 ایک یہودی بڑے عالم سے مناظرہ کرنے کا اتفاق پیش آیا اور انجام کار کھل گیا کہ واقعی اسکو یقین ہے کہ  
 اس کا مذہب باطل ہے۔ اور بجز عناد اور اپنی جماعت میں اندیشہ رسوائی کے اور کوئی شے بھی اس کو اسلام  
 لانے سے مانع نہیں ہے اور یہ ایک بڑا مناظرہ تھا جو کئی دن تک رہا اور اس میں ہزارے بھی کثیر علماء اور حفاظ  
 موجود تھے اور اس کی جماعت کے بھی بکثرت یہودی شریک جلسہ تھے۔ اسی طرح عیسائیوں کے ایک بڑے  
 پادری سے میرا مناظرہ ہوا تو واقعی اُن کے پاس رجبز بن ترائی اور بدزیانی کے ٹھکانہ کی بات، کچھ بھی نہ پائی اس  
 مبحث کو دیکھنا ہو تو محقر الادیب فی الرد علی اهل الصلیب کا مطالعہ کرو جو عبد اللہ میورتی نے لکھا ہے۔  
 کہ عیسائیوں کے بڑے پادری تھے اور اسلام نے آئے تھے اسی طرح عبد الحق اسلامی کی تالیفات دیکھو کہ یہودی  
 مذہب کے زبردست عالم تھے اور مشرک بہ اسلام ہوئے تھے اور رد نصاریٰ میں مولانا ابوالعباس قرطبی کی تالیف  
 دیکھو جس میں عجائبات بھرے ہوئے ہیں اور اس کی ضخامت پچیس جُز کے قریب ہے جس نے ان کتابوں کا



مطالعہ کر لیا اور پھر اس کو عیسائی یا یہودی سے ملنے کا اتفاق ہوا تو اسے علم الیقین حاصل ہو گیا ہے کہ بیشک ان کے قلوب میں شک کا مرض اور اس کا یقین موجود ہے کہ وہ غلطی دگرا ہی پر ہیں جسے ایک شخص کا اکلوتا بچہ دفعۃً مر گیا ہو اور اس کے سامنے بے حد لذیذ بریائی پکا کر رکھو۔ اور ایک شخص کو مدتوں کی تمنائوں اور دعاؤں کے بعد حق تعالیٰ نے بتایا دیا ہو اور اس کے سامنے روٹی کے سوکھے ٹکڑے کھانے کے لئے رکھ دو۔ اور اب دونوں سے پوچھو کہ کیا مزہ آرہا ہے؟ جو فرق ان دونوں میں ہے اس سے بدرجہا فرق کا فردا انسان کے تمتعات دنیا میں ہے۔ پس اگر لذت کا مدار قلب کے سرور اور دلی فرحت پر ہے تو مومن کی صورت تنگی و عسرت و حقیقت وہ پیاری گذران ہے جس پر غبطہ در شک ہونا چاہیے اور کافر کا صورت یسر و غنا و حقیقت وہ تنگ گذران ہے جس پر قلق اور ترس آنا چاہیے۔ اگر حضرت ابراہیم بلخی کو شاہانہ گذران سے زیادہ مزہ نیکرانہ گذران میں نہ آتا تو کبھی کے بلخ واپس آئے ہوتے۔ اور کفار کے لئے اس دلی کلفت کا سبب بطرح ان کے قلبی امراض یعنی شبہات و شکوک ہیں جیسا کہ حضرت شیخ نے فرمایا ہے، آیا ان کا دنیا پر مٹنا اور سجدہ گردیدگی سے اس پر گرتا اور کھنسا ہے جیسا کہ علامہ بیفادی نے بیان فرمایا ہے، اسی طرح ایک اور سبب بھی ہے جو مذہب و آزاد محض ملحد اور تارک الدنیا راہبوں اور جوگیوں کو بھی شامل ہے یہ ہے کہ ان کو اپنے دنیا میں آنے کا مقصد اول اور یہ کہ کہاں جانا اور رہنا ہے معلوم نہیں۔ اس لئے ان کی طبیعت کا رنگ دنیا کے مزے اڑاتے وقت بھی ڈاکوؤں کا سا ہے کہ آباد شہر میں گھس کر محفوظی دیر کے لئے بہت کچھ کھاتے پیتے اور غل غپاٹا مچاتے ہیں مگر ان کو خود پتہ نہیں کہ شہر میں انسان کیوں آیا کرتا ہے اور اب یہاں سے نکل کر ان کو جانا اور رہنا کہاں ہے ان کی خانہ بدوشی زندگی کے لئے سیم و زر کے ڈھیر پلہ داروں کے سر کا ایک وزنی بوجھ ہے جو اٹھانے نہیں اٹھتا اور جو بوجھ سے سبکدوش ہے وہ بھی نکمرا اور بے سہارے ہونے کے سبب متحر ضرر ہے کہ آخر یہاں کیوں آئے تھے اور اب جائیں گے کہاں۔ یتیم بچہ اور بیوہ عورت جس کا دل مان چکا ہے کہ میرا کوئی سر دھرد نہیں کتنا ہی اس کو جواہرات پر بھادو مگر وہ فقری جو سہاگن ہے اور وہ مجھ کا پیاسا بچہ جو اپنے باپ کی آغوش میں کر دیں بدل رہا ہے ان سے یہ درجہا خوش اور بدرجہا پر لطف زندگی گذار رہا ہے مومن کتنا ہی تنگدست اور ناقہ زدہ ہو حتیٰ کہ دشمن اس کو کتے کے ساتھ بھی تشبیہ دیں تب بھی وہ گویا شکاری کتا ہے جس کے گلے میں پٹہ ہے اور پٹہ اس کے مالک کے ہاتھ میں ہے اور کافر کتنا ہی خوش حال اور فریہ کیوں نہ ہو مگر جھوٹے ہوئے بجا کی طرح ہے جس کا نہ کوئی والی ہے اور نہ وارث اور نہ گھر ہے نہ در اگر حق تعالیٰ دونوں جانوروں کو گویائی بخشے تو لاغر و خیف کتا فرحت کے ساتھ کہے گا کہ ایک چوکٹ پر پڑے رہنے سے جو سکون و اطمینان نصیب ہے اس کا مزہ کہ اس پر ہزار نعمتیں قربان نہ ہوتیں تو کبھی کاشیوں کے ٹکڑوں پر جا پڑا ہوتا۔ میرے دل سے پوچھو اور بجا رکھو گا کہ سارے جنگلوں کی سیرو تفریح اور طرح طرح کی



غذائیں سہی کہ جس کیفیت یا بارغ میں چاہتا ہوں منہ ڈالتا اور بھوک سے زیادہ کھاتا ہوں مگر صرف یہ کہ میری لئے کوئی کھونٹا نہیں جس سے بندھ جاؤں اور کوئی مالک نہیں جس کے سہارے دن گزاروں، ایسی کھن ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ یہی راز ہے کہ حق تعالیٰ نے اُمت محمدیہ کو ہر امر میں خواہ وہ عبادت ہوں یا عادت اور شادی ہو یا ثمنی زندگی کے ہر جزئیہ میں اپنے محبوب کے اتباع کا حکم دیا ہے تاکہ کسی حال میں ان کی رستی مضبوط و محفوظ کھونٹے سے نہ کھلے اور لا وارث و آزاد بیوہ و یتیم کی سی دل شکستگی لاحق نہ ہونے پائے۔ الحاصل کا فر زیادہ سے زیادہ یہ سمجھنا ہے کہ دنیا کے مزے اڑانے کے لئے آیا ہوں اور ظاہر ہے کہ دنیا کے مزے بیشمار ہیں اس لئے کہ دن ان کے پیچھے پڑا رہے گا اور کسی ایک جگہ بھی اس کو قرار نصیب نہ ہوگا۔ ایک ذائقہ چکھلے گا تو دوسری رکابی پر چلے گا اور اس کا مزہ لے گا تو تیسری پر غرض اسی چکر میں رہے گا اور جتنے زیادہ مزے چکھے گا اسی قدر حرص اور طلب لذت بڑھے گی کہ مقصود پورا ہوگا نہیں اور طلب ہی طلب میں دم نکل جائے گا بقول ذوق

حرص کے پھیلنے ہیں پاؤں بقدر وسعت : تنگ ہی رہتے ہیں دنیا میں فراغت والے

اور مومن کو دنیا میں آنے کا مقصود بھی معلوم ہے اور یہ بھی کہاں ہوتا ہے اور اصل قیام گاہ کیا ہے لہذا وہ دنیا کو آخرت کا مزرعہ سمجھتا اور وثوق کے ساتھ جانتا ہے کہ زمین کی تمامی نعمتیں صرف اس لئے ہیں کہ اپنے آپ کو اللہ کی عبادت کے لئے تیار کرتے ہیں اُن سے مدد سے لوں نہ بالذات مقصود ہیں اور ان کی لذت کو پائنداری نصیب ہے حلق سے اُترا اور مزہ ختم ہوا۔ اس لئے بُرا ہو یا سبلا جہاں اس کو اتنا مل گیا کہ پیٹ میں ڈال کر کھڑے ہونے اور آفاقی خدمت انجام دینے کے قابل بن گیا وہیں سب سے پہلے کربطاعت الہی میں مشغول ہو گیا اور ایسا مطمئن ہو گیا جیسے گھوڑے کو دانہ کھلا کر اور پانی پلا کر سوار مطمئن ہو جاتا اور پاؤں پھیل کر سرائے میں سو جاتا ہے کہ صبح کو اُٹھوں گا تو منزل قطع کرانے کے لئے سواری کو چاق و چوبند پاؤں گا۔ یہی اطمینان قلب جو مقصود صحیح متعین ہوجانے کے سبب قلب میں آیا ہے وہ پُر لطف زندگی ہے جس کو وَ تَخْيِيْنَةُ جَلْوَةِ طَيِّبَةٍ میں بیان فرمایا گیا ہے۔ اور یہی بے اطمینانی اور بے سہارے ایام گذاری و تَنگي گذران ہے جو ہمیشہ فتنہ گاہ میں کفار کے لئے سزا تجویز کی گئی ہے خلاصہ یہ ہے کہ ایمان ایک نور ہے اور اس کی روشنی میں چلنے والے کو راستہ کا ہر نشیب و فراز اور منزل مقصود کا مبدا و منہا سب نظر آ رہا ہے اس لئے اس کا ہر قدم ولی اطمینان کے ساتھ اُٹھتا اور قلبی سکون کے ساتھ پڑتا ہے لہذا اس کا سارا سفر پُر لطف اور بیشاشت کا ہے۔ اور کفر ایک ظلمت ہے اور اس کی تاریکی میں چلنے والے کی شان اندھے کی سی ہے کہ نہ اس کو سرائے کا پتہ ہے نہ منزل مقصود کا، نہ اس کو اپنی مقدار غذا معلوم ہے نہ اپنی سواری کا نہ اسے دریا کا علم ہے نہ جنگل کا یا قنضا حارث غریزہ انہن کے پیروں کی طرح مہلتا ہے کہ بے اختیار چکر کھا رہا، اندھ رہا ہے۔ بصارت کی طرح بصیرت کی بھی وہ آنکھیں کھلتی ہیں کہ ایک آخرت نظر آتی جو منزل مقصود اور اصل



قیام گاہ ہے۔ اور دوسری سے دنیا نظر آتی ہے کہ راستہ ہے منزل کا اور پہل کا یعنی دریا عبور کرنے کا چونکہ کنر کی تاریکی نے دونوں کو معطل ہے کار کر دیا اس لئے بروز قیامت اندھا بنا کر اٹھایا جائے گا کہ بصیرت کا حرمان اس دن بصارت کے حرمان کی صورت قبول کرے گا۔ اسی لئے آگے مذکور ہے وَنَحْشُرُكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَعْمٰی اور جو بھی ساتھ ہی مذکور ہے قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْ اَعْمٰی وَتَدْكُنْتُ اَبْصِرًا قَالَ كَذَلِكِ اتَّخَذَ الْاِنْسَانُ نَفْسًا وَكَذَلِكِ الْيَوْمَ تُنْشَىٰ ہ ہم اس کو بروز قیامت اندھا بنا کر محشر میں لائیں گے۔ وہ دریافت کرے گا کہ اے میرے پروردگار مجھے قبر سے اٹھتے وقت آپ نے اندھا کیوں بنا دیا حالانکہ رمرتے وقت میری دونوں آنکھیں موجود تھیں۔

جواب ملے گا کہ ایسا ہی رتم نے برتاؤ بھی کیا تھا کہ بصیرت کی دونوں آنکھوں کو پٹ کر لیا تھا۔ اور ہمارے نشانیاں رجن سے دنیا میں جانے کا مقصود اور اصل قیام گاہ کا بورا پنہ چل رہا تھا، تمہارے پاس راہنیا دروسل اور عقل سلیم کے ذریعہ، آمیں مگر تم نے ان کو نسیا منیا بنا دیا۔ لہذا اسی طرح آج تم کو بھی بھولا سبرا بنا دیا جائے گا کہ مگر میں مارتے پھر دگے اور کوئی نہ پوچھے گا کہ کہاں جاؤ گے اور کیا کھاؤ گے، واللہ اعلم

(۲۶) وَلَقَدْ هَمَمْتُ دِبْلًا وَهَكَذَا كَوَّلَا اَنْ تَرٰی بُرْهَانَ رَبِّہٖ ؕ اور عورت نے یوسف کا قصد کیا اور یوسف نے اس عورت کا قصد کیا اگر نہ رکھ لیتے اپنے رب کی دلیل (تو ہوتا جو بھی ہوتا) میں نے حضرت ممدوح سے

دریافت کیا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کا قصد کیا تھا؟ فرمایا عورت کو اپنے کا قصد کیا تھا۔ اس کے بعد مفسرین نے اس بارہ میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ میں نے آپ کو سنایا تو آپ نے شدت سے انکار فرمایا اور کہا کہ راگریہ قصے صحیح ہوں، تو پھر عصمت کہاں رہی رولی کو جب حق تعالیٰ فتح نصیب فرماتا ہے تو ظلمت کی بہتر رگیں اس سے نکال لیتا ہے کہ کسی سے کذب پیدا ہوتا تھا اور کسی سے کبر پیدا ہوتا تھا اور کسی سے ریا پیدا ہوتا تھا اور کسی سے حُب دُنیا پیدا ہوتی تھی اور کسی سے شہوت و محبت زنا پیدا ہوتی تھی وغیرہ وغیرہ۔ جب دل کی یہ شان ہے تو کیا پوچھنا نبی کا جس کی انہیں ہی عصمت پر ہوتی ہے اور معصومیت اس کی ذات میں داخل ہے اس سے تو زنا کی خواہش یا میلان قطعاً محال ہے) نیز آپ نے فرمایا کہ وہی کبھی ایسے مرتبہ پر پہنچتا ہے کہ اس کے نزدیک محسوس شہوت اور دوسری جگہ مساوی بنجاتی ہے۔ حتیٰ کہ عورت کی پیشاب گاہ اور یہ پتھر جو آپ کے سامنے پڑا ہوا تھا، بالکل ایک درجہ میں ہوتے ہیں (کہ جس طرح پتھر پر نظر پڑنے سے شہوت کو حرکت نہیں ہوتی اسی طرح شرمگاہ پر نظر پڑنے سے بھی مطلق حرکت نہیں ہوتی) اور وجہ یہ ہے کہ نبی کا دیکھنا نور الہی سے ہوتا ہے جس کے قریب بھی شیطان کبھی نہیں بچسک سکتا اور نہ کوئی دوسری ظلمت پاس آسکتی ہے۔ اور حب ولی کے حق میں ایسا ہوتا ہے تو نبی معصوم کا کیا پوچھنا۔ حق تعالیٰ میں تو نیک بخشے کہ ہم نبوت کے حق سے واقف ہوں۔

رفصے یہ مقام بھی نہایت نازک ہے اردو کے مؤلفین مثلاً یوسف زین خان نے تو اس قصہ کو حسن و عشق کا



افسانہ بنا کر ایسی روایات بھردی ہیں جن کو نقل کرتے بھی ڈر لگتا ہے۔ مگر عام مفسرین کی علمی نظر بھی اس نزاکت مقام کی پوری رعایت نہ رکھ سکی اور عصمت انبیاء کے مسئلہ کا حق ادا نہ ہو سکا۔ عزیر مصر کی بیوی جس کا نام زلیخا بتایا جاتا ہے سیدنا یوسف علیہ السلام کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو چکی تھی اس لئے اس کا قصد جو کچھ بھی تھا وہ تو ظاہر ہے۔ مگر بحث اس میں ہوئی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا اس کے ساتھ کیا قصد تھا جس کو حق تعالیٰ شائے نے وَهَمَ بَکھا سے ظاہر فرمایا ہے۔ اکثر مفسرین نے یہی قصد مراد لیا ہے جو زلیخا کا تھا اور حضرت ابرہہ کا عصمت کو عصمت کے خلاف بتایا ہے۔ قصدِ معصیت کو نہیں اور ظاہر ہے کہ فعل کا وقوع نہیں ہوا۔ مگر یہ جواب تو صحیح نہیں ہے۔ اول تو فعلِ معصیت جس طرح عضو بدن کا جرم ہے اسی طرح عزمِ معصیت قلوب کا جرم ہے اور جیبِ قلب و بدن دونوں اللہ کے مخلوق اور مکلف ہیں تو بھی جرم کرے گا اس کی پاداش یُسْکِتُکَ گا دُؤْمَ آیتہ شریفہ وَارْتَبِدْ وَارْتَبِدْ اِمَّا نَحْنُ اَوْ تَحْفُوْهُ بِمَا سَيُکَلِّمُکَ بِهٖ اللّٰهُ ہ سے پتہ چل رہا ہے کہ عدل تو اسی کو چاہتا ہے کہ مساوی و خطرات پر بھی مواخذہ ہو کہ ظلمت بہر حال ظلمت ہے یہ بمنزلہ تخم کے ہے اور قلب پر خطرہ و قصد و عزم اس کے درخت کے ابتدائی و درمیانی و انتہائی تین زمانے ہیں اور صدورِ معصیت اس کا پھل ہے اور سزا کا مدار اسی ظلمت پر ہے جو تخمِ معصیت ہے مگر حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ اُمتِ محمدیہ کی کمزوری پر نظر نہ کر اسکو معاف کر دیا اور لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا نازل فرمایا پس فضل کو قانونِ عدل قرار دینا احسانِ فراوانی ہے خصوصاً جبکہ یہ فضل مخصوص اُمتِ محمدیہ کے ساتھ ہے جس کا مطلب ہے کہ دوسروں کے لئے وہ قانون بدستور ہے کہ قصدِ معصیت پر مواخذہ ہوگا سوئم تمامی اُمتوں کے لئے بھی اگر یہ قانون ہوتا کہ قصدِ معصیت پر مواخذہ نہیں تب بھی حضراتِ انبیاء علیہم السلام کی شان رفیع چاہتی ہے کہ اُن سے قصد پر ضرور گرفت ہو کہ مقربانِ رابیش بود جراتی اور حساتِ الابرار سلیمات المقربین جہاں عزمِ معصیت پر تو اُمتِ محمدیہ سے بھی مواخذہ ہوگا مثلاً ایک شخص کا پختہ ارادہ ہے کہ موقع پائے تو ضرور زنا کرے مگر اس کو موقع ہی نہ مل سکا تو اس عزم کو مجرم صدور سمجھا جائے گا۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص مسرتِ مالدار کو دیکھ کر کہا کرتا تھا کہ مجھے روپیہ ملے تو میں ایسے ہی مزے اناؤں تو نیابت کے دن یہ اور وہ مسرت جس نے حقیقتاً بمعصیتوں میں روپیہ پیسہ خرچ کیا، جہنم کے ایک طبقہ میں ڈالے جائیگی اسی طرح وہ نادار جو ایک صالح مالدار کو دیکھ کر کہا کرتا تھا اگر مجھے حق تعالیٰ روپیہ عطا فرمائے تو میں بھی ایسے ہی کارہائے خیر میں صرف کروں، جنت کے ایک درجہ میں رکھے جائیگی گے۔ اس سے مراد یہی عزم اور ارادہ کی نچنگی ہے اور وجہ ظاہر ہے کہ روپیہ نہ ملنا جو مانعِ فعل ہوا منجانب اللہ ہوا۔ یہ دونوں جتنا ان کے اختیار میں تھا چونکہ پورا کر گزرے اس لئے گویا مسرت اور سختی بن چکے۔ پھر سیدنا یوسف علیہ السلام کے قصدِ معصیت کو محض اس لئے کہ صدورِ معصیت نہیں ہوا معصیت کے کیسے نکال سکتے ہیں۔ اور معصیت منافعی ہے عصمت کے یہ دیکھتے ہوئے محققین نے اس مقام کی جو توجہات فرمائی ہیں ان میں قابل



ذکر دو ہیں، اول یہ کہ فہرہ چکا پر وقف صحیح نہیں ہے اور لَوْلَا اَنْ تَسْ اِی شرط مؤخر ہے اور فہرہ چکا جزا مقدم ہے  
آیت تشریفہ کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام بھی عورت کا قصد کرتے اگر نہ دیکھ لیتے اپنے رب کی دلیل کو  
جس کا حاصل یہ ہوا کہ رب کی دلیل چونکہ دیکھ لی تھی لہذا قصد بھی نہ ہو سکا دوسری توجیہ یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام  
کا قصد صرف میلان کے درجہ میں تھا جیسے شدید گرمی کے رمضان میں یرت ملا ہوا شربت دیکھ کر روزہ دار کو میلان  
ہوتا ہے مگر روزہ توڑنے کا وسوسہ بھی نہیں گذرتا۔ اور لولا کی جزا محذوف ہے یعنی اگر آپ رب کی دلیل نہ دیکھ  
لیتے تو یہ میلان ممکن تھا عزم کے درجہ میں پہنچ جائے مگر چونکہ دلیل دیکھ لی تھی اس لئے میلان ہی میلان رہا۔  
جس میں بشر کے لئے خصوصاً جبکہ تمامی مویات فراہم ہوں یا قضا و بشریت عذر قوی ہے ہر دو توجیہ میں بنی کے لئے  
عزم معصیت سے بھی عصمت ثابت ہوئی اور میں نے بھی چالیس برس ہوئے قرآن مجید کا ترجمہ کرتے وقت اسی توجیہ کو درج  
حامل کیا ہے مگر چند سال ہوئے از خود یہ خلجان لاحق ہوا کہ عزم ہو یا میلان دونوں ثمرہ ہیں مادہ طبیعہ کے حب  
حضرات انبیاء کی طبیعت فطرۃ نورانی ہے تو ناممکن ہے کہ ظلمت کا کوئی اثر پیدا ہو۔ ماں اور بہن کتنی ہی حسین  
اور کتنی ہی حسین و خلوت و تنہائی میں نہ ہوں بیٹے اور بھائی کی طبیعت اگر سلیم اور نظیف ہے تو ناممکن ہے کہ ان کی  
طرف میلان پیدا ہو۔ پھر بنی سے تو کیونکر ممکن ہے کہ نامحرم و اجنبیہ کی طرف میلان کر سکے۔  
مادہ رجولیت بیشک تقاضہ بشریت ہے مگر اس کے ہیجان کے لئے محل اور موقع کی صلاحیت بھی تقاضا بشریت ہے  
پتھر کی مورت یا اپنی متوفیہ بیوی کیسی ہی خوبصورت ہوں شباب میں بھرے ہوئے مرد کے لئے جاذب نہیں ہاں ان  
ہی میں حق تعالیٰ روح ڈال دے تو اب میلان بلکہ عزم بلکہ صدور فعل سب متوقع ہے۔ اسی طرح بنی جس کی طبیعت  
و فطرت خالص نور ہی نور ہے اجنبیہ کی طرف میلان کہ مقتضا و غلط ہے کہ یہ نہیں سکتا البتہ جس وقت یہ حرمت  
مبدل بہ حلت ہو جائے گی اور وہ بیوی یا فترگی باندی بن جائے گی تو میلان بلکہ فعل بھی ضرور صادر ہوگا دوسرا  
شبه جو اس کتاب ابریز کے مطالعہ سے روشنی میں آکر اس مویہ ہوا وہ یہ ہے کہ ولی اور بنی میں فرق یہی ہے کہ  
ولی کے لئے مانع معصیت امر طبعی نہیں ہوتا بلکہ بیرونی و عارضی ہوتا ہے اس لئے وہاں میلان ممکن ہے مگر بنی میں  
مانع معصیت خود طبیعت اور فطرت ہوتی ہے اور اسی کا نام عصمت ہے کہ بنی کو حاصل ہے ولی کو نہیں۔  
اور ہر دو توجیہ مذکور کا حاصل یہ ہے کہ عزم معصیت ہو یا میلان کا عزم کے درجہ پر پہنچنا بہر حال دونوں کا مانع  
نفس طبیعت نہیں بلکہ رب کی دلیل کا دیکھ لینا ہوا جو امر عارض ہے۔ لہذا عصمت کا حق ادا نہ ہوا پھر وہ  
دلیل زبانی کیا تھی جس کا دیکھنا مانع بنا اس میں بھی مختلف اقوال ہیں مگر زیادہ مشہور یہ ہیں اول یہ کہ اس موقع  
پر حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے والد بزرگوار حضرت یعقوب علیہ السلام نظر آئے کہ انگلیاں دانتوں میں  
دبا گئے کھڑے ہیں گویا اشارہ فرما رہے ہیں ملامت اور ایسا گندہ کام۔ دوسرا یہ کہ زینحاکے گھر کے کوٹہ



میں ایک بُت کھڑا تھا۔ اس موقع پر اُس نے ایک کپڑے سے ڈھانپ دیا۔ جب حضرت یوسف نے پوچھا کہ یہ کیا کیا تو زلیخا نے جواب دیا مجھے شرم آتی ہے کہ میرا معبود مجھے اس حالت میں دیکھے اس پر حضرت یوسف علیہ السلام کو تنبیہ ہوا اور فرمایا میں اس کا زیادہ مستحق ہوں کہ اپنے رب سے شرمائوں۔ یہ دونوں قول تو کسی طرح بھس دل کو نہ لگے کیونکہ ان کا توصاف یہ مطلب ہے کہ باپ کے متخلفہ کی موجودگی سے سبق لیا۔ مگر اللہ جبار و قہار کی حضوری سے سبق نہ لیا نیز کافرہ کو تو اپنے باطل اور مدھے معبود سے شرم آئی مگر نبی کو اپنے حاضر و ناظر سچے معبود سے از خود شرم نہ آئی۔ اگر آئی تو عورت سے سبق لے کر۔ کوئی شخص ہارون الرشید کے سامنے کھڑا ہوا اس کی یگم یا شاہزادی سامنے آ بیٹھے تو ناممکن ہے کہ شاہی رعب و جلال اور نظر بھی اٹھائے یا مثلاً شیر کے سامنے کھڑا ہو تو دیکھے کہ ہیجان پیدا ہوتا ہے یا نہیں۔ پھر جس ذات کو حق تعالیٰ کا دائمی شاہدہ حاصل ہو اور وہ ہر وقت غلام بنا ہوا اُس شاہنشاہ کے سامنے کھڑا ہو جس کے سطوت و اقتدار کی کوئی مثال ہی نہیں ہو سکتی تو کس طرح مان لیا جائے کہ وہ نامحرم اجنبیہ کی طرف میلان کر سکے۔ اس خلیجان کے بعد طبیعت اس کی حقیقت کی جو یا ہوئی تو منجانب اللہ قلب پر یہی مضمون وارد ہوا جواب حضرت شیخ کی تقریر میں نظر سے گذرا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ سے کوئی مناسبت ہی نہیں اگر ہے تو صند کی ہے یعنی زلیخا کے اس قصہ پر صیغہ حیا کی پر سیدنا یوسف علیہ السلام کو غصہ آیا اور آپ نے یہ طے فرما کر کہ ایک طمانچہ سے سارا ہیجان پانی بن جائے گا مارنے کا قہر فرمایا۔ اور یہ عین مفتضاء نور نبوت تھا۔ چنانچہ میں نے قصہ سیدنا یوسف نام رسالہ میں جس کو ایک نرالے طرز پر مرتب کیا تھا اس مضمون کو درج بھی کر دیا۔ مگر اب چند باتیں ذہن میں اور گھوم رہی ہیں جن کے ظاہر کرنے کو دل چاہتا ہے کہ یہ نازک مقام زیادہ وضاحت کو چاہتا ہے اور جامع کتاب نے حضرت شیخ سے اور کوئی سوال نہیں کیا ورنہ بہت کچھ متعلق معلوم ہو جاتے۔ مثلاً وہ برہان رب کیا تھی جس نے ملنے ہاتھ روک دیا۔ اور جب حضرات انبیاء کا دائمی شاہدہ اور عصمت ذاتیہ۔ دہ رجولیت میں حرکت ہی نہیں لا سکتا تو امتحان ہی کیا ہوا کہ اس موقع پر آپ کے تحفظ کو کمال قرار دیا جاسکے۔ لہذا غور فرمائیں سیدنا یوسف علیہ السلام جلیل القدر نبی تھے اور نبی زادہ تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اکرم بن اکرم ابن اکرم یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیمؑ سے یاد فرمایا ہے اور حق تعالیٰ نے آپ کی شان میں اِنَّہٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ نازل فرمایا ہے۔ چونکہ آپ کا امتحان عبدیت ہی کے متعلق ایک انوکھی صورت میں لیا گیا تھا۔ آپ بے نظر حسن کا مجسمہ تھے اور دل بزرگوار کو سب بھائیوں میں زیادہ پیارے تھے جس قدر آپ ناز پروردہ تھے اسی قدر سخت ابتلا آپ کو پیش آیا کہ بچپن ہی میں آپ سے گھر چھوٹا وطن چھوٹا۔ آغوش پدری چھوٹی بھائیوں کی نظریں پھر یہ اندھے کنویں میں آپ کو پھینکا گیا۔ چند درہم کے عوض نووارد قافلہ کے ہاتھ آپ کو بیچ دیا گیا



اتنا انقلاب عظیم ہوا! اور کل دو تین دن کے اندر ہوا۔ غلام بنا کر بازار مصر میں لائے گئے اور دوبارہ فروخت ہو کر عزیز مصر کے گھر آئے۔ یہاں پر برہسہایکس غلامانہ خدمتیں انجام دیں اور زبان سے ذکر کرنا تو بڑی بات ہے کبھی افسردگی بھی نہ آئی کہ کنعان میں کیا تھا اور مصر میں کیا بن گیا۔ پھر آپ کا حسن دل افروز آپ کے ابتلا کے لئے سونے پر سہاگہ بن گیا۔ کہ آپ کی مربیہ یعنی عزیز کی بیوی جس کے پاس آپ کا ہر وقت رہنا سہنا تھا آپ پر فریضہ ہو گئی اور آپ کی غلامانہ اطاعت کا جوہر دیکھ کر گندی تو قنات کو دل میں جگہ دینے لگی۔ آخر ایک دن مضطر ہو کر گھر کے دروازے مقفل کئے اور آپ پر قابو یافتہ ہونے کی ہر تدبیر عمل میں لاکر صاف لفظوں میں کہا کہ یہاں آؤ اور جلد آؤ۔ عام خیال یہ ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کا امتحان اسی میں تھا کہ جوان اور مجرد ہوتے ہوئے خود عورت کی طرف سے طلب اور لجاجت ظاہر ہونے پر اپنے کو کتنا بچاتے ہیں مگر مجھے جو بات عرض کرنی ہے وہ یہ ہے کہ نہ اس میں آپ کا امتحان تھا اور نہ یہ نبی کے لئے کوئی ڈمگمانے کے قابل بات ہے۔ آپ کا امتحان اُس غلامی میں تھا جس کی پہلی کڑی باپ کے جدائی تھی، اور اب یہ اس کی آخری کڑی ہے کہ دیکھیں غلامی کا فریضہ کیونکر انجام دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نبی مجسم نسکی ہوتا ہے اور دوسروں کو نیک بنانا اس کی فطرت ہے فحش اور فحش بھی وہ کہ زلیخا خود ہی اس کی مرکب نہیں بلکہ نبی کو اس کے ارتکاب کا حکم دیتی ہے طبعاً مقتضی ہے غیظ و غضب کو مگر اپنی غلامی کا اقتضا ہے رب مجازی کا احترام۔ لا طاعت لمخلوق فی معصیۃ الخالق نے یہ فیصلہ تو عام مسلمانوں کو بھی قطعی دیدیا کہ اولاد کے لئے والدین، بیوی کے لئے شوہر شاگرد کے لئے استاد، مرید کے لئے پیر، فوجی سپاہی کے لئے سپہ سالار اور رعیت کے لئے بادشاہ بیشک واجب الاطاعت ہیں۔ اور اس میں شبہ زیادہ مضبوط کڑی غلام کی ہے کہ ملوک اور زور خریدے اپنے آقا کا۔ مگر ان کی اطاعت کا وجوب چونکہ رب حقیقی ہی کے ایجاب کی بنا پر ہے لہذا جب بھی مقابلہ ہوگا ان کے حکم کا اللہ کے حکم سے تواصل بہر حال اصل ہے اور فرع بہر حال فرع لیکن بڑوں کا امتحان بھی بڑی بات میں ہوتا ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کے سامنے تو یہ پُصراط تھی کہ مربیہ کی عدم اطاعت کے ساتھ ساتھ اس کے رب مجازی ہونے کی بھی پوری رعایت رہے اور مجازی غلامی کے فریضہ پر بھی دھیان نہ آنے پائے۔ آپ کے جد امجد سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اس کمٹھن منزل کو طے کیا اپنے باپ کا حق پداری ادا کرتے وقت کہ باوجود اس کے کافر ہی نہیں بلکہ کافر اور بت تراش ہونے کے اس کو توحید کا سبق دیا تو آبا ہی آیا پکار کر دیا۔ اور جب اس کی طرف سے یہ سخت جواب ملا کہ یہاں سے نکل جاؤ ورنہ پتھروں سے کچل دوں گا تب بھی آپ کی زبان مبارک سے وہی الفاظ نکلے جو احترام پداری کے لئے زیبا تھے یعنی سَلَامٌ عَلَیْكَ سَمَاءُ سَتَاخِضُ لَكَ رَبِّیْ بِہِت اچھا آخری سلام لیجئے جاتا ہوں مگر آپ کے لئے اپنے رب سے استغفار ضرور کروں گا۔ آج اُسی سید الموحدین کے پر پوتے کا امتحان اسی نوعیت کے دوسرے رنگ میں لیا جا رہا ہے کہ دیکھیں رب مجازی کا ادب و احترام



قائم رکھتے ہوئے تبلیغ اور موعظہ حسنہ کا حق کس خوبی سے انجام دیتا ہے۔ درحقیقت آپ ہی کا کام تھا کہ تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک راستہ کو عبور فرما گئے کہ سب و شتم یا زد و کوب تو بڑی چیز ہے غصہ کا لہجہ بھی نہ آنے پایا بلکہ مربیہ کو اس طرح حکم کرنا بھی کہ قصد معصیت سے باز آؤ شانِ غلامی کے خلاف سمجھا۔ جو کچھ نصیحت کی وہ اپنے اوپر رکھ کر کی کہ *فَعَاذَ اللّٰہُ، اِنَّہٗ کَفٰی الْاٰیۃُ اللّٰہِ پناہ* میں رکھے اپنے عذاب سے کہ معصیت کی لذت تو دوزخ میں پانی ہو کر بہ جائے گی مگر اس کے عذاب کی تکلف تم ہو یا میں مدت دراز تک جھیلنا پڑے گی) نیز وہ یعنی عزیزِ مہر میرا آقا ہے اور آقا کی ناموس میں بیٹہ لگانا غلام کا کام نہیں اور ظاہر ہے کہ غلام ہی کی طرح بیوی کا بھی آقا ہے بلکہ زیادہ خصوصاً جبکہ انہوں نے مجھے رکھا بھی اچھی طرح (کہ میری ہر ضرورت کے بار آورنے کا خیال رکھا اور تم کو تو اپنے گھر کا مالک ہی بنا بیٹھا یا ہے) نیز زنا ظلم ہے کہ نعمت الہی کا بے محل استعمال ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ ظالم فلاح نہیں پایا کرتا دنیا ہی میں رسوا ہو کر رہتا ہے (غرض ارشاد و ہدایت کا کوئی پہلو نہ چھوڑا اور اس حقیقی کی سطوت و شان اور عذابِ اخروی کا منظر دکھایا۔ پھر رب مجازی کی تربیت کا عقلی اقتضا پیش کیا پھر تقاضاءِ مروت و شرافت ظاہر فرمایا اور پھر بروئے تجربہ دنیوی ذلت و رسوائی سے ڈرایا کہ درحقیقت زنا کی خاصیت ہے کہ باوجودیکہ اس میں حد سے زیادہ اخفا ہوتا ہے مگر طشتِ ازبام ہو کر رہتا اور کوکر و رعایا تک کے دلوں سے احترام نکل جاتا ہے۔ یہ ہے اخلاصِ عبدیت کہ سب کچھ فرمایا مگر کس پیارے اسلوب سے فرمایا۔ رب حقیقی کے حکم کا احترام بھی پورا ادا ہوا اور رب مجازی کے ادب و احترام میں بھی ذرہ برابر فرق نہ آنے پایا۔

اس کے آگے حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے *وَلَقَدْ کُفِّرْتُ بَہٗ وَھَکَہٗ جَکھا* جس میں حضرت شیخ نے *ھَکَہٗ* بکھا کا ترجمہ فرمایا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے مارنے کا قصد فرمایا تھا۔ بندہ نا چیز کا وجدان یہ کہتا ہے کہ *ھَکَہٗ* بکھا میں عورت کے قصد سے بھی یہی سخت گری کا پہلو مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ زلیخانے جب دیکھا کہ حضرت یوسفؑ اس سے نہیں ہوتے اور نہ میری لجاجت پر نظر کرتے ہیں نہ اپنی غلامانہ اطاعت پر بلکہ دفتر کھولتے ہیں نصیحتوں کے، جو ایسے بتیابانہ ہیجان کے وقت تیر کا کام دیا کرتے ہیں تو اس نے منوانے کا دوسرا پہلو اختیار کیا یعنی گرمی برقی اور تحریف و تہدید سے اپنا کام نکالنا چاہا۔ اسپر سیدنا یوسف علیہ السلام کو بھی اپنی رکوش بد لئے کی ضرورت ہوئی کہ اب نرمی برتنے گویا معصیت کو ہلکا سمجھتا ہے اور جہاں معصیت سے روکتے ہیں ہاتھ کی ضرورت ہو وہاں محض زبان سے کام لینا کمزوری ہے اور ظاہر ہے کہ آپ کا ایک طمانچہ عورت کے شہوتِ نفسانیہ کو فنا کرنے کے لئے کافی تھا مگر پھر وہی غلامی کا امتحان کہ مربیہ ہے اور میلِ منصب نہیں کہ دستِ دلازی کروں مانع آیا اور اب بجز اس کے آپ وہاں سے بھاگ نکلیں اور کوئی صورت دو متضاد پہلو سنبھالنے کی نہ رہی۔ چنانچہ آپ بھاگے اور قدرت الہیہ پر نظر رکھ کر بھاگے اس لئے آپ کے عزم کو جس کا محرک محض مشاہدہ رب تھا قفل کی بندش نہ روک سکی۔ زلیخانے تعاقب کیا اور آپ کے



کرتے کا دامن پکڑ بھی لیا مگر آپ نہ روک سکے۔ دامن پھٹ گیا۔ مگر آپ آخری دروازہ پر پہنچ لئے ابھی تتمہ امتحان باقی تھا اس لئے باہر پہنچتے ہی دیکھا کہ عزیز مصر کھڑا ہے اس حال میں شوہر کو دیکھتے ہی بدنامی و نفرت کے مارے زلیخا کا داعیہ نفسانی ختم ہو لیا اور سارا بوجھ بار اپنی گردن سے اتار کر اس بے گناہ کے سر تھوپ دیا جس کو اپنی جان سے زیادہ پیارا سمجھنے کا دعویٰ کیا کرتی تھی۔ یہ ہے حقیقت نانی و ظلماتی محبت کی کہ ذرا اسے امتحان میں بے نقاب اور منقلب ہو کر محبوب کو مجرم قرار دیتی اور سزا دلانا چاہتی ہے مگر سیدنا یوسف علیہ السلام کے قدم نے حق غلامی سے اب بھی لغزش نہ کھائی۔ نہمت سے اپنے آپ کو بچانے کا فریضہ ادا کرنے کے لئے اتنا تو فرمایا کہ انہوں نے ہی تو مجھے پھنسا یا تھا مگر زلیخا کی دیدہ و دلیری اور سفید جھوٹ پر غصہ لا کر آگے کوئی لفظ انسیا نہ نکال سکے جو عزیز کو ان کی مرہیہ پر برا فروختہ کرے۔ چونکہ امتحان کا ہر پہلو ختم ہو لیا اس لئے اب حق تعالیٰ نے اظہار قدرت فرمایا کہ سات تا لوں کی خلوت کے قصہ میں جہاں مدعیہ اور مدعا علیہ کے سوا تیسرے شخص کی ہوا بھی نہ تھی بے زبان بچہ یا پردہ کو گویا فی بخشی اور اس نے ایسا دل لگتا ثبوت پیش کیا جس کے ذریعہ ہر شخص خود جج بن کر صحیح فیصلہ نکال سکتا ہے وہ یہ کہ یوسف کا کرتا دیکھ لو۔ اگر سامنے سے پھنسا ہے تو عورت سچی اور یوسف جھوٹے کیونکہ صفات علامت ہے مرد جبر کر رہا ہے اور عورت اس کو دھکیل رہی ہے اور اگر پیچھے سے پھنسا ہے تو عورت جھوٹی اور یوسف سچے کہ کھلی علامت ہے مرد بھاگ رہا ہے اور عورت اس کو پکڑ رہی ہے چنانچہ کرتا دیکھا گیا تو صورت حال بے نقاب ہو گئی اور حضرت یوسف کے بے گناہ ہونے کا عزیز کو یقین آ گیا۔ حتیٰ کہ زبان سے بے اختیار نکلا کہ عورتوں کا نکر بھی بڑا غضب کا ہوتا ہے قصہ تو ختم ہو لیا مگر سیدنا یوسف علیہ السلام کا زمانہ غلامی جس میں آپ کا امتحان تھا ابھی باقی تھا اور آپ کی شان عبدیت جس کا پہلا سبق رضا و تسلیم کا تھا وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس سے اکتائے اس لئے بجائے اس کے کہ آپ غلامی سے رہائی کی دُعا مانگتے آپ نے یہ دُعا کی کہ اس قصر شاہی سے جہاں معصیت کا خطرہ ہو مجھے وہ جیل خانہ پیارا ہے جہاں امن و کیسوٹی ہو۔ چنانچہ آپ کی دُعا قبول ہوئی اور کافی مدت آپ نے مجلس میں گزاری الحاصل سیدنا یوسف علیہ السلام کا امتحان عبدیت میں تھا کہ ایک عورت کی غلامی میں آپ کو مدتوں رکھا گیا۔ نبی کے لئے غیر اللہ کی غلامی ہی صبر و استقلال اور رضا و تسلیم کی آزمائش کے لئے کیا کم تھی، چہ جائیکہ ایسے فحش قصہ میں آپ کو ابتلا پیش آیا جس کا خواب بھی آپ کو نظر نہ آ سکتا تھا کہ نہ مرہیہ کی اطاعت اپنی حد سے بڑھے اور بیجیائی کا مرتکب بنائے اور اپنی حد سے گریے اور سوؤ ادب کا مرتکب بنائے۔ چنانچہ آپ نے لفظہ تعالیٰ دونوں پہلوؤں کا حق ادا کر دیا کذلک لِنَصْرِتْ عَنْهُ الشُّؤْرَ وَالْفَحْشَاوْہِ ایسا ہی ہوا کہ ہم نے سودا ادب اور صدور فحش دونوں سے یوسف کو محفوظ رکھا۔ اور دونوں کا مانع کوئی امر خارجی و عارضی نہ تھا بلکہ وہی ربوبیت حقہ کا شاہدہ تھا۔ جو آپ کے لئے دائمی تھا جس کا اظہار کُنْ لَآ اَنْ تَرٰی بُرْهَانَ رَبِّہِمْ میں ہو رہا ہے کہ حق تعالیٰ کو



رب حقیقی سمجھنے سے فدا ازہول ہوتا تو فحشاء کے صدور کا کوئی مان نہ تھا اور مرہیہ کو منظر ربوبیت سمجھنے میں ذرا غفلت ہوتی تو سوء ادب سے ہاتھ تھا منے والا کوئی نہ تھا۔ اور امر بالمعروف کے چونکہ دو درجے ہیں۔ ہاتھ سے معصیت کا مقابلہ کرنا، یا زبان سے، اس لئے دونوں کی جانچ ہو گئی۔ کہ زلیخا نے جب محبانہ طرز اختیار کیا تو آپ نے داعطانہ روش اختیار کی مگر اپنی غلامی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور جب اُس نے حاکمانہ روش اختیار کی تو آپ نے دست درازی نہ فرمائی کہ غلامانہ شان پر دھبہ نہ آجائے۔ جس نے بشر کی غلامی کا اتنا حق ادا کر دکھایا اس کی عبدیت کا اپنے محبوب کے ہاتھ کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔

تیسرے اس خیال کی تائید کہ حکمتِ بہ سے بھی عورت کا وہی قصد مراد ہے جو تشدد کا گرم پہلو لئے ہوئے ہو، چند وجوہ سے ہوتی ہے۔ پہلی آیت میں عورت کے قصد کی تصریح ہو چکی کہ اُس نے حضرت یوسف کو بلایا اور صاف الفاظ میں کہا میرے پاس آؤ۔ اب اس آیت میں اُسی قصد کو اشارۃً ذکر کرنا تکرار محض اور فصاحت قرآنیہ کے خلاف ہے۔ زلیخا اور حضرت یوسف کا قصد متصل مذکور ہے۔ اس لئے چاہتا ہوں کہ دونوں کی ایک ہی نوعیت ہو۔ قصد و ارادہ خود عربی الفاظ ہیں ان کو چھوڑ کر فقہ کا لانا علامت ہے کہ کوئی خاص قسم کا قصد مراد ہے۔ اور وہموا بما لکم ربنا لئلا یحزنکم۔ وہموا باخراج الدرسولہ وھمت کل امیر برسولہ۔ آیات شریفہ سے معلوم ہو رہا ہے کہ فقہ کا استعمال عموماً ایذا رسانی و سخت گیری کے قصد میں آتا ہے۔ لہذا یہاں بھی یہی مراد ہے اور لینا چاہئے عقل تسلیم نہیں کرتی کہ جب عورت صراحتہً ارتکاب معصیت کا حکم دے تب تو سیدنا یوسف علیہ السلام نرم جواب کا نا صحنہ پہلوا اختیار فرمائیں، اور جب اس کے محض قصد کا اظہار ہو تو آپ جارحانہ پہلو پر اتر آئیں۔ اگر عورت کی روش میں فرق نہیں آیا تو پیغمبر کا رنگ بلا وجہ کیسے بدل گئی۔ نیز اس کی تائید میں کہ آپ کا امتحان آداب غلامی میں تھا نہ کہ نفس فحشاء میں خود نتیجہ امتحان ہے کہ جب اس کے نرم و گرم اور سر و سیر حتیٰ کہ شاہی محل اور جیل خانہ کی کوٹھری کے سب مراحل طے کر چکے تب آپ کو صلہ میں حریت عطا کی گئی اور حریت بھی وہ یکتائے روزگار جس مصر کے بازار بردہ فروشی میں آپ فروخت کئے گئے تھے اس کا عورت و مرد و بچہ اور بوڑھا شریف و ضعیف امیر و غریب زمیندار و کاشتکار غرض ہر باشندہ آپ کا زر خرید غلام بنایا گیا اور عالم غیب سے کہا تدین تدان وھل جزاء الاحسان الا الاحسان کا اقتضاء ظہور میں آیا اور اسی لئے منہ عبادنا المخلصین سے آپ کی عبدیت خالصہ کا اظہار فرمایا۔ واللہ اعلم

(۲۷) وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا اور حق تعالیٰ نے موسیٰ سے کلام فرمایا۔ میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ اللہ جل شانہ کا مکالمہ کیا محض مخصوص ہے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یا اولیاء اللہ کو بھی میسر آتا ہے۔ مثلاً حضرت ابوالحسن شاذلی قدس سرہ کا حزب الکبیر میں قول منقول ہے وَهَبْنَا مَشَاهِدًا



تَصَحُّبُهَا الْمَكَامَلَةُ۔ الہی ہمیں وہ مشاہدہ نصیب فرما جس کے ساتھ مکالمہ بھی ہو۔ فرمایا ہاں شیخ ابوالحسن شاذلی وغیرہ کا قول مکالمہ خداوندی کے بارہ میں بالکل حق ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اولیاء بھی مکالمہ الہیہ سے نوازے جاتے ہیں۔ اگرچہ نوعیت میں مشاہدہ کی طرح بہت فرق ہوتا ہے، نیز حضرت نے فرمایا کہ صاحب مشاہدہ ولی پر جب حق تعالیٰ فضل فرماتا ہے تو وہ اللہ سے کلام سنتا ہے مگر عادت حباریہ کے خلاف (کہ عادت اللہ نے عام طور پر صرت کمان کو آلہ سماعت بنایا ہے مگر اس کو کلام الہی کی سماعت اس طرح ہوتی ہے کہ نہ حرمت ہوتے ہیں نہ آواز، اور نہ کیفیت کا ادراک (کہ کیونکر سماعت ہوئی) نہ کوئی جہت مخصوص ہوتی ہے (کہ فلاں جانب سے آواز آرہی ہے) بلکہ ہر جہت سے سنائی دیتی ہے (اور سننے کے لئے کان مخصوص نہیں ہوتے) بلکہ تمامی اعضاء اور ذات کے تمامی اجزا سنتے ہیں۔ حتیٰ کہ دانت داڑھ اور بال بال غرض بدن کا ہر جوہر اور ہر حصہ سنتا ہے اور مجسم پتہ سننے والا کان بنجاتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے اہل مشاہدہ کی مقدار سماعت کا فرق و اختلاف بیان فرمایا جن کے اظہار کا یہ موقع نہیں۔ فہم یہ ظاہر ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی شان مرتبہ سماعت کلام الہی میں نہایت ارفع و اعلیٰ تھی کہ اسی خصوصی بنا پر آپ کا خطاب ہی کلیم اللہ ہے۔ نفس سماعت میں اشتراک دوسری شے ہے اور خصوصی شان کا امتیاز دوسری شے۔

(۲۵) وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنَّ الْكَافِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُبِينًا

اور جب تم سفر کو جاؤ تو تم پر کچھ گناہ نہیں کہ نماز کو کم کر دو۔ (یعنی بجائے چار رکعت کے دو رکعت پڑھو جس کا نام اصطلاح شرع میں قصر ہے) اگر تم کو اندیشہ ہو کہ کافر تم کو تکلیف دے گا۔ بے شک کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں، میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ خوف کی قید لگانے کا کیا مطلب ہے جبکہ امن کی حالت میں بھی قصر جائز ہے چنانچہ بخاری و مسلم میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ میں قصر نماز پڑھی حالانکہ وہاں ہر طرح کا امن کا وقت تھا۔ نیز ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ و مدینہ کے درمیان بجاالت امن قصر نماز پڑھی، حضرت مدوح نے فرمایا کہ یہ قید مفہوم مخالفت کے خارج کرنے کے لئے نہیں ہے (یعنی یہ نہیں ہے کہ خوف کے سوا دوسری حالت یعنی امن میں قصر کرنا گناہ ہے) بلکہ اس مضمون کی تصریح کے لئے ہے کہ خوف کی حالت میں قصر کرنے کو گناہ نہ سمجھو، اور بجاالت خوف نماز میں قصر کرنے کا ایسا ہی اہتمام کرو جیسا سفر کی دوسری حالتوں میں کرتے ہو۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرات صحابہ حبیب سفر جہاد میں جاتے (اور ان کا سفر اکثر اسی لئے ہوا کرتا تھا) تو اس خیال سے کہ ممکن ہے زندگی کا آخری وقت ہو (اور شہادت کے ذریعہ اللہ سے ملنے کا دن آپہنچا ہو) عبادت کو بڑھا دیا کرتے اور ہر وقت نماز میں مشغولیت کو محبوب



سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض حضرات کی تو یہ حالت تھی کہ تمام دن جہادی خدمت میں گزارتے تھے اور تمام رات اپنے اللہ کے سامنے رکوع و سجد کرتے ختم کیا کرتے تھے۔ عرض دشمنوں پر جہاد کے سفر میں (کہ مرنے کا استحضار رہتا تھا) عبادت کے اندر کمی کرنا تیاری آخرت کے خلاف اور ایک قسم کا گناہ و کوتاہی سمجھتے تھے اور ان کے خیال میں یہ مضمون جملہ تھا کہ ایسے موقع پر (جبکہ موت سامنے ہو) عبادت میں اضافہ کرنا چاہیے نہ کہ کمی۔ حق تعالیٰ نے ان کے اس خیال راسخ کو دھوکہ دینے کے لئے یہ آیت نازل فرمائی جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس خاص موقع پر جہاد اور اس کے متعلقات ہی میں مشغول ہونا بہترین عبادت ہے۔ کیونکہ کافر تمہارے دشمن ہیں ان کو مغلوب کر لو گے تو پھر اطمینان سے ہر وقت نمازیں پڑھو گے۔ لہذا نماز کا قصر کہ دو رکعت کی گنجائش نکل کر خدمت جہاد میں صرف ہو ہیں زیادہ پسند ہے اس کے نماز پوری پڑھو اور دو رکعت کا وقت جہادی خدمت سے نکل کر نماز میں داخل ہو جائے۔ اور عبادت سے مقصود ہی چونکہ رضا و حق ہے اس لئے صورت عبادت کو نہ دیکھو بلکہ حکم خدا کو دیکھو مثلاً طلوع و غروب آفتاب کے وقت نماز پڑھنا ممنوع ہے تو یہ عدم صلوٰۃ بوجہ اس کے کہ اطاعت ہے حکم خدا کی بالکل اسی وجہ میں ہے جیسے فرض نماز کا پڑھنا اور اوقات مفروضہ میں۔ پس تم نے خوف جان یعنی جہاد کی حالت میں قصر کو برا سمجھا کہ تقیل ہے نماز کی۔ اس کو دلوں سے نکال دو۔ اس تقریر سے یہ شبہ بھی رفع ہو گیا کہ قرآن مجید سے تو صورت نماز کا قصر بحالت خوف ثابت ہوتا ہے مگر حدیث سے بحالت امن بھی قصر کرنا ثابت ہوا۔ چونکہ شان نزول نے واضح کر دیا کہ قصر کا حکم مطلق سفر پر مرتب ہے اور خوف کی قید صرف بافقنا حال ہے لہذا خوف ہو یا امن دونوں حالتوں میں قصر نماز کا ثبوت کلام اللہ سے ہوا اور کلام الرسول نے صرف اس کی موافقت و توضیح کی ہے نہ یہ کہ خاص کو عام بنادیا، اور نہ یہ تعمیم کہ ایک حالت کا حکم اللہ نے دیا اور دوسری حالت کا رسول نے۔ دوسرا شبہ یہ تھا کہ لاجناح سے حالت سفر میں قصر کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ مطلب یہ ہے کہ قصر میں کوئی خرابی نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ ضروری نہیں البتہ مباح ہے۔ حالانکہ حنیفہ و جوب کے قائل ہیں کہ سفر میں پوری نماز پڑھے گا تو گناہ گار ہوگا۔ اس کا جواب بھی اسی تقریر سے نکل آیا کہ جناح کی نفی صرف اس لئے ہے کہ صحابہ نے اس کو جناح اور کوتاہی سمجھ کر کھا تھا۔ یا قصر نہ کرنے میں گناہ یا عدم گناہ کا حکم اس سے آیت ساکت ہے اور حدیث میں آیا ہے کہ اللہ کی نعمت ہے اس کو قبول کرو یہ بتا رہا ہے کہ قصر نہ کرنے میں انعام الہی کا رد کرنا ہے جو شان عبدیت کے خلاف ہے۔ یا مفہوم مخالفت معتبر مانو تو یوں کہو کہ آیت ہی سے وجوب قصر ثابت ہے بایں صورت کہ قصر میں گناہ کی نفی کی گئی ہے تو عدم قصر یعنی پوری نماز پڑھنے میں گناہ کا ثبوت ہے اور حدیث کو اس کی شرح اور تفصیل قرار دیا جائیگا جیسا کہ آیت شریفہ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهَا میں صفا مردہ کی سعی پر لاجناح مرتب ہوا ہے تو سعی نہ کرنے میں گناہ ثابت ہوگا۔ اور اس بنا پر سعی کو واجب کہا جائے گا واللہ اعلم۔



(۲۹) کَلَّمَا جَاءَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْ رَآئِ الْوَكِيلِ اَللّٰہِ حجب رات کی تاریکی ابراہیم پر، چھا گئی تو ان کی ستارہ پر نظر گئی کہنے لگے یہ میرا پروردگار ہے مگر حجب وہ غائب ہوا تو کہنے لگے مجھے غائب ہو جانے والے پسند نہیں پھر حجب چاند کو چمکتا ہوا دیکھا تو کہنے لگے یہ میرا پروردگار ہے لیکن حجب وہ بھی چھپ گیا تو کہا اگر میرا پروردگار میری رہبری نہ فرمائیگا تو میں اُن لوگوں میں سے ہو جاؤں گا جو بیٹکے ہیں۔ پھر حجب سورج کو دیکھا کہ جگمگا رہا ہے تو کہا یہ ہے میرا پروردگار۔ یہ سب سے بڑا ہے مگر جب وہ بھی غروب ہو گیا تو کہنے لگے لوگوں جن چیزوں کو تم شریکِ خدا ٹھہراتے ہو میں اُن سے بیزار ہوں میں نے سب سے یکسو ہو کر اپنے آپ کو اسی کی طرف متوجہ کیا ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا فرمایا ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ میں نے حضرت محمد ص سے دریافت کیا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا یہ فعل خود اپنے نفس کے لئے استدلال کی خاطر تھا کہ رب کی تلاش میں مصنوعات باری تعالیٰ پر نظر ڈالی تاکہ ترقی فرما کر ذات حق تک رسائی پائی، یا قوم کو جواب کرنے کے لئے تھا کہ ان کے معبودان باطلہ کی قنایت و حدود دکھلا کر ان کا منہ بند کر دیں؟ فرمایا اپنے ہی نفس کے لئے استدلال تھا مگر عوام کے استدلال کی طرح نہیں کہ وہ حقیقت سے نا آشنا ہوتے اور پھر دلیل کے ذریعہ حقیقت پہنچانا چاہتے ہیں مگر حضرات انبیاء کو اللہ کی غایت منزلت اور کمال عبودیت اور انتہائی خورق اور حد درجہ کا خضوع و خشوع نصیب ہوتا ہے کیونکہ حق شناسی اور توجہ الی اللہ ان کا ذاتی وطبعی امر ہے اس لئے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا استدلال جو اس آیت میں مذکور ہے یہ تھا کہ آپ جس حق کو اپنے باطن اور بصیرت سے دیکھ رہے تھے اس کو اپنی آنکھوں اور بصارت چشم سے دیکھنا چاہتے تھے یعنی حق کی معرفت آپ کو بصیرت کے ذریعہ حاصل تھی۔ مگر آپ کا مطلب یہ تھا کہ بصیرت آگے بڑھ کر بصارت تک پہنچ جائے لہذا اپنے ان توراتی اجرام پر نظر ڈالی کہ شاید بصیرت سے پہچانی ہوئی حقیقت کے مناسب حال کوئی زر آنکھوں سے نظر آجائے مگر آپ نے دیکھا کہ ان میں کوئی نور بھی ذات منزہ و مقدس کے مناسب و مماثل نہیں لہذا سب سے تیری فرما کر اسی بصیرت سے پہچانی ہوئی حقیقت کی طرف گئے کہ وہ ذات پاک ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا محض نونہ کے درجہ میں اس کی مثال ایسی سمجھو کہ اہل مشاہدہ ولی کو مستلاً کشف و بصیرت کے ذریعہ انتہائی تاریخ کو چاند نظر آ گیا۔ اس کے بعد اُس نے چاند کو لاؤ نظر چشم سے بھی اس کو دیکھوں چنانچہ جو لوگ چاند کی تلاش میں آسمان پر نگاہ دوڑا رہے تھے یہ بھی اُن کے پاس آکر اُترا اور اُنق آسمان پر نظر دوڑانے لگا تو ما واقف شخص اس کو دیکھ کر ہی سمجھ گئے گا کہ دیگر صاہرین کی طرح اس کو بھی چاند ہونے میں شک ہے اور اس لئے حقیقت کی طلب جستجو کر رہا ہے مگر جس کو اس کی بصیرت اور باطنی حالت سے واقفیت ہوگی اُسے پورا رتوق ہوگا کہ چاند ہو جائیگا اُسے خیر یقین ہے اور ہمارا ساتھ اس کا اکھڑا ہونا صرف اس غرض سے ہے کہ آنکھوں سے بھی چاند کو دیکھے بر فلاح عام لوگوں کے کہ ان کو ظاہر و باطن چاند کے ہونے میں شک ہے اور وہ آسمان کو اس لئے تک رہے ہیں کہ اس کے ہونے یا نہ ہونے کا شک زائل ہو جائے پس یہ فرق ہے انبیاء علیہم السلام کے استدلال میں اور اہل حجاب عوام کے استدلال میں کہ حضرات انبیاء چونکہ معصوم ہیں اس لئے نہ اُن میں اللہ سے ناواقفیت ہے نہ کسی قسم کا



شکے شعبہ کہ یہ دونوں باتیں کفر ہیں۔ اور انبیاء علیہم السلام تو صغیرہ گناہ سے بھی معصوم ہیں چہ جائیکہ کبیرہ گناہ، اور چہ جائیکہ نوع کفر، واقعی حضرت نے بڑی ترکی بات فرمائی۔ بے شمار تیسرے مجھے اس کا تجربہ ہوا کہ حضرت ممدوح اپنے گھر کے اندر یا مسجد میں چھت کے نیچے بیٹھے ہوئے انیسویں تاریخ کو ہم سے فرمایا کرتے کہ چاند ہو گیا۔ ہم آپ کے پاس ہی بیٹھے رہتے اور کوئی باہر سے آتا تو اطلاع دیا کرتا تھا کہ چاند نظر آگیا۔ بلکہ بارہا ایسا ہوا کہ سورج میں زردی باقی ہوتی تھی اور آپ ہمیں چاند ہونے کی خبر دیا کرتے تھے۔ پھر ہماری خواہش پر آپ بھی ہمارے ساتھ آسمان پر چاند دیکھنے کے لئے کھلی مگر بر شریف لایا کرتے اور ریس غور سے اتفاق پر نگاہ ڈالا کرتے۔ مگر چاند اتنا باریک ہوتا تھا کہ نہ ہمیں نظر آتا تھا اور نہ آپ کو حتیٰ کہ کچھ دیر بعد تیز نگاہ والا آتا اور کہا کرتا تھا کہ دیکھو وہ رہا چاند۔ اس کے بعد چاروں طرف سے خبریں آ جاتی تھیں کہ چاند ہو گیا۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ لوگوں کے نزدیک شعبان کی آخری تاریخ (۳۱) ہوتی اور کسی کا روزہ نہ ہوتا اور آپ مجھ سے فرمایا کرتے تھے کہ آج تو عید کا دن ہے۔ یا فرمایا کرتے کہ آج یوم عرفہ ہے حالانکہ لوگوں کے خیال میں ۸ رذی الحجہ ہوتی تھی۔ مگر اس کے بعد کہیں نہ کہیں سے بلکہ کبھی چار منزل اور پانچ منزل سے جنبہ حضرت شیخ کی اطلاع کے موافق خبر آیا کرتی تھی۔ (۳۰) وَمِنْهُمْ مَنْ عَاثَرَ اللَّهَ قَبْلَ مَا قَامَ مِنْ بُيُوتِهِ نَصَدَّقَ وَلَنُكُونَنَّ مِنَ الصَّالِحِينَ ط انہی میں ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے اللہ سے عہد و پیمان کیا کہ اگر ہمیں اپنے فضل سے (مال دنیا) عطا فرمائے گا تو ہم ضرور صدقات دیا کریں گے اور بالضرور نیکو کاران میں سے بنیں گے پھر جب اللہ نے اپنے فضل سے ان کو دیا تو وہ بخیل بن گئے اور لپٹ پھیر کر بے رخی برتنے لگے۔ میں نے حضرت ممدوح سے دریافت کیا کہ مفسرین لکھتے ہیں یہ آیت ثعلبہ بن حاطب کے بارہ میں نازل ہوئی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور التجا کے ساتھ درخواست کی کہ یا رسول اللہ آپ میرے لئے دعا فرمائیں حق تعالیٰ مجھے دنیا کا مال کثیر عطا فرمائے آپ نے فرمایا اے ثعلبہ وہ قلیل جس کا تو شکر ادا کرتا رہے اس کثیر سے بدرجہا بہتر ہے جس کا شکر ادا نہ کر سکے۔ مگر یہ باریا راسی کا اصرار کرتے رہے حتیٰ کہ قسم کھا کر کہا کہ یا رسول اللہ بخدا میں مال کثیر پر اللہ کا شکر ادا کروں گا اور اللہ سے عہد کرتا ہوں اگر اس نے مجھے مال عطا کیا تو ضرور صدقات و خیرات دیا کروں گا چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی اور ثعلبہ کی بکریوں میں اتنی بڑھوتری ہوئی جیسے درسات، میں کیڑے بڑھا کرتے ہیں۔ ثعلبہ کا معمول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمعہ اور پنجگانہ نماز جا بڑھنے کا تھا مگر جب بکریوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی کہ مدینہ میں رکھنے کی گنجائش نہ پائی تو وہ ان کے کیریون شہر چلا گیا اور جماعت کی نمازیں فوت ہونے لگیں مگر جمعہ میں پھر بھی شریک ہوتا رہا اس کے بعد جب بکریوں میں اور ترقی ہوئی تو وہ جگہ بھی تنگ ہو گئی اور وہاں سے دور جا کر قیام کرنا پڑا، حتیٰ کہ ان کے دھندے میں جمعہ کی شرکت بھی جاتی رہی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ثعلبہ کو جب نہ دیکھا تو صحابہ سے دریافت فرمایا کہ ثعلبہ کہاں ہے؟



صحابہ نے عرض کیا کہ اُن کی بکریاں بہت زیادہ ہو گئیں اور ان کے دھندے میں پٹر کر جمعہ اور جماعت کی حاضری سے محروم ہو گئے۔ آپ نے فرمایا دائے افسوس ثعلبہ کی حالت پر۔ اس کے بعد آپ نے دو شخصوں کو زکوٰۃ و صدقات وصول کرنے کے لئے مامور فرمایا اور وہ تحصیل زکوٰۃ کے لئے جگہ جگہ گئے، لوگوں نے ان کا احترام کیا اور اپنی اپنی زکوٰۃ کے اموال پیش کر دیئے۔ چنانچہ ثعلبہ کے پاس بھی دونوں حضرات پہنچے اور زکوٰۃ کا مطالبہ کیا نیز رجب اُس نے کہا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان دکھاؤ تو انہوں نے آنحضرت کی عطا کردہ وہ تحریر بھی جس میں زکوٰۃ (کے قواعد اور ہر جنس کی مقدار وغیرہ کی تفصیل) درج تھی پڑھ کر سنادی۔ اس کو سن کر کہنے لگا یہ تو بالکل جزیہ ہے۔ اچھا اب توجاڑ میں ذرا سوچ لوں پھر کسی وقت آنا چنانچہ دونوں صاحب چلے گئے اور دوسروں سے اموال زکوٰۃ وصول کر کے پھر ثعلبہ کے پاس آئے تو اس نے تحریر مبارک کو مکرر دیکھا اور پھر یہی کہا کہ یہ تو کھٹا جزیہ اور صریح ٹیکس ہے۔ اچھا اس وقت تو آپ دونوں جاہلی میں سوچ کر جواب دوں گا چنانچہ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے ان کو دیکھتے ہی فرمایا دائے افسوس ثعلبہ کی حالت پر! اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی اس کے بعد رجب ثعلبہ کے کسی رشتہ دار نے جا کر اس کو حضرت کا ارشاد اور نازل آیات کا حال سنایا تو وہ زکوٰۃ اموال لے کر آیا بھی مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے تیرے صدقات قبول کرنے سے حق تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ ثعلبہ نے رونا اور سر پر خاک ڈالنا شروع کر دیا۔ آپ نے فرمایا یہ خود تیرا ہی کیا ہوا کام (اور تیری ضرر کا نتیجہ) ہے میں تجھ سے کہتا تھا مگر تو نے میرا کہنا نہ مانا۔ پھر حضرت کی وفات کے بعد ثعلبہ صدقات لے کر حضرت ابو بکر صدیق کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مگر آپ نے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ جب حضرت ہی نے قبول نہ فرمایا تو میں قبول کرنے والا کون (پھر بزبانہ فارسی) حضرت عمرؓ کے پاس لے کر آیا (اور چند مہاجرین و انصار کو سفارشی بنا کر ساتھ لایا) مگر اپنے بھی قبول نہ فرمایا حتیٰ کہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں مر گیا۔ امام جلال الدین سیوطی نے بیضاوی کے حاشیہ میں اس قصہ کو بیان کیا اور لکھا ہے کہ ابن جریر ابن ابی حاتم ابن مردویہ، طبرانی، بیہقی نے شعب الایمان میں بروایت ابو امامہ اس کو نقل کیا ہے۔ میں نے حضرت ممدوح سے پوچھا کیا یہ شخص صحابہ میں تھا اور کیا یہ قصہ صحیح ہے؟ فرمایا میں نے خوب غور کیا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں مجھے کوئی نظر نہ آیا جس سے اس قسم کا گناہ صادر ہوا ہو۔ اور نہ مجھے اس قصہ کا کہیں وجود نظر آیا وہ بندہ نے بھی اپنے ترجمہ میں یہی شان نزول بیان کیا ہے اور اپنے بڑوں کو بھی اس کی نقل کرتے سنا اور دیکھا ہے۔ بہر حال آیت شریفہ بتا رہی ہے کہ یہ یا اس قسم کا کوئی اور قصہ کہ اللہ سے عہد و پیمان کرنے کے بعد کسی شخص نے مال کثیر پایا اور پھر خبیل بن کر زکوٰۃ و صدقات دینے سے انکار کیا پیش ضرور آیا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی منافق کا قصہ ہو جو صورت صحابہ میں شامل ہو۔ واللہ اعلم

(۳۱) وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَءِيلَ أَنَّمَا أَنَا رَبُّكُمُ فَاعْبُدُونِي وَاسْمِعُوا لَكُمْ الْقُرْآنَ يُخَرِّجُهُمْ غَافِلِينَ فَوَقَّعَ فِيهِمْ آلَافَ مَرَّةٍ وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فِئْتًا مِّنْهُم مَّنْ فُتِنَ فَرِيقًا لِّئَلَّا يَعْلَمَ أُولَٰئِكَ أَنَّهُمْ بِلَآئِنَا مُتَعَدُونَ (۳۲)



نے نکالا بنی آدم سے یعنی ان کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو اور ان کو گواہ بنایا انھیں کے نفوس پر، کہ ان سے پوچھا، کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ سب نے کہا بیشک ہے اور ہم گواہ ہیں۔ (یہ اقرار اس لئے لیا کہ) مبادا قیامت کے دن تم کہنے لگو کہ ہمیں تو اس کی خبر ہی نہیں تھی۔ یا کہنے لگو کہ شرک تو ہم سے پہلے ہمارے باپ دادا نے کیا اور ہم ان کی اولاد تھے جو ان کے بعد آئے تھے تو کیا آپ اس فعل میں ہمیں ہلاک کئے دیتے ہیں جو اہل باطل نے کیا؟ (یعنی اللہ نے حضرت آدم سے لے کر قیامت تک مختلف زمانوں میں ایکے بعد دیگرے جتنے بھی انسان انسان دنیا میں آنے والے ہیں ان سب کو اصلاً اباء سے نکال کر یکجا جمع فرمایا اور بلا واسطہ سب اپنی ربوبیت کا اقرار لیا تاکہ حجت پوری ہو جاوے اور سزا پاتے وقت کسی کو اپنی لاعلمی و بے خبری کا عذر نہ ہو اور نہ یہ کہہ سکیں کہ سزا بڑی کو ملنی چاہیے جنہوں نے بڑی ڈگر نکالی نہ کہ بچوں کو جو ان کے قدم بقدم چلنے میں معذور ہیں) میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ یہ واقعہ عالم ارواح میں ہوا تھا یا حضرت آدم کی پیدائش کے وقت کہ ان کی پشت سے ان کی اولاد کو نکال کر عقل اور گویائی بخشی اور ان سے اقرار ربوبیت کرایا۔ یا مضمون آیت از قبیل استعارہ ہے کہ انسان کو دلائل کے ذریعہ اپنی واحدانیت کا علم اور عقل عطا فرمانا گویا اقرار لینا ہے اور انسان کا عقل فہم سے بہرہ یاب ہونا گویا ربوبیت الہیہ کا گواہ بننا ہے؟

فرمایا کہ یہ واقعہ ہے اور عالم ارواح میں پیش آیا تھا۔ جب حق تعالیٰ نے بنی آدم کو خود ان کے نفوس پر گواہ بنانا چاہا تو حضرت اسرافیلؑ کو نفع صور کا حکم دیا۔ ان کے صور پھونکتے ہی ارواح میں ایسی ہول اور ہل چل مچی جیسے حشر کے دن قبروں سے اٹھتے وقت ہوگی، بلکہ اس سے بھی زیادہ اس کے بعد حق تعالیٰ نے حجاب دور فرمایا اور اپنا کلام قدیم سنایا کہ ہر ایک نے بلا واسطہ خطاب الہی سن کر جواب دیا) اس وقت انوار کی قوت و صنف کے اعتبار سے ارواح میں کئی فرق بن گئے۔ ایک فریق وہ تھا جس نے اقرار ربوبیت کا جواب محبت کے ساتھ دیا۔ اور وہ ارواح مومنین تھیں اور دوسرے فریق نے جواب ناگواری کے ساتھ جبراً دیا۔ اور وہ کفار کی روحیں تھیں۔ پھر محبت کے ساتھ جواب دینے والوں میں بھی فراق مراتب تھا کہ بعض میں کلام قدیم سن کر قوت آئی اور بعض میں کمزوری (غالباً یہ قوی الایمان اور ضعیف الایمان روحوں کا حال تھا) اور بعض: جن میں جو کلام قدیم کی لذت سے طرب و سرور میں جھومنے لگیں (غالباً یہ مجذوبین و اہل وجد عشاق کی روحیں تھیں اور بعض وہ تھیں جن کو حق تعالیٰ نے مخلوق کے لئے رحمت بنایا کہ وہ دوسری روحوں کو قوی بنانے کے لئے مدد پہنچانے لگیں چنانچہ اس کا ظہور (حسب تقویت و اعانت) مشائخ و مریدین کی صورت میں ہوا اور اسی دن ارواح میں باہم تعارف ہوا جیسا کہ حدیث میں منقول ہے کہ جن ارواح میں وہاں محبت و الفت ہوئی وہ دنیا میں بھی ایک دوسرے سے مانوس ہوئے خواہ کسی زمانہ میں ظہور ہوا ہو اور جن روحوں میں وہاں ایک دوسرے سے نفرت ہوئی ان میں یہاں بھی تنازع ہوا اگرچہ یہ کسی صدی میں پیدا ہوا ہو اور وہ کسی صدی میں) اس کے بعد تمامی ارواح پر کلام قدیم کی سطوت و ہیبت چھائی اور وہ اپنے برزخی



مکانات میں چپڑک چپڑک کر اڑنے لگیں۔ اور راحت و سکون کے خیال سے زمین کی طرف اترنے لگیں۔ لہذا ان کے اترنے کے اعتبار سے زمین کی کبھی تین قسمیں ہو گئیں۔ ایک وہ جہاں یکے بعد دیگرے صرف مومنین کی روہیں اتریں۔ دوسرے وہ جہاں گردہا گروہ صرف کفار کی روہیں اتریں۔ سوئم وہ مواضع جہاں دونوں قسم کے روہوں کا نزول ہوا۔

اول الذکر وہ لبتیاں ہیں جہاں صرف اہل ایمان و اہل معرفت کی سکونت رہے گی اور کبھی کوئی کافروہاں آباد نہ ہوگا۔ ثانی الذکر اس کے برعکس وہ شہر و دیہات ہیں جہاں صرف کفار کی آبادی ہوگی اور کبھی کوئی مسلمان وہاں نہ لے گا تیسری قسم کے مقامات میں دونوں فریق کی رہائش ہوگی اور اسی ترتیب سے ہوگی جس ترتیب سے ارواح کا نزول ہوا تھا کہ سب کے اخیر جس فریق کی روہوں کا نزول ہوا تھا انہیں کی آبادی پر اس کا خاتمہ ہوگا۔

اگر ارواح مومنین کا نزول آخری تھا تو قیامت کے دن، وہ دارالاسلام ہوگی۔ اور اگر ارواح کفار اخیر میں آئی ہئیں تو اس کا خاتمہ دارالکفر پر ہوگا۔ اور بعض ممالک ایسے ہیں جہاں پہلے ایک گروہ ارواح مومنین کا آیا اور ان کے بعد دوسرا گروہ ارواح کفار کا اور پھر تیسرا گروہ ارواح مومنین کا آیا اور ان کے بعد ارواح کفار کا اور اسی طرح سلسلہ چلتا رہا کہ اترنا ختم ہو گیا تو اسی کے موافق یکے بعد دیگرے وہاں مومنین و کفار کی آبادیاں ہوں گی، چنانچہ اہل بصیرت جب ایسی جگہ پر نظر ڈالتا ہے جہاں اس وقت اہل شرک کا تسلط ہے تو معلوم کر لیتا ہے کہ ان کے بعد یہ جگہ مومنین کے قبضہ میں آئے گی یا نہیں۔ اور اس کی صورت یہی ہے کہ روز الست کے نزول ارواح کی ترتیب پر نظر ڈالے گا کہ موجودہ مشرکین کے بعد یہاں کن روہوں کا نزول ہوا تھا اگر وہ ارواح مومنین ہئیں تو سمجھ لے گا کہ عنقریب یہ جگہ دارالاسلام بنیں گی اور اگر ان کے بعد اترنے والی روہیں بھی کفار و مشرکین کی ہئیں تو سمجھ لے گا کہ ابھی اس کو دارالکفر بنا رہتا ہے اسی طرح سلسلہ دار نظر ڈالتا چلا جائے گا اور معلوم کرے گا کہ کس وقت کوئی دارالاسلام دارالکفر بنے گا اور کس قرن میں کوئی دارالکفر دارالاسلام بنے گا۔ نیز خاتمہ اس کا کس حال پر ہوگا یعنی (قیامت کے دن) دارالکفر ہوگا یا دارالاسلام نیز حضرت نے فرمایا کہ اس کی شناخت کے دو طریق اور بھی ہیں۔ ایک یہ کہ دارالکفر پر اہل بصیرت نظر ڈالتا ہے اگر دیکھتا ہے کہ اہل مشاہدہ اور اولیاء اس میں دن بدن بڑھ رہے ہیں تو سمجھ لیتا ہے کہ عنقریب دارالاسلام بننے والا ہے۔ اور اگر دیکھتا ہے کہ دنی کا کہیں وجود نہیں تو سمجھ لیتا ہے کہ اس بستی پر اللہ کا غضب ہے (اور بدستور دارالکفر بنا رہے گا) میں نے عرض کیا کہ ایسے دارالکفر میں اگر حق تعالیٰ کسی کو فتح نصیب فرماوے تو وہ کیا کرے گا؟

فرمایا مردان غیب اس کی مدد کریں گے اور جسم و بدن کے ساتھ خود اس کے پاس جا کر اس کو علم ظاہر و شریعت محمدیہ کے ضروری مسائل، تہائیں اور پڑھائیں گے۔ کیونکہ جسے علم باطن کے ساتھ علم ظاہر نہ ہوا اتفاق ہی سے اس کو فتح نصیب ہوتی ہے ورنہ اہل فتح وہی ہوتا ہے جو دونوں کا جامع ہو نیز آپ نے فرمایا کہ علم باطن بمنزلہ آب زر سے لکھی



ہوئی ننائوں سطروں کے ہے تو علم ظاہر سیاہی سے لکھی ہوئی آخری سوتیل سطر کے ہے۔ اگر یہ سیاہ سطر نہ ہو تو زرین سطریں ساری بیکار ہیں اور ان سطروں والے کی نجات دشوار ہے ایک مرتبہ فرمایا کہ علم ظاہر گویا مشعل ہے جو رات کے وقت روشنی دے گی اور تاریکی شب میں اس کا بڑا فائدہ نظر آئے گا۔ اور علم باطن گویا دوپہر ہے کہ سورج کی شعاعیں پھیلی ہوئی ہیں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اہل باطن کہنے لگتا ہے اس مشعل کا جو میرے ہاتھ میں ہے کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ اللہ نے مجھے دن کی روشنی دے کر اس سے مستغنی بنا دیا۔ اس لئے اس کو بچھا دیتا ہے اس وقت حق تعالیٰ دن کی روشنی کو زائل فرما دیتا ہے اور اس پر اللہ جبرئیل چھا جاتی ہے اس وقت سمجھتا ہے کہ دن کی روشنی کا بقا اسی مشعل کے ہاتھ میں لئے رہنے پر موقوف تھا کہ اس کو نہ بجھاتا تو حق تعالیٰ اس کی احتیاج کا وقت نہ دکھاتا، نیز آپ نے فرمایا کہ اس دھوکہ میں بہتروں کے پاؤں جھل چکے ہیں اور جب تک مشعل کو دوبارہ اچھے ہاتھ میں لے کر روشن نہ کرے دن کی روشنی کبھی واپس نہیں آتی۔ مگر کسی کو حق تعالیٰ توفیق بخش دیتا ہے اور وہ علم ظاہر کی قدر و منزلت معلوم کر کے اس کو حاصل کرتا ہے اور کسی کو توفیق نہیں بخشتا (اور وہ بھٹکتا ہے ہی ہو اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے) اور دوسرا طریق شناخت یہ ہے کہ اہل بصیرت و انکشاف پر نظر ڈالتا ہے۔ اگر دیکھتا ہے کہ مردان غیب سے مسجدیں آباد ہیں اور جماعت سے نمازیں ادا کی جاتی ہیں تو سمجھ لیتا ہے کہ عنقریب دارالاسلام بن جائے گا ورنہ معلوم ہو جائے گا کہ اس زمین پر نحوست کا برستا مقدار ہو چکا ہے۔ واللہ اعلم۔

(۳۲) میرے پاس ایک تحریر آئی جن میں یہ سوالات تھے۔ کیا حضرات انبیاء علیہم السلام قبل از نبوت معصوم ہیں؟ اور آیا یہ حکم متفق علیہ ہے یا اس میں کسی کا اختلاف بھی ہے؟ اور آیا صغیرہ گناہ بھی دوبارہ عصمت انبیاء مثل کبیرہ کے ہے؟ پھر برادران یوسف علیہم السلام کے متعلق بتائیے کہ وہ بنی نفعی یا نہیں؟ اور اگر بنی تھے تو راجحاً اور باپ کی ایذا و رسانی کے) جو واقعات پیش آئے ان کا تسلی بخش کیا ہے؟ میں نے جواب دینے کے خیال سے اس تحریر کو اپنی بیاض میں درج کر لیا اور ارادہ تھا کہ عصمت کے متعلق صاحب مواقف وغیرہ علماء کلام کی تحقیق نقل کروں گا اور واقعات کے متعلق امام سیوطی کے رسالہ دفع النقص عن اخوة یوسف سے مدد لوں گا۔ جو مجھے دستیاب ہو گئی تھی۔ اتفاق سے حضرت ممدوح کی نظر میری بیاض میں اس سوال پر پڑ گئی تو آپ نے اپنے دست مبارک سے یہ تحریر فرمائی۔ الجواب واللہ الموفق لمصر اب۔ انبیاء علیہم السلام نبوت سے قبل اور بعد ہر حال معصوم تھے اور برادران یوسف علیہم السلام سے جو کچھ ظہور میں آیا باطنی حدیث سے وہ اس کے مامور تھے اور حکم اللہ کی طرف سے تھا اور عتاب صرف ظاہر میں ہے کیونکہ غیب ایک راز ہے اللہ کے ساتھ رصورت عتاب میں اس کو چھپائے رکھا ہے کہ افشاء نہ ہو، والسلام کتبہ احمد بن المبارک السجسی۔ میری طرف جواب اس لئے منسوب فرمادیا کہ تحریر میرے ہی نام آئی تھی۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ حضرات انبیاء پر حق تعالیٰ کے عتاب اکثر اسی



قبیل سے ہیں کہ باطن میں ان کو ایک حکم فرمایا۔ اور ظاہر میں جو حکم تھا وہ اس کے خلاف تھا۔ نبی نے اس کی تعمیل کی تو ظاہر کے لحاظ سے وہ گناہ بن گیا۔ میں نے عرض کیا کہ جب عمل حق تعالیٰ کے حکم سے ہے تو گناہ کیسے بن گیا اور اس پر عتاب کا کیا مطلب جبکہ اللہ کی اجازت سے کیا؟ فرمایا ہاں یہ صحیح ہے مگر جب ان کی نظر حکم ظاہری پر گئی اور دیکھا کہ ہم سے اس کا خلاف صادر ہوا تو ان کی نگاہ میں وہ گناہ نظر آیا۔ کیونکہ ظاہر کا محض خلاف ہونا ہی ان کے نزدیک گناہ ہے۔ میں نے کہا یہ اس کے لئے تو بیشک کافی ہے کہ نبی کو وہ گناہ نظر آیا، مگر عتاب الہی کے صحیح ہونے کو تو کافی نہیں، اس لئے کہ جس خدا نے ظاہری حکم دیا تھا اسی نے باطنی حکم بھی دیا ہے پھر عتاب کیسا؟ فرمایا نزول وحی تابع ہو کرتا ہے تو وہ اپنے نفس کو نفرین اور اس پر عتاب کرتا ہے (کہ ایسا کیوں ہوا) لہذا وحی بھی تبعاً لئلا ظاہر عتاب کی نازل ہوتی ہے نیز فرمایا کہ جس کو خواطر انبیاء کا معلوم کرنا مطلوب ہو وہ ان پر نازل شدہ آسمانی کتاب میں غور کرے کہ ان کا نزول ان کے خواطر قلب ہی کی موافق ہوا ہے۔ پس جہاں کتاب میں مخلوق کو نصیحت ہے، اس کا نزول اس وقت ہوا ہے جبکہ نبی کے قلب میں مخلوق کو نصیحت کا خیال تھا۔ اور جہاں کتاب میں بشارت و خوشخبری ہے اس کا نزول اس وقت ہوا ہے جبکہ نبی کے قلب میں اینسا ط اور منافع امت کے محبت تھی اور جہاں کتاب میں وعید اور تحوین مذکور ہے اس کا نزول اس وقت ہوا جبکہ نبی کے قلب میں انقیاض و غفہ تھا۔ اس سے تم کو معلوم ہوگا کہ عصمت انبیاء کا ثمرہ کیا ہے اور یہ کہ ان کے تمامی خواطر اور وہ خیالات جو ان کے قلب منور پر گزرتے ہیں سب منجانب اللہ ہوتے ہیں۔ ذہن: یہ ایک واقعہ ہے کہ قتل کے ایک سنگین مقدمہ میں کسی شبہ کی بنا پر جج نے قاتلین کو معمولی قید کی سزا دیدی خفیہ پولیس کا ایک بڑا عہدہ دار تفتیش پر مامور ہوا۔ اس کو سراغ رسانی کے لئے جیل میں جانے کی ضرورت تھی اس لئے اُس نے چورنگر ایک گھر میں نقب لگایا جاگ ہو گئی پکڑا گیا آلات نقب ساتھ تھے۔ زد و کوب ہوئی۔ مشکیں کسی گٹس۔ حوالات میں بند ہوا۔ ہتھکڑی پہنا کر سر بازار کچھری لایا گیا کہڑے میں کھڑا کیا گیا مجرم کا انکار کیا آخر گواہوں کی شہادت پر جھوٹا قرار پاکر سزائی قید کا حکم سنا اور جیل خانہ میں داخل کیا گیا۔ وہاں چکیاں پیسیں، بیدیں کھائیں اور مہینوں قید یوں کی سی ساری خدمتیں انجام دیں۔ آخر ان قیدیوں سے رابطہ ضبط بڑھا کر جو حقیقت قاتل تھے اور ان کا رفیق حبیل بن کر حقیقت کا پورا پتہ چلا لیا۔ اس وقت اپنے محکمہ کو اطلاع دی اور وہاں سے حکم آیا کہ بوقت راحت رام فوراً جیل سے لیا جائے۔

چنانچہ مقدمہ دوبارہ چلا اور قاتلین کے لئے سزائے موت کا وہ نتیجہ برآمد ہوا جو امن عام و بقا سلطنت کا ضامن ہے۔ یہ ادنیٰ ترین مثال ہے کہ چند لوگوں کی خاطر، انگریزی حکومت کے ماتحت، ایک شریف و معزز آفسیہ محکمہ قانون تعزیرات کی صریح خلاف ورزی کرتا اور باطنی حکم کو



آنا پوشیدہ رکھتا ہے کہ کسی سرکاری ملازم کو بھی پتہ نہیں لگنے دیتا کہ میرا مجرم و سزا یاب بننا سرکاری حکم کی تعمیل میں ہے۔ کیونکہ نتیجہ کی ساری کامیابی کا مدار اسی اخفاء و راز پر ہے۔ پھر کیا پوچھنا حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا جن کے قلوب مجسم نور اور امتثال امر الہی کا پتہ ہیں۔ سیدنا یعقوب و سیدنا یوسف علیہما السلام کا وہ ممتد ابتلاء امتحان جو ایک سچی اور مہی کہانی بن کر احسن القصص کہلایا اسی ترتیب واقعات کو چاہتا تھا جو برادران یوسف سے صادر ہوئے۔ قدرت الہی کا یہ کرشمہ کہ ایک بنی زادہ حسن و جمال کا پتلہ بچپن میں لاڈلے باپ سے جدا ہوتا ہے۔ چند کھوٹے ٹکوں کے عوض فروخت ہوتا ہے غلام بن کر مصر میں آتا ہے برسوں طرح طرح کے امتحان میں ڈالا جاتا ہے اور آخر اسی مصر کا حاکم با اختیار ہوتا اور مصر کا بچہ بچہ اس کا زرخیز غلام بنتا ہے، دنیا پر کیسے ظاہر ہوتا اگر برادران یوسف اس کے لوازمات و مقدمات کو خفیہ حکم الہی کے ماتحت اس رازداری کے ساتھ انجام نہ دیتے کہ غیر تو غیر خود باپ اور بھائی کو خبر نہ ہوئی کہ صریح ظلم و جفا کی صورت کیوں اختیار کی۔ کیا ٹھکانا ہے اس اخفاء و راز کا کہ بجز خال خال اہل مشاہدہ کے عام مسلمان بھی نہ سمجھ سکے کہ یہ باطنی حکم الہی کا امتثال اور احسن القصص مرتب کرنے کی خاطر تھا۔ رہا یہ امر کہ باطنی حکم کی صورت کیا تھی سو ظاہر ہے کہ نبی کا خواب بھی وحی الہی ہے اگر خواب میں بیٹے کو ذبح کرتے دیکھیں تو حکم خدا ہونے کے سبب بیداری میں اس کے گلے پر چھری رکھنے میں دریغ نہیں ہوتا پھر کیا پوچھنا بیداری میں قلب پر خطرہ و خیال وارد ہونے کا کہ اس کا امر من اللہ ہے۔ نزول وحی کے تابع خواہ انبیاء ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وحی اور خاطر قلبی دونوں حسب علم الہی مشیت الہیہ کے تابع ہیں مگر قلب نبی کو اصل قرار دیکر حق تعالیٰ اپنے تجویز کردہ امر مقدر کو اول نبی کے قلب پر وارد فرماتا ہے اور پھر اسی کو وحی بنا کر اسی نبی پر نازل فرماتا ہے۔ واللہ اعلم۔

(۳۳) وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ اور اسے محمد تم لوگوں کا اندیشہ کرتے ہو حالانکہ اللہ زیادہ مستحق ہے کہ اس کی ناراضی کا اندیشہ کرو۔ میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو سید العارفین اور امام الانبیاء والمرسلین ہیں پھر آپ پر حق تعالیٰ نے یہ عتاب کیسا فرمایا؟ حضرت ممدوح نے اس کا جواب بھی وہی دیا کہ حضرت زینب جب حضرت زینب کو طلاق دینے کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ لیا تو حالانکہ آپ کو علم تھا کہ حضرت زینب آپ کی زوجیت میں آئیں گی۔ مگر آپ نے مشورہ یہ دیا کہ اللہ سے ڈرو اور زینب کو بیوی بنائے رکھو۔ اس کے بعد آپ نے خود اپنے نفس پر عتاب فرمایا کہ لوگوں کا اندیشہ کرتے ہو حالانکہ اللہ زیادہ مستحق ہے کہ اس کا اندیشہ کرو۔ چنانچہ باطن محمدی کے موافق وحی کا نزول ہو گیا۔ اور حق تعالیٰ نے اسی عتاب کے طرز میں آپ کا وارد قلبی ظاہر فرما دیا۔

فہم۔ یہ قصہ یہ تھا کہ حضرت زینبؓ آل حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی



پھوپھی امیمہ بنت عبدالمطلب کی لڑکی یعنی آپ کی پھوپھی زاد بہن تھیں اور حضرت زید ابن حارثہ قبیلہ بنی قضاہ کے ایک شریف عرب تھے جن کو بچپن میں ڈاکوؤں نے پکڑ کر سوق حباشہ میں کہ مکہ کے قریب سالانہ منڈی لگا کرتی تھی ان کو بیچ دیا تھا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان کو خرید لیا اور انہوں نے حضرت کی تذکرہ دیا۔ حضرت نے ان کو آزاد فرما کر اولاد کی طرح پرورش کیا حتیٰ کہ لوگ ان کو آپ کا متبنا اور زید بن محمد کہنے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح حضرت زینب سے کر دیا کہ اس میں ننگ و عار کی بھی اصلاح تھی کہ اونچے گھرانے کی عورت کا ایسے شخص سے نکاح کرنا جس پر غلامی کا کبھی نام بھی آجائے عار معلوم ہوتا تھا۔ نکاح تو ہو گیا مگر حضرت زینب آخر عورت تھیں اور عرب کے بہترین قبیلہ بنی ہاشم کے خاندان کی تھیں اس لئے ان کی نظروں میں حضرت زید کی وہ وقعت نہ آئی جو شوہر کی ہونی چاہیے تھی اور میاں بیوی میں موافقت نہ ہوئی۔ آخر رات دن کی کلفت سے پریشان ہو کر حضرت زید اس پر مجبور ہوئے کہ طلاق دیدیں اور اس کی اجازت لینے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے حضرت نے اس کی اجازت نہ دی اور فرمایا کہ گھر بیٹھے اللہ نے یہ نعمت بخشی ہے کفران سے دُرو اور صبر و تحمل سے کام لو۔ اس پتر آیت نازل ہوئی۔ مفسرین کے اس بارہ میں مختلف اقوال ہیں کہ لوگوں کی طرف سے وہ کیا اندیشہ تھا جس کو حضرت نے دل میں مصمر رکھا اور اس کی رعایت سے طلاق کا مشورہ نہ دیا۔ بعض کی رائے ہے کہ اندیشہ یہ تھا کہ اگر زید نے طلاق دیدی تو لوگ کہیں گے حضرت نے کیسا بے جوڑ رشتہ کرایا جس کا نباہ نہ ہو سکا۔ بعض کی رائے ہے کہ جو کچھ ہوا تھا امر مقدر تھا اور حکم الہی کی تعمیل میں ہوا تھا۔ آئندہ یہ مقدر تھا اور حضرت کو اس کا علم بھی تھا کہ حضرت زینب آپ کی زوجیت میں آئیں گی۔ گویا یہ امر تکوینی آپ کے لئے حکم باطنی تھا جس کا مقتضا یہ تھا کہ آپ نے حضرت زید کو اجازت دیتے طلاق دینے کی کہ اسی پر حضرت زینب کا اُم المؤمنینؓ بننا موقوف تھا۔ مگر آپ کو اندیشہ ہوا کہ لوگ کہیں گے خود نکاح کرنے کے لئے حضرت زید سے طلاق دلائی۔ ممکن ہے یہ اندیشہ ہو کہ لوگ کہیں گے ہو سے نکاح کر لیا۔ یہ حال لوگوں کی چہرہ گیوٹیاں کا جو بھی اندیشہ تھا محض اس لئے تھا کہ لوگوں کے ایمان پر یاد ہوں گے اور کہیں گے یہ فتنہ صنعاء مسلمین کو مرتد نہ بنا دے اور اس اندیشہ کی رعایت کرنا امر ظاہر کا مقتضا اور عین دین تھا کہ جو خبر آتے ہی ہیں کھر سے ایمان کی طرف لانے کو، نہ کہ برعکس۔ لہذا آپ آپ نے طلاق دینے سے حضرت زید کو منع فرمایا۔ مگر آپ اس کے بعد خود ہی خیال آیا کہ تجویز الہی کے خلاف کا ارتکاب ہوا اور مجھے مناسب تھا کہ امر مقدر من اللہ میں کوئی پس و پیش نہ کرتا۔

اس بنا پر آپ نے اپنے دل میں خود اپنے اوپر عتاب فرمایا اور اسی کے موافق آیت شریفہ کا نزول ہو گیا۔ چنانچہ حضرت زید نے طلاق دیدی، اور حضرت زینب ام المؤمنینؓ بنیں، اور جن



مصلح دینیہ کے یہ سب مقدمات و لوازم تھے۔ ان کا ظہور ہوا۔ کہ متبنیٰ بنانے کی رسم ٹوٹی، اور لوگوں نے متبنیٰ کو حقیقی بیٹے اور اس کی بیوی کو سگی بہو ہونے کا جو درجہ دے رکھا تھا عملاً اس کا تخم نکال چھڑکا گیا۔ لاکھ زبان سے سمجھایا جاتا مگر لوگوں کو اس پر عمل کرنا دشوار تھا۔ جب کوئی کہتا ہی کہتا کہ مانا نکاح حلال ہے مگر فرض تو نہیں ہے۔ اور دنیا میں عورتوں کا قحط تو نہیں پڑ گیا۔ کیا ضرور ہے کہ جس پر بہو ہونے کا نام آگیا اسی کو بیوی بنایا جائے زبان بھی اقرار کر لیتی مگر دل کا کھوٹ نکلتا کہ طبیعت خالی ہو کر متبنیٰ کی بیوی کو دوسری حلال عورتوں کی طرح مان لے بغیر اس کے ناممکن تھا کہ حضرت قریشی و ہاشمی خاندان میں ہو کر خود اس پر عمل فرمائیں۔ ایک حلال عورت کو دلوں کا حرام کی فہرست میں داخل کرنا ایمان کے لئے بڑا تاریک پہلو تھا اس کی اصلاح کے لئے یہ سب صورتیں مقدر ہوئیں کہ زید پکڑے گئے، مکہ میں لاکر بیچے گئے، غلام بنے ہوئے حضرت کی خدمت میں پہنچے، آزاد کئے گئے۔ حضرت نے ان کو متبنیٰ بنایا۔ حضرت زینب سے رشتہ ہوا۔ انہوں نے منظور کیا۔ نکاح ہوا مگر نباہ نہ ہوا اور وہ صورتیں جنہوں نے حضرت زید کو طلاق پر مجبور کیا مقدر بنکر سامنے آئیں، حتیٰ کہ طلاق ہوئی۔ اور آخر کار حضرت زینب ام المؤمنین بن کر خاتم النبیین کی شرف زوجیت سے ہمراہ یاب ہوئیں۔ یہ مقدمات جن سے حد بندی شریعت کا یہ بہترین نتیجہ نکلا عند اللہ کتنے پیارے ہوں گے۔ نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اندیشہ فتنہ سے بھی اُمت کو یہ سبق ملا کہ دینی مضر توں کی رعایت کرنا بھی عین دین ہے۔ اور اسی لئے آیت شریفہ میں اَحَقُّ آیا جس کا یہ مطلب ہے کہ لوگوں کے فتنہ میں پڑنے کا اندیشہ بھی جس پر تم نے عمل کیا اگرچہ حق ہے کہ اللہ ہی ڈرنے کی فرع ہے مگر تجویز الہی کا علم ہو جانے پر دوسرے پہلو کی رعایت زیادہ احق تھی۔ ۱۲

نیز حضرت نے فرمایا کہ کتب سہادیہ میں غور کرو گے تو ان کی آیات میں کلام قدیم کا بھی نور پاؤ گے اور جس حالت کا بھی اس وقت بنی کی حالت پر غلبہ تھا اس کا بھی ان میں نور پاؤ گے مثلاً کبھی قبض کی حالت ہوتی تو اس وقت نازل ہونے والی وحی میں کلام قدیم کا بھی نور ہو گا اور کبھی لبط کی حالت ہوتی تو اس وقت کی نازل شدہ وحی میں نور کلام قدیم کے ساتھ نور لبط بھی ہو گا اور کبھی تواضع کی حالت ہوتی تھی تو اس وقت جو وحی نازل ہو گی اس میں نور کلام کے ساتھ نور تواضع بھی ہو گا غرض کوئی آیت بھی نور کلام الہی اور نور طبیعت محمدیہ سے خالی نہ ہو گی ان میں پہلا نور قدیم ہے اور دوسرا حادث اسی طرح آیت وَتَخْشَى النَّاسَ میں نور کلام قدیم بھی ہے اور نور عتاب بھی ہے کہ اس کے نزول کے وقت طبیعت محمدیہ میں عتاب تھا۔ پس کلام قدیم اللہ کی طرف سے نہیں، اور عتاب خود آپ کی طرف سے ہے، اللہ کی طرف سے نہیں۔ نیز آپ نے فرمایا کہ اہل فتح جب کسی آیت میں بحث کرتے ہیں تو ان کا بڑا اتہام شان نزول میں ہوتا ہے۔ اور شان نزول سے مراد وہ واقعات نہیں جن پر علماء ظواہر کی نظر جاتی ہے بلکہ وہ انوار اور حالات مراد ہیں جو نزول آیت کے وقت طبیعت محمدیہ پر طاری تھے چونکہ وہ حضرات باطن محمدی یعنی آدمیت، لبط، قبض، نبوت، روح، رسالت



اور علم کامل کے سمندروں میں غوطہ لگاتے ہیں۔ اس لئے ان کی تفسیر میں وہ عجائبات ہوتے ہیں جن کی کیفیت ناقابل بیان ہے۔ حقیقت کا علم تو خدا کو ہے مگر مثال کا درجہ یہ ہے کہ رنگ برنگ کے شیشوں میں ایک نور اس کے جرم کا ہے کہ شیشہ ہے صاف شفاف اور یہ نور اس کا ذاتی واصلی ہے اور دوسرا نور ہنریا سرخ یا زرد رنگ کا ہے کہ گویا جرم میں پیوست ہے مگر عارض ہے جزو ذات نہیں واللہ اعلم۔

خلاصہ ان تمام تقریروں کا یہ ہے کہ نبی کا قلب چونکہ مجسم نور ہے اس لئے جس فعل کا بھی ارادہ و خیال اس پر وارد ہوتا ہے وہ بمنزلہ وحی من اللہ کے ہوتا ہے گویا ان کو باطناً حکم ہوتا ہے کہ ایسا کریں اور جب یہ شان ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا امتثال طاعت میں داخل ہے خصوصاً جبکہ لوح محفوظ میں لکھا ہوا ان کو نظر بھی آچکا ہو کہ علم الہی میں ہم سے اس فعل کا صدور مقدر ہوا ہے لہذا وہ بامثال امر باطنی اس کے فاعل و عامل بنتے ہیں مگر جب دیکھتے ہیں کہ امر ظاہر جس کا نام شریعت ہے اس کے خلاف ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ ہم سے امر الہی کی نافرمانی ہوئی اور اس لئے روتے اور اپنے آپ کو خود ہی نفرین کرتے ہیں کہ ایسا کیوں کیا اور یہ بھی چونکہ اسی قلب پر وارد ہوا ہے جو مجسم نور ہے اس لئے اس نے بھی وہی حکم لیا کہ وحی الہی ہے، لہذا وہ وحی ظاہر بن کر اپنے نازل ہو گیا گویا پہلا وار واللہ کا باطنی حکم اور باطنی وحی تھی اور یہ دوسرا وار کہ حکم ظاہری کی مخالفت کا نفس پر عتاب ہے ظاہری حکم اور ظاہری وحی ہے پس ان کا فعل معصیت بھی نہ ہو کہ عصمت پر عتاب آئے اور عتاب حقیقتہً اللہ کی طرف سے گرفت و مواخذہ ہی نہ ہو ممکن ہے کوئی یہ شبہ کرے کہ اس تقریر کی رو سے حضرات انبیاء کی شان مسلوب الارادہ کی ہوئی لہذا جس طرح ان کی خطا خطا نہیں اسی طرح طاقت طاعت بھی نہ ہو کہ دونوں فعل اسی وار قلبی پر مرتب ہوئے ہیں جس میں ان کے ارادہ کا دخل نہیں۔ جواب یہ ہے کہ واردات و خطرات قلب میں تو بے بیشک کہہ سکتے ہیں کہ ارادہ کا دخل نہیں ہے مگر فعل کے درجہ میں کون عاقل ہے جو اس کو مان لے کہ اس کا صدور عرشہ کی سی حرکت یا مشین کے پرنزوں کی طرح اضطراری و بے شعوری کے ساتھ ہوا ہے لہذا ان کی طاعت بھی طاعت بالارادہ ہے اور یہ خطا جو امر باطنی کے درجہ میں طاعت ہے اور محض امر ظاہری کے درجہ میں صورت خطا ہے یہ بھی بالارادہ ہے نیز جو عتاب بر نفس اور گریہ و زاری کا مرتب ہوا ہے اس میں بھی اختیار و ارادہ کا پورا دخل ہے۔ انسان ہمیشہ تقدیر کے مسئلہ کو سامنے لا کر جزائے کے ساتھ کہہ دیتا ہے کہ ہم اپنے افعال میں مجبور ہیں کہ تقدیر کے خلاف نہیں کر سکتے۔ انہیں جبر کے خیال کو تو دل سے نکال ہی دینا چاہیے جبکہ وہ مشاہدہ کر رہے ہیں کہ ہماری حرکت، عرشہ کی سی نہیں ہے۔ اگر ہمارے یہ افعال جبری و غیر اختیاری ہیں تو تبار آگے چل کر عرشہ کی حرکت کا یا مثلاً کوئی پکڑ کر جبراً ہمیں کنوئیں میں ڈال دے تو اس کا کیا نام رکھو گے۔ اگر جبراً ہمیں پورا ہو گیا تو جس کو دنیا جبراً سمجھ رہی ہے اس کا نام کچھ اور ہونا چاہیے۔ بہر حال افعال حضرات انبیاء کے بھی



ارادی ہیں فرق اتنا ہے کہ وہ مجسم نور ہیں اس لئے صورت خطا بھی ان کی طاعت ہے اور ہمارے قلوب میں چونکہ ظلمت بھی ہے اس لئے ہمارا وار و جی ہے اور نہ وہ ہمارے لئے باطناً امر من اللہ ہے اور نہ ہم اس کے مسکلف ہیں کہ ظاہر شرع کو چھوڑیں۔ لہذا ہمارا جو فعل اس امر ظاہری کے موافق ہوگا وہ طاعت میں درج ہوگا اور جو اس کے خلاف ہوگا وہ معصیت و خطا قرار دیا جائے گا۔ دوسرا شبہ ممکن ہے یہ ہو کہ مسلوب اللہ وہ ہوتا تو صوفیہ کے نزدیک کمال عبدیت ہے اور جگہ جگہ اولیاء و انبیاء کی شان یہی بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنے اندر فعل الہی کے تصرف کا مشاہدہ کرتے اور خوب سمجھتے ہیں کہ ہم بمنزلہ ظروف خالیہ کے ہیں۔ کھلا بُرا جو کچھ بھی ہو رہا ہے اللہ کی طرف سے ہوا ہے کہ تصرف کا حق اس کے سوا کسی کو بھی نہیں اور اسی بنا پر مدح و ذم ان کے نزدیک یکساں ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کو علم الیقین ہے کہ سب من اللہ ہے لہذا خوب سمجھ لو اور یاد رکھو کہ اس کا مطلب اُس ارادہ کی نفی نہیں ہے جو صدور فعل سے پہلے ہوا کرتا ہے اگر یہ مراد ہو تو ساری شریعت ہی اٹھ جائے اور اللہ کا قانون جو بغیر من تنفیذ بھیجا گیا ہے معطل ہو جائے۔ نہ سارق کا ہاتھ کاٹا جائے کہ وہ بھی من اللہ ہوا ہے اور نہ زانی کو سنگسار کیا جائے کہ وہ بھی بتصرف الہی ہوا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہی مسلوب الارادہ اور مخلوق کو ظروف خالیہ سمجھنے والے حضرات ہم دیکھتے ہیں کہ قانون الہی کے حامل اور سب زیادہ اس پر عامل ہوتے اور اس کی تنفیذ کا جتنا اہتمام کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے مگر حدود و تعزیرات کا اجراء نہ ملے، ان حضرات نے کیا ہے دنیا میں کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ لہذا مسلوب الارادہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ارادہ نفسانی اور اس کا استقلال سلب ہو چکا ہے کہ ان کا ارادہ، ارادہ الہیہ کے ماتحت و تابع بن گیا ہے جو بھی اللہ کا ارادہ ہوتا ہے وہی ان کا ارادہ بن جاتا ہے۔ کیونکہ خلاف کرنے کا ان میں مادہ ہی نہیں ہے اور وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں اُس ارادہ سے کرتے ہیں جو تابع ہے رضائے حق کے کہ پہلے حکم الہی کا علم ہو جاتا ہے خواہ فرشتہ کے ذریعہ ہو یا الہام والقا کے ذریعہ جس کا نام وار و قلبی و خواطر قلوب ہے۔ اس کے بعد فعل کا ارادہ کرتے ہیں۔ برخلاف ہمارے کہ ہم شریعت کے مسکلف ہیں اور جان بوجھ کر کہ اللہ کی رضا اس فعل میں ہے، اس کے خلاف کا ارادہ اور پھر اس پر عمل کرتے ہیں۔ اس لئے ہمارے افعال کا صدور نفسانی ارادہ کی طرف منسوب ہے اور مستحق سزا ہے۔ رہا یہ امر کہ ہوا وہ بھی یا مرتقدیری ہے۔ سو بیشک صحیح ہے مگر اس کا علم ہمیں صدور فعل کے بعد ہوا ہے۔ کیونکہ نہ لوح محفوظ کو ہم نے دیکھا اور نہ دیکھ کر فعل کا ارادہ کیا۔ پس کتنا فرق ہے اس میں کہ ایک شخص کو امر مقدر یعنی تجویز خداوندی کا پہلے علم ہو جائے اور وہی اس کے لئے محرک ہو فعل کا اور اس میں کہ امر تقدیری سے جاہل و ناواقف بن کر فعل کا محرک بنائے ذاتی قصد اور نفسانی ارادہ کو اور پھر اس کو سرچپ کے مقدر کے۔ ایک ڈاکٹر قصد کھولتا ہے اور خون نکالتا، تو وہ محسن اور مستحق حمد و ثناء ہے۔ اور ایک ڈاکٹر چھری مارتا ہے قتل کے ارادہ سے مگر وہ پڑ جاتی ہے رگ پر اور



فصد کا کام دے جاتی ہے، وہ مجرم اور مستحق سزائے قتل ہے۔ طرہ بران عامی شخص کی یہ تحویل بھی صرف غلطیوں میں ہے  
 ورنہ طاعات اور خوبیوں کو پھر بھی اپنی طرف منسوب کرتا ہے بلکہ ان پر خوش ہوتا، باز کرتا، دوسروں سے مدح سرائی  
 چاہتا اور ان کے صلہ و انعام کا اللہ پر حق جتانے ہے۔ طاعت کے متعلق اس کا یہ رویہ اور اقتضاء طبعی اس پر حجت ہے  
 کہ معصیت و خطا کی بھی شان یہی ہونا چاہیے تھی کہ روتا، بیلاتا، شرماتا اور رٹ پتا۔ مگر اپنے عیب کو براہ و تکبر اپنی طرف منسوب  
 کرنا گوارا نہ کرتے ہوئے معصیت مار رہا ہے تقدیر کے اور منسوب کر رہا ہے اللہ سبحانہ کی طرف ورنہ کم از کم  
 صدور طاعت پر جیسا سکون و سرور لاحق ہوا ہے ایسا ہی صدور معصیت پر اضطراب و حزن لاحق ہوتا اور  
 پھر یوں کہتا کہ کُلُّ مَن عِنْدَ اللَّهِ مَزِيدٌ بَرَّانٌ تقدیر کے سامنے اگر سر جھکانا اس کو نصیب ہو گیا ہے جیسا کہ صدور  
 معصیت کے وقت اس کا دعویٰ ہے تو جس وقت حق تعالیٰ نے اسی معصیت کا نام رکھ کر اس کو قانونی سزا  
 دلائے مثلاً سنگسار کرائے یا ہتھ کٹوائے اگر اس پر بھی اسی طرح سر جھکا لئے رہے کہ یہ بھی امر مقرر اور من اللہ  
 ہے تب تو دعویٰ کا ثبوت و ید یا۔ اور اگر غصہ بڑھتا ہے کہ وہ صاحب خود ہی کرا میں اور خود ہی پٹوائیں تو معلوم ہوا  
 کہ محض دھوکا دینا مقصود ہے رضا بر قضا خاک نہیں روزہ جس نے معصیت صادر کرائی اسی نے سزا بھی دلائی ہے  
 اس کے کیا معنی کہ اس وقت راضی و مکن تھے اور اب ناخوش ہو گئے اور حیلہ اٹھتے۔ حدیث میں آتا ہے کہ دو  
 شخص جہنم میں پڑے ہوئے بہت شور و غوغا مچائیں گے۔ حکم ہو گا کہ ان کو سامنے لاؤ۔ چنانچہ دربار الہی میں پیش  
 کئے جائیں گے دریافت کیا جائے گا کہ کیوں چیخ چلا رہے ہو؟ عرض کریں گے بار الہا تکلیف برداشت نہیں ہوتی  
 تو بے اب ہم پر رحم فرما دیجئے۔ حکم ہو گا تو یہ کارمانہ گذر چکا واپس جاؤ جہنم میں۔ چنانچہ فرشتے پھر ان کو کشاں  
 کشاں جہنم کی طرف لے جائیں گے۔ کنارہ پر پہنچ کر ایک تو کھڑا ہو جائے گا اور دوسرا اپنے آپ کو جہنم میں جھونک  
 دے گا اس سے دریافت کیا جائے گا کہ تم کھڑے کیوں ہو گئے؟ عرض کرے گا کہ رب العالمین اس امید پر کہ  
 آپ کا رحم جس بد حال کو ایک مرتبہ جہنم سے نکال لیتا ہے دوبارہ اس میں نہیں ڈالا کرتا۔ میں ایسا بد نصیب کیوں بن گیا  
 کہ جہنم سے نکالے جانے کے بعد پھر اسی میں جھونکا جاؤں۔ حکم ہو گا اچھا جاؤ جنت میں دوسرے سوال کیا جائے گا کہ  
 تم نے ایسا خیال کیوں نہ کیا اور بے دریغ جہنم میں کیوں چلے گئے؟ عرض کرے گا کہ بار الہا آپ کے حکم کی تعمیل میں کہ  
 اگر آپ کی رضا اسی میں ہے تو سر آنکھوں پر راضی ہوں میں اسی میں جس میں تیری رضا ہے حکم ہو گا اچھا جاؤ جنت  
 میں۔ دیکھا آپ نے رضا بر قضا کا ثمرہ اور سمجھی آپ نے کُلُّ مَن عِنْدَ اللَّهِ کے سامنے سر جھکانے کی حقیقت  
 اگر واقعی صدور معصیت کے وقت آپ کی رضا بر قضا حقیقی ہے تو جہنم میں جانے پر امتحان ہو جائے گا اور پھر  
 یقیناً ارتکاب معاصی کا انجام بھی نجات و دخول جنت ہو گا ورنہ یہاں باتیں بنانے سے علماء علیلہ انبیاء کو بھی اگر ساکت  
 و لا جوابہ کر دیا تو کیا حاصل اور محض زبان درازی ہے۔ حضرات انبیاء کی یہی شان ہے کہ



اپنے اندر اور تمامی مخلوق کے اندر تصرفات الہیہ کو ہمہ وقت جاری و ساری دیکھتے ہیں۔ اس لئے رضا بر قضا اور شان تسلیم و تقویٰ کے تقاضے سے سب کچھ من اللہ سمجھتے اور ان کے امور تکوینیہ کے سامنے جھکتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی امور شرعیہ یعنی قانون الہی کو بھی جس کا حامل و منفذ بنا کر انکو دنیا میں بھیجا گیا ہے من اللہ سمجھتے اور اس کے سامنے جھکتے ہیں اور اسی میں ان کا ابتدا و امتحان ہوتا ہے کہ کبھی ان کے لئے کوئی فعل ایسا مقدر کیا جاتا ہے جس میں تکوین کہتی ہے کرو، اور شریع کہتی ہے نہ کرو۔ اور یہی تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ بازیک راستہ ہے۔ مگر محمد اللہ بڑی خوبی سے یہ سرداران خلق اس کو عبور کرتے ہیں کہ امر تکوینی کا امتثال بھی کیا اور فوراً کیا۔ اور امر شرعی کے امتثال میں قصور پاکر روئے اور فوراً روئے مگر اس قصہ زید و زنیب میں امتحان کی دوسری شان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امتثال فرمایا اور ظاہر کا اور فتنہ و ہیان کی رعایت کو ترجیح دیکر حضرت زید کو مشورہ دیا حسن معاشرت کا۔ پھر نظر گئی امر مقدر اور تکوین باطنی پر تو ندامت ہوئی اور عتاب ہوا اپنی ذات مطہرہ پر۔ لیکن دیگر انبیاء میں عموماً اس کا عکس ہوا ہے کہ امر باطنی کا امتثال سبب ہوا ہے خلاف امر ظاہر کا۔ اس میں خاص نکتہ اور دقیق اشارہ ہے اس طرن کہ طبیعت محمدیہ نے عمل کے درجہ میں امر ظاہری کو امر باطنی پر ترجیح دی اور شریعت ظاہرہ کا احترام غالب رکھا ہے امور باطنیہ پر فراڈ کیوں عظمت اس شریعت بیضی کی جس کو آج امت ہی پامال کر رہی ہے اور اپنے خیالی تصورات کو بھی اس پر ترجیح دے کر اس کا مذاق اڑا رہی ہے۔ اور ذرا سمجھو احرام حاملین شریعت یعنی علماء امت کا کہ ان کی غلطی بھی دوسروں کے صواب سے عند الرسول راجح العمل ہے۔ اور اس میں خصوصی سبق اہل باطن بلکہ اہل مشاہدہ کہے واللہ اعلم (۳۴) عَقَّا اللّٰهُ عَنْكَ لَیْلَہٗ اَزَدْتُ لَکُمْ حَتّٰی اَتَّیْبَنَّ لَکَ الْذِّیْنَ صَدَقُوا وَ لَعَلَّہُمُ الْکَافِرِیْنَ اللہ تمہیں معافی بخشے تم نے اس سے پیشتر ان کو اجازت کیوں دی کہ وہ بھی تم پر ظاہر ہو جاتے جو سچے ہیں اور وہ بھی تم کو معلوم ہو جاتے جو جھوٹے ہیں۔ (واقعہ یہ تھا کہ ۹۰ ع میں قیصر روم نے دو لاکھ باقاعدہ لشکر سے مدینہ پر حملہ کرنے کا ایسا وقت ارادہ کیا جبکہ گرمی شدید پڑ رہی اور کھجور کی فصل جس پر اہل عرب کا گزاران تھا۔ تیار کٹ رہی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تہیہ فرمایا کہ اس ٹڈی دل کو ٹام و عرب کی سرحد ہی پر روک دیا جائے۔ اس غزوہ کا نام غزوہ تبوک ہے۔ یہ غزوہ ہر جہت سے سخت ترین غزوہ تھا جس نے کھرے اور کھوٹے کو علیحدہ کر کے رکھ دیا اور اسی لئے اس کو فاضل یعنی رسوا کرنے والا بھی کہتے ہیں کہ منافقون کی اس میں قلعی کھل گئی۔ جب آپ نے سفر جہاد کا اعلان فرمایا تو منافقون نے طرح طرح کے بہانے اور سفر سے معذری کے جھوٹے اعدا پیش کئے۔ جو بھی کوئی عذر لایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قبول فرما کر اجازت دیدی کہ بہتر ہے اگر نہیں جاسکتے تو گھر بیٹھو۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ یہ منافقون کی چال تھی تاکہ جنگ میں بھی نہ جانا پڑے



اور نفاق پر پروہ بھی پڑا رہے۔ آپ کو اجازت نہ دینا چاہئے کبھی کہ جانے نہ جانے کا مدار عذر کی حقیقت پر رہتا اور آپ کی اجازت کو آڑ نہ بنایا جاتا۔ دنیا خود دیکھ لیتی کہ فلاں شخص واقعی معذور ہے اور فلاں شخص محض حیلہ جو ہے) اس میں تین شبہات ہیں اول وہی کہ عتاب ہے سید الانبیاء پر دوم اظہار ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جھوٹا اور سچا معلوم نہ تھا اور موہن و منافق میں امتیاز نہ فرما سکے سوم عفو مثبت خطبہ ہے کہ معافی اسی کو دی جاتی ہے جو غلطی کرے) اس کے متعلق بھی حضرت ممدوح نے اسی کے قریب قریب فرمایا کہ حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا تھا عفو و مسامحتہ اور بہتر طریق سے مدافعت کا حتیٰ کہ ارشاد ہوا ہے وَكَوْنْتُ فَظًّا غَلِيظًا الْقَلْبُ لَا تُفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ اے محمد اگر تم ترش زبان اور سخت دل ہوتے تو لوگ کبھی کے تمہارے پاس سے بھاگ لئے ہوتے لہذا ان کی غلطیوں کو معاف کرتے رہو اور معاملات میں ان کا مشورہ لے لیا کرو، چنانچہ مخلوق کے ساتھ آپ کا یہی نرم اور چشم پوشی کا ہمیشہ) برتاؤ رہا جب منافقین آپ کے پاس آئے اور عذرات پیش کر کر کے سفر سے معافی ملنے کی درخواست کی تو آپ نے باوجودیکہ ان کے نفاق سے واقف تھے طبعی شفقت و مرحمت کی بنا پر ان پر اس لئے کہ آپ کو معاشرت میں بہترین صورت اختیار کرنے کا حکم تھا اور متعدد آیات میں آپ کو اس کی ترغیب دی گئی تھی صرف ان کی ظاہری صورت پر حکم لگایا اور ان کو (مدینہ میں رہ جانے کی اجازت دیدی۔ اس کے بعد خود ہی آپ کے قلب میں خیال پیدا ہوا کہ ان کا تو پردہ کھلنا اور کھوٹ ظاہر ہونا چاہیے تھا۔ مگر چونکہ آپ کی طبیعت میں شرم و حیا کا مضمون زیادہ تھا۔ چنانچہ رجب طعام و لیمہ کھا چکنے کے بعد بھی لوگ نہ اٹھے تو حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي الْبَنِيَّ فَيَسْتَعْجِلْ مِنْكُمْ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَعْجِلُ مِنْ الْحَقِّ ہ کہ مسلمانو! متہراسے اس طور و طریق سے بنی کو ایذا پہنچتی ہے اور وہ اگر تم سے (یہ کہتے ہوئے کہ اب رخصت ہو جاؤ) شرماتے ہیں مگر اللہ حق بات کہنے میں نہیں شرماتا۔ اس بنا پر آپ کی یہ خواہش تھی کہ حق تعالیٰ ہی اس کی بھی کفالت فرمائے اور عتاب الہی کی صورت میں کوئی آیت قرآنیہ نازل فرما دے تاکہ تجھ پر کوئی بات بھی نہ آئے اور نصیحت بھی زیادہ موثر بن جائے اور تنبیہ بھی ہو جائے کہ آئندہ بنی کے ساتھ منافقانہ برتاؤ کبھی نہ کریں۔ کیونکہ نزول آیت سے یہ سبق ملے گا کہ منافقون کے برتاؤ پر گرفت و محاصرت میں اللہ اپنے نبی کا وکیل ہے (جو عالم الغیب اور شدید العتاب ہے) غرض صورت عتاب متعدد مصالح کو متضمن ہے، ورنہ حقیقت میں عتاب ہی نہیں صرف صلیب کی اپنے محبوب کے بدلہ مقدمہ میں پیروی ہے (کہ تم بیٹھو ہم سب دیکھ لیں گے۔ پس اس کی ایسی مثال ہوئی جیسے کسی مافی مقدمہ میں کوئی وکیل اپنے موکل سے کہے اللہ تم کو معاف کرے تم نے ایسی غلطی کیوں کی کہ اس بد معاشر کو قرض دیکر اس کا کام چلا دیا۔ جب تک در بدر بھیک مانگتا نہ پھرتا اس کو



تو کھوٹا پیسہ بھی نہ دینا چاہیے تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ خیال کر لینا کہ آپ کو عذر کرنے والوں میں سچے اور چھوٹے کا امتیاز نہ تھا۔ کسی درجہ میں بھی صحیح نہیں۔ آپ سے تو کیا چھپا رہ سکتا تھا جبکہ اس زمانہ کا اہل فتح بھی اُس زمانہ کے سچے اور چھوٹے سے پوری واقفیت رکھتا ہے حالانکہ متسامی اہل فتوح کو جو کچھ بھی نصیب ہوا ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی محبت کی بدولت نصیب ہوا ہے کہ انوار محمدی کے ایک بال برابر مقدار سے ان کو سیرابی بخشی گئی ہے اور اس کی روشنی سے دل کی تہ میں چھپا ہوا نفاق اور کاذب کا کذب نظر آتا ہے، پھر حضرت کا تو کیا پوچھنا جبکہ حدیث انزل القرآن علی سبعة احصرت میں معلوم ہو چکا کہ آپ کے علم کی کیا کیفیت تھی۔ ۱۳

امام بیضاوی نے اس جگہ بڑی غلطی کھائی ہے کہ کہتے ہیں غَفَا اللہُ عَنْكَ اشارہ ہے کہ دوبارہ اذن منافقین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خطا صادر ہوئی کیونکہ معافی کسی غلطی ہی پر ہوا کرتی ہے، حاشیہ پر شیخ الاسلام علامہ زکریا نے لکھا ہے کہ اس میں امام بیضاوی نے زحشری کا اتباع کیا ہے اور زحشری کے بارہ میں علامہ طیبی نے لکھا ہے کہ اس مقام پر زحشری نے بڑی قحش غلطی کھائی۔ میں حیران ہوں کہ اس قسم کے اشارات سے لطائف کا استخراج بھی ان کو یاد نہ رہا یعنی معافی کا سب سے پہلے ذکر کرنا (آخر کیا اشارہ کر رہا ہے۔ یہی تو کہ مخاطب مستحق تعظیم اور واجب الاحترام اور قابل توقیر ہے۔ اور واقعہ ہے کہ ذات محمدی معظم و محترم ہے پھر ایسے موقع پر جہاں اظہار عظمت ہو رہا ہو عفو کا لفظ لا کر اس کی خطا و غلطی کا اظہار کرنا کیسے مناسب ہو سکتا ہے اگر خطا کا اشارہ مقصود ہوتا تو وار چونکہ مستحق تعظیم و احترام نہیں رہتا۔ لہذا پہلے خطا کا اظہار کیا جاتا اور یوں کہا جاتا تم نے اجازت کیوں دی تھی؟ خیر جاؤ ہم نے اب کے تو معاف کر دیا مگر آئندہ ایسا کبھی نہ کرنا) پس یہاں مقتضاء اشارہ یہ ہے کہ اظہار عفو بھی تعظیم ہی کے لئے ہے جیسے بڑوں سے کہا کرتے ہیں کہ اللہ آپ کو معافی بخشے آپ نے میرے معاملہ میں کیا کیا۔ نیز کہا کرتے ہیں اللہ آپ سے راضی ہو میری درخواست کا کیا جواب ہے؟ (اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اللہ آپ سے ناراض ہے اور میں دعا کرتا ہوں کہ راضی ہو جائے) نیز علامہ تفتازانی لکھتے ہیں زحشری کو زیبا نہ تھا کہ اس بڑی عبارت سے مضمون ادا کرتے جبکہ دیکھ رہے ہیں کہ حق تعالیٰ نے اپنے رسول کے احترام کی کتنی رعایت فرمائی ہے کہ عفو کو پہلے ذکر کیا (تاکہ خطا کا ثبوت و انتساب ہی نہ ہو سکے) پھر اذن کا لفظ استعمال فرمایا ہے جو آپ کے علو مرتبہ اور قوت تصرف کی خبر دے رہا ہے (کیونکہ اجازت دینا بزرگ یا حاکم ہی کا منصب ہوتا ہے چھوٹے سے کوئی نہیں کہا کرتا کہ آپ نے اجازت کیوں دیدی) پھر مان لو کہ مقصود انکار ہی ہو کہ اجازت دینی نہ چاہیے تھی، تب بھی کلام بصورت استفہام آیا ہے (کہ اجازت آپ نے کیوں دی)؟ اس کی کوئی معقول وجہ ہو تو بیان فرمائیے۔ یہ طرز اختیار نہ کیا کہ تمہارا



اجازت دینا غلط اور خطا تھا یا تم کو اجازت دینے کا کوئی حق نہ تھا۔ پس جس ذات مقدسہ کی حق تعالیٰ اتنی رعایت فرمائیں وہاں یہ کہہ دینا کہ عفو اشارہ کر رہا ہے خطا کی طرف ایک فحش غلطی ہے) علاوہ ازیں اللہ تم کو معاف کرے (خطا ہی کے موقع پر نہیں بلکہ) اولیٰ اور افضل کے چھوڑنے پر بھی کہہ دیتے ہیں (جیسے کہا کرتے ہیں اللہ معاف فرمائے مجھ سے تو تفلین کھڑے ہو کر نہیں پڑھی جاتیں) بلکہ کبھی محض تعظیم و جلالت شان ظاہر کرنے کے لئے بولتے ہیں (جیسے کسی حاکم کو خطاب کریں اللہ آپ کو معافی بخشے میرے معاملہ میں آپ نے کیا کیا) نیز علامہ سیوطی نے بیضاوی کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ اس بارہ میں بیضاوی نے زحمتی کا اتباع کیا ہے۔ حالانکہ صاحب انتصاب کہتا ہے کہ یہ دو باتوں سے خالی نہیں یا تو مراد خداوندی یہ نہیں ہے جو بیضاوی نے بیان کی ہے۔ تب تو اس کا خطا ہونا ظاہر ہے۔ اور اگر یہی مراد ہے تب بھی بیضاوی نے خطا کی کہ اللہ پاک نے تو جلالت شان محمدی کی رعایت فرما کر کنا یہ اشارہ کا استعمال کیا۔ مگر بیضاوی نے بڑی صفائی سے اس کا اظہار کر دیا۔ کیا آداب الہیہ کے سبق نے کہ ہمیں ادب کا برتاؤ نہ کرنا چاہیے۔ خصوصاً دربارہ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔ نیز قاضی عیاض نے شفاء میں لکھا ہے کہ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ کلام شروع کرنے کے لئے ہے جیسے مضمون شروع کرنے سے قبل محاورہ ہے) اللہ آپ کو صلاحیت بخشے اور اللہ آپ کو عزت بخشے (اس کے آگے درخواست کا مضمون لایا جاتا ہے) اور اسی نکتہ کی وجہ سے دیندار اتقیا نے تفسیر کشاف کے پڑھنے اور پڑھانے سے منع کیا ہے۔

کہ مفسر نے اس میں ورع و احتیاط کا التزام نہیں رکھا) واللہ اعلم

۵۷) وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ تَبْعَثَ رَسُولًا ہم عذاب نہیں دیا کرتے جب تک کہ رسول نہ بھیج دیں۔ میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ اس عذاب سے مراد عذاب دنیوی ہے یا عذاب اخروی؟ اور آیت سے تو معلوم ہوتا ہے بلوغ و دعوت شرط ہے کہ جب تک رسول کی معرفت احکام الہیہ قوم کو پہنچ نہ جائیں عذاب نہ دیا جائے گا) اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شرط نہیں (چنانچہ منقول ہے کہ) پاگل اور مجنوں الحواس کو جہنم سمجھ نہیں ہے قیامت کے دن لغرض امتحان آگ میں گھسنے کا حکم دیا جائے گا۔ اگر انہوں نے کہنا مان لیا تو جنت میں بھیج دیا جائے (کیونکہ معلوم ہوا راحت اور تکلیف کا شعور نہیں رکھتا) اور اگر کہنا نہ مانا تو دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ (کیونکہ معلوم ہوا عقل رکھتا ہے لہذا رسول آوے یا نہ آوے ایمان نہ لانے پر عذاب کا مستحق ہے)

آپ نے فرمایا دنیوی عذاب مثلاً خسف ورجم وغیرہ کے لئے تو بلوغ و دعوت شرط ہے جب تک رسول نہ آئے گا اور قوم پر اس کی نافرمانی کرنے سے حجت پوری نہ ہو جائے گی نہ ان کو زمین میں دھنسا یا جائے گا نہ ان پر پتھر برسائے جائیں گے مگر عذاب اخروی کے لئے نبی کا آنا شرط نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو قوم یا جوج و ماجوج میں سے ایک کا بھی دوزخ میں جانا صحیح نہ ہوتا (کیونکہ ان کی جانب کوئی پیغمبر نہیں آیا) حالانکہ دوزخ میں جانے والوں



میں بڑی تعداد انہیں کی ہوگی۔ میں نے کہا ایک حدیث میں تو آیا ہے کہ شبِ معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان پر گزر ہوا اور آپ نے اُن کو عبادتِ خدا کی دعوت دی۔ مگر انہوں نے انکار کیا لہذا رحمتِ پوری ہو گئی اور وہ بھی نافرمان بنی آدم کے ساتھ جہنمی بن گئے۔ آپ نے فرمایا (یہ قطعہ غلط ہے) ایسا نہیں ہوا۔ جامع کتاب کہتے ہیں محدثین کا قول بھی یہی ہے کہ حدیثِ مذکور کی سند میں نوح ابن ابی مریم آیا ہے جو جھوٹی حدیثوں کے گھڑنے میں مشہور ہے اور جس کے بارہ میں امام ابن حبان نے فرمایا ہے کہ اس میں ہر چیز موجود ہے بجز سچائی کے (یعنی کذاب ہے سچ بولنا جانتا ہی نہیں، واللہ اعلم

(۳۶) میں نے دریافت کیا اس کی کیا وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ توحق تعالیٰ نے اس طرح ظاہر فرمائی وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍؕ اور تمہارے رفیق (یعنی محمدؐ) دیوانہ نہیں ہیں۔ اور حضرت جبریلؑ کے بارہ میں ارشاد ہوا رَسُولٌ كَرِيْمٌ مَّتَّاعٍ ثَمَرٍ اَمِيْنٍ۔ سیر الہی ہیں، عالی مقام ہیں، وہاں (یعنی گروہ ملائکہ) میں سردار ہیں، صفتِ امانت میں ممتاز ہیں، فرمایا کہ قرآن کا نزول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر لورحق سے ہوتا تھا اور اس کی عبارت اس حالت کو اخذ کرتی تھی جو اس وقت آپ پر غالب ہوتی تھی اور اس وقت آپ پر تواضع کی شان کا غلبہ تھا کہ حضرت جبریلؑ کو بڑا اور اپنے آپ کو چھوٹا سمجھتے تھے اور ایک مرتبہ یہ ارشاد فرمایا کہ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍؕ اپنے ماقبل یعنی حضرت جبریلؑ کی طرف جو اوصاف منسوب ہوئے ان کو ثابت کرنے کے لئے ہے۔ گویا حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ جبریلؑ کے بارہ میں ہم نے جو کچھ کہا ہے اس کی خبر تم کو وہ پیغمبر دے رہا ہے جس کی سچائی و امانت سے اور اس سے کہ جو بات کہتا ہے وہ سمجھ کر کہتا ہے تم لوگ واقف ہو اور جب تجھ اس درجہ کا ہو تو خبر ضرور قابل و ثوق ہوگی۔ وہ دیوانہ نہیں ہے کہ جس بات کا علم نہ رکھتا ہو اس کو زبان سے نکالے۔ غرض دیوانہ نہ ہونا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت بیان کرنے کے لئے نہیں بلکہ ماقبل کو مخاطبین کی عقل میں بٹھانے کے لئے ہے۔ لہذا یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں تو صفتِ سلبیہ پر انکار فرمایا کہ جنوں کی نفی فرمادی) اور حضرت جبریلؑ کی تعریف میں بڑے بڑے اوصاف بیان فرمائے (۳۷) وَالْتَجِدْ اِذَا هَوٰى مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَوَعَاوٰى سِتَارَهٗؕ کی قسم جب وہ اترنے لگے کہ تمہارے رفیق (محمدؐ) نہ راستہ بھولے ہیں نہ بھٹکے ہیں۔ میں نے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے ثابت کرنے میں حق تعالیٰ نے جادِ محض یعنی ستارہ کی قسم کیوں کھائی اور اس میں اور نور رسالت میں کیا مناسبت ہے جس کی بنا پر قسم کھانا موزوں ہو؟ فرمایا ستارہ کی قسم محض اس کے جاد ہونے کی وجہ سے نہیں کھائی بلکہ اس وجہ سے کہ اُس میں وہ نور حق موجود ہے جو بڑو بھر کی اندھیروں میں راستہ ملنے کا ذریعہ ہے۔ فرض کرو آدمی سفر کے لئے وطن سے چلے اور راستہ بھول گئے۔ نہ کوئی ساتھ ہے نہ خورد و نوش کا سامان پاس ہے حتیٰ کہ دونوں کو یقین



ہو گیا۔ اب مرجائیں گے اور بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن ان میں سے ایک کو ستاروں کی شناخت، اور ان کے ذریعہ سمت سفر اور راستہ معلوم کرنے سے واقفیت تھی اس لئے وہ تورات آنے کے انتظار میں بیٹھ گیا اور جب ستارے نمودار ہوئے تو ان کے پیچھے لگ گیا۔ حتیٰ کہ منزل مقصود پر پہنچ گیا اور ہلاکت سے بچ گیا مگر دوسرے شخص کو ستاروں کی شناخت تھی، اور نہ طریقہ معلوم تھا کہ ان کے ذریعہ راستہ کا پتہ کیونکر چلا کرتا ہے، اور نہ اس نے اپنے ساتھی کی تقلید کی کہ واقف کا دامن پکڑ کر پیچھے ہولیتا، تو ظاہر ہے کہ جنگلوں میں ٹھیکتا پھرے گا اور آخر مر رہے گا۔ مرنے کے بعد بھی نعش پر گرمی و سردی کا اثر پڑے گا اور اس کی وجہ سے سوکھا چنابن جائے گا یہی حالت ہے لوگوں کی پیغمبر کے ساتھ کہ ایک فریق ان کو سچا سمجھتا اور ان کے پیچھے لگ لیتا ہے حتیٰ کہ دار النعیم اور مقام کریم و عطاء عظیم پر جا پہنچتا ہے۔ جیسے ستارہ کے پیچھے لگ لینے والا مسافر اس مقام پر پہنچ گیا جہاں اعزہ و احباب بھی موجود ہیں اور خورد و نوش کی تمام لذتیں بھی فراہم ہیں۔ اور دوسرے فریق نے رسول کو جھوٹا سمجھا اور اس کے اتباع سے گریز کیا تو غضب خداوندی میں مارا مارا پھرا۔ حتیٰ کہ مر گیا اور جہنم نے اپنی آگ سے اس کو جھلسایا اور خشکی سے اس کو ٹھٹھا دیا۔ جیسے دوسرے مسافر کو بعد مرگ گرمی و سردی نے سکھا دیا۔ ستارہ اور پیغمبر چونکہ راہ نمائی کے بارہ میں ہم شکل تھے اس لئے صحت رسالت پر ستارہ کی قسم کھائی ورنہ درحقیقت تو نور حق کے ایک فرد کی جس سے لوگ واقف تھے قسم کھا کر نور حق کا دوسرا فرد جس سے وہ ناواقف تھے محقق فرمایا ہے میں نے عرق کیا اور اذنا کھوی سے کیا مراد ہے؟ فرمایا جبکہ وہ وسط فلک سے نیچے اتر آئے کیونکہ جب تک بیچ آسمان پر رہے گا تو کوئی بھی اس سے راستہ معلوم نہیں کر سکتا اس لئے کہ وہ کسی ایک جانب کو مائل ہی نہیں ہوا تو کسی جہت کا پتہ ہی نہیں چل سکتا۔ واللہ اعلم

(۳۸) ارشاد فرمایا کہ الصمد حق تعالیٰ کا ایسا نام ہے کہ تمامی مخلوقات اس سے سیراب کی جاتی ہے۔ خواہ درخت ہو یا پتھر، اور مٹی ہو یا ڈھیلہ اور ذی روح ہو یا غیر ذی روح۔

(۳۹) اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا لِيُغْفِرَ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَهُ (۱۷۱ محمد) ہم نے تم کو فتح بخشی واضح تاکہ اللہ بخشہ سے تمہارے اگلے پچھلے گناہ اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دے اور تم کو راہ مستقیم پر چلائے اور تمہاری مدد فرمائے زبردست مدد، میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ فتح سے کیا مراد ہے؟ فرمایا فتح سے مراد حق تعالیٰ کا مشاہدہ ہے۔ اور اس کی شرح یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے علم قدیم میں یہ امر طے شدہ تھا کہ مخلوق ساری حق تعالیٰ کی معرفت سے فائز نہ ہوگی۔ اس لئے کہ اگر سب ہی عارف باللہ ہو جائے تو صرف ایک گھر (یعنی واحدیت) رہ جاتا۔ حالانکہ حق تعالیٰ نے گھر دو تجویز فرمائے ہیں (یعنی وارد و زخ بھی بنایا ہے) لہذا بجز اس کے جن پر رحمت نازل فرمائی منظور تھی باقی سب پر حجاب ڈال دیا اور اپنے فعل کے مشاہدہ سے بھی



ان کو روک دیا اور اپنی فات پاک کے مشاہدے سے بھی روک دیا۔ کیونکہ اگر حجاب اٹھا دیتا اور حقیقت مکشوف ہو جاتی تو ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کا مشاہدہ کرتے اس کے ارشاد کے موافق کہ وہ فرماتا ہے **هُوَ مَعَكُمْ أَيْنَا كُنْتُمْ** اللہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں بھی تم ہو **وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ** ہم انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں **وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ** اور جب (اے محمد) تم سے میرے بندے دریافت کریں میرے متعلق تو (تبادو کہ) بلاشبہ میں قریب ہوں **وَلَا أَذْنُ مِنْ ذَالِكُ وَلَا أَكْثَرُ إِلَّا هُوَ مَعَهُمُ** ایتنا گا فو۔ اس سے کم ہوں یا زیادہ بہر حال اللہ ان کے ساتھ ہے جہاں بھی ہوں۔

نیز ان کو نظر آتا ہے کہ ان کے تمامی افعال اللہ کے مخلوق ہیں اور وہی ان کا خالق ہے نہ کہ وہ خود اور وہ خود تو بمنزلہ ظروف اور خالی اجسام کے ہیں جن کو حق تعالیٰ جس طرح چاہتا ہے حرکت دیتا ہے جیسا کہ خود فرماتا ہے **وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ** اور اللہ ہی نے پیدا کیا تم کو اور تمہارے اعمال کو جو تم کرتے ہو، اور جب سب کو یہ دونوں مشاہدے واقعہ کے موافق ہوتے تو کوئی بھی کبھی معصیت نہ کر سکتا اس لئے کہ معصیت بجز اس کے ہو ہی نہیں سکتی کہ اللہ سے پس پیدہ ہو، اللہ کو مہیلا ہوا ہو، اللہ سے بنجر و غافل ہو۔ اور مومنین کا اگرچہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یاں اللہ ہی ہم میں فاعل و متصرف ہے اور اسی کا ارادہ غالب ہے مگر یہ اعتقاد کبھی سامنے آتا ہے اور کبھی اوجھل ہو جاتا ہے اور اس کا سبب وہی حجاب ہے کہ ان کا یہ اعتقاد محض ایمان بالغیب ہے، مشاہدہ و معائنہ کا نہیں (یعنی بغیر دیکھے محض بتانے سے مان لیا ہے) اس لئے جگنو کی روشنی کے مثل ہے کہ کبھی چمکی اور کبھی بجھ گئی اور جس پر حق تعالیٰ افضل فرماتا ہے اس سے حجاب دور کر دیتا اور اپنے مشاہدے میں کو نواز لیتا ہے لہذا اس کو حق ہی حق نظر آتا ہے کہ حق ہی کی طرف سے ابتدا ہے اور حق ہی کی طرف انتہا۔ پس یہ ہے جس کی طرف فتح مبین سے اشارہ کیا گیا ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ فتح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کب حاصل ہوئی؟ فرمایا بچپن سے کہ آپ پر حجاب کسی وقت بھی نہیں آیا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ فتح تو سر نبی کو بلکہ ہر عارف کو حاصل ہے، اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کون سی خصوصیت ہوئی (جو اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ) سے تعبیر فرمایا کہ ہم نے تم کو فتح نصیب فرمائی، فرمایا فتح بلحاظ قوت و ضعف بہت مختلف ہوتی ہے کہ ہر شخص کو اس کی طاقت کے موافق دی جاتی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں عقل اور روح اور نفس اور ذات اور سر اور حفظ غرض ہر لحاظ سے جو قوت موجود ہے وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔ حتیٰ کہ تمامی اہل فتح خواہ انبیاء ہوں یا اولیاء سب کو جمع کیا جائے اور وہ قوت جس کا ہم نے اشارہ کیا ہے مجبوراً پیر ڈالی جائے تو تو سب درانگہ کی طرح، گچھل جائیں اور ان کے ابدان پاش پاش ہو جائیں وئے ممکن ہے وہی حیر کا شہ ہو اس لئے گذشتہ تقریر پر نظر ڈال لی جائے اور دو باتیں یہاں اور سمجھنی جائیں۔ اول یہ کہ **وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ**



وَمَا تَعْمَلُونَ فِيهِمْ حِينَ يَدْعُوهُ بَيْنَ يَدَيْهِ يُرِيتُهُمْ أَمْرًا مُّبِينًا ۖ وَكَذَٰلِكَ يَهْدِي اللَّهُ سَبِيلَ الْمُسْلِمِينَ ۚ

لَعَلَّكُمْ تَعْلَمُونَ اعمال کو بندوں کی طرف منسوب کر رہا ہے کہ وہ اعمال جو تم کو رہے ہو اللہ ہی کے مخلوق ہیں لہذا القلا آیت قرآنیہ سے ثابت ہوا کہ اعمال میں عامل کے ارادہ کو دخل ہے دوم عقلاً ہمیں اپنے ساتھ کی اختیاری حرکت میں اور عیشہ کی اضطراری حرکت میں فرق معلوم ہو رہا ہے پھر کیسے ممکن ہے کہ دونوں کو غیر اختیاری و جبری بنا کر یکساں بنا دیں۔ البتہ بندوں کے ظروف خالیہ اور حق تعالیٰ کے غافل متصرف ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اس کے فعل و تصرف ہی کی دو صورتیں ہیں ایک وہ جن میں ارادہ انسانی کا واسطہ نہیں ڈالا جاتا جیسے رعشہ کی حرکت کہ وہ من اللہ ہے اور اضطراری ہے دوم وہ جن میں ارادہ انسانی کو واسطہ بنایا جاتا ہے جیسے ہلختہ کو یا ارادہ حرکت دنیا کہ یہ بھی من اللہ ہے مگر اختیاری ہے۔ اسی ارادہ کے توسط و عدم توسط پر عذر و عفو اور سزا و جزا کا مدار ہے کہ تلوار پر باوجودیکہ ارادہ سے محروم ہے محض توسط و آلہ ہونے کے سبب خون کی آلودگی و شکتگی کا اثر اثر آتا ہے اور مالک کی رعیت و نفرت کا سبب بنتا ہے تو کیا پوچھنا جبکہ ارادہ و اختیار کا واسطہ بھی درمیان میں پڑ جائے۔ دوسری بات یہ کہ حق تعالیٰ کے فعل و تصرف کا مشاہدہ مانع و زاجر ہے معصیت سے۔ اور ہم معصیت کے ارتکاب ہی پر اس کو دلیل لاتے ہیں اپنے بمقتور ہونے کی اس سے معلوم ہوا کہ ہم مشاہدہ سے محروم ہیں اور اس کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہمیں دعویٰ ہے کہ ہاں عنقریب دنیا چھوٹے گی اور ہم قبر کے گڈھے میں جا سوئیں گے مگر اسی کو دنیا طلبی کا آلہ بنائے ہوئے ہیں کہ مرنا تو ہے ہی، لہذا خوب کہا لو جو کمانا ہے اور مزے اڑاؤ جو اڑانا ہے یہ علامت ہے کہ ہم نے موت کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھا۔ جس وقت اس کا مشاہدہ ہوگا اور وہ نظر کے سامنے آکھڑی ہوگی کہ روح قبض عضری سے نکلنے لگے گی تب معلوم ہوگا کہ موت کے یقین کا کیا اثر ہوتا ہے غرض یہ خود مشاہدہ فعل الہی سے غفلت و بخیری کا ثمرہ ہے کہ اس کو معاصی میں اپنی بے قصوری کا آلہ بنالیا ہے اگر حقیقی مشاہدہ نصیب ہو تو معصیت کا صدور ہی نہ ہو سکے گا، اور اگر ہوگا تو روتے روتے یراعمال ہو جائے گا نہ یہ کہ حق سبحانہ پر بے باکانہ الزام اور آئیدہ معاصی پر دلیر کرنے والا سکون۔ چنانچہ جن کو یہ مشاہدہ ہوا ہے ان کے حالات تیار ہے ہیں کہ ان سے زیادہ طاعات کا ذخیرہ کوئی نہ لاسکا۔ پس اگر عالم میں فعل الہی و تصرف خداوندی کا یہ مقتضا ہوتا جو ہم نے اس کے ایمان بالغیب میں سمجھ رکھا ہے تو مشاہدہ و انوں پر تو اس سے بدرجہا زیادہ اپنی بے قصوریا اور افعال کے جبری و اضطراری ہونے کا یقین اور معاصی پر جرأت و دلیری کا اثر طاری ہوتا۔ اور حیب صورت حال اس کے برعکس ہے تو معلوم ہوا ہم نے ایمان بالغیب میں بھی اس کی حقیقت کو سمجھا ہی نہیں۔ لہذا بجائے اس کے کہ اپنے کو حقیقت شناس سمجھ کر اللہ پر گرفت اور اس کی طرف ظلم منسوب کرو، دعا مانگو کہ حق تعالیٰ



حقیقت شناس بنائے واللہ اعلم

مغزور سخن مشوکہ توحید حسداً و احد دیدن بود نہ واحد گفتن

ابو یحیی اشعریٰ تلمسانی نے بھی اس حقیقت کی جستجو میں بہت کچھ دماغ و عقل کو دوڑایا اور آخر اس حد تک پہنچے کہ گناہ کے تین درجے ہیں۔ ایک محل صدور یعنی نفس امارہ۔ ایک اس کی حقیقت یعنی خلافت حکم کرنا۔ ایک اس کا اثر یعنی ظلمت قلب جس کا ذکر آیہ کَلَّا بَلْ عَلٰی قُلُوبِهِمْ میں ہے کہ رنگ آگیا ہے ان کے دلوں پر۔ اور جس طرح گناہ کا اطلاق اپنی حقیقت یعنی مخالفت پر ہوتا ہے اسی طرح محل صدور اور اثر پر بھی مجازاً اس کا اطلاق ہوتا ہے نیز مغفرت کا اشتقاق غفر بمعنی ستر سے ہے جس کا ترجمہ ہے چھپانا اور اس کے بھی تین درجے ہیں۔ پہلا درجہ جو سب میں زیادہ قوی ہے یہ ہے کہ شے کا وجود ہی نہ رہے یعنی پردہ عدم میں چھپ جائے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ اس کا وجود تو ہو مگر اس کا ادراک کرنیوالا حاسہ نہ ہو تیسرا درجہ یہ ہے کہ وجود ہی ہو اور حاسہ مدد نہ بھی ہو مگر درمیان میں کوئی چیز آٹھ بن جائے کہ ادراک نہ ہو سکے مثلاً رات کا وقت کہ آفتاب کا وجود ہی نہ رہا اور وہ پردہ عدم میں چھپ گیا۔ یا دن کا وقت اندھے کے لئے کہ آفتاب موجود ہے مگر اس کو دیکھنے والی بصارت مفقود ہے یا گھٹا کا سماں کہ آفتاب بھی موجود ہے اور بصارت بھی موجود ہے مگر ابر حائل ہو گیا جس کی وجہ سے آنکھ اس کو دیکھ نہیں سکتی اور یہ چھپنے کا ضلعت ترین درجہ ہے کہ ذرا بادل ٹپٹ جائے تو سورج نظر آجائے گا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گناہ سے آیہ مَا تَقَىٰ مِنْ فَنِيْلٍ وَمَا تَاَخَّرَ مِنْ مَحَلِّ صُدُورِ اور حقیقت گناہ مراد ہے نہ کہ اثر۔ اور مغفرت سے مراد اعلیٰ درجہ یعنی پردہ عدم میں چھپانا ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ سے نفس امارہ اور مادہ مخالفت کو معدوم فرمادیا۔ اس سے اثر کا معدوم ہونا خود لازم آجائے گا۔ اور اگر اثر مراد لیا جاتا کہ ظلمت گناہ کو دور فرمادیا تو محل صدور یعنی نفس اور حقیقت یعنی خلافت حکم کا صدور منتفی نہ ہوتا اور یہ ادل تو عصمت کے خلاف ہوتا کہ اگرچہ رنگ اثر گیا مگر مادہ مخالفت موجود ہے تو عصمت کہاں رہی۔ دوم آتنا تو عام مسلمان بلکہ گناہ گار میں بھی پایا جاتا ہے کہ توبہ کر لے گا تو اثر گناہ یعنی رنگ دور ہو جائے گا مگر نفس امارہ اور نفس مخالفت باقی رہے گی پس اگر گناہ سے مراد حقیقت گناہ یعنی مخالفت لے جائے تب تو لفظ مَنِ مَعْنٰی ہوگا اور یہ ترجمہ ہوگا کہ حق تعالیٰ نے مخالفت سے جو شے مقدم ہے یعنی محل صدور اور نفس امارہ اس کو بھی معدوم فرمادیا اور نیز مخالفت سے جو شے مؤخر ہے یعنی اثر گناہ اور ظلمت قلب اس کو بھی معدوم فرمادیا اور اگر گناہ سے مراد حقیقت و مجاز دونوں لئے جائیں تو ماتقدم سے مراد حقیقت گناہ ہے کہ فعل مخالفت کو معدوم فرمایا اور متاخر سے مراد اثر گناہ ہے کہ رنگ و ظلمت کو بالکل مٹا دیا کیونکہ مخالفت کا وجود مقدم ہوتا ہے اور اثر کا وجود مؤخر۔ ۱۲ علامہ مذکور کی تقریر سے مطلب تو قریب قریب وہی ادا ہو گیا جو حضرت ممدوح نے بیان فرمایا۔ مگر فتح کی —



تفسیر شیخ کے موافق نہ ہو سکی۔ حالانکہ مسئلہ کی روح وہی ہے۔ انہوں نے فتح سے مراد لیا قضا و قدر یعنی اے محمدؐ ہم نے تمہارے لئے مقدر فرمایا۔ مگر مقتضی یہ کہ معین نہ کیا مقدر فرمایا۔ جب تک وہ معین نہ ہو مغفرت و تکمیل نعمت اور ہدایت و نصرت کی تفریع کس پر ہوگی۔ اور شیخ کی تفسیر نے سب مراحل طے کر دیئے کہ اے محمدؐ ہم نے تم کو شاہد کامل نصیب فرمایا تاکہ مادہ گناہ تم سے معدوم ہو جاوے اور تاکہ نعمت الہیہ تم پر تمام ہو جائے اور تاکہ تم کبریٰ اور معارف حاصل ہوں، اور تاکہ تم ملک حقائق کے منصور و فاتح قرار پاؤ واللہ اعلم۔

وہم) اَفَلَا يَظْهَرُ عَلٰی غَلِيْبَةٍ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ دُوْنِهَا وَهِيَ غَيْبٌ كَا جَانِنٍ وَالَا هِيَ لَيْسَ كِي كُو اِنِّیْ غَيْبٌ پَر مَطْلَع نَہِیْں كرتا مگر ہاں حَسْبُ یَغْمُرُ كُو لَیْز فرماتے (تو اس كو غیب كی بات بتا دیتا ہے اور) اس كے آگے اور پیچھے نگہبان چلتے ہیں۔ تاکہ معلوم فرماتے کہ انہوں نے اپنے رُكے پیغام پہنچا دیئے اور اللہ نے احاطہ كر كھا ہے ان كی سب چیزوں كا اور گن ركھا ہے ہر شے كو۔ میں نے حضرت سے عرض كیا كہ آیت شریفہ سے معلوم ہوتا ہے حق تعالیٰ نے اپنے غیب پر بجز پیغمبر كے كسی كو مطلع نَہِیْں كرتا حالانكہ اولیاء و عارفین كو بھی كشف ہوتا ہے اور وہ غیب كی بات مثلاً ماں كے پیٹ میں لڑكا ہے یا لڑكی تبا دیا كرتے ہیں فرمایا كہ آیت سے مقصود كا سنو اور عارفین كا كھانا ہے كہ جنات ان كے تابع ہوتے تھے (جواد پر تلے چڑھ كر آسمان كے قریب پہنچ كر دنیا میں ہونے والے واقعات كا اہل تصرف فرشتوں میں جو تذكرہ ہوتا تھا اس كو سن لیتے اور ان كا سنوں كو پہنچا دیا كرتے تھے۔ یہ لوگ اس ايك بات میں اپنی طرت سے دس جھوٹ ملا كر غیب دانی كا سكہ جاتے اور) اہل عرب ان كے معتقد ہو جاتا كرتے تھے كہ ان كو غیب كی ہر بات معلوم ہے حق تعالیٰ نے اس عقیدہ ناسدہ كو جس طرح نفس نام میں دور فرمایا كہ آسمان پر چوكیدار بنا كر فرشتے تعینات فرما دیئے تاکہ غیبی خبر معلوم كرنے كے لئے اگر جنات میں سے كوئی آسمان كے پاس آئے تو شہاب ثاقب مار كر اسكو جلا دیا جائے اسی طرح قولاً اس عقیدہ باطلہ كا ازالہ فرمایا پس مقصود اپنے بندوں كو باطل سے پھیر كر حق پر لا جمع كرنا ہے اور اولیاء اللہ تو حق میں شامل ہیں۔

لہذا وہ خارج نہ ہوں گے۔ نیز فرمایا كہ اكثر الفاظ عام ہوتے ہیں مگر اس كے نور كے تار بعض افراد كو مخصوص بنا دیا كرتے ہیں۔ لہذا عارف كی نظر نور كے تاروں پر جایا كرتی ہے۔ اگر وہ دیکھتا ہے كہ ان كا نزول فلاں فلاں مثلاً صرف زید عمر بکر پر ہوا ہے تو سمجھ لیتا ہے كہ فقط یہی افراد مراد ہیں دوسرے لوگ مراد نَہِیْں۔ اور اگر دیکھتا ہے كہ نور كے تار تمامی افراد پر پڑ رہے ہیں تو سمجھ لیتا ہے كہ سب مراد ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم كو تو كلام اللہ كے دہن مبارك سے كلام نكلنے كے قبل ہی یہ معلوم ہو جاتا تھا كیونكہ وہ نور كے تار ازل آپ كے قلب پر پڑا كرتے تھے تاکہ آپ مراد خداوندی كو سمجھ لیں (حضرت ممدوح كی مراد اس سے عام مخصوص البعض تھا كہ آپ اُمی محض اور علی اصطلاح سے ناواقف تھے) میں نے



عرض کیا کہ پھر بھی آیت شریفہ میں رسول کی تخصیص دلی کو تو خارج کر دے گی مگر باغیہ الرسول کو خارج کرے گی اور دلی تو خادم الرسول ہونے کے اعتبار سے (رسول کے حکم میں داخل رہے گا۔ دیکھو اگر نواب یا جاگیردار کاشتکاروں کی جانچ کے لئے اپنے علاقہ میں گشت کرے گا تو تنہا نہ جائے گا۔ اس کے ہمراہ اس کے خواص و صاحبین اور نوکر چاکر بھی ضرور ہوں گے اور جس موضع میں وہ جائے گا وہاں یہ بھی جائیں گے اور جو جو کھیت و باغات وغیرہ وہ دیکھے گا ان کو یہ بھی دیکھیں گے اسی طرح پیغمبر کے لئے بھی اس کی امت میں خدمتگار و غلام اور احباب و اصحاب ضرور ہوں گے تو جن معنیات پر پیغمبر کو مطلع کیا جائے گا ان کا کچھ حصہ ان ہمراہیوں اور اصفیاء امت کو بھی ضرور ملے گا۔ پھر میں نے عرض کیا کہ آیت شریفہ اِنَّ اللہَ عِنْدَکَ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَیُنَزِّلُ الْغَیْثَ وَکَیْلُکُمْ مَا فِی الْاُدْحَامِ ۚ وَمَا تَدْرِی نَفْسٌ مَّا فَا تَکْسِبُ قَدْ اَدْمَا تَدْرِی نَفْسٌ بِاٰی اٰرْمِی تَمُوْتُ ۗ اللہ ہی کو علم ہے کہ قیامت کا (کب آئے گا) اور وہی بارش برتا ہے (کسی کو خبر نہیں کب برسے گی) اور وہی جانتا ہے کہ رحم مادر میں کیا ہے (نر ہے یا دھ) اور کسی کو خبر نہیں کہ کل کو کیا کرے گا اور کسی کو پتہ نہیں کہ کس زمین پر جا کر مرے گا۔ نیز حدیث میں ہے خمس لا لعلمہن الا اللہ پانچ چیزوں کا علم سوائے اللہ کے کسی کو نہیں یہی پانچ چیزیں گنوائیں اس میں علماء و محدثین کا بہت اختلاف ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان پانچ چیزوں کا علم تھا یا نہیں؟ فرمایا حضرت سے یہ چیزیں کیسے مخفی رہ سکتی ہیں جبکہ امت کے اہل تصرف اولیا و بغیر اس کے کہ یہ چیزیں ان کو معلوم ہوں بغیر تصرف عوالم کی خدمت انجام نہیں دے سکتے پھر میں نے دریافت کیا کہ شب قدر کی بابت بھی علماء میں اختلاف ہے کہ اس کا علم آپ کے ذہن سے نکال یا گیا تھا اور اسی لئے آپ نے فرمایا کہ اس کو تلاش کرو۔ انتیسویں شب میں، یا ستائیسویں میں، یا پچیسویں میں سورہ اگر آپ کو علم ہوتا تو معین تاریخ بیان فرماتے (کہ فلاں تاریخ میں ہوگی) اس پر حضرت ممدوح کو غصہ آگیا اور فرمایا سبحان اللہ اگر شب قدر آوے اور میں مڑھ پڑا ہوں کہ گدھے کی طرح پیٹ پھول کر میری ٹانگ بھی اوپر اٹھ گئی ہو تو اس حالت میں بھی واللہ مجھے اس کا علم ہو جائے گا۔ پھر سید ابو جعفر صلی اللہ علیہ وسلم سے تو مخفی کیسے رہ سکتی ہے۔ چنانچہ حضرت ممدوح نے متعدد سالوں میں شب قدر کا اُس کے آنے سے قبل تعین فرما کر ہمیں تاکید فرمائی کہ اس میں عبادت کا اہتمام کریں۔ ایک مرتبہ ماہِ رجب میں تعین فرمایا۔ دوسرے سال ماہِ شعبان میں، اور تیسرے سال ماہِ رمضان میں اور چوتھے سال شبِ عید الفطر میں اور فرمایا کہ وہ ہر سال منتقل ہوتی رہتی ہے اسی طرح جمعہ کی ساعت مقبولہ کا تعین فرما کر ہمیں بتا دیا کرتے تھے۔ یہ آیت شریفہ سورہ جن کی ہے۔ چونکہ حق تعالیٰ نے جنات کو آگ سے پیدا فرمایا ہے اس لئے وہ ہمیں نظر نہیں آتے اور ان کی رفتار بھی بجلی کی طرح بہت سریع ہے کہ ایک لمحہ میں ہزاروں میل طے کر لیتے ہیں۔ شیاطین بھی جنات ہی کی ایک قسم ہیں جن کی سرشت کفر و طغیان



پہر رکھی گئی ہے بہر انسان کے ساتھ ایک فرشتہ ہے جو اس کو امور خیر کی ترغیب دیتا ہے، اور شیطان ہے جو اس کو کفر و معاصی پر چلانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اس شیطان کو ہزار کہتے ہیں۔ کیونکہ انسان کے ساتھ ہی پیدا ہوتا ہے۔ مشرکین میں بعض لوگ سفلی عملیات کے ذریعہ ان کو اپنا مسخر ذابع بنا لیا کرتے اور ان کے ذریعہ ملکوں ملکوں کی وہ چیزیں جو انسان کی نظر سے اوجھل ہیں معلوم کر لیا کرتے تھے۔ پھر لوگوں کو بتا کر اپنی غیب دانی کا سکہ جابا کرتے تھے۔ ان کا نام کاہن تھا اور جس قدر بھی زیادہ ہزار کسی کے مسخر ہوتے تھے اسی قدر وہ بڑا کاہن سمجھا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ تقدیری معاملات جو لوح محفوظ سے منتقل ہو کر یکے بعد دیگرے آسمانی فرشتوں کی معرفت نلک دنیا کے ان فرشتوں پر ڈالے جاتے تھے جن کو عالم دنیا میں ان کے جاری کرنیکا واسطہ بنایا گیا تھا تو بعض دفعہ ان مسخر شیطاں کو قبل از تنفیذ اس کی بھی اطلاع مل جاتی تھی۔ کہ ایک دوسرے کے کندھے پر اوپر تلے چڑھ کر آسمان دنیا کے قریب تک پہنچتے اور فرشتوں میں جو چہر چا اور تذکرہ ہوتا کہ فلاں کام فلاں وقت ہونا ہے اس کو لے اڑتے اور اپنے کاہن کو لاسنایا کرتے تھے۔ یہ لوگ اس میں دس باتیں اپنی طرف سے ملاتے اور لوگوں کو سنا کر اپنا معتقد و گرویدہ بنایا کرتے تھے حالانکہ جیسے کچھ مادیات اور طبیعیات کا کھیل تھا۔ مگر عام انسانوں کی طاقت سے چونکہ بالا اور نظردن سے اوجھل قصہ تھا اس لیے لوگ حیران ہوتے۔ خصوصاً جب قبل از وقت ایک بات کو سنتے اور اسی کے موافق پاتے تو ان کی عقیدت بڑھتی اور کاہنوں کو عالم الغیب اور متصرف عالم سمجھ کر گویا ان کی پرستش کیا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ تک یہ صورت قائم رہی حتیٰ کہ آپ کے قرب ولادت کی خبریں جو عرب کے مشہور کاہن لوگوں نے سنائیں وہ بھی اسی قبیل کے تھیں مگر چونکہ آپ پر کلام اللہ کا نزول ہونا تھا اس لیے حق تعالیٰ نے جنات و شیطاں کی آسمان تک رسائی کا انتظام فرمایا کہ فرشتے تعینات کر دیئے اگر کوئی جن یا شیطان چوری چھپے آئے تو آگ کے انگارے اس پر مار جائیں چنانچہ شہاب ثاب اسی کا نام ہے۔ یہ اس غرض سے تھا کہ نظام عالم اور مادی طاقتوں کو بجا ہوا قائم رکھتے ہوئے کہ ابتلاء و امتحان کا مدار اسی پر ہے، وحی الہی جو نبی تک پہنچتی ہے محفوظ ہو کر پہنچے اور پہلے سے کوئی اچکے اپنے کاہن کو نہ پہنچا دے ورنہ دعویٰ نبوت اور نبوت وحی میں خلل و اشتباہ پیدا ہو جائے گا اس طرح پر کلام اللہ اور نیز وہ واقعات مستقبلہ جن کا اظہار بزبان پیغمبر ہوتا تھا سب دائرہ حفاظت میں آگئے مگر دنیوی ممالک اور بلاد بعیدہ کی خبروں کا معلوم کرنا بدستور رہا اور اب تک جاری ہے کہ جنات کو مسخر بنا کر ان سے طرح طرح کے وہ کام لیتے ہیں جو انسانی طاقت سے باہر ہیں مگر جنات کے لئے وہ معمولی باتیں ہیں چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے بھی غیب کی خبریں سنتے تھے اس لیے آپ کو کاہن سمجھتے اور اسی لفظ سے آپ کو یاد کرتے تھے۔ کاہنوں کی دی ہوئی خبریں جنات اور ہزار و شیطاں و جنات کے ذریعہ حاصل



کی ہوئی ہیں جن کی قوت رفتار لوگوں کی نظروں سے مخفی ہے۔ اور ان کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ٹیلی فون اور ٹیلی گراف کے ذریعہ ایک لمحہ میں لندن کی خبر کا معلوم کر لینا یا ریڈیو میں امریکہ کی خبر کا ایک سکنڈ میں اپنے کانوں سن لینا کہ برقی طاقت یا ہوائی قوت واسطہ بنی ہوئی ہے جو نظر نہیں آتی۔ پس اگر کوئی شخص ان مصنوعات الہیہ کے ذریعہ ملکوں ملکوں کی خبریں معلوم کر کے غیب دان کہلا یا جاسکتا ہے۔ تو کابن بھی غیب دان سمجھا جاسکتا ہے۔ اسی طرح منجم ہو یا رمال اور جفار ہو یا عراف مخفی ستاروں کی رفتار یا دیگر علوم ظہینہ کے واسطہ سے وہ آئندہ کے واقعات پر جو بھی حکم لگاتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے سمندر سے مون سون اٹھتا ہوا دیکھ کر برے حساب یہ حکم لگانا کہ غلاں جبکہ پرمسلاں دن بارش ہوگی۔ یا مثلاً کسی تپ زدہ کو معمولی مقدار سے دو چند کنین کھلا کر یہ حکم لگانا کہ کل کو اسے بخار ہرگز نہ آئے گا۔

پس اگر اس کا نام علم غیب رکھا جاسکتا ہے تو منجم و جفار وغیرہ کے علم کو بھی علم غیب کہنا صحیح ہو سکتا ہے ورنہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ علم غیب کی حقیقت وہ علم ہے جس میں کسی مخلوق کا بھی واسطہ نہ ہو اور ظاہر ہے کہ وہ صرف اللہ ہی کا علم ہے اور اسی لئے وہ فاتی اور قدیم و ازلی ہے اسی لئے عقیدہ ہے کہ عالم الغیب بجز اللہ کے کوئی نہیں ہے اور اسی لئے اس آیت میں بھی فلا یظہر علی غیب سے غیب کو اپنی طرف منسوب اور اس کا انہار فرمایا کہ غیب صرف اللہ کا ہے اور اسی کے لئے مخصوص ہے جس میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ جیسے ایجاد اور تخلیق مخصوص ہے اللہ سبحانہ کے ساتھ کیونکہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ توسط مادہ کے بغیر نیت کو ہست فرمائے پس والدین کو بچہ کا خالق نہیں کہہ سکتے اگرچہ بچہ کا وجود بظاہر ان سے صادر ہو رہا ہے کیونکہ اس میں مادہ منویہ اور عالم اسباب کی مصنوعات الہیہ کا واسطہ پڑا ہوا ہے اور نہ ٹیلی فون وغیرہ ایجادات جدیدہ کو حقیقتہً ایجاد کہا جاسکتا ہے جبکہ تصرف ہے ان ہی مادیات میں جن کو حق تعالیٰ نے بصورت خاصیت یہ تو تین بخشیں ہیں اور دو چار مختلف مصنوعات الہیہ کی باہم ترکیب و خلط سے ایک نئی صورت بنا گئی ہے لہذا خالق و موجد بجز حق تعالیٰ کے کوئی نہیں اس لئے کہ اس کی تخلیق فاتی اور بلا واسطہ ہے اور وہ مبدء کو موجود بنانے میں کسی غیر کا محتاج نہیں ہے رہا یہ فرق کہ اہل کشف اولیاء اور مہبط وحی حضرات انبیاء علیہم السلام بھی غیب کی خبریں دیتے ہیں، ان کی خبروں میں اور کابن و منجم وغیرہ اہل باطل کی خبروں میں کیا فرق ہے؟ اس کو حق تعالیٰ شانہ نے اس آیت شریفہ میں ظاہر فرمایا ہے اور وہ یہ ہے کہ اہل باطل کی خبروں میں تو وسط ہے مادیات و علوم ظہینہ کا یا کلمات شرکیہ و ارواح جہیشہ کا، اور حضرات انبیاء کی اطلاعات میں تمامی اسباب عادیہ کا پردہ چاک کر دیا گیا ہے اور براہ راست اللہ عالم الغیب کی طرف سے مطلع فرمایا گیا ہے لہذا وہ یقینی بھی ہوں گی اور ان کا انتساب خالص اللہ کی طرف ہوگا اور وہ دلیل نبوت



یعنی معجزہ بھی نہیں گی، اور ان پر ایمان لانا بھی ضروری ہوگا۔ بر خلاف اہل باطل کی اطلاعات کے کہ اُن کے وسائل سب ظنی اور مخلوق من اللہ ہیں۔ لہذا اسباب ہی کی طرف منسوب ہیں، اور چونکہ دعویٰ کیا جاتا ہے اُن کے یقینی ہونے کا اور ان کے ذریعہ مقابلہ کیا جاتا ہے معجزہ انبیاء مسکات شفات اولیا کا اس لئے انکا انکار ضروری ہوگا اور اُن کے ساتھ عقیدت قریب بکفر ہوگی۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے اونٹنی سے بچہ پیدا ہوتا ہے اور عالم اسباب میں اس قانون کے ماتحت ہے جس کو حق تعالیٰ نے بطریق عادت دنیا میں جاری فرمایا اور اور ایک معمولی بات بن گئی ہے مگر یہ عارض صالح علیہ السلام پیغمبر سے اونٹنی کا بچہ پیدا ہونا ایک معجزہ ہے ہرچند کہ ہر اونٹنی سے بچہ پیدا فرمانا حق تعالیٰ ہی کا فعل ہے مگر قانون عادت کا ماتحت ہونے کے سبب منسوب ہوگا اسباب کی طرف۔ اور پیغمبر سے بچہ پیدا ہونے میں چونکہ اسباب عادیہ چاک ہو چکے اور وہ خالص قانون قدرت الہیہ کے ماتحت ہوا ہے لہذا اس کا انتساب حق تعالیٰ کی طرف ہوگا اور بنی کے لئے دلیل نبوت قرار پائے گا۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ کاہن و منجم وغیرہ کی اطلاعات نہ محفوظ ہیں اور نہ کسی کے لئے مخصوص۔ ایک کاہن جو خراج مسخر جن کے ذریعہ حاصل کر رہا ہے وہی خبر دوسرا کاہن اپنے مسخر جن کے ذریعہ حاصل کر سکتا ہے بلکہ کر رہا ہے ممکن ہے یہ پہلے لے آوے اور ممکن ہے وہ پہلے لے آوے اور جو بھی پہلے لے آئے گا دوسرے کو اس کا نقال و سابق کہا جاتا ہے۔ یہی حال نجوم و جفر وغیرہ کا ہے کہ جو کوئی بھی ریاضی و حساب و علم کو اکب سے کام لے گا وہ امر مخفی کو معلوم کر لے گا بر خلاف بنی کی اطلاعات کے کہ وہ محفوظ ہوتی ہیں اور ناممکن ہے کہ کوئی دوسرا ان کو معلوم کر سکے پہلا فرق **فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِمُ أَحَدًا إِنْ مِنْهُ لَكُنُوزٌ مِّنْ ذُرُوءٍ** سے واضح فرمایا کہ غیب اللہ کا ہے اور اس کا علم اسی کے لئے مخصوص ہے بلا توسط مادیات و علوم عادیہ اس پر آگاہی بجز رسول کے کسی دوسرے کو نہیں دی جاتی لہذا وہ ولادت غیبی اور ولادت ناقہ صالح علیہ السلام کی طرح خاص اللہ کی طرف منسوب ہے اور اسی لئے اس کا نام معجزہ ہے اور وہ نبوت کی علامت ہے اور اس کا ماننا اللہ کو ماننا ہے۔ بر خلاف منجم و کاہن وغیرہ کی ضرورت کے کہ وہ مادیات اور اسباب عادیہ کی طرف منسوب ہیں اور اس لئے یقینی بھی نہیں اور ان کا ماننا بندہ اسباب بننا ہے یہی سبب ہے کہ منجم و کاہن حریص و دنیا طلب متکبر اور خدا سے غافل بلکہ دل میں گویا خدائی کا دعویٰ کرنے والا ہوتا ہے اسی طرح اس کے معتقدین پر بھی برا اثر پڑتا ہے کہ اسی کو عالم الغیب سمجھتے اور اس کی گویا پرستش کرنے لگتے ہیں بر خلاف بنی و ولی کے کہ عیناً بھی مہجانب اللہ ان پر مہجانبت کا انکشاف ہوتا ہے اسی قدر وہ زاہد و خائف اور خاشع و خاضع بنتے اور حق تعالیٰ کے سامنے سر جھکاتے ہیں اسی طرح ان کے معتقدین پر اچھا اثر پڑتا ہے کہ وہ پیغمبر کو نہ خدا سمجھتے ہیں نہ عالم الغیب، بلکہ مہبط وحی اور محترم عند اللہ قرار دیکر اللہ کا وحی ہونی اطلاعات کا مظہر و مخبر مانتے ہیں اور شان توحید میں ترقی کرتے



چلے جاتے ہیں۔ یہ دونوں کے اثرات و نتائج کا فرق ایسا جلی ہے کہ ان کے ذریعہ عامی سے عامی بھی حق اور باطل میں تمیز کر سکتا ہے اور دوسرا فرق فَاِنَّ لِّلْكَافِرِ لَعْنًا مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ سے ظاہر فرمایا گیا کہ بلا توسط اسباب جو خبر نبی کو دی جاتی ہے اس پر آگے پیچھے ہر طرف فرشتوں کا پہرہ چوکی کی تعینات ہوتا ہے کہ کوئی جن یا ہزار اس تک رسائی نہیں پاسکتا، اور نہ کوئی سبب مادی یا علم یا تجربہ ان کا شریک و ہمیں بن سکتا ہے ہر خلقت ہنم و کاہن وغیرہ کی خبروں کے کہ وہ جو رہے کی پڑی چیز ہے جس کا دل چاہے اٹھائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک بات ثبوت نبوت بنا کر پیغمبر سے پوچھو اور وہی بات دنیا کے منجمین و کاسینین کو جمع کر کے پوچھو۔ پیغمبر کو حق تعالیٰ اس کی اطلاع دے گا اور کاسینین لاکھ کوششیں کر لیں مگر کبھی معلوم نہ کر سکیں گے۔ یہی فرق تصرفات عالم کے متعلق سحر اور معجزہ میں ہے کہ معجزہ بلا واسطہ خالص من اللہ ہوتا ہے اور سحر من ذریعہ تصرف گندے عملیات و شرکیہ کلمات و ارواح خبیثہ و اسباب خفیہ ہو کرتے ہیں۔ صورتہ دونوں تصرف اگرچہ ایک طرح کے معلوم ہوتے ہیں مگر حقیقت کے اعتبار سے بہت فرق ہے چنانچہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ پر جا دو گروں نے اپنی لاکھٹیوں کو اور رسیوں کو سانپ بنایا کہ ان کے علم سفلی اور کلمات شرکیہ کی خاصیت نے ناظرین و حاضرین کی نگاہوں پر یہ اثر ڈالا کہ لاکھٹیاں ان کو سانپ نظر آئیں۔ مگر سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا سانپ بننا کسی عمل یا مادی شے کے واسطہ سے نہ تھا بلکہ محض کرمہ قدرت الہیہ اور خارق عادت امر تھا۔ لہذا نظر کی بندش نہ تھی بلکہ حقیقت تھی کہ لاکھٹی تبدیل اور منقلب ہو گئی تھی سانپ کی حقیقت و ماہیت کی طرت چونکہ مکاشفات و اطلاعات امور مخفیہ میں اور تصرفات عالم و تعلیب ماہیات میں صورتہ اشتباہ تھا اہل حق اور اہل باطل کے درمیان اس لئے کافروں نے ہمیشہ حضرات انبیاء کو کاہن اور ساحر کہا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک میں بھی یہ گندے الفاظ استعمال کئے گئے۔ لہذا حق تعالیٰ نے دونوں کا فرق واضح فرمایا جس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ کاہن یا ساحر کتنا ہی اپنے فن کا صاحب کمال کیوں نہ ہو جس وقت اس کا مقابلہ ہوگا نبی کے ساتھ تو اس کا فن یقیناً مغلوب ہوگا اور اور کبھی کام نہ دے سکے گا کہ حق اور باطل کا مقابلہ ہوتے پر عبادت الہیہ کا تقاضا ہے کہ ضرور قدرت کا اظہار فرمائے تاکہ دودھ جدا ہو جائے اور پانی جدا حضرت شیخ کا مقصود یہ ہے کہ اس آیت شریفہ میں نفس علم غیب یا اس کی مقدار وغیرہ کا تذکرہ مقصود نہیں بلکہ اہل حق کے مکاشفات میں اور اہل باطل مدعیان غیب کی اطلاعات میں فرق دکھانا ہو جائے مقصود یہ ہے کہ وہ من اللہ حق ہیں اور یہ باطل۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ باری شارة النفس رسول کے ساتھ خدا کا رسول یعنی اولیاء امت بھی شامل ہیں مگر ظاہر ہے کہ اطلاع معنیات کی مقدار میں دونوں مساوی نہیں۔ پھر مخلوق اور خالق میں تو مساوات کا کیا سوال ہو سکتا ہے۔ نیز معنیات خاصہ میں شیخ کرائے ہے



کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر مطلع فرمادیا گیا بلکہ اہل تصرف اغوات واقطاب کو بھی مطلع کر دیا گیا ہے۔  
 کہ ان پر مطلع ہوتے بغیر وہ اپنی خدمت مقصودہ یعنی تصرفات عوالم کو انجام نہیں دے سکتے لہذا آیت شریفہ ان  
 اللہ عندہ علم الساعة والیہ اور حدیث شریف خمس لا لعلمہن الا اللہ میں حصر صرف جنات و شیاطین  
 اور کاہن و منجم وغیرہ کے علوم کو خارج کرنے کے لئے ہے کہ ان پانچ چیزوں تک نہ جنات و شیاطین کی رسائی  
 ہو سکتی ہے اور نہ وہ مادیات یا علوم ریاضیہ کے تحت میں آ سکتے ہیں۔ ان کا علم صرف اللہ کے ساتھ مخصوص  
 ہے اور اُس نے اہل حق یعنی رسول و خواص امت کو ان پر مطلع فرمایا ہے۔ اہل باطل کو مطلع نہیں فرمایا پس  
 منجم اور کاہن وغیرہ اگر ان کے متعلق کوئی جبر دے گا تو وہ محض اٹکل اور رجما بالغیب ہوگا کہ بچہ کے تیر کی  
 کی طرح اتفاقہ ٹھیک پڑ گیا، پڑ گیا ورنہ غلط ہو گیا۔ چنانچہ تجربہ ہوا ہے کہ جوشی نہڈت جو دو دنگے کی خاطر  
 دروازے دروازے مارے پھرتے ہیں حاملہ عورت کے استفسار پر اُس سے کہتے ہیں کہ لڑکا پیدا ہوگا اور  
 یہ بشارت سنا کر اچھا خاصہ وصول کر لیتے ہیں اور اس کے بعد اس کی پڑوسن کے کان میں چپ سے کہہ جاتے  
 ہیں کہ اس کے لڑکی پیدا ہوگی۔ جب وضع حمل ہوتا ہے تو اگر لڑکا ہوا کہہ دیا دیکھ کیسی سچی بات تباہی تھی اور  
 اگر لڑکی پیدا ہوئی تو کہہ دیا پوچھ لے اپنی پڑوسن سے میں تو کہہ گیا تھا کہ لڑکی ہوگی، صرف تیرے خوش کرنے کو  
 تجھے لڑکا بتایا گیا تھا۔ بہر حال اپنی جیت اور اپنے علم کی ساکھ کے دونوں پہلو بچانے کی چال چل جاتے ہیں برفلا  
 بنی اور رسول اور اقطاب و اغوات کے مفہیات خمسہ کے متعلق وہ جو کچھ بتائیں گے چونکہ عالم الغیب عز اسمہ کی طرف  
 سے ان کو اس پر مطلع کیا گیا ہے اس لئے وہ واقعہ کے بالکل موافق ہوگا اور نہ اس میں چال ہوگی نہ دو معین اجمال  
 ہوگا اور نہ وہ واقعہ کے خلاف ہوگا اس کو غور سے سمجھو پڑے کام کی بات ہے۔

جن علماء نے مفہیات خمسہ کی اطلاع حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص کی ہے غالباً ان کا مطلب یہ ہے کہ ان باوجود  
 چیزوں کا علم اہل حق کے لئے بھی عمومی اور تحت عادیہ جاریہ نہیں بلکہ خصوصی اور تحت قدرۃ الہیہ ہے کہ جیسا اللہ چاہے  
 اور جس کے لئے چاہے بوقت ضرورت مطلع فرمادے دیگر معلومات رسالت کی طرح نہیں کہ ان کا حصول دائمی  
 اور لوازم نبوت میں ہوتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت خضر اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے قصہ سے جو  
 سورہ کہف میں مذکور ہے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام تکوینی خدمت پر مامور تھے  
 اور حضرت موسیٰ علیہ السلام صاحب تشریع اور قانون الہی کی خدمت پر مامور تھے ہر ایک کو اپنے اپنے  
 مذهب اور خدمات مقصودہ کے علوم سے نوازا گیا تھا۔ اور تکوین و تشریع میں اکثر اختلاف رہتا ہے چنانچہ  
 فدا سی مرافقت میں تین قصے ایسے پیش آ گئے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام ان پر خلاف شرع ہونے کی  
 گرفت کئے بغیر نہ رہ سکے۔ جن مصالح مخفیہ اور نتائج مفیہ پر فعل کے وقت حضرت خضر علیہ السلام کو



بوجہ خادم تکوین ہونے کے مطلع کیا گیا تھا اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مطلع کر دیا جاتا تو اعتراض ہی کیوں فرماتے چنانچہ بعد میں جب خضر علیہ السلام نے ان پر آپکو مطلع کیا تو آپ کا وہ خلیجان جو ایک اہل حق کے خلاف شرع امر کرنے سے لائق ہوا تھا دور ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل تشریع کے علوم دوسرے ہیں اور اہل تکوین کے علوم دوسرے۔ اہل تکوین کے لئے واقعات کا علم ضروری ہے اور اہل تشریع کے لئے صرف قانون الہی کی دفعات کا علم ضروری ہے بلکہ اہل تشریع کو اگر تکوینی واقعات کا علم ہو تو تشرعی خدمت کا انجام پانا مشکل پڑ جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اگر وہ معنیات معلوم ہوتے جو حضرت خضر علیہ السلام کو معلوم تھے تو تشریع پر وہ قوت کہ ناگواری و گرفت کو صیقل نہ دیتا اور اس کا نام تشرعی قانون میں مدانت رکھا جاتا۔ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے واقعات کا ماحصل بھی یہی تھا کہ سیدنا داؤد علیہ السلام سے واقعہ کا علم مخفی رہا اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے گوتبریر سے اس کا پتہ چلایا مگر ذاتی علم ان کو بھی نہ تھا۔ بائیں ہمہ منصب تشریع افضل اور تشرعی حکم اگرچہ خلافت واقعہ ہوا حب عند اللہ ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ صاحب تشریع کے لئے عموماً عدم علم تکوین ضروری ہے۔ یعنی ان کے لئے علم غیب کمال نہیں بلکہ عدم علم غیب کمال ہے کہ قانونی تنفیذ میں سختی و یکسوئی اسی پر موقوف ہے حضرات انبیاء پر صورت عتاب کی وجہ بھی چنانچہ یہی ہے کہ تکوین کے علم غیب پر اطلاع ہوتی تو اس کی تعمیل میں لپکے لہذا عصمت کا خلاف نہ ہوا، مگر پھر تشریع پر نظر گئی تو اس کے خلاف ہونے کا وجہ سے اپنے کو گناہ گار قرار دیا اور گریہ وزاری ہوئے لگی۔

پس اگر ان حضرات کو علوم غیب دیدے جائیں تو عمر بھر میں لاکھوں کروڑوں صورتیں ایسی پیش آئیں گی کہ واقعہ اور تکوین کچھ ہے اور تشرعی حکم کچھ اور ہے اس لئے علم غیب کی بنا پر تکوین کی موافقت میں لپکا کر سگے اور پھر ان کو تشریع کے خلاف پا کر رو دیا کریں گے۔ اس طرح تو بے شمار واقعات پیش آئیں گے جن میں گناہ کی صورت ہوگی اور پھر اس پر صورت عتاب کا ترتیب ہوگا۔ غرض یہ قانون الہی کہ لُئِ الْخَلْقُ وَالْآخِرُ بظاہر اس کی رہبری کر رہا ہے کہ ہر دو محکمہ کے علوم جدا اور باہم متضاد ہیں مگر تشرعی محکمہ افضل ہے کہ نظام عالم کا بقا اسی پر ہے اور اجتہاد و فہم و عقل کا امتحان بھی اسی میں ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ واقعات معنیہ اور تکوینیات مخفیہ کو مستور رکھا جائے۔ اور چونکہ کمال کا موقوف علیہ خود کمال ہے اس لئے ان حضرات نے معنیات خمسہ کے متعلق حکم لگایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مخفی تھے۔ اور یہ اخفا آپ کے لئے نقص نہیں بلکہ کمال تھا کہ منصب تشریع کے لئے کمال ہی عدم علم ہے مثلاً آپکو علم ہوتا کہ قیامت آنے میں ابھی دو ہزار برس باقی ہیں تو دجال کے فتنہ سے جو قرب قیامت ہوگا آپ اس کا اہتمام کے ساتھ صحابہ کو نہ ڈلا سکتے جس اہتمام سے اب ڈرایا کہ ممکن ہے چند سال بعد آجائے اور صحابہ بھی اس کو دیکھ لیں۔ اور جب تخلف میں یہ اہمیت نہ ہوتی تو تشریع انداز



میں نقص آجاتا۔ حالانکہ تشریح ہی افضل المناصب ہے غرض علماء کے دونوں فریق عاشقانِ رسول ہیں اور ہر ایک اپنے علم و فہم کے موافق چلا ہے کہ جس نے معنیاتِ خمسہ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے علم ثابت کیا ہے اس نے اسی کو کمال سمجھا ہے اور جس نے اس کا انکار کیا ہے اس نے عدم علم ہی کو کمال سمجھا ہے لہذا اس میں کسی پر اعتراض نہ کرنا چاہیے کہ وَلِلْعَشَائِ فِيمَا لَيْسَتْ قَوْلٌ مِّمَّا هِيَ وَاللَّهُ اعْلَمُ۔

حق تعالیٰ توفیق بخشے کہ رسول کے ساتھ خادمانِ رسول کی محبت و احترام ہمارے دلوں میں قائم رہے کیونکہ یہ حضرات باغِ انوارِ الہیہ میں اپنے پیغمبر کے ساتھ گشتِ لگانے والے ہیں ان کی اجتہادِ دی خطا تو انشاء اللہ قلمزد اور معاف ہو جائے گی بلکہ اگر منشا مستحسن یعنی محبت و تعظیم ہے تو اجر ملنا بھی متوقع ہے مگر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے الوان نسبت میں کسی لون کے ساتھ اگر بغض و عناد ہو تو بڑا خطرناک اور یقیناً موجبِ خسران و حرمان ہے۔ اللہ جعل ما کتبناہ خالصاً لوجهک الکریم و موجباً لرحمنک العظیم و النفع بہ من قراہ او کتبہ او سعی فی شئ منہ بجاہ من ہو بالمومنین لئلا یتذکر دحیم علیہ افضل الصلوٰۃ واذکی التسلیم ہ

**التماس** اپنی بے بضاعتی پر نظر کرتے ہوئے مجھے خیال بھی نہ ہوتا تھا کہ اس عالی کلام اور اسجاٹ مزاجہ الاقدام کی خدمت کو انجام دے سکے گا۔ اللہ سبحانہ کے محض فضل و کرم کے بھروسہ پر یکم غرم کو قلم اٹھا لیا تھا۔ اپنے مولیٰ کریم کا کس طرح شکر ادا کروں چار مہینہ پورے نہ ہوئے کہ یہ حصہ ترجمہ اور طباعت سے مکمل ہو گیا۔ احباب کا استعجال مقتضی ہوا کہ اس کو حصہ اول قرار دے کر جدا کر دوں۔ کیونکہ اربیز کا نصف حصہ بھی گیا ہے اور کلامِ رسول اور کلامِ اللہ کے متعلق اشکالات کے ابواب بھی تمام ہو گئے اس لئے ختم کرتا ہوں۔ حصہ دوم جس میں اخلاص، پیری مریدی، حالات اولیا، مجلس اغواث و اقطاب، احوال یرزخہ اور احوال حبت و دوزخ وغیرہ کے مضامین عجیبہ و غریبہ مذکور ہوں گے۔ اگر توفیق الہی شامل حال رہی تو انشاء اللہ چند ماہ بعد نذر ناظرین ہو گا۔ مجھے پورا اعتراف ہے اپنی کم مائیگی و ضعف علمی کا اس لئے اگر حضرات اہل علم خطا و زلت پائیں تو بیگناہ لطف و کرم اصلاح فرمادیں اور عند اللہ ماجور و عند الناس مشکور ہوں۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهِ مُحَمَّدٍ وَاٰلِهِ وَصَحْبِهِ اَجْمَعِیْنَ

بندہ ناچیز عاشقِ الہی عفی عنہ مولوی فاضل میرٹھی

۲۰ ربیع الثانی ۱۳۵۴ھ



(باب سوم) اُن ظالموں کا ذکر جو بندوں کی ذات اور ان کے اعمال پر داخل ہوتی ہیں اور ان کو خبر بھی نہیں ہوتی۔

حضرت ممدوح نے فرمایا کہ ایک مرتبہ مجھے میرے شیخ حضرت عمر بن محمد ہزاری نے اس جنگل کی طرف بھیجا جہاں ان کے مزدور اجرت پر کام کر رہے تھے۔ اور تاکید فرمایا کہ جا کر ان کے کارِ خدمت کو غور سے دیکھو۔

چنانچہ میں چلا گیا نظر کے وقت حضرت شیخ بھی تشریف لے گئے اور ہم نماز سے فارغ ہو کر شام تک وہیں بیٹھے رہے حتیٰ کہ مزدور اپنے کام سے فارغ ہو گئے اور ان کی اجرتیں ان کو دے دی گئیں جب سارے مزدور چلے گئے تو میں نے حضرت کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا دیکھا کہ غصہ آ رہا ہے حتیٰ کہ میں بھی ڈر گیا۔ اس وقت آپ نے مجھ سے فرمایا تم نے کچھ دیکھا بھی؟ میں نے عرض کیا کہ میں نے تو کچھ نہیں دیکھا۔ فرمایا غور کر شاید کچھ دیکھا ہو۔ مزدوروں کی کارِ خدمت میں تم نے کیا بات دیکھی؟ میں نے کہا جب تک آپ تشریف نہیں لائے تھے تو بہت ہی سست کام کر رہے تھے اور جب آپ آ گئے اور ان کی نظر آپ پر پڑی تو بڑی چستی کے ساتھ کام کرنے لگے فرمایا ہاں آج تم نے ناسقین کے اعمال اور محرومین کے اعمال کا نظارہ کیا۔ ناسقین تو وہ لوگ ہیں جو عبادتیں کرتے ہیں مگر عبادت اور طاعت کا صدور بغیر نیت، اور قصد کے محض عادت کی بنا پر ہوتا ہے۔ کہ نماز میں بھی اٹھنا بیٹھنا اور حرکت و سکون اُن کا باقتضاء عادت و طبیعت ہوا کرتا ہے۔ کوئی غرض اچھی یا بُری اس کی محرک نہیں بنتی۔ لہذا ان کی عبادت نہ اللہ کے لئے ہے نہ غیر اللہ کے لئے۔ بلکہ محض عادت و طبیعت کی خاطر ہے جیسے ایک شخص کو بھوک ہو نہ پیاس بلکہ فرض کرو اتنا شکم سیر ہو کہ کھانے کی خواہش تو درگت اور گنجائش بھی نہ ہو کہ کچھ کھا سکے۔ وہ لوگوں کے ساتھ باغ میں چلا جائے اور یہ دیکھ کر کہ لوگ وہاں چل پھر رہے ہیں اور تسم تسم کے پھل کھا رہے ہیں یہ بھی ان کے ساتھ پھرنے لگے۔ تو دوسروں کا چلنا پھرنا پیٹ بھرنے کی خاطر اور نفس کو لذت پہنچانے کی غرض سے ہو گا مگر اس کا چلنا پھرنا محض عادت کی بنا پر ہو گا کہ نہ کھانا اس کو مقصود ہے، نہ نفس کو لذت پہنچانا مطلوب ہے نہ اپنے بھائیوں کی مدد کرنا اس کے لئے محرک ہے اور ان کی موافقت و دلجوئی اس کی غرض ہے، بلکہ دوسروں کو سیر کرتا اور گشت لگاتا دیکھ کر صرف عادت و طبیعت کے اقتضا سے چلنے پھرنے لگا ہے۔ پس یہ مثال ہے ناسقین کے اعمال کی۔ اور محرومین وہ لوگ ہیں جن کے اعمال اپنے ذاتی نفع اور اغراض نفس کی خاطر ہوتے ہیں، اللہ کے واسطے نہیں ہوتے۔ ایسے اعمال سے بجائے قرب کے حق تعالیٰ کا بُعد بڑھتا ہے۔ اس لئے کہ وہ ذاتِ عبد کی حقیقت کے خلاف ہیں کیونکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ذاتِ عبد حق تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے اس کی مملوک ہے اور ہر جہت سے اسی کی طرف منسوب ہے کسی دوسرے کی طرف اس کا انتساب کسی حیثیت سے بھی نہیں ہے۔ پس اگر اس کے افعال کا صدور اس



حقیقت پر ہوتا تو اس کے تمامی افعال خالص اللہ کے لئے ہوتے۔ گویا وہ کہتا ہے کہ میرے افعال میں میرا کوئی حصہ بھی نہیں ہے کیونکہ تمامی افعال جو مجھ سے صدور ہوئے وہ خود اللہ ہی کے مخلوق ہیں۔ ایسے اعمال کو بے شک کہا جاتا کہ حقیقت ذات کے موافق صادر ہوئے ہیں۔ لیکن جب وہ یہ کہہ رہا ہے کہ میں تو بے شک اللہ کا ہوں مگر میرے افعال خود میرے ہیں اور ان کے صدور کے وقت نیت کر رہا ہے کہ ذاتی نفع اور حصول اغراض کی، تو ایسے اعمال کو سر حقیقت کے موافق کسی طرح نہیں کہہ سکتے اور ناممکن ہے کہ یہ اللہ کا کوئی حق کچھ بھی ادا کر سکے کیونکہ جو عمل کرتا ہے وہ اپنی ذاتی غرض کے لئے کرتا ہے نہ کہ اللہ کا حق ادا کرنے کی خاطر۔ اور جب یہ شخص افعال میں اللہ سے بے تعلق و جدا ہو گیا تو اللہ کی عطا بھی اس سے منقطع اور علیحدہ ہو جائے گی اور منجملہ محرومین کے یہ بھی (اجر و ثواب سے) محروم بن جائے گا۔ میں نے عرض کیا کہ عمل کرنے والے کو اجر و ثواب کا ذکر کر کے بکثرت آیات و احادیث میں ترغیب دہی گئی ہے۔ پس اگر اجر و ثواب کی خاطر (کہ وہ ذاتی نفع اور نفسانی اغراض ہیں) عمل کرنا اللہ سے بے تعلق ہوتا جیسا کہ حضرت عمرو بن ہواری کے ارشاد سے معلوم ہوا تو احادیث و آیات میں بڑے بڑے اجر و ثواب بیان کر کے اعمال کی ترغیب کہیں نہ دی جاتی فرمایا کہ آیات و احادیث کا مضمون ہمارے خلاف نہیں ہے کیونکہ ان میں یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ اعمال اپنے نفسوں کی خاطر کیا کرو اور میں ایسے اعمال پر تم کو بڑے بڑے اجر و ثواب دوں گا وہاں یہ تو ارشاد ہے کہ عبادت کرو میری، اور طاعت کرو خالص میرے لئے پس میں اجر و ثواب دوں گا اس پر جس کا مطلب یہ ہوا کہ اپنے اعمال میں ہماری نیت (اجر و معافہ کی نہیں بلکہ) اللہ کے لئے ہو کہ سر محب کا نا اور حکم کی تعمیل کرنا محض اس کی عظمت اور کبریائی کی خاطر اور ان احسانات کی وجہ سے ہو جو رات دن بڑی بڑی نعمتوں کی صورتوں میں اس نے ہم پر فرمائی ہیں اور اس پر وہ محض اپنے فضل و کرم سے ثواب عطا فرمادے۔ ہاں اگر احادیث و آیات کا مضمون یہ ہوتا کہ اخلاص والی عبادت پر ہم اجر نہ دیں گے تب بے شک ہماری تقریر کے خلاف ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ عبادت اس نیت سے کرنا کہ میں اجر ملے خود غرضی ہے اور ثواب سے محروم بنادیتی ہے البتہ اس نیت سے کرنا کہ اللہ جل جلالہ کا ہم پر حق اور مار کا نہ استحقاق ہے کہ ہم اس کی غلامی کا اظہار اور اس کے حکم کی تعمیل کریں اخلاص کہلاتا ہے اور اسی پر اجر و ثواب مرتب ہوتا ہے، اور کس درجہ جاہل اور احمق ہے وہ بندہ جس کا یہ گمان ہو کہ اپنے افعال سے نیکیاں حاصل کروں گا اور اجر و ثواب کماؤں گا جبکہ جانتا ہے کہ افعال میں اس کا بال برابر بھی دخل نہیں۔ خود بھی اللہ ہی کا پیدا کردہ ہے اور اس کے افعال بھی اللہ ہی کے پیدا کئے ہوئے ہیں پھر میں کیسے جانتا ہوں کہ ان نیکیوں پر بھروسہ کریں جو اللہ کے پیدا کردہ افعال پر مرتب ہوئے ہیں اور اللہ کے فضل و کرم پر بھروسہ نہ کریں۔ مگر بات یہ ہے کہ غفلت آنکھوں کو اندھا بنا دیا کرتی ہے اور اس لئے حقیقت تک نظر نہیں جاتی، ایک عابد اپنے ذاتی نفع کی خاطر کہ عبادت پر



اللہ میری مرادیں پوری فرمائے گا کامل بیس برس عبادت کرتا اور بڑے المحاح کے ساتھ دعائیں مانگتا رہا۔ مگر ایک مراد بھی اس کی پوری نہ ہوتی۔ بہت حیران ہوا اور کہنے لگا کیا بات ہے بیس سال سے عبادت کر رہا اور دعا مانگ رہا ہوں مگر حق تعالیٰ پوری نہیں فرماتا۔ اس وقت حق تعالیٰ نے اس پر رحمت نازل فرمائی اور اس کو نفس اور افعال کی معرفت بخشی (کہ حقیقت منکشف ہو کر آنکھیں کھل گئیں) تو کہنے لگا درحقیقت میں بڑا احمق ہوں۔ جبکہ اللہ ہی نے مجھے پیدا کیا اور اسی نے میرے افعال کو پیدا کیا اور اسی نے میرے اندر صحت پیدا فرمائی اسی نے وہ جگہ پیدا فرمائی جس پر عبادت کر رہا ہوں، اسی نے پانی پیدا کیا جس سے وضو کرتا ہوں، -  
 رغن اسی نے کپڑا پیدا کیا جس سے ستر چھپاتا ہوں، اسی نے وقت اور زمانہ پیدا فرمایا جس میں عبادت کرتا ہوں رغن عبادت کے تمامی اجزا اور تمامی شرائط و ارکان اور تمامی افعال و قوی اسی کے پیدا کردہ اور عطا فرمائے ہوئے ہیں) میں نے کیا کیا ہے جس پر اجر کا طالب ہوں اور اس کی وجہ سے شکر و ثناء کا مستحق ہوں۔ ان کو جتاؤں۔ واللہ میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ اور کیا تو یہ کیا کہ میرے اندر جو تصرفات و افعال الہیہ جاری تھے۔ ان کو اللہ سے قطع کر کے اپنی طرف منسوب کر لیا اور اس پر اجر و ثواب مانگنے لگا اللہ سے ہر قسم کی تمنائیں رکھنے لگا۔ طرہ براں تعجب کرنے اور یہ کہتے لگا کہ آستانہ خدا پر بیس سال سے پڑا ہوں مگر اس نے مجھے کچھ نہیں دیا۔ یا اللہ میری توبہ۔ یا اللہ میری توبہ، یا اللہ میری توبہ۔ رغن جب اُس نے سچی توبہ کی ر اور حقیقت شناس ہو کر سمجھ لیا کہ خود رغن کی عبادت اللہ و بال ہے) تب حق تعالیٰ نے اس کی ساری مرادیں بھی پوری فرمادیں اور وہ معرفت نائکہ عطا فرمائی جس کے مقابلہ پر جنت بھی کوئی چیز نہیں ۱۲۔

امام سیوطی نے بھی بدورسافرہ میں ایک حدیث نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پہلے زمانہ میں ایک شخص تھا جس نے ایک جزیرہ میں چھ سو برس اللہ کی عبادت کی تھی۔ حق تعالیٰ نے وہاں اس کے لئے شریں پانی کا ایک چشمہ جاری اور انار کا ایک درخت پیدا فرمایا تھا جس میں روانہ ایک انار لگتا اور وہ اس کی غذا کے لئے کافی ہو جاتا تھا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا جاؤ جنت میں میری رحمت اور فضل سے۔ کہنے لگا کہ نہیں اے میرے پروردگار بلکہ چھ سو برس کی عبادت کی وجہ سے تب حق تعالیٰ نے محاسبہ شروع فرمادیا اور فرمایا کہ تیری یہ چھ سو برس کی عبادت تو میری عطا کردہ نعمتوں میں ایک نعمت کی بھی مکانات نہیں کر سکتی۔ میں نے تیرے لئے ستور سمندر میں میٹھے پانی کا چشمہ جاری کیا۔ بتا کہ اس نعمت کا تو مستحق کس بنا پر ہوا؟ نیز میں نے تیرے لئے انار کا درخت اُگایا جس میں روزانہ پھل لگتا تھا حالانکہ دوسروں کے لئے سال بھر میں صرف ایک دفعہ پھل آتا تھا۔ بتا کہ اس نعمت کا تو مستحق کس بنا پر ہوا؟ نیز میں نے تجھ کو اتنی دراز عمر عطا فرمائی کہ سالانہ دوسروں کی عمر اس سے بہت کم ہوتی تھی۔



نیز اس مدت دراز تک میں نے تجھ کو عبادت کی طاقت بخشی حالانکہ دوسروں میں یہ طاقت نہیں بخشی۔ نیز میں نے تجھ سے شیطان کو دور اور تجھے اس سے محفوظ رکھا حالانکہ وہ بہتروں کو تباہ و ہلاک کر چکا ہے۔

نیز اتنی مدت دراز تک میں نے تجھ کو تندرست رکھا حالانکہ دوسروں کو یہ صحت نہیں بخشی۔ نیز میں نے تیرے جسم کو پیدا کیا حالانکہ تو لاشی محض تھا۔ میں نے تیرے حرکات و سکنات کو پیدا کیا اور ہر قسم کی نعمتوں سے تجھے مالا مال کیا۔ ان بے شمار بیشکی نعمتوں کی مکافات کا حساب کرنے کے بعد تباہ کیا لے کر آیا ہے اچھا اس کو لے جاؤ دوزخ میں۔ چنانچہ فرشتے اس کو دوزخ کی طرف لے چلے۔ جب اُس نے دیکھا کہ بس تباہ ہو گیا تو عرض کرنے لگا اے میرے پروردگار مجھے جنت میں داخل فرما دیجئے محض اپنے فضل و رحمت سے حق تعالیٰ نے کہ ارحم الراحمین اور اکرم الاکرامین ہے ارشاد فرمایا اچھا اس کو واپس لے آؤ اور جنت میں داخل کرو میری رحمت و فضل سے۔ اس کے بعد اس سے فرمایا جاؤ جنت میں تم تو میرے بڑے پیارے بندہ ہو۔

اس کے بعد میں نے حضرت ممدوح سے دریافت کیا کہ زیادہ بُری فاسقین کی عبادت ہے یا محرومین کی؟ فرمایا کہ محرومین کی عبادت پھر بہتر اور افضل ہے۔ ایک وجہ سے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ روقت و رحیم اور لطیف ہے جب دیکھتا ہے کہ کوئی بندہ خود غرضی ہی کے درجہ میں سہی مگر عبادت میں لگا اور پابندی سے جا ہوا ہے تو اس پر فضل و رحم فرماتا اور اس کی ذات اور اس کے افعال کی حقیقت سے واقف اور شناسا بنا دیتا ہے اور پھر وہ (خود غرضی) سے تائب ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا (اور محض لوجہ اللہ عبادت کرنے لگتا) ہے جیسا کہ قصہ مذکورہ میں بیسی سال عبادت کرنے والے کا حال ہوا، اور نیز بے شمار مخلوق کے ساتھ حق تعالیٰ کا یہ برتاؤ ہو چکا ہے۔ میں نے عرض کیا تو اپنی رحمت و فضل ہی سے ان کو وہ اجر و ثواب بھی عطا فرما دے گا جو آیات و احادیث میں مذکور ہیں کہ جو وہ (یعنی لطف و رحم) اس کی ہو سکتی ہے کہ ان پر رحم فرمایا اور ان کو حقیقت سے واقف بنایا وہی وجہ اس کے لئے کافی ہے کہ باوجود خود غرضی کی عبادت کے ان پر اجر و ثواب عطا فرما دے۔

فرمایا اگر تمہارا یہ مطلب ہے کہ جب حقیقت کی معرفت بخشی تو اب اجر بھی عطا فرما دے، تب تو ٹھیک ہے اور اگر یہ مطلب ہے کہ وہ افعال کو حق تعالیٰ سے قطع کئے اور اپنی طرف منسوب کرتے رہیں اور اس حالت میں بے تعلقی سے اللہ پر اجر کا استحقاق جملتے رہیں تو ایسا خیال بھی نہ لاؤ کہ اجر مل جائے کیونکہ گو قدرت میں داخل ہے مگر عبادت الہیہ اور قانون کے خلاف ہے میں نے عرض کیا اچھا ایک شخص نے حدیث میں سنا کہ جو فلاں کام کرے گا اس کو اتنا اجر ملے گا اور جو فلاں کام سے باز رہے گا اُسے اتنا ثواب دیا جائے گا، یہ سنکر وہ مکمل کی تعمیل کے لئے اور اس اجر و ثواب کے حاصل کرنے کے لئے پکا جو حدیث میں آیا ہے، اور اس کا یہ عقیدہ بھی ضرور ہے کہ بغیر اذنِ خدا کے (میں تو کیا) ذرہ بھی نہیں ہل سکتا۔ (تو ایسی صورت میں اس عمل پر کیا حکم



لگائیں گے؟) فرمایا اگر اس کی خالص نظر اور اصل نیت تعمیل حکم خدا کی طرف گئی ہے اور اجر و ثواب لینے کی نیت اس کے تابع ہے کہ فرض کرو اجر و ثواب حدیث میں مذکور نہ ہوتا تب بھی وہ تعمیل میں ایسا ہی لپکتا۔ جیسا اب لپکا ہے تب تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اور اگر اس کی خالص نظر اور اصل نیت تحصیل اجر کی طرف ہے اور تعمیل حکم کی نیت اس کی تابع ہے کہ اجر و ثواب اگر مذکور نہ ہوتا تو حکم کی تعمیل نہ کرتا تو یہ وہی عبادت ہے جس میں ہم گفتگو کر رہے ہیں اس کو مذموم قرار دے رہے ہیں کہ دنیا کا بھی نقصان اٹھایا کہ محنت کی اور وقت خرچ کیا، اور آخرت کا بھی خسارہ پایا کہ اجر و ثواب ملے گا۔ بشرطیکہ دو باتوں پر نظر قائم رہے۔ اول اس پر نظر ہو کہ یہ فعل طاعت ہے، اور اس پر حق تعالیٰ نے اجر کا وعدہ فرمایا ہے اور اس کے لئے عامل کو تاکید کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دوم اس پر نظر ہو کہ اللہ ہی برا خالق ہے اور وہی میرے افعال کا خالق ہے اور اس نے ثواب کا جو کچھ بھی وعدہ فرمایا ہے وہ اس کا محض احسان اور لطف و کرم ہے اس پر واجب و لازم نہیں۔ اور یا وجود وعدہ فرمانے کے اس کو اہم قرار دے چاہے رحم فرمانے اور چاہے عذاب دے۔ مگر چونکہ میں غلام ہوں اس لئے آقا کا حکم سن کر تعمیل کے لئے تیار ہوا ہوں اور اپنے رب کریم سے اجر و ثواب کی امید و توقع رکھتا ہوں پس جب بندہ اس نظر صحیح سے اپنے رب کو دیکھے گا تو اب اجر و ثواب پر نظر رکھنا بھی مضرت نہ ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ قسم تو وہ ہے جس میں علماء کا اختلاف ہوا ہے کہ امام غزالی نے تو ایسی عبادت کو آبر سے خالی بلکہ شرک فی العمل قرار دے کر ریا و نمود کے حکم میں لیا ہے جس سے عمل حبیط ہو جاتا ہے (کیونکہ عبادت خالص اللہ کے لئے درہی بلکہ اپنا نفع اور اپنی غرض اس میں شامل ہو گئی جو شرک خفی ہے) اور علامہ ابوبکر ابن عربی نے سراج المریدین میں اور امام قرافی نے القواعد والفرق میں لکھا ہے کہ ایسے عمل پر اجر ملے گا اور نہ یہ شرک فی العمل ہے نہ ریا و نمود جس سے اعمال حبیط ہوتے ہیں۔ فرمایا ابن عربی اور قرافی کی رائے صحیح ہے، کیونکہ حق تعالیٰ کسی عمل والے کے اچھے عمل کو ضائع نہیں فرمایا کرتا۔ اور اس نے بھی چونکہ عمل نیک کیا ہے۔ لہذا اس کا عمل جب اس کی ذات سے صادر ہوگا بھی ایک نور ہوگا اور اس کی نیت صالحہ کا اور اپنے رب پر نظر قائم رکھنے کا بھی ایک دوسرا نور ہوگا نور عمل کے علاوہ پھر اجر ہے محروم کیسے رہ سکتا ہے ہاں وہ شخص اس سے بہتر اور اکمل ہے جس کے اجر و ثواب پر نظر ہی نہ ہو اور محض اپنی غلامی کے تقاضہ سے امر الہی کا امتثال کرے)

اور وہ پہلی قسم ہے جو مذکور ہو چکی۔ اور ان دونوں سے اکمل و افضل وہ ہے جو نیت عمل کے بعد نفس عمل سے بھی بے خبر ہو جائے کہ صرف عمل کے شروع کرتے وقت عمل سے باخبر تھا اور اس کے اللہ واسطہ کرنے کی نیت کر لی تھی۔ مگر پھر بھی اپنے خالق سبحانہ کے مشاہدہ میں اس کا فکر و خیال للہ



کی عظمت و کبریائی اور جلالت شان میں محو و مستغرق ہو گیا کہ عمل کی خبر ہی نہیں رہی اور اب عمل کی تکمیل گویا  
 منجانب اللہ یا نہ گرفتہ طاعت طبیعت کے تقاضہ سے ہوئی، اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں  
 بھی یہ حال نصیب فرمائے۔ نیز آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ مشاہدہ موجب محبت الہی ہے، اور اللہ کی محبت  
 کے لئے لازم ہے یکسوئی کے ساتھ تعلق مع اللہ اور اس تعلق مع اللہ پر ضروری ہے کہ اس پر حق تعلق  
 کی طرف سے اتنا ہو جو اس کی شان ہائے شان کو زیبا ہے نہ کہ اتنا جو بندہ کی شان کے لائق ہے۔ اور عدم مشاہدہ  
 موجب غفلت ہے، اور اللہ سے غفلت کے لئے لازم ہے یکسوئی کے ساتھ تعلق مع النفس، اور اس تعلق  
 مع النفس پر ضروری ہے کہ اجر بندہ کی حیثیت کے موافق ہو نہ کہ رب کی شان کی موافق۔ اور یہی سبب ہے  
 کہ دو شخص درود شریف پڑھتے ہیں مگر ایک کے لئے اجر بہت کم ہوتا ہے اور دوسرے کے لئے اجر بے پایاں  
 و بے شمار وجہ وہی ہے کہ پہلے شخص کے دہن سے درود نکلا ہے غفلت کے ساتھ اور دوسرے کے لئے درود نکلا کہ  
 اس کا دل مشاغل اور اغیار میں منہمک ہے اور گویا محض عادت کی بنا پر نکلا لہذا اس کو اجر ضعیف دیا گیا اور دوسرے کے  
 منہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف محبت و تعظیم کے ساتھ نکلا اور آپ کے ساتھ محبت نصیب  
 ہونے کی صورت یہ ہے کہ آپ کی جلالت شان اور عظمت کا دھیان کرے کہ آپ تمامی موجودات کی ہستی و وجود کا  
 سبب ہیں اور آپ ہی کے نور سے ہر نور کا ظہور ہے، اور آپ مخلوق کے لئے رحمت ہیں۔ اور اولین و آخرین کو  
 کوہدایت آپ کے ہی ذریعہ اور آپ ہی کی وجہ سے نصیب ہوئی ہے پس آپ پر درود و سلام آپ کی اس  
 رفعت شان کی وجہ سے پڑھنا چاہیے نہ کہ اپنی ذات کو نفع پہنچانے یعنی اجر اور دنیوی یا اخروی ثواب  
 حاصل کرنے کی وجہ سے۔ اور آپ کی تعظیم نصیب ہونے کی صورت یہ ہے کہ آپ کی اس رفعت شان میں غور  
 کرے اور سوچے کہ یہ آپ کو کس وجہ سے حاصل ہوئی؟ اور ایسی عالی مرتبت ذات کے لئے  
 کیسے بہترین اخلاق و خصائل زیب ہیں؟ یعنی ساری مخلوق ان میں سے ایک خصلت حاصل کرنے  
 سے بھی عاجز ہے۔ کیونکہ ہر خصلت حمیدہ کا وہ انتہائی عروج آپ کو حاصل ہے جس کو قوت فکر یہ سمجھ  
 سبھی نہیں سکتی۔ چہ جائیکہ کوئی اس کا حامل بن سکے۔ پس جب آپ پر درود و سلام بندہ کے دہن سے اس  
 بنا پر نکلے گا تو اس کا اجر بقدر شان محمدی اور بقدر شان رب ہوگا۔ کیونکہ اس درود پڑھنے کا محرک اور اس  
 پر آمادہ کرنے والا یہی علوم مرتبت محمدی کا دھیان ہوا ہے۔ لہذا اس کا اجر بھی بقدر اسی علوم مرتبت کے  
 ہوگا جو کہ درود کے لئے محرک ہوا ہے اور پہلے درود کا محرک چونکہ ذاتی غرض اور حظ نفسانی ہوا ہے لہذا  
 اس کا اجر بھی بقدر اس کے محرک ہوگا۔ یہی حال بندہ کے تمامی اعمال کا ہے کہ اگر ان کی محرک اللہ کی غفلت  
 اور اس کی کبریائی و علو شان ہوئی ہے تو ان کا اجر بھی بقدر غفلت الہیہ ہوگا۔ اور اگر ان کی محرک ذاتی غرض



اور خط نفسانی ہوا ہے تو ان کا اجر بھی بقدر اس محرک کے ہوگا والسلام۔

میں نے حضرت محدوح سے دریافت کیا کہ ہمارے درود پڑھنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نفع پہنچتا اور آپ پر نازل رحمت میں اضافہ ہوتا ہے یا نہیں؟ کیونکہ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے۔

فرمایا حق تعالیٰ نے ہمارے لئے درود پڑھنا اپنے بنی کو نفع پہنچانے کی غرض سے مشروع نہیں فرمایا بلکہ صرف ہم کو منتفع بنانے کے لئے مشروع کیا ہے مثلاً ایک شخص کے بہت سے غلام ہوں اور اس کی نظر ایسی زمین پر جائے جس کا مقابلہ زراعت و پیداوار میں کوئی زمین بھی نہ کر سکے۔ پس وہ نگار لطف و کرم فرما کر یہ زمین اپنے غلاموں کو عطا فرما دے کہ اس کے تمامی منافع صرف انہیں کے ہوں اور وہ اس کے مستقل مالک بنیں نہ یہ کہ شرکت اور بٹائی کی صورت میں زمین ان کے سپرد کر دی ہے۔ یہی حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہمارے درود پڑھنے کا ہے کہ اس کا سارا اجر و ثواب خالص ہمارے لئے ہے۔ ارحیب اس کے اجر کا نور کسی وقت

مستقل ہوتا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نور سے جا ملتا ہے تو اس کی یہ شان ہوتی ہے جیسے کوئی چیز اپنی اصل سے جا ملی۔ کیونکہ مومنین کے لئے جو اجر بھی ثابت ہوتا ہے وہ ان کے ایمان کی وجہ سے ثابت ہوتا ہے اور ان کا ایمان پر تو وہ ہے نور محمدی کا لہذا جتنے اجور بھی ہمارے لئے ثابت ہوں گے (انکی اصل ذات محمدی ہوگی اور) آپ ہی کی طرف سے ہوں گے۔ محسوسات میں اس کی مثال سمندر اور بارش کا پانی ہے کہ بارش کا سارا پانی سمندر ہی کی طرف سے ہے (کہ اسی سے بخارات اٹھ کر ابر میں جمع ہوتے اور زمین پر برکتے ہیں)

اور پھر وہ بہہ کر اور رو بن کر آخر کار اسی سمندر میں جا ملتے ہیں۔ پس جب وہ پانی سمندر کی طرف واپس ہوگا تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے سمندر میں اضافہ کر دیا (اسی طرح درود پڑھنے کے اجر کا نور چونکہ آیا ہے بحر انوار محمدی سے لہذا اگر وہ بعد میں جا ملا تو محمدی سے تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے اضافہ کر دیا انوار و برکات محمدیہ میں) میں نے عرض کیا کہ بعض علماء نے ہمارے درود پڑھنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نفع محمدی پہنچنے پر اسی طرح استدلال کیا ہے کہ درود کی مثال حیات کے حور و غلمان کی سی ہے۔ پس جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حیات میں میوؤں اور پھلوں سے منتفع ہوں گے جن کو ظرت میں لے کر حور و غلمان حاضر ہوں گے اسی طرح انوار اور اجوار سے منتفع ہوتے ہیں جن کو حور و غلمان میں لے کر ہمارے دہن اور لب حاضر ہوتے ہیں۔

وہاں حامل ظرت ملحق ہوں گے اور یہاں حامل حور و غلمان اور لب ہیں۔ اور حالت محمدیہ جیسی حیات میں ہوگی ایسی ہی عالم دنیا میں تھی۔ لہذا اس قیاس کے لئے کوئی امر مانع نہیں ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اس عالم کا قول تو اس وقت صحیح ہو جبکہ حور و غلمان دوسری چیز ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوسری چیز اور جب حقیقت یہ ہے کہ حور و حیات اور جو کچھ بھی حیات کے اندر ہے سب کا وجود ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم



کے نور سے ہے تو پھر کیا قیاس اور کیسی تمثیل۔ بس میاں حسن کو معلوم ہو جائے ثناء محمدی کیا ہے تو اس کو ہر قسم کا سکون و آرام مل جائے نیز حضرت نے فرمایا تم دلائل الخیرات پڑھنے والے کو دیکھو گے کہ جب درود پڑھتے کا ارادہ کرتا ہے تو اپنے منکر و خیال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت شریفہ کو لاتا اور پھر وسیلہ اور درجہ رفیعہ اور مقام محمود و غیرہ کی صورتوں کو جن کی طلب و درخواست کر رہا ہے اور جو تقریباً ہر درود میں مذکور ہوتے ہیں اپنے متخیلہ میں جاتا ہے اور دھیان کرتا ہے کہ میں اللہ سے ان چیزوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے طلب کر رہا ہوں۔ اور پھر اپنے خیال ہی میں اس کو تسلیم کر لیتا ہے کہ اللہ اس کو قبول فرمائے گا اور یہ چیزیں میری دعا و طلب کے سبب گویا، میرے ہاتھوں اپنے بنی کو عطا فرمائے گا۔ ان تخیلات کی وجہ سے یہ طالب سمجھتا ہے کہ میری وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا نفع پہنچا۔ لہذا پھوٹتا اور خوش ہوتا ہے اور خوب خوب خوش۔ سے درود پڑھتا اور آواز کو بلند کرتا ہے۔ غرض قراءت میں اس کا شوق و ہیجان بڑھتا جاتا ہے اور یوں محسوس کرتا ہے کہ درود صرف زبان سے نہیں بلکہ میرے دل کی رگوں سے نکل رہا ہے۔ پھر شروع و جھکاؤ ظاہر اور اس پر رقت طاری ہو جاتی ہے (کہ زار زار روتے لگتا ہے) اور سمجھتا ہے کہ یہ وہ عجیب حالت ہے جس سے بالا کوئی حالت نہیں۔ حالانکہ اس کا یہ خیال بالکل غلط اور خطا و عظیم ہے اور اس کے اس درود سے اس کو اللہ کی طرف سے کچھ بھی نہ ملے گا۔ اس لئے کہ اس درود کا تعلق اس کے محض وہم گمان اور متخیلہ اور صورتہ فکر یہ ہے اور اس کا وہم گمان باطل و خلاف واقعہ ہے۔ اور جو چیز باطل ہے اس کو حق تعالیٰ سے کوئی علاقہ نہیں حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق و اتصال صرف اسی شے کو ہوگا جو نفس الامر میں حق اور واقعہ کے مطابق ہوگی کہ اگر آنکھ کھول کر دیکھے تو ایسی ہی نظر بھی آجائے جو شے ایسی ہوگی اس کو بیشک اللہ سبحانہ سے تعلق ہوگا اور جس کی یہ حالت ہو کہ آنکھ کھول کر دیکھے تو نظر نہ آوے، وہ باطل کہلانی ہے۔ اور باطل کو حق تعالیٰ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لہذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے والے کو اس آفت عظیمہ سے ڈرنا اور بچنا چاہیے کہ اکثر آدمی حقیقت کو سمجھتے نہیں اور یوں خیال کرتے ہیں کہ یہ رقت اور جلالت جو ان کو حاصل ہوئی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ حالانکہ وہ شیطان کی طرف سے ہے تاکہ اس ذریعہ سے ان کو دھکیل کر اللہ سبحانہ سے دور کر دے اور دوری پر دوری بڑھاتا رہے۔ ورنہ اس کے لئے زیبا تو یہ تھا کہ درود پڑھنے کا محرک بجز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عظمت کے کوئی چیز بھی نہ ہوتی۔ اس وقت البتہ اس کا نور مشتعل ہوتا (اور نور محمدی کے جالمتا، لیکن اگر درود پڑھنے کی محرک اپنا ذاتی نفع اور نفسانی غرض ہوئی ہے تو وہ محبوب ہے اور اس کا اجر ناقص ہو جائے گا۔ اور اگر اس کا محرک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نفع ہے تو چونکہ خلافت واقعہ ہے۔



لہذا نہ اس کے درود کو اللہ کے ساتھ کوئی تعلق ہے، اور نہ وہ اللہ تک پہنچے گا۔ نیز حضرت محدوح نے فرمایا کہ  
 ہر عمل کا ایک اجر ہوتا ہے اور ہر اجر کا ایک نور ہوتا ہے، اور اس نور کا اس عالم دنیا میں ذات عبد کے ساتھ  
 آج بھی اتصال ہے کہ اگر اعمال صالحہ خالص اللہ کے لئے اور حسب بیان سابق ذات کی سر حقیقت کے  
 موافق صادر ہوں گے تو ان کے اُجور کے انوار ذات حاصل پر چکیں گے اور ذات کو ان کا ادراک و شعور ہوگا کہ  
 کبھی لرزہ چڑھ آئے گا کبھی گریہ طاری ہو جائے گا اور کبھی خشوع و انکسار پیدا ہوگا۔ غرض اس چمکنے والے نور  
 کا مقتضا جو بھی ہوگا وہ بدن پر نمودار ہوگا اور اس سے صاحب بصیرت سمجھ لے گا کہ عمل مقبول ہوا۔ نیز مقدار  
 بھی معلوم کرے گا کہ اس کا اجر اس مقدار کا عطا ہوا۔ اکثر آدمی یوں سمجھتے ہیں کہ اجراء اور اس کی مقدار  
 کا پتہ صرف آخرت ہی میں چلے گا مگر یہ اہل حجاب کا حال ہے کہ ان کو یہاں پتہ نہیں چلتا، درنہ اہل بصیرت  
 سے تو چھپا ڈھکا نہیں، ان کے لئے تاجر کی مقدار تک بھی واضح اور مکشوف ہے اور حسب اعمال غیر اللہ یعنی اپنے  
 ذاتی نفع، کی خاطر ہوں گے تو محض بے سود محنت و مشقت ہے جن کا نہ کوئی اجر ہے اور نہ ذات پر اس کا نور  
 چمکتا ہے نیز آپ نے فرمایا کہ ہر صاحب عمل اس کا امتحان کر سکتا ہے کہ عمل کے وقت اپنے قلب کو غور کے ساتھ  
 دیکھے کیونکہ کتنا ہی چھوٹا اور دقیق عمل کیوں نہ ہو اس کے لئے ضرور اجر ہوگا اور اجر کے لئے ضرور نور ہوگا جو  
 ذات پر چمکے گا اور ذات اس کو ادراک کرے گی۔ پس اگر اپنے قلب کو دیکھے گا کہ عمل کے وقت وہ دنیوی دھندل  
 سے لبریز اور غیر اللہ سے وابستہ ہے تو سمجھ لے کہ اللہ نے اس کو اجر سے محروم رکھا اور اسی لئے اس کے قلب کو  
 شواغل سے معمور فرما دیا۔ اور اگر قلب کو عمل کے وقت دھندلوں سے فارغ اور اللہ کی طرف متوجہ دیکھو پائے  
 تو سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو موجب اجر بنایا اور اس پر ثواب تجویز فرما دیا۔ ایک طالب علم شہر شہر اور  
 ملکوں ملکوں کا سفر کرتا پھرتا ہے مگر اس نیت سے کہ علم حاصل ہو جائے گا تو عزت بڑھ جائے گی، لوگوں کے  
 دلوں میں میرا جاہ اور میری بات کا اثر قائم ہوگا، دنیا خوب ملے گی، اور جہاں جاؤں گا بنگاہ احترام دیکھا  
 جاؤں گا۔ غرض اغراض باطلہ و فانیہ حاصل کرنے کی نیت سے پردیس میں مارا مارا پھرتا اور پرستہا پرستہا  
 اور مشقتیں برداشت کرتا ہے مگر یاد رکھو کہ حق تعالیٰ اس کو نور علم سے محروم رکھے گا اور وہ راسخ فی العلم  
 کبھی ہرگز نہ بن سکے گا۔ کیونکہ حقیقت علم صرف اسی کو مل سکتی ہے جو اپنے باطن سے علم کی طرف متوجہ ہو۔  
 اور اس کا باطن علم میں نہیں بلکہ ذاتی اغراض اور دنیوی مشاغل سے معمور ہے۔ صرف ظاہر اس کا حرکت و گشت  
 کر رہا ہے علم میں، اور علم منجملہ اسرار کے ایک سرالہی ہے جس کو باطن ہی لے سکتا ہے، لہذا اس کا ظاہر  
 اس کو کسی طرح نہیں پاسکتا۔ یہی حال اجور اعمال کا ہے کہ اگر ان میں اخلاص نہیں رہنمائی  
 اعضاء بدن کے ظاہری حرکات و سکنات ہیں، تو وہ اجور بندہ کو نصیب نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اجور



متحملہ اسرار الہیہ کے ہیں اور باطن کے بغیر صرف ظاہر ان کو کبھی نہیں پاسکتا۔

یقین نے عرض کیا حضرت مدوح سے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ لوگ بزرگوں سے مرویں مانگتے اور استغاثہ کرتے ہیں۔ اللہ جل جلالہ سے نہیں کرتے حتیٰ کہ کوئی قسم کھانے میں اپنا وثوق جتانا چاہتا ہے تو بجائے اس کے کہ اللہ کی قسم کھائے، یوں کہتا ہے کہ قسم کھاتا ہوں سید عبدالقادر جیلانی کی، قسم کھاتا ہوں حضرت یعزٰی کی، قسم کھاتا ہوں سید ابوالعباس سبکی کی۔ اسی طرح جب کسی مصیبت یا تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے یا بھیک مانگتا ہے اور سوال کرتا ہے جیسے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے فقیر پھرتے ہیں تو کہتا ہے مجھ فقیر کو فلاں بزرگ کے نام پر دیدو، اور فلاں ونی کا واسطہ مجھے روٹی کھلا دو۔ حالانکہ اس میں اللہ جل جلالہ سے قطعاً بے تعلق ہے حتیٰ کہ اگر ان سے کہا بھی جائے کہ اللہ کا وسیلہ لایا کرو اور اسی کی قسم کھایا کرو تو ان کے دل پر اس نصیحت کا بھی کچھ اثر نہیں ہوتا۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ فرمایا کہ اہل دیوان الیعنی مجلس اقطاب وابدال والے، اولیاء اللہ نے بالقصد ایسا کیا ہے۔ جب اللہ سے بے تعلق والے اور طلب میں ظلمت قویہ رکھنے والے بندوں کی کثرت پائی اور دیکھا کہ ان کی ذات گندی اور خبیث بن گئیں اور ان کا دل چاہتا ہے کہ ہمارے خالق جل جلالہ کا نام وہ بے حس کی ذات ہر طرح پاک صاف ہو۔ لہذا ان کے تلوٰب کو غیر اللہ یعنی بزرگوں کے ساتھ مربوط و وابستہ کر دیا۔ اور اس میں نازیہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ، دعا اور قبول فرماتا ہے جو دعا مانگتے وقت اپنے تلوٰب باطن سے بالکل حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو اور قبولیت دعا کی دو صورتیں ہیں۔ یا یہ کہ جو شے مانگ رہا ہے وہ اس کو عطا فرمادے (اور یہ اس وقت ہوتا ہے جبکہ اس شے کا ملنا اس کی تقدیر میں لکھا جا چکا ہے، یا یہ کہ عطا فرمائے مگر عطا مقدر نہ فرمانے کی مصلحت اور اس کا راز اس پر ظاہر فرمادے۔ اور یہ اولیاء کے لئے ہوتا ہے نہ کہ اہل حجاب کے لئے۔ پس اگر کوئی ظلمانی ذات (دعا مانگتے وقت) اپنے تمامی عروق اور جواہر ذات کے ساتھ (اللہ کی طرف) پوری متوجہ ہوئی اور کوئی چیز اللہ سے مانگی مگر حق تعالیٰ نے عطا نہ فرمائی (کیونکہ تقدیر میں اس کا دینا تجویز نہ فرمایا تھا۔ اور ساتھ ہی) اس کو عطا نہ فرمانے کی مصلحت سے بھی آگاہ نہ فرمایا (بوجہ اس کی ظلمت ذات اور عدم ولایت کے) تو بہت ممکن ہے کہ اس کو حق تعالیٰ کے وجود دوستی ہی میں طرح طرح کے شک اور وسوسے لاحق ہو جائیں (کہ عیاذ باللہ کوئی وجود ہوتا تو اس الحاح و زاری پر ضرور ترس کھاتا) پس اس صورت میں ضرورت پوری نہ ہونے سے بھی زیادہ مصیبت و وبال میں پڑ جائے گا (کہ مراد کے ساتھ ایمان بھی ہاتھ سے گیا)۔ اس مصلحت سے اہل دیوان نے و باطنی تصرف کے ذریعہ عوام الناس کی عقول کو اللہ کے نیک بندوں کے ساتھ وابستہ کر دیا کہ اگر مراد پوری نہ ہونے کے دلوں میں وسوسے بھی آئیں گے تو اولیاء و صلحا کی ولایت ہی کے



متعلق آئیں گے (اگر سچے ولی ہوتے تو میری مراد بر لاتے) اور اس سے ان کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا (کیونکہ دلالت کا انکار کفر نہیں ہے) یہی بات کہ اللہ سے بے تعلقی والے اور قلوب میں ظلمتیں رکھنے والے دنیا میں بہت زیادہ ہیں، اگر اس کا پتہ لگانا چاہو تو غور سے دیکھو ایک شخص مثلاً بیس روپیہ لے کر گھر سے اس نیت و ارادہ سے نکلتا ہے کہ فلاں بزرگ کے مزار پر چڑھاؤں گا تاکہ میری فلاں مراد پوری کر دے۔ چنانچہ وہاں جا کر قبر پر ڈال دیتا ہے۔ حالانکہ راستے میں اس کو بہترے محتاج اور ضرورت مند ملتے اور وہ اسی سے سوال بھی کرتے ہیں کہ اللہ واسطہ اور فی سبیل اللہ ہیں کچھ دیدور مگر یہ ان کو ایک پیہ بھی نہیں دیتا اور سیدھا مزار پر جا کر قبر کے سر ہانے پوری رقم پھینک آتے ہیں۔ بعد اس سے زیادہ بُری بات کیا ہوگی۔

اور اس کا سبب یہ ہے کہ یہ رقم اللہ واسطہ صدقہ کی نیت سے نہیں نکلی، اور نہ اس کا محرک عظمت و جلالت شان الہی ہوتی ہے۔ اگر یہ محرک ہوتا تو راستہ میں جو محتاج و مسکین بھی ملتے یہ اس کو ضرور دیتا۔ البتہ اس صدقہ پر آمادہ کرنے والی سے فاتی نفع اور خود غرضی ہے کہ مراد پوری ہو جائے۔ اور نفس کو حفظ مل جائے اور جاہ یا مال کا نفع نصیب ہو لہذا اس نے جس جگہ کو حصول غرض کے لئے اپنے خیال میں مفید سمجھا اس کو خاص کر لیا۔ کیونکہ اس کا گمان یہ ہے اگر یہاں دوں گا تو غرض پوری ہوگی اور اگر یہاں دوں گا تو غرض پوری نہ ہوگی نیز آپ نے فرمایا کہ آج میں نے غور کیا کہ دیکھوں ہر گوں کے نام کتنے صدقات دیئے جاتے ہیں تو صرف یاب تلمسان سے لے کر ساقیۃ الحرام تک (کے باشندوں نے جتنی رقم نذر اولیاء میں خرچ کی ہے اس کی تعداد اسی دینار سرخ (دو سو روپیہ سے زائد) اور تین سو ساٹھ بکریاں اور تہتر گائے اور سیل تھے کہ یہ سب کا سب صرف ایک دن میں صالحین کے نام پر نکالا گیا۔ اور اللہ جل جلالہ کے نام پر آج جو رقم نکالی گئی۔ اس کی مقدار دس درہم (ڑھائی روپیہ) بھی پوری نہیں ہوئی۔ اس سے اندازہ کرو کہ اہل ظلمت اور اللہ سے بے تعلق والوں کی کتنی کثرت ہے) آپ نے فرمایا یہ ایک سبب ہے منجملہ ان اسباب کے جو اللہ سے قطع تعلق کرانے میں قوی تاثیر ہیں اور امت محمدیہ پر ایسی طرح طاری ہوتے ہیں کہ اکثر لوگوں کو ان کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ بلکہ وہ اسی بے تعلقی کو تعلق مع اللہ سمجھ کر دھوکہ میں پڑے رہتے ہیں) اور ایسے اسباب جو بندہ کے لئے موجب انقطاع تعلق رب بنے ہوئے ہیں تین سو ساٹھ کی تعداد میں ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ اس وقت ان میں سے کچھ جناب والا کو مستحضر ہیں؟ فرمایا ہاں لکھو۔ اول یہی بطریق مذکور صالحین کے نام کی نذر اور ہدیہ کہ اللہ کے نام نہ ہو۔ دوم اولیا سے مراد مانگنا اور اللہ کا وسیلہ لانا کہ مزار پر آکر کہتا ہے اے فلاں بزرگ تم کو اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ میری فلاں ضرورت پوری کر دو۔ اس کا موجب انقطاع ہونا بائیں سبب ہے کہ معاملہ برعکس کر دیا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اللہ سے مراد مانگنا اور صالحین کا وسیلہ



لاتا کہ یا اللہ فلاں بزرگ کا واسطہ میری حاجت بر لانا یہ کہ اس کو الٹا کر دے۔ سوئم سر پر فرض یا قرض ہوتے ہوئے مزارات کا سفر کرنا۔ مثلاً فرض نمازوں کی قضا سر پر ہے، ان کا ادا کرنا تو چھوڑ دیا باوجودیکہ اللہ کا حق ہے اور اس میں وہ نور خدا اور اسرار الہی ہے جس کی وجہ سے بندہ پر رحم و کرم ہوا کرتا ہے اور ایک صالح کے مزار پر جا عافری دی۔ اور ظاہر ہے کہ اس میں اللہ سے بے تعلقی اور ظلمت ہے۔ چہارم۔ عمر یا رزق وغیرہ کے متعلق کسی ظالم سے ڈرنا کہ دل میں یوں کہے مجھے اس کا خلاف کبھی نہ کرنا چاہیے۔ اگر میں نے اس کو ناراض کیا تو یہ مجھے جان سے مار دے گا۔ یا میری روزی بند کر دے گا۔ کیونکہ اگر اس کے نزدیک محقق ہوتا۔ کہ اللہ اس کے نزدیک ہے اور ساتھ ہے اور اس کے تصرفات اس کے اور اس ظالم کے اندر جاری ہیں تو ضرور سمجھتا کہ صرف اللہ ہی فاعل ہے کسی فعل میں بھی یہ ظالم یا کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں اور پھر بجز اللہ کے کسی سے بھی نہ ڈرتا۔ بندہ کی یہ نگاہ جتنی قوی ہوتی جاتی ہے اسی قدر اس کا قرب حق تعالیٰ کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے اور جتنی کم یا معدوم ہوتی جاتی ہے اسی قدر اللہ سے اس کا پھٹا اور انقطاع بڑھتا جاتا ہے پنجم ظالم سے طمع اور توقع رکھنا کہ اس کا تقرب ڈھونڈے تاکہ اس سے مال و دولت حاصل کرے۔ کیونکہ اگر اس کے نزدیک مستحق ہوتا کہ روزی دینے والا صرف اللہ ہے تو یہ فعل اس کے کبھی صادر نہ ہوتا ششم کافروں کی اعانت کرنا کہ ان کو دنیا کے مصالح سمجھائے مثلاً (ترقی دینا کا) کوئی طریقہ بتائے دیا اور کسی طرح ان کے عروج و اقتدار کا ذریعہ بنے) پس یہ بھی منجملہ اسباب انقطاع کے ہے۔ جامع کتاب کہتے ہیں کہ واقعی ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ کسی نے ظالم کی خیر خواہی کی ہو اور انجام کار خسارہ نہ اٹھایا ہو، ایک شخص نے پولیس کے ایک سپاہی کو نماز کے لئے جگہ کا ارادہ کیا تو حضرت سفیان ثوریؒ نے فرمایا جگاؤ مت اور سونے دو کہ اتنی ہی دیر اس سے آرام اور اس کے شر سے امن نصیب ہو۔ ہفتم مسلمان کی خیر خواہی نہ کرنا کہ کسی بات کو ان کے لئے مضر پائے اور اس سے بچنے کی ان کو نصیحت نہ کرے یا کوئی چیز ان کے لئے مفید سمجھے اور اس کے حاصل کرنے کی ان کو ترغیب نہ دے ہشتم۔ اللہ کی عبادت کے مقابلہ پر دنیا کی طلب میں محنت و مشقت کو لذیذ سمجھنا جس کو اپنے نفس میں یہ اثر محسوس ہو کہ عبادت گراں گزرتی ہے اور دنیا طلب میں مرنا کھنا شیریں معلوم ہوتا ہے۔ اس کو سمجھ لینا چاہیے کہ اسباب انقطاع میں ضرور کسی سبب کا ارتکاب ہوا ہے۔ (جس کا یہ اثر ہے) نہم دنیا کی تلاش ایسے ذریعہ سے جو دنیا سے بھی زیادہ ذلیل و حقیر اور دنی ہو مثلاً بھوٹا، مکر، چالبازی، بددیبانی اور چھوٹی قسموں کے ذریعہ دنیا کماتا تھا کہ یہ سب معاصی ہیں اور دنیا سے بھی زیادہ حقیر و خسیس ہیں۔ ورنہ سلف صالحین نے دنیا کمائی ہے دنیا سے زیادہ مغرر و محترم ذریعہ سے مثلاً جہاد و تجارت اور زراعت وغیرہ اسباب حلال سے پس جس کی



یہ حالت ہو کہ دنیا کمار ہے ذلیل ترین اسباب یعنی حرام طریقہ سے اس کو اللہ سے توبہ کرنی چاہیے۔

دہم یہ کہ بندہ کے اعمال اور طاعات اللہ کریم کی ذات اور ہستی قدیم کی خاطر نہ ہوں۔ بلکہ تحصیل اغراض اور فانی نفع کی نیت سے ہوں کہ ان کی وجہ سے اللہ مجھ پر رحم فرمائے گا اور ہر قسم کی نعمتیں بخشے گا اور یہ سبب انقطاع عموم لئے ہوئے اور اکثر لوگوں میں موجود ہے **الآ مَا شَاءَ اللہ**۔ بات یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ شاد، حنیت اور دوزخ کو پیدا فرماتا تب پتہ چلتا کہ کون اللہ کی عبادت کرتا ہے اور کون اس کی عبادت نہیں کرتا۔

اس وقت جو اس کی عبادت کرتا وہ خالص وجہ اللہ ہوتی اور اس وقت عبادت کرنے والے کو اللہ تعالیٰ کی معرفت بھی بطریق کامل نصیب ہوتی مگر جب لوگوں نے جنت اور دوزخ کا تذکرہ سنا تو ان کی اغراض ان دونوں

کی جانب منقسم و متفرق ہو گئیں اور (افلاص کے) راستے سے بھٹک گئے۔ یازدہم جو جگہ عند اللہ محترم ہو مثلاً مساجد وغیرہ میں معصیت کا ارتکاب کیونکہ اگر بندہ کو متحقق ہوتا کہ اس جگہ کا انتساب

اللہ کی طرف ہے اور اس کا دل اندر سے پکارتا کہ یہ خانہ خدا ہے تو اس میں معصیت کا صدور کبھی نہیں

ہوتا۔ دوازدہم۔ ا غلام اور اس کے مفاسد کا تذکرہ انشاء اللہ عنقریب آئے گا۔ سیزدہم۔ مرد کا اپنی عورت

کو بغیر خطا کے مارنا۔ کہ عورت کے مرد پر حقوق ہیں اور بے قصور اس کو مارنے میں ان کا اتلاف ہے جو

سبب انقطاع ہے۔ چار دہم اہل و عیال پر نفقہ کا احسان جتنا اور کہنا کہ دیکھو میں نے تم پر اتنا خرچ کیا۔

پنجدہم حد کرنا اور اس کے مفاسد بھی عنقریب مذکور ہوں گے۔ شش دہم معصیت کو سمجھتے ہوئے اس پر

پیش قدمی کرنا اور اس کی شرح بھی آگے آئے گی ہفت دہم حرام کمائی سے دنیا جمع کرنا۔ ہش دہم ماں باپ

کی نافرمانی چنانچہ میں ایک دن اپنے شیخ حضرت عمر بن محمد ہواری کے پاس روضہ علی بن حزم کے باہر سری

کے درخت کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ان کا لڑکا جو والدین کا نافرمان تھا حج کے لئے جانے کا ارادہ کر کے باپ

سے رخصت ہو نیکو آیا۔ حضرت عمر بن محمد نے اس کو جانے سے منع کیا۔ مگر وہ نہ مانا اور والد کو ناراض کر کے

رواد ہو گیا۔ اس وقت حضرت شیخ نے مجھ سے فرمایا کہ حقوق والدین کا انجام چار باتیں ہیں۔ ایک یہ کہ دنیا

اس سے جاتی رہتی اور اس کو ایسا بُرا سمجھتی ہے جیسے مومن دوزخ کو بُرا سمجھتا ہے لہذا دنیا میں تنگدست

اور پریشان حال رہتا ہے، دوم یہ کہ جب وہ کسی جگہ بیٹھا اور حاضرین مجلس سے کسی بارہ میں گفتگو کرتا

ہے تو حق تعالیٰ ان کے قلوب کا رُخ اس کی گفتگو سننے سے پھیر دیتا ہے اور اس کی گفتگو سے نور و

برکت نکال لیتا ہے کہ بجائے اس کی تقریر کا اثر ہونے کے، وہ ان کی نظروں میں مبغوض بن جاتا ہے

سوم یہ کہ صاحبان خدمت اہل دیوان اولیاء اللہ اس کو نگاہ شفقت نہیں دیکھتے اور ان کو اس پر کبھی ترس نہیں آتا۔

چہارم یہ کہ اس کا نور ایمان آہستہ آہستہ ہر وقت کم ہوتا رہتا ہے۔ پھر کوئی بد نصیب تو اسی تنزل میں



رہتا ہے حتیٰ کہ ایمان اس کا مفصل اور فنا ہو جاتا ہے اور کافر ہو کر مرتا ہے۔ اور کوئی ناقص الایمان بنا ہوا دنیا سے اٹھ جاتا ہے اور والدین کو راضی و خوش رکھنے کا نتیجہ ان چاروں باتوں کی ضد ہوا کرتا ہے یعنی دنیا اس کو محبوب سمجھتی ہے جیسے مومن جنت کو محبوب سمجھتا ہے اور اس کی گفتگو لوگوں کو شیریں معلوم ہوتی (اور سامعین کے دلوں میں اثر کرتی ہے) اور اولیاء اللہ کی اس پر شفقت ہوتی ہے اور اس کا ایمان ہر ساعت بڑھتا اور ترقی پذیر رہتا ہے۔ غور کرو چاروں مفاسد پر جو حقوق والدین میں ہیں اور چاروں محاسن پر جو خوشنودی والدین میں ہیں نہدیم<sup>۱۲</sup> اہل حجاب کی صحبت اور ان سے خلا ملا مثلاً امیروں اور رئیسوں کے ساتھ اختلاط کہ بندہ مومن میں نور کا ایک ڈورا ہوتا ہے جو اس کی ذات کے سوراخ سے نکلتا اور عطیہ حق سجادہ سے جا کر ملتا ہے وہ اولیاء کی صحبت سے بڑھا کرتا ہے اور اس سے محروم رہنے پر کم ہوتا رہتا ہے حتیٰ کہ بالکل منقطع ہو جانے کا خطرہ ہے اور صاحبان ریاست کی مخالفت سے نور کا سوراخ بند ہو جانے کا اندیشہ ہے کیونکہ وہ اپنی ریاست اور مال و جاہ کی وجہ سے اس کی ذات پر غلبہ پاتے رہتے ہیں اور یہ گویا ان کی قید و قبضہ میں آجاتا ہے ہر وقت اپنے قلب اور بدن سے ان کی طرف جھکتا رہتا ہے اور حیب مدت دراز اسی حالت پر گزر جاتی ہے تو حق تعالیٰ کا خیال و خطرہ بھی اس کے فکر و خیال میں کبھی نہیں آتا۔ اور پھر اپنی اغراض اور اسی انقطاع کی ڈھیل میں پڑے پڑے نور کا سوراخ بالکل بند ہو جاتا ہے اور یہ ساری آفت صاحبان ریاست کے ساتھ خلا ملا کی بدولت پہنچی۔

لشتم خلفاء اربعہ یعنی حضرت ابوبکر و عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم میں تفریق کروافض اور خوارج کی طرح کسی سے محبت رکھے اور کسی سے بغض اور یہ تفریق سبب انقطاع اس وجہ سے ہے کہ ان میں ہر ایک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائل میں سے کسی ایک خصلت کا وارث ہوا ہے۔ اور اس لئے اس خلیفہ کے ساتھ بغض رکھنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بغض رکھنا ہے اور یہ حق تعالیٰ سے انقطاع کا سبب ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ وہ خصلت کونسی ہے جس کے وارث حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہوئے؟ فرمایا ایمان باللہ کی خصلت۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مطہرہ میں تو ایمان باللہ عزوجل اس خاص کیفیت پر تھا کہ اگر اس کو نامی اہل زمین پر خواہ صحابہ ہوں یا غیر صحابہ ڈال دیا جائے تو سب (رانگ کی طرح) پگھل جائیں۔ اور حضرت ابوبکرؓ کو ان کی طاقت کے موافق اس کیفیت خاصہ کا وہ قلیل حصہ ملا جس کو وہ برداشت کر سکے۔ مگر باوجود اس کے امت محمدیہ میں کوئی بھی نہ تھا۔ جو اس خصلت کو اتنا برداشت کر لیتا جتنا سیدنا ابوبکرؓ نے برداشت کیا بلکہ آپ کے قریب قریب بھی کوئی نہیں پہنچا نہ صحابہؓ میں سے اور نہ اہل فتح کبیر اغواث و اقطاب میں سے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت



صلی اللہ علیہ وسلم اسرار الوہیت اور حقائق ربوبیت اور دقائق معرفت میں اس درجہ پر پہنچے ہوئے تھے کہ اس کی کیفیت بھی بیان نہیں ہو سکتی۔ اس کے جن سمندروں میں آپ غواصی فرمایا کرتے تھے اس کے متعلق آپ کی گفتگو حضرت ابو بکرؓ سے ہوا کرتی تھی۔ لہذا وہ اس بلند مرتبہ پر پہنچ گئے با ایں ہمہ آخری تین سالوں میں ان حقائق کے متعلق آپ نے ابو بکرؓ سے بھی گفتگو نہیں فرمائی۔ اس اندیشہ سے کہ مسیاد ابرداشت نہ کر سکیں اور پگھل نہ جائیں۔ اور وہ خصلت حب کی دراشت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ملی وہ مسلمانوں کی خیر خواہی و شفقت، اپنے نفس پر ان کو ترجیح دینا ان کے لشکر کا انصرام، اور افواج کی ترتیب اور وہ استطاعت ہیں جو عوام و خواص سبکی اصلاح و بہبود کا سبب تھے۔ درحقیقت یہ خصلت منجملہ خصال محمدیہ کے ہے۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی طاقت و برداشت کے موافق اس کے وارث ہوئے۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جو خصلت ملی وہ رافت و شفقت اور صلہ رحمی حسن سلوک کی خصلت ہے کہ حقیقتہً وہ خصال محمدیہ میں سے ہے مگر حضرت عثمانؓ اپنی طاقت اور برداشت کے موافق اس کے وارث ہوئے۔ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو جو خصلت ملی وہ خصلت شجاعت ہے کہ درحقیقت وہ خصال محمدیہ میں سے ہے۔ مگر حضرت علیؓ اپنی طاقت کے موافق اس کے وارث ہوئے نیز آپؐ فرمایا کہ اسی طرح تمامی صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ہر صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی نہ کسی شئی کا وارث ضرور ہوا ہے لہذا کوئی صحابی کیوں نہ ہو اس کے ساتھ بغض رکھنا موجب انقطاع عن اللہ ہے۔

اس کے بعد مجلس برقا ست ہو گئی اور میں حضرت مدوح سے پوری تعداد موجب انقطاع کی نہ سن سکا حتیٰ کہ آپ کی وفات ہو گئی۔ ہاں البتہ ایک مرتبہ آپؐ نے وہ امور بیان فرمائے جن سے ایمان میں ترقی ہوتی ہے چنانچہ فرمایا ان میں سے ایک زیارۃ القبور ہے کہ گور غریباں میں جا کر شکستہ قبروں کو دیکھا کرے تاکہ موت یاد آکر دنیا سے دل افسردہ ہو اور ایک خالص اللہ واسطہ خیرات دینا ہے اور ایک جھوٹی قسمیں کھانے سے پرہیز کرنا ہے اور ایک نامحرم عورتوں پر نظر ڈالنے سے بچنا اور نگاہ جھکائے رکھنا ہے اور ایک لوگوں کے گناہوں سے تغافل ہے کہ جو شخص مخلوق کی معصیتوں کی گریہ اور چھان بین کے پیچھے پڑتا ہے حق تعالیٰ اس کو ان معصیتوں میں یہ وسوسہ ڈال کر مبتلا فرماتا ہے کہ دیکھا اس کو تو باوجودیکہ معصیت میں مبتلا ہے اللہ نے کیا نعمتیں دے رکھی ہیں اور تجھے باوجودیکہ طاعت میں مشغول ہے ان سے محروم کر رکھا ہے یہ تو حکمت کا مقتضا نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور ایک علماء کی تعظیم و احترام ہے کہ یہ حضرات حاملین شریعت میں لہذا ان کی تعظیم کرنے سے ایمان میں زیادتی ہوتی ہے حق تعالیٰ ہیں توفیق بخشے کہ ہم ان کا مرتبہ پہچانیں اور قدر شناس بنیں نیز آپؐ نے فرمایا اگر لوگوں کو



معلوم ہو جائے کہ علماء کی اللہ کے نزدیک کیا قدر و منزلت ہے تو ان کو کبھی زمین پر نہ چلنے دیں۔ بلکہ اپنے اپنے علاقہ کے علماء کو نمبر وار اپنی گردنوں پر چڑھائے چڑھاتے پھریں۔

ایک مرتبہ حضرت محدوح نے فرمایا کہ اغلام کے حرام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مرد کے نطفہ کے ساتھ چند فرشتے گرا کرتے ہیں۔ پس اگر وہ نطفہ مقعد میں گرا جو کہ محل ولادت نہیں ہے تو وہ فرشتے سب مر جاتے ہیں۔ اور ایک مرتبہ فرمایا کہ وہ ملائکہ گویا کبوتر کے بچوں کی طرح (نازک بدن) ہوتے ہیں۔ اگر کوئی بچہ اونچے گھونسلہ سے گر کر کسی پتھر پر آکر پڑے تو کیا اس میں کچھ باقی رہ جائے گا؟ البتہ جس وقت نطفہ فرج میں گرتا ہے جو کہ محل ولادت ہے تو نطفہ کے ساتھ دو گروہ فرشتوں کے باقی رہتے ہیں ایک گروہ نطفہ پدری کے ملائکہ کا اور ایک گروہ نطفہ مادری کے ملائکہ کا۔ اور ان سب کی تعداد تین سو چھیاسٹھ ہوتی ہے۔ دونوں نصف نصف۔ البتہ مرد میں دس زائد ہوتے ہیں۔ اس فوقیت کے سبب کہ حضرت آدم اصل میں حضرت حوا کے لئے۔ پھر اگر حق تعالیٰ نے پیدائش مقدر فرمائی ہے تب تو نطفہ ترقی پا کر علقہ اور مضغہ وغیرہ بنتا اور تدریجاً وہ مراتب طے کرتا ہے جو جنین مادر پر طاری ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح نطفہ کے نشوونما کے ساتھ ملائکہ بھی نشوونما پاتے رہتے ہیں حتیٰ کہ جب بچہ بطن مادر سے نکل کر دنیا میں آتا ہے تو وہ فرشتے بھی اس کے ساتھ باہر آتے ہیں اور وہی اس کی ذات کے محافظ اور نگہبان قرار پاتے ہیں۔ ان کا سردار وہ فرشتہ ہے جو داہنے شانہ پر تعینات ہوتا ہے پس جس طرح بچہ کا نشوونما اور باپ کے درمیان ہوتا ہے اسی طرح ان تین سو چھیاسٹھ فرشتوں کا نشوونما ملائکہ ذات پدر اور ملائکہ ذات مادر کے درمیان ہوتا ہے اور اگر بچہ کی ولادت اس نطفہ سے مقدر نہیں ہوتی تو گروہ ملائکہ نطفہ کے ساتھ رحم مادر میں جاتے اور وہاں پہنچ کر مر جاتے ہیں مگر اس کا بار بوجھ بندہ پر کچھ نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس میں اس کے کسب و فعل کا کوئی دخل نہیں البتہ نطفہ سے بچہ پیدا فرماتا اللہ پاک کا فعل ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے چراغ میں مقدار سے زیادہ تیل بھرا ہوا ہو تو بجتی ہے اس کے قطرے ٹپکتے ہیں، گرتے وقت تو روشن اور چمکتے ہوئے ہوتے ہیں مگر زمین پر پہنچنے سے پہلے ہی بجھ جاتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ رحم مادر سے متنی نکالنے کا سبب بنتا جائز نہیں۔ کیونکہ ہمیں معلوم نہیں اس نطفہ سے بچہ پیدا ہونا مقدر ہوا ہے یا نہیں ہوا۔ لہذا (قصداً منی کا یا ہر کر کرنا گویا) گروہ ملائکہ کا ہلاک کرنا ہے اور زنا جس مفسدہ کی وجہ سے حرام ہوا ہے وہ ملائکہ کی حیثیت سے نہیں ہے کہ بچہ کی پیدائش تو اس میں بھی ہوتی ہے، بلکہ اس کی تحریم قطع نسب کی وجہ سے ہے کہ ولد الزنا مجہول النسب ہوا کرتا ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ قیامت کے دن ان لوگوں کو نسب کی وجہ سے رکھ یہ فلاں کا بیٹا ہے



اور فلاں پوتا ہے) نفع عظیم پہنچے گا۔ اور دعویٰ نسب بغیر گواہی کے مقبول نہ ہوگا۔ اور اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا ہے نکاح میں دو گواہ بنانے کا اور اس کے اعلان و اشاعت کا چونکہ زنا میں یہ نہیں ہوتا بلکہ وہ چھپا کر ہوتا ہے کیونکہ اگر زانی اپنے زنا کا اعلان کرے تو اس پر حد زنا قائم کر دی جائے۔ لہذا وہ نسب کو قطع اور مخلوط و مشتبہ کرنے کی سعی کر رہا ہے اور ولد الزنا کو نسب کے نفع سے محروم بنا رہا ہے لہذا حرام کر دیا گیا۔ فے: کلام اللہ میں ارشاد ہے قَدْ اِذَا نَفَخَ فِي الصُّوْرِ فَلَا اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ کہ جب صور پھونکا جائے گا تو باہمی نسب کا کوئی تعلق نہ رہے گا۔ نیز احادیث میں آیا ہے کہ کسی کا نسب کسی کو جنت میں نہ لے جائے گا۔ باپ ہو یا بیٹا ہر ایک کا کرنا اور ہر ایک کا بھرتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نسب سے آخرت میں کوئی نفع نہیں اور شیخ کی تقریر و نیز زنا کی حرمت کا راز نسب کا نفع ہوتا تیار رہا ہے۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ ایمان و کفر کے اختلاف میں تو بیشک نسب کا نہ کوئی اعتبار ہے نہ نفع۔ نبی کا باپ اگر کافر ہے تو جہنمی ہے اور بیٹے کا نبی ہونا اس کو کچھ بھی نفع نہ دے گا۔ اور ممکن ہے کہ موجب سزا و جہنم معصیتوں میں بھی نسب سے زیادہ نفع نہ پہنچے اور جو گناہ کبیرہ کا ترک ہو وہ جہنم کی سزا بھگتے گا۔ خواہ کسی ضعیفی کا باپ ہو یا بیٹا۔ مگر اس کے علاوہ صورتوں میں نسب کے ذریعہ ایک کو دوسرے سے بہت زیادہ نفع ہوگا چنانچہ وَالْحَقُّا بِيَهُمْ ذِيَّ تَتِيَهُمْ کا اشارہ اسی طرف ہے۔ اور معصوم بچہ کا ذخیرہ آخرت و فرط ہونا اور باپ کو بشرطیکہ اُس نے اس کے مرنے پر صبر جمیل کیا ہو ساتھ لئے بغیر جنت میں نہ جانا، اور علماء و حفاظ و دیگر صالحین کا اپنے متعلقین و اعزہ کی شفاعت کرنا اور اس کا قبول کیا جانا وغیرہ وغیرہ یہ سب مضامین تیار رہے ہیں کہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے بوجہ تعلق نسب و رشتہ داری بہت کچھ نفع پہنچے گا۔ بلکہ عجب نہیں موجب جہنم کبیرہ معصیتوں پر بھی شفاعتوں کا اثر پڑے اور مغفور و ناجی ہونے پر چھوٹے درجہ والے کا نسب رشتہ دار بلکہ صہری تعلق کی وجہ سے بھی بڑے درجہ میں پہنچ جانا تو بکثرت وقوع میں آئے گا۔ چنانچہ حضرات انبیاء کے متعلقین و اعزہ کا ان کے پاس رہنا اسی بنا پر ہوگا کہ تعلق نسب و مصاہرت کی وجہ سے چھوٹے درجہ والے صالحین بڑے اور اونچی درجہ میں پہنچ گئے۔ بلکہ دنیا کی بیویوں کے جنت میں ملنے کا یہی مفہوم ہے کہ زوجین کے اعمال اگرچہ متفاوت ہوں گے مگر ایک کی وجہ سے دوسرے کو تعلق و رحمت کے سبب ترقی دی جائے گی جب معدن نسب کا یہ حال کہ تو اصل نسب کے نفع کا کیا پوچھنا۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایمان محفوظ و سالم ہوتے ہوئے نسب کا نفع عظیم ہے اور ایمان ہی کے اگر لاپے پڑ جائیں تو جس طرح کافر کے اعمال صالحہ بے کار و بسیو و ہیں اسی طرح اس کا کسی صالح کے ساتھ ہم نسب ہونا بھی غیر مفید و بے نفع ہے واللہ اعلم۔



ایک مرتبہ حضرت نے فرمایا جانتے بھی ہو کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب کس کو دیا جائے گا؟  
 میں نے عرض کیا حضرت ہی بیان فرمادیں۔ فرمایا کہ وہ شخص جسے حق تعالیٰ نے جہنم کا مل اور اعضاء صحیح عطا  
 فرمائے، عقل کامل بخشی، صحت تامہ نصیب فرمائی، ہر قسم کا عیش اور رزق کے اسباب مہیا فرمائے اور اس پر  
 ایک دن و دو دن یا زیادہ اس حالت پر گزرے کہ اس کو اپنے رب کا خیال بھی کبھی نہ آیا اور جب کسی گناہ پر  
 قدرت پائی تو سارے بدن اور ساری عقل سے اس پر ٹوٹ پڑا اور اس کے مزے لینے لگا کہ پروردگار کی طرف  
 سے ذرہ برابر فکر بھی لاحق نہ ہوا جو اسے پریشان کر دیتا یا معصیت کی حلاوت میں کمی لے آتا۔ چونکہ اس  
 شخص کو معصیت کے ساتھ کمال درجہ کا اتصال اور رب سے پورا انقطاع ہو چکا ہے کہ کلی درجہ میں  
 جہد و قلباً معصیت کی طرف مائل اور اس کو نہایت درجہ شیریں پارہا ہے لہذا قیامت کے دن اس کی  
 سزا بھی یہی ہوگی کہ تمام اجزاء عذاب میں ڈال دیا جائے گا اور سارے کو یکدم آگ میں جھونک دیا جائے گا  
 اور عذاب میں اس کو وہ مزہ آئے گا جو کھجلی کے مریض کو کھجانے میں آتا ہے اور جتنا کھجائے گا اسی قدر  
 رکھجلی کا، وبال بڑھے گا۔ پس ارتکاب معصیت کی حالت بڑی قابل لحاظ ہے۔ مومن کو چاہیے اگر معصیت  
 بھی کرے تو اس کا علم ضرور قائم رکھے کہ کوئی اس کا پروردگار بھی ہے جس کو اس پر ہر طرح کی قدرت  
 ہے۔ تاکہ اللہ کا خوف اور ڈر پیدا ہو اور عذاب اگر بالکل معاف نہ ہو تو کم از کم اس کا جوش مزدہکا  
 ہو جائے۔ ایک مرتبہ میرے شیخ حضرت عمر بن محمد ہواری نے ایک قصہ نقل فرمایا کہ ایک شخص جو  
 گناہوں کا مزکب ہوتا رہتا تھا میرے شیخ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ حضرت مجھ سے معصیتیں چھوٹی  
 نہیں اور میں ان میں ہمیشہ مستل رہتا ہوں، اس کی کیا تدبیر کروں۔ شیخ نے فرمایا وائے انوس  
 کہ اپنے رب کی معصیت کرتے ہو۔ اس کو چھوڑ دو اور اب کبھی نہ کرنا۔ کہنے لگا کہ میں چھوڑنے پر قادر  
 نہیں۔ شیخ نے پھر یہی فرمایا وائے تجھ پر، اللہ سے توبہ کر، اس نے پھر یہی کہا کہ کیا کروں اس کا چھوڑنا  
 میرے بس کی بات نہیں اس پر حضرت نے تغافل برتا اور وہ شخص دو ایک دن حضرت کے پاس ٹھہرا۔ جب  
 رخصت ہونے لگا تو پھر اس نے کہا اے میرے سردار بچنے کی کیا صورت کروں؟ شیخ نے فرمایا اچھا جب اپنے  
 رب کی معصیت کا ارادہ کیا کرو تو تین باتوں کا دل میں تصور باندھا کرو۔ اول اس معصیت اور اس کی بُرائی  
 کا (کہ بڑی قبیح اور عیب کی بات ہے) دوم اس کے انجام یعنی رب کے غضب کا (کہ اس پر خدا کا غضب  
 مرتب ہوگا) سوئم اپنی ذات اور نفس کی خست و دناوت کا اور رب کی سطوت و قہر و قدرت کا۔  
 (کہ ایک ذلیل مخلوق ہو کر اللہ قدرت والے سے منہ پھیر رہا ہوں) پھر اس کا کہ باوجود قدرت کے کہ جب  
 چاہے پکڑے اس کا عضو و کرم مجھ پر کتنا عظیم ہے کہ پردہ پوشی فرما رہا ہے ان تین باتوں کا۔



دھیان کر جیسا کہ ان کا حق ہے اور پھر جو دل چاہے کیجو چنانچہ وہ شخص چلا گیا۔ ایک مدت کے بعد وہ مجھے ملا اور اس نے سلام کیا۔ اور کہا کہ شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں نے کہا ہاں فرمائیے آپ کون صاحب ہیں؟ کہنے لگا میں وہی مرتکب معاصی ہوں۔ حضرت شیخ کی برکت سے حق تعالیٰ نے میری دستگیری فرمائی اور جب میں نے معصیت کا ارادہ کیا اور حضرت کی نصیحت کے موافق ان تین باتوں کا تصور کیا تو معصیت پر قادر نہ ہو سکا اور یہی میری توبہ کا سبب بن گیا۔ نیز آپ نے فرمایا کہ میرے نزدیک کبیرہ گناہ وہ ہے جو بحالت انقطاع کیا جائے کہ قلب اس کے ارتکاب کے وقت اللہ اور اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور قیامت کے دن سے بے تعلق ہو۔ اگرچہ اس کے ظاہر کو ان سے تعلق ہو کہ اس (ظاہری تعلق) سے کوئی نفع نہیں پہنچتا۔ اور اس حالت کی معصیت کو کبیرہ اس لئے کہا گیا کہ بے تعلق کی حالت میں بندہ جب معصیت میں پڑے گا تو بدن سے بھی پڑے گا اور دل سے بھی، ہاتھوں سے بھی اور پاؤں سے بھی، محبت سے اور شوق سے اور اپنی تمامی ذات سے۔ لہذا نہ کوئی رکعے والا ہوگا جو دھکائے اور معصیت سے روکے، اور نہ کوئی ناصح و مدبّر ہوگا کہ رب کی یاد دلائے۔ اور صغیرہ گناہ وہ ہے جو ایسی حالت میں صادر ہو جبکہ اپنے رب سے وابستہ ہو اور اس کے رسل و ملائکہ یعنی ان وسائل سے متعلق ہو جو رب تک پہنچانے والے ہیں کہ ایسی حالت میں جب بندہ معصیت میں پڑے گا تو نیت کے بغیر اور معصیت سے ایک قسم کا بغض لٹے ہوئے پڑے گا۔ کیونکہ قلب میں زاجر موجود ہوگا جو معصیت سے جھڑکے گا۔ اور اس لئے عین ارتکاب معصیت کے وقت بھی اپنے رب کی شرم و حیا اس میں موجود ہوگی۔ میں نے عرض کیا کہ اس فرق پر تو یہ اشکال وارد ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند گناہ کبیرہ گنوائے ہیں۔ ان میں انقطاع کی قید نہیں لگائی۔ چنانچہ بخاری و مسلم میں ایک حدیث ہے کہ کبیرہ گناہ یہ ہیں شرک باللہ، سحر، نافرمانی والدین، قتل نفس اور بخاری میں اضافہ ہے جموٹی قسم کا اور ایک حدیث میں آیا ہے بچو سات تباہ کن گناہوں سے شرک باللہ، سحر، ناحق کسی کا قتل، یتیم کا مال کھانا، سود خوردگی، جہاد سے بھاگنا۔ اور بے خبر پاک دامن مسلمان عورتوں پر زنا کی تہمت لگانا۔ حضرت محدوح نے فرمایا یہ سارے گناہ (جن کو کہا کر کہا گیا ہے) بندہ سے صادر ہی نہیں ہوتے جب تک وہ اپنے رب سے منقطع نہ ہو جائے۔ اگر اس کے قلب کو رب کے ساتھ کچھ بھی لگاؤ رہے گا تو نہ شرک صادر ہوگا، نہ سحر کر سکے گا نہ کسی کو ناحق مار سکے گا نہ یتیم کا مال یا سود کھا سکے گا نہ جہاد سے پشت پھیر سکے گا نہ زنا کی تہمت لگا سکے گا نہ عقوق والدین کر سکے گا نہ جموٹی قسم کھا سکے گا۔ اس کے بعد فرمایا کیا فلاں شخص کو نہیں دیکھتے کہ عنقریب ولی بننے والا ہے حالانکہ اس وقت اس پر حجاب پڑا ہوا ہے مگر اس کا قلب اللہ سے تعلق رکھے ہوئے ہے آخر کیا وجہ ہے کہ ربا و جود قدرت کے



مذکورہ معصیتوں میں مبتلا نہیں ہو سکتا اور ان سے ایسا ڈرتا ہے جیسے کوئی آگ سے ڈرتا ہے۔ اور دیکھو فلاں شخص کو کہ (صورۃ کیسا ہی ذاکر شغل بنا ہوا ہے مگر) فتح نصیب نہیں ہوئی کیونکہ اس کا قلب اللہ سے بے تعلق ہے۔ اور محض ربانی ذکر اللہ کچھ نفع نہیں دیتا۔ پھر دیکھو لو کیسے گندے افعال کا مرتکب ہو رہا ہے۔ غرض بے تعلق کی معصیتیں بھی چھپتی نہیں اور با تعلق کی معصیتیں بھی چھپتی نہیں۔ (انداز و قرآن) بالخصوص نتیجہ و ثمرہ سے کھل جاتا ہے کہ یہ گناہ قطع تعلق عن اللہ پر صادر ہوا ہے اور یہ گناہ تعلق مع اللہ قائم رہتے ہوئے صادر ہوا ہے۔

نیز آپ نے فرمایا کہ حصول معاش کے جتنے بھی وسائل ہیں مثلاً تجارت زراعت ملازمت وغیرہ ان کی مثال ایسی ہے جیسے نفروں کے ہاتھ میں کشکول رکھ بیٹھ مانگتے وقت اس کو سامنے کر دیتے ہیں۔ دینے والا روٹی، پیسہ جو بھی دیتا ہوتا ہے اس میں ڈال دیتا ہے، چونکہ حق تعالیٰ کی عادت اسی طرح جاری ہے کہ بلا کسی کو رزق عطا نہیں فرماتا بلکہ اس وقت دیتا ہے جب بندہ اسباب رزق میں سے کسی سبب کا کشکول لے کر آوے پس جب اس کو سامنے کر کے روزی کا سوال کرتا ہے تو جو بھی اس کے لئے مناسب اور جتنا بھی اس کے لئے مصلحت سمجھتا ہے اس میں ڈال دیتا ہے لہذا سبب معاش اختیار کرنے والے پر ضروری ہے کہ وہ سبب کو اسی درجہ پر رکھے کہ سبب اختیار کرتے وقت اس کی نظر اپنے رب کی طرف ہو نہ کہ سبب کی طرف جیسا کہ بھکے منگے فقیروں کی نظر دینے والوں پر پڑا کرتی ہے نہ کہ اپنے کاسہ پر جسے ہاتھ میں لئے ہوئے ہے اور جب سبب اختیار کرتے وقت نظر اپنے رب کی طرف ہوگی تو سبب کی حالت میں بھی اس کا تعلق رب ہی کے ساتھ رہے گا اور سبب (یعنی تجارت و زراعت وغیرہ) اس کے اور رب کے درمیان وصلہ و ذریعہ بن جائے گا۔ لہذا سبب پر مجبور نہ کرے گا بلکہ رب پر مجبور کرے گا اور چونکہ اس کا مجبور رب ہوگا تو سبب معاش بھی وہی اختیار کرے گا جس کی بابت اس کے رب نے اجازت دی ہے (یعنی حلال و جائز صورت نہ کہ حرام یا مکروہ) اور اب اس کے نزدیک اسباب معاش کی تعلیل و تبحر میں بھی کوئی فرق نہ ہوگا کیونکہ دینے والا پرموہگار تو ایک ہی ہے اور وہ قادر ہے کہ ایک ہی سبب اختیار کرنے پر اتنا دید سے جو دوسروں کو متعدد اسباب اختیار کرنے پر دیتا ہے۔ لہذا ڈرنا چاہیے اور تحصیل معاش میں خوبی کو اختیار کرنا چاہیے (کہ جب دینے والا اللہ ہے تو مستحب و محبوب طریق معاش کیوں نہ اختیار کرے تاکہ دنیا بھی ملے اور دین بھی ملے) غرض اللہ سے تعلق والوں کے اسباب کی صورت تو یہ ہوتی ہے۔ اور جو اللہ سے بے تعلق ہوتے ہیں وہ سبب اختیار کرنے کی حالت میں محنت و خدمت کرتے کرتے مر کھتے ہیں۔ اور جو کوئی بھی ذریعہ معاش دیکھتے ہیں اس کو اختیار کر لیتے ہیں، خواہ حلال ہو یا حرام، اور اللہ نے اس کی اجازت دی ہو۔



یا نہ دی ہو۔ اور ان کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ جتنی کوشش اور تدبیر کریں گے اسی کے موافق رزق حاصل ہوگا۔ پس ان لوگوں کو دنیوی امور کی تدبیر اور طلب رزق میں (دن رات) تعجب اٹھانا اور محنت شاقہ کا برداشت کرنا اللہ سبحانہ کی طاعت اور عبادت سے زیادہ لذیذ اور شیریں معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ان کو اللہ سبحانہ سے قطعی بے تعلق ہو چکی ہے نیز ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسی ایک قوم کی۔

کمرؤں میں رسیاں باندھ دی جائیں اور ان کو بلند پہاڑوں کی چوٹیوں سے لٹکا دیا جائے کہ آسمان اور زمین کے مابین آدھرا اور ہوا میں معلق ہوں اور اس حالت پر زمانہ گزر رہا ہو۔ پس ان میں جو لوگ اہل فہم اور ذی عقل ہوں گے وہ تو بے قرار ہوں گے کہ کسی وقت ان کو سکون نہ ہوگا۔ سمجھی تو ان کی نظر اس جگہ پر جائے گی جہاں گرنے کی صورت میں آپڑنے کا اندیشہ ہے کہ دیکھیں گے وہ جگہ قریب ہے یا بعید۔ اور نرم ہے یا سخت اور اگر اس جگہ جا کرے تو کیا حالت ہوگی (سر پھٹے گا یا بچے گا اور مریں گے یا زندہ رہیں گے) غرض وہ وہ فکر لاحق ہوں گے جو کلیجہ شوق اور دل پارہ پارہ کر دیں گے اور کبھی نظر جائے گی اس شخص کی طرف جس کے ہاتھ میں وہ کٹی ہوئی رسی لٹکی ہوئے ہیں۔ کہ آیا وہ رسی کو اپنے ہاتھ سے چھوڑنے کا ارادہ کر چکا ہے یا ابھی کچھ دقت باقی ہے اور آیا ہمارے اور اس کے درمیان محبت و شفقت کا تعلق قائم ہے کہ چھوڑتے وقت ترس کھائے گا اور جہاں بھی گرائے گا نرمی و ملاحظت کے ساتھ گرائے گا، یا اس کے اور ہمارے درمیان نہ رشتہ محبت ہے نہ تعلق شفقت۔ اس لئے گراتے وقت پرواہ بھی نہ کرے گا کہ مریں یا جیئیں یا سسکیں، اگر ایسا ہے تو اس کی خوشنودی و طلب و رضا میں سعی کریں گے اور یہ کسی تدبیر سے تو ممکن نہیں۔ کیونکہ وہ رنبدھے ہلکے پڑے ہونے کے سبب خود کوئی کام بھی نہیں کر سکتے بجز اس کے کہ ان کے قلب میں شکستگی و انکسار ہو اور زبان پر خاشاۃ و عجزانہ کلمات، اور نگاہ چشم لپٹت اور ایسی جھکی ہوئی ہو جیسے خوف زدہ اور رنہم و کرم کے طالب و مستمنی کی نگاہ ہوا کرتی ہے۔ پھر اس کے بعد اس کو اختیار ہے کہ چاہے رحم فرمائے اور چاہے سزا دے۔ پس ان لوگوں کے قلوب اس کے خوف اور عذاب سے مضطرب اور گویا آگ میں تپ رہے ہوں گے۔ مگر ان لٹکے ہوئے لوگوں میں جن کو عقل نہ ہوگی وہ نہ تو اس جگہ پر نظر ڈالیں گے جہاں گرنے کا ہے اور نہ اس شخص پر نگاہ ڈالیں گے جس کے ہاتھ میں ان کی رسی ہے بلکہ ان پر نسیان کا غلبہ ہوگا اور وہ پس و پیش سب کچھ بھولے ہوئے ہوں گے، اور یوں سمجھیں گے کہ یہی ہماری قیام گاہ ہے لہذا اسباب اقامت میں مشغول ہو جائیں گے مکانات اور محل تعمیر کرنے لگیں گے اور زراعت و تجارت میں لگ جائیں گے۔ حالانکہ وہ ہوا میں معلق ہیں رجو نہ تعمیرات کی جگہ ہے نہ زراعت و تجارت کی، اور ان کو رسی کے معاملہ کا شعور و ادراک ہی نہیں جس وقت وہ رسی کٹ جائے گی اور جہاں گرنے کا ہے وہاں آپڑیں گے تب سمجھیں گے کہ بڑی



غلطی کھائی اور حد درجہ کوتاہی ہوئی کہ اس کا کبھی خیال بھی نہ لائے اور نہ اس کی اصلاح کا کوئی طریق اختیار کیا، حتیٰ کہ دعا و نزاری تک بھی نہ کی۔ نہ اس جگہ گرنے کی تیاری کی اور نہ اس کو پہچانا جس کے ہاتھ میں ہماری رسی تھی در نہ کم از کم اس کے سامنے گر گڑا تے اور اس سے بجات و سلامتی کی درخواست تو کرتے پس یہ ہے حالت اس کی جو اللہ سے غافل اور آخرت سے بے خبر ہے کہ رسی تو عمر ہے اور اس کا کٹنا موت ہے اور وہ جہاں گرتا ہے یا جنت ہے یا دوزخ، اور وہ ذات جس کے ہاتھ میں رسی ہے وہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہے پس جن کو معرفت نصیب ہے کہ عقل سلیم اس کی خادمہ ہے وہ تو ہر وقت ان دونوں باتوں کے غور میں رہتا ہے۔ لہذا حق تعالیٰ اس کو بروز قیامت اس کے بدلہ ہر قسم کی راحت نصیب فرمائے گا کہ لَا كُوفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ان ہی کے بارے میں ہے، اور جو لوگ غافل ہیں ان کا حال اس کے برعکس ہوگا۔ نیز آپ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے پیغمبروں کو بھیجا اور ان کو طاعت کا حکم فرمایا ہے۔ صرف ایک بات کی خاطر۔ وہ یہ کہ اللہ کو پہچانیں اور اس کو لیگانہ سمجھیں اور اس کے ساتھ کسی شے کو شریک قرار نہ دیں۔ پس جب بندہ سے یہ مقصود حاصل ہو گیا تو وہ محبوب و عزیز بن گیا اور طاعت صرف وہ دروازہ کھولنے کے لئے ہے جس سے نور حق مریطع کی ذات پر داخل ہو اور معاصی کی ممانعت کا حاصل صرف ان دروازوں کا بند کرنا ہے جن سے عاصی کی ذات پر باطل کی ظلمتیں داخل ہوا کرتی ہیں تو جس شخص نے طاعتوں پر عمل کیا اور مخالفتوں سے بچتا رہا اس نے اپنی ذات پر نور حق کے دروازے بند کر دیئے۔ اور جس نے طاعت بھی کی اور معصیت کا بھی مرتکب ہوا اس نے اپنے اوپر ایک ساتھ دونوں دروازے کھول لئے۔ لہذا بندہ کو اس سے قبل کہ پشیمان ہو اور پشیمانی نفع نہ دے دیکھ لینا چاہیے کہ وہ کس درجہ میں ہے اور کونسا دروازہ اپنے اوپر کھول رکھا ہے لیکن اکثر آدمیوں کا خیال یہ ہے کہ ظاہری عمل طاعت کافی ہے دروازہ نور کھولنے کے لئے اور ظاہری ارتکاب معصیت کافی ہے دروازہ ظلمت کھولنے کے لئے حالانکہ یہ غلط ہے۔ بلکہ ضروری ہے کہ ظاہر کو باطن سے موافقت بھی ہو۔ لہذا آدمیوں کی چار قسمیں بن گئیں۔ ایک قسم وہ جن کا ظاہر اور باطن دونوں اللہ کے ساتھ ہیں کہ ظاہر کے مع اللہ ہونے کا اثر ہے۔

تعمیل حکم اور عمل بر طاعت۔ اور باطن کا مع اللہ ہونا یہ ہے کہ طاعت کرتے وقت غفلت نہیں ہے۔ بلکہ شانِ حضور و مراقبہ اور توجہ الی اللہ و مشاہدہ نصیب ہے۔

یہ قسم تو وہ ہے جو عند اللہ محبوب ہے۔

دوسری قسم۔ وہ ہے جن کا ظاہر و باطن غیر اللہ کے ساتھ ہے کہ ظاہر



پڑا ہوا ہے معاصی میں اور باطن ڈوبا ہوا ہے غفلتوں میں۔ یہ وہ قسم ہے جو عند اللہ مذموم ہے۔  
 تیسری قسم وہ ہے جن کا ظاہر اللہ کے ساتھ ہے اور باطن غیر اللہ کے ساتھ کہ بدنِ طاعت میں  
 لگا ہوا ہے مگر دل غافل ہے اور اس کی وجہ کہ عبادت بھی اس کو اللہ کی طرفت واپس نہ لائے یہ ہے کہ عبادت  
 اس کے لئے منجملہ عادتوں کے ایک عادت بن گئی ہے اور اس لئے طبیعت اس سے مانوس ہو گئی ہے (جیسے  
 پان کھانے کی عادت کہ جب تک مل نہ جائے طبیعت بھٹکتی ہے) پس یہ شخص طاعت کرتا ہے بحکم طبیعت نہ کہ  
 بحکم شریعت اور کبھی اس کے ساتھ ایک مرض اور بھی شامل ہو جاتا ہے وہ یہ کہ عبادت اور زہد اور حسن سیرت  
 میں لوگوں کے اندر اس کی شہرت ہوتی ہے اور اس کو اندیشہ ہوتا ہے کہ عبادت میں کوتاہی کروں گا تو لوگوں  
 کی نظروں میں گر جاؤں گا چنانچہ تم اس کو دیکھو گے کہ رات دن عبادت میں لگا رہتا ہے۔ اس لالچ میں کہ لوگوں  
 کے نزدیک میرا مرتبہ بڑھ جائے پس اس کی عبادت میں حکم طبیعت کے ساتھ حکم دیا و حصول جاہ عند الناس  
 بھی ہے) یہ وہ حکم اور قسم ہے جس کی عبادت اللہ سے لے کر بڑھتی (اور دور کرتی چلی جاتی ہے)۔  
 ہاں کبھی حق تعالیٰ اس نوع کے کسی شخص کو اپنے اکابر اولیاء میں سے کسی کی صحبت نصیب  
 فرمادیتا ہے تو وہ اس کا مرض دیکھ لیتا ہے اور اس کا علاج کرنا چاہتا ہے تو اس کی ظاہری عبادتوں  
 میں سے جن کا وہ پابند تھا کسی عبادت کے چھوڑنے کا اس کو حکم دیتا ہے۔ پس اگر یہ مرض قوی و  
 مستحکم ہوتا ہے تو وہ کہنا نہیں مانتا اور ہلاک ہو جاتا ہے صاحب کتاب کہتے ہیں کہ حضرت ابو یزید بسطامی  
 کے ایک مرید کا قصہ ایسا ہی ہوا تھا کہ حضرت ممدوح نے اس کو نفل روزوں کے چھوڑ دینے کا حکم فرمایا  
 تو اس نے انکار کر دیا اور کہنا نہ مانا۔ اس کے پیر بھائی نے اس سے کہا کہ تجھ پر افسوس اپنے پیر کا بھی  
 کہنا نہیں مانتا۔ حضرت بسطامی نے فرمایا چھوڑو جو اللہ کی نظروں سے گر گیا اسے نصیحت سے  
 کیا فائدہ۔ چوتھی قسم وہ ہے جن کا ظاہر مخالفت میں ہے مگر باطن اللہ کے مراقبہ میں مغموم دیکھو گے کہ  
 (غلبہ النفس) معصیت کا ارتکاب کر رہا ہے مگر اس کا رب اس کی نظروں کے سامنے ہے اور اس کے  
 فکر و خیال سے اوچل نہیں ہوتا اور اس لئے یہ معصیت اس کو (بعد فراغ جبکہ غلبہ نفس ٹھنڈا پڑ جاتا ہے)  
 اتنی بڑی معلوم ہوتی ہے گویا سر پہ پاؤں گر پڑا۔ پس وہ ہر وقت محزون و غمگین رہتا ہے۔ اور یہ اس شخص  
 سے جس کا ظاہر مشغول بہ طاعت تھا مگر اس کا باطن مغفل تھا، بدرجہا افضل ہے کیونکہ بندہ سے اللہ کا مقصود  
 اس کا انکسار اور ذلت و عاجزی کے ساتھ اس کے حضور میں کھڑا ہونا ہے اور وہ اس کو حاصل ہے  
 اس کو حاصل نہیں۔

ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا کہ بعض دفعہ آدمی تڑپنے لگتا ہے اور اس کی چیخیں نکلتی گنتی ہیں اس کی حقیقت



کیا ہے۔ اور میں تو جب بھی ذکر یا عبادت میں مشغول ہوتا ہوں یہ حالت مجھ پر طاری ہو جاتی ہے مجھے اندیشہ ہے کہ شیطان کی طرف سے نہ ہو۔ کیونکہ جب دنیا کی طرف متوجہ ہوتا ہوں یا اس کے مشغلہ میں لگ جاتا ہوں تو یہ حالت نہیں ہوتی۔ حضرت نے فرمایا کہ کبھی روح اپنے نور کو ذات انسان پر بھپکایا کرتی ہے اور اس کی وجہ سے بدن ٹڑپنے لگتا ہے۔ پھر کبھی تو روح یہ نور بحالت طاعت ڈالتی ہے اور کبھی بحالت معصیت کہ انسان اپنے رب کی معصیت میں مشغول اور خواہش نفس پر جما ہوا ہوتا ہے اور دفعۃً روح اپنا نور اس کی ذات پر بھینکنے لگتی ہے جس کی وجہ سے ذات کو رجوع الی اللہ اور خشوع حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اگر طاعت کی حالت میں یہ کیفیت طاری ہو تو اس کو اپنی طاعت اور عبادت کی طرف منسوب نہ کرنا چاہیے ورنہ خود ستائی پیدا ہو جائے گی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اگر یہ اثر اس طاعت کا ہوتا تو دوسری حالت میں کبھی ظاہر نہ ہوتا۔ نیز آپ نے فرمایا کہ یہ نور جو ذات کو روح کی طرف سے حاصل ہوتا ہے بمنزلہ لگام کے ہے کیونکہ جب روح ذات کو دیکھتی ہے کہ راستہ سے مُڑ چلی اور اندیشہ کرتی ہے اس کی کجی اور بدراہی کا تو وہ نور ظاہر ہوتا ہے تاکہ اس کو کھینچ کر راستہ کی طرف لے آئے اور اہل خیر و صلاح میں سے بنائے رکھے کیونکہ ہدایت کے اسباب میں یہ بھی ایک سبب ہدایت ہے اور نا اہلوں کے لئے یہ نور روح خالص ظلمت بن جاتا ہے کہ راہِ حق سے باز رکھتا رہے اور یہ سمجھا کر کہ میری حالت مستحسن ہے اس پر جمادیتا اور اس کو پیغمبر کا حکم ماننے سے روک دیتا ہے غرض ہر ذات کے لئے ایک روشنی ہے اور وہ اپنی ہی روشنی میں چلے کرتی ہے۔ پس اگر اس کی روشنی صحیح راستہ دکھا رہی ہے تو توفیق الہی اس کے شامل حال ہے اور اگر اس کی روشنی اسے کج راستہ پر لے جا رہی ہے کہ اسی کا نام ہم نے ظلمت رکھا ہے تو اس کا ساتھ توفیق الہی تے چھوڑ دیا ہے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ روح میں تین سوچیاں سمٹے اسرار ہیں منجملہ ان کے ایک ستر ایسا ہے کہ اگر روح اس کو ذات پر ڈالے تو آدمی ہر وقت روتا رہے اور ایک ستر ایسا ہے کہ اس کو روح اگر ذات پر ڈالے تو مردم نہتا رہے اور ایک ستر ایسا ہے کہ روح اس کو اگر ذات پر ڈالے تو ہمہ وقت چیختا رہے مگر روح وہی اسرار ڈالتی ہے جو تقدیر میں پہلے سے تجویز ہو چکے ہیں۔ میں ایک دن حضرت ممدوح کے پاس ایک جگہ بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص آکر ہمارے پاس بیٹھ گیا۔ حضرت ممدوح کچھ تقریر فرما رہے تھے کہ وہ بڑے نور سے چیخنے لگا۔ اس کے بعد حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ یہ حالت بڑی چیز ہے (کہ رقت قلب اور توجہ الی اللہ ہے) بشرطیکہ شیطان اس کے ساتھ کیسلنے اور اس کی نماز کو ناسد نہ کرنے لگے۔ میں نے کہا حضرت یہ کیسے؟ فرمایا قلوب کا اللہ کی طرف رُخ ہونا قلب کی نماز ہے جیسا کہ بدن کا رکوع و سجدہ بدن کی نماز ہے۔ اور نماز و دیگر طاعات کا مشروع ہونا محض اس لئے ہے کہ بندہ کو



یہ توجہ قلب حاصل ہو جائے کیونکہ تمامی عبادتوں کا نتیجہ اور فائدہ جو بندہ کے نفع اور رحمت کا سبب ہے وہ یہی ہے۔ پس شیطان جب کسی شخص کو دیکھتا ہے کہ وہ ذکر اللہ یا دو غلط وغیرہ سن کر اس توجہ کو حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ اس حد و بغض کی بنا پر جو اس کو بنی آدم کے ساتھ مدت سے ہے اس کے قلب میں گھس کر اس توجہ کو فاسد کرنے لگتا ہے چنانچہ چھیننے والے پرکٹی مفاسد مرتب ہو جاتے ہیں۔ ایک تو یہی کہ وہ توجہ فاسد ہو گئی جو سبب نجات تھی۔ ایک یہ کہ وہ سمجھنے لگتا ہے میں کچھ ہو گیا۔ ایک یہ کہ خطرہ ہو گیا اللہ سے قطع تعلق کا کیونکہ اس چھیننے چلانے سے وہ سمجھا کہ مجھے بزرگی مل گئی۔ نیز عوام بھی اس کو بزرگ اور بڑا سمجھنے لگتے اور اس کی طرف انگلیاں اٹھانے لگتے ہیں کہ یہ ہیں وہ صاحب کمال جن کو وجد و حال آتا ہے اور اللہ کی محبت میں تر پتے اور سر پھوڑتے ہیں، اور جس کی طرف انگلیاں اٹھتی ہیں وہ تباہ ہو جاتا ہے (کیونکہ نفس پھولتا ہے، صاحب کتاب اس کی تائید میں ایک قصہ نقل کرتے ہیں جن کو شیخ زروق نے بیان فرمایا تھا کہ چند درویش تھے جن کی فاس میں ایک خانقاہ تھی ایک دن انہوں نے ایک صادق الحال بزرگ سے جو کہ نابینا تھے درخواست کی کہ ہمارے ساتھ چلیں۔ چنانچہ وہ ان کی قیام گاہ پر آئے۔ جب افراد اپنے ذکر میں مشغول ہو گئے تو دفعۃً نابینا بزرگ نے فرمایا صاحبو دیکھو تم پر شیطان ایک سینگوں والے مینڈھے کی صورت میں گھس آیا ہے۔ اس کے بعد پکارا ارے یہ لال گدڑی والا تم میں کون ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ شیطان اس کو بُری طرح سونگھ رہا ہے اس کے بعد غل مچایا ارے اس کے تو سینگ مار دیا تو اس کے پیٹ میں تو اس نے اپنے سینگ گھسادیے۔ یہ نابینا اپنے کلام سے نارغ نہ ہونے پائے تھے کہ لال گدڑی والا فیر چھینے لگا اور بدحواس ہو گیا جس کو اپنے خیال میں کمال اور وجد و حال سمجھا ہوا تھا، اس کے بعد نابینا بزرگ نے کہا اور وہ تم میں فلاں لباس پہنے ہوئے کون ہے؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ اب شیطان اس کی طرف آیا اور اس کو سونگھنے لگا۔ اس کے بعد شور مچایا اللہ کی قسم اس کے تو بُری طرح اس نے سینگ مارا چنانچہ وہ بھی چھین مارنے لگا اور بدحواس ہو گیا غرض اس صادق الحال کی معیت کے سبب سب سو ہوئے اس سے پہلے وہ سمجھ رہے تھے کہ ہم بڑے مرتبہ برہنہ گئے ہیں مگر ان کا یہ جہل مرکب تھا کہ شیطانی اثرات کو رحسانی برکات سمجھ لیاں ایک مرتبہ کسی عارف شیخ کے سامنے ایک شخص چھین مارنے لگا شیخ نے فرمایا میاں میں نے تمہاری چھین کا تعاقب کیا کہہ دیکھوں کہاں پہنچتی ہے، تو فلاں مقبرہ میں فلاں قبر پر جا پہنچا تب چھینے لگا اور کہا ہاں حضرت آپ نے سچ فرمایا میرا دھڑ کو گزر ہوا تو آپ صاحبوں پایا۔ کہ اپنے محبوب کو یاد کر رہے ہیں۔ لہذا مجھے بھی میری محبوبہ یاد آگئی جو کہ میری حجاز زاد بہن تھی اور انتقال کر چکی۔ وہ قبر رجاں تک آپ پہنچے، اسی کی ہے۔ بس اس کو یاد کر کے الم فراق کی وجہ سے میری چھینیں ٹکٹنے لگیں۔



رحمت نے فرمایا کہ تمباکو پینا حرام ہے کیونکہ ایک تو بدن کو مفرت پہناتا ہے دوسرے اس کی لبت ایسی  
 لگ جاتی ہے کہ اللہ کی عبادت سے غافل بنا دیتی اور قطع تعلق کر دیتی ہے اور ہمیں تو جب کسی چیز کے حلال  
 و حرام ہونے میں شک ہوتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں کوئی نص منقول نہیں  
 ملتی تو ہم اہل دیوان اہل اللہ کو دیکھتے ہیں جن کو اہل دائرہ کہا جاتا ہے۔ پس اگر ان کو اس کا استعمال  
 کرتے دیکھتے ہیں تو سمجھ لیتے ہیں کہ وہ حلال ہے اور اگر دیکھتے ہیں کہ وہ اس کا استعمال نہیں کرتے بلکہ  
 اس سے پرہیز کرتے ہیں تو سمجھ جاتے ہیں کہ وہ حرام ہے اور اگر بعض کو استعمال کرتے دیکھتے ہیں اور بعض  
 کو پرہیز کرتے تو پھر کثرت پر نظر ڈالتے ہیں کہ ان کا ان میں اکثر کا معمول کیا ہے، کیونکہ حق وہ ہے جس  
 پر اکثر ہوں۔ اور اہل دیوان میں اس دعوٰی کا استعمال بالکل نہیں ہے تیسری وجہ یہ ہے کہ اس کی  
 بد بو سے فرشتوں کو تکلیف ہوتی ہے اس کے بعد آپ نے ایک قصہ بیان فرمایا کہ ایک شہر تھا نہایت متعفن  
 کہ آدمیوں کے بھی فضلے اس میں بہت جمع تھے اور مولشیوں کے گوبر اور نجاستیں بھی زیادہ تھیں اور وہاں  
 پانی بہت کم تھا۔ اس لئے نجاستیں وصل بھی نہ سکیں، غرض ہوا میں اتنی بدبو پھیلی تھی کہ بیان نہیں  
 ہو سکتی۔ ایک دن آٹھ اہل تصرف اولیاء اللہ اس میں داخل ہوئے مگر جب وسط شہر میں پہنچے تو بڑی سرعت  
 کے ساتھ باہر نکلے اور اس سرعت کا سبب یہ ہوا کہ ان فرشتوں کو جو ان کی ذات پر تعینات تھے اس بدبو سے  
 نفرت و وحشت ہوئی اور اس وجہ سے ان اولیاء کو بھی نفرت و وحشت ہوئی کیونکہ ملائکہ کی وحشت و  
 علیحدگی سے جو خطرات ہیں ان کو وہی سمجھتا ہے جو صاحب بصیرت ہوتا ہے اس کی مثال ایسی ہے  
 جیسے کسی شخص کو ایسی جگہ لایا جائے جہاں دشمن اور چور جمع ہوں اور اس کے ہتھیار اس کے بدن سے  
 علیحدہ کر دیئے جائیں تو اب اس کو جان کا خطرہ کیونکر ہوگا؟ اب چیز کو نہی رہی جسے دشمن کا مقابلہ  
 کرے ورنہ اسی طرح ملائکہ کو یا اہل تصرف کے ہتھیار اور اعوان و انصار ہیں کہ ان کی وجہ سے شیطان پاس  
 آتا ہوا اُڑتا ہے۔ وہی گھبرا کر بھاگنے لگے اور جدا ہو گئے تو اب ہر قسم کا خطرہ ہو گیا۔ بودار چیزوں کے  
 استعمال سے شریعت نے اسی وجہ سے منع کیا ہے اور بلا ضرورت کتے کے پالنے یا گھر میں تصویر رکھنے  
 کی ممانعت ہے کہ اس گھر میں فرشتے داخل نہیں ہوتے اسی بنا پر ہے کہ نور ملائکہ سبب ہے ظلمت شیاطین کے  
 مٹانے کا پس جس جگہ فرشتوں کو نفرت و وحشت ہوگی وہاں شیاطین کا عمل دخل اور زور ہوگا۔ اور  
 جہاں شیاطین کا زور ہوگا ہر قسم کی ظلمت دیے برکتی چھائے گی اور طاعتوں سے دن بدن بے رغبتی  
 اور معاصی سے روز بروز رغبت بڑھے گی۔ ایک چیز صورتِ ہلکی اور معمولی ہوتی ہے مگر اثر اور نتیجہ کے  
 اعتبار سے بڑی خطرناک ہوتی ہے اسی قبیل سے کتا اور تصویر ہے کہ مسلمانوں نے بھی اس کو معمولی



سمجھ لیا۔ مگر اہل نور کا اس گھر سے بعد خروج اور اہل ظلمت کا اس سے قرب و دخول اگر دین سے متوحش اور معلوم رسالت سے متنفر بنا کر عیاذ باللہ کفر و انقطاع عن اللہ تک پہنچا دے تو بعید نہیں جبکہ شیطان کا قصہ مشہور ہے کہ دیوار پر ذرا سا شیر لگا کر علیحدہ کھڑا ہو گیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ خونریزی سے کئی جانیں ہلاک ہو گئیں چنانچہ تصویر کا انجام بت پرستی اور کتنا پالنے کا نتیجہ درندگی و بیدردی تجربہ میں آ رہا ہے۔

میں نے کہا کہ لہسن اور پیاز میں بھی تو بدبو ہے حالانکہ انکا کھانا حرام نہیں صرف اس بدبو کے موجود ہوتے ہوئے مسجد میں جانے کی ممانعت ہے، فرمایا جب آدمی اور فرشتہ کے حقوق کا مقابلہ آ پڑتا ہے تو آدمی کے حق کو ترجیح دی جاتی ہے۔ کیونکہ ہر چیز آدمی ہی کی غرض سے پیدا کی گئی ہے۔ تو جس شے میں بنی آدم کے لئے کوئی منفعت ہو وہ حرام نہ ہوگی اگرچہ اس میں فرشتہ کے لئے مضرت ہو۔ اور پیاز و لہسن میں جو منافع ہیں وہ ظاہر ہیں کسی پر مخفی نہیں۔ بخلاف تمباکو نوشی کے کہ اس میں کوئی منفعت نہیں ہے۔ ہاں اس کے پینے سے ایک بدنی مضرت ضرور پہنچتی ہے اور اس کے بعد حقہ پینا اس مضرت کا دافع بن جاتا ہے اس کی مثال ایسی ہوتی کہ خود کپڑے کو بھاڑا اور پھر پیوند لگایا کہ حقہ پی کر مرض لگایا اور پھر اس کا علاج حقہ نوشی کو بنایا۔ اگر یہ شخص کبھی حقہ نہ پیتا تو وہ سچٹن ہی پیدا نہ ہوتی جس میں پیوند لگانے کی ضرورت پڑ گئی پس حقہ پینے والے سمجھتے ہیں کہ اس میں نفع ہے حالانکہ اس نفع کی حقیقت پس اتنی ہے کہ اس نقصان کے لئے مفید ہے جو خود حقہ پینے سے لاحق ہوتا ہے، شیخ خطاب اور شیخ مواق رہا اللہ میں اختلاف ہوا ہے کہ حمام میں غسل کے لئے جانا جبکہ اس میں بے ستر اور برہنہ لوگ موجود ہوں شیخ خطاب کے نزدیک حرام ہے اور فرماتے ہیں کہ ٹھنڈے پانی سے اندیشہ ہلاکت ہو تو غسل جنابت کا تیمم کرنا ضروری ہے مگر حمام میں جانا جائز نہیں اور شیخ مواق کہتے ہیں کہ جائز ہے بشرطیکہ خود برہنہ نہ ہو اور نگاہ نیچی رکھے۔ میں نے اس کے متعلق جب حضرت سے دریافت کیا تو یہی نفرت ملا کہ ذکر فرما کر جواب دیا کہ شیخ خطاب کی رائے صحیح ہے اور شیخ مواق کی رائے پر عمل کرنے میں کتنا ہی اپنا ستر عورت اور اپنی نگاہیں نیچی بند کیوں نہ کرے ایک آفت بڑی ہے اور وہ یہ ہے کہ معصیت اور اللہ کے حکم کی مخالفت جہاں بھی ہوگی اس ظلمت کے ساتھ ہوگی کہ اس کے اور ظلمت جہنم کے درمیان اتصال اور ملیا تار کچی ہوا ہوگا کہ اس کے ذریعہ جہنم کی شقاوت اس جگہ تک پہنچتی ہے اور فرشتوں سے زیادہ اس کی شناخت کسی کو نہیں ہے۔ پس جب کوئی قوم مثلاً حمام کے اندر کسی معصیت (یعنی کشف عورت و برہنگی) پر جمع ہوگی اور معصیت اُن سب سے ظاہر ہوگی تو وہ ظلمت اس تمام جگہ پر چھا جائے گی (جس کا اتصال شقاوت جہنم کے ساتھ ہے) لہذا فرشتے گھبرا کر اُن لوگوں سے دور بھاگیں گے اور جب فرشتہ در چلے جائیں تو شیطان مع اپنے لشکر کے آئے گا اور ساری جگہ کو آگھیرے گا۔



اس لئے اس مبتلائے معصیت قوم کے انوار ایمان کی ایسی حالت ہو جائے گی جیسے جلتے ہوئے چراغوں پر  
چہار طرف سے تند ہوا کے جھونکے آئیں اور چراغ کی کوکبھی ادھر جائے کبھی اُدھر اور کبھی نیچے کے رخ ملتے کھڑے  
حتیٰ کہ ہم کہنے لگتے ہیں کہ اب بجھا کہ اب بجھا اور اسی وجہ سے معاصی کو کفر کا قاصد کہا جاتا ہے کہ شیطانی تقییروں  
سے نور ایمانی کے بجھنے کا قوی اندیشہ ہو جاتا ہے، تو جب حمام کی اور حمام والوں کی یہ حالت ہوئی کہ شیاطین  
سے معمور اور ظلمتوں سے لبریز ہو گیا ہے، اور اس میں دیندار صالح شخص داخل ہوا تو اس کے نور ایمان  
کو بھی اس ظلمت کی وجہ سے جو حمام میں موجود ہے اضطراب ضرور لاحق ہو گا۔ کیونکہ ظلمت ضد ہے ایمان  
کی، اور اس وجہ سے اس کے رجو اس کی ذات کے ساتھ ہیں، مضطرب ہوں گے اور گھبراہٹیں گے لہذا شیاطین  
کو اس کے متعلق بھی امید بندھے گی اور وہ اس تک پہنچ کر شر مگاہ پر نگاہ ڈالنے کی اس کو خواہش دلائیں گے  
اور اُسے گمراہ کریں گے۔ غرض ان کے ساتھ ہر لمحہ اس کی جنگ رہے گی۔ آخر وہ قوت پکڑتے جائیں گے کہ  
ان کی آمد کا سلسلہ جاری ہے، اور یہ دیتا اور کمزور ہوتا چلا جائے کہ تنہا لڑتا رہتا تھکتا جا رہا ہے، آخر کار  
شہوت مستحسن معلوم ہونے لگے گی اور شر مگاہ پر نظر ڈالنے میں مزہ آنے لگے گا۔ اسی طرح فرض کر دو کچھ لوگ  
شراب پی رہے ہیں اور وہ معصیتیں ظاہر کر رہے ہیں جو دور شراب جلتے ہیں ہوا کرتی ہیں کہ فحش بک رہے  
ہیں، گالیاں دے رہے ہیں نہ کسی کا لحاظ کرتے ہیں، نہ کسی سے ڈرتے ہیں۔ پھر فرض کرو۔ ایک شخص ہاتھ  
میں دلائل ایخرات لئے ہوئے آیا اور ان کے پاس بیٹھ کر اُسے پڑھنے لگا۔ دیر تک ان کے پاس بیٹھا رہا کہ  
صبح سے شام تک وہ اپنی معصیتوں میں لگے رہے اور یہ قراءت دلائل میں لگا رہا۔ مگر کوئی دن گزر گیا  
کہ یہ بھی پلٹا کھلے گا اور جیسا بن جائے گا۔ اس کی وجہ یہی ہے جو ہم نے ابھی بیان کی اور اسی وجہ سے فساق  
اور اہل معاصی کے پاس بیٹھنے کی شریعت میں ممانعت کی گئی ہے کیونکہ خون اور شہوت اور غفلت ہم میں  
اور ان میں سب ہی میں ہے لہذا جس کی بدولت وہ بگڑے اس کی بدولت ہمارا بگڑنا کیا بعید ہے  
ہاں جس پر اللہ رحم فرمائے (وہ بیشک محفوظ رہ سکتا ہے) مگر وہ بہت ہی کم ہیں۔

ایک مرتبہ آپ دوزخ کی کیفیت بیان فرمانے لگے اور وہ باتیں ذکر کیں جن کا سننا ناقابل برداشت تھا  
حتیٰ کہ حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا کہ حضرت اگر لوگوں کو دوزخ کا علم ہو جائے تو کھانا اور پینا بھی  
بند ہو جائے چہ جائیکہ کوئی اور کام۔ فرمایا ہاں اللہ و رسول پر جن کا ایمان ہے سب کو دوزخ کا علم ہے  
کیونکہ اُن میں جب کسی کی زبان پر دوزخ کا تذکرہ جاری ہوتا ہے تو یہ تذکرہ پہلے اس کے قلب پر جاری ہوتا  
ہے اور جب کان اس کا تذکرہ کو سنتا ہے تو اداں اس کا دل اس کو سنتا ہے۔ کیونکہ جہنم کے عقیق  
میں ظاہر اور باطن دونوں برابر ہیں۔ اور جس طرح اس کا حضور ظاہر میں ہوتا ہے



اسی طرح اس کا حضور باطن میں ہوتا ہے۔ مگر خوبی تو حضور کے دوام اور ہر وقت قائم رہنے میں ہے کہ جس کو یہ نصیب ہو گیا اس پر بارانِ رحمت کا نزول ہو گیا، اس کی غفلت اور مخالفت کم ہو گئی۔ اور جس کو اس کا دوام نصیب نہ ہوا اس کی حالت اس کے برعکس ہوئی۔ میں نے عرض کیا کہ حضور میں دوام نہ ہونے کا سبب کیا ہوتا ہے فرمایا بدن کا خون اور اس کے بخارات ہی اس کا سبب ہوتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بندہ جب دوزخ کا تذکرہ کرتا یا سنتا ہے تو جیسا ہم ابھی کہہ چکے ہیں اول وہ قلب پر جاری ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے خون اور اس کے بخارات بھاگنے لگتے ہیں (اور یہی وجہ ہے کہ خوف زدہ کا سارا جسم زرد پڑ جاتا ہے)، اور جب خون بھاگتا ہے تو اس کا حکم یعنی غفلت معطل ہو جاتی ہے اور وہ تذکرہ جو خون کے بھاگنے کا سبب تھا جب منقطع ہو جاتا ہے تو خون اپنی نالیوں میں واپس آ جاتا ہے اور ذات پر غفلت پھر مسلط ہو جاتی ہے اور پھر جب بندہ اُسے یاد کرتا ہے تو خون پھر بھاگنے لگتا اور غفلت دور ہو جاتی ہے پھر جب اس کی یاد جاتی رہتی ہے تو خون پھر اپنی جگہ لوٹ آتا اور بندہ پر غفلت چھا جاتی ہے اور جب تک پھر اس کی یاد نہ آئے اس کا غلبہ و تسلط قائم رہتا ہے حتیٰ کہ یاد کے بعد پھر جب شہو طاری ہوتا ہے تو پھر غفلت آسوار ہوتی ہے ہمیشہ یہی دور جاری رہتا ہے پھر یاد اور سہو کے درمیانی مدت میں لوگوں کے حالات مختلف ہیں کہ کسی کی واپسی گھڑی بھر بعد ہو جاتی ہے اور کسی کی دو گھڑی بعد اور کسی کی ایک دن بعد اور کسی دو دن بعد۔ اب تم دیکھ لو کہ تمہاری مثال کس فریق میں ہے۔ میں نے کہا اس کا کیا سبب ہے کہ اس کا تذکرہ سنتے سے کم قلب جاگتا ہے اور ہوش آ جاتا ہے گویا عقل واپس آ جاتی ہے اور اس کے افعال درست اور صحیح ہونے لگتے ہیں اور جب اس کا سنتا موقوف ہو جاتا ہے تو پھر اُسی نیند میں چلا جاتا ہے جس کا نام غفلت ہے اس کی مثال ایسی ہے جبے کوئی شخص نہایت میٹھی اور مزہ دار گہری نیند میں سو رہا ہو جب باتیں کی جائیں گی اور اس کو پکارا جائے گا تو (جاگ جائیگا مگر) گرائی اور ناگواری کے ساتھ جواب دے گا اور آواز کے بند ہوتے ہی پھر اپنی نیند میں چلا جائے گا۔ کیونکہ وہ اس پر اس پکار سے قبل مسلط ہو چکی ہے اور پہلے سے غلبہ پائے ہوئے ہے یہی حال غفلت کا ہے جو ذات انسانی پر پہلے ہی سے غالب اور مسلط ہے۔

میں نے آپ سے علوم کشف و جہر و مل و غیرہ اور ان میں غور و فکر کے متعلق دریافت کیا اور یہ کہ اُن سے غیبی امور معلوم ہونے کا سبب کیا ہے؟

فرمایا خطوط اور جہر و مل و غیرہ جن علوم سے بھی واقعات مغیبہ معلوم کئے جاتے ہیں اُن سبکی وجہ قلب کا اللہ سے قطع تعلق اور باطن کا اس کی شاہانہ حکومت سے ویرانی ہے۔ اور اس کی شرح یہ ہے کہ بندہ جب اپنے رب کا دھیان کرتا اور یوں سمجھتا ہے کہ وہی ہے جس کی شان یہ ہے کہ جو چاہے کرے۔



اور جو ارادہ فرمائے اس کا حکم دے (اور کلمے) اس کے سوا نظام عالم کی باگ کسی کے ہاتھ میں نہیں، تمامی ملک میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ بندوں پر اس کی یہ حد شفقت ہے کہ ان کی تمناؤں سے زیادہ اور وہم و گمان سے بالا ان کو عطا فرماتا ہے۔ تو بندہ اپنے رب کو لطیف خاطر اپنا کارساز بناتا اور اپنے تمامی امور میں اس کو رہبر قرار دے لیتا ہے بالکل اس طرف سمت آتا اور سب سے منہ پھر کر اسی کا ہو رہتا ہے۔ اپنی ساری کنجیاں اور اپنی باگیں اس کے ہاتھ میں دے دیتا ہے کہ کسی امر میں بھی اس کے سوا دوسرے پر اعتماد نہیں کرتا اس وقت اس کو اپنے آقا کے برتاؤ میں جو اس کے ساتھ ہوتا ہے وہ وہ خوبیاں اور بھلائیاں دیکھنے میں آتی ہیں جنہیں نہ آنکھوں نے کبھی دیکھا نہ کانوں نے سنا اور نہ کسی بشر کے دل پر ان کا وہم و خیال گذرا۔ یہ شان تو اس کی ہے جس کا قلب مامور ہوا اللہ جل جلالہ سے لیکن جس کا قلب اپنے رب سے خالی ہو اور غفلت اس پر مسلط ہو گئی ہو گئی کہ اس کو ہر ذات اپنی ہی ذات نظر آتی ہو اور تمامی افعال کا صدور اپنے ہی نفس کی طرف سے سمجھ رہا ہوں تو وہ ان علوم مذکورہ کے استعمال و اشتغال میں لگا رہتا اور اپنی اندھی رائے اور تاریک تدبیر کے موافق یوں چلتا ہے کہ واقعات آئندہ کا علم حاصل کر دے تاکہ بکثرت خوبیاں اور منافع کما سکوں۔ لہذا حق تعالیٰ اس کو اس کے نفس کے حوالہ کر دیتا ہے اس کی تدبیر میں تدمیر و ہلاکت رکھ دیتا ہے اور قسم قسم کی بلاؤں اور مصیبتوں میں مبتلا کرتا، نامراد اور حصول مقصود سے محروم رکھتا ہے چنانچہ اس فن دانوں کی حالتوں کا شاہدہ اس کا گواہ ہے اور یہ سزا بھی اس کے لئے بہت محوڑی ہے جو اپنے مونی سے منہ پھرنے اور اس نے اس کی قسمت میں جتنا تجویز کر دیا ہے اس پر راضی نہ ہو ورنہ مطلب یہ ہے کہ ایک شان مومن متوکل کی ہے کہ اللہ کو رازق و قاضی الحاجات اور مستقر و مالک سمجھ کر اور بندوں پر ہاں باپ سے زیادہ شفیق و مہربان اور ان کی یہودی و مصلحت سے واقف و آگاہ قرار دے کر اپنے آپ کو اس کے حوالہ ایسا کر دیتا ہے جیسا مردہ بدست غسال کو جس کو ڈٹ چاہے لٹائے وہ ہر حال بے غدر اور بے شکوہ ہے اس رضا و تسلیم کے صلہ میں دنیا کے اندر بھی جو راحت و سکون اور جاہ و عظمت اس کو ملتی ہے وہ سلاطین کو نصیب نہیں۔ برخلاف ان کے کشف مغیبات کی سعی کرنے والے جفار و رمال اور ہاتھوں کے خطوط دیکھ کر عمر و مرضی وغیرہ معلوم کرنے والے جو بھی اس نوع کے علوم ہیں ان سے کینے اور برتنے والے جو مکہ مدبر عالم جل جلالہ سے مخافل اور اپنی فلاح و یہودگی کی باگ اپنے ہاتھ میں سمجھ رہے ہیں اس لئے ان کی فہم نارسا ان کو سبق پڑھاتی ہے کہ آئندہ کے واقعات کسی طرح معلوم کرور اگر معلوم پہلے ہی ہو گیا کہ فلاں مرضی فلاں وقت ہونے والا ہے تو اس سے بچاؤ کی تدبیر کر لیں گے لہذا اگر معلوم ہو کہ فلاں جگہ خزانہ مدفون ہے تو جاکر اُسے نکال لیں گے غرض راحت و خوشحالی اور خیر و خوبی کے تمامی امور پر قبضہ ہو جائے گا اور مصائب و تکالیف اور حوادث و افکار غرض تمامی پریشانیوں سے تحفظ و بچاؤ



مل جائے گا۔ لہذا حق تعالیٰ نے ان کی ڈھیل چھوڑی اور گویا فرمایا کہ اچھا اپنا انتظام اپنے ہاتھ میں لیتے ہو تو لو اور کچھ کر کے دکھاؤ۔ بلکہ جس علم غیب کے گھنڈ پر کودتے ہو کہ وہ حاصل ہو جائے تو کوئی خیر حاصل کئے بغیر چھوڑو گے نہیں اور کوئی بُرائی یا تکلیف پاس پھٹکے نہ دو گے، اس کو بھی بے نو اور بھڑکیھو کہ کچھ تباہ کئے اور حسبِ خواہش پاس کئے ہو یا نہیں۔ چنانچہ وہ علوم عطا فرما رہے اور ان میں کچھ کامیابی بھی بخشدی تاکہ دل میں کوئی ہوس یا قی نہ رہ جائے۔ مگر اب نتیجہ کا مشاہدہ کرو کہ فن تو ایسا بُرا جس پر عقل حکم لگاتی ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ راحت اور عزت ملتی چاہیے مگر واقعہ اور مشاہدہ یہ کہ بھیک منگا بقرعی اتنا ذلیل نہ ہوگا جتنا ذلیل یہ طبقہ ہے کہ پورے لپٹکے دروازہ دروازہ صرا لگاتا ہوا ٹکے ٹکے بلکہ ایک ایک مٹھی چنے پر اپنا وقت اپنی آبرو اپنا ناموس اور اپنی شرافت بیچتا پھرتا ہے جب فکر معاش میں رات دن کی یہ مصیبت اور تنگی ہے تو دوسری مصیبتوں کا کیا پوچھنا۔ جن امراض و حوادث و آلام و احزان میں ساری دنیا مبتلا ہے غیب سے ناواقف ہو کر ان سے کچھ زیادہ ہی مبتلا نکلے گا جفا و رقت و اوقاتِ مفیدہ سے آگاہ ہو کر غرض وہ خود تو دین و دنیا سے کے خسارہ میں پڑ ہی گئے مگر دنیا کو سبق مل گیا کہ اپنی تدبیر پر اکتفا کرنا اور اپنی فلاح و ہیود کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینے والے بندہ کا دنیا ہی میں یہ حشر ہوتا ہے ان سے زیادہ تعجب ان کی حالت پر ہے جو غیب سے بھی ناواقف ہو کر محض اپنی عقل پر ناز کرتے اور سمجھتے ہیں کہ جتنی تدبیر زیادہ کریں گے اسی قدر بام ترقی پر پہنچیں گے تدبیر کرتا عیب تھا مگر مدبرِ عالم سے غافل ہو کر اپنا انتظام اپنے ہاتھ میں لینا اور اپنی تدبیروں کو موثر و کار گزار سمجھنا بیشک عیب ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ تدبیر کرو مگر تدبیر پر بھروسہ نہ کرو فقیر کا ہاتھ میں کاسہ لینا کنڈھے پر بھونی ڈالنا محض اس لئے ہے کہ سختی کی عطا اس میں ڈالی جائے گی نہ یہ کہ خود یہی ذریعہ عطا ہے اور جتنی بڑی بھونی ہوگی اتنی ہی زیادہ بھر کر رہے گی۔ اگر کاسہ اور بھونی میں کوئی چیز ہے تو اہل عطا سے باغی بن کر اور اہل سخا سے منہ پھیر کر ناپسند خیلوں کنبو سیوں میں دن بھر عمر بھر چکر لگا کر دیکھے کہ کتنا ملتا ہے اور کاسہ علیحدہ رکھ کر سختی کا ٹوکریا غلام بن کر اس کی چوکھٹ پر پڑ کر دیکھے کہ وہ از خود اس کی تمامی ضروریات کو قبل از سوال پوری کرنے کا خیال رکھتا ہے یا نہیں۔ ذرا غور کرو گے تو پتہ چلے لو گے کہ ہم نے اپنی تدبیر کو کاسہ سمجھا اور آقا کو معطل سمجھا ہے یا کاسہ ہی کو معطل اور آقا کو معطل قرار دیا ہے۔ حق تعالیٰ کو عباد باللہ معطل و مغفل اور اپنی تدبیر و عقل یا علوم غیبیہ کے کشف کو مدبرِ زمانہ سمجھنے کی سزا جو کچھ بھی ملتی وہ پھوڑی تھی مگر لطف و کرم ہے بے نیاز خدائے رحمان کا ذلت و بے برکتی اور کثرتِ احزان و افکار ہی پر اکتفا فرمایا۔ نہ زندگی چھینی نہ تنہا رستی، اور نہ روٹی بند کی نہ اولاد۔ کاش ہماری آنکھیں کھلیں اور ہم اپنی موجودہ مصائب کا جن کی گھنگھور گھٹانے چار طرف سے ہم پر اندھیرا چھا دیا ہے



حقیقی راز سمجھیں، اور جو تدبیر کریں محض سائل کی صورت بنانے کے لئے کریں، اور تحت اذن مولیٰ کریں، اور معطلی و تدبیر حق جل شانہ کو سمجھ کر کریں۔ پھر دیکھیں کہ حالت بدلتی اور نلاج و بہبود ملتی ہے یا نہیں۔ ورنہ لاکھ کمپٹیاں بناؤ اپنی تدبیر کے بل بوتے پر خاک نہ ہوگا بلکہ الٹی ذلت و ناکامی بڑھے گی۔

ایک نصرانی راہب کا عجیب قصہ ہوا کہ راہبوں کا سردار اور سب میں بڑا سمجھا جاتا تھا اور گرجا میں دھارتا تھا۔ جب گرجا سے باہر نکلتا تو صلیب کی طرف پشت نہ کرتا اور اس سے منہ پھیر کر نہ چلتا تھا۔ ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ اس کے پیٹے نے عین طوفان اور تلاطم کے زمانہ میں بحری سفر اختیار کیا اور اس لئے اس کو بے حد پریشانی تھی اور ہر وقت اس کی خیریت معلوم کرنے کے انتظار میں رہتا تھا۔ دفعۃً اس کو خبر ملی کہ وہ بعافیت و سلامتی آگیا۔ اس فرط مسرت میں وہ پیٹے سے ملنے گرجا سے باہر نکلا اور اپنی اس عادت و معمول کو بھول گیا کہ صلیب سے منہ نہ پھیرے چنانچہ اس طرف پشت ہو گئی۔ مگر جب پیٹے سے مل چکا تو اس کو یاد آیا کہ صلیب سے روگردانی ہوئی۔ لہذا فوراً واپس آیا اور راہبوں سے کہا کہ میرے سوؤں سے مارو۔ انہوں نے پوچھا کیوں؟ کہا اس لئے کہ آج صلیب کی طرف میری پیٹھ ہو گئی۔ ان کو بھی حرکت بڑی معلوم ہوئی اور اس لئے انہوں نے دُڑے مارنا شروع کئے حتیٰ کہ تنو کی تعداد پوری کر دی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ضرب کی تکلیف کے سبب صلیب کے متعلق اب اس کی نیت بدل جائے گی اور اپنے دین سے پھر چلے گا۔ مگر بجائے اس کے کہ چوٹ کا اثر مانے، ہوا تو یہ ہوا کہ اس نے چھری سے کرٹخنوں سے اپنے دونوں پاؤں کاٹ ڈالے اور کہا کہ یہ ہے سزا اس کی جو اپنے آقا سے منہ موڑے اور پیٹھ پھرے (کہ جن پیروں سے چلنا سبب ہوا پیٹھ پھرنیکا وہی قطع کر دیئے جائیں۔ نہ آئندہ چل سکوں گا اور نہ صلیب سے منہ پھرے گا) حضرت ممدوح نے فرمایا جب گمراہ اور اہل باطل سے ایسا صادر ہو تو کیا حال ہونا چاہیئے اہل حق کا جو حق کی پرستش کرتا ہو۔ مگر بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے علم قدیم میں طے ہو چکا ہے کہ وہ اپنی مخلوق میں ایک فریق کو نعمت و رحمت کا اہل بنائے گا۔ اور دوسرے فریق کو مستحق نعمت و عذاب اور ہر فریق کی حرکات اور سعی اسی تجویز کے موافق ہوں گی۔ جن کو رحمت کے لئے تجویز کیا ہے ان کے قلوب کو اپنے ساتھ متعلق بنالیا اور ان کی ہمت کو اپنی طرف پھیر لیا لہذا ان کے حرکات و سکنات اس کے تابع بن گئے۔ کہ ان کی نماز بھی اللہ کے لئے ہے اور روزہ بھی اللہ کے لئے اٹھنا بھی اللہ کے لئے اور بیٹھنا بھی اللہ کے لئے بیداری بھی اللہ کے لئے اور خواب بھی اللہ کے لئے غرض حق تعالیٰ ان کو اپنی محبوب و پسندیدہ چیزوں میں حرکت دینا رہے گا حتیٰ کہ وہ اذات پا کر اللہ تک پہنچ جائیں گے اور اس کی اس رحمت کو بائیں گے جو ان کے لئے تجویز فرمادی تھی۔ اور جن کو اہل نعمت بنایا ہے ان کے قلوب دوسروں کے ساتھ وابستہ کر دیئے اور ان کی مہمتوں کو اس شے کی طرف پھیر دیا جو مکاری کے جانے سے بھی زیادہ



بودے ہیں۔ جیسے یہی امور مذکورہ ر علم جعفر درمل وغیرہ یا عقل اور اس کی تدبیر، لہذا ان کے حکمت و سکنت اس کے تابع بن گئے کہ ان کا اٹھنا بھی غیر اللہ کے لئے ہے اور بیٹھنا بھی اللہ کے لئے جاگنا بھی غیر اللہ کے لئے اور سونا بھی غیر اللہ کے لئے غرض ہر سعی و کوشش غیر اللہ کے لئے بنیادی تاکہ اللہ سبحانہ کے ساتھ کسی حال ان کو تعلق نہ ہو سکے آخر کار تقدیر پوری ہو کر رہی اور وہ (مرکز) اپنے عذاب مقسوم تک جا پہنچے۔

ایک بزرگ نے مجھ سے قصہ نقل کیا کہ میں ایک مرتبہ در بڑھے آدمیوں کے پاس جا بیٹھا جن کی عمر ستر برس کی قریب پہنچ چکی تھی صبح سے لے کر زوال تک میں سنتا رہا کہ دونوں دنیا کی باتیں کرتے رہے اور ایک مرتبہ بھی ان کی زبان پر اللہ کا ذکر آیا نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس وقت میں اٹھا اور تازہ و صند کیا۔ اس کے بعد دو لڑکوں کے پاس آ بیٹھا جو روزہ رکھنے کے قابل ہو گئے تھے۔ میں نے سنا کہ وہ آپس میں اللہ کی وحدانیت اور اس کی صفات کا عجیب عجیب تذکرہ کر رہے تھے۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ ان بچوں کی ربا و جود نو عمری کے یہ حالت اور ان بوڑھوں کی ربا و جود بگور پہنچ جانے کے، وہ حالت ذلک تقدیر العزیز العلیم۔ یہ قبلہ اور علم دانوں کی تجویز ہے جس کا نام تقدیر ہے کہ ارادہ عید کا واسطہ ڈال کر کام کر رہی ہے تاکہ جبر بھی لازم نہ آئے اور علم قدیم میں نقص بھی لاحق نہ ہو، اس کی تائید میں کہ حق تعالیٰ جب بندہ کے قلب کا تعلق کسی غیر کے ساتھ کر دیتا ہے تو اس کو ڈھیل دیتا اور ایسی چیزوں سے اس کو مدد پہنچاتا ہے جو اس کے لئے فتنہ بن جاتی ہیں حتیٰ کہ مقدمات اور واقعات مستقیدہ کی خبریں اس سے ظاہر ہوتے لگتی ہیں۔ حضرت ممدوح نے ایک عبرتناک قصہ سنایا کہ ایک ولی تھا حق تعالیٰ نے اس کی ولایت سلب کر لی اور حق اس کے قلب سے منقطع ہو گیا۔ سلب ولایت سے قبل اس سے کرامتیں ظاہر ہو آ کر تھیں اور سلب کے بعد رجائے اس کے کہ اندر دیکھتا اور تنبہ ہو کر توبہ کر لیتا، فتنہ کی صورت میں اس سے تعجب خیز طبی امور اور نجومی معلومات کا ظہور ہونے لگا کہ سلب کے بعد بھی وہ سمجھا کہ میں کچھ ہوں (اور کسی بات میں کمی نہیں آئی) چنانچہ چار طرف اس کی شہرت ہوئی اور لوگ رقیس لے کر جوق جوق اس کے پاس آنے لگے۔ اس کو مال جمع کرنے کی ہوس بہت تھی اس لئے خوب سمیٹا۔ حتیٰ کہ تقریباً تیرہ برس میں ستر ہزار دینار (قریب دو لاکھ روپیہ کے) جمع کر لئے آخر کار مر گیا اور کوئی وارث نہ چھوڑا۔ سارا مال بیت المال میں داخل ہوا اور اس کا انجام ہر قسم کا خسارہ و حرمان ہوا۔

۱۔ میں نے حضرت ممدوح سے دریافت کیا کہ کسی شخص کو نہانے کی حاجت ہو اور اس نے غسل نہ کیا ہو تو دلی کو کیسے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شخص جُبنی اور ناپاک ہے؟ فرمایا اولیاء کے نزدیک جنابت کئی قسم کی ہوتی ہے اور غسل کے وجوب کی وجہ صرف ایک ہے مگر اس کے اسباب اولیاء کے نزدیک متعدد ہیں اور علما کے نزدیک



اس کا سبب صرف ایک ہے لہذا اولیا کے نزدیک تمامی اسباب میں غسل کا وجوب ہوگا اور علماء کے نزدیک  
بجز ایک سبب کے دوسری جگہ غسل واجب نہ ہوگا۔ میں نے دریافت کیا کہ وہ وجہ کیا ہے جس کے اسباب اولیا  
کے نزدیک متعدد ہیں اور علماء کے نزدیک صرف ایک ہی سبب ہے؟ فرمایا کہ وہ وجہ ذات عبد کی نگاہ کا  
اللہ سے بایں صورت منقطع ہو جانا ہے کہ اللہ کی طرف سے اس کی ساری آنکھیں بند ہو جائیں اور اس کی  
رگیں غیر اللہ کے ساتھ فرح و سرور سے لبریز ہو جائیں اور اس کا فکر اور تمامی اجزاء و جواہر ذات اس غیر میں  
منہمک و غرق ہو جائیں۔ بشرطیکہ یہ غیر اس حالت میں قاطع عن اللہ ہو، یعنی اپنے اندر اتنا فنا کرے کہ حق تعالیٰ  
کے تصور و دھیان کی گنجائش ہی نہ رہے) پس ذات عبد جب اس انقطاع کلی میں پڑے گی تو فرشتے اس  
سے گھبراہٹیں اور بھاگیں گے اور بندہ کی اپنے اور بندہ کی اپنے رب سے اس درجہ بے تعلقی ان کو ایک بڑی  
بات معلوم ہوگی۔ پس صوفیہ کے نزدیک تو ہر وہ سبب قاطع جو ذات کے لئے اس بے تعلقی کا موجب ہو غسل واجب  
کر دیتا ہے اور علماء کے نزدیک غسل صرف جماع سے واجب ہوگا یا جو بھی جماع کے حکم میں ہے جیسے انزال  
کسی دوسرے طریقہ سے کیونکہ لذت انزال انسان کی ہر قوت کو اپنے اندر اس درجہ فنا کرنے والی ہے کہ اللہ  
کے دھیان و تصور سے بالکل غافل کر دیتی ہے اور اس کا سبب یعنی خروج منی چونکہ آنکھوں سے نظر آتا ہے  
لہذا غسل کا حکم دیا گیا۔ بر خلاف دیگر قواطع کے وہ مشاہد نہیں اس لئے قانونی ضابطہ میں ان پر کوئی  
حکم نہ لگایا گیا، اور غسل کا راز اس انقطاع سے ذات کو پاک کرنا ہے کہ انقطاع عن اللہ کی طلسمت و  
نجاست باطنیہ کو حق تعالیٰ نے بمنزلہ حسی نجاست کے قرار دیدیا۔ اور جب بندہ غسل کرنے لگتا ہے تو فرشتے  
واپس آنے لگتے ہیں پس ولی کو ذات منقطعہ سے فرشتوں کو بھاگتا ہوا دیکھ کر جنابت کا پتہ چلتا ہے اور وہ  
سمجھ جاتے ہیں کہ ان کے بھاگنے کا سبب وہ انقطاع ہے جو حاصل ہوا ہے جنابت سے (اور اس بنا پر وہ  
ہر قاطع مخفی کا ادراک کر کے دیگر صورتوں میں بھی غسل کا حکم لگانے کا حق رکھتے ہیں، میں نے کہا کہ اس تقریر کا  
مقتضا تو یہ ہوا کہ جس شخص کو جماع کی حالت میں بھی حق تعالیٰ کا دھیان اور مراقبہ قائم رہے اس پر  
غسل واجب نہ ہونا چاہیئے۔ فرمایا ایسا شخص شاذ و نادر کوئی ہوگا (ورنہ بالعموم لذت انزال سب کے لئے قاطع  
عن اللہ ہے) اور نادر کی رعایت سے کوئی حکم خاص نہیں ہوتا (اسی عموم کا یہ بھی محکوم ہوتا ہے) ایک  
مرتبہ فرمایا حق تعالیٰ نے ولی کو قدرت دی ہے کہ ایک شخص کے کان میں بات کہے اور اٹھتے نہ پائے کہ  
وہ اور یہ ولی معرفت میں مادی ہوں اور دونوں میں کچھ بھی فرق نہ ہو۔ یعنی ولی کامل بندہ کو ایک لحظہ میں  
واصل باللہ بنا سکتا ہے پھر فرمایا لیکن ساری بات تو اس گووند کی ہے جس میں یہ ستر الہی چپکا یا جلے  
کہ اگر ذات عابد میں گووند نہ ہوگا تو ستر اپنی اصل کی طرف لوٹ آئے گا۔ جیسے کوئی شخص



ہوا کو (شاندار آدمی بنانے کے لئے)، کوترہ یا پا جا مہ پہنانے اور عمامہ باندھنے لگے کہ وہ اس میں قائم نہیں رہ سکتا میں نے چاہا کہ دریافت کروں وہ گوند کیا ہے، مگر مجلس برخاست ہو گئی رات کو میں نے خواب میں آپ سے یہی سوال کیا تو آپ نے فرمایا وہ نفس کا مرجانا ہے۔ جب بیداری میں آپ سے ملنے کا اتفاق ہوا تو میں نے خواب عرض کیا۔ فرمایا جواب بالکل صحیح ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ نفس کے مرجانے کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا بندہ کے سب کام خالص اللہ واسطہ ہو جائیں اور اگر اعمال غیر اللہ کے لئے ہوں تو یہ علامت ہے نفس کے زندہ ہونے کی۔ دوسری علامت یہ ہے کہ جب بندہ کے نفس میں دوسو سے آدیں تو سمجھو نفس زندہ ہے اور جتنا زیادہ زندہ ہوگا اسی قدر دوسو سے زیادہ آئیں گے۔ پس جسے کوئی دوسو نہ آوے اس کا نفس ہی نہیں رہا اور جسے دوسو سے آوے اُس کا نفس نہ زندہ ہے، اور جس کا نفس زندہ ہے اس کے اعمال اللہ کے لئے نہیں، بلکہ وہ نفس کے لئے سعی اور اُسی کے لئے تدبیر کر رہا ہے میں نے عرض کیا اس کا تریاق کیا ہے جس کے نفس پر ڈالتے سے وہ مرجائے اور پانی میں نمک کی طرح گھل جاتے وہ ہیں تبارکے کہ ہم سپر ڈال کر مطمئن ہو جائیں فرمایا جب تک اس پر بڑا پہاڑ نہ آپڑے کوئی بھی علاج نہیں۔ میں نے کہا وہ بڑا پہاڑ کیا؟ فرمایا اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کا مشاہدہ۔ قلب جب اس سے معمور ہو جاتا اور سمجھ لیتا ہے کہ (میں ہر وقت اللہ کے سامنے حاضر ہوں اور وہ) سب کچھ دیکھ اُدس رہا ہے اور میں کسی کام میں بھی حرکت نہیں کر سکتا جب تک کہ وہی محرک نہ بنے اور وہی ہے کہ جو چاہتا ہے نعمت عطا فرماتا ہے اور یہ کہ مجھے انجام کار آخرت میں اپنے رب کی طرف جانا ہے پھر وہ (جنت و دوزخ کے) جس گھر میں چاہے گا مجھے داخل فرمائے گا۔ پس جب اس میں غور کرے گا تو یقیناً سمجھے گا کہ جب تک میرا رب قدرت نہ بخشے دنیا ہو یا آخرت کہیں بھی از خود نہ میں اپنے نفس کو کچھ نفع پہنچانے کی قدرت رکھتا ہوں نہ کسی دوسرے کو پس اب اس کی نظر اللہ کے سوا کسی پر نہ جائے گی اور نفس مرجائے گا۔ حق تعالیٰ نفس مرنے کے اسباب کی اپنے فضل و کرم سے ہیں توفیق بخشے راستہ میں میرا گذر چند لوگوں پر ہوا جو چوسر کھیل رہے تھے۔ میں نے حضرت سے اس کا حکم دریافت کیا۔ فرمایا حرام ہے۔ میں نے وجہ دریافت کی تو فرمایا حرام چیزوں کی حرمت کا سبب ہی صرف ایک ہے یعنی انقطاع عن اللہ۔ لہذا جوشے بھی (اپنے اندر غرق کر کے)، بندہ کو اللہ سے بے تعلق کرنے والی ہے اور اس میں شارع کی کوئی غرض صحیح موجود نہیں تو حق تعالیٰ نے اس کو حرام فرما دیا ہے اور اس کھیل میں کوئی بھی منفعت نہیں بجز اللہ سے غافل بنانے کے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کھیل میں مشغول ہونے کے وقت کھیلنے والوں کے قلب اور بدن کو اس درجہ اس میں استغراق ہوتا ہے کہ ذات کی ساری آنکھیں حق تعالیٰ کی طرف سے بند ہو جاتی ہیں اور اللہ پر نظر جانے کی صورت ہی نہیں رہتی۔ میں نے کہا کہ یہ حال تو تیرا اندازی اور گھوڑ دوڑ کا بھی ہے



کہ اس میں مشغولیت کے وقت بھی اللہ سے انقطاع ہو جاتا اور کھیل میں محویت ہر چیز سے بیخبر کر دیتی ہے فرمایا یہ چوسر کھیلنے کے برابر نہیں کہ اس میں شارع کی نہ کوئی غرض صحیح موجود ہے اور نہ اس کا کوئی نفع ذات عابد پر عود کرنا ہے پر خلافت تیر اندازی وغیرہ آلات جنگ کے کہ ان کا سیکھنا اس قوت کی تیاری میں داخل ہے جو آیہ شریفہ **وَاللّٰهُ مَا اسْلَطَعَهُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ** میں مامور ہے کہ کافروں (سے جنگ کرنے) کے لئے تیار کرو قوت اور گھوڑے باندھنا جتنا بھی ہو سکے۔ پس ہر وہ چیز جو شارع کے نزدیک مقصود ہو یا اس کا مقصود ہو سکنا صحیح ہو، وہ قاطع عن اللہ نہیں (بلکہ امثال امر ہونے کے سبب اس نوع میں داخل ہے جو صورتہ قطع ہے اور حقیقتہ وصل) اور اسی وجہ سے شطرنج کے بارہ میں ائمہ کا اختلاف ہوا ہے کہ بعض (یعنی امام شافعی) نے یہ دیکھتے ہوئے کہ اس میں طریق جنگ کی تعلیم ہے اور اس کا مقصود شارع بننا صحیح ہے اس کو مباح کہا ہے اور بعض (یعنی امام ابو حنیفہ) نے اس پر نظر کر کے طریق جنگ سیکھنے کا مقصود شارع خاص اس طریق پر موقوف نہیں بلکہ دوسرے طرق سے بھی حاصل کیا جاتا ہے جو اس سے زیادہ سہل اور واضح تر ہے۔ اس کو اس انقطاع عن اللہ کی وجہ سے حرام فرمایا ہے۔ اس اختلاف کی وجہ سے شطرنج البتہ چوسر سے نیتہ کم ہے۔

ایک بزرگ کہا کرتے تھے کہ مجھ میں توبہ الی اللہ کا استحکام اور قلب میں اس کی شاخوں کا پھیلاؤ اور اس کی رگوں کا جاذب اور جگر پکڑ لینا اور انتہا درجہ پر پہنچ جانا صرف اس سبب سے ہوا ہے کہ میرے دل میں بلا تفریق تمامی مومنین کی محبت ہے جیسا کہ بلا تفریق تمامی کافروں سے بغض ہے۔ پھر حضرت نے ارشاد فرمایا کہ بندہ کے اندر جب یہ محبت آجاتی ہے تو اس پر اللہ کی طرف سے توبہ نازل ہوتی ہے اور کتنا ہی اس کو ٹھانا چاہے مگر نازل ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ مومنین کے ساتھ محبت میں یہ تفریق کہ کسی کے ساتھ محبت ہو اور کسی کے ساتھ نہ ہو دل میں چھپے ہوئے بغض کے بغیر نہیں ہوا کرتی جو کہ حسد یا تکبر وغیرہ سے پیدا ہوتا ہے لہذا اس کا ضمیر گندہ ہوا اور توبہ خالصہ کا نزول عمدہ زمین اور پاک طبیعت پر ہوا کرتا ہے۔ اور جب عامہ مومنین سے محبت ہوتی تو چھپے ہوئے سارے کھوٹ قلب سے مرتفع ہو گئے۔ لہذا توبہ کا نزول ہو گا۔ اور ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ ایسے شخص کو توبہ کی کبھی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ یہی محبت عامہ اس کے سارے گناہ مٹانے کو کافی ہو جاتی ہے اس لئے کہ سارے کھوٹ جو گناہوں کا سبب بنا کرتے ہیں، دل سے دور کر دیتی ہیں نیز آپ نے فرمایا اور سب میں بڑا کھوٹ حسد ہے اور اس محبت کے ساتھ وہ قطعاً باقی نہیں رہتا۔ حسد کو سب میں بڑا کھوٹ ہم نے اس لئے کہا کہ تمامی معصیہیں اور سارے کھوٹ اسی کی شاخیں ہیں اور سب کا سبب صرف یہی ہے کیونکہ اگر کسی کے صاحب کمال و صاحب اولاد ہونے کی وجہ سے عداوت



بغض ہوا ہے تو ظاہر ہے کہ ان نعمتوں پر حسد ہی کی وجہ سے ہوا ہے کہ وہ اس کو کیوں مل گئیں، اور اگر تمہارے پاس مال و اولاد اور قبیلہ زیادہ ہے اور تم کو تکبر پیدا ہوا ہے تو ظاہر ہے کہ اپنی بُرائی کی وجہ سے تم دوسرے کو اپنے مرتبہ پر پہنچ جانے سے دھکے دے رہے ہو کہ بڑا مطلب یہی ہے، اور یہ اس وجہ سے ہے کہ اس کا تمہارے مرتبہ پر پہنچ جانا تم کو ناگوار ہے۔ اور اسی کا نام حسد ہے۔ اسی طرح ہر معصیت انجام کار حسد کی طرف رجوع کرے گی اور سب کا سبب اصلی یہی نکلے گا۔ میں نے عرض کیا کہ جب بندہ کو بلا تفریق سارے مومنین سے محبت ہوئی تو حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کہاں رہے، حالانکہ وہ شاہانِ ایمان کی دو شاخیں ہیں۔ کیونکہ مرکب معصیت اس کا مستحق ہے کہ اللہ کی راہ میں اس سے بغض رکھا جائے اور جب ہم نے اللہ کی راہ میں اس سے محبت رکھی کہ عامہ مومنین میں وہ بھی داخل ہے، تو مقتضایہ معصیت کے خلاف خلاف کیا۔ فرمایا کہ مرکب معصیت میں جس کی طرف بغض کا متوجہ ہونا (بغض فی اللہ میں) ضروری ہے وہ اس کے افعال معصیت ہیں نہ کہ اس کی ذات مومنہ اور قلبِ طاہر اور ایمانِ دائم۔ کیونکہ یہ چیزیں جو معصیت محبت ہیں اس کے لئے لازم اور اس کی ذات کے ساتھ قائم ہیں اور گناہ جو موجب بغض ہیں اس پر عارض اور ذات پر طاری ہوئے ہیں۔ لہذا اس کی ذاتی محبت تو ہمارے قلوب میں قائم رہنی چاہیے، اور بغض ان عارضی امور کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ اس کے گناہ ہماری نظر اور خیال میں ایسے ہوں گے جیسے کسی محبوب کے، کپڑوں سے پتھر باندھ دیئے جائیں کہ اس کی ذات تو محبوب ہی بنی رہے گی مگر کپڑوں سے بندھے ہوئے عارضی پتھروں کے ساتھ بغض ہوگا اور اتنی مقدار کے بغض کا ضرورت نے حکم بھی دیا ہے اس سے زیادہ کا نہیں مگر اکثر آدمی افعالِ خارج از ذات کے ساتھ بغض اور اصل ذات کے ساتھ بغض میں فرق نہیں کرتے۔ چاہتے ہیں کہ افعال کے ساتھ بغض رکھیں مگر سمجھتے نہیں کہ اس کی صورت کیا ہے، اس لئے بغض ذاتی میں جا پڑتے ہیں۔ حالانکہ ذات کے ساتھ بغض رکھنے کا حکم ہمیں صرف کافر کے متعلق دیا گیا ہے کہ اس کی ذات اور جو کچھ بھی اس سے صادر ہو سب ہی مبغوض ہونا چاہئے مگر گناہگار مسلمان کے ساتھ اتنے بغض کا ہمیں کہاں حکم دیا ہے جس سے اس کی ذات، اس کے اللہ پر ایمان، اللہ کے رسول پر ایمان، پیغمبروں پر ایمان، تمامی انبیاء و پر ایمان، تمامی آسمانی کتابوں پر ایمان، روز قیامت اور حشر و نشر، پطراط، میزان، پیغمبروں پر ایمان، جنت و دوزخ پر ایمان، تقدیر پر ایمان، کہ کبھی ہو یا بُری سب اللہ کی طرف سے ہے غرض ہر وصفِ محمد سے جو اس میں پایا جاتا ہے سب سے قطع نظر کر لی جائے (اور کسی کی بھی رعایت نہ رکھی جائے)، پس اگر ان خصالِ حمیدہ کی محبت پہلے سے ہمارے دلوں میں ہوگی تو ناممکن ہے کہ اس کی ذات کا بغض ہمارے قلوب میں کبھی آ سکے۔ ہاں صرت اس کے افعال سے بغض ہوگا اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم اس کے لئے دعائے خیر کریں گے خصوصاً جبکہ نگاہ حقیقت رکھیں گے تو دعا خیر ہی کا اس کو مستحق پائیں گے لیکن



اکثر آدمیوں کی یہ حالت ہے کہ جیب انہوں نے مزکیب معصیت سے (مقتضا و حدیث) بغض رکھنا چاہا تو سب سے پہلے بغض کو اس کی طرف متوجہ کر دیا اور موجب محبت خصلتوں سے غفلت اختیار کی کہ عقل میں بھی ان کو مستحضر نہیں کرتے لہذا عاصی کا بغض ان کے دلوں میں بیٹھ جاتا اور اس کی ذات تک سرایت کر جاتا ہے کہ اس کی ذات ہی ان کی نگاہوں میں مبعوض بن جاتی ہے حالانکہ یہ نہ حلال ہے نہ جائز ہے۔

ایک مرتبہ فرمایا جو شخص سواری و لباس و مکان اور خورد و نوش میں امتیازی شان اختیار کرتا ہے بڑے عیب کی بات ہے، میں نے پوچھا اس کے عیب ہونے کی کیا وجہ؟ فرمایا کہ وہ لوگوں کے قلوب اپنی طرف متوجہ اور ان کو اللہ سے منقطع کرتا ہے اور یہ اس کی امتیازی شان سبب قطع بنیتی ہے میں نے کہا وہ اندھے لوگ جو اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں خود اللہ سے بے تعلق ہیں پھر اس کی طرف توجہ کرنے سے ان کا نقصان؟ فرمایا بے تعلق پر بے تعلق کا اضافہ ہو جائے گا نیز جو ذات اس امتیاز میں مشغول ہوتی ہے روح اس سے بھاگنے لگتی ہے اس لئے کہ روح کو اس شان امتیازی سے ذلت و خواری لاحق ہوتی ہے کہ میں عام حالت پر بھی نہ رہی اور ذات مجھ سے بڑھ چڑھ کر کام کرتے لگی، لہذا وہ ذات کے فعل سے نفرت کھا کر اپنے خالق کے ساتھ جو برتاؤ کرنا مناسب تھا اس کا راستہ دکھانا چھوڑ بیٹھتی ہے اور یہ اس کی ہلاکت کا سبب بن جاتا ہے۔

دعوت من شان امتیازی میں دو مصرتیں ہیں ایک لازمی اپنی ذات کے لئے کہ رشد و سداد میں روح کی اعانت سے محروم ہو گیا اور ایک متعدی دوسروں کے لئے کہ بھائیوں کو اللہ سے اور زیادہ دورے جا ڈالا حاضرین میں سے ایک صاحب نے جو بڑے سخی اور کریم تھے عرض کیا کہ حضرت اگر کوئی شخص اس امتیازی شان سے صدقہ و خیرات کرے تو کیا وہ بھی مضر ہے؟ فرمایا ہاں اور اس لئے جہاں تک ہو سکے چھپا کر خیرات کرے نیز فرمایا میں واقف ہوں ایک شخص سے کہ اس نے مغرب اور عشاء کے درمیان پچیس مثقال سونا بے شمار تقروں پر صدقہ کیا۔ مگر کسی ایک کو بھی پتہ نہ لگا کہ وہ کون تھا۔ اسی سخی نے سوال کیا اچھا حضرت اگر صدقہ چھپا کر دے مگر نفس کو بھلا معلوم ہو اور خیرات کر کے خوشی ہو؟ فرمایا اگر یہ بھلا معلوم ہوتا خود صدقہ کرنے پر خوشی اور اس کو اپنی نظر میں بڑا کام سمجھنے پر ہوا ہے تو مانع صدقہ نہیں کیونکہ ممکن ہے صدقہ کرتے دے کا نفس کبھی اس نظر میں بھی غافل ہو جائے اور صدقہ عیب سے سالم نکلے جس کو حق تعالیٰ قبول فرمائے۔ نیز فرمایا کہ اسی فائدہ کے لئے حق تعالیٰ نے ہمیں سٹھ اور ستر برس کی عمریں عطا فرمائی ہیں کہ کیا عجیب ہے اس ددازدہت میں کوئی ساحت قبول کی ہمارے ہاتھ آ جائے کیونکہ ہم کپر شہوت و نفس کا اتنا غلبہ و تسلط ہے کہ ایک فعل بھی (ظلمت سے) صاف اور کوئی عمل بھی (ریا و تمود سے) خالص صادر نہیں ہوتا لہذا یہ علت (یعنی صدقہ پر فرح و سرور جس کو عجیب کہتے ہیں) فعل طاعت کے لئے مانع نہیں،



رالبتہ جس فعل میں ریا و نمود ہو وہ فعل ضرور ممنوع ہے (سختی نے کہا حضرت ہمیں آگاہ فرمائیے کہ ہمارے صدقات اور دیگر اعمال خالص اللہ واسطہ کیونکر بنیں؟ فرمایا جو عمل بھی اجر اور صلہ رحمی کی نیت سے کرو گے وہ بغیر اللہ ہوگا اور اس میں وسوسے ضرور پیش آئیں گے۔ مثلاً خیال آئے گا کہ جس شخص کو صدقہ دیا ہے نہ معلوم وہ صدقہ کا اہل بھی تھا یا نہیں، اور اگر اہل تھا تو ممکن ہے وہاں کوئی دوسرا اس سے زیادہ مستحق اور قبولیت صدقہ میں اقرب الی اللہ موجود ہو اور میں اسے نہیں دے سکا حتیٰ کہ آخری وسوسہ یہ ہوگا کہ نہ معلوم میرا صدقہ اللہ نے قبول بھی کیا یا نہیں۔ اور جس عمل میں وسوسہ کا دخل ہو گیا (معلوم ہوا کہ) اس میں اللہ کا کوئی حصہ نہیں۔ کیونکہ وسوسے شیطان کی طرف سے ہوا کرتے ہیں اور جو عمل اللہ واسطے ہوا کرتا ہے شیطان اس کے پاس بھی نہیں پہنچ سکتا۔ سختی نے کہا اگر اجر و صلہ کی نیت سے نہیں بلکہ اللہ کا قرب حاصل کرنے کی نیت سے خیرات کروں تب کیا مضر ہے؟ فرمایا ہاں مضر ہے کہ قرب بھی ایک علت ہے اور اس کی خاطر عمل کرنا بھی سمجھدہ اغراض کے ایک عزم ہے۔ اہل اخلاص کے نزدیک عمل کے خالص اللہ کے لئے ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اللہ جل جلالہ کے اوصاف بلال و کمال اور اس کی کبریائی و عظمت کو معلوم کرے اور جو بے شمار اور ان گنت نعمتیں اس نے عطا فرمائی ہیں ان کو سوچے اور پھر سمجھے کہ واقعی وہ اسی کا مستحق ہے کہ اس کے سامنے سر جھکایا جائے۔ اس کے سوا حظوظ نفس میں کسی حظ و لذت کا دل میں وسوسہ بھی نہ آوے چہ جائے کہ عمل حظ یا نفس ہی کی خاطر ہو بلکہ یوں سمجھے کہ دشوار سے دشوار عبادت جو تصور میں آسکے اور بیماری سے بیماری تکلیف جو فرض کی جاسکے دراز سے دراز زندگی ملنے پر رات اور دن کے ہر لمحہ وہ لحظہ بھی اگر اس کی عبادت میں لگا رہے تب بھی اپنے پروردگار کے حق واجب کا ذرہ برابر حق ادا نہ کر سکوں گا۔ اور حظ نفس کی خاطر کسی عمل کرنے کا تصور و خیال تو وہ کرے جو اپنے رب کے تمامی حقوق سے فارغ ہو گیا ہو۔ اور جب عمر بھر اس کے ایک حق ادا کرنے کی بھی طاقت نہیں رہتا تو سارے حقوق ادا کرنے کی تو کیا ہو سکتی ہو۔ اور اس سے فراغ پا کر حظ نفس کے لئے عمل کرنے کی توقع تو کس طرح کرے نیز آپ نے فرمایا جنتی حب جنت میں داخل ہو جائیں گے اور ان کو اپنے خالق کی معرفت میں زیادتی نصیب ہوگی تو سب نادم ہوں گے کہ ہم سے اللہ سبحانہ کے بارہ میں بڑی کوتاہی ہوئی نیز آپ نے فرمایا میں نے جو کچھ کہا ہے اگر اس میں غور کرو گے تو معلوم ہوگا کہ اجر کی خاطر عمل کرنا اللہ اور اس کے ادا و حقوق سے بے تعلق بنانے والی چیز ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایسے عمل کرنے والے کو ولایت اور قرب الہی نصیب نہیں ہوتا بلکہ اللہ کا بُعد بڑھتا ہے۔ اور جب اللہ کے مستحق ہونے کی وجہ سے عبادت کرو گے تو تمہاری عبادت میں کبھی کسی وسوسہ کا بھی دخل نہ ہوگا۔ میں نے عرض کیا حضرت اگر خیرات دینے والا خیرات دیتے وقت یوں سمجھے کہ مال بھی اللہ کا ہے میرا نہیں، اور میں خود بھی اللہ کا ہوں اپنا نہیں، اور مسکین جس پر



خیرات کی جارہی ہے وہ بھی اللہ ہی کا ہے۔ غرض وہ خوب سمجھے ہوئے کہ سب کچھ اللہ کا ہے اور اب اس نیت سے وہ خیرات کرے اور اپنے نفس کے لئے کسی شے پر کچھ بھی نظر نہ ہو تو ایسی خیرات کا کیا حکم ہے؟ فرمایا سبحان اللہ بہترین سے بہترین ہے اور اس سے پہلے ہم متہیں اس تاخیر کی حکمت بتا ہی چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک چالیس سال کی عمر کو نہ پہنچ لئے مبعوث نہیں فرمائے گئے (اس کا تذکرہ آئندہ آئے گا)، اس کے بعد فرمایا کہ میں ایک شخص کو جانتا ہوں صراطین میں سے تھے اور مجذب صفت تھے موسم سرما میں ان کے پاس کوئی کپڑا نہ تھا جو ان کو سردی سے بچا سکے۔ مجھے ان پر بہت ترس آتا اور ان کا اکثر فکر و خیال رہا کرتا تھا۔ اکثر ایسا ہوا کہ کسی نے ان کو کپڑا دیا کہ سردی سے بچاؤ ہو مگر کوئی آتا جس کے دل میں اللہ کا خوف نہ ہوتا اور وہ کپڑا ان کے بدن سے اتار کر لے جاتا تھا۔ وہ ایک کارخانہ میں رہا کرتے تھے جہاں آٹا لپستا تھا۔ ایک دفعہ میں ان کے لئے کپڑا لے گیا، دیکھا تو وہ وہاں موجود تھے۔ میں نے ان سے باتیں کیں اور وہ جواب دیتے رہے۔ اس کے بعد میں نے کہا میں آپ کے لئے یہ کپڑا لایا ہوں اس کو پہن لیجئے۔ فرمایا میں قبول نہیں کرتا اور اسے ہرگز نہ پہنوں گا۔ میری نیت ان کے لئے کپڑا لانے میں یہ تھی کہ حق تعالیٰ میری غلطی مراد پوری فرما دے۔ مگر بجز اللہ کے اس کی اطلاع کسی کو بھی نہ تھی۔ جب میں نے ان کا انکاری جواب سنا تو پھر عرض کیا کہ قبول فرما لیجئے مگر نہ مانے۔ کئی مرتبہ میں نے کہا اور وہ ہر مرتبہ انکار کرتے رہے۔ آخر فرمانے لگے کہ میں وہ کپڑا نہیں پہنا کرتا جو کسی حاجت کی غرض سے صدقہ کیا گیا ہو، اور میری حاجت بیان کر دی۔ میں صرت وہ کپڑا پہنتا ہوں جو فاضل اللہ نام کا ہو۔ غرض میں کپڑا وہیں چھوڑ کر چلا آیا اور کارخانہ والوں سے کہہ آیا کہ یہ ان کو پہنا دیجو۔ مگر معلوم ہوا کہ وہ یوں ہی پڑا رہا اور انہوں نے اسے پہنا نہیں۔ جب مخلوق کا یہ حال ہے کہ جو چیز غیر اللہ کے لئے ہو اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا تو کیا پوچھنا خالق سبحانہ کا تیر آپ نے فرمایا ایک عابد کو عبادت میں ولایت عطا کی گئی وہ استقامت کے مرض میں بیمار ہوئے۔ جب موت کے آثار نمودار ہوئے تو ان کے ہوش جو اس قائم تھے۔ کیونکہ اس مرض میں اکثر کپڑے کی طرح، مرتے وقت عقل اور ہوش قائم رہتا ہے۔ جب نزع کی تکلیف کو دیکھا اور علم ہوا کہ اس جیسی تکلیف عمر بھر کبھی پیش نہیں آئی تو ر موت کا یقین ہو کر، اللہ کا خوف لاحق ہوا اور لقاء رب کے رعب و درشت سے قلب لبریز ہو گیا۔ دفعۃً اپنی عبادت کثیرہ کا خیال آیا اور فرحت پیدا ہوئی کہ اس خوف کا عبادت سے مقابلہ ہو کر قلب میں اطمینان و سکون آیا۔ چونکہ اس نے عبادت پر اعتماد کیا اس لئے فوراً حق تعالیٰ نے عطا کردہ نعمت سلب فرمائی اور سلوب ہو کر اس کو موت آئی۔ نیز فرمایا اور جہنم میں اس جیسے عابد بہتیرے ہوں گے کہ اپنے عمل پر اعتماد کرنے کی وجہ سے حق تعالیٰ ان کو جہنم میں



داخل فرمائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ عبادت پر اعتماد وہی کرتا ہے جو احسب اور حفظ نفس کی نیت سے عبادت کیا کرتا ہے۔ اگر عبادت خالص اللہ کے لئے ہوتی تو اس یوم عظیم میں ضروران کو نفع دیتی۔ نیز فرمایا اور جو اللہ کے عارف اور اس کی شان الوہیت سے واقف ہیں ان کی عبادت محض اس کے وجود کریم اور ذات رفیعہ کی خاطر ہوتی ہے کہ بروئے اجلال و تعظیم اور ہدیت و توفیق اس کی عبادت کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ساری عمر بھی اگر اس کی عبادت کریں اور ہر وقت پیشانی رگڑتے رگڑتے پتھروں میں سوراخ بھی ڈال دیں۔ تو اس کے حقوق روبرو بیت میں کچھ بھی پورا نہ کر سکیں۔ پھر اپنے نفس کے لئے اجر کیسے مانگ سکتے ہیں جبکہ اجر کا طالب وہی ہو سکتا ہے جو سمجھتا ہو کہ حق پورا کرے گا اور مجھ پر جو ضروری تھا اس کو ادا کر چکا۔ اور عارفین کا تو یہ حال ہے کہ وہ (اذا حقوق میں بھی) اپنے آپ کو قاصر و مقصر سمجھتے ہیں کہ اللہ کے لئے کچھ کیا ہی نہیں۔ علاوہ ازیں ان کو مشاہدہ ہوتا ہے کہ (عبادت کا) جو فعل بھی ان سے صادر ہوا ہے درحقیقت وہ اللہ کی طرف سے ہوا ہے نہ کہ ان کی طرف سے۔ پھر دوسرے کے فعل پر اجر کس منہ سے مانگیں۔ میں نے عرض کیا کہ اس عابد سے سلب کیا چیز ہوئی؟ معرفت تو ظاہر ہے کہ کبھی ہی نہیں۔ کیونکہ اس کو معرفت نصیب ہوتی تو اپنے عمل پر اعتماد ہی نہ کرتا۔ اب سلب شدہ چیز یا ایمان ہو گا یا نیکیاں۔ فرمایا ہاں جو نیکیاں اس نے کی تھیں وہ چھین لی گئیں کیونکہ ان پر نظر کرتے سے ساری رحمتیں جو ان پر مرتب ہوئی تھیں زائل کر دیں اور ان تمامی حسنات کو گناہ اور سنیات بنادیا کہ ان پر جہنم میں عذاب کی سزا دی جائے گی۔ میں نے کہا کہ ان پر نظر کرنے کی سزا کے لئے اعمال ضبط کر لینا کیا کافی نہ تھا جو مزید برآں ان کو گناہ بھی بنادیا گیا؟ فرمایا ان پر نظر کرنے ہی نے تو ان کو گناہ بنایا۔ مثلاً اگر تم دیکھو نیزہ تمہاری طرف تھبکا اور وہ ضرور پہلو میں گھس جائے گا تو جس وقت تم ڈھال کے ذریعہ اس سے اپنا بچاؤ کرنا چاہو گے ظاہر ہے کہ اسی وقت کرو گے جبکہ تم کو اس کا پختہ یقین ہو گا کہ ڈھال میں نیزہ کی مار سے زیادہ فوت ہے حتیٰ کہ وہ نیزہ کو بھی روک سکتی ہے اور دوسرے ہتھیاروں کو بھی روک سکتی ہے۔ اور اگر تمہارے علم میں یہ ہو کہ ڈھال نیزہ کو روک نہیں کر سکتی تو کبھی اس کو سامنے نہ لاؤ گے اور اب صرف یہ کرو گے کہ پناہ مانگو گے نیزہ والے سے، اور گھسو گے انکی حمایت میں، اور طلب کرو گے اس کی رضا و خوشنودی کو کہ شاید رحم فرمائے اور اپنا نیزہ روک لے، پس یہی حال اس عابد کا تھا کہ جب اس نے اس خوف کا مقابلہ اپنی عبادت سے کیا اور قلب کو سکون ہو گیا اور دل میں خوشی و اطمینان آگیا تو یہ سب کچھ اسی بنا پر تو ہوا کہ وہ عبادت کو اللہ کے حق واجب سے زیادہ قوی اور قاطع سمجھتا تھا۔ کہ وہ اس کو بھی روک کر دے گی اور (عذاب و عتاب وغیرہ) دوسری چیزوں کو بھی روک دیگی اور یہ کھلی گمراہی ہے نیز ساری عبادتیں اور طاعتیں بلکہ تمامی شریعتیں حق تعالیٰ نے بندوں کے لئے صرف اس لئے تجویز فرمائی ہیں کہ



کلمہ توحید قائم ہو۔ اور مخلوق کے قلوب میں اپنے رب کی معرفت حاصل ہو۔ پس اگر (بندہ کو عبادت کرنے سے) معرفت حاصل ہو گئی تو مقصود حاصل ہو گیا۔ مگر جب معرفت ہی حاصل نہ ہوئی تو مقصود فوت ہو جاتا ہے۔ (یعنی عبادت اور طاعت) کا کچھ اعتبار نہیں (لہذا اپنا اجر و ثواب نہیں) اور معاصی کے حرام ہونے کی وجہ صرف یہی ہے کہ ان میں اللہ سے قطع تعلق۔ اور جب طاعتیں بندہ کا تعلق اللہ سے قطع کرنے لگیں تو ظاہر ہے کہ وہ معاصی ہیں لہذا وہ منافق کی عبادتوں کی طرح محض صورت طاعت ہیں مگر حقیقتہً معصیت ہیں۔ یہ مطلب طاعتوں کے معاصی بنانے کا جیسا کہ عکس اس کے اہل تعلق کی سیئات مبدل چنات ہو جائیں گی ایک شخص نے (محکمہ پولیس میں ملازمت کے متعلق جس میں عموماً ظلم و جور کرتا پڑتا ہے) آپ سے مشورہ کیا کہ اگر اس کو قبول نہ کروں تو مجھے جان کا خطرہ ہے (کہ سلطان ناراض ہو جائیں گے) فرمایا اہل ظلم میں ایسے لوگ بھی ہیں جن میں ایمان ہے اور ان کا قلب اللہ سے وابستہ ہے۔ اور ایسے بھی ہیں جو اللہ سے بے تعلق ہیں۔ اور اس کی علامت انقباض اور انبساط ہے کہ جو شخص (اس کام میں پڑ کر مفتیض اور مکدر رہتا ہو اور یہ بھی علم رکھتا ہو کہ میں اپنے رب کے حکم کی مخالفت کر رہا ہوں اور غیر اللہ کی اطاعت کر رہا ہوں تو یہ پہلی قسم میں داخل ہے کہ آخرت میں حساب کتاب اور عقاب و عتاب کے بعد نجات پا جائے گا اور اللہ سبحانہ اگر بالکل ہی معاف کر دے تو یہ بھی متوقع ہے۔ اور جو ان میں بحالت ظلم مسرور و فرحان اور اس کے قلب میں اطمینان و انبساط ہو کہ نہ ڈر ہے نہ حزن تو وہ دوسری قسم ہے کہ معصیت کو اور بندگان خدا پر ظلم اور زیادتی کو ایسا لذیذ سمجھتا ہے جیسے نجاست کا کیرا نجاست کو اور گندگیوں کو کھانے کو لذیذ سمجھتا ہے۔ نیز فرمایا کہ مومن کی مثال پرند کی سی ہے۔ اگر کسی گندی زمین پر اڑے گا تو منتصب ہوگا اور اپنے پروں کو سمیٹے گا اور اگر صاف ستھری زمین پر اترے گا تو منبسط ہوگا اور اپنے پروں کو پھیلائے گا اور روانہ کی تلاش میں سی کرے گا۔ نیز فرمایا کہ اہل انقطاع جب حرام اور ظلم سے درہم وصول کرتا ہے جن پر اللہ کا نام (کلمہ طیبہ کند) ہے اور کوئی اللہ والا اس سے پاس آکر کسی حیلہ سے مثلاً مانگ کر یا اور کسی تدبیر سے وہ درہم اس کے قبضہ سے نکال لیتا ہے تو اس نے اللہ کے محترم فرشتوں کو قید سے چھڑا لیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نام خدا کے ہر حرف پر ایک فرشتہ ہوتا ہے اور ہر اسم الہی پر وہ فرشتہ تعینات ہوتا ہے جس کو چالیس فرشتوں کی قوت دی ہوئی ہے توحید تک وہ درہم جن پر اللہ کا نام ہوتا ہے اس (ظالم) منقطع عن اللہ کے پاس رہتے ہیں تو ان فرشتوں میں سے ہر فرشتہ کی یہ حالت ہوتی ہے جیسے کسی پرند کو پکڑ کر اس کے بازو باندھ دیئے جائیں اور اس کا سر اس کے پروں کے نیچے کو نکال دیا جائے۔ لہذا جب کوئی اللہ کا نیک بندہ اگر کسی تدبیر سے ان کو لے لیتا ہے تو فرشتہ کو بڑی خوشی ہوتی ہے اور جو ضیق اس کو لاحق تھی وہ دور ہو جاتی ہے کیونکہ



زشتوں کو اہل انقطاع سے کراہت و گرائی ہوا کرتی ہے۔ چونکہ اس کمزور بندہ نے جو کمایا وہ اللہ سے غافل  
 ہو کر کمایا کہ اپنے آپ کو اللہ سے جدا کیا، اپنا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا، اپنی تدبیر پر نظر رکھی، اسی پر  
 عمل کیا، اور اپنا مطلب حاصل کرنے میں اپنی انتہائی کوشش صرف کر گزرا، اس لئے حق تعالیٰ نے بھی اس  
 کو اسی کے حوالہ کر دیا اور اس کو اغیار کا محسوس کرنے لگا۔ کہ گرمی و سردی کی تکلیف اس کو محسوس ہوتی ہے  
 اور زخم ہائے بدن اور قسم قسم کی اذیتیں اس کا دل دکھاتی ہیں۔ اور اگر یہ اپنے آپ کو اللہ سے علیحدہ نہ کرتا  
 اور اپنی باگ اپنے خالق کے ہاتھ میں دے دیتا اور اغیار سے قطع نظر کر کے اغیار کو دل سے مٹا دیتا تو لوہے کے  
 کانٹوں اور سلاخوں پر بھی چلتا تب بھی تکلف و درد محسوس نہ کرتا۔ نیز فرمایا کہ غفلت عن اللہ ہی کے سبب  
 بندہ پر راور و نواسی کا بڑا بوجھ ڈال گیا اور اس کو احکام کا مکلف بنا دیا گیا اور پیغمبروں کے ہاتھ شریعتیں بھی  
 گئی ہیں تاکہ وہ اس کو غفلت سے بچائیں۔ اگر یہ غفلت عن اللہ نہ ہوتی تو بشر بھی فرشتوں کی طرح (غیر مکلف)  
 ہوتے اور ان عظیم مشقتوں کے برداشت کرنے کی ان کو حاجت نہ ہوتی۔ اگر یہ غفلت عن اللہ نہ ہوتی تو جہنم بھی قطعاً  
 نہ ہوتی اور بندہ اپنے افعال کو اپنے رب کا پیدا کردہ سمجھتا اور اس کے نفس ہی نہ ہوتا جس کی نظر افعال پر جاتی  
 چہ جائیکہ ان کو اپنی طرت منسوب کرتا۔ اور جب اس کی یہ حالت ہوتی تو ہر وقت فانی ہوتا۔ پھر مکلف ہی  
 کیسے بنایا جاتا۔ نیز فرمایا کہ سب میں بڑا احمق وہ ہے جو فانی چیز یعنی دنیا اور اس کے متعلقات میں دوڑ دھوپ  
 کرے۔ اور سب میں بڑا عاقل وہ ہے جو باقی یعنی فانیات حق میں دوڑ دھوپ کرے۔ کیونکہ جب فانی میں  
 کھپ گیا تو کسی ایک نے بھی دوسرے کو نفع نہ پہنچایا۔ لیکن اگر فانی جذب ہو گیا باقی میں تو فانی بھی باقی  
 بن گیا نیز فرمایا لوگ کہتے ہیں کہ موت کی کوئی دوا نہیں۔ حالانکہ یہ غلط ہے اس کی دوا ضرور ہے۔ اور اس کی  
 دوا یہی ہے جو ہم نے بیان کی بجز اس کے کہ باقی کی طلب میں مرکبے، اس کی اور کوئی دوا نہیں ہے اس کے بعد  
 قسم کھائی اور بار بار قسم کھا کر یہی فرماتے رہے۔ اور فرمایا جب بندہ اللہ سبحانہ میں ظاہراً و باطناً پوری اور کامل  
 دوڑ دھوپ کرتا ہے تو نہ فنا ہوتا ہے نہ اس کو وہ موت آتی ہے جسے لوگ موت سمجھتے ہیں نیز فرمایا اکثر اہل دنیا  
 کی یہ حالت ہوتی ہے کہ جب مرتے ہیں تو خود ہی اپنے آپ کو غسل دیتے ہیں کہ تختہ پر نعش بھی بڑی نظر  
 آئے گی اور غسل بھی نظر آئے گا۔ حالانکہ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ اب ہم اس باب کو ایک عجیب حکایت  
 پر ختم کرتے ہیں جو ہم نے حضرت ممدوح سے سنی۔ اور اس کی صورت یہ پیش آئی کہ میں ایک دن تاکہ دنیا  
 فقیروں کی جو کہ قطع تعلقات کر کے پہاڑوں، غاروں اور حزیروں میں جا پڑے ہیں آپ سے تعریف کرنے اور کہنے لگا کہ وہ  
 تمام اغیار سے قطع تعلق کر کے خالص اللہ کے ہو رہے اور مجرد وکیو بن کر حق تعالیٰ کی عبادت میں لگ گئے  
 عوام بھی ان کی بڑی تعظیم کرتے اور ان کو زاہد اور بزرگ ترین مردم سمجھتے ہیں۔ فرمایا میں تمہیں ایک واقعہ



سنا تا ہوں اُسے غور سے سنو، اور میں اگر اس میں اپنی طرف سے کچھ بھی بڑھاؤں تو اللہ مجھ سے باز پرس فرمائے۔  
 میں نے عرض کیا معاذ اللہ اس کا تو ہمیں وہم بھی نہیں ہو سکتا فرمایا ایک روز باب الفتوح پر میں حضرت منصور  
 قطب کے پاس عید گاہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ لیک ایک سپہیں خیال ہوا کہ سمندر کے اُس جزیرہ میں جائیں جس کے  
 کنارہ پر شہر سلا بندر گاہ واقع ہے۔ چنانچہ ہم گئے اور دیکھا کہ بقدر ایک میل رقبہ کا جزیرہ ہے جس میں  
 شیریں پانی کے دو چشمے بہ رہے ہیں وہاں ہمیں ایک شخص خاص ملا جس کی عمر قریب چالیس سال ہوگی اور وہ اللہ کی عبادت  
 کر رہا تھا۔ نیز اس میں بڑے بڑے مکانات تھے جن کو پتھر کھود کر بنایا گیا تھا، اور مکانات کے وسط میں ایسی  
 چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں تھیں جیسے اندرون حمام ہوا کرتی ہیں۔ یہ ہمیں پتہ نہیں کہ وہ کس نے کھودے  
 اور بنائے تھے۔ کیونکہ وہ جگہ آبادی سے بہت دور ہے کہ وہاں کوئی پہنچتا بھی نہیں۔ کبھی کوئی کشتی  
 البتہ پہنچ جاتی ہے۔ نیز اس میں دو قسم کے درخت تھے ایک نوع جنکے پھل بادام کے مشابہ تھے اور دوسری  
 نوع کو اس درخت سے مشابہت تھی جس کا نام ہمارے ملک میں تغزاز ہے۔ البتہ طول میں اس سے کم تھا اور  
 اُس کے پتے چوڑے تھے اور ہمیشہ سبز رہتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اُس عابد کی غذا وہ پھل تھے جو بادام کی  
 مشابہ نوع میں لگتے تھے اور وہ سبز پتے تھے جو تغزاز کی مثابہ نوع میں نکلتے تھے۔ پھر ہم نے اس کے لباس  
 پر ٹالی تو اس درخت کی جو تغزاز کے مشابہ تھا پتلی پتلی شاخیں لے کر باہم گوندھ لیا اور لنگوٹ سا بنا کر کمر  
 میں باندھ لیا تھا۔ جس سے صرف ستر عورت ہو گیا تھا۔ باقی سارا بدن برہنہ تھا۔ ہم نے اس سے باتیں شروع  
 کر دیں اور پوچھا کہ تم اس مقام پر کتنی مدت سے ہو؟ اُس نے کہا تقریباً چالیس برس سے۔ میں نے  
 کہا تمہاری تو کل عمر ہی قریب چالیس کے معلوم ہوتی ہے پھر تم یہاں آئے کب تھے؟ کہا میں اپنے باپ کے  
 ساتھ آیا تھا اور اُس وقت میری عمر تقریباً پانچ برس کی تھی کہ چھوٹا بچہ تھا پھر قریب پچیس سال کے میں  
 اپنے باپ کے ساتھ رہا۔ آخر ان کا انتقال ہو گیا اور میں نے ان کو میری دفن کر دیا۔ ہم نے کہا کہ ان کی قبر ہمیں دکھاؤ  
 کہ زیارت کریں۔ چنانچہ اُس نے قبر دکھائی اور ہم نے سر حرم کے لئے دعاء مغفرت مانگی۔ پھر اس سے باتیں کرتے  
 لگے۔ چونکہ اس کا آدمیوں سے بہت کم ملنا ہوتا تھا اور بچپن ہی میں یہاں آگیا تھا اس لئے اس کی زبان بہت  
 بھاری تھی (کہ مشکل سے سمجھ میں آتی تھی) باتیں عربی میں کرتا تھا کیونکہ وہ اس قوم کا تھا جو تونس کے نواح  
 میں آباد ہے اور اس قوم کی زبان عربی ہے۔ چنانچہ ہم نے اس سے ایمان کے متعلق دریافت کیا تو معلوم  
 ہوا کہ وہ اللہ کو پہچانتا ہے مگر جہت کا معتقد تھا کہ اللہ آسمان پر ہے، اس سے ہم نے اس کو منع کیا  
 اور امر حق بتایا کہ وہ ہر جگہ ہے اس کے لئے کوئی جہت معین نہیں) یہ نیز ہم نے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
 سے بھی واقف پایا اور اس سے بھی کہ آپ سید الاولین والآخرین ہیں نیز حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ



اور حضرت فاطمہ بنت رسول سے بھی واقف تھا۔ ان کے فرزند حضرت حسن کی بابت ہم نے سوال کیا تو معلوم ہوا ان سے واقف نہیں ہے۔ پھر ہم نے ماہ رمضان کے متعلق دریافت کیا تو اس سے بھی ناواقف پایا۔ ہاں اس کے بیان سے معلوم ہوا کہ تیس دن کے روزے رکھا کرتا ہے۔ مگر سال کے اندر متفرق ایام میں۔ چنانچہ رمضان کے روزوں کی فرصت سے ہم نے اُسے آگاہ کیا اور معین کر کے بتایا کہ سال میں ماہ رمضان کو نسا ہے۔

پھر ہم نے پوچھا قرآن مجید میں کچھ یاد ہے؟ معلوم ہوا کچھ یاد نہیں بجز اس کے الحمد للہ رب العالمین الرحمن الرحیم الذین العزت علیہم اتنی مقدار اور اسی طرح غلط اس کو یاد تھا۔ ہم نے پوچھا تمہاری عبادت کیا ہے؟ کہنے لگا کہ اللہ کے لئے رکوع و سجدہ۔ ہم نے کہا کسی وقت سوتے بھی ہو؟ کہا ہاں سوچا دو بتے وقت سوتا ہوں، اس وقت تک کہ خوب اندھیرا ہو جائے۔ باقی سارے وقت میں رکوع اور سجدہ کرتا رہتا ہوں۔ میں نے کہا کیا بلاد اسلام کی طرف چلنے اور ان میں رہنے پہنچنے کو جی چاہتا ہے کہ ان کا دین بھی وہی ہے جو تمہارا دین ہے اور جس نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر تم ایمان لائے ہو اسی پر وہ بھی ایمان لائے ہیں۔ کہا ہاں میں بھی مسلمان ہوں منجملہ مسلمانوں کے مگر میں اپنی اس جگہ سے نکلنا نہیں چاہتا حتیٰ کہ یہیں موت آجائے۔ ہم دیکھتے تھے کہ جب باتیں کرتے ہوئے خطاب کے وقت ہم ذرا اس کے قریب جاتے تو وہ ہم سے بھاگتا تھا، اس لئے کہ آدمیوں سے اس کو اُفسیت دھتی۔ وہ ہماری غذا میں نہیں کھا سکتا تھا اور اس کا معدہ اسے برداشت بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ مدت سے دوسری غذا کا عادی تھا۔ پھر ہم نے دیکھا کہ کہ قریب ڈیڑھ پاؤ وزن کے ریال (نقرئی سک) اس کے پاس ایک طرف پڑے ہیں جن میں چند طلائی مثال (دینار) بھی تھے۔ ہم نے کہا کہ یہ تمہارے پاس کہاں سے آگئے؟ کہنے لگا کبھی کسی وقت کشتی والے اس جزیرہ میں آجاتے ہیں اور مجھے دیکھ کر مجھ سے دعا و خیر کے خواستگار ہوتے ہیں اور بطور تبرک و زیارت کے یہ ریال اور دینار دے جاتے ہیں۔ میں ان کو دعا دیتا ہوں اور وہ واپس چلے جاتے ہیں۔ ہم نے کہا یہ ریال اور دینار ہمیں دیدیں آپ نے لئے تو بیکار ہیں، نہ تمہیں کوئی مکان تعمیر کرنا ہے، نہ نکاح کی ضرورت ہے، اور نہ کپڑے بنانے ہیں اور یہی ان کے خرچ کرنے کی ضرورتیں ہوتی ہیں لہذا ہمیں تو ان کی ضرورت ہے اور تمہیں ان کی کیا ضرورت ہے۔ کہنے لگا میں اپنے درہم تو تمہیں دوں گا نہیں۔ غرض ہم دیر تک اس کے پاس بیٹھے کہ اس کو احکام شرعیہ بتاتے اور سکھاتے رہے۔ اس کے بعد رخصت ہوئے اور چلے گئے۔ جب اس نے ہمیں دیکھا کہ سطح آب پر پاؤں سے چل رہے ہیں اور وہ بتے نہیں تو ہم سے اللہ کی پناہ مانگنے لگا اور ہمارے متعلق یوں سمجھا کہ شیاطین ہیں نیز فرمایا وہ اب تک یعنی ماہ شعبان ۱۲۹ھ تک بقید حیات اسی جزیرہ میں موجود رہے۔ ۱۲ صاحب کتاب کہتے ہیں کہ اس قصہ میں چند نصیحتیں ہیں۔ اول تنبیہ ہے اس



اُس نعمت پر جو مومنین کی مخالطت اور مسلمانوں کے ساتھ رہنے سہنے سے حاصل ہوتی ہے کہ اس کی وجہ سے ہمیں احکام شرعیہ کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کی سیرت نبویہ اور سیرت صحابہ کی واقفیت ہوتی ہے اور یہ کہ آپ کا زمانہ اور آپ کے صحابہ کا زمانہ کیسا تنہا غرض وہ باتیں معلوم ہوتی ہیں جن سے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے چنانچہ اس شخص کو مخالطت مسلمان نصیب نہ ہوئی تو احوال مذکورہ کی معرفت بھی نصیب نہ ہوئی حتیٰ کہ میں نے حضرت ممدوح سے عرض کیا اس کے باپ نے اس کو بڑا نقصان پہنچایا کہ اس کو جزیرہ میں لا ڈالا۔ اور اہل اسلام سے اس کو حبس کر دیا۔ اگر ان کے پاس اس کو رہنے دیتا تو اس کے لئے بہتر اور نہایت مبارک ہوتا۔ فرمایا سچ کہتے ہو۔ اس سے قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے مومنین کی اگرچہ مستی و معصیت ہی کیوں نہ ہوں کیونکہ احکام شرعیہ کی برابر کوئی چیز نہیں بن سکتی۔ مسلمانوں کی مخالطت حتیٰ کہ بازاروں میں ان کے اڑھام سے غلط ملط بھی بھی قابل شکر نعمت ہے اور مواقع خیر میں تو کھچا چچی کا پوچھنا ہی کیا۔ اسی لئے شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ فرماتے ہیں کہ مومنین کے چہروں پر نظر ڈالنے سے بھی ایمان میں ترقی ہوتی ہے دوم اللہ کی نعمتوں سے واقفیت کہ کھانے میں، پینے میں، لباس میں، سونے میں، آرام کرنے میں، نکاح میں، توالد و تناسل میں، غرض ہر صورت میں حق تعالیٰ نے ہمیں وہ نعمتیں عطا فرمائی ہیں، جن سے وہ عابد تارک الدنیا محروم رہا۔ اگر اہل اسلام کے ساتھ رہتا سہتا تو وہ بھی ان نعمتوں سے مستمتع ہوتا اور اللہ کا شکر ادا کرتا۔ کیا عجب تھا کہ ان نعمتوں پر شکر کرنا جزیرہ میں اس کی عمر بھر عبادت کرنے کے برابر ہو جاتا۔

سوم اکثر لوگوں کو بن باسی فقیروں اور اہل خلوت و ریشوں کے معاملہ میں دھوکا ہوتا ہے کہ وہ ان کے کمال کا اعتقاد رکھتے اور یوں سمجھتے ہیں کہ جس درجہ پر یہ پہنچتے ہیں لوگوں میں جا ملے جلے ادبیاء عارفین دنیا نہیں پہنچ سکتے۔ حالانکہ حضرت ممدوح فرمایا کرتے تھے کہ میں اکثر اُن انوار پر نظر ڈالتا ہوں جو ذات بنی آدم سے نکل کر سبز رخ سے جا ملے ہیں۔ وہ رقت اور غلیظ میں مختلف ہیں کہ کوئی باریک و پست لاپے اور کوئی موٹا اور غلیظ) اور رقت دلالت کرتی ہے ضعف ایمان پر اور غلیظ دلالت کرتا ہے قوت ایمان پر پھر میں ان عابدین کی طرف نظر کرتا ہوں جو غاروں اور بنوں میں رہتے ہیں تو اُن کے انوار پر اکثر پر اکثر رقت ہی کو غالب دیکھتا ہوں بجز خال خال کے۔ اور عوام مومنین پر نظر ڈالتا ہوں تو ان کے انوار ان تارک الدنیا فقیروں سے زیادہ اچھی حالت میں دیکھتا ہوں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام کا اعتماد اللہ کے فضل پر ہوتا ہے کہ اپنی عملی کوتاہیاں دیکھ کر نجات میں اللہ کے کرم بھی پر نظر جاتی ہے) اور عبادت گزاروں کا اعتماد اکثر اپنی عبادتوں پر ہوا کرتا ہے نیز فرمایا عابد کو اس کی عبادت کے ذریعہ نجات نہیں مل سکتی جب تک کہ باطن اس کو اپنے رب کی طرف سے نہ سمجھے۔ اور اس کا یہ خیال و فکر دائمی ہو



اگر فلا بھی یہ اس کے دھیان سے ہٹ گیا تو سلامتی کی بہ نسبت ہلاکت اس کے زیادہ قریب ہے۔

عرض حضرت سے یہ قصہ سکران نعمتوں کو یاد کر کے جو حق تعالیٰ نے ہم پر فرمائی ہے اور ہم ان سے غافل ہیں مجھے بڑی رقت اور شان خضوع نصیب ہوئی۔ اس کے بعد میں نے حضرت سے عرض کیا آپ اس شخص کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے کیوں نہ آئے کہ جزیرہ سے نکل کر اسلامی شہروں میں کسی بستی کے اندر رہتا اور (دنیوی) راحت بھی پاتا اور (آخرت کے متعلق) حق تعالیٰ کی رحمت بھی اس پر برسنی۔

فرمایا حق تعالیٰ نے اس کا قیام اس جگہ جو بیز فرمایا جو شخص سطح زمین کی عجائبات پر نظر کرے تو اللہ کی وحدانیت معلوم کرنے کے لئے یہی کافی ہے، دوسری کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ایک سطح زمین پر صد ہا مختلف اقسام کی مخلوقات اس کو مجتمع نظر آئے گی۔ بعض ان میں اہل عقل ہیں اور بعض دیوانے اور پاگل کوئی خوش حال ہے کوئی محروم و مفلوک الحال۔ کوئی کسی کو قتل کر رہا ہے اور کوئی کسی پر ترس کھا رہا ہے کسی کے تفکرات امور دنیا میں دوڑ رہے ہیں، کسی کے خیالات معاملات تجارت میں، اور کسی کے اپنے پڑوسیوں میں۔ کوئی شخص علمی امور میں غرق ہے اور کوئی امور آخرت میں۔ میرے شیخ حضرت عمر بن محمد ہواری نے ایک دن فرمایا کہ میں جمعرات کے دن باب المحرق پر بیٹھا ہوا سداڑھ سے باہر نکلنے والوں کے باطن پر نظر ڈال رہا تھا چنانچہ ایک شخص نکلا اور اس کے باطن کو دیکھا تو بجز فلال مجبورہ کے منکر و خیال کے اس میں کچھ نہ تھا۔ یہی تفکر اس پر مسلط تھا کہ وہ کیونکر ہاتھ لگے اور کیا تدبیر کر دوں اس کو پانے کی پھر دوسرا نکلا اور اس پر نظر تو اس کا قلب بھی پہلے شخص کی طرح تھا بجز اس کے کہ اس کے فکر کا تعلق (عورت سے نہیں بلکہ) لڑکے کے ساتھ تھا۔ پھر تیسرا آیا تو اس کا قلب دنیا سے وابستہ تھا اور اسی کے منکر میں غرق تھا کہ دوسری بات کا ہوش ہی نہ تھا۔ پھر چوتھا نکلا تو اس کا منکر دار آخرت اور اس کے معاملات میں دوڑ رہا تھا اور اتنا غائب آگیا تھا کہ بدن پر ظاہر ہو گیا تھا۔ پھر چھٹا نکلا تو اس کا قلب مسلم اور اس کے بڑھنے کی محبت سے معمور تھا کہ بجز اس کے دوسری چیز اس کے خیال میں نہیں آتی تھی۔ پھر ساتواں نکلا تو اس کا فکر سواری اسپ میں غرق تھا اور اتنا غائب آگیا تھا کہ باقی سب کچھ بھلا دیا تھا۔ پھر آٹھواں نکلا تو اس کا فکر کھیتی کی محبت میں ڈوبا ہوا تھا کہ اس کے سوا کسی سعی اور تدبیر کا خطرہ بھی نہ گذرتا تھا۔

پھر نواں نکلا تو اس کا منکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے معمور تھا اور اس کا اتنا

غلبہ تھا کہ احوال محمدیہ کے سوا دوسری طرف اس کا خیال جاتا۔ ہچا نہ تھا۔

بس یہی دھیان تھا کہ لعنت سے پہلے آپ کے کیا حالات تھے اور لعنت کے بعد کیا تھے پھر نزول وحی کے بعد



آپ کے کیا احوال تھے۔ مکہ میں آپ کی سکونت کس طرح رہی، اور مدینہ میں کس طرح رہی۔ پھر سوال نکلا تو اس کا قلب اللہ رب العالمین اور خالق الکل اجمعین کی محبت سے لبریز تھا کہ کبھی اس کی عظمت و جلال اور تقدس و تنزہ میں جولانی کرتا تھا اور کبھی اس کی صفات کمالیہ میں حضرت عمر بن محمد نے فرمایا کہ اس کے بعد میں نے اس امر باطن پر نظر ڈالی جو ان سب میں حاکم اور ارادۃ الہیہ سے ناشی تھا تو میں نے ان کے بواطن میں ایسا پایا جیسے ایک رستی ان کو اس کام کی طرف کھینچنے لگے جا رہی ہے جس کا حق تعالیٰ نے ان میں ارادہ فرمایا ہے مگر وہ اس سے بیخبر ہیں کہ فعل کو اپنی طرف سے اور اختیار کو اپنے حوالہ سمجھ رہے ہیں۔ یہ سنکر تجھے بڑی عبرت ہوئی اور میں نے کہا بیشک کوئی معبود و متصرف نہیں بجز اللہ کے لاریب ملک میں اس کا کوئی شریک نہیں اور بلاشبہ وہ کرتا ہے جو چاہتا ہے اور حکم دیکر کرتا ہے جو بھی ارادہ فرماتا ہے۔ اس کے حکم کا کوئی بدلہ لینے والا نہیں اور وہ سرلیح الحساب، مخلوق بڑی عظمت میں ہے (فص)، بدن میں آنکھ کان ناک ہاتھ پاؤں مختلف اعضاء ہیں جن میں نقطہ روح کا فرمایا ہے کہ ہر عضو سے جدا کام لے رہی۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے آنکھ دیکھ رہی ہے کان سن رہا ہے ناک سونگھ رہی ہے ہاتھ چل رہے ہیں، پاؤں چل رہے ہیں، مگر دفع میں یہ سب کام روح کو رہا ہے اور اعضاء اس کے لئے صرف آلہ اور محل بنے ہیں۔ یہ کام بالذات اگر ان اعضاء کے ہوتے تو روح کے نکل جانے پر جبکہ کسی عضو میں کوئی فرق نہیں آیا ہے وہ معطل و بیکار نہ بن جاتے باہیں ہمہ بُرا بھلا جو بھی اثر مرتب ہوتا ہے اور اعضاء ہی پر ہوتا ہے کہ ہاتھ سے بے احتیاطی ہوتی ہے تو وہی کٹتا ہے اور آنکھ اگر بد پرہیز بنتی ہے تو وہی پھوٹتی ہے اسی طرح تمامی مخلوقات بمنزلہ اعضاء کے ہے اور ارادہ الہیہ بمنزلہ روح کے کہ وہی ہر ایک سے جدا کام لے رہا ہے اور پھر وہی صادر ہوتا ہے جس کے لئے مشیت الہیہ نے اس کو تجویز فرمایا اور بنایا، باہیں ہمہ افعال و اعمال کے حسن و قبح کا اثر ان ہی پر پڑتا ہے اور محل سزا و جزا وہی قرار پاتے ہیں۔ اس کو خوب سمجھ لو کہ طبیعت اکثر اس میں شبہات کیا کرتی ہے فے نیز فرمایا دو شخص ایک جگہ پر گزرتے ہیں اور چہ قدم بھی چلنے نہیں پاتے کہ ایک کی مغفرت ہو جاتی ہے میں نے عرض کیا کہ اس کی وجہ کیا؟ فرمایا صرف اس کی واقفیت کہ اللہ کی مخلوقات میں غور فکر کس طرح کرنا چاہیے۔ اور دوسرا شخص جو اس کے ساتھ چل رہا ہے اس سے غافل اور اس کو بھولا ہوا ہے (لہذا وہ مغفرت سے نوازا گیا) بس یہ ہے صورتیں بندوں پر اور ان کے افعال و بظلمتوں اور انوار کے داخل ہونے کی۔ اور اس سے قبل تعبیر خواب کے باب میں جو ظلمتوں کے وہاں درجاست ہم بیان کر آئیں ہیں یعنی سہو مکروہ۔ سہو حرام، عمدہ مکروہ، عمدہ حرام عقیدہ حقیقیہ میں جہل بسیط۔ اس کا جہل مرکب عقیدہ ثقیفہ میں جہل بسیط اس کا جہل مرکب بارگاہ محمدی میں جہل بسیط اور جہل مرکب ان دسوں کے ساتھ ان ابواب ظلام کو بھی شامل کر دو تو ایک بڑی معرفت تم کو حاصل ہوگی واللہ الموفق للسداد واللہ اعلم۔



بسم اللہ الرحمن الرحیم  
حمد و نسی علی رسولہ الکریم

## چوتھا باب دیوان صاحبین (یعنی اہل تصرف اقطاب بدال کی مجلس) کا بیان

شیخ فرماتے تھے کہ یہ دربار عسار حرامیں ہوتا ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبل رسالت عبادت فرمایا کرتے تھے۔ غوث تو غار سے باہر بیٹھتا ہے کہ مکہ اس کے داہنے شانہ کے پیچھے ہوتا ہے اور مدینہ بائیں گھٹنے کے سامنے۔ چار قطب اس کی دائیں جانب ہوتے ہیں اور وہ مالکی المذہب ہیں۔ اور تین قطب اس کی بائیں جانب کہ ہر مذہب باقیہ کا ایک ایک ہے اور وکیل سامنے ہوتا ہے۔ جس کا نام قاضی محکمہ ہے اور اس وقت وہ بھی مالکی مذہب ہیں۔ خاندان بنی خالد کے جو کہ نواح بصرہ میں رہتے ہیں۔ ان کا نام محمد بن عبد الکریم بصر اوی ہے اور غوث وکیل ہی سے گفتگو کرتا ہے اور اسی لئے اس کا نام وکیل رکھا گیا ہے کہ وہ تمامی مجلس کی طرف سے قائم مقام اور نائب ہوتا ہے تصرف کا تعلق اقطاب سے مگر غوث کے حکم کے موافق۔ ساتواں اقطاب میں ہر قطب کے ماتحت ایک مخصوص مدد ہے جو اس کی ماتحتی میں تصرفات کرتے ہیں اور وکیل کی پشت کی جانب چھ صفیں ہیں جن کا دائرہ چوتھے قطب سے شروع ہو کر بائیں جانب کے اقطاب ثلاثہ پر ختم ہوتا ہے۔ سات اقطاب اس دائرہ کے اطراف بنتے ہیں اور یہ پہلی صف ہے۔ پھر اس کے پیچھے اسی طرح پر دوسری صف دائرہ بنا ہوتی ہے اور پھر تیسری اور چوتھی اور پانچویں چھٹی۔ مجلس میں مستورات بھی شریک ہوتی ہیں مگر ان کی تعداد کم ہے۔ اور ان کی تین صفیں ہوتی ہیں ان کی نشست گاہ دائرہ صف اول سے اوپر بائیں جانب کے اقطاب ثلاثہ کی جانب اس حصہ میں ہوتی ہے جو غوث اور اقطاب ثلاثہ کے درمیان خالی ہوتا ہے بعض کا ملین اموات بھی اس میں شریک ہوتے ہیں اور احواء کے ساتھ ہی صفوں میں بیٹھتے ہیں صرف عین باتوں سے ان کی شناخت ہوتی ہے ایک یہ کہ ان کی شکل اور وضع میں کبھی تغیر نہیں ہوتا بر خلاف احواء کے کہ کبھی ان کا سر منڈا ہوتا ہے کبھی کپڑے بدے ہوئے ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مگر اموات اولیاء کی حالت میں تبدیل نہیں ہوتی۔ پس اس مجلس میں جب ایسے شخص کو دیکھو کہ اس کی وضع میں تغیر نہیں ہوتا تو سمجھ لو کہ وہ اموات میں سے ہیں مثلاً ہمیشہ ان کا سر منڈا ہوا دیکھو کہ بال بڑھتے ہی تو سمجھ لو کہ اسی حالت پر ان کی وفات ہوئی تھی۔ یا سر پر بال دیکھو مگر ایک حالت پر کہ نہ بڑھتے ہیں نہ گھٹتے ہیں اور نہ منڈتے ہیں تو سمجھ لو کہ یہ اموات میں ہیں اور اسی حالت پر انتقال ہوا تھا۔ دوم یہ کہ عالم احواء کے متعلق ان سے مشورہ نہیں لیا جاتا صرف عالم اموات کے متعلق مشورہ لیا جاتا ہے



نیز آپ نے فرمایا زیارۃ قبور کے آداب میں سے ہے کہ زائر جب کسی مُردہ کے لئے (مغفرت وغیرہ کی) دعا مانگے اور قبولیت دعا کے لئے کسی ولی کا توسل لائے تو متونی ولی کا توسل لائے کیونکہ مراد پوری اور دعا قبول ہونے میں اس کو زیادہ دخل ہے سوّم یہ کہ اموات کا سایہ نہیں ہوتا۔ یعنی تمہارے اور سورج کے درمیان اگر میت کھڑا ہوگا تو اس کا سایہ نہ دیکھو گے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی روح سے حاضر مجلس ہوتا ہے نہ کہ ترابی ذات غائیبہ سے، اور ذات روح میں نہ ثقل ہے نہ کثافت بلکہ نور کی طرح ہلکی و شفاف ہے لہذا اس کے سایہ نہیں) آپ نے فرمایا اکثر میں اس مجلس دیوان یا اولیا کی کسی دوسری مجلس میں جاتا ہوں اور دھوپ نکلی ہوتی ہے اور وہ مجھے دور ہی سے دیکھ کر استقبال کرتے ہیں۔ تو میں اپنی ان ہی آنکھوں سے یہ دیکھ کر ان میں (زندہ اور مُردہ ولی کا) فرق کر لیتا ہوں کہ اس کے سایہ ہے اور اس کے سایہ نہیں۔ نیز آپ نے فرمایا دیوان میں حاضر ہونے والے اموات عالم برزخ سے اُترتے اور وحی پر دراز سے یہاں تک آتے ہیں مگر جب محل دیوان کے قریب پہنچتے ہیں تو زمین پر اپنے پاؤں سے چلتے ہوئے مجلس تک آتے ہیں بوجہ احیاء کے ادب و احترام اور ان سے خوف و ہیبت کے اور یہی حال رجالِ عِزب کا ہے کہ جب ایک دوسرے سے ملنے آئیں گے محروم سے چل کر آئیں گے مگر جب اس جگہ کے قریب پہنچیں گے تو براہِ ادب و خوف اپنی ذاتِ ثقیلہ (یعنی جسمِ ترابی) سے چسبیں گے نیز آپ نے فرمایا کہ اس مجلس میں ملائکہ بھی آتے ہیں مگر وہ تمام صفوں سے پیچھے ہوتے ہیں اور کالمین جنات بھی شریک ہوتے ہیں جن کا نام روحانیوں ہے اور وہ سب کے پیچھے بیٹھتے ہیں مگر ان کی پوری ایک صف بھی نہیں ہوتی۔ ملائکہ اور جنات کے شریک ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ اولیاء دیوان (اہل خدمت) کو وہ کام بھی انجام دینا پڑتے ہیں جن تک ان کی ذات پہنچ سکتی ہے اور وہ کام بھی انجام دینا پڑتے ہیں جن کی ان کی ذات تک نہیں پہنچ سکتی۔ لہذا جن امور تک ان کی ذات نہیں پہنچ سکتیں (اور وہ ان کی بشری طاقت سے بالا ہیں) تو ان میں فرشتوں اور جنات سے مدد لیتے ہیں فرمایا کہ کبھی کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس مجلس میں شرکت فرماتے ہیں اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں تو غوث کی جگہ تشریف رکھتے ہیں۔ غوث وکیل کی جگہ بیٹھتا ہے اور وکیل پیچھے صف میں آجاتا ہے اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں تو آپ کے ساتھ وہ انوار آتے ہیں جن کے برداشت کی کسی میں طاقت نہیں۔ اور وہ انوار جلا دینے والے گہرا دینے والے ہوتے ہیں، فوراً قتل کر دینے والے وہ انوار ہیبت و جلالت و عظمت کے ہیں حتیٰ کہ فرشتے و چالیس آدمی ایسے ہوں جو شجاعت کے انتہائی درجہ پر پہنچے ہوئے ہوں اور ذمّہ یہ انوار ان کے سامنے آجادیں تو یقیناً وہ سب یکدم بے ہوش ہو کر گر پڑیں مگر حق تعالیٰ اپنے اولیاء و اہل مجلس، کو ان انوار سے



مستفیض ہونے کی قوت عطا فرمادیتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے بہت ہی کم اہل مجلس ہوتے ہیں جو ان معاملات کو محفوظ رکھ سکتے ہیں جو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی کے وقت طے ہوتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو غوث سے ہوتی ہے اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غیبت کے وقت غوث کے لئے مافوق العادہ اقرار ہوتے ہیں کہ اہل مجلس غوث کے قریب بھی نہیں جاسکتے بلکہ دور بیٹھتے ہیں پس جو امر اللہ جل جلالہ کی طرف سے نازل ہوتا ہے اس کی طاقت تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے سوا کسی میں نہیں مگر جب وہ امر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے چلتا ہے تو اس کی برداشت بجز غوث کے دوسری کوئی ذات نہیں کر سکتی پھر غوث کی طرف سے وہ امر ساتوں اقطاب پر پھیلتا ہے اور ساتوں اقطاب کے تمامی اہل مجلس پر۔ اس مجلس کا وقت وہی ساعت ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ ہوئی۔ کھلی، یعنی رات کا آخری تہائی حصہ جو قبولیت دعا کا وقت ہے چنانچہ حدیث میں آیا ہے ہر شب میں ہمارا رب آسمان دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے جبکہ رات کا آخری تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے پس فرماتا ہے کوئی جو مجھ سے دعا مانگے پس میں قبول کروں الخ۔ جامع کتاب لکھتے ہیں کہ جو شخص اس ساعت نیک کو حاصل کرنا چاہے وہ سوتے وقت سورہ کہف کی آخری آیت ان الذین امنوا سے تا آخر پڑھ کر دعا مانگے کہ بارہا مجھے وقت مذکورہ میں بیدار فرما دیجو تو وہ ضرور اس وقت جاگ اٹھے گا شیخ عبدالرحمن ثعالبی نے اس کو بیان کیا ہے اور ہم نے بھی بے شمار دفعہ اس کو آزمایا اور دوسروں نے بھی اس کا بارہا تجربہ کیا ہے حتیٰ کہ اکثر ایسا ہوا متعدد آدمیوں نے یہ آیت پڑھ کر اس وقت پر جاگنے کی دعا مانگی اور ایک کو دوسرے کی نیت کا علم بھی نہ تھا مگر جب آنکھ کھلی تو سبکی ایک ہی وقت کھلی۔

نیز آپ نے فرمایا کہ مجلس دیوان پہلے حضرات ملائکہ سے آیا و کھلی مگر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سجدے ہوئے تو یہ مجلس اس امت کے اولیاء سے آباد ہونے لگی۔ اس سے ظاہر ہوا کہ وہ ملائکہ اولیا رات محمدیہ کے نائین تھے۔ چنانچہ ہم نے دیکھا کہ جب کوئی ولی دنیا میں آیا اور حق تعالیٰ نے اس کو فتح نصیب فرما کر اہل دیوان بنایا تو وہ صفت اول میں یا جہاں بھی اس کی جگہ تھی آکر بیٹھا اور وہ فرشتہ جو اس جگہ بیٹھا کرتا تھا آسمان پر چڑھ جاتا تھا۔ پھر جب دوسرا ولی ظاہر ہوا تو وہ اپنی جگہ پر آکر بیٹھا اور اس جگہ کا فرشتہ آسمان پر چڑھ گیا۔ عرض دیوان کی یہ ابتداء کھلی حتیٰ کہ محمد اللہ وہ مکمل ہو گیا کہ ولی ظاہر ہوتا رہا اور فرشتہ اٹھتا اور آسمان پر چڑھتا رہا اب وہ ملائکہ جو باقی ہیں اور چہیوں صفوں کے پیچھے بیٹھتے ہیں وہ اہل دیوان نہیں بلکہ ذات محمدی کے وہ فرشتے ہیں جو دنیا میں ذات شریفہ کے محافظ تھے اور چونکہ ذات محمدی کا نور اہل دیوان میں پھیلا ہوا ہے اس لئے نور شریف کے ساتھ ذات شریفہ کے فرشتے موجود رہتے ہیں۔ اور جب



آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دیوان میں تشریف لاتے ہیں اور آپ کے ساتھ ناقابل برداشت اوار  
آتے ہیں تو فرشتے جواہل دیوان کے ساتھ تھے بڑی سرعت کے ساتھ نور محمدی میں سما جاتے ہیں جب تک  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دیوان میں تشریف رکھتے ہیں ان میں کا کوئی فرشتہ بھی نظر نہیں آتا اور جب آنحضرت  
صلی اللہ علیہ وسلم دیوان سے تشریف لے جاتے ہیں تو وہ فرشتے اپنی اپنی جگہ پھراکھڑے ہوتے ہیں۔

ہر شہر و بستی میں ستیاکم زیادہ فرشتوں کی تعداد اہل تصرف اولیاء کی ان کاموں میں مدد کرنے کے لئے  
موجود رہتی ہے جو ذات ولی کی طاقت سے باہر ہوتے ہیں اور یہ لہستوں کے ملائکہ انسانی شکل میں ہوتے ہیں  
کہ کسی کو خواجہ کی صورت میں دیکھو گے کسی کو فیروز کی صورت میں اور کسی کو نور محمدی کی صورت میں غرض ملے چلے  
رہتے ہیں مگر لوگوں کو اس کا پتہ نہیں چلتا۔ پھر شیخ نے اس بارہ میں چند حکایتیں سنائیں جن کے اسرار  
کی کیفیت نہ بیان ہو سکتی ہے نہ برداشت ہو سکتی ہے اور اس کے بیان فرمانے کا سبب یہ ہوا کہ میں ایک  
مرتبہ بعض ماضین سے کہنے لگا اہل اللہ کہتے ہیں جو شخص بخاری شریف کا کوئی پارہ لے کر کسی ولی کے مزار  
پر جائے اور اس کو کھول کر اس کے راویان حدیث اور اس ولی کے وسیلہ سے دعا مانگے تو اس کی مراد پوری  
ہوتی ہے خصوصاً بخاری شریف کا پارہ اخیر۔ اس کے بعد میں حضرت مدوح سے پوچھنے لگا کہ یہ صحیح  
ہے یا غلط؟ آپ نے فرمایا کہ ہر شہر میں ملائکہ کی ایک خاص تعداد ہوا کرتی ہے۔ اور جب وہ کسی بندہ کو اللہ  
سے کوئی چیز مانگتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اگر نوشتہ تقدیر کی موافقت پاتے ہیں تب تو سائل کو سوال پر قائم  
رکھتے اور اس کے ساتھ لگ لیتے ہیں کہ ان کی برکت سے، توفیق اس کے شامل حال اور شیطان راستہ  
سے علیحدہ ہو جاتا ہے اور اگر دیکھتے ہیں کہ مراد کا ملنا مقرر نہیں ہے تو سائل کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اور  
شیطان اس کو آچٹتا ہے۔ چنانچہ جب وہ بخاری شریف کا کوئی پارہ لئے ہوئے کسی کو دلی کے مزار  
کی طرف جاتا ہوا دیکھتے ہیں اور اس کی مراد کو پورا ہوتا ہوا (روح محفوظ میں) پاتے ہیں تو اس کو عزم  
پر قائم رکھتے ہوئے اس کے قلب میں گڑ گڑاہٹ اور عرض مطلب میں بیچارگی و شکستگی ڈالتے اور بونے  
مزار اس کے ساتھ اس طرح جاتے ہیں کہ وہ شخص جزو بخاری کا جسم لئے ہوتا ہے اور یہ حضرات اس کے  
اسرار اٹھاتے ہوئے ہیں۔ اور جب وہ مزار پر پہنچے، دعا مانگتا ہے تو یہ آمین کہتے رہتے ہیں حتیٰ کہ اس کی  
مراد پوری ہو جاتی ہے اور اگر دیکھتے ہیں کہ حاجت (مقتضا و تقدیر) پوری ہونے والی نہیں ہے تو کتاب کے  
اسرار نکال لیتے ہیں۔ لہذا سائل صرف جسم کتاب لئے ہوئے مزار پر جاتا ہے اور راستہ میں شیطان و وسوسہ  
تشویش لئے ہوئے اس سے آملتا ہے چنانچہ دعا و میں حلاوت باقی نہیں رہتی اور اس لئے دعا  
اس کی رد ہو جاتی ہے، میں نے پوچھا کہ وہ اسرار کیا ہیں جو جرم کتاب سے زائد ہوتے ہیں؟



فرمایا اور وہ اسرار کیا ہیں جن کی وجہ سے شہد کو رال سے امتیاز ہے؟ میں نے کہا وہ تو مٹھا س ہے فرمایا  
ایک امر زائد ہی تو ہے جرم شہد پر۔ میں نے عرض کیا جی ہاں فرمایا اسی طرح ہر کتاب میں اس کے  
جرم سے زائد ایک شے ہوتی ہے جس کو سر (یعنی برکت و نور معنوی) کہتے ہیں اور جس طرح شہد سے اگر  
اس کا مٹھا س نکال لیا جائے تو اس کا نفع بالکل جاتا رہتا ہے۔ اسی طرح کتاب کا حال ہے جبکہ اس کا  
سر نکال لیا جائے۔ نیز فرمایا بہتر سے کاغذ اور اوراق تم دیکھو گے کہ ان میں اسماء الہی لکھے ہوئے ہیں اور وہ  
زمین پر پڑے ہوئے ہیں کہ لوگ ان کو پاؤں سے روندتے ہیں اگر ملائکہ نے ان اسماء الہیہ کے اسرار نکال کر  
نہ اٹھائے ہوتے تو اس بے ادبی پر (تعامی انسان ہلاک ہو جاتے۔ یہ اللہ کا فضل و احسان ہے جس کا  
شکر ادا نہیں ہو سکتا۔ میں نے پوچھا کہ مجلس دیوان میں کیا سیدنا ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام وغیرہ  
انبیاء بھی تشریف لاتے ہیں؟ فرمایا ہاں سال بھر میں صرف ایک شب میں۔ میں نے دریافت کیا کہ وہ کونسی  
شب؟ فرمایا شب قدر اس شب میں انبیاء مرسلین اور ملائکہ اعلیٰ ملائکہ مقربین بھی آتے ہیں اور آنحضرت  
صلی اللہ علیہ وسلم مع ازواج مطہرات اور اکابر صحابہ کے بھی تشریف لاتے ہیں میں نے حضرت خدیجہ  
اور حضرت عائشہ کے بارہ میں ایک کی دوستی پر مضیت کے متعلق جو محدثین میں اختلاف ہے آپ سے  
دریافت کیا تو فرمایا ہم نے جو دونوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دیوان میں دیکھا ہے تو حضرت عائشہ  
کا نور حضرت خدیجہ سے بڑھا ہوا دیکھا ہے اس کے بعد شب قدر کا سبب ذکر فرمایا کہ حبرم آفتاب میں  
نور کے پیدا ہونے سے قبل سارا عالم تاریک تھا اور زمین و آسمان اور غاروں پہاڑوں، جنگلوں اور وادیوں  
میں سب جگہ فرشتے آباد تھے جب حق تعالیٰ نے آفتاب میں نور پیدا فرمایا اور عالم اس سے چمک اٹھا  
تو آسمان اور زمین کے فرشتوں میں شور برپا ہو گیا۔ اور سب ڈر گئے کہ عالم برباد یا ہم پر کوئی  
حادثہ عظیم نازل ہونے والا ہے۔ چنانچہ آسمان کے فرشتے بھی زمین پر اتر آئے اور ملائکہ زمین و آسمان  
نے بدشئی سے سایہ کی طرف بھاگنا شروع کیا یعنی دن کی بدشئی سے جس سے نا آشنا تھے ظلم کی تاریکی کی طرف  
جس سے واقف تھے ڈرتے کانپتے اور سب ملکر اللہ کی بارگاہ میں گڑ گڑاتے اور زاری کرتے ہوئے بھاگے  
اور اللہ سے اس کی خوشنودی طلب کرتے اور دعائیں مانگتے تھے کہ ان پر غضب نازل نہ فرمائے  
کیونکہ ان کے خیال میں تو یہی تھا کہ حق تعالیٰ اس عالم کو تو فرمانا چاہتا ہے لہذا ہر لمحہ اس کے وقوع کا  
خطرہ جاتے ہوئے مجتمعاً سب کے سب اس گریہ و زاری میں لگ گئے اور جوں جوں دھوپ کی چمک ان کی  
طرف بڑھتی گئی دونوں سایہ کی طرف بھاگتے رہے حتیٰ کہ ساری زمین کا چکر لگا لیا اور اب اسی جگہ پھر  
آگئے جہاں سے چلے تھے جب کوئی حادثہ نہ دیکھا تو اب ان کو اطمینان ہوا اور آسمان و زمین میں



اپنے اپنے مقامات پر واپس ہوئے۔ اس کے بعد وہ ہر سال ایک رات میں باہم جمع ہونے لگے اور یہ صورت بندھی  
 شہد کی۔ میں نے کہا اس کا مقتضا تو یہ ہے کہ شب قدر پیدائش آدم سے پہلے سے ہے حالانکہ حدیث  
 کا مقتضایہ ہے کہ وہ مخصوص ہے اسی اُمت محمدیہ کے لئے۔ آپ نے فرمایا اس اُمت شریفہ کے لئے تو یہ کثرت  
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کا اجر اور اس کی شناخت کی توفیق مخصوص ہے کہ دیگر امتوں کو اس سے  
 واقفیت نصیب نہیں ہوئی جیسے جمعہ کی ساعت قبولیت کہ تھی وہ بھی آفرینش آدم کے دن سے، مگر اس کی  
 معرفت بجز اس اُمت مرحومہ کے دوسری اُمت کو نصیب نہیں ہوئی چنانچہ یہود پر پیش ہوئی تو انہوں نے  
 یوم شنبہ کا انتخاب کیا، اور انصار سے پریش ہوئی تو انہوں نے یکشنبہ کو اختیار کیا۔ اور ہمیں حق تعالیٰ  
 نے اپنے لطف و فضل سے اس کی صحیح معرفت اور یوم جمعہ کی توفیق بخشی۔ اب میں نے ساعت جمعہ کا سبب  
 دریافت کیا تو فرمایا اس کا سبب یہ ہوا کہ حق تعالیٰ جب تمامی اشیاء کی تخلیق سے فارغ ہوا اور وہ جمعہ کی  
 آخری ساعت تھی تو ساری مخلوق دعاء و تضرع الی اللہ کے لئے جمع ہوئی کہ ان کی فوات پر نعمت کی تکمیل  
 فرمائے اور وہ عطا فرمائے جو اللہ کی رضا و خوشنودی کے ساتھ ان کی بقا و بہبود کا سبب ہو۔ اور جس شخص  
 کو حق تعالیٰ توفیق بخشے اور جمعہ کی ساعت مقبولہ پر مطلع فرمائے اسے مناسب ہے کہ یہی دعا مانگے  
 اور دنیا و آخرت دونوں کی خیر و خوبی کی درخواست کرے کیونکہ مخلوقات کے باطن سے اس دن یہی دعا نکلی  
 تھی۔ ان کی دعا و محض آخرت کے لئے نہ تھی پس جس کی دعا اس ساعت مقبولہ سے موافقت پائے گی اس کی  
 مراد برآئے گی نیز فرمایا کہ یہ ساعت بہت ہی مقہور ہے۔ یعنی باطلینان رکوع کرنے کی مقدار کہ ہر عضو اپنی  
 جگہ واپس آکر ٹھہر جائے اور عروق و اعضا کو حرکت سابقہ سے سکون مل جائے نیز یہ ساعت منتقل  
 ہوتی رہتی ہے مگر یوم جمعہ ہی کے اندر رہتی ہے پس کبھی زوال سے قبل ہوتی ہے اور اس کی ساعتوں  
 میں منتقل ہوتی رہتی ہے اور کبھی عین زوال کے وقت ہوتی ہے اور کبھی بعد زوال اور غروب شمس تک کی  
 ساعتوں میں منتقل ہوتی رہتی ہے اور کبھی چھ مہینہ قبل زوال رہتی ہے اور چھ ماہ بعد زوال۔ نیز فرمایا کہ  
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس ساعت کا وقت وہ تھا جس وقت آپ خطبہ پڑھا کرتے تھے  
 یعنی عند الزوال۔ اور حضرت عثمان کے زمانہ میں منتقل ہو کر بعد زوال آگئی اور خطبہ کا وقت وہ ہو گیا جو  
 ربیعانہ نبوی نماز کے لئے لوگوں کے جمع ہونے کا تھا بعد فراغ۔ حالانکہ خطبہ اور اجتماع آنحضرت صلی اللہ  
 علیہ وسلم نے اسی ساعت مقبولہ پانے کے لئے مشروع فرمایا تھا۔ مگر چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اٹھنا  
 اور اللہ سبحانہ کے سامنے خشوع و خضوع کے ساتھ کھڑے ہو کر خطبہ پڑھنا وہ درجہ رکھتا تھا جس کی برابری  
 کوئی شخص نہیں کر سکتی اس لئے اس وقت کو جس میں آپ خطیب بن کر کھڑے ہوتے تھے اتنا شرف عظیم اور



نورکش حاصل ہوا جو بمنزلہ ساعتہ جمعہ کے بن گیا بلکہ (قبولیت دعا کے لئے) اس بھی افضل۔ تو جس کو بعد زوال منتقل ہو جانے کی وجہ سے، ساعتہ جمعہ نہ ملی اگر خطبہ نبویہ کی ساعت مل گئی تو اس کا کچھ نقصان نہیں ہوا اور اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم نہیں فرمایا کہ جوں جوں ساعتہ جمعہ منتقل ہو خطبہ بھی منتقل ہوتا رہے چونکہ آپ کی ساعتہ خطبہ (معین ہے) منتقل نہیں ہوتی لہذا اس کا اعتبار زیادہ مناسب ہے بہ نسبت ساعتہ جمعہ کے جو منتقل ہوتی رہتی ہے۔ بایں وجہ خطبہ کے منتقل نہ ہونے میں اُمت پر رفق اور سہولت ہے نیز ساعتہ جمعہ کا قبضہ تو غیب اور راز ہے جس پر بجز خواص کے کوئی مطلع نہیں ہو سکتا اور ساعتہ خطبہ نبویہ امر ظاہر اور زوال کے ساتھ منضبط و محدود ہے جو کسی سے پوشیدہ نہیں۔ لہذا اس کا اعتبار اولیٰ ہوا اور اس بنا پر جو لوگ زوال کے وقت نماز جمعہ نہیں ادا کرتے امدان کی عادت ہو گئی ہے کہ تاخیر سے پڑھتے ہیں تو ساعتہ نبویہ میں جو یقینی تھی کوتاہی کر گئے اور ساعتہ جمعہ کے ہاتھ آنے میں شک ہے لہذا انہوں نے شک کی بدولت یقین کو ہاتھ سے کھو دیا اور یہ بڑی کوتاہی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ہم لوگ (مدینہ سے) مغرب میں رہتے ہیں اس لئے ہمارے بلاد کا طلوع و غروب بہت موخر ہے، پس اگر ساعتہ نبویہ کی قوت کرنا چاہیں اور زوال کے وقت نماز جمعہ پڑھیں تب بھی اس کو نہیں پاسکتے کیونکہ ہمارا وقت زوال مدینہ وقت زوال سے بہت موخر ہے۔ اور اگر اپنے وقت زوال سے قبل اس کو تلاش کریں اور صبح پتہ چلا کر کہ اتنے گنہ اور اتنے موخر ہے۔ ساعتہ نبویہ کی تحقیق کر لیں، تو لازم آتا ہے کہ زوال سے قبل نماز جمعہ پڑھیں اور یہ جائز نہیں۔ پھر تدبیر کیا کریں؟ فرمایا کہ ساعتہ نبویہ مطلقاً ہر جگہ کے زوال میں ساریت کئے ہوئے ہے۔ لہذا کسی خاص زوال کا اعتبار نہیں۔ جیسا کہ غروب اور طلوع میں کسی خاص جگہ کا اعتبار نہیں بلکہ ہر جگہ کا طلوع و غروب جدا معتبر ہے (خواہ آگے ہو یا پیچھے)، پس ہم صلوات فجر ادا کریں گے اپنی طلوع صبح صادق پر۔ نہ کہ مدینہ کی طلوع صبح پر، اور روزہ افطار کریں گے اپنے غروب پر نہ کہ مدینہ کے غروب پر۔ تمامی احکام شرعیہ جو وقت کی طرف منسوب ہیں ان کی یہی صورت ہے اور بخلاف ان کے زوال بھی ہے لہذا ہمارے ملک میں جس وقت زوال ہوگا اس کا وہی حکم ہوگا جو مدینہ میں وہاں کے وقت زوال پر حکم مرتب ہوگا) پھر میں نے آپ سے درخواست کی کہ ساعتہ جمعہ کے منتقل ہونے کی کیفیت بیان فرمائیں اور یہ کہ وہ جمعہ کی آخری ساعت سے کس طرح واپس ہوتی کہ منتقل ہوتی ہوئی زوال پر پہنچی، اور پھر آگے بڑھتی تو قبل از زوال منتقل ہوتی ہوئی شروع دن پر پہنچی۔ اور پھر پہلی حالت پر جانے کے لئے اس کا انتقال شروع ہو جاتا اور دن کے آخری حصہ پر جا پہنچتا ہے۔ حالانکہ (ساعتہ نبویہ کا) سب سے سابق چاہتا ہے کہ نہ ساعتہ جمعہ منتقل ہوا کرے نہ شب قدر منتقل ہوا کرے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی



ساعتہ ولادت یعنی شب کا اخیر تہائی حصہ منتقل نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں ساعتہ جمعہ جب بہت ہی قلیل ہے تو چھ مہینہ میں زوال سے لے کر غروب تک رچھ گھنٹہ کا وقت کیسے پورا کرے گی۔ یہ تو اسی وقت ممکن ہے کہ وہ بڑی (اور کم از کم دو منٹ) ہو۔ فرمایا ان باتوں کے ظاہر کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔

نیز آپ نے فرمایا کہ اہل دیوان کی گفتگو سریانی زبان میں ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ بہت مختصر اور کثیر معانی ادا کرتی ہے نیز اس لئے کہ اس مجلس میں ارواح اور ملائکہ کی شرکت ہوتی ہے اور ان کی زبان سریانی ہے البتہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے اور شریک مجلس ہوتے ہیں تو اس وقت آپ کے ادب کی وجہ سے بڑا عربی گفتگو ہوتی ہے نیز فرمایا یہ کچھ ضرور نہیں کہ جو ولی دیوان میں حاضر ہو وہ روح محفوظ کی تحریر بھی دیکھ سکے۔ بلکہ بعض ایسے ہیں کہ دیکھ سکتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو بنگاہ بصیرت اس کی طرف توجہ کرتے ہیں مگر معلوم نہیں کر سکتے۔ اور بعض ایسے ہیں کہ متوجہ ہی نہیں ہوتے کیونکہ جانتے ہیں ہم اس کو دیکھنے کے قابل نہیں ہیں۔ جیسا کہ پہلی شب کا چاند کہ اس کے دیکھنے والوں کی حالتیں مختلف ہوتی ہیں بعض تیز نظر ہوتے ہیں کہ کتنا ہی باریک چاند ہو فوراً دیکھ لیتے ہیں اور بعض متوسط النظر ہوتے ہیں کہ دیکھنے کی کوشش میں چار طرف نظر دوڑاتے ہیں مگر وہ ان کو نظر نہیں آتا۔ اور بعض ضعیف البصر ہوتے ہیں کہ جانتے ہیں ہمیں نظر نہ آئے گا اس لئے وہ دیکھے کا قصد ہی نہیں کرتے نیز فرمایا کہ جب دیوان میں اولیاء اللہ جمع ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کو روحانی فیضان اور باطنی مدد پہنچاتا ہے چنانچہ انواران میں تیروں کی طرح (ایک سے) نکلتے اور دوسرے میں داخل ہوتے نظر آتے ہیں لہذا جب مجلس سے باہر نکلتے ہیں تو بہت ترقی پر نکلتے ہیں۔

نیز فرمایا کہ چھوٹا ولی (دیوان میں) اپنی ذات سے حاضر ہوا کرتا ہے، مگر بڑے ولی پر کوئی پابندی نہیں مطلب یہ ہے کہ چھوٹے درجہ کا ولی جب دیوان میں آتا ہے تو اپنی جگہ اور اپنے گھر سے غائب ہو جاتا ہے (اور وہ اپنے شہر میں موجود نہ ملے گا کیونکہ وہ اپنی ذات ترائی کے ساتھ دیوان میں جایا کرتا ہے اور ذات ترائی ایک وقت میں دو جگہ موجود نہیں ہو سکتی) برخلاف بڑے ولی کے کہ وہ تفکر اور سمیت سے کام لیتا ہے اور اپنے گھر سے غائب نہیں ہوتا۔ کیونکہ بڑے درجہ کا ولی جس شکل و صورت کو چاہتا ہے اختیار کر سکتا ہے اور کمال روح کی وجہ سے اگر چاہے تو تین سو چھیانوہ ذوات میں متکون بن سکتا ہے۔ بلکہ ایک مرتبہ تو آپ نے باب الحجب سے باہر مجھ سے فرمایا کہ دیوان اور اس کے قائم کرنے والے ہیں کیا؟ وہ رب میرے سینہ کے اندر ہیں ایک بار فرمایا وہ مجلس میرے سینہ میں منعقد کی جاتی ہے ایک مرتبہ آپ باوجود اُمی ہونے کے اکابر صالحین کا تذکرہ فرماتے لگے۔ میں نے دریافت کیا کہ حضرت آپ کو ان سے واقفیت کس طرح ہوتی؟ فرمایا فتح کبیر والے ادب کی ارواح کا مسکن عالم برزخ کا قبہ ہے جسے ہم اس قبہ میں دیکھتے ہیں سمجھ لیتے ہیں کہ یہ



اکابر میں سے ہے۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم دسوقی کا تذکرہ ہونے لگا تو آپ نے فرمایا وہ اکابر میں سے ہیں پھر میں ان کے مناقب اور کرامات کا ذکر کرنے لگا جو ان سے صادر ہوئی تھیں تو فرمایا اگر حضرت ابراہیم دسوقی اپنے زمانے سے اس زمانہ تک بھی زندہ رہتے تو اس مدت دراز میں بھی وہ مقامات اور ترقی نہ پاسکتے جو تمہارے بھائی عبدالعزیز نے کل سے آج تک صرف ایک دن میں حاصل کرنی ہے) اور واللہ عبدالعزیز بروئے فخر نہیں کہتا بلکہ اظہار نعمت رب کی بنا پر کہہ رہا ہے۔ ایک دن میں اور آپ باب الحیثیہ سے شہر کے اندر آ رہے تھے کہ آپ نے میری طرف دیکھ کر فرمایا اس وقت مجھے تین خلوت پہننے گئے، اگر ان میں سے ایک بھی شہر فاس پر ڈال دیا جائے تو اس کا بوجھ (برداشت نہ کر سکے اور) سارے باشندے اور شہر کی فسیل اور تمامی مکانات اور جو کچھ بھی شہر کے اندر ہے سب یکھل کر عدم محض بن جائے۔ ایک روز میں آپ کے ساتھ باب الفتوح سے شہر میں آ رہے تھے تو اسماء الہی اور ان کی تعداد کے متعلق میں نے آپ سے سوال کیا کہ بعض علماء کا قول ہے وہ چار ہزار ہیں۔ فرمایا میں آنکھ بند کرتے اور کھولنے کے درمیان (یعنی پلک جھپکنے کی مقدار ایک لحظہ میں) ایک لاکھ سے زیادہ اسماء الہیہ کا مشاہدہ کرتا ہوں اور اسی طرح ہر لحظہ دائماً ترقی ہے (وہ حق تعالیٰ کے اسماء صفات مراد ہیں جن کی شمار محدود نہیں مشہور و منقول نودہ نام بھی اگرچہ اسماء صفات ہیں مگر وہ ہیں جن کے انوار کا تحمل عام امت کر سکتی ہے اور اسی لئے بعض روایات میں تین سو کے علاوہ دیگر اسماء الہیہ بھی منقول ہیں جس سے معلوم ہوا کہ تین سو میں حصر نہیں ہے۔ غیر متناہی ذات کی غیر متناہی صفات ہیں اور غیر متناہی اسماء جس دلی کو جتنی ترقی ہوئی اسی قدر زائد اسماء کا اس کو مشاہدہ بڑھتا رہا۔ واللہ اعلم۔

نیز فرمایا کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غوثِ غیر حاضر ہوتے ہیں اور دیوان تشریف نہیں لاتے۔ ایسی صورت میں اہل دیوان اولیا میں اختلاف پیش آجاتا ہے اور وہ تصرف باطنی واقع ہوتا ہے جو باہمی قتل و قتال کا موجب بن جاتا ہے پس اگر اکثر مجلس کی رائے متفق ہوئی اور اقل نے خلاف کیا تب تو یہ تصرف سابق ان میں واقع ہوتا ہے اور وہ سب مرجاتے ہیں چنانچہ ایک مرتبہ ایک معاملہ میں اختلاف رہا ہوا تو چند اولیاء کی جماعت نے کہا اگر یہ معاملہ اسی طرح نہ ہوا رجبی ہماری رائے ہے تو ہمیں مرجانا چاہیے اس پر دوسری کثیر جماعت نے کہا ایسا ہی جی چاہتا ہے تو مرجاؤ۔ پس قلیل جماعت فوراً مر گئی۔ اور اگر دونوں فریق برابر برابر ہوتے ہیں تو تصرف سابق دونوں میں جاری ہوتا ہے میں نے عرض کیا کہ علماء میں تو اختلاف اس لئے ہوتا ہے کہ ان کو مراد خداوندی معلوم نہیں ہوتی اور اس کی طلب و تلاش میں ان کو اپنی عقل اور علم ظاہر سے کام لینا پڑتا ہے مگر وہ حضرات تو اہل کشف اور صاحبان بصیرت ہیں اور اپنی بصیرت سے مراد خداوندی کا مشاہدہ کرتے ہیں پھر ان میں باہم نزاع کیوں ہوتا ہے؟ فرمایا جس صورت میں اہل مجلس کا اقل حصہ مخالف ہوتا ہے اس صورت میں تو حق تعالیٰ اپنی مراد



اقل کو محبوب بنا دیتا ہے تاکہ ان کے متعلق ر موت کی، قضا و قدر نافذ ہو کہ کسی طرح ان کا رنا علم الہی میں مقدر  
 تھا اور اگر دونوں فریق برابر برابر ہوتے ہیں تو مراد خداوندی سب پر پوشیدہ کر دی جاتی ہے کیونکہ اولیاء و اصفیاء  
 کے قلوب تعادیر کے منظر ہوتے ہیں کہ ہر امر جس طرح مقدر ہوتا ہے اسی کے موافق ان کے دل میں خیال  
 اور ارادے پڑتے ہیں، اور ان میں برابر کے درجہ کا اختلاف واقع ہو گیا لہذا مراد حق جو مقدر تھی کسی پر ظاہر  
 نہ ہوئی، میں نے کہا کہ غوث کی غیر حاضری کا کیا سبب ہوتا ہے؟ فرمایا یا تو متواتر کئی دن تک مشاہدہ حق میں  
 ان کی محویت، کہ سارے عالم ان کی نظر میں فنا ہو جاتے ہیں اور اس لئے وہ دیوان میں تشریف نہیں لاسکتے  
 اور یا ان کی ابتدائی قومیت، کہ سابق غوث کا حال ہی میں انتقال ہوا اور یہ ان کی جگہ مقرر ہوئے وجہ تک  
 آہستہ آہستہ ان کی فات (اس عہدہ جلیلہ کے فرائض سے) مانوس نہ ہو جائے شروع میں کبھی غیر حاضر ہو جاتے  
 ہیں نیز آپ نے فرمایا اور کبھی غوث کی غیر حاضری پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے ہیں اس وقت  
 اہل دیوان کو ایسا ثبوت و اضطراب پیش آتا ہے جو ان کو بدحواس بنا دیتا ہے کیونکہ حضور صلی اللہ  
 علیہ وسلم میں انجام کار کو معلوم نہیں کر سکتے اور تدبیر و تفکر کے قابل نہیں رہتے حتیٰ کہ اگر زیادہ دنوں تک یہ صورت  
 قائم رہے تو رتھرات و انتظامات سب معطل اور تمامی عوام برباد ہو جائیں بتاد حجب غوث کی غیر حاضری  
 پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں تو آپ کے ساتھ حضرت ابو بکر رحمہ حضرت عمر رحمہ حضرت  
 عثمان رحمہ حضرت علی رحمہ حضرت حسن رحمہ حضرت حسین رحمہ اور ان کی والدہ حضرت فاطمہ زہرا ہوتی ہیں کبھی سب  
 کبھی بعض رضی اللہ عنہم اجمعین حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا مجلس کی بائیں جانب ان عورتوں کی جماعت  
 میں بیٹھتی ہیں جو دیوان میں شریک ہوتی ہیں، اور آپ ان سب مستورات کی امام ہوتی ہیں نیز فرمایا کہ  
 ایک شب میں نے حضرات فاطمہ کو اپنے باپ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ درود پڑھتے سنا اللھم صلی علی  
 من رھل محراب الارواح والملكۃ والکون اللھم صلی علی من هو امام الالنبیاء والمرسلین اللھم  
 صلی علی من هو امام اهل الجنة عباد اللہ المومنین۔ درود کے لفظ تو یہ نہ تھے دعا لیا سر یانی ہو گئے  
 مگر معنی جو میں نے اس عبارت سے نکالے وہ یہی تھے میں نے کہا کیا غوث کی موجودگی میں کسی کو قدرت ہے  
 کہ ان کی مخالفت کرے؟ فرمایا کسی کی طاقت نہیں کہ مخالفت میں ہونٹ بھی ہلا سکے چہ جائیکہ زبان سے خلافت  
 لفظ نکالنا ایسا کرے تو اس کے سلب ایمان کا خطرہ ہے چہ جائیکہ کچھ اور نیز فرمایا کہ اہل دیوان جب جمع ہوتے  
 ہیں تو اس وقت سے لے کر کل آئندہ تک جو کچھ بھی ہونا ہے اس پر متفق رائے بن جاتے ہیں آئندہ دن رات  
 کے متعلق مقدرات میں گفتگو کرتے ہیں انکو علوی اور سفلی تمام عوام حتیٰ کہ ستر حجب عالم رقا میں بھی کہ ستر حجب  
 سے مافوق ہے نصرت کا منصب ہے پس وہ ہر عالم اور اہل عالم اور ان کے خواطر و مافی الضمیر میں تصرف کرتے ہیں



کہ کوئی خطرہ بھی کسی کے دل میں بغیر اذن اہل تصرف کے خطور نہیں کرتا اور جب عالم رقا میں تصرف کی بہ شان ہے جو کہ ان ستر حجابوں کے اوپر ہے جو یکے بعد دیگرے عرش کے مانوق ہیں تو دیگر عوالم کا تو بوجھنا ہی کیا۔ ایک مرتبہ میرے ایک دوست کے بڑے کوپڑیس نے پکڑ لیا کہ کو تو ال شہر اس کی تلاش میں تھا اور وہ ڈر کے مارے روپوش تھا جب گرفتار ہو گیا تو باپ کو اس کی ہلاکت کا یقین ہو گیا اور وہ میرے پاس آیا میں نے حضرت سے تذکرہ کیا فرمایا اگر تمہارا ایسا خیال ہو کہ بلی چوہے کو کھا جائے گی فلاں کی رعین میری، اجازت کے بغیر تو بالکل غلط خیال ہے۔ بڑے کے کچھ اندیشہ نہ کرو اور اس کے باپ سے کہو کہ خاطر جمع رکھے۔ چنانچہ کو تو ال کے سامنے جاتے ہی اس کو چھوڑ دیا گیا اور اس کا ظاہری سبب کوئی سمجھ میں نہ آیا۔

میں نے آپ سے دریافت کیا مجلس دیوان غار حرا کے علاوہ کیا کہیں اور بھی ہوتی ہے؟ فرمایا ہاں سال میں صرف ایک مرتبہ شہر سوس اور غربی سوڈان کے درمیان، اس جگہ پر ہوتی ہے جس کا نام زاویہ آٹا ہے اس میں سوڈان کے اولیاء آتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو صرف اسی شب میں شریک مجلس ہوتے ہیں۔ اس شب کے دو تین دن پہلے سے باذن الہی یہاں ایک بڑا بازار لگ جاتا ہے جس میں دودھ کے سوناگر آتے ہیں اور دو تین دن بعد وہ بازار لگ رہا ہے یہاں بے شمار سونا جمع ہوتا ہے میں نے دریافت کیا ان دنوں جگہ کے سوا کیا اور بھی کہیں اجتماع ہوتا ہے؟ فرمایا ہاں ہو جاتا ہے، مگر دس سے زیادہ کا اجتماع بجز ان دو جگہ کے کہیں نہیں ہوتا۔ چونکہ زمین ان کے ریکھائی انوار کو برداشت نہیں کر سکتی اس لئے ارادۂ خداوندی نے ان حضرات کا تفرق تجویز فرمایا ہے کہ دنیا اور اس کی مخلوق میں چار طرف پھیلے رہیں۔ میں نے کہا کیا مجذوب کا بھی دیوان میں کچھ دخل ہے، اور کیا وہ بھی سائیکن اہل تصرف کی طرح تصرف کیا کرتے ہیں؟ فرمایا ان کا مجلس دیوان میں بالکل دخل نہیں اور نہ ان کے ہاتھ میں کوئی تصرف ہے جس دن تصرف ان کے ہاتھ میں جائیگا دنیا تباہ ہو جائے گی میں نے کہا ان کے قبضہ میں تصرف کب جائے گا؟ فرمایا خروج دجال کے وقت کہ اس وقت تصرف ان کے ہاتھ میں ہوگا اور صد مجلس بھی مجذوب ہی ہوگا اور چونکہ اس کو عقل اور فہم نہ ہوگی لہذا تصرف میں اختلال واقع ہو جائے گا اور وہی سبب ہوگا خروج دجال کا ایک مرتبہ آپ نے یہ قصہ نقل فرمایا کہ حضرت حماد ایک مجذوب تھے بلاد مغرب کے باشندے تھے اور مصر کے بازار میں روٹی کا سوال کرتے پھر اترتے تھے موسم تھا غلہ کی گرانی کا ایک دفعہ کھانے کے قابل کچھ مانگنے کے لئے ایک دکان کی طرف چلے ان کو باطنی نگاہ سے معلوم ہوا کہ کثیر مقدار سونا دکان کے سامنے ایک دیگ میں زمین کے اندر مدفون ہے حماد اس پر پاؤں رکھ کر کھڑے ہو گئے صاحب دکان بھی عارفین میں سے تھے انہوں نے حضرت حماد کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھا تو آواز مانا چاہا اس لئے حماد سے فرمایا کہ مانگتے پھرتے ہو حالانکہ پاؤں کے نیچے کی چیز کافی ہے حماد نے کہا پاؤں کے نیچے تو سونا ہے اور مجھے تو روٹی



کھانے کے لئے ایک کتنی درکار ہے تب صاحب دکان کو ان کا حال معلوم ہوا اور کسی اکنیاں ان کے حوالے کیں  
 میں نے دریافت کیا کہ جب ان کو پہلے دیکھا ہی نہ تھا تو پہچان کیسے کر یہ حاد ہیں اور پھر آزمانے کا ارادہ کیسے کیا  
 فرمایا دیکھنے سے قبل واقفیت کی صورت ایسی تھی جیسے کوئی خوابیدہ جاگنے کے قریب کسی اجنبی کو خواب میں  
 دیکھے اور پھر آنکھ کھلے تو وہ شخص سامنے کھڑا نظر آئے ظاہر ہے کہ اب وہ اس کو ذرا غور سے دیکھے گا کہ آیا  
 وہی ہے جو اب بھی خواب میں نظر آیا تھا یا کوئی دوسرا ہے تاکہ شک رفع اور یقین حاصل ہو جائے کہ ہاں  
 بیداری میں جس کو دیکھ رہا ہوں وہی ہے جس کو خواب میں دیکھا تھا۔ میں نے کہا اس کی کیا وجہ کہ اول ان کو  
 انکاری جواب دیدیا کہ اللہ برکت دے اور جب معلوم ہوا کہ وہی ہیں تو ان کا سوال پورا کر دیا بلکہ سوال سے بھی زائد  
 دیا؟ اگر عطیہ اللہ واسطہ مقامات کی سائل کی طرف دیکھنا ہی نہ چاہیے تھا کہ وہی ہے یا نہیں کیونکہ دونوں کا  
 رب ایک ہے اور اگر عطیہ غیر اللہ کے لئے تھا تو یہ عارف کی حالت کے مناسب نہیں نیز جب پہلے انکار کر  
 چکے تو دوبارہ بھی انکار ہی ہونا چاہیے تھا۔ بشرطیکہ انکار کرنا اللہ واسطہ تھا اور جب دوسری دفعہ میں  
 دیا تو پہلی ہی دفعہ دینا چاہیے تھا بشرطیکہ دینا اللہ واسطہ تھا فرمایا کہ مومن کا تو صرف ایک حق ہوتا  
 ہے۔ یعنی حق ایمان اور وہی کا حق دوہرا ہوتا ہے ایک حق ایمان اور ایک حق معرفت با اللہ تبارک و تعالیٰ پس اول  
 انکار کیا تو یہ سمجھ کر کیا کہ سائل مجملہ مومنین کے ہے اور حق ایمان نے اس وقت ان کے مال میں کسی حصہ  
 کا استحقاق قائم نہ کیا تھا۔ مگر جب امتحان کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ عارفین میں سے تھے تو ان کا حق  
 نسبتاً موکد اور استحقاق پہلے سے قائم ہو گیا اور بوجہ معرفت الہیہ کے جس میں دونوں برابر تھے عارف کے مال میں  
 دوسرے عارف کا حصہ واجب ہو گیا کیونکہ معرفت الہیہ گویا دو دینی بھائیوں کی طرح دو عارفوں کے مابین عقد اخوت ہے لہذا  
 پہلے نہ دینا اور کہہ دینا کہ اللہ زیادہ دے، یہ بھی اللہ ہی واسطہ تھا اور پھر دینا اور سوال سے زائد دینا یہ بھی اللہ  
 ہی واسطہ تھا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے دروازہ پر کوئی سائل سوال کرے اور صاحب مکان جواب دیکر  
 کہ اللہ زیادہ دے پھر دروازہ کھولے تو دیکھے کہ سائل تو اس کا سگ بھائی ہے اب اس پر واجب ہے کہ  
 اس کو اجنبی کے درجہ میں نہ اتارے اور اس کے بھائی ہونے کا علم ہو جانے کے بعد ایسا انکار نہ کرے جیسا پہلے  
 کر چکا ہے کہ یہ اخوت کے منافی اور صلہ رحمی کے مقتضا کے خلاف ہے میں نے کہا وہ حصہ کیا ہے جو معرفت  
 کے سبب مال میں واجب ہو جاتا ہے؟ فرمایا وہی ہے جو دینی بھائی بنانے میں واجب ہوا کرتا ہے کہ اگر صرف  
 ایک دینی بھائی ہو تو نصف النصف۔ اور اگر دس بھائی ہوں تو مال کا دسواں حصہ۔ میں نے کہا پھر اس عارف  
 نے حاد کو اپنا آدھا مال کیوں نہ دیا صرف دس اکنیاں کیوں دیں؟ فرمایا عارف سائل کا انحصار صرف اسی  
 سائل میں نہ تھا۔ ممکن ہے اس کے جانے کے بعد دوسرا عارف سائل بن کر آئے اور پھر تیسرا جو تھا



پانچواں آدمی۔ پس انسان اپنے دینی برادران کے حصہ واجبہ کی تقسیم کو خود ہی خوب سمجھ سکتا ہے۔ میں نے کہا یہ سید حماد کیا تھے؟ فرمایا مجاہذیہ میں سے تھے، اور صاحب دکان جن کا نام حضرت ابراہیم تھا سالکین میں سے تھے اور دونوں اولیاء عارفین میں سے تھے میں نے پوچھا کہ مجذوب اور سالک میں فرق کیا ہے جبکہ معرفت الہیہ میں دونوں شریک ہیں؟ فرمایا مجذوب وہ ہے کہ جو کچھ اس کو نظر آتا ہے اس کا ظاہر اس سے متاثر ہوتا ہے اور جو مشاہدہ کرتا ہے اس سے سرور ہو کر بدن سے اس کی نقل اتارتا اور اس کے حرکات و سکنات کا اتباع کیا کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ جب بندہ پر لطف و کرم فرماتا اور اس کی چشم بصیرت کھول دیتا ہے تو وہ ہر وقت ملا لا علی کے عجیب و غریب معاملات کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے پس اگر وہ مجذوب ہوتا ہے تو چشم بصیرت سے جو چیز دیکھتا ہے اس کا ظاہر اس کا اتباع کرنے لگتا ہے اور چشم بصیرت سے جو چیزیں نظر آتی ہیں وہ غیر منحصر اور لا محدود ہیں اس لئے اس کا کوئی حال منضبط نہیں ہوتا کبھی روتا کبھی سنہتا ہے، کبھی لرزتا ہے، کبھی چنچلتا ہے، پس اگر کسی مجذوب کو دیکھو کہ سرور میں مہووم رہا ہے تو سمجھ لو کہ حوروں کے مشاہدہ میں محو ہے کیونکہ حوروں کی حرکات کا انداز یہی ہے لہذا جو صورت زان کے عشوہ و ناز کی مشاہدہ کر رہا ہے اس کا ظاہر ہم اس کی نقل اتارنے میں مشغول ہے اور سالک وہ ہے جس کا ظاہر اپنی دیکھی ہوئی چیز سے متاثر نہ ہو اور جو مشاہدہ کرے اس کی نقل نہ اتارے کہ وہ ٹھہرا ہوا سمندر اور ساکن بحرِ خار ہے سالک مجذوب سے اکل اور اس کا اجر مجذوب کے اجر سے کہ گونہ نماند ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سالک قدم بقدم ہوتا ہے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آپ کا ظاہر کسی شے سے بھی متاثر نہیں ہوتا تھا۔ اور یہی سبب ہے کہ سالکین اہل عقل ہوتے ہیں، اور مجاہذیہ اکثر بے عقل ہوا کرتے ہیں کیونکہ ان کا ظاہر حب دوسروں کی نقل اتارنے میں مشغول ہو گیا تو وہ ظاہر جو فتح سے پہلے اصل خلقت میں ان کو ملا تھا مغل ہو گیا اور اس کے طبعاً ان کی عقل بھی ضائع ہو گئی ایک عارف سالک دیوان میں آیا کرتے تھے اور اکابر میں سے تھے ان کے ایک لڑکا تھا اور ان کو معلوم تھا کہ روحانی کمال میں بھی ان کا وارث ہی ہوگا۔ مگر ان کو اس کا پتہ نہ تھا کہ وہ مجذوب اٹھے گا یا سالک۔ لہذا ایک مرتبہ وہ اس کو اپنے کمرے پر بیٹھا کر مجلس میں لے آئے۔ اہل دیوان نے اعتراض کیا کہ یہ تم نے کیا کیا حالانکہ جانتے ہو کہ اس مجلس میں غیر کا لانا جائز نہیں ہے انہوں نے کہا میں آپ حضرات سے معافی چاہتا ہوں اور چشم پوشی و درگزر کا متمنی ہوں اس کے بعد بچہ کو لے کر غوث کے سامنے آئے اور عرض کیا کہ حضرت میں اس مقدس مجمع میں آنجناب کی حضور میں ایک خاص ضرورت لے کر آیا ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ اور اس مجلس مقدسہ کا واسطہ میرے بچہ کے متعلق یہ ظاہر فرمادیجئے کہ یہ مجذوب اٹھے گا یا سالک، غوث نے فرمایا یہ تو ایسی بات ہے جس کا علم ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ جو نور ایمان سالک میں ہوتا ہے وہی نور ایمان مجذوب نہیں ہوتا۔



اور جو معرفت الہیہ اس میں ہوتی ہے وہی لعینہ اس میں ہوتی ہے۔ رہا دونوں میں حسنات اور درجات کا فرق سو وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہے اس کا علم آخرت ہی میں ہوگا پھر وہ طریقہ کونسا ہے جس سے معلوم ہو جائے کہ یہ مجذوب ہے یا سالک ہے یہ ہو سکتے والی بات نہیں ہے انہوں نے عرض کیا کہ حضرت آپ کو تو حق تعالیٰ غوث ہی اس لئے بنایا ہے کہ آپ ضرور معلوم کر سکتے ہیں غرض دیر تک الحاح و اصرار کرتے رہے اور آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جاہ کا واسطہ دیا تو غوث نے کہا اچھا ایک لکڑی لاؤ چنانچہ لکڑی حاضر کر دی پھر فرمایا کہ چھری بھی ہے؛ چنانچہ چھری بھی حوالہ کر دی آپ نے بچہ کو سامنے بٹھایا اور لکڑی پر چھری کو جلانا شروع کیا کبھی لکڑی کو کھینچتے تھے کبھی اس میں چھری گڑھتے تھے پھر کبھی اپنی زبان دانتوں سے کاٹتے تھے اور کبھی اپنے ہونٹ بھینچتے تھے اور اٹنا میں گوشہ چشم سے بچہ کو دیکھتے جاتے تھے۔ بچہ بھی ان کی نقل اتار رہا تھا کہ وہ زبان کاٹتے تھے تو یہ بھی اپنی زبان کاٹتا تھا اور ہونٹ بھینچتے تھے تو یہ بھی اپنے ہونٹ بھینچتا تھا۔ تب آپ نے اس کے باپ سے کہا اے جاؤ اپنے بچہ کو یہ مجذوب ہو گا۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت نے کیسے معلوم فرمایا؟ فرمایا اس کا ظاہر جو شے دیکھتا ہے اور مشاہدہ کرتا ہے اس سے متاثر ہوتا ہے (اور یہی قائم ہے جذب کا) نیز آپ نے فرمایا کہ سالکین چند باتوں میں مجذوبیت سے پرہیز رکھتے ہیں اول یہ کہ سالک مجذوب کے ساتھ کھاتا نہیں کیونکہ مجذوب کو پروا نہیں ہوتی خواہ اس کی زبان سے گالی نکلے یا فحش، اس لئے سالک پر واجب ہے کہ اس سے پرہیز کرے دوم اس کے ساتھ سفر نہ کرے اس کی وجہ بھی یہی ہے (یہی مجذوب کی بے احتیاطی ہے سوم مجذوب کا پہنا ہوا کپڑا نہیں پہنتا کیونکہ وہ بے عقل ہونے کے سبب، نجاست وغیرہ سے بچتا نہیں، چہارم سالک کو جائز نہیں کہ مجذوبہ سے نکاح کرے اور اسی طرح سالک کو مجذوب کے نکاح کرنا صحیح نہیں۔ رہا تربیت کا قصہ سو کبھی سالک شیخ کا تربیت یافتہ مجذوب ہوتا ہے جیسا کہ اشعری کا قصہ تھا کہ وہ مجذوب تھا اور اس کا باپ سالک تھا اور کبھی مجذوب شیخ کا مرید سالک نکل آتا ہے جیسے حضرت یوسف فاسی کا قصہ ہے کہ وہ سالک تھے اور ان کے شیخ حضرت عبدالرحمن مجذوب تھے میں نے عرض کیا کہ یہ کیسے ہو جاتا، حالانکہ مجذوب کو تو اپنی ہی خبر نہیں ہوتی پھر دوسری کی تربیت کیسے کرے گا۔ فرمایا جذب کے درجات بلحاظ قوت و ضعف مختلف ہوتے ہیں بعض کا جذب قلیل ہوتا ہے (اور ان کو تربیت کا ہوش رہتا ہے) اور بعض کا جذب کثیر ہوتا ہے کہ کسی وقت بھی ہوش نہیں آتا (وہ البتہ کسی کی تربیت نہیں کر سکتا) نیز آپ نے فرمایا (اہل تصرف) اولیاء ایسے بڑے بڑے کام کرتے ہیں کہ دیکھنے والا حیران ہو جاتا ہے مگر چشم حقیقت دیکھو تو کرنے والا وہی حق سبحانہ ہے اور یہ حضرات بلا فرق دوسری مخلوقات کی طرح محض آلہ و واسطہ ہیں میں نے کہا کہ اولیاء اللہ کو تو افعال الہیہ کا مشاہدہ ہوا کرتا ہے اور جب ان کو اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے



پھر ان کو فعل کا ہندو اپنی جانب سے کیے نظر آتا ہے اور وہ افعال کی نسبت اپنی طرف سے کہتے ہیں؛ فرمایا  
 اولیا و ہوں یا غیر اولیا، جن پر بھی حق تعالیٰ نے لطف و کرم فرمایا ہے ان کو دوسروں کے متعلق افعال الہیہ کا  
 مشاہدہ ہوا کرتا ہے اپنی ذات میں افعال الہیہ کا مشاہدہ کرنے کی طاقت کسی مخلوق میں بھی نہیں ہے۔  
 اگر اپنی ذات میں افعال ربانیہ کا اُسے مشاہدہ ہو تو اس کی ذات (نمک کی طرح) بگھل کر بہ جائے پس مخلوق  
 میں اتنی ہی طاقت ہے کہ واسطہ کے ذریعہ افعال الہیہ کا مشاہدہ کرے، یا دوسروں میں مشاہدہ کرے۔ باقی  
 اپنی ذات میں بلا واسطہ مشاہدہ کرنے کی طاقت ہرگز نہیں اور کسی لئے حق تعالیٰ نے واسطوں کو پیدا فرمایا اور فرشتوں  
 کو ظہور بنایا کہ ان میں افعال ربانیہ کا ظہور ہوتا کہ مخلوقات بگھل کر جلتے اور فرشتوں میں (بلا واسطہ منظر  
 افعال الہیہ بننے کی) یہ طاقت اس لئے آئی کہ ان کی ذوات نورانی اوصاف ہیں (انسان کی طرح کثیف)  
 خاک اجسام نہیں ہیں اور فعل باری کا واسطہ بننے میں ملائکہ کے لئے ایک خاص خصوصیت ہے جو دوسروں میں  
 نہیں پائی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ فتح نصیب ہو جانے کے بعد تم دیکھو گے کہ مخلوقات کی جگہوں میں کوئی جگہ بھی  
 ان سے خالی نہیں ستر حجابوں میں، اور ان کے نیچے عرش میں اور اس کے نیچے جنت میں، دوزخ میں، آسمان میں،  
 زمین میں، غاروں میں، پہاڑوں میں، بنوں میں، سمندروں میں، غرض ہر جگہ ان کو موجود پاؤ گے۔ اور اسی نفع  
 کے سبب جو مخلوق اور خالق کے درمیان ان کا واسطہ بننے سے حاصل ہوا ہے ان پر ایمان لانا ضروری ہوا  
 (کہ ان کا احسان ہم پر کثیر در کثیر ہے) ورنہ ستر حجاب اور اللہ کی دیگر بڑی بڑی مخلوق موجود ہے، ان پر ایمان لانا  
 ضروری نہ ہوا کہ ان سے ہمیں کوئی خاص نفع نہیں پہنچا، واللہ اعلم۔

ایک مرتبہ میں آپ سے باتیں کر رہا تھا کہ معجزات انبیاء کا تذکرہ آگیا میں کہنے لگا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام  
 کے لئے حق تعالیٰ نے جنات و انسان اور شیاطین اور ہوا کو مسخر کر دیا تھا۔ اور ان کے والد سیدنا داؤد  
 کو لوہے کی صناعت سکھائی اور آہن کو ان کے ہاتھ میں گندھے ہوئے آٹے کی طرح نرم بنا دیا تھا اور  
 سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو تندرست اور مردوں کو زندہ کرنے کی طاقت بخشی تھی وغیرہ  
 وغیرہ حضرت مدوح میرا مطلب سمجھ گئے گویا میں کہہ رہا ہوں کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب سے افضل و  
 برترین ہیں مگر ایسی باتیں آپ سے ظاہر نہیں ہوئیں اور جو معجزات آپ سے صادر ہوئے وہ دوسری قسم کے تھے  
 (اس عام پسند و واضح نوع کے نہ تھے) آپ نے فرمایا کہ سیدنا سلیمان علیہ السلام کو ملکی حکومت و اقتدار جو کچھ بھی  
 عطا ہوا اور سیدنا داؤد علیہ السلام کو آہنی تسبیح جو کچھ بھی ملی اور سیدنا سلیمان علیہ السلام کو اقتدار جو کچھ بھی عطا ہوا  
 وہ باذن اللہ جو کچھ بھی دیا گیا وہ سب بلکہ اس سے زیادہ حق تعالیٰ نے انہیں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت مرحومہ میں اہل  
 تصرف اولیا کو عطا فرما دیا ہے کہ جنات و انسان اور شیاطین اور ہوا اور فرشتے بلکہ تمامی عالموں میں جو کچھ



بھی ہے وہ سب ان کا مسخرہ تابع کر دیا ہے اور باورِ زاد اندھے اور کوڑھی کو تندرست اور مردوں کو زندہ کرنے کی بھی ان کو طاقت بخشی ہے مگر یہ سب امر غیبی اور نظروں سے پوشیدہ ہے مخلوق پر اس مصلحت سے ظاہر نہیں ہوتا کہ ان حضرات اولیاء کے گردیدہ ہو کر اپنے رب کو نہ بھول جائیں اور ان ہی کے تہہ ہو رہی دنیا پنہ عیسائی ان معجزات ہی کو دیکھ کر حضرت عیسیٰ کے بندے بن گئے اور خدا کو چھوڑ بیٹھے ہیں) اور ظاہر ہے کہ اہل تصرف کو یہ نعمتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی برکت سے حاصل ہوئی ہیں لہذا ان سب کا شمار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے معجزات میں ہے بلکہ زیادہ کہ جو خوارق عادات حضرات انبیاء کو عطا ہوئے وہ مع شئی زائد غلامانِ محمدی کو عطا ہوئے۔

ایک دن میں نے آپ سے دریافت کیا کہ اہل تصرف اولیاء اللہ جب کفار کو جہاں کہیں بھی ہوں ہلاک کرنے کی طاقت رکھتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ باوجود ان کے کفر اور غیر اللہ کی پرستش کے ان کو چھوڑ رکھا ہے حالانکہ ایسوں کا ہلاک کرنا واجب ہے یہ سن کر آپ نے منہ پھیر لیا اور فرما دیا میرا بعد منہ سامنے کر کے فرمایا کہ دلی کو بیشک اتنی قدرت ہے کہ لحظہ بھر میں اس سارے کو ہلاک کر دے مگر باوجود اس کے جب وہ مسلمانوں اور کافروں کی باہم جنگ میں جانے لگا تو اس پر حرام ہے کہ کافروں میں اس ستر باطنی کے ذریعہ کچھ بھی تصرف کرے بجز اس کے کہ جو طریقہ جنگ کا جاری ہے یعنی تلوار چلاتا اور بھالا مارنا وغیرہ اسی طرح وہ کافروں سے لڑے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اقتدار ضروری ہے۔ ایک مرتبہ مسلمانوں کی ایک کشتی کا جس میں دو اہل تصرف دلی بیٹھے ہوئے تھے کافروں کی ایک کشتی سے مقابلہ ہو گیا جب باہمی جنگ جوش پر آئی تو ایک دلی جو چھوٹا تھا اٹھا اور ستر باطنی سے تصرف کر گزرا دفعۃً کافروں کی کشتی میں آنکھوں دیکھنے دیکھتے آگ لگ گئی اور اس کا کوئی سبب عادی اس سے صادر نہیں ہوا کہ جس کے پردہ میں وہ تصرف چھپ جانا بلکہ کشتی بلا سبب خود جل گئی۔ جب اس دلی نے ایسا کیا تو دوسرے دلی نے جو اس کے ساتھ تھا اور وہ بڑا تھا اس فعل کی تائید میں فوراً اس کی قوت تصرف کو سلب کر لیا۔ کہ آئندہ ایسا کرنے کی طاقت ہی نہ رہی) نیز فرمایا کہ کفار میں ستر باطنی کے ذریعہ تصرف کرنا ناجائز اس لئے ہے کہ صاحب تصرف اس حالت میں درحقیقت عالم بشر سے خارج اور دوسرے عالم سے جاملے کرتا ہے۔ اور جیسے مثلاً عالم ملائکہ کو جائز نہیں کہ اپنی قوت اعلیٰ کے موافق کافروں میں تصرف کریں اسی طرح صاحب ستر کو جائز نہیں کہ ان میں اپنی قوت کا تصرف عمل میں لاوے بلکہ اہل تصرف کے ہاتھوں وہی امور جاری ہوں گے جن میں ان کی بقا و زندگی اور دوام عیش مضمر ہے جیسا کہ نگہبان فرشتے ان کی پیدائش سے لے کر مرتے دم تک ان کے تمامی امور کا انتظام کرتے (اور ان کو بجائے ہلاک کرنے کے جب مقدر ہر قسم کی ایذا و فنا کا فی سہ پچاتے اور ترقیات میں مدد پہنچاتے) رہیں گے الحاصل چونکہ



کفار عالم بشر میں سے ہیں لہذا ان کے ساتھ جنگ میں اسی کا استعمال کیا جائے گا جو عادت جاریہ ہے عالم بشر میں۔ دوسرا کوئی طریق استعمال نہیں کیا جاسکتا واللہ اعلم۔

نیز آپ نے فرمایا ایک نصرانیہ نو عمر لڑکی کی چاند پر نظر لگی تو اپنے آپ سے پوچھنے لگی ابا اسے کس نے پیدا کیا؟ باپ نے زمین پر رکھی ہوئی صلیب کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس نے۔ لڑکی نے صلیب کو اٹھایا اور اپنے سر کے برابر لے جا کر ہوا میں چھوڑ دیا کہ وہ زمین پر آگری اور کہا کہ ابا جو چیز اتنی قریب جگہ میں اپنے کو خود نہ مقام سکی اس کو کس نے مقام کیا کہ اتنی بلندی اور اونچائی پر پہنچ کر وہ چاند کو پیدا کر آئی۔ باپ اس کو ڈانٹنے لگا اور برا بھلا کہنے لگا۔

میں نے پوچھا کیا لڑکی مسلمان تھی؟ فرمایا نہیں۔ میں نے کہا کیا بعد میں اسلام لائی؟ فرمایا نہ۔ میں نے کہا پھر ایسے صحیح اعتراض اور واضح نور کی توفیق کہاں سے ہوئی؟ فرمایا ایک اہل حق وہاں موجود تھا اور اس نے لڑکی کی طرف دیکھا تھا جس کی وجہ سے اُس نے یہ گفتگو کی۔ اس بزرگ سے مراد خود حضرت شیخ ہیں اور نظر جو اس پر ڈالی تھی وہ باطنی تھی جو لوگوں کی نگاہ سے مخفی ہے۔

میں نے دریافت کیا کہ اہل تصرف ولی جب کسی دوسری شکل کو قبول کرے اور اس حالت میں فرض کر دقت کر دیا جائے تو تکلیف کس شے کو ہوگی آیا روح کو یا اس کے اصلی جسم کو، یا اس جسم کو جس نے اُسے لے رکھا ہے؟ فرمایا دنیا ہو یا آخرت دونوں جگہ درد و تکلیف کا طریق یکساں ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ درد و تکلیف سے مقصود جسم ہو اگر تا، کہ جہنم میں جلائے سے بھی مقصود بدن ہی کو جھکنا ہے اور دنیا میں کسی کو مارا یا قتل کیا جاتا ہے تو اس سے بھی بدن ہی کو کلفت پہنچانا مقصود ہوتا ہے، مگر یہ خیال غلط ہے تکلیف پہنچانا روح کو مقصود ہوتا ہے البتہ بدن اس کا ذریعہ و واسطہ اور محل بنا کرتا ہے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اس ولی کو جب حق تعالیٰ ایسے مقام پر تعینات فرماتا ہے جسے گرمی یا سردی وغیرہ کسی مانع کی وجہ سے اس کی ذات ترا بی برداشت کر سکتا ہے اور اس طرح اس خدمت مفوضہ کو انجام دے لیتا ہے پس اگر اس جسم پر کوئی چوٹ پڑے گی جس میں وہ منتقل ہوا ہے تو ایسی ہی تکلیف محسوس کرے گا جیسی اس بدن پر پڑتی ہے جس کو چھوڑا ہے اور اس وقت تکلیف محسوس کرتا۔ اس میں کچھ بھی فرق نہ ہوگا۔ میں نے کہا وہ اجسام کون سے ہیں جن میں روح داخل اور منتقل ہو جاتی ہے؟ فرمایا مثلاً پہاڑ یا بیل یا ایسے ہی سخت اور مضبوط، دیگر اجسام میں نے کہا ان میں تو خود ان کی روح موجود ہے پھر ولی کی روح اس میں کیسے داخل ہو جاتی ہے؟

فرمایا ہاں ان کی روحیں ان میں موجود ضرور ہوتی ہیں مگر ان کی روحیں بنی آدم کی روحوں کی طرح نہیں ہیں، جو پایوں کی ارواح ان کی عقول کی طرح (ضعیف) ہیں اور ان کی عقول ان کی ارواح کے مثل (نارسا) ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی ارواح کا ان کی ذوات پر ایسا حکم نہیں چلتا جیسا بنی آدم کی ارواح کا ان کی ذوات



پر چلتا ہے چنانچہ انسان کی روح اپنے بدن اور دماغ اور اعضا سے وہ وہ کام لیتی ہے جو کھیل اور تماشہ بن کر عقل کو بھی متحرک بنا دیتے ہیں، ہر جانور کی آواز اور بولیوں کی نقل اتار لیتا ہے، مست سے مست ہاتھ کو داب لیتا ہے، چیل کی طرح ہوا میں جھانڈا لیتا ہے جیسی کو قید کر کے اس سے ہلکے چلو اتار، چراغ چلواتا اور لاکھوں من وزنی مشینیں چلواتا ہے۔ مگر گھوڑا، بیل وغیرہ باوجود ذی روح ہونے کے بحر اپنی ایک ڈگر کے جس پر قدرت نے اس کو چلایا ہے دوسرے جانور کی رفتار و رفتار بھی نہیں لاسکتا۔ لہذا ولی و حسب حکم الہی، ایسے امر مقدر کو نافذ کرنا چاہتا ہے جو تبدیل جسم پر موقوف ہو تو بہائم کی شکل اختیار کرتا ہے کہ ان کی اس طرح کے ضعیف ہونے کی وجہ سے اس کی روح ان پر حاکم بن سکتی ہے، مگر بنی آدم کے اجسام میں جن کے اندر ان کی روح موجود ہو نہیں جاسکتا کہ اس کی روح خود با اختیار حاکم ہے لہذا دوسری روح کا ان میں سمانا ایسا ہی دشوار ہے جیسے ایک نیام میں دو تلوار کا سمانا۔ میں نے کہا بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک روشنی اپنی جگہ پر ٹھہری ہوئی نظر آتی ہے پھر دفعہ کوئی بات اس کو پیش آتی ہے اور وہ اپنی جگہ سے سرکتی اور کسی شخص کی طرف چلتی دکھائی دیتی ہے حتیٰ کہ اس کو (جلا کر) قتل کر ڈالتی ہے عجیب نہیں یہی سبب ہو کہ اس امر مقدر کے پورا کرنے کو اہل تصرف نے آگ کی شکل کو قبول کیا ہو فرمایا ممکن ہے ایسا ہی ہو بشرطیکہ مقتول کا فرہو۔ اس لئے کہ نور کے لشکر اور ظلمت کے لشکر میں شدید جنگ رہتی ہے میں نے کہا کہ بٹی اور کتوں کی شکل میں جو شیاطین متشکل ہوتے ہیں ممکن ہے کہ اس کی بھی یہی نوعیت ہو فرمایا ہاں شیاطین میں ظلمت اور باطل (کی قوت) ہے اور اولیاء اللہ میں حق اور نور (کی قوت) ہے اور ظلمت و نور و لشکر ہیں۔ کبھی تقدیر الہی کی تنفیذ میں بہائم مذکورہ کی صورت و شکل یہ لشکر اختیار کر لیتا ہے اور کبھی ان کی صورت و شکل میں وہ لشکر متشکل ہو جاتا ہے میں نے کہا کیا ولی سانپ کی صورت بھی لے لیتا ہے جیسا کہ جنات اور شیاطین اس شکل کو لیا کرتے ہیں؟ فرمایا ہاں اگر حق تعالیٰ کا اے حکم ہو کہ زید کو زہر کے ذریعہ ہلاک کرے تو تقدیر کے نافذ کرنے کے لئے وہ زہریلے سانپ کی صورت میں متشکل ہو جائے گا۔ میں نے کہا ولی کی روح میں تو زہر نہیں فرمایا زہر نام کس چیز کا ہے۔ ولی کی ہمت و عزیمت ریشی چیز ہے کہ ہر شے کا اثر قبول کرتی ہے یعنی جس وقت بھی وہ کسی شے کا ہمت کے ساتھ عزم کرتا ہے کہ یہ کام کس طرح ہو فلاں صورت وقوع میں آوے بلکہ خدا، وہ فوراً ہو جاتی ہے۔ پھر میں نے آپ سے دریافت کیا کہ جب ولی کی روح (تنفیذ تقدیر کے لئے) اپنے جسم سے باہر نکل جاتی ہے تو اس کا جسم کس حالت پر رہتا ہے؟ فرمایا بلا روح کے رہ جاتا ہے۔ پس اگر ولی چھوٹے درجہ کا ہوتا ہے تب تو اس کے بدن کی حالت ایسی ہوتی ہے جیسے مہموت مدہوش کہ کوئی بات نہیں کرتا۔ اور اگر کرتا ہے تو نہ خود سمجھتا ہے کہ کیا کہہ رہا ہے اور نہ اس سے واقف ہوتا ہے کہ کون بول رہا ہے۔ اور اگر بڑے درجے کا ولی ہوتا ہے تو اس کا جسم اسی حالت پر رہتا ہے جیسا روح ہونے کی حالت میں تھا۔



کہ حالت سابقہ کی طرح نہتا بھی ہے، بولتا بھی ہے، میں نے کہا جب روح ذات سے نکل گئی تو وہ مریا۔ پھر پہلے شخص کے مہوت و مدہوش کی صورت رہنے کا کیا مطلب، اور دوسرے کے اپنی حالت سابقہ پر رہنے کی کیا صورت، جبکہ روح دونوں کی نکل چکی؟ فرمایا روح کے نکل جانے کے بعد بدن میں اس کے آثار مثلاً حرارت وغیرہ باقی رہتے ہیں۔ لہذا جب تک آثار باقی رہیں گے اس وقت تک ذات زندہ رہے گی اور آثار چوبیس گھنٹہ سے پہلے زائل نہیں ہوا کرتے پس جس کی روح اس سے پہلے واپس آ جاتی ہے وہ بدستور زندہ رہتا ہے اور جس کی روح پر بدن سے مفارقت میں مدت مذکورہ گزر گئی ہے وہ پھر اپنے بدن کی طرف کبھی نہیں لوٹ سکتی اور اس کا شمار مردوں میں ہوتا ہے بہترے ولی ہیں جن کی روح اس حالت میں قبض ہو جاتی ہے مگر جن کی روح اس حالت میں قبض ہوتی ہے چونکہ سرکاری خدمت میں قبض ہوتی ہے اس لئے شہر کی طرح، ان پر حق تعالیٰ کی بڑی عنایت ہوتی ہے میں نے کہا کہ بعض اولیاء کا قصہ سنایا ہے تین تین دن ان کی روح بدن سے غائب رہا کرتی تھی اور اس کے بعد لوٹ آتی تھی یہ تو تقریر مذکور کے خلاف پڑتا ہے فرمایا تم نے جو سنا ہے وہ حق ہے اور روح سترہ دن تک بلکہ اس سے بھی زیادہ غائب رہ سکتی ہے مگر اس زمانہ میں ذات کی طرف اس کی توجہ و نگرانی ضروری ہے کہ اس کی توجہ سے ذات کو حیات حاصل ہوتی رہتی ہے جیسے کوئی شخص کپڑے اتار کر کنارہ پر رکھ دے اور ندی میں اتر کر غوطے لگائے تو خود پانی میں ہوگا مگر اندیشہ ہوگا کہ کوئی اس کے کپڑے چرائے نہ لے جائے لہذا بار بار پانی سے سر نکال کر اپنے کپڑوں پر نظر ڈالتا ہے گا اسی طرح روح اپنے چھوڑے ہوئے جسم کو تکتی رہتی ہے فرق اتنا ہے کہ غوطہ خور کی نگرانی کپڑوں کے متعلق صرف نگاہ کے ذریعہ ہوگی۔ اور روح میں چونکہ نقل نہیں اس لئے اس کا ذات کی طرف تکیہ بذریعہ دخول کے ہوگا کہ محض اس دھیان اور چمکنے ہی سے اس کا ذات میں دخول ہو جائے گا اور اس کے بعد اس کو مکلف کو پورا کرنے کے لئے وہ پھر باہر نکل جائے گی اور پھر ذات کی طرف دھیان و توجہ کے ذریعہ داخل ہو جائے گی اور پھر باہر چلی جائے گی غرض جب تک وہ کام پورا نہ ہوگا یہی سلسلہ جاری رہے گا خواہ تین دن میں پورا ہو یا زیادہ دنوں میں پس اس میں اور تقریر گزشتہ میں کوئی منافات نہیں ہے۔

نیز آپ نے فرمایا کہ اہل تصرف ولی جس کی بھی جیب میں چاہے ہاتھ بڑھا کر جتنے روپیہ چاہے نکال لیتا ہے اور جیب دالے کو خبر بھی نہیں ہوتی اس لئے کہ یہ تصرف باطنی ہاتھ کا ہے نہ کہ ظاہری ہاتھ کا، اس کے بعد اپنے ایک ولی کا قصہ سنایا جو اس کے پڑوسی کے ساتھ پیش آیا تھا فرمایا کہ اس پڑوسی کی بیوی کے پاس ایک شخص پانچ دینار امانت رکھ کر کہیں دُور سفر میں چلا گیا اور کہہ گیا کہ زندہ واپس آیا تو خود لے لوں گا اور اگر مر جاؤں تو ان کو میرے بچوں کے حوالہ کر دوں جو۔ امانت رکھنے والے کے پردیس میں چلے جانے کے بعد اس عورت کا وقت گزر



قریب آیا تو اس نے وہ رقم اپنے شوہر کے حوالہ کر دی اور اس کو وصیت کی کہ ان کا مالک جب واپس آئے تو اس  
 کو دیدنیا۔ اس نے وعدہ کر لیا اور اس کے بعد عورت کا انتقال ہو گیا۔ ہمسایہ کی نیت اپنی بیوی کو دفن کرنے کے بعد  
 بگڑ گئی اور وہ امانت کو کھا گیا۔ کچھ دنوں بعد رقم کا مالک سفر سے واپس آیا اور اپنی امانت طلب کی تو یہ  
 انکار کر گیا کہ مجھے بیوی نے کچھ نہیں دیا آخر وہ کر کے بیٹھ رہا، اس کے بعد اس ہمسایہ نے کہا کہ جوڑنا  
 شروع کیا حتیٰ کہ پانچ دینار اس کے پاس جمع ہو گئے اس پر مہ خوشی ہوا اور ولی کو جس کا یہ ہمسایہ تھا،  
 ان کے دروازہ مکان پر کھڑا چھوڑ کر باہر نکلا اور موم بتی فروخت کرنے والوں میں پہنچا دونوں کے مکان شہر  
 فاس کے محلہ راس الجنان میں تھے غرض اس نیت سے کہ حضرت عبدالقادر فاسی کے مزار پر بتی روشن کر ڈالنا  
 اس نے ایک شمع خریدی جس وقت یہ اس تنویر کے قریب پہنچا جو بازار سبع لویات میں واقع ہے تو ولی نے  
 راس الجنان سے ہاتھ پٹھا کر امانت میں عذر و خیانت کی سزا میں اس کی جیب سے پانچوں دینار نکال لئے  
 حتیٰ کہ مزار پر پہنچ کر اس نے شمع روشن کی اور راس الجنان پر پہنچا تو ولی بے ستورا اپنے گھر کے دروازہ پر کھڑا تھا،  
 جب اس کی نظروں پر پڑی تو حق تعالیٰ نے اس کے دل میں خیال ڈالا کہ اپنی جیب کی رقم کو دیکھ لے۔  
 چنانچہ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو کچھ نہ پایا غصہ میں جھپٹا اٹھا اور ولی سے کہ اس کی ولایت کا اس کو وطن و گمان  
 بھی نہ تھا کہنے لگا واللہ دنیا میں کوئی ولی ہی نہیں رہا نہ زندہ نہ مردہ۔ ولی کو سنہی آگئی اور اتنی آلی کہ قریباً زمین  
 پر گر پڑیں اس کے بعد ولی نے ناواقف بن کر پوچھا چچا عبدالرحمن کیا بات پیش آئی؟ کہنے لگا میری جیب میں پانچ  
 دینار تھے اور میں ان کی خوشی میں یہ ارادہ کر کے گھر سے نکلا تھا کہ موم بتی خرید کر حضرت عبدالقادر فاسی کے مزار  
 پر روشن کروں گا۔ اس کی یہ برکت سامنے آئی کہ اچکوں نے جیب ہی خالی کر دی اور پانچوں دینارے اُڑے اس  
 پر ولی کو اور زیادہ سنہی آئی (وہ ولی خود حضرت شیخ تھے) اس کے قریب قریب ایک واقعہ حضرت مدوح کا گھر  
 مجمع میں مولانا محمد بن علی مجاوی کے ساتھ پیش آیا کہ شہر تازی کے نواح میں قبیلہ مجاویہ آباد ہے اور وہ اس کے  
 باشندہ تھے اپنے وطن سے حضرت مدوح کی زیارت کے لئے آئے تھے حضرت اپنے گھر کے دروازہ کے قریب دیوار سے  
 مکر لگا کر بیٹھ گئے اور مولانا محمد بن علی سامنے کے مکان کی دیوار سے مکر لگا کر بیٹھ گئے کہ دونوں کے بیچ میں راستہ  
 تھا جس میں لوگوں کی آمد و رفت تھی حضرت مدوح مولانا سے بہت محبت فرماتے تھے۔ آپ نے دریافت  
 فرمایا کہ تمہارے پاس کچھ دراہم بھی ہیں؟ مولانا نے جواب دیا کہ حضرت میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے  
 غرض تین مرتبہ ایسا ہی ہوا کہ حضرت نے تین بار یہی دریافت فرمایا اور مولانا نے یہی انکار ہی جواب دیا اس  
 کے بعد حضرت نے فرمایا ذرا سوچ کر جواب دو چو کہ مولانا کی جیب میں درحقیقت ایک کپڑے میں بندھے ہوئے  
 اٹھارہ موزونہ پڑے ہوئے تھے اس لئے اقرار کئے بغیر چارہ نہ ہوا اور فرمایا ہاں حضرت اٹھارہ موزونہ پڑے ہیں



فرمایا لاؤ ان کو نکالو۔ انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور خوب تلاش کیا مگر کچھ نہ پایا۔ حیران رہ گئے اور پریشان ہو گئے حضرت کو سنہی آگئی اور اپنے نیچے سے بندھی پوٹلی نکال کر ان کے حوالہ کی اور فرمایا مولانا محمد بن علی بھلا جس کو اتنی قدرت ہو اس سے چھپانے اور چال چلنے کی کیا گنجائش ہے ایسے ہی حضرت ممدوح کی ایک دوسری کرامت ان ہی مولانا کے متعلق ظاہر ہوئی کہ ان کو پتہ کی محبت زیادہ تھی اور دنیا جمع کرنے کے حریص بہت تھے اور حق تعالیٰ نے دنیا بھی ان کو اچھی خاصی دے رکھی تھی۔ اور ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ جب ان کو حضرت ممدوح کی صحبت نصیب ہوئی اور حق تعالیٰ نے حضرت کی محبت ان کے قلب میں ڈال دی تو حضرت ان کو اللہ واسطے خرچ کرنے کی ترغیب دیا کرتے اور یہ دل کھول کر صرف کیا کرتے تھے خود بھی اس پر تعجب کیا کرتے تھے کیونکہ اس کی ان کو عادت ہی نہ تھی۔ آخر حضرت نے ان کو تو بہت ہی سخت پکڑا مگر یہ نہایت مسرور اور خوش ہوتے تھے درحقیقت ہم نتیجہ سے بے خبر تھے اور نہیں سمجھتے تھے کہ مولانا کی وفات کا وقت آچکا ہے اور حضرت ان کے لیے سے ان کے ہاتھوں جنت میں محل تعمیر کر رہے اور ان کا مال و زرات کے جانے سے قبل ان کے پاس پہنچا رہے ہیں حتیٰ کہ جیب اتنا روپیہ رہ گیا جو صرف بیوی کے مہر اور گندے قابل تو کہہ کے لئے کافی تھا تو ان کا انتقال ہو گیا یہی برتاؤ حضرت ممدوح کا مولانا محمد بن علی بن عبداللہ صباغی کے ساتھ ہوا تھا جن کا قصہ شروع کتاب میں لکھا جا چکا ہے کہ حضرت نے اصرار فرمایا کہ اللہ واسطہ ان کا مال خرچ کرادیا اور ختم ہوتے ہی وہ خود جوار رحمت الہی میں پہنچ گئے حضرت ممدوح جیسے بزرگوں کی معرفت سے یہ نفع حاصل ہوا کرتا ہے۔

نیز حضرت نے فرمایا کہ صاحب تصرف ولی کے لوگوں کا مال نکالنے میں اور چور کے مال چلنے میں فرق صرف حجاب اور عدم حجاب کا ہے کہ ولی کو مشاہدہ نصیب ہے اپنے رب کا اور وہ منجانب اللہ مامور ہے اس کے لینے کا چنانچہ حضرت خضرؑ سے چند واقعات جو صورتہ ناجائز صادر ہوئے تو ان کے متعلق حضرت خضرؑ نے خود اظہار فرمایا کہ اے موسیٰ وما فعلتہ عن امری میں نے یہ کام اپنے حکم سے نہیں کیے بلکہ حکم خدا کے تھے۔ لہذا وہ معصیت اور ظلم نہیں ہیں) نیز آپ نے فرمایا کہ حضرت منصور قطب ایک مرتبہ مولانا ادریس کے روضہ میں پہنچے۔ وہاں حضرت ابو یغری بکاری کو موجود پایا کہ زیارت کے لئے آئے تھے حضرت منصور انکا زادہ راہ لے کر چل دئے میں نے حضرت ممدوح سے اس کے متعلق عرض کیا کہ یہ تو صریح سرقہ ہے۔ قطب ہو کر اور ایسا کام فرمایا ولی اور چور کے مال لینے میں فرق حجاب اور عدم حجاب کا ہے کہ اہل تصرف سے پردہ اٹھا دیا جاتا ہے اور حقیقت اس پر نکشوت ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ حضرت خضر علیہ السلام سے پردہ اٹھا کر انجام اور مصالح کا ان کو مشاہدہ کرادیا گیا۔ لہذا ولی کو اس کا لینا حلال ہوا اور سارق پر پردہ پڑا ہوا ہے اور حقیقت نکشوت نہیں ہوئی لہذا اس کو لینا حرام ہے۔



یہی حضرت منصور چونکہ قطب تھے اور ان کو مشاہدہ ہو چکا تھا کہ یہ زادہ راہ ان کا ہے اور لوح محفوظ میں اس کو اپنی قسمت کا لکھا ہوا دیکھ چکے تھے اور پھر حق تعالیٰ کی طرف اس کے لینے کا حکم بھی سن لیا تھا، لہذا وہ ان کے لئے حلال تھا برخلاف سارق کے کہ وہ نجوب اور رب سے غافل ہے لہذا اس کے لئے امر شرعی ہی حاکم ہے اور جب اس نے اجازت دی نہیں تو اس کو کسی کا پیہ لینا حرام ہوا، پھر آپ نے حضرت عبدالرحمن بن ہزیم کا قصہ نقل فرمایا کہ ان کے رفقاء نے ایک بیل پکڑ لیا حضرت عبدالرحمن نے فرمایا زبح کرو اور کھاؤ ورنہ چنانچہ سب نے کھایا، مگر حضرت یوسف ناسی نے جو ان کے وارث (اور خلیفہ) ہوئے تھے ہاتھ پھینچ لیا کہ مالک کی اجازت کے بغیر مال مفسد کیسے کھا لیا جائے۔ آخر کار اس کا مالک آیا تو اس نے اطلاع دی کہ وہ بیل حضرت عبدالرحمن اور ان کے رفقاء کے لئے صدقہ ہے۔ یہی صورت حضرت ابو یعزیٰ مذکور کی تھی کہ وہ حضرت منصور کے اتنے مخلص و عاشق تھے، اگر ممکن ہوتا کہ وہ اپنے گوشت کے نوالے بنا کر حضرت منصور کو دیدیں تو ضرور کر گزرتے۔ واللہ اعلم۔

### ریانچوان باب) پیری مریدی اور اس کے متعلق حضرت مدوح کے ارشادات

ایک مولوی نے آپ سے حضرت زروق رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کا مطلب دریافت کیا کہ صوفیہ کی اصطلاح میں جس کا نام تربیت ہے وہ منقطع ہو چکی اور اب صرف بہت اور حال کے ذریعہ تربیت باقی رہ گئی ہے کہ کتاب اللمذ اور سنت رسول اللہ کو اس میں کمی و بیشی کئے بغیر مضبوط مقام لے۔ سوال یہ تھا کہ اصطلاحی تربیت صرف حضرت زروق کے زمانہ میں منقطع ہو چکی تھی یا سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے نزول تک (ہمیشہ کے لئے) جاتی رہی۔ اگر ہمیشہ کے لئے) جاتی رہی تو اس کی وجہ کیا؟ اور اگر باقی ہے تو ایسے شیخ کا پتہ بتائیے جو مرید کی روح میں بحالت خلوت جس قسم کا چاہے نظرت کر سکے اور اس کو صاحب نسبت و اصل بنادے یہ مولوی وہی تھے جنہوں نے سورۃ ق کے متعلق اور دو تحریروں والی اس حدیث کی بابت سوال کیا تھا جس میں اہل جنت اور اہل جہنم کی فہرست اسماء کا ذکر آیا ہے حضرت مدوح نے جواب ارشاد فرمایا کہ تربیت سے مقصود نفس کی نخوت و تعلیٰ کا دور کرنا ہے کہ ذات ترائی پاک صاف ہو کر سیر الہی کا بوجھ برداشت کر سکے اور یہ بغیر اس کے ناممکن ہے کہ اس کی ظلمت دور اور باطل کے تعلقات قطع ہو جائیں پھر باطل کے تعلقات کے قطع ہونے کی صورت کبھی تو یہ ہوتی ہے کہ اس کی اصل آفرینش ہی صفائی و طہارت ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ بلا واسطہ اس کو اخلاقی گندگیوں سے پاک بنا دیتا ہے یہ حالت تو قرون ثلثہ کی تھی جن کو خیر القرون کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ کے لوگ بالطبع حق کے ساتھ متعلق اور اس کی تلاش میں لگے ہوئے تھے سوتے تھے تب اسی حال میں اور جاگتے تھے تب اُسے میں اور حرکت کرتے تھے تب اسی طلب و تلاش میں حتیٰ کہ جسے خدا نے بصیرت بخشی ہے اس نے ان کے باطن پر نظر ڈالی ہے تو ان کی عقول کو اللہ و رسول کے ساتھ واسیتہ اور ان ہی دو کی خوشنودی کا طالب و جو یاں پایا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے قلوب میں حق کا نور



(مؤرج سے زیادہ) دمک اٹھا اور علم و اجتہاد کے اُس درجہ پر پہنچ گئے تھے جس کی کیفیت بھی ناقابل بیان ہے۔  
 اور دوسروں کو اس کا حصول بھی ناممکن ہے لہذا اُس زمانہ میں اصطلاحی تربیت کی ضرورت ہی نہ تھی۔ طہارت  
 ذات و صفائے عقل اور ہمہ وقت راہِ حق کے انتظار و دھیان کی وجہ سے محض اتنا کافی تھا کہ شیخ نے اپنے  
 مرید کو پاس بٹھا کر کان میں بات کی اور مرید کو فتح نصیب ہو گئی اور کبھی قطع باطل کی صورت یہ ہوتی ہے کہ شیخ  
 کو مرید کی ذاتِ تراپی سے ظلمت مٹانے کی تدبیر کرنا پڑتی ہے اور یہ حالت قرونِ ثلاثہ کے مابعد زمانہ کی ہے  
 کہ نیتوں میں فساد آگیا۔ باطن خراب ہو گئے عقول کا تعلق بجائے اللہ و رسول کے دنیا کے ساتھ ہو گیا، اور  
 حصولِ شہوات اور طلبِ لذت میں ڈوب گئے لہذا صاحبِ بصیرت شیخ کے پاس جب مرید آیا تو اس نے  
 دیکھا کہ اس کی عقل متعلق و دالبتہ ہے باطل اور حصولِ شہوات کے ساتھ اور اس کی ذاتِ تراپی بھی عقل کی تابع  
 بن کر اہلِ غفلت سے مانوس اور اہلِ باطل کی طرف مائل ہو گئی کہ اس کے اعضا و جو بھی حرکت کرتے ہیں وہ غیر محمود  
 افعال اور ناپسندیدہ احوال ہی ہیں حرکت کرتے ہیں کیونکہ جو ان کی مالک تھی یعنی عقل وہ خود باطل کے ساتھ  
 دالبتہ ہو گئی ہے انہوں نے مرید کو اس حالت پر قابو پایا تو ظہور اور ذکر اور تقییلِ غذا کا اس کو حکم دیا کہ گوشہ میں  
 بیٹھنے سے اہلِ باطل کا تعلق جن کا شمار مردوں میں ہے قطع ہو جائے گا۔ اور ذکر میں مشغولیت سے لغو گوئی اور کلام  
 باطل جو ہر وقت زبان پر جاری تھا نائل ہو جائے گا اور تقییلِ غذا سے خون کے بخارات کہ شہوتِ اسی سے پیدا  
 ہوتی ہے کم ہو جائیں گے اور عقل اللہ و رسول کے ساتھ تعلق کی طرف لوٹ آئے گی اور مرید جب اس طریق سے  
 طہارت و صفائی تک پہنچ جائے گا تو اس کی ذاتِ سرِ الہی کو اٹھا سکے گی بس یہ ہے مشائخ کی غرضِ تربیت سے  
 اور ملکوت میں بٹھانے سے چنانچہ مدت تک یہ طریق جاری رہا حتیٰ کہ حق و باطل کے ساتھ اور نورِ ظلمت کے ساتھ  
 مخلوط ہو گیا کہ اہلِ باطل کے پاس بھی جو آیا وہ اس کو بہ نیتِ ناسئدہ اور باغراضِ باطلہ خلوت میں بیٹھانے اور  
 اسمائے الہیہ کی تلقین کرنے لگے بلکہ اس کے ساتھ تعویذات اور عملیات کا اضافہ کر دیا جو استدراج کو مقتضی ہیں کہ  
 ان کے اثرات اور رجوعِ مخلوقات دیکھ کر سمجھتے ہیں کامل بن گئے، حضرت زروق کے زمانہ میں چونکہ یہ رنگ بہت پھیل  
 گیا تھا اس لئے انہوں نے دینی خیر خواہی کی غرض سے یہ مشورہ دیا کہ اس طریقِ تربیت کو جس میں اہلِ باطل کی شرکت ہو گئی ہے  
 اور وہ امن کا راستہ اختیار کریں جس میں نہ کوئی خطرہ ہے نہ پریشانی یعنی کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کا اتباع  
 کہ اس میں اہلِ باطل کی شرکت محال ہے اور اگر کریں گے تو خود اہلِ حق بن جائیں گے ان کی خیر خواہی بھی اسی میں ہے  
 الحاصل شیخ زروق کا یہ قول دینی مصلحت پر مبنی ہے نہ یہ کہ اصطلاحی تربیت کے وہ منکر یا اس کو منقطع سمجھ  
 رہے ہیں اور ایسا کیسے کہہ سکتے ہیں جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرامد آپ کی خیر و برکت اُمت کے شامل حال ہے۔  
 اور قیامت تک باقی رہنے والی ہے رہا آپ کا یہ سوال کہ ایسا شیخ تربیت کون ہے جس کو حوالہ مرید اپنے آپ کو کر دے؟



اس کا جواب یہ ہے کہ شیخ ایسا ہونا چاہیے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے آگاہ ہو، اور اس کی ذات نور محمدی سے سیراب کی گئی ہو کہ قدم بقدم ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اور حق تعالیٰ نے اس کو کمال ایان اور صفاء معرفت عطا فرمایا ہو ایسے شیخ کا جب دامن پکڑا جائے گا اور اس کی محبت کو دل میں جگہ دیکر صحبت اختیار کی جائے گی تو وہ مرید کو اللہ تک پہنچائے گا اور معرفت الہیہ میں جو خطرات و دساوس سدراہ بنے ہوئے ہیں ان کو قطع کر دے گا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں ترقی دلائے گا۔ رہا یہ امر کہ اس کا نام بتایا جائے سوال اللہ کا ملک خالی ہے۔

الحمد للہ اکثر جگہ ایسی سہتیاں موجود ہیں مگر اہل سنت والجماعت سے باہر نہ ہوں گی کوشش کرو ضرور پاؤ گے فَإِنَّ اللَّهَ تَعَالَى الَّذِي تَتَّقُونَ وَالَّذِينَ هُمْ يُحْسِنُونَ وَاللَّهُ أَعْلَمُ۔

نیز عالم مذکور نے حضرت ممدوح سے ایک سوال یہ کیا کہ جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سیداری میں دیکھے گا دعویٰ کرے عارفین اس کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کا دعویٰ قابل قبول نہیں جب تک کہ ثبوت پیش نہ کرے اور وہ ثبوت یہ ہے کہ ایک کم تین ہزار مقام طے کر چکا ہو لہذا وہ مقامات اسی سے دریافت کئے جائیں پس حضرت دال محضہ طور پر ہم سے بیان فرمائیں کہ وہ مقامات کیا ہیں؛ حضرت ممدوح نے جواب دیا کہ ہر ذات کے اندر تین سو چھیانوے رگیں ہیں اور ہر رگ اس خاصیت کی حامل ہے جس کے لئے وہ پیدا ہوئی ہے اور صاحب بصیرت عارف ان تمامی عروق کا مشاہدہ کرتا ہے در انحالیکہ ان کے خواص ان میں مشتمل ہیں ایک رگ کذب کی ہے جس میں اس کی خاصیت مشتمل ہے۔ ایک رگ حسد کی ہے جس میں حسد چمک رہا ہے ایک رگ ریا کی ہے جس میں ریا روشن ہو رہا ہے۔ ایک رگ غدر کی ہے جس میں غدر چمک رہا ہے ایک رگ خود پسندی کی ہے جس میں وہ روشن ہو رہی ہے ایک رگ کبر کی ہے جو اس کو چمک رہی ہے اسی طرح تمام عروق میں جدا جدا خاصیتیں چمک رہی ہیں حتیٰ کہ عارف جب ذات پر نظر ڈالتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک چھاڑ میں تین سو چھیانوے قمقمے لٹکا دیئے جائیں اور ہر قمقمہ کی روشنی کا رنگ جدا ہو کہ ایک دوسرے کے بالکل مشابہ نہ ہو پھر ان خواص میں ہر خاصیت کی مختلف اقسام ہیں مثلاً شہوت کی کئی قسمیں ہیں اگر شرمگاہ کی طرف اس کا انتساب کیا جائے تو جدا قسم ہے اور جاہ کی طرف نسبت کی جائے تو جدا قسم ہے اور مال کی طرف نسبت کی جائے تو جدا قسم ہے اور طول اہل کی طرف نسبت کی جائے تو جدا قسم ہے اسی طرح کذب کی خاصیت مثلاً اس اعتبار سے کہ صاحب کذب کبھی سچ نہیں بولتا علیحدہ قسم ہے اور اس لحاظ سے کہ دوسرے کو سمجھتا ہے وہ سچ نہیں بولتا اور اس کے کلام میں شک لانا اور اس کو سچا نہیں سمجھنا یہ علیحدہ قسم ہے اور بندہ کو فتح نصیب نہیں ہوتی جب تک کہ ان تمامی مقامات کو طے نہ کرے جب حق تعالیٰ کسی بندہ کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتا اور فتح کی اہلیت بخشتا ہے تو آہستہ آہستہ یہ تدریج ان مقامات کو قطع کر دیتا ہے۔ مثلاً خاصیت کذب کو قطع کرتا ہے تو مقام صدیق پر پہنچ جاتا ہے۔ اور پھر



مقام تصدیق پر جا پہنچا ہے۔ اور جب خاصیت شہوت فی المال کو قطع کرتا ہے تو مقام زہد حاصل ہو جاتا ہے۔ اور شہوت زنا و دیگر معاصی کو قطع کرتا ہے تو مقام توبہ پر فائز ہوتا ہے۔ اور شہوت طول اہل کو قطع کرتا ہے تو اس دھوکہ کے گھر (یعنی دنیا) سے بے تعلق کے مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ پھر جب اس کو فتح نصیب ہوتی ہے اور ستر الہی اس کی ذات میں مستقر ہو جاتا ہے تو یہ تدریج عوالم کے مقامات مشاہدہ قطع کرتا ہے۔ سب سے پہلے ترانی اجسام کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس کے بعد علوی اجرام کا اور پھر اجرام نورانیہ کا اور پھر مخلوق میں افعال الہیہ کے سرمان کا نیز ترانی اجسام کے مشاہدہ میں بھی تدریج ہوتی ہے کہ اول اس زمین کا مشاہدہ کرتا ہے جس میں خود موجود ہے اس کے بعد ان سمندروں کا مشاہدہ کرتا ہے جو اس زمین میں واقع ہیں پھر اپنی زمین کے اور دوسری زمین کے مابین کا مشاہدہ کرتا ہے کہ اس کی نظر تخوم رضخامت ارضی کو بھاڑتی چلی جاتی ہے زمین دوم تک پھر دوسری زمین کا مشاہدہ کرتا ہے اور پھر اس کے تخوم کا ارض سوم تک اسی طرح ساتویں زمین کا مشاہدہ کرتے کے بعد اس خلا کا مشاہدہ کرتا ہے جو زمین سے لے کر پہلے آسمان تک واقع ہے۔ پھر پہلے آسمان کا مشاہدہ کرتا ہے اس کے بعد اس فضا کا جو فلک اول اور فلک دوم کے درمیان ہے اور پھر فلک دوم کا۔ غرض زمینوں کی ترتیب کے موافق ساتویں فلک کا مشاہدہ ختم کر کے عالم بندخ اور عالم ارواح کا مشاہدہ کرتا ہے جو آسمان میں ہیں۔ پھر ملائکہ اور محافل فرشتوں کا اور امور آخرت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اور ان مشاہدات کے ہر مشاہدہ میں بندہ پر ایک حق ہے منجملہ حقوق ربوبیت کے اور ایک خاص ادب ہے آداب عبودیت میں سے جس کا ادا کرنا اس پر فرض ہے اور اس زمانہ مشاہدات میں اس کو موانع و قوائع پیش آتے اور ایسے خوفناک خون ریز امور نظر آتے رہتے ہیں کہ اگر اللہ کا فضل و کرم اور اس کی توفیق بندہ ضعیف کے شامل حال نہ ہو تو ادنیٰ درجہ کا نقصان یہ ہے کہ صاحب مشاہدہ دیوانہ اور بے عقل بن جائے۔ پھر مقامات مشاہدہ کا قطع کرنے خواص نفوس کے مقامات قطع کرنے سے بھی زیادہ سخت ہے اس لئے کہ مقامات خواص کا قطع کرنا امر باطنی ہے جس کی خبر خود اس کو بھی فتح نصیب ہونے کے بعد ہوتی ہے اور مقامات مشاہدہ کا قطع کرنا امر ظاہری ہے کہ نظر سے دیکھتا اور معائنہ کرتا ہے کیونکہ اس میں (تلم کی خدمت انجام دینے کے لئے) فتح کے بعد اس کو مشغول ہونا ہے پس جب تمامی مقامات طے کر کے، اس کی نظر صاف اور اس کا نور بصیرت کامل ہو جاتا اور اللہ کی وہ رحمت جس کے بعد شفاوت نہیں ہے اس پر بکرتی ہے تو سید الاولین والاخرین علیہ افضل الصلوٰۃ وازکی التسلیم کی رحمت اس کو نصیب ہوتی ہے کہ آپ کو آنکھوں سے دیکھتا اور بیداری میں آپ کی زیارت کرتا اور اس نعمت سے سالامال ہوتا ہے جسے نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی قلب پر اس کا خیال گذرا۔ یہ وقت ہے اس کے فرح و سرور اور مستحق مبارکباد ہونے کا ابدی سعادت اس کو نصیب اور صد مبارک۔ یہ تمام خواص نفوس مع ان کی اقسام و تفاسیل کے اور یہ مقامات جو مشاہدات مذکورہ ہیں طے ہوتے ہیں اگر یکجا جمع کرو تو تین ہزار سے بھی زائد ہو جائیں گے۔



پھر یہ بھی سمجھ لو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل مطہرہ امت پر پوشیدہ نہیں ہیں کہ ذات مقدسہ کے ظاہری و باطنی محاسن مخصوصہ کو حضرات علمائے جمع اور کتابوں میں مدون کر دیا ہے۔ لہذا جو شخص دعویٰ کرے بحالت بیداری آپ کی رویت کا اس سے آپ کے شمائل زکیہ اور احوال علیہ درجات کئے جائیں اور اس کا جواب سنا جائے کہ آنکھوں سے دیکھنے والا چھپ نہیں سکتا اور نہ دیکھنے والے کے ساتھ مستتبہ نہیں ہو سکتا۔ والسلام۔

اگر اس جواب سے تسلی ہو گئی ہو فہما ورتہ دوسری تقریر سنو۔ حق تعالیٰ جب کسی بندہ کو فتح نصیب فرماتا ہے تو اس کو انوار حق میں سے ایک نور عطا فرماتا ہے جو تمامی اطراف سے اس کی ذات پر داخل ہوتا ہے اور وہ تمامی جہات میں حتیٰ کہ لکیرے کی طرح، بڑی اور گوشت میں گھستا چلا جاتا ہے۔ اور ذات پر اس نور کے داخل ہونے کی تکلیف قریب قریب جانکشی و سکرات موت کے ہوتی ہے۔ پھر اس نور کی شان یہ ہے کہ جس مخلوق کا اس بندہ کو حق تعالیٰ مشاہدہ کرانا چاہتا ہے اس کے اسرار اس پر وارد کرتا ہے کہ ذات عبد پر یہ نور مخلوقات مذکورہ کے الوان سے متلون ہو کر داخل ہوتا ہے مثلاً جب حق تعالیٰ اس زمین کی مخلوقات کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہے تو ایک دفعہ یہ نور آتا ہے اور وہ اسرار جن سے بنی آدم آفرینش ہو رہی ہے ساتھ لے کر ذات میں سرایت کرتا چلا جاتا ہے پھر دوبارہ آتا ہے تو وہ اسرار جن سے چوبایوں کی تکوین ہوئی ہے ساتھ لے ہوئے سرایت کرتا ہے پھر تیسری دفعہ آتا ہے تو وہ اسرار جن سے جادات یعنی بھوں اور میوؤں کی تکوین ہوئی ہے ان کو لے ہوئے سرایت کرتا چلا جاتا ہے غرض جس مخلوق کا بھی مشاہدہ کرایا جاتا ہے اول اس کے اسرار اس بندہ کی ذات کو سیراب کیا جاتا ہے اور ہر مرتبہ اس کو جانکشی کی مشقت برداشت کرنا پڑتی ہے اور منجملہ مخلوقات کا سید الوجود اور علم الشہود صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہیں۔

لہذا جب حق تعالیٰ مشاہدہ ذات محمدی کا انکشاف فرمانا چاہتا ہے توجیب تک آپ کی ذات مقدسہ کے اسرار سے اس کو سیراب نہ کر دیا جائے وہ آپ کا مشاہدہ نہیں کر سکتا۔ اب فرض کر دو کہ فتح سے قبل ذات عبد خیر ایک تاریک جسم کہے اور ذات محمدی گویا ایک نور ہے جس کی ایک لاکھ یا اس سے بھی زائد شاخیں ہیں توجیب اس تاریک جسم پر حق تعالیٰ لطف و کرم فرمانا چاہے گا تو وہ نور جو اس کو عطا فرمائے گا وہ ان شاخوں میں یکے بعد دیگرے نفوذ کرتا اور حسب طاقت اس سے متاثر و متلون ہوتا رہے گا۔ مثلاً شعبہ صبر میں نفوذ کرنے سے اس کی ضد یعنی اضطراب بے صبری کی ظلمت زائل ہو جائے گی اور جب مثلاً شعبہ رحمت میں جائے گا تو اس کی ضد یعنی بے دردی کی سیاہی دور ہو جائے گی اور جب مثلاً شعبہ حلم میں جائے گا تو اس کی ضد یعنی عدم تحمل کی سیاہی مٹ جائے گی غرض اسی طرح ذات مطہرہ کے تمامی شعبوں میں وہ نور جائے گا اور ذات منظمہ سے تمامی اوصاف منظمہ کی تاریکیاں زائل ہو جائیں گی۔ اس وقت بندہ اس قابل ہوگا کہ ذات محمدی کا مشاہدہ کر سکے کیونکہ جب تک ذرا سی سیاہی باقی رہے گی وہ ذات پر سیاہ نشان بنا رہے گا اور جب تک ذات سے سیاہی بالکل لکلی جائے گی ذات شریفہ کے مشاہدہ کی طاقت اس میں ہرگز



نہ آئے گی۔ اور ذات محمدی کے اسرار سے سیراب کئے جانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ذات ولی کو وہ کمال حاصل ہو جائے گا جو ذات محمدی کو حاصل ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ اس کی ذات کو اصل آفرینش میں جتنی طاقت دی گئی ہے اس کے موافق اس کو سیرابی نصیب ہوگی نیز ہماری یہ مراد بھی نہیں کہ جب ذات ولی کو شہنائی نور محمدی سے سیراب کیا جائے گا تو ذات محمدی میں نقص آجائے گا اور آپ کے نور کی جگہ خالی ہو جائے گی۔ کیونکہ نور سے رکتے ہی چراغ روشن کرو، نور اپنی جگہ سے زائل نہیں ہوا کرتا۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ بندہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشاہدہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے تمامی اوصاف رزقہ ذات محمدی کے اسرار شریفہ و انوار لطیفہ کے درود کی بدولت محو و معدوم نہ ہو جائیں اور اس میں بیشمار مقامات قطع کرنے ضرورت ہے پس جس نے دو تہزار یا زیادہ میں حصر کر دیا ہے گویا اس نے اپنی حالت کی جزدی ہے اور جتنی فتح اس کو نصیب ہوئی تھی اس کا حال ظاہر کیا گیا ہے اور جو مقامات باقی رہ گئے وہ رو گئے۔ اور ہم نے جو کہا ہے کہ جب تک ذات مقدسہ کے تمامی شعبوں سے سیرابی نہ ہوگی آپ کا مشاہدہ نہ ہوگا، اس سے مراد مشاہدہ علی الکمال ہے کہ فرض کر دیکر ایک شعبہ باقی رہ گیا اور مشاہدہ حاصل ہو گیا تو مشاہدہ تو حاصل ہوا مگر بدرجہ کمال حاصل نہیں ہوا۔ واللہ اعلم۔

نیز عالم مذکور نے ایک یہ سوال کیا کہ شیخ کامل جب دعویٰ کرتا ہے کہ مرید کی تربیت ہمت اور حال کے ذریعہ کیا کرتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ قرب کی حالت میں اس کو پورا نفع ہوتا ہے اور جب سفر وغیرہ کی وجہ سے بعد ہو جاتا ہے تو مرید کے علم اور عمل اور حال (یقینوں) منافع میں کمی آ جاتی ہے؟ حضرت ممدوح نے جواب دیا کہ شیخ کامل کی ہمت در حقیقت اس کا نور ایمان ہے کہ اس کے ذریعہ مرید کی تربیت کرتا ہے اور مرید کو اسفل کا درجہ سے اعلیٰ درجہ پر چڑھایا کرتا ہے پس اگر شیخ کے ساتھ محبت مرید کو اپنے نور ایمان سے ہوتی ہے تو شیخ کی طرف سے اس کو فیضان غائب ہو یا حاضر بہر حال پہنچتا رہتا ہے بلکہ شیخ کی وفات کے بعد بھی ہزاروں برس کیوں نہ گذر جائیں فیض جاری رہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر قرن کے اولیاء اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نور ایمان سے فیض حاصل کرتے رہے اور آپ کا نور ایمان ان کی تربیت فرماتا اور ترقی بخشتا رہا ہے کیونکہ اولیاء کی محبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ (اغراض، نفسانی سے) پاک صاف اور نور ایمان سے ہوا کرتی ہے اور اگر مرید کی محبت شیخ کے ساتھ نور ایمانی سے نہ ہو بلکہ ذات ترائی سے ہو تو جب تک سامنے موجود رہے گا نفع پہنچے گا اور جب ذات مرید ذات شیخ سے منقطع ہو جائے گی تو نفع بھی منقطع ہو جائے گا اور ذات کی محبت کی علامت یہ ہے کہ شیخ کے ساتھ تعلق و محبت کسی دنیوی یا اخروی نفع حاصل، یا مضرت دفع کرنے کی غرض سے ہو اور نور ایمان کی محبت کی شناخت یہ کہ خالص موجب اللہ ہو کہ شیخ چونکہ اللہ کا ولی اور رسول کا نائب ہے اس لئے دل اس کی طرف کھچتا اور اس کو پیارا سمجھتا ہے، کیسی غرض کی خاطر نہ ہو پس اگر مرید کو بحالت عدم موجودگی شیخ کمی و ضعف محسوس ہوتا ہے تو



اس میں کمزوری و کوتاہی اسی کی طرف سے نہ کہ شیخ کی طرف سے۔ واللہ اعلم  
 نیز عالم مذکور نے ایک سوال یہ کیا کہ (وصول الی اللہ میں) طریق شکر ادائی ہے یا طریق مجاہدہ۔ امام شاذلی  
 اور ان کے متبعین کا طریق طریق شکر ہے جس کا مدار منعم جل جلالہ کے ساتھ فرح و سرور اور شکر و امتنان پر ہے  
 مشقت اور تعب و محنت پر ہے کہ راتوں جاگے اور بھوک کی تکلیفیں جھیلے۔ پھر یہ دونوں طریق باہم متفق ہیں  
 کہ امام شاذلی بھی وصول کے لئے ریاضت کو ضروری کہتے اور وصول الی اللہ کے حصول یا قرب حصول پر شکر و فرح  
 کا حکم فرماتے ہیں، یا ان کے نزدیک اول ہی پہلہ میں ابتدا ہی سے شکر مامور ہے اس لئے دونوں طریق جدا ہیں؟  
 اور اگر جدا ہیں تو کیا ایک شخص کو دونوں طریق کا سکوٹ ممکن ہے، یا جب تک دوسرے سے یکسو نہ ہو جائے  
 ایک سے نفع نہیں اٹھا سکتا؟ حضرت ممدوح نے جواب دیا کہ اصل طریق تو طریق شکر ہی ہے کہ حضرات  
 انبیاء و اولیاء و صحابہ و دیگر اصفیاء کے قلوب اسی طریقہ شکر پر ہوئے جس کا حاصل یہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ اللہ  
 کی عبادت ہو اور تمامی خطوط نفس سے بیزاری۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے عجز و قصور کا اقرار اور حق ربوبیت  
 ادا نہ کر سکنے کا اعتراف ہو، اور ہر حال اور ہمہ وقت یہ اذعان قلب میں جما ہوا ہو۔ جب حق تعالیٰ نے اس مہمون  
 میں ان کی سچائی اور بخلگی کو جانچ لیا تو اس کے صلہ میں بمقتضا و لطف و کرم ان کو فتح اور اسرار ایمان بکچھ  
 عطا فرمائے۔ اہل ریاضت نے جب دیکھا کہ ان کو فتح اور معرفت الہیہ حاصل ہو گئی تو انہوں نے بھی اسی کو اپنا  
 مطلوب و مقصود قرار دیا اور راتوں جاگ کر اور نمازیں پڑھ کر دنوں روزے رکھ کر اور ہمہ وقت خلوت و عزلت  
 میں رہ کر اس کی طلب میں لگ گئے اور جو حاصل کرنا تھا انہوں نے بھی حاصل کر لیا پس طریق شکر میں تو شروع ہی  
 سے ہجرت ہوتی ہے اور اللہ اور اس کے رسول کی طرف نہ کہ فتح اور مکاشفات کی طرف اور طریق ریاضت میں ہجرت ہوتی ہے  
 فتح اور حصول مراتب و مشاہدات کی طرف۔ نیز طریق شکر میں سیر قلوب ہے کہ دل کھچتے ہیں مولیٰ کی طرف۔ اور  
 طریق ریاضت میں سیر ابدان ہے کہ جسم جھکتا ہے اللہ کی طرف، طریق شکر میں فتح کا حصول دفعتی ہے کہ بندہ  
 کی طرف سے اس کا انتظار بھی نہیں ہوتا وہ اپنے گناہوں سے توبہ و استغفار ہی کے مقام میں تھا کہ اچانک  
 فتح مبین آگئی۔ برخلاف طریق ریاضت کے کہ اس میں طلب ہی فتح و مشاہدہ کی تھی اور وہ برسوں انتظار اور  
 صدمات و مشقتیں برداشت کرنے کے بعد نصیب ہوتی، دونوں راستے صحیح اور سچے ہیں مگر شکر کا راستہ زیادہ صحیح  
 اور با اخلاص ہے ریاضت میں دونوں طریق متفق ہیں مگر طریق شکر میں ریاضت ہے قلوب کی کہ ہمہ تن و ہمہ وقت  
 وابستہ ہیں اللہ سے پڑے ہوئے ہیں۔ اس کے استانہ پر۔

ایک لفظ بھی ہٹنا نہیں جانتے۔ تمامی حرکات و سکنات میں پناہ پکڑے ہوئے ہیں اللہ کی، کہ  
 اوقات حضور میں ایک لمحہ کی بھی غفلت پاس نہیں چھوکتی۔



غرض طریق شکر میں ہمہ وقت اور دائماً تعلق مع اللہ کی ریاضت ہے اگرچہ بدن کسی بڑی عبادت میں مشغول نہیں، اور اسی لئے اس طریق واسے کی حالت یہ ہوتی ہے کہ کبھی روزہ رکھتا ہے تو کبھی نہیں رکھتا نماز کے لئے، شب میں اٹھتا بھی ہے اور باقی رات میں آرام سے، سوتا بھی ہے بیوی سے سمہیتر بھی ہوتا ہے اور عامی مباحات شرعیہ کو جو کہ بدنی ریاضت کے منافی ہیں اختیار کرتا ہے۔ اور طریق ریاضت واسے کی ہجرت چونکہ حصول مراتب کی جانب ہوتی ہے اس لئے (اندیشہ رہتا ہے اور) کبھی فتح حاصل ہو جانے کے بعد بھی اس کی یہی نیت قائم رہ جاتی ہے (جو اخلاص کے منافی ہے) اور اس کا قلب ان ہی امور میں پھنسا رہ جاتا ہے جن کا علوم میں مشاہدہ کیا تھا اور کشف و خوارق عادات مثلاً پانی پر چلنا اور ہوا پر اڑنا اس کی مسرت و شادمانی کا سامان بن جاتا ہے یہ لوگ تو وہ ہیں جن کے قلوب ابتداء میں بھی اللہ سے خالی رہے (کہ اس کو مطلوب نہ بنایا) اور انتہا میں بھی خالی رہے (کہ غیر اللہ سے مانوس و مسرور ہوئے) لہذا ان میں داخل ہوتے جن کے متعلق حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ بروئے اعمال سب میں زیادہ خسارہ کے اندر وہ لوگ ہیں جن کی دنیوی زندگی کی ساری محنت رائیگاں گئی اور وہ سمجھتے رہا کہ ہم اعمال حسنہ کر رہے ہیں البتہ بعض ایسے ہوتے ہیں کہ حصول فتح کے بعد ان کی نیت بدل جاتی اور حق تعالیٰ ان پر رحم فرما کر ان کا ہاتھ تمام لیتا ہے۔ لہذا وہ غیر سے منہ پھیر کر اللہ کے ہو جاتے ہیں مگر یہ حالت جو ان کو آخر میں نصیب ہوتی وہی ہے جو طریق شکر واسے کو شروع میں نصیب تھی۔ اب خود دیکھ لو کتنا فرق ہے دونوں راستوں میں خلاصہ یہ ہے کہ طریق شکر میں چلنا پڑتا ہے قلوب کو اور طریق ریاضت میں چلتے ہیں ابدان طریق شکر میں نیت خالص ہوتی ہے اور طریق میں نیت (خود غرضی و طلب فتح سے) آمیز ہوتی ہے۔

طریق شکر میں حصول فتح دفعی ہے کہ بندہ کی طرف سے انتظار بھی نہ ہو لہذا ربانی (اور وہی) ہوتی اور طریق ریاضت میں فتح کا حصول سبب اور تدبیر سے ہوا (لہذا کسی واکتسابی ہوتی) طریق شکر کی فتح بجز مومن عارف اور محبوب مقرب کے دوسرے کو نہیں مل سکتی اور ریاضت کی فتح میں (جوگی اور) عیسائی یہودی راہب بھی شریک ہو سکتے ہیں کہ اس کے فدیہ استدراج تک پہنچ جاتے (اور کشف و خوارق عادت کا ظہور ہونے لگتا ہے ہماری یہ بحث مطلق ریاضت میں ہے کہ حق ہو یا باطل کو سید کشف و خوارق بنجاتی ہے) ورنہ خاص ریاضت جو امام غزالی کی طرف منسوب ہے وہ ہرگز اس میں داخل نہیں اور فقہ اس میں گفتگو ہے کہ امام محدوح تو پیچے دلی اور اہل حق تھے (اور ان کا تعلیم کردہ طریق ریاضت بھی موصل الی الحق اور وسیلہ قرب الہی ہے) رہا یہ سوال کہ کوئی سالک ان دونوں طریق کو جمع کر سکتا ہے یا نہیں؟ سو جواب یہ ہے کہ دونوں میں منافات نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کا قلب تمامی حرکات و سکنات میں اللہ سے وابستہ ہو (جو حاصل ہے طریق شکر کا) اور بدن اس کا مجاہد و ریاضت میں لگا ہو (جو حاصل ہے طریق ریاضت کا) واللہ اعلم فحق تعالیٰ کا ارشاد ہے اللہ یحب المتطہر (اللہ پاک)



وَيُخَوِّدُ الْيَدِ مَنْ يُنَيِّبُ۔ اللہ جس کو چاہتا ہے اپنا برگزیدہ بنا لیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے اس کو اپنا راستہ دکھاتا ہے اس میں اشارہ ان ہی دو طریق کی جانب ہے کہ پہلا طریق اجتہاد کہلاتا ہے جس کا دوسرا نام طریق شکر ہے اور دوسرا طریق انابت کہلاتا ہے جس کا دوسرا نام طریق ریاضت ہے پہلے طریق میں محبوبیت غالب ہے اور دوسری میں محبت کا غلبہ ہے پہلے طریق میں روحانی ریاضت ہے کہ کسی حال بھی فدا حق سے قلب کی وابستگی مفصل نہیں ہوتی مگر سکون ہوتا ہے اور دوسرے طریق میں جسمانی ریاضت ہوتی ہے کہ بدن کو ہر قسم کی تعجب و مشقت میں ڈالنے کا اہتمام ہوتا ہے اور غلبہ ہوتا ہے اور اولہ شوق کا کبھی تڑپ ہوتی ہے کبھی اضطراب، کبھی گریہ و زاری ہوتی ہے اور کبھی چیخ و پکار، ہر چند کہ دونوں طریق کا مقصد حق تعالیٰ کا لطف و فضل ہے کہ

عشق اول در دل معشوق پیدا میشود پھر گرنہ سوز و شمع کے پروانہ شیدا میشود۔ اس لئے محبت کے لئے بھی محبوبیت شرط ہے کہ اللہ سبحانہ کی طرف سے کشش نہ ہو تو بندہ بیچارہ کر ہی کیا سکتا ہے مگر صورت حال اس طریق میں عساستانہ اور والہانہ ہوتی ہے سوز و گداز ہوتا ہے چہرہ پر زردی ہوتی ہے اور بدن میں سخافت و لاغری سے از رختن و رفتن و یاد دہی و ہوا زین شمع زین گل زین آفت اسی غلبہ بیتابی میں شطحیات اور ایسے کلمات بھی کبھی زبان سے نکل جاتے ہیں جو صورت نا جائزہ انداز گاہ احذرت میں سوادب ہو ہیں مگر چونکہ ان کا منشا آتش عشق ہے اس لئے نظر انداز اور سخت عفو و درگزر ہوتے ہیں ان کو وصال کی ذرا بھی محبت نظر آتی ہے تو بھولے نہیں ساتے اور زبان سے بجا اختیار نکلتا ہے۔ امروز شاہ شاہان ہماں شد است مارا جبرئیل با ملائکہ زبان شد است مارا بخود خلوت نشینی اور عزت و صحرانوردی ان کا طبعی اقتضا ہوتا ہے تعب و فقر میں مزہ آتا ہے تعلقات دنیا سے دشت ہوتی ہے خواب و خور خواب و خیال بن جاتا ہے اور راستے کے کانٹے پھول معلوم ہوتے ہیں راہ خدا کا جام شہادت ان کا مقصد اور اپنے مولیٰ کے نام پر جان و دنیا ان کا قصا مراد ہوتی ہے خرم آن روز کہ از منزل ویران بروم + راحت جان طلیم و ز پے جانان بروم + بندہ کروم کہ گراں آید بسیر اس غم روز + تا در مسکدہ شاداں و غزل خواں بروم۔ اور طریق اجتہاد و محبوبیت میں سکون و قرار ہوتا ہے طائیت کی شان ہوتی ہے منعم و انجلاں کی نعمتائے بیشمار کا ہر وقت شکر و امتنان محسن لم یزل ولا یزال کے احسانات لا تعد و لا تحصی کا ہمہ وقت تصور و دھیان اور اپنے ضعف اپنی نااہلی اپنے عجز و قصور اور اپنی بیچارگی اور ہمہ تن خطا وار ہونے کا ہر لمحہ ایسا اذعان ہوتا ہے جیسے مردہ بدست غسال کہ خوب سمجھ رہا ہے کچھ بھی نہیں ہوں محض پتہ خاک ہوں اور خاک میں ملنے والا شان رضا و تسلیم انکا ان کا لباس بنتی ہے اور کمال عبدیت و غلامی جس کا مقتضا ہے ہمہ وقت انکسار و شکستگی اور تذلل و افتقار ان کا شعار و شعار قرار پاتی ہے۔ جو مکہ سمجھتے ہیں کہ عمر نوح بھی ملے اور لوط اس کا سجدہ میں گذرے تب بھی اس کا ان گنت پیشگی نعمتوں میں ایک نعمت کا لاکھواں بلکہ مہاسنکھواں حق بھی ادا نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ یہ سجدہ بھی اسی کا کرایہ ہو اور اس کا ایک مستقل احسان ہے جس کا شکر ہم پر جدا واجب ہے اس لئے کثرت عبادت پر طبیعت نہیں ابھرتی۔ کیونکہ دل جو کہ حاکم و محرک ہے جو ارج و اعضا کا وہ روز شب اپنی کوتاہی و عجز کے دھیان میں غرق ہے اور اس لئے قلب کا یہ حضور اور آستانہ خدا پر پڑا رہنا بدن کے قبضہ و اور سر بسجود ہونے پر مجبور رہ عبادت بھی کرتے ہیں تو نادم و شرمسار ہوتے ہیں اور زباناں حال کہتے ہیں۔ منت منہ کہ خدمت سلطان ہمیں کم منت شناس از وہ بخیرت گذاشت واللہ اعلم



نیز عالم مذکور کا ایک سوال یہ تھا کیا انسان اپنی خاص قابلیت کو جس کے لئے حق تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا ہے خود معلوم نہیں کر سکتا کوئی دوسرا مثلاً شیخ صالح یا برادرناصح ہی معلوم کر سکتا ہے؟ حضرت مدوح نے جواب دیا کہ ہاں خود بھی واقف ہو سکتا ہے اس میں غور کرے کہ غالب فکر و تخیل کس حالت کا رہتا ہے اگر غلبہ اللہ کی محبت اور اس کی طرف کشش کا رہتا ہے کہ اس کی عظمتِ شان مستحضر رہتی ہے اور اس کے جلال و کبریائی کا خوف لگا رہتا ہے تو علامت ہے اس کی کہ حق تعالیٰ کا ارادہ اس کے متعلق خیر کا ہے۔ خواہ اس کا بدن اس وقت طاعت میں مشغول ہو یا معصیت میں کہ معصیت میں بھی مبتلا ہوگا تو اللہ سبحانہ اس کو توبہ کی توفیق بخشے گا اور عنقریب خیر و صلاح اور رشد و صلاح کی طرف لے آئے گا۔ پھر جس طرح (جسمانی) فطری قابلیت مثلاً شجاعت اور ہمتی میں قوت اور ضعف کے درجات مختلف ہوتے ہیں کہ کھیلنے ہوئے بچوں میں غور کرو گے تو معلوم کر لو گے۔ یہ حجت ہے، اور یہ بہت سست ہے اور یہ میں میں ہے اسی طرح (روحانی) فطری استعداد میں شانِ استحضار کی کمی و بیشی کا اختلاف ہوا کرتا ہے کہ بعض اونچے درجہ پر ہوتے ہیں اور ان پر استحضارِ جلالتِ خداوندی کا ہر وقت غلبہ رہتا ہے اور بعض کو کبھی کسی وقت اس کا خیال آجاتا ہے اور اکثر اوقات ان پر افکارِ دنیا غالب رہتے ہیں اور بعض کی حالت متوسط درجہ پر ہوتی ہے۔ اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ فکر و تخیل عقل کا ایک نور ہے جس کا فیضان تقدیر کی حکمت اور مقسوم ازلی کے موافق طبیعت پر ہوا کرتا ہے۔ پس اگر ذات کے ساتھ خیر کا ارادہ کیا گیا ہے تو عقل اس پر اسی کا فکر اور اسی کے اسباب کا خیال ڈالتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ (اسی طلبِ جستجو میں لگا رہتا اور آخر کار) اس کو پالیتا ہے۔ اور اگر ذات کے ساتھ شر کا ارادہ کیا گیا ہے تو عقل اس پر اسی کا فکر اور اسی کے اسباب کا خیال ڈالتی ہے حتیٰ کہ وہ (اسی تنگ و دو میں لگا رہتا اور انجام کار) اس کو پالیتا ہے۔ پھر خیر ہو یا شر وہی تین درجے (اعلیٰ و ادنیٰ و متوسط) ہر ایک میں جاری ہوتے ہیں نیز یہ قابلیت اور اس کی شناخت کچھ اسی (ایمان و کفر اور خیر و شر میں منحصر نہیں بلکہ جو کچھ بھی تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے کہ نلاں شخص نلاں کام کرے گا اس کی قابلیت بچپن ہی سے ظاہر ہوتے لگتی ہے۔ چنانچہ چند بچوں کو سامنے بٹھاؤ جن کے متعلق مثلاً ازلی تجویز تے طے کیا ہے کہ ایک ان میں منشی ہوگا اور دوسرا فوجی سپاہی اور تیسرا حجام تو دیکھو گے کہ پہلے کو قلم تھا منا آتا ہوگا یا کم از کم ذرا سی تہنیہ پر سمجھ لے گا کہ قلم ہاتھ میں اس طرح پکڑا کرتے ہیں، مگر اس سے واقف نہ ہوگا کہ سر ہونڈنے کے لئے استرا کیونکر پکڑا کرتے ہیں یا تلوار کیسے لٹکایا کرتے ہیں بلکہ اس کو سمجھایا بھی جائے گا تو تو نہ سمجھ سکے گا اور دوسرے بچہ کو تلوار کا لٹکانا آتا ہوگا یا ذرا تہانے سے اس کو آجائے گا مگر قلم پکڑنا یا ہاتھ میں باقاعدہ استرا تھا منا تہانے سے بھی سیکھنا مشکل ہوگا اور تیسرے کو استرا پکڑنا اور اس کا چلا نا آتا ہوگا یا معمولی تعلیم سے باسانی آجائے گا مگر قلم تھا منا اور تلوار لٹکانا کسی کو سکھانے سیکھنا دشوار ہوگا غرض کل "میتہ" بنا خلق لئے ہر ایک کے لئے وہ کام آسان کر دیا گیا ہے جس کے لئے وہ پیدا



کیا گیا ہے۔ ایک شخص کی طبیعت مثلاً چلتی ہے بزازہ میں اور کپڑے کی تجارت کا خیال اس پر غالب رہتا ہے لیکن اس کا باپ چاہتا ہے کہ اس کو کھیتی کے کام میں ڈالے تو (کتنی ہی مارے باندھے) اس میں کامیابی نہ ہوگی اور جس وقت بھی اس کو تجارت پارچہ میں لگا دے گا۔ تو حسبِ خواہش تھر مرتب ہوتا دیکھ لے گا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ ہر کام کی قابلیت اس کے فکر پر مرتب ہے اور ہر شخص کو معلوم ہے کہ اس کا نکر کس شغل میں مدد رہا ہے ایک مرتبہ حضرت نے فرمایا ایک عورت کے دو لڑکے تھے اور ایک لڑکی مرتے وقت عورت نے کہا کہ میرا یہ لڑکا صالحین میں سے ہوگا اور یہ لڑکا ظالمین میں سے اور لڑکی کو دنیا خوب وافر ملے گی۔ لوگوں نے کہا کیا تجھے غیب کی خبر ہے؟ اس نے جواب دیا کہ غیب کی خبر تو (سوائے خدا کے کسی کو بھی) نہیں ہے۔ میں نے (فراست سے قابلیت کا پتہ چلا یا اور) غور و فکر سے نتیجہ نکالا ہے اس بچہ میں اللہ کا قدر محسوس کیا کہ یہ کبھی بچہ پر بھی زیادتی نہیں کرتا تھا اس سے میں نے سمجھا کہ خیر و صلاح کی طرف جائے گا اور اس بچہ کی حالت اس کے برعکس دیکھی (کہ مارنے پیٹنے میں بے باک تھا) اس سے معلوم ہوا کہ شر کی طرف جائے گا اور لڑکی کو دیکھا کہ چھوٹی بچی تھی اور کپڑا مٹی سنیکیں جو کچھ بھی اس کے ہاتھ آجاتا اس کی اعلیٰ درجہ کی پہونچیاں اور جھانور دیگر زیورات بنایا کرتی اور ہر وقت اسی دھندے میں رہا کرتی تھی۔ اس سے میں نے سمجھا کہ اس کے مقدر میں خوشحالی اور دنیا کا ملنا لکھا ہے۔

میرے ایک دوست نے اپنا قصہ سنایا کہ بچپن میں میرے والد کا انتقال ہو گیا اور میں یتیم بن گیا تھا میری والدہ نے مجھے ریشم بننے کے کارخانہ میں داخل کر دیا مگر میرا دل اس میں بالکل نہ لگتا تھا۔ دل اچاٹ اور ہر وقت ایک صنیق و گرائی رہا کرتی تھی ایک دفعہ ان بزرگوں پر سیرا گذر رہا تھا جو چونہ کے پلاستر میں گلکاری کیا کرتے اور پھول بوٹے تراشا کرتے تھے۔ ان کے کام کو دیکھ کر میں گریہ ہو گیا اور ایسی کشش ہوئی کہ دل بے قابو ہو گیا۔ آخر میں ان کے ساتھ لگ گیا اور بڑی آسانی کے ساتھ ان کا کام سیکھ لیا یوں معلوم ہوتا تھا کہ میں قید سے رہا ہو گیا اور میرے بند کھول دئے گئے اس کے بعد میں نے ریشمی کارخانہ میں قدم بھی نہ رکھا۔ چنانچہ آج اس فن دانوں کا مستری بنا ہوا ایک اور شخص نے قصہ سنایا کہ میرے پاس ایک دیلا کمزور گدھا تھا جو دروازہ پر بندھا رہا کرتا تھا۔ میرے مکان کے سامنے محلہ میں ایک یتیم بچہ رہتا تھا جس کا شغل بجز اس کے کچھ نہ تھا کہ میرے گدھے پر اچڑھا کرتا مگر اس کا انداز بالکل سواروں کا سا تھا۔ کانٹوں کی ایک مہینہ بنا کر پاؤں میں باندھ لیا کرتا تھا۔ کھجور کے پھولوں کی ایک لگام بنالی تھی اور لکڑی کو پھیل کر نیزہ قرار دے لیا تھا جب ذرا نظر بچتی وہ گدھے پر آسوار ہوتا اور نیزہ ہلا کر گویا فوجی سوار کی نقل اتار کرتا تھا جب ہم دھمکاتے تو بھاگ جاتا مگر جب موقع پاتا پھیرا اس پر اچڑھتا تھا۔

جب بالغ ہو گیا تو ہم نے دیکھا کہ ملازم ہو کر ان لوگوں میں شامل ہوا جو سلطانی گھوڑے پھیرتے اور ان کو سیدھا کرتے ہیں فے ہندی مثل ہے پوت کے پاؤں پالتے ہی میں پہچانے جاتے ہیں۔ قدرت نے جس شخص کو جس کام



کے لئے بنایا ہے اسی میں اس کو دل بستگی ہوتی اور بچپن سے اسی کی رغبت کا ظہور ہونے لگتا ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ دنیا کا تمدن صد ہا مختلف پیشوں کو مقتضی ہے لوہار، معمار، نذات، حاکم، کاشتکار، باغبان، طبّاح وغیرہ وغیرہ سب ہی کی دنیا میں ضرورت ہے کہ یہ اُس کا محتاج ہے تو وہ اس کا حاجتمند ہے اگر کسی ملک کی ساری رعایا کالجوں کی ڈگریاں حاصل کر کے عدالتوں اور دفاتر کی کلرک بن جائے تو خود ان کی زندگی بھی موت سے بدتر ہو جائے کہ نہ غلہ نصیب ہو کھانے کو نہ کپڑا ملے پہننے کو نہ معائنہ آدے مکان بنانے کو، یہ نظام قدرت ہے کہ ضرورتاً زندگی کے سارے شعبے قائم رکھنے کے لئے ہر انسان میں ایک خاص کام کی استعداد رکھی اور اس کی طبیعت کو اسی طرف چلایا ہے جس کے لئے وہ تجویز کیا گیا ہے اگر ہم چاہیں کہ سب کو ایک ڈگری برقرار رکھیں تو ناممکن بھی ہے اور نظام عالم کی تبدیلی خود ہمارے لئے مصیبت خیز بھی ہے۔ ایسے قصص رات دن صد ہا پیش آتے ہیں کہ ماں باپ اپنے بچہ کو مار مار کر کتے میں لاتے ہیں اور برسوں اس پر جبر و قہر ہوتا ہے مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلتا اور آخر کار بچہ کسی صناعت یا حرفہ کی طرف جاتا ہے جس کے لئے قدرت نے اس کو بنایا اور پیدا کیا ہے یہ علامت اور قرائن ایک سمجھدار شخص کو بچہ کی طبعی روش سے اس کی ہوش سنبھالتے ہی نظر آتے گتے ہیں اور جوں جوں وہ بڑھتا ہے اس کی فطری استعداد کا ظہور ہوتا چلا جاتا ہے اسی طرح صلاح و طلاع رحمہ اللہ کی عدل و ظلم حب دنیا و حب آخرت سلامتی و کجی و دیگر اخلاقی امور ہیں کہ طبیعت شروع ہی سے اس طرف چلتی اور اس میں ایسا طوطی نشاں لیتی ہے مگر جس طرح دنیوی امور کے مختلف مقتضیات طبعیہ میں نظم کے لئے جسمانی قانون اور بادشاہ کی ضرورت ہے اسی طرح اخلاقی اقتضات مختلف کی بندش کے لئے انبیاء اور شرائع کی حاجت ہے خصوصاً جبکہ بعض قرآن ایسے خفی ہیں جن کا ادراک مشکل ہے اور اس لئے نہیں پتہ چل سکتا کہ اس کی فطرت کیا ہے اور وہ اس کو کس طرف لے جا رہی ہے آسمانی قانون جس کا نام شریعت ہے فطرت کی روحانی کسوٹی ہے جنت میں جانے کے لئے جو فریق تجویز کیا گیا ہے وہ اس کی گرویدہ ہو کر گویا اپنی کھوئی ہوئی متاع کو پا لیتی ہے اور دوسرا فریق جو جہنم کے لئے تجویز کیا گیا ہے وہ اس سے متوحش ہو کر سوا و عینہ عائد رتھمہ امد لحد تنیق دھند لا یومثوث میں داخل ہو جاتا ہے اس طرح ہر عالم تکوین و عالم تشریع دونوں کا نظم جدا جدا حسب تجویز خداوندی اپنے طریق محمود پر چل رہا ہے اور چلتا رہے گا۔ پس اگر کسی کو اپنی طبیعت کی روش فسق و فجور کی طرف چلتی نظر آ رہی ہو تو اس کو ڈرنا چاہیے۔ اور اس اُمید پر کہ کیا خبر ہے اصلی فطرت کا تقاضا صلاح و فلاح ہو مگر مجھے نظر نہیں آتا کوشش کرنی چاہیے تو بہ اور رجوع الی الحق کی ہر ممکن ہے حضرت فضیل بن عیاض کی طرح مدت گزری ہو و کیتی ہیں، مگر آخر وقت میں راکھ کے اندر چھپی ہوئی چنگاری سمجھ کر اٹھے اور ولی کامل بنا دے کہ اصل فطرت وہی تھی جو صحبت فساد اور عادات بد کی راکھ میں دبی ہوئی خود کو بھی محسوس نہ ہوتی تھی۔ واللہ اعلم۔



ایک مسلم نے اپنے شاگردوں کی فطری استعداد کا امتحان لینا چاہا اور ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک پرند دیکھ کر کہا کہ اس کو ایسی جگہ ذبح کر کے لاؤ جہاں کوئی نہ دیکھے۔ چنانچہ سب (گوشتوں اور جنگلوں میں) ذبح کر کے لے آئے مگر ایک نو عمر بچہ جن کے متعلق مشہور ہے کہ حضرت ابوالعباس سبیتی تھے، زندہ پرند کو لئے ہوئے واپس آئے اور اُستاد سے کہا کہ جہاں بھی گیا اللہ کو اپنے ساتھ موجود پایا اور کوئی جگہ ایسی نہ ملی کہ اس کو ذبح کرتا اور کوئی نہ دیکھتا۔ اُستاد نے سمجھ لیا کہ یہ بچہ مقام معرفت پر پہنچنے والا ہے اور ان پر خاص توجہ فرماتے تھے۔ حضرت مدوح نے فرمایا کسی آدمی میں ولایت کی رگ ہوتی ہے اور وہ مدت دراز تک فساق و فجار میں شامل رہتا ہے مگر جس وقت بھی اللہ کا کوئی ولی اس کے پاس کو گزر جاتا ہے تو اس رگ میں باذن اللہ حیات آجاتی اور اس کو ایک انشراح اور سرور حاصل ہوتا ہے حالانکہ ولی سے کوئی بات بھی نہیں ہوتی اور جمیع عصاۃ میں بیٹھا ہوا ہے۔

پھر اگر اختلاط و صحت نصیب ہو جائے تب تو اس رگ کی حیات کا پوچھنا ہی کیا۔ دن بدن خیر و خوبی بڑھتے لگتی ہے اسی طرح مثلاً کسی شخص میں سرقہ کی رگ ہوتی ہے اور وہ مدت دراز تک صلحاء کی جماعت میں شامل رہتا ہے۔ پھر کسی سابق کا اس جماعت پر گزر ہوتا ہے تو کسی پر کوئی اثر نہیں ہوتا مگر اس کی رگ زندہ ہو جاتی ہے اور چوری کے لئے اس کا سینہ کھل جاتا ہے پھر اگر دونوں میں تعارف و دوستانہ ہو جائے تو کامل اور باہر فن ہی بن جاتا ہے غرض یہ باب بہت وسیع ہے خصوصاً ان کے لئے جن کو درس تدریس میں اشتغال ہے کہ وہ تلامذہ کی استعداد کا بانی پتہ چلا سکیں گے میں الحمد للہ ستائیس برس سے تعلیمی خدمت میں مشغول ہوں حضرت مدوح کا یہ کلام سن کر میری طبیعت سے تو بڑا بوجھ اُتر گیا۔ ورنہ میری حالت یہ تھی کہ پڑھانے میں شدید محنت اٹھاتا اور یوں دل چاہتا تھا کہ کسی طرح ان کو گھول کر پلا دوں۔ مختلف تقریریں کرتا اور طرح طرح کے دلائل و براہین سے ایک مضمون کو طلبہ کے ذہن نشین کیا کرتا مگر دیکھتا تھا کہ فدا سی غفلت دے تو بھی پر سب برباد ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت ہوتی تھی کہ جانور کو چلاتے اور قمچی مارتے رہو تو چلتا رہے۔ مگر ذرا ہاتھ روک لو تو کھڑا ہو جائے۔ یہ دیکھ کر اتنی کوفت ہوتی تھی کہ بیان نہیں کر سکتا اور بعض طلبہ کی یہ حالت دیکھتا تھا کہ معمولی طور پر ان کو پڑھایا مگر ہر بات ان کے ذہن میں اُترتی چلی گئی اور ادنیٰ توجہ سے خلاف گمان کہیں کے کہیں پہنچ گئے۔ میں حیران ہو کر اس کا سبب تلاش کیا کرتا مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ آخر جب حضرت سے یہ تقریر سنی تو ایک بھاری بوجھ سر سے اُتر گیا اور سمجھ لیا کہ قدرت نے جس کو علم کے لئے تجویز کیا اس کو کوئی رد نہیں کر سکتا اور جن کو اس کا دل نہیں بنایا کتنی ہی جدوجہد کروان کی فطرت کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ مگر مِیْسَرٌ لَمَّا خَلَقَ لَہٗ۔ ہر شخص کے لئے بجانب اللہ ان کاموں میں سہولت و آسانی مہیا کر دی جاتی ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ عالم مذکور کا ایک سوال حضرت سہیل تیسری رحمتہ اللہ علیہ کے قول کی تحقیق میں تھا۔ جس کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت



میں اور ابلیس لعین میں مناظرہ ہوا۔ ابلیس نے کہا اے سہل حق تعالیٰ فرماتا ہے **وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ** کہ میری رحمت ہر شے کو شامل ہے، اور میں بھی شے میں داخل ہوں لہذا کیا دلیل ہے کہ رحمت الہیہ سے محروم رہوں، حضرت سہل نے فرمایا حق تعالیٰ فرماتا ہے **فَاَكْتَبَهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ** میں اپنی رحمت کو رقیامت کے دن، مخصوص کر دوں گا پر سزاگار بندوں کے ساتھ (اور تو چونکہ مومن بھی نہیں چہ جائے کہ متقی لہذا رحمت سے محروم رہے گا) پس آیت سابقہ میں جس رحمت کا مضموم مذکور ہے وہ مقید و مخصوص ہے اتقواء کے ساتھ۔ ابلیس نے کہا کہ مقید کرنا تو تمہاری شان ہے نہ کہ اللہ کی حضرت سہل ساکت ہو گئے اور کچھ جواب نہ دیا۔ اس پر حضرت محی الدین حاتمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں اس خاص فائدہ کی تعلیم میں کہ مقید کرنا خود ان کی شان ہے نہ کہ سبحانہ کی، ابلیس اسناد ہوا حضرت سہل کا چونکہ علامہ شعرانی نے یہ پورا قصہ نقل کیا ہے اور شبہ کا کچھ جواب نہیں دیا اس سے سائل کو شبہ ہوا کہ شعرانی نے ابلیس کا استاذ ہونا تسلیم کر لیا اور اس قول کو صحیح مان لیا اس لئے حضرت ممدوح سے سوال کیا کہ رحمت کو اتقواء کے ساتھ مقید کرنا تو (آیت ساکتھا الخ) سے حق تعالیٰ سبحانہ ہی کی طرف سے ہوا ہے کہ سہل کی طرف سے پھر ابلیس کا یہ کہنا کہ مقید کرنا تمہاری شان ہے نہ کہ اللہ کی، اور حضرت سہل کا ساکت ہو جانا اور پھر حاتمی کا یہ فرمانا کہ اس نفع پہنچانی میں ابلیس استاذ و معلم ہوا حضرت سہل کا، اور علامہ شعرانی کا بھی اس واقعہ کو نقل کر کے سکوت کرنا اور کچھ جواب نہ دینا، سب امور شافی جواب کے محتاج ہیں حضرت ممدوح نے جواب دیا کہ ہاں مقید کرنا حق تعالیٰ کی طرف سے ہے نہ کہ سہل کی طرف سے کیونکہ آیت میں مذکور ہے جس کا نزول من اللہ ہوا ہے اور شیطان کا استدلال صریح باطل اور غلط تھا مگر حضرت سہل کا سکوت اور علامہ حاتمی کی مدح و ثنا محض اس بنا پر ہے کہ دونوں حضرات کا خیال شیطان کے اس کلام سے دوسرے مضمون کی طرف منتقل ہوا جس کو ابلیس سمجھ بھی نہ سکا وہ یہ ہے کہ حضرت صوفیہ کو جب معرفت الہیہ نصیب ہو جاتی ہے اور وہ رب کی شان سے جیسی کہ وہ درحقیقت ہے، واقف ہو جاتے ہیں تو اپنی پہلی حالت پر کبھی نظر ڈالتے اور دیکھتے ہیں کہ ہم تو حق سبحانہ کی صفات غیر متناہیہ کو محدود و مقید ہی سمجھتے اور بڑی جہالت میں پڑے رہے پس شیطان کی زبان سے یہ لفظ نکلا کہ مقید کرنا تمہاری شان ہے تو حضرت سہل کے اس دبلے ہوئے اثر میں حرکت پیدا ہوئی اور خوابیدہ امر جاگ اٹھا یعنی اپنی گزشتہ حالت کہ شان حق کو مقید سمجھتے رہے یاد آگئی، اس لئے ان پر سکوت و تحیر طاری ہو گیا۔ حالانکہ نہ ابلیس مومن کی اس قول سے یہ مراد بھی اور نہ اس کا ذہن اس کی طرف منتقل ہوا تھا۔ ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ اپنے مرید کے گھر گئے اور دروازہ پر دستک دی مرید نے اندر سے جواب دیا کون صاحب ہیں آ جاؤ۔ یہاں میرے سوا کوئی نہیں ہے۔ شیخ یہ لفظ سن کر کہ یہاں میرے سوا کوئی نہیں ہے بیہوش ہو گئے کہ ذہن توحید خدا کی طرف منتقل ہوا اور زمین خانہ بجز خدا کے دیگرے نیست، کے مضمون کا اثر لیا۔ حالانکہ مرید کا اس قول سے نہ یہ مطلب تھا نہ خیال بلکہ مرید کو اپنے



شیخ کے بے ہوش ہو کر گر جانے کی بھی خبر نہیں ہوئی۔ اب اگر یوں کہہ دوں کہ اس بارہ میں مرید اپنے شیخ کا استاد ہو گیا تو گنجائش ہے کوئی حرج نہیں کیونکہ محبوب کی طرف ذہن منتقل ہونے کا سبب تو اسی کا قول تھا ہے) ایک لڑکی اپنے بوڑھے باپ سے ضد کر رہی تھی کہ فلاں چیز مجھے بازار سے ابھی لا کر دو باپ اٹھ کر چلا تو لڑکی کی والدہ نے لڑکی سے کہا تجھے ترس نہ آیا بوڑھے باپ کو تو نے تکلیف دی؟ لڑکی نے کہا باپ کے سوا اور میرا کون ہے۔ ایک اہل دل نے لڑکی کا یہ فقرہ سنا تو بے ہوش ہو گیا اور گر پڑا (لا الہ الا اللہ کی حقیقت اور مافی قلبی غیر اللہ کے ذوق نے ذہن اپنی طرف منتقل کر کے بے تاب بنا دیا) غرض یہ شان راہل دل مجتہد صوفیہ کی ایک بات کان میں پڑتی ہے تو اس کے اشارہ سے ان کی چھپی ہوئی چٹکھاری چمک اٹھتی ہے اور وہ مضمون ذہن میں آتا ہے جس کا قائل کو ہم و گمان بھی نہیں گذرتا۔ واللہ اعلم۔

نیز عالم مذکور نے ایک سوال یہ کیا کہ ایک عارف کا قول ہے ارتکاب معصیت میں مومن پر سورجیں نازل ہوتی ہیں اور وہ سورجیں کونسی ہیں جن کی اصل غضب خداوندی ہے (کہ ثمرہ ہے ارتکاب کا) اور غضب کے بدلہ بہ رحمت ہونے کے حقیقت کیا ہے؟ حضرت ممدوح نے جواب دیا کہ اس معصیت سے مراد اس مومن کی معصیت ہے جو اپنے رب کے جلال و عظمت کا عارف ہو کہ ایسے مومن سے معصیت کا صدور و غفلت و ظلمت کے سبب نہ ہوگا بلکہ) حکم غلبہ تغذیر ہوگا اور اس مومن عارف سے ہماری مراد صاحب مشاہدہ نہیں ہے بلکہ ہر مومن جس کا ایمان (ریا و نمود سے) خالص اور اس کا یقین (جنت و دوزخ اور شر و نثر کے متعلق) صاف اور کامل ہو، مراد ہے کہ جس کی یہ حالت ہوگی اس کے دل سے بجاالت طاعت بھی خوف خدا نہ ہوگا۔ حالت معصیت کا تو کیا پوچھا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے قلب میں خوف الہی کے مستقر و متمکن ہونے کا سبب تو اس کی معرفت اور قدرت الہیہ کی عظمت و سطوت سے واقفیت ہوئی ہے جو ہر لحظہ قائم ہے اور کسی حال میں بھی مفارقت نہیں کرتا حتیٰ کہ عطا کی حالت میں بھی اس کو یہ خوف ہوگا کہ کہیں میری یہ طاعت (سود ادب قرار پا کر) بعد من اللہ کا سبب نہ بن جائے اس احتمال سے اس کا دل لرزے گا اور رگیں اتنا پھرکیں گی کہ ان کو قرار نصیب نہ ہوگا۔ پھر اس خوف کے لئے کوئی وقت مخصوص نہ ہوگا، عمل سے قبل اور عین بجاالت عمل اور بعد عمل ہر حال اس کو اندیشہ رہے گا کہ کہیں مجھ پر عذاب نازل نہ ہو جائے طاعت میں اس کی یہ حالت ہے تو معصیت کے ارتکاب پر اس خوف اور ہیبت سطوت کا کیا پوچھا۔ ایک مومن سے معصیت کا صدور ہوا تھا اور وہ اس کے بعد چوبیس برس زندہ رہے مگر اس طریق مدت میں ایک پھر بھی ایسا نہیں گذرا جس میں ان کے آنسو تھم گئے ہوں ہر وقت خوف کے مارے آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے تھے پس حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ایک معصیت پر جو خوف ان کے دل میں ڈالا وہ ذریعہ بن گیا صد ہا حسنات کا کہ چوبیس برس تک اللہ کا دھیان اور اس کی سطوت و تہاری کا مراقبہ قائم رہا اور اس مدت طریقہ میں کبھی



ایک معصیت بھی ان سے صادر نہ ہو سکی۔ الحاصل رحمت الہیہ کا مدار اس خوف پر ہے جو ہر وقت دل میں قائم ہو۔ اور اس کا سبب شان ربوبیت کی معرفت ہے جو روح کی طرف سے حاصل ہوا کرتی ہے کہ روح عالم بالا اور ملائکہ کی چیز ہے جس کو معرفت الہیہ تمامی مخلوق میں نسبتاً زیادہ حاصل ہے پس ذات بعد جب صاف ستھری ہوتی ہے تو روح اپنے معارف ہر حالت میں خواہ اطاعت ہو یا معصیت اس کو دیتی رہتی ہے اور اگر ذات نجس و ناپاک ہوئی تو روح اپنے معارف کا ہر حالت میں خواہ طاعت ہو یا معصیت اپنے معارف کا فیضان اس سے روک لیتی ہے اور حالت محمودہ اس کے نزدیک بمنزلہ خواب و خیال کے بن جاتی ہے۔ اور چونکہ حبش کا غلبہ ہوا کرتا ہے اسی کا حکم چلتا ہے اس لئے اس کے تمامی اعمال تحصیل لذت کے لئے ہوتے ہیں حتیٰ کہ طاعت بھی کرتا ہے تو فانی اغراض کے لئے نہ کہ مقصد ربوبیت کی خاطر۔ اور اگر معصیت کرتا ہے تب تو لذت پانے اور مزے اڑانے کے لئے کرتا ہی ہے اور اس لئے رگیدہ و بتیابی تو کیا پریدا بھی نہیں ہوتی کہ کیا ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ رحمت و عذاب کا مدار طاعت و معصیت پر نہیں ہے بلکہ خوف اور عدم خوف پر ہے اور درحقیقت اس پر بھی نہیں بلکہ معرفت اور جہل پر مدار ہے کہ خوف اسی کا اثر ہے، لہذا رحمت کی بھی سو کیسا تھ کوئی تخصیص نہیں بلکہ جس درجہ پر معرفت اور اس کا اثر یعنی خوف ہو گا اسی کے موافق اس کے ثمرات یعنی رحمتوں کا ترتیب ہو گا (واللہ اعلم)

ایک سوال عالم مذکور کا یہ تھا کہ عارف کا قول ہے میں نے کوئی چیز نہیں دیکھی جس میں خدا نظر نہ آیا ہو، ذات حق سبحانہ حلول و اتحاد سے منزہ ہے پھر حادث و فانی میں باقی و واجب الوجود کیسے نظر آیا؟ حضرت نے جواب دیا کہ ذات حق نہیں بلکہ افعال حق کا نظر آنا مراد ہے چونکہ ہر شے میں حق تعالیٰ کے افعال جاری و ساری ہیں اس لئے عارف اپنی قوت معرفت کے سبب تمامی مخلوقات میں افعال خالق کا مشاہدہ کرتا ہے نیز ایک سوال یہ تھا کہ بعض کو شان حق سبحانہ کے متعلق یہ کہتے سنا ہے کہ ہم اللہ کے نہ عین ہیں نہ غیر، اس کا مطلب ہے؟ فرمایا یہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ حادث لا محالہ غیر اور مباہین ہے واجب و قدیم سے۔ لہذا کوئی چیز بھی عین خدا نہیں ہو سکتی بلا شک و شبہ غیر ہے ایک سوال عالم مذکور نے یہ کیا کہ مومن کے ذہن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا استحضار اور تشخیص عالم اروج سے یا عالم مثال سے، یا عالم خیال سے؟ اور اس صورت شریفہ سے جو گفتگو اور باتیں ہوتی ہیں آیا وہ بھی عالم خواب کی صورت شریفہ کی طرح شیطانی اثر سے محفوظ اور اس ارشاد میں داخل ہیں کہ جس نے مجھے دیکھا واقعی مجھ ہی کو دیکھا کیونکہ شیطان میری صورت نہیں دے سکتا؟ حضرت مدوح نے جواب دیا کہ یہ استحضار اس شخص کی روح اور عقل کا فعل ہے کہ جو شخص اپنا فکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ کر لیا اس کے ذہن میں آپ کی صورت شریفہ آئے گی پس اگر یہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت شریفہ سے واقف ہے مثلاً صحابی ہے یا ان علماء میں سے جنہوں نے حلیہ شریفہ کو پوری تحقیق سے حاصل کیا ہے تب تو صورت مستحضرہ واقعہ کے مطابق اور حقیقی صورت



شریفہ کے موافق ہوگی۔ ورنہ ایک کامل انسان کی صورت ذہن میں آئے گی جو اعلیٰ درجہ کا حسین اور خوبصورت ہو پس ممکن ہے کہ واقعی صورت شریفہ کے موافق متصور و مستحضر ہو جائے اور ممکن ہے کہ واقعی نہ ہو اور کچھ کسی بات میں فرق رہ جائے۔ بہر حال بہر دو فریق کے فکر و خیال میں جو صورت آئی ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت ذات ہے نہ کہ صورت روح۔ کیونکہ وہ صورت شریفہ جس کو صحابہ نے آنکھوں سے دیکھا تھا اور علمائے حق کو بیان کیا ہے وہ ذات مبارکہ ہی کی صورت تھی نہ کہ روح شریفہ کی صورت اس لئے کہ قوت فکر بہ میں وہی شے آسکتی ہے جس سے واقفیت ہو، پس تمہارا یہ سوال کہ اس کا تعلق عالم ارجح سے ہے یعنی یہ فعل نکر کنندہ کی روح کا ہے اور اگر مراد صورت حافزہ ہے کہ ہماری قوت فکر یہ میں جو صورت آئی ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت روح ہے یا نہیں تو جواب نفی میں ہے کہ ہم تباہتہ ہیں وہ ذات محمدی کی صورت شریفہ ہے نہ کہ روح محمدی کی، رہا یہ سوال کہ وہ گفتگو (خطا سے) محفوظ ہے یا نہیں، سو اس کا جواب یہ ہے کہ اس نکر کنندہ کی ذات اگر ظاہرہ ہے کہ اس کی روح اس کے ساتھ محبت کرتی ہے اور اپنے معارف کا فیضان اس کو پہنچاتی ہے اور ایسی ہو گئی ہے جیسے صورت کی شان (دور) کے ساتھ ہوتی ہے تب تو صورت فکر یہ معصوم ہے (اور واقعی یہ گفتگو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف سے ہے) اور اگر ذات کی حالت برعکس ہے تو صورت فکر یہ کا حکم بھی برعکس ہے واللہ اعلم۔

میں نے ایک دن آپ کے عرض کیا کہ ایک قصہ سنا ہے کوئی بزرگ اپنی جماعت کے ساتھ ذکر میں مشغول تھے دفعۃً ان میں سے ایک صاحب کارنگ فتن پڑ گیا حالت متغیر ہو گئی اور اپنی نشست کو بدل لیا کہ مرڈ ہو بیٹھے۔ کسی نے پوچھا کیا ہوا بولے وَأَعْلَمُوا أَنَّ فَيْكُمُ الرَّسُولُ اللَّهُ منشایہ تھا کہ اس وقت مجلس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور میں آپ کو دیکھ رہا ہوں پس یہ مشاہدہ اس شخص کا مشاہدہ فتح تھا یا مشاہدہ فکر؟ فرمایا مشاہدہ فکر تھا مشاہدہ فتح نہ تھا اور مشاہدہ فکر کا درجہ اگرچہ مشاہدہ فتح سے کم ہے مگر وہ بھی اسی کو نصیب ہوتا ہے جو اللہ پس خالص ایمان اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بے لوث محبت اور نیت صادقہ رکھتا ہو خلاصہ یہ ہے کہ جس کا تعلق ذات محمدی کیساتھ کمال درجہ پر پہنچا ہو، نہ ہو اس کو یہ مشاہدہ فکر بھی نصیب نہیں ہوتا بہترے لوگ اس مشاہدہ کو مشاہدہ فتح سمجھ بیٹھتے ہیں حالانکہ یہ فکر مشاہدہ ہے اور اسی کو ہوا کرتا ہے جو اہل فتح نہ ہو۔ با این ہمہ اس کے ایمان کے مقابلہ میں عامہ مومنین کا ایمان بمنزلہ عدم اور لاشے کے ہے۔ جامع کتاب کہتے ہیں کہ مشاہدہ فکر یہ کمی تائید اور یہ کہ اس کا وقوع اس کے لئے ہوتا ہے جس کے ساتھ کمال تعلق ہو۔

اس واقعہ سے ہو رہی ہے کہ ہمارے شہر فاس میں ایک قصاب تھا اس کے بیٹے کا انتقال ہو گیا جس کے ساتھ اس کو محبت بہت زیادہ تھی اس کی صورت ہر وقت اسی کی نظروں کے سامنے پھرتی تھی اور رات دن اسی کے دھیان میں



ڈوب رہا تھا۔ اُس نے مجھے خود بیان کیا کہ ایک دن قصا بان کی عادت کے موافق بکریاں خریدنے کے لئے میں باب الفتوح سے باہر گیا۔ مرنے والے بیٹے کے دھیان میں غرق تھا کہ خفیف سی محویت مجھ پر طاری ہوئی اور میں نے دیکھا کہ وہ میری طرف آرہا ہے حتیٰ کہ میرے پاس آکر کھڑا ہو گیا اور میں اس سے باتیں کرنے لگا ایک بکری میں خرید چکا تھا میں نے اسی حالت میں اس سے کہا کہ بیٹا ذرا سے پکڑ لے میں دوسری بکری خرید لاؤں جو لگ بھگ قریب کھڑے تھے انہوں نے جب سنا کہ مرنے والے سے باتیں کر رہا ہوں تو کہنے لگے میاں کس سے باتیں کر رہے ہو؟ اس پر مجھے ہوش آیا اور میں نظروں سے غائب ہو گیا اس وقت صدمہ و غم کا جو پہاڑ مجھ پر ٹوٹا بس اس کا حال خدا ہی جانتا ہے۔

حضرت محدوح نے فرمایا کہ بس مرید اور شیخ کے درمیان ایسی محبت ہونی چاہیے کہ اس سے بیحد نفع ہوتا ہے نیز فرمایا کہ اس محبت والوں میں نفع اور نقصان پہنچانے کے متعلق اہل تصرف کی سی قوت آجاتی ہے اور فرمایا کہ آتش محبت جب بھڑکتی ہے تو کوئی چیز اسے رد نہیں کر سکتی نیز فرمایا ایک مرید تھا اس کو اپنے شیخ کے ساتھ بہت محبت تھی کہ کبھی کبھی بھی دھیان سے نہ ہٹتا تھا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ شیخ اپنے گھر میں جو کام کیا کرتے وہی کام مرید اپنے گھر میں کیا کرتا حتیٰ کہ شیخ اپنی لڑکی کو آواز دیتے اے فاطمہ تو مرید اپنے گھر میں بھی یہی کہتا اے فاطمہ اور شیخ یہاں کہتے فلاں کام کر دے تو مرید وہاں کہا کرتا فلاں کام کرو شیخ اپنے سر پر پہاں عمامہ باندھتے تو مرید کوئی کپڑا لے کر اپنے سر پر وہاں لپیٹا کرتا تھا غرض شیخ کے ہر معاملہ میں اس کی یہی حالت ہو گئی تھی کہ فرط محبت میں حق تعالیٰ نے خاصیت ہی یہ رکھی ہے کہ جب محبت اس درجہ پر پہنچ جاتی ہے تب شیخ کی سیراٹ مرید کو ملتی ہے ایک شخص کو کسی لڑکی سے عشق ہو گیا تھا۔ اس فرط محبت میں اس کی یہ حالت ہو گئی کہ جب کوئی شخص اس لڑکی کا نام لے کر پکارتا کہ اے فاطمہ تو بے اختیار اس کی زبان سے نکلتا جی (گویا فنا ہو کر محبوبہ میں گھل مل گیا تھا) میں نے اس شخص کو اور اس کی حالت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جب بھی کوئی اس کی مشوقہ کو پکارتا تو بے حسی کے عالم میں خود اس کو بھی خبر نہ ہوتی تھی اس کی زبان سے نکلا کرتا تھا جی جب امور ہنر لہ میں محبت کی یہ تاثیر ہے تو کیا پوچھنا حقیقی معاملہ والوں کا۔

حضرت منصور قطب فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کی محبت کا دعویٰ کرنے والوں پر یہ قصہ حجت بن گیا جو ایک عیسائی بچہ کو پیش آیا کہ اس کو ایک بڑے درجہ کے پادری کی لڑکی سے عشق ہو گیا۔ جب اس کو وصال نصیب ہوا اور دونوں ایک لستر پر لیٹے تو اس کا فکر و خیال بحر شوق و محبت میں غوطے لگانے لگا۔ محبوبہ کی نظر اس کے چہرہ پر پڑی تو ایک منٹ نظر آیا۔ اس نے چاہا اس کو کاٹ دوں، چنانچہ چاقو نکال کر اس کو چھیل دیا چاقو زہر میں بچھا ہوا تھا اس لئے فوراً ہکا زہر سا کہ بدن میں سرایت کر گیا اور اس کی روح نکل گئی مگر اُسے کسی بات کی کچھ خبر نہ ہوئی جب شیطانی محبت میں محب کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ دم نکل جائے اور حس و شعور نہ ہو تو کیا حال ہونا چاہیے مومنین کا اپنے رب کے ساتھ (جبکہ ارشاد ہے وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ کہ مومنین کو اللہ کے ساتھ عشق ہوا کرنا ہے) نیز آپ نے فرمایا کہ بڑے کی محبت سے خواہ وہ نبی



ہی کیوں نہ ہو چھوٹے کو نفع نہیں ہوا کرتا جب تک کہ چھوٹے ہی کو اس بڑے کے ساتھ محبت نہ ہو البتہ حق تعالیٰ کی محبت بندہ کے ساتھ (اس قانون سے مستثنیٰ ہے کہ) بندہ کتنا ہی روگردان کیوں نہ ہو جب حق تعالیٰ اسی سے محبت فرمائے گا تو وہ محبت اس کو ضرور نفع دیگی اور اپنا گرویدہ بنائے گی نیز فرمایا کہ چھوٹے کو جب بڑے کے ساتھ محبت ہو کرتی ہے تو بڑے کے اندر جو چیز بھی ہوتی ہے سب کچھ لیتا ہے مگر بڑا کسی چھوٹے سے محبت کرے تو وہ جاذب نہیں بنتا اس وقت آپ کے سامنے ایک آلوچہ رکھا ہوا تھا اس کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ دیکھو اگر حق تعالیٰ اس کے اندر ترش سیب کی محبت کاملہ پیدا فرمادے تو یہ سیب کی ساری ترشی کو چوس لے گا حتیٰ کہ دونوں کو چیر کر دیکھو گے تو آلوچہ میں سیب کی ترشی موجود ملے گی اور سیب کے اندر آلوچہ کا مزہ برائے نام بھی نہ آئے گا درخت کی قلم لگانا اسی قانون فطرت پر متفرع ہوا ہے) مگر حق تعالیٰ کی ذات اس سے بھی مستثنیٰ ہے کہ) بندہ جب اللہ کے ساتھ محبت کرے گا تو بندہ اسرار الہیہ کو نہیں کھینچ سکتا جب تک کہ حق تعالیٰ اس کے ساتھ محبت نہ فرمائے اور اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ بندہ کو حق تعالیٰ محبوب ہی اس وقت بنانا ہے جبکہ اس کو اپنی معرفت بخشدیتا ہے اور معرفت سے اسرار الہیہ کی طاقت ہوا کرتی ہے لہذا بندہ کو اللہ کی طرف کشش ہوتی ہے برخلاف اس کے کہ بندہ کو اللہ کے ساتھ محبت ہو بلا معرفت اللہ کے کہ آپ سے کچھ نہیں بتا۔ میں نے کہا لوگ کہتے ہیں کہ شیخ اپنے مرید کی ذات میں متمکن ہوتا اور اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے فرمایا ہاں صحیح ہے مگر یہ خوبی مرید ہی کی ہے کہ جب شیخ کے ساتھ اس کو محبت کاملہ ہوتی ہے تو وہ شیخ کو اپنے اندر جذب کرتا ہے اور مرید کی ذات شیخ کا مسکن بن جاتی ہے جیسے حاملہ عورت کہ اپنے پیٹ کو بچہ کا مسکن بنائے ہوئے ہے مگر اس کا حمل کبھی تام ہوتا ہے کہ وضع حمل تک یکساں حالت پر رہتی ہے اور کبھی ناقص ہوتا ہے کہ ناقص بچہ کا اسقاط ہو جاتا ہے اور کبھی بچہ پیٹ میں سو جاتا ہے (جس سے شہ پڑ جاتا ہے کہ حل ہے بھی یا نہیں) اور پھر افاقہ ہو جاتا ہے اور بچہ میں حرکت محسوس ہونے لگتی ہے) اسی طرح مرید کی تین حالتیں ہیں کہ کبھی تو شیخ کے ساتھ اس کی محبت کامل و خالص اور دائمی ہوتی ہے اس صورت میں تو شیخ کے کمالات مرید کے اندر متواتر ظہور پاتے اور بڑھتے رہتے ہیں حتیٰ کہ نسبت مسلسلہ حاصل اور فتح نصیب ہو جاتی ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شروع میں سچی اور کامل محبت ہوتی ہے مگر چند روز بعد کسی عارض کے پیش آ جانے سے منقطع ہو جاتی ہے اور شیخ کے متعلق نیت بدل جاتی ہے تو ایسی صورت میں شیخ کے اسرار و انوار بھی بند ہو جاتے اور جو شعاعیں پہلے پھیل رہی تھیں وہ رک جاتی ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ محبت چلتے چلتے ٹھنک جاتی اور اس کی رفتار ترقی رک جاتی ہے مگر کبھی جلد اور کبھی کچھ دنوں بعد اور کبھی مدت طویلہ کے بعد آگے بڑھنے لگتی ہے ایسی صورت میں ذات شیخ کے اسرار بھی رک جاتے ہیں اور جب محبت عود کر آتی ہے تو ان کی آمد بھی عود کر آتی ہے اب مرید کو اپنی حالت کا امتحان کر لینا چاہیے کہ وہ تینوں اقسام میں کس قسم کے اندر داخل ہے اور اللہ سے توفیق اور ہدایت کی درخواست کرنی چاہیے۔



اِنَّهُ سَمِيعٌ قَرِیْبٌ

نیز آپ نے فرمایا کہ مرید کو اپنے شیخ کے ساتھ محبت اگر اس کی ولایت یا علم یا کرم وغیرہ کی وجہ سے ہو تب بھی محبت کچھ فائدہ نہیں دیتی۔ فائدہ مند صرف وہ محبت ہے جو بلا غرض اور صرف ذات شیخ کی طرف متوجہ ہو۔ جیسے بچوں میں ایک کو دوسرے کے ساتھ ہوا کرتی ہے کہ محبت پر ابھارنے والی نہ کوئی غرض ہوتی ہے نہ کوئی سبب، محض الفت اور فاقی کشش ہوتی ہے پس اگر مرید کو شیخ کے ساتھ اس قسم کی محبت ہے تب تو فاقی کشش کی محبت ہے اور جاذب انوار و اسرار ہے اور اگر اس میں دخل ہے کسی غرض اور سبب کا تو ضرور دخل ہوگا شیطان کا اور طرح طرح کے وسوسے پیش آیا کریں گے۔ اس لئے کبھی رکے گی اور کبھی منقطع ہوئے گی۔ یعنی سہ اقسام مذکورہ میں آخری دو قسموں میں داخل ہوگی رکامل و قائم قسم اول نہ بن سکے گی۔ میں نے دریافت کیا کہ علم یا ولایت وغیرہ کی وجہ سے محبت کرنا غیر مفید کیوں ہوتا ہے؟ فرمایا اس لئے کہ اسرار و معارف وغیرہ جو کہ سبب محبت ہوئے ہیں (سبب اللہ کی طرف سے ہیں اور اللہ کی محبت سب کو ہے) اس لئے یہ محبت عام مخلوق کی سی ہوئی، خاص شیخ کی محبت ابھی تک نہیں ہوئی۔ شیخ کی محبت تو اس وقت کہی جائے گی جبکہ خاص اس کی ذات سے ہو نہ کہ ان اسرار سے جو اس کی ذات میں موجود ہیں۔ میں نے کہا یوں تو شیخ کی ذات بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے بلکہ ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے پھر اس کی کیا وجہ کہ ایک کی محبت مفید اور دوسرے کی محبت مفید نہ ہو؟ فرمایا یہ سچ ہے کہ سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے، مگر ذات شیخ سے محبت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ محبت خالص لوجہ اللہ ہو۔ کیونکہ شیخ کی ذات مجردہ تو نہ نفع پہنچ سکتا ہے نہ نقصان (وہ تو محض اللہ و واسطہ ہے نفع نقصان سب اللہ کی طرف سے پہنچتا ہے) پس جس وقت محبت کا رخ ذات شیخ کی طرف ہوگا تو یہ علامت ہوگی خلوص کی کہ (اغراض و اغیار کی) آمیزش نہیں ہے (لہذا مفید ہوگی کہ ہر شے میں اخلاص ہی فائدہ دیا کرتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے قبلہ کی سمت کہ وہ بھی اگرچہ دیگر جہتوں کی طرح ایک ہی جہت ہی ہے۔ مگر نماز میں اس کی طرف منہ کرنا علامت ہے توحید اور اخلاص کی۔ کہ خاص اللہ کی طرف منہ کر لیا۔ میں نے کہا کہ انسان کے لئے تو اغراض کے بغیر چارہ ہی نہیں۔ کوئی کھیتی کرتا ہے تو غلہ کی خاطر کرتا ہے لہذا راحت کی محبت ہوئی تو غلہ کی غرض سے ہوئی نہ کہ خود زراعت ہے فرمایا ہاں ٹھیک ہے لیکن اگر شروع میں غلہ کی نیت اور ارادہ کئے اور پھر اپنا خیال دوسری طرف بٹالے اور غلہ کے فکر سے خالی الذہن بن جائے تو اُمید ہے اس کو کثیر غلہ حاصل ہو اور ہر کام اس کا راست آتا رہے۔ اور اگر اس کا فکر و تخیل رات دن ہی میں پڑا رہا اور ہر وقت اسی اُدھیڑ بن میں لگا رہا کہ اب کیا کرنا چاہیے اور فلاں کام کیونکر کیا جائے تو غلہ حاصل ہوتے سے پہلے ہی طرح طرح کے توہمات اس کو ستائیں گے۔ کبھی خطرہ ہوگا دیکھئے غلہ ہوگا یا نہیں ہوگا اور ہوگا تو کتنا ہوگا۔ کبھی فکر ہوگا کہ میں ٹڈی نہ آ پڑے یا اولہ اس کو تباہ نہ کر دے کبھی وہم ہوگا اس میں چور نہ گھس جائے۔



یا فلاں دشمن اس میں آگٹ لگا دے، وغیرہ وغیرہ۔ برخلاف پہلے شخص کے کہ وسوسوں سے بھی راحت میں ہے۔ اور غلہ کی فکر سے بھی امن و آرام میں۔ یہی حال اس مرید کا ہے جس کو ذات شیخ کے ساتھ محبت ہو، یا ذات کے ساتھ نہیں بلکہ اس کے علم و کمال کے ساتھ محبت ہو ایک دن میں آپ سے باتیں کر رہا تھا کہ فرمایا حضرت منصور بیرون شہر تشریف رکھتے ہیں کیا ان سے ملاقات اور تعارف کو تمہارا دل چاہتا ہے؟ میں نے عرض کیا بے شک مجھ کو قطب وقت سے ملنے کو دل کیوں نہ چاہے گا فرمایا مگر ہمارا تو یہ حال ہے کہ تمہارے ماں باپ تمہارے ہی ہم شکل اور ہم صفت سوچتے بھی اگر پیدا ہوں تو وہ سب میری نظر میں عام لوگوں کی طرح ہوں گے۔ اور تم تم ہی رہو گے کہ بجز تمہارے کسی کی طرف بھی نگاہ اٹھا کر نہ دیکھوں گا یہ سن کر گویا مجھے ہوش آگیا اور سوتے سے آنکھ کھل گئی کہ واقعی مجھ سے کچھ نہ بنا۔ اور توحید مطلب سے محروم رہا۔ کیونکہ محبت کسی کی بھی شرکت کو قبول نہیں کرتی۔

نیز فرمایا کہ طالب اسرار مرید کی ذات ترابی ہوا کرتی ہے اور معطی اسرار شیخ کی ذات ترابی ہوا کرتی ہے۔ پس جب مرید کی ذات ترابی شیخ کی ذات ترابی کے ساتھ محبت کرتی اور اسی پر نظر روک لیتی ہے تو ذات شیخ اپنے اسرار و معارف ذات مرید پر ڈالا کرتی ہے اور جب ذات مرید ذات شیخ کے ساتھ نہیں بلکہ اسرار شیخ کے ساتھ محبت کرتی ہے تو شیخ کی ذات ترابی اپنے اسرار و معارف کے فیضان کو روک لیتی ہے اور پھر نہ روح میں قدرت ہے کہ اسرار جاری کر دے نہ کسی اور شے میں۔ لہذا مرید کو پوری کوشش کرنی چاہیے کہ نفع سے بالکل نظر ہٹا لے اور خالص ذات شیخ کی محبت رکھے کہ نفع لینے کا طریق ہی ہے) میں نے دریافت کیا کہ اس محبت کی کوئی شناخت سمجھی ہے جس سے معلوم کہ ذات شیخ کی محبت ہے؟ فرمایا ہاں دو علامتیں ہیں۔ اول یہ کہ مرید کی راحت منحصر ہو جائے ذات شیخ میں کہ اسی کا فکر ہو اور اسی کا دھیان اسی کی خوشی ہو اور اسی کا غم غرض تمام حرکات و سکنات چھپے اور کھلے موجودگی میں اور غیر موجودگی میں ذات شیخ کی بہبودی اور راحت رسانی اور اسی کے متعلقات و ضروریات میں صرف ہوں کہ اپنی ضروریات و مصالح کی پروا ہی نہ ہو۔

دوم شیخ کی تعظیم اور اس کا ادب و احترام حتیٰ کہ فرض کرو شیخ کنویں میں پڑا ہو اور مرید عبادت خانہ میں ہو تو قلب پر بلکہ عقل پر اس کے ادب و احترام کا اتنا غلبہ ہو گا کہ اس کا عکس نظر آئے گا کہ میں کنویں میں پڑا ہوں اور شیخ عبادت خانہ میں ہے نیز فرمایا لوگ سمجھتے ہیں کہ احسان شیخ کا ہے مرید پر حالانکہ درحقیقت احسان مرید کا ہے شیخ پر کیونکہ ظاہر ہو چکا کہ بڑے کی محبت کچھ بھی نفع نہیں دیا کرتی اور مرید ہی کی محبت جاذب اسرار ہوا کرتی ہے پس اگر مرید کی ذات میں صفاتی و طہارت اور خیر کے قبول کرنے کا قابلیت اور محبت جاذبہ نہ ہوتی تو شیخ کچھ بھی نہ بنا سکتا۔ اگر شیخ کا محبت کرنا نفع دیا کرتا تو اس کے سارے ہی مرید اصل اور کامل بن جاتے



(کہ اس کو تو سارے ہی مریدوں سے محبت ہوتی ہے) نیز آپ نے فرمایا کہ شیخ کے ساتھ مفید اور سچی محبت ہونے کی علامت یہ ہے کہ فرمان کو اس کی فات میں جتنے بھی اسرار اور خوبیاں جھپٹیں سب زائل ہو جائیں اور شیخ کی فات تمامی کمالات سے خالی ہو کر بالکل عوام کی طرح رہ جائے۔ پس اگر مرید کی محبت شیخ کے ساتھ اب بھی اسی حالت پر قائم رہے تب تو محبت سچی ہے اور ذرا بھی قدم ڈگمگائے اور اسرار شیخ کے ساتھ ساتھ اس کی محبت بھی زائل ہو جائے تو وہ جھوٹی محبت ہے نیز فرمایا کہ محبت صادقہ کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ شیخ کو وزن کرنے کی ترازو مرید کے ہاتھ سے گر جائے یعنی شیخ کے تمامی اقوال و افعال و احوال اس کی نظر میں صحیح و صواب ہوں اپنے کو چانچ کتندہ نہ سمجھے کہ اس کا فلاں کام میرے نزدیک شرعیت کے موافق ہے اور فلاں کام خلاف شرع، اگر کوئی توجیہ خلاف شرع فعل کی سمجھ میں آجائے تبہا ورنہ حقیقت کو اللہ کے حوالہ کرے مگر یہ یقین قائم رکھے کہ شیخ ضرور حق پر ہے اور وجہ کا میری سمجھ میں نہ آنا اس کی خطا کا مثبت نہیں، لیکن اگر شیخ کو غلطی پر سمجھا تو بس سر کے بل گرا اور کاذبین کے زمرہ میں محسوب ہوا فتنے طالب کسی کو شیخ بناتا ہے تو یہی سمجھ کر بناتا ہے کہ میں جھوٹا ہوں اور بٹھا ہے میں راستہ سے ناواقف ہوں اور یہ اس سے آگاہ ہے۔ میں جاں ہوں یہ عارف ہے میری سمجھ نا کافی و نارسا ہے اور اس کی سمجھ عالی اور روشن ہے پس اگر مرید ہو کر بھی اس نے شیخ کی خطا و صواب کا جانچنے والا اپنے کو سمجھا تو قیضہ معکوس کر دیا اور گویا اپنے کو شیخ سے اعلیٰ و فہم تر سمجھا۔ مگر یہ اسی شیخ کے متعلق ہے جس کی معرفت اللہ مستحق ہو چکی ہو ورنہ ظاہر ہے کہ بدوین اور خلافت شرع کو شیخ بنانا ہی عقل و نقل کے خلاف ہے آئنا کہ خود گم است کرا رہی کندی آداب تصوف کا پہلا درجہ یہ ہے کہ اول جامع طریقت و شرعیت کی تلاش میں پوری جدوجہد کرے اور شرعیت کی کسوٹی پر کے بغیر کبھی کسی کو پیر نہ بنائے کہ فاسق کبھی عارف نہیں بن سکتا۔ البتہ جب شیخ مل جائے اور اس کے ہاتھ میں ہاتھ ویدے تو اب اس پر زبان یا دل سے کوئی گرفت یا اعتراض نہ کرے کہ ممکن ہے کہ صورت کچھ ہو اور حقیقت کچھ ہو ایک دیندار شخص حالت اضطراب کو پہنچ کر خنزیر کھا رہا ہے تو دیکھنے والے کے نزدیک حرام خور ہے، مگر درحقیقت مباح پر عمل کر رہا ہے مگر یہ حسن ظن وہیں ہو سکتا ہے جہاں ہزار ہا امور میں اتنا محتاط و متقی ثابت ہو چکا ہے کہ مشتبہ سے بھی بھاگتا رہا ہے اور اگر عام فاسق و حجار میں بھی یہ قانون حسن ظن کا جاری کریں تو پیری مریدی ایک کھیل اور عجوبہ بن جائے با ایں ہمہ اس حسن ظن کا اثر اتنا ہوگا کہ شیخ کو معذور سمجھے گے کہ خطا بھی ہوگی تو اجتہادی ہوگی جس پر اجر موعود ہے باقی اتباع اس کا فعل میں جائز نہ ہوگا کیونکہ مرید کے لئے وہ عذر مستحق نہیں جس کا احتمال شیخ میں نکال کر اس کا معذور سمجھا گیا ہے لہذا مقتضا لا طاعة لمخلوق فی معصیۃ الخالق یہ فعل اس کے لئے معصیت ہے مگر شیخ میں اس وجہ سے میں کہ اس کے لئے معصیت جائز ہوگی بلکہ اس وجہ سے کہ ابھی اس کے لئے معصیت ہونے ہی میں احتمال اور شک ہے اور عمر بھر کے تقویٰ اور



پر سبزی گاری کی بنا پر غالب یہی ہے کہ کوئی وجہ اباحت و جواز کی ایسی مخفی ہے جو ہماری فہم میں نہیں آئی۔ لہذا اس کو اس فعل میں بوجہ فقدان علت کے غلطی و گناہگار نہ سمجھیں گے واللہ اعلم۔

نیز فرمایا کہ شیخ اپنے مرید سے نہ ظاہری خدمت کا طالب ہے نہ روپیہ پیسہ کا کہ تجھ پر خرچ کیا کرے اور نہ زیادہ بدنی عبادات کا۔ پس اگر چاہتا ہے تو صرف یہی چاہتا ہے کہ شیخ کے متعلق اعتقاد رکھے کمال کا اور توفیق کے شامل ہونے کا معرفت و بصیرت کا اور قرب من اللہ کا اور اس پر قائم رہے کہ دن گزریں مہینے گزریں اور سال پر سال گزریں مگر اس اعتقاد میں تنزل نہ آئے پس اگر یہ اعتقاد پایا گیا تو مرید کو نفع ہوگا شیخ سے، اور پھر اس خدمت سے جو وہ (بدن یا مال سے) شیخ کی کرے گا۔ اور اگر یہ اعتقاد نہ پایا گیا، یا پایا گیا مگر اس کو بقاء و دوام نہ ہوا کہ طرح طرح کے دوسرے پیش آنے لگے تو مرید کچھ بھی نہیں۔

ایک دن میں آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا جو حضرت ممدوح کی بہت خدمت کیا کرتا اور ہر کام خود انجام دینے کے لئے اشارہ پر دوڑا کرتا تھا حضرت نے اس سے فرمایا کیوں جی کیا تمہیں میرے ساتھ اللہ واسطہ کی محبت ہے؟ اس نے کہا ہاں حضرت خالص لوح اللہ الکریم محبت ہے جس میں نہ ریا ہے نہ سمعہ فرمایا اچھا اگر تمہارے کانوں میں پڑے کہ میری نسبت سلب ہوگئی اور جو اسرار میری ذات میں تھے وہ سب زائل ہو گئے کیا پھر بھی میری محبت پر قائم رہو گے؟ اس نے کہا ضرور قائم رہوں گا فرمایا اگر لوگ تم سے کہیں کہ میں بدخلق اور فحش گو بن گیا تو کیا پھر بھی تم کو میری محبت رہے گی۔ اس نے کہا ہاں حضرت رہے گی فرمایا اگر لوگ کہیں کہ میں مستبد و معصیت ہو گیا اور اس کی پروا نہیں کرتا تب اس نے کہا تب بھی محبت رہے گی۔ فرمایا اگر مجھے اس حالت پر سال دو سال دس سال بیس سال گذر جائیں تب بھی؟ کہا جی ہاں مجھے کسی قسم کا شک و شبہ بھی پیش نہ آئے گا حضرت ممدوح نے فرمایا اچھا ہم تمہارا امتحان لیں گے میں یہ سن کر کانپ گیا اور میں نے اس شخص سے کہا میاں بڑے اندیشہ کی صورت ہے بھلا اندھے میں کہاں طاقت ہے کہ بینا کے امتحان میں پورا اتر سکے شیخ سے معافی مانگو اور اپنے عجز و تقصیر کا اعتراف کرو۔ چنانچہ اس نے ادر میں نے بعجز و انکسار عفو و اقالہ کی درخواست کی مگر جوابات ہوئی تھی وہ ہو چکی تھی اس لئے کچھ دنوں بعد حضرت نے اس کو ایک بات کا حکم فرمایا جس میں اس کی بہبودی و مصلحت مضمر تھی مگر اس کی وجہ اس کے فہم میں نہ آئی اس لئے پھر گیا اور شیخ کے متعلق اس کی تئیت بدل گئی رکھ حسن ظن مبدل بہ سوء ظن ہو گیا، درحقیقت سرالہی کا تحمل وہی کر سکتا ہے جس طینت پاک صاف ہو صحیح العزم ہو نافذ العزم ہو اعتقاد میں ختم ہو کہ بجز شیخ کے کسی کی طرف نگاہ بھی نہ جائے اور اپنے شیخ کے سوا سب پر نماز جنازہ پڑھ چکا ہو اب ہم اس بارہ میں چند واقعات بیان کرتے ہیں جن سے طالب صلاح کو عبرت حاصل ہو۔



مگر پہلے مقدمہ حکایات کی صورت میں حضرت مدوح ہی کا واقعہ نقل کرتے ہیں۔ حضرت مدوح نے فرمایا اس سے قبل کہ مجھے فتح نصیب ہو چکو ایک لمبی سیاہ ڈراؤنی صورت اونٹ کی شکل پر دکھائی دی۔ جب حق تعالیٰ نے مجھے فتح نصیب فرمائی اور میں نے تمامی عوالم میں جتنا حق تعالیٰ نے میرے لئے مقدر فرمایا تھا اس کا مشاہدہ کیا تو اس خوفناک صورت کو میں نے تلاش کیا کہ کہاں اور کس عالم اور کس ملک کی ہے مگر کہیں نہ پایا اور اس کا کوئی پتہ مجھے کہیں نہ لگا تب میں نے حضرت محمد بن عبدالکریم سے اس کے متعلق دریافت کیا انہوں نے فرمایا کہ اس صورت کی صیغہ کا کہیں وجود نہیں ہے، میں نے کہا پھر وہ کیا چیز تھی جو میرے مشاہدہ میں آئی؟ فرمایا وہ صرت تمہاری روح کا فعل تھا۔ میں نے کہا یہ کیسے؟ فرمایا ذات جب کسی (خیالی و فرضی) صورت کو اپنی نگاہ کے سامنے لاتی اور اس کا پختہ یقین کرتی ہے (کہ وہ واقعی ایک چیز موجود ہے)، تو روح اس صورت کے موجود کرنے میں جس کا ذات نے یقین کر لیا ہے اور اس سے قدر ہی ہے ذات کی موافقت کیا کرتی اور اس کو موجود بنا کر سامنے لا کھڑا کرتی ہے اگرچہ اس میں ذات کے لئے ضروری کیوں نہ ہو اس کے بعد حضرت مدوح نے فرمایا کہ ذات کا یہ پختہ یقین جس کا نام جزم ہے ایسی چیز ہے کہ کوئی چیز اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی نہ جانب خیر میں نہ جانب شر میں چنانچہ امر شر میں اسی سے کام لے کر مسہر جزم ایجاد ہوا اور امر خیر میں اس کو ذریعہ اصلاح خلق بنایا گیا) پھر حضرت محمد بن عبدالکریم نے فرمایا کہ فتح نصیب ہونے سے قبل میرا ایک مقام پر گنہ ہوا راستہ میں دریا جس کو کشتی کے بغیر عبور کرنا ممکن نہ تھا اس وقت مجھے ایک جزم عظیم حاصل ہوا کہ میں پانی پر چلا جاؤں گا اور ہرگز نہ دوپٹہ لگا چنانچہ میں نے سطح آب پر پاؤں رکھ دیا۔ میرا جزم بڑھتا جاتا تھا اور میں پانی پر رخصتی کی طرح، چل رہا تھا حتیٰ کہ دوسرے کنارہ پر پہنچ گیا جب دوسری مرتبہ پھر اس مقام پر آیا تو وہ جزم زائل ہو گیا اور مجھے شک پیدا ہوا کہ دیکھتے چل سکوں یا نہ چل سکوں،

چنانچہ آزمائش کے لئے میں نے پاؤں ڈالا تو وہ پانی میں ڈوب گیا۔ میں نے جلدی سے اس کو باہر نکالی لیا اور سمجھ لیا کہ پانی پر اب نہیں چل سکتا۔ حضرت مدوح نے فرمایا جب تک ذات کو کسی شے کا جزم حاصل رہتا ہے شیطان اس کے پاس نہیں پھٹک سکتا وہ پاس اسی وقت آتا ہے جب جزم جاتا رہتا ہے اور شیطان کو اس کے جانے کا علم ہو جاتا ہے کیونکہ بنی آدم میں جہاں جہاں خون بہتا ہے وہاں تک شیطان کی بھی رسائی ہے اس لئے جب دیکھتا ہے کہ جزم جاتا رہا تو آتا ہے اور طرح طرح کے وسوسے ڈالتا ہے حتیٰ کہ خیر و خوبی اس کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے نیز آپ نے فرمایا کہ جزم گویا شہر کی مضبوط فصیل ہے جب تک فصیل قائم رہے گی دشمن کو شہر میں گھسنے کی طمع اور توقع نہ ہو سکے گا اور جب فصیل میں نقصان آئے گا اور اس میں دروازے اور خفاکات کھل جائیں گے تو دشمن شہر کے اندر گھسنے میں عجلت کرے گا پس شیطان اور اس کے دوسروں کا



عیب تابع ہے ذات کی فضیل یعنی جزم کے عیب کا لہذا عقلمند کو چاہیے کہ اپنی ذات کی فضیل کو مضبوط کرے تاکہ نہ شیطان پاس آسکے نہ کوئی انسان جگہ سے ہلا سکے۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ جب کوئی سچا شخص کسی سے دنیا یا آخرت کے متعلق کسی شے کا وعدہ کرے تو اس کو چاہیے کہ اپنے دل کو ٹٹولے، اگر اُس کا وعدہ سننے کے وقت اس کو سکون و اطمینان اور وعدہ کرے سچائی کا جزم حاصل ہو تب تو علامت ہے کہ یہ شے اس کو ضرور ملے گی اور اگر وہ سننے کے وقت تذبذب و اضطراب اور وعدہ کی سچائی میں شک و شبہ ہو تو علامت ہے کہ یہ شے اُسے ہرگز نہ ملے گی غرض جزم علامت ہے اہل صدق و تحقیق کی۔ خدائیک! اپنے لطف و کرم سے اس کی جلالت و اسرار نصیب فرمائے۔ اب حکایات سنو۔

حضرت نے فرمایا ایک شخص کو صلحا کے ساتھ محبت تھی حق تعالیٰ نے اس کے دل میں ڈالا کہ کسی صالح کی خدمت میں رہ کر کچھ حاصل کرے لہذا اس نے ساری پونجی بیچ کر روپیہ جمع کیا اور اس کو لے کر گھر سے چل پڑا۔ ایک شخص کی صلاح و بزرگی کی شہرت تھی اور چار طرف سے مخلوق اس کے پاس جوق درجوق آتی تھی اس کے شہر میں پہنچ کر گھر کا پتہ لگایا اور دروازہ پر دستک دی۔ اندر سے خادمہ آئی اور پوچھا تمہارا نام کیا ہے؟ اس نے کہا عبد العلی یہ شخص جس کی بزرگی مشہور تھی درحقیقت بد دین فاسق تھا اور اس کے ایک خاص ہم صحبت کا نام بھی عبد العلی تھا جو شراب و کیاب میں اس کا ہم پیالہ و ہم نوا رہتا تھا۔ خادمہ نے جا کر اطلاع دی کہ دروازہ پر جس نے دستک دی تھی اس کا نام عبد العلی ہے شیخ نے اپنا قدیم خاص سمجھ کر کہہ دیا کہ اندر بلا جتنا چہ یہ شخص اندر آیا اور دیکھا کہ شراب سامنے رکھی ہے اور ایک کیسی بغل میں بیٹھی ہے حق تعالیٰ نے ان سب باتوں سے غفلت اس کو نصیب فرمائی اور اس نے کہا حضرت میں نے اپنے وطن میں آپ کی شہرت سنی تھی اور اس ارادہ سے آیا ہوں کہ مجھے اللہ کا راستہ بتائیں اور یہ میری عمر بھر کی پونجی ہے جو اللہ واسطے آپ کی نذر کرنے کو لایا ہوں شیخ نے اس کو لے لیا اور کہا اللہ تمہاری خدمت قبول فرمائے۔ اس کے بعد خادمہ سے کہا اس کو ایک روٹی دیکر کھڑا کھدال پکڑا دے کہ ہمارے فلاں باغ میں جا کر فلاں خدمت انجام دیا کرے چنانچہ یہ مسکین اسی وقت باغ میں چلا گیا اور اس کا دل اس پر مطمئن و مسرور تھا کہ شیخ نے خدمت میں قبول فرمایا۔ حالانکہ سفر کا تعب و تکان تھا مگر اس نے ذرا بھی آرام کرنا پسند نہ کیا اور نہایت اینسٹ و نشاط کے ساتھ فوراً باغ کی خدمت میں لگ گیا اس کی خوش نصیبی اور اللہ کا اس پر انعام کہ اس کا بد دین شیخ کے پاس آنا عین اُس وقت تھا جبکہ اہل دیوان میں ایک بڑے عارت کی وفات کا وقت قریب آگیا تھا اور غوث مع ساتوں اقطاب کے ان کے پاس آئے ہوئے ان سے یہ کہہ رہے تھے کہ درست ہم نے کتنی مرتبہ تم سے کہا کہ کسی اسلامی شہر میں جا کر اپنا وارث تلاش کرو مگر تم نے ہمارا کہنا نہ مانا اب تمہاری وفات کا وقت پہنچا



اور تمہارا سر باطن ضائع ہو جائے گا اور تم بغیر وارث کے دنیا سے جاؤ گے۔ عارف نے کہا اے میرے بزرگو مجھے اپنی جگہ سے کہیں جانا بھی نہ پڑا اور اللہ پاک نے میرا وارث یہیں بھیج دیا۔ انہوں نے دریافت کیا کہ وہ کون ہے؟ کہا وہی عبد العلی جو نلاں بدین کے پاس آیا ہے ذرا اللہ کے ساتھ اس کے حسن طبیعت اور کمال صدق اور سوخ خاطر اور سختی جزم پر تو نظر ڈالو کہ اتنا کچھ دیکھ کر بھی اپنے ارادہ سے متزلزل نہیں ہوا اور نہ اُسے کوئی دوسرے پیش آیا یہ صفائی و جزم جو اس کی ذات میں موجود ہے کیا آپ حضرات کے کبھی سننے میں آئی ہے؟ اور کیا اس کے وارث بنانے میں آپ حضرات میری موافقت فرمائیں گے؟ سب نے کہا ہاں ٹھیک ہے اتنا کہتے ہی عارف کی روح پرواز کر گئی اور حق تعالیٰ نے عبد العلی کو اس کے حسن نیت کے صلہ میں سربلانی کا ترکہ دیکر فتح نصیب فرمادی اس وقت اس کو علم ہوا کہ یہ رحمت الہیہ کدھر سے آئی اور وہ شیخ جی کے پاس آیا تھا بدین و کذاب تھا۔ جو نعمت ملی وہ محض نیت اور جزم کی وجہ سے ملی۔

ایک شیخ کے مریدوں میں ایک سچا مرید تھا شیخ نے ایک روز اس کا امتحان لینا چاہا اور اس سے پوچھا کیوں جی تم کو ہمارے ساتھ محبت ہے؟ اُس نے کہا ہاں حضرت ہے۔ فرمایا اپنے باپ کے ساتھ زیادہ محبت ہے یا ہمارے ساتھ؟ اس نے کہا آپ کے ساتھ زیادہ ہے فرمایا اگر میں تم سے کہوں کہ اپنے باپ کا سر مجھے لاد دو تو کیا تعمیل کرو گے؟ کہا حضرت تعمیل کیوں نہ کروں گا اسی وقت دیکھ لیجئے۔ یہ کہتے ہی وہاں سے چل دیا اور چونکہ شب کا وقت تھا اور مخلوق سو چکی تھی اس لئے دیوار پھانڈ کر اپنے گھر کی چھت پر گیا اور وہاں سے نیچے اتر کر اس مکان میں آیا جہاں اس کے والدین رہا کرتے تھے۔ دیکھا کہ باپ اس کی ماں سے ہم بستری کر رہا ہے۔ فراغت کا بھی انتظار نہ کیا اور گھٹنے اس کے اوپر رکھ کر اس کا سر کاٹ لیا۔ سرے کر شیخ کے پاس آیا اور سامنے ڈال دیا کہ لیجئے حضرت حکم کی تعمیل کر لایا۔ شیخ نے کہا کیا اپنے باپ کا سر لے آیا؟ کہا ہاں حضرت یہ آپ کے سامنے پڑا ہے۔ شیخ نے فرمایا کمبخت میں نے تو مذاق میں کہا تھا مرید نے کہا میرے نزدیک تو حضرت کا ہر کلام واقعی ہے، اس کو مذاق سمجھتا ہی نہیں تب شیخ نے کہا ذرا غور سے دیکھو کیا یہ سر تمہارے باپ کا ہی ہے مرید نے دیکھا تو باپ کا سر نہ تھا۔ شیخ نے کہا یہ کس کا سر ہے؟ مرید نے کہا یہ تو نلاں مجوسی غلام کا ہے مرید کے وطن میں رواج تھا کہ مجوسی غلام زیادہ رکھتے تھے جیسا کہ آج کل حبشی غلاموں کے رکھنے کا رواج غالب ہے اُس رات اس کا والد کہیں باہر گیا تھا اور اس کی ماں نے خائنے بن کر اپنی ناموسی کو مجوسی غلام کے حوالہ کیا۔ شیخ کو کشف کے ذریعہ حال معلوم ہوا اور مرید کے امتحان کی صورت میں اس کا قتل عمل میں آیا مگر معلوم ہو گیا کہ مرید نے اپنے عزم و ارادت میں گویا اٹل پہاڑ ہے چنانچہ شیخ کے سرباطن کا وہی وارث اور فتح پر اُن کے بعد وہی قابض ہوا۔



ایک عارف کے پاس ایک طالب آیا اور کہا حضرت مجھے اپنی خدمت میں اللہ واسطہ قبول فرما لیجئے۔  
 فرمایا بہت اچھا ہمارے پاس رہو۔ اس کے بعد ایک بیلیجہ اس کے حوالہ کیا جس کے سرے پر ایک آہنی خول ببد زائد  
 تھا۔ جس کا کوئی نفع نہ تھا فضول بوجہ تھا جس سے بیلیجہ بھاری ہو گیا تھا یہی مرید شیخ کا وارث قرار پایا تھا۔  
 بشرطیکہ اس آہنی خول کی طرف توجہ نہ کرے اور اگر اس پر تہنہ ہوا اور اس نے دریافت کیا کہ اس خول سے کیا نائدہ ہے  
 اور کس غرض کے لئے اس کو لگایا گیا ہے اور بجز اس کے بیلیجہ وزنی ہو گیا اس کا کوئی نفع نہیں ہے تو اس کو شیخ کا  
 ترکہ کچھ نہ ملے گا چنانچہ وہ کامل سات برس شیخ کی خدمت میں رہا اور اس بیلیجہ سے کام کرتا رہا مگر کبھی دسوسہ بھی نہ  
 آیا کہ یہ آہنی خول کیوں لگایا گیا ہے۔

ایک عارف کا وارث ہونے والا ایک سچا مرید تھا جو مدت دراز تک ان کی خدمت میں رہا اور حق تعالیٰ نے  
 اس کو شیخ کے اکثر اموریے دکھلائے جو صورت غلات شرع تھے مگر مرید کی ارادت میں فرق نہ آیا۔ جب شیخ کی  
 وفات کے بعد حق تعالیٰ نے اس کو فتح نصیب فرمائی تب شاہدہ ہوا کہ صورت اشتباہ تھا اور حقیقت بالکل حق  
 تھی ایک عورت مشہور ناشہ تھی ایک دفعہ مرید نے دیکھا کہ شیخ اس کے ساتھ ہم خلوت ہیں۔  
 مگر فتح کے بعد معلوم ہوا کہ شیخ کی زوجہ بالکل اس کی ہم شکل تھیں اور ہم بستری ان سے ہوئی تھی۔ ایک دفعہ ہمستری  
 کے بعد شیخ نے تیم سے نماز پڑھی بظاہر غسل نہ کرنے کا کوئی سبب نظر نہ آیا۔ مگر حصول شاہدہ کے بعد معلوم  
 ہوا کہ اندرونی مرض تھا جس میں پانی کا استعمال مضر تھا۔ ایک دفعہ معلوم ہوا کہ شراب پیا رہے ہیں۔ مگر  
 حصول شاہدہ کے بعد معلوم ہوا کہ فالسہ کا شربت تھا اور محض شراب کا ہم رنگ تھا۔

ایک مرتبہ مرید کا پیر بھائی تھا اس کا انتقال ہو گیا اور مرید تنہا رہ گیا۔ اس نے اپنا معمول کر لیا کہ جو چیز بھی اس کو  
 حاصل ہوتی اس کے دو حصے کرتا ایک خود رکھتا اور دوسرا حصہ پیر بھائی کے بچوں کو دے دیتا تھا۔ اس کی کچھ  
 زمین حقیقی بھائیوں میں مشترک تھی جس کو حکومت کی طرف سے ظلماً فروخت کر دیا گیا اس کی قیمت میں جتنا حقہ  
 اس کے ہا تھا آیا اس کی مقدار ہمارے زمانہ کے سکے سے چالیس دینا (سورویہ) کی برابر تھی اس کے بھائیوں  
 نے اس سے پوری کا پوچھا کہ کس کام میں لاؤ گے؟ کہا اپنے اور پیر بھائی کی اولاد کے درمیان نصف نصف کر لوں گا  
 بھائی کہنے لگے کہ ہم نے تجھ جیسا احق بھی کوئی نہیں دیکھا۔ ارے کوئی جائداد خرید کر رقم محفوظ رہے، اور  
 اس حماقت کو چھوڑ جس میں لگا ہوا ہے یہ سنکر اس کے نفس نے چاہا کہ بھائیوں کے مشورہ کی طرف  
 مائل ہو، مگر اس نے اپنے نفس کو خطاب کیا کہ اے نفس بھلا کیا جواب دے گا اپنے اللہ کو جبکہ تو اس کے سامنے  
 کھڑا ہوگا اور وہ دریافت فرمائے گا کہ ہم نے تجھے چالیس دینا عطا کئے تھے مگر تو نے اپنے آپ کو ترجیح دیکر حق اخوت  
 کو ضائع کر دیا۔ لہذا آج ہم بھی تجھے صاف کر دیں گے جیسا کہ تو نے اخوت کو ضائع کیا تھا۔



چنانچہ اسی وقت اُس نے رقم کو نصف نصف بانٹ دیا۔ بھائیوں کے پاس سے چلا ہی تھا کہ حق تعالیٰ نے اس کو فتح نصیب فرمادی اور چشم بصیرت دیا ہو گئی حق تعالیٰ نے حسن نیت اور صدق عزم کی بدولت ایک لمحہ میں عارت بنالیا اور وہ نعمت بخشی جو آنکھوں نے دیکھی نہ کانوں نے سنی نہ کسی تلب پر اس کا وہم و خیال آیا۔

ایک شیخ کے بکثرت مرید تھے مگر ان کا خیال ایک کی طرف تھا کہ میرا وارث یہ ہوگا۔ اس لئے ایک مرتبہ اس کو آزمایا کہ ایسی صورت ظاہر کی گویا اجنبی عورت آئی اور شیخ اس کو خلوت میں لے گئے۔ یہ دیکھ کر سارے مرید فوہر ہو گئے صرف یہی ایک رہ گیا بلکہ غسل کئے پانی لا کر گرم کرنے لگا جب شیخ باہر نکلے تو فرمایا کیا کر رہا ہے؟ عرض کیا کہ عورت کے ساتھ حضرت کو خلوت میں جاتے دیکھا تھا اس لئے خیال ہوا کہ شاید حضرت کو غسل کی ضرورت ہوگی اس لئے پانی گرم کر رہا ہوں شیخ نے کہا کیا مجھے معصیت پر بھی دیکھ کر تو میرے ساتھ رہے گا؟ مرید نے کہا حضرت کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتا ہوں جبکہ معصیت کا ارتکاب آپ سے ناممکن نہیں۔ معصیت تو صرف نبی سے ناممکن ہے، اور میں نے آپ کا دامن یہ سمجھ کر نہیں پکڑا کہ آپ نبی ہیں اور آپ سے معصیت ہو نہیں سکتی صرف یہ سمجھ کر دامن پکڑا ہے کہ آپ بشر ہیں مگر راستہ کے مجھ سے زیادہ واقف ہیں۔ اور یہ راستہ کی واقفیت آپ ہیں اب بھی موجود ہے۔ ارتکاب معصیت سے جاتی نہیں رہی پھر میری نیت کیوں بدلے اور میری طبیعت متغیر کیوں ہو۔ اس وقت شیخ نے فرمایا صاف جزا دہ دہ دنیا تھی جو عورت کی شکل بن کر میرے پاس آئی تھی اور میں اس سے متمتع ہوا اور ایسا میں نے عمداً کیا تاکہ یہ بازاری لوگ مجھ سے جدا ہو جائیں اب تم میرے ساتھ خلوت میں آؤ اور دیکھو اندر کیا کوئی عورت ہے؟ چنانچہ وہ حجرہ میں گیا اور دیکھا کہ وہاں کچھ بھی نہیں۔ حضرت تاج الدین مصری کے شاگرد مولانا محی الدین کی کتاب میں یہ قصہ میں لکھا ہوا دیکھا کہ ایک طالب کسی بڑے عارف کے پاس آیا اور درخواست کی کہ حضرت مجھے سرباطنی عطا فرمادیجئے شیخ نے کہا میاں تم اس کی طاقت نہیں رکھتے اُس نے کہا نہیں حضرت مجھ میں اس کی طاقت ہے اور میں اس کو ضرور برداشت کروں گا۔ شیخ نے اس کو آزمایا چاہا اور فرمایا اچھا ٹھہرو اور چند روز ہمارے پاس رہو پیغم تم کو سر عطا کریں گے شیخ کے پاس ایک نو عمر لڑکا رہتا تھا جو کسی بڑے شخص کا بیٹا تھا شیخ نے اس کو ایک مکان میں چھپ جانے کا حکم دیا کہ کسی کو بھی خبر نہ ہو اس کے بعد اپنے حجرہ میں ایک بکری لے جا کر خفیہ طریق سے اس کو ذبح کیا اور کچھ خون اس کا اپنے کپڑوں سے لگایا پھر چھری ہاتھ میں لئے ہوئے کہ اس سے خون ٹپک رہا تھا اور ہاتھ پر سہ رہا تھا غلیظ و غضب کی صورت بنائے ہوئے اُس طالب ترمید کے پاس تشریف لائے مرید نے گھبرا کر پوچھا حضرت کیا ہوا فرمایا فلاں نو عمر بچہ کی ایک حرکت پر مجھے غصہ آگیا اور اتنا آیا کہ میں بے قابو ہو گیا آخر میں نے اس کو ذبح کر دیا اور حجرہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا دیکھو وہ اس میں ذبح ہوا پڑا ہے۔ پس اگر تم مجھ سے



سرباطنی لینا چاہتے ہو تو عزیز من اس راز کو پوشیدہ رکھو اور کسی سے بھی اس کا تذکرہ نہ کیجیو جب اس کا باپ  
مجھ سے پوچھے گا تو میں کہوں گا کہ وہ بیمار ہو گیا تھا اور انتقال کر گیا (چونکہ وہ میرا معتقد ہے اس لئے) میری بات  
کو سچ سمجھے گا اور بات رفع دفع ہو جائے گی۔ لہذا تم اس میں میری موافقت کرو اور میرا پردہ ڈھانپے رکھو۔  
ایسا کرو گے تو انشاء اللہ میں تم کو سرباطنی دے دوں گا سرید کا یہ سننے ہی رنگ بدل گیا اور چہرہ پر ہل بٹ گئے  
غصہ برسنے لگا اور یہ سمجھ کر شیخ اب میرے قبضے میں ہے منہ بنا کر جواب دینا بہت اچھا ایسا ہی کروں گا۔

اس کے بعد وہاں سے چلا اور لپکا ہوا لڑکے کے باپ کے پاس گیا اس کو سارا قصہ سنایا اور کہا اس مکار کذاب  
پیر نے جس کو تم لوگ بزرگ سمجھے بیٹھے ہو تمہارے لڑکے کو ذبح کر ڈالا اور میرے پاس آکر خواہشمند ہوا کہ اس کو چھپائے  
رکھوں اور تم سے اس کا ذکر نہ کروں اگر تمہیں اس کے متعلق کوئی شک و شبہ ہو تو ابھی میرے ساتھ چلو آنکھوں  
سے دیکھ لو گے کہ بچہ اپنے خون میں بھرا پڑا ہے سننے والوں نے کہا نہیں میاں فلاں حضرت ایسا کبھی نہیں کر سکتے  
تم کو ضرور کوئی اشتباہ ہوا ہے اس نے کہا میرے ساتھ چلو تمہیں میرا جھوٹ سچ ابھی معلوم ہو جائے گا  
غرض یہ بات چار طرف پھیل گئی اور افسانہ حکومت کے کانوں میں بھی پڑ گئی۔ وہ بعجلت تمام شیخ کی طرف  
چلے کہ مرید ان کے آگے آگے تھا اور حجرہ کے سامنے کھڑے ہو کر کوارٹروں پر دستک دی۔

شیخ باہر نکلے تو دیکھا کثیر جمع کھڑا ہے پوچھا کیا بات ہے آپ لوگ کیسے آئے؟ انہوں نے مرید  
کی طرف اشارہ کیا اور کہا کیا تم نے سنا نہیں یہ کیا رہا ہے؟ شیخ نے کہا کیا بات ہوئی تباؤ مرید بولا وہی  
بات ہے جس کی مجھے ترغیب دے رہے تھے کہ چھپائے رکھو کسی سے کہی موت شیخ نے کہا کونسی بات؟  
میرے اور تمہارے درمیان تو کوئی بات ہوئی نہیں اور نہ میں نے تم سے کچھ کہا مرید نے کہا میاں جھوٹ بول کر جان نہیں  
بچ سکتی تم لوگوں کے بچوں کو قتل کرتے ہو، اس پر چار طرف سے شیخ پر بوچھاڑ پڑی شروع ہوئی کہ تو نے بچہ کو  
قتل کیا ہے، اب ہم تجھے قتل کریں گے۔ اے دشمن خدا اپنی عبادت سے خلق خدا کو فریب دینا اور اپنی  
فلوت و گوشہ نشینی سے لوگوں کو دھوکہ میں ڈالتا ہے شیخ نے فرمایا اس سے دریافت تو کرو اس کو معلوم کیسے  
ہوا کہ میں نے قتل کیا ہے۔ مرید نے کہا جب تم میرے پاس آئے تھے کیا تمہارے ہاتھوں اور کپڑوں پر  
خون لگا ہوا نہیں تھا؟ شیخ نے کہا ہاں ٹھیک ہے میں نے بکری ذبح کی تھی۔ مرید نے کہا اگر سچ  
ہو تو ہم حجرہ کے اندر جا کر دیکھیں گے۔ چنانچہ لوگ اندر گئے تو دیکھا کہ واقعی بکری ذبح ہوئی پڑی ہے  
مرید نے کہا تم نے مقتول کو کہیں چھپا دیا ہے اور بکری کو ذبح کر کے اس کی جگہ ڈال دیا ہے تاکہ  
نقصا ص میں قتل نہ کئے جاؤ۔ شیخ نے فرمایا بھلا وہ نوحوان اگر صبح سالم باہر آجائے تب تو سمجھے گا کہ تو  
جھوٹا اور بد نصیب ہے؟ مرید نے کہا سچے ہو تو اسے باہر نکالو۔ چنانچہ شیخ نے آدمی بھیج کر اس



نوجوان کو بلوایا اور وہ سامنے آکھڑا ہوا کہ اس بیچارہ کو اس واقعہ کا کچھ بھی علم نہ تھا۔ لوگوں نے اسکو دیکھا تو شیخ کے پاؤں پکڑ لئے اور اس جھوٹے مرید کو گالیاں دینے لگے اس وقت شیخ نے اس سے فرمایا اسے جھوٹے تو تو دعویٰ کرتا تھا کہ میں ستر الہی کی طاقت رکھتا ہوں حالانکہ اتنی سی بات کے چھپائے رکھنے پر قادر نہ ہوا جو درحقیقت کچھ بھی نہ تھی۔ میں نے توجہ کچھ کہا تھا صرف تیرے اس دعویٰ پر کہا تھا کہ میں ستر الہی کی برداشت کر سکتا ہوں جاہم نے تجھے وہ ستر عطا کیا جو تجھے جیسوں کے لائق اور شاہان خان ہے۔ اس دن کے بعد اس مرید کی جو حالت ہوئی وہ موجب عبرت تھی اور مدعی کاذب کے لئے ایک عذاب الہی تھی۔

ایک شخص کو عجیب واقعہ پیش آیا بلاد مغرب کے باشندہ تھے اور ہر سال حج کو جایا کرتے تھے رھلی سے ملنے کا ان کو بڑا اہتمام تھا اور اس تلاش میں رہتے تھے کہ کوئی اللہ والا ملے جس کے ہاتھ پر بیت کر کے وصول الی اللہ نصیب ہو۔ غرض وہ مشرقی ممالک میں جاتے اور آتے اسی طلب و جستجو میں رہتے تھے آخر مصر میں ان کی ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے ایک امانت کو دیکھ کر فرمایا کہ جو شخص بھی یہ امانت تم سے طلب کرے بس وہی ہے جس سے تمہارا مطلب پورا ہوگا چنانچہ ان کے علم میں جتنے بھی بزرگ تھے ایک ایک کر کے وہ سب کے پاس گھوم آئے مگر کسی نے امانت طلب نہ کی، آخر اپنے شہر میں آئے اور گھر پہنچ گئے۔ کچھ دنوں بعد ان کے مہمایہ نے ایک دن بوقت ملاقات ان سے کہا وہ امانت کہاں ہے جو تم کو مصر میں ملاں شخص نے دی تھی۔ اس وقت اس شخص کو علم ہوا کہ مہمایہ ہی صاحب وقت ہیں۔ اس لئے ان کے پاؤں میں گر پڑا اور بوسہ دینے لگا۔ اس کے بعد کہا اللہ اطہر حضرت آپ بھی اپنے آپکو کتنا پوشیدہ رکھتے ہیں۔ میں نے مشرق اور مغرب میں کوئی بزرگ نہ چھوڑا جس کے پاس مہمایہ نہیں آیا اور آپ میرے اتنے قریب اور پڑوس ہی میں ہیں مگر پتہ نہ چلا، اس کے بعد ان سے ستر الہی طلب کیا شیخ نے فرمایا اس کی تو تم میں طاقت نہیں ہے۔ طالب نے کہا حضرت میں اس کی طاقت رکھتا ہوں اور اس کا مستعمل ہو جاؤں گا فرمایا اگر اس کی طاقت رکھتے ہو تو اس کے لئے ایک شرط ہے، اس پر عمل کرو۔ اس نے کہا فرمائیے وہ کیا شرط ہے؟ فرمایا ایسی شرط ہے کہ اس میں تمہارا کچھ زیادہ نقصان بھی نہیں ہے وہ یہ ہے کہ اپنی اس لمبی ڈارھی کو منڈواؤ۔ اس نے کہا حضرت بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے اس کی وجہ سے تو بلاد مشرق میں لوگ میری عزت کرتے اور مجھ سے مرعوب ہوتے ہیں شیخ نے فرمایا اگر ستر چاہتے ہو تو جو میں کہتا ہوں اس پر عمل کرو۔ اس نے کہا حضرت یہ تو ایسی بات ہے جس کو میں برداشت نہیں کر سکتا۔ شیخ نے فرمایا پھر مجھ پر کوئی الزام نہیں رہا جبکہ تم نے میری شرط قبول نہیں کی۔ چنانچہ وہ چلے گئے مگر جب شیخ کی وفات ہو گئی اور جہنمیت سے



محروم رہا تھا اس سے محروم رہ گئے تو بہت نادم ہوئے اور کہا کہ آج عقل آئی اگر شیخ کے زمانہ میں آجاتی تو اس سے بھی زیادہ کر گزرتا کیونکہ یہ ڈاڑھی رکھنا اللہ واسطہ اور اتباع سنت میں نہ تھا بلکہ لوگوں میں جاہ حاصل کرنے ان پر رعب و ہیبت ڈالنے اور ان سے اپنی تعظیم کرانے کی غرض سے تھا۔ اور اسی نمود کا استعمال شیخ کو مقصود تھا جس پر نفس نے عمل نہ کرنے دیا بعد میں ہوش آیا کہ ڈاڑھی کا قطع صورت ایک معصیت تھی مگر وہ حقیقتاً مادہ ریا کا قطع تھا جس سے تمامی عبادت کی اصلاح تھی۔ بلکہ خود ڈاڑھی کی بھی اصلاح تھی کہ وہ بھی اخلاص کے بغیر بکرے کی ڈاڑھی کے حکم میں ہے۔ لہذا اس کی ایسی مثال ہوئی جیسے آکلہ کے مرض میں ہاتھ کٹنا نا کہ لپٹا ہر ایک کا رآمد عضو کی اضاعت ہے مگر درحقیقت سارے بدن کی اصلاح اور حیات کی حفاظت ہے مگر یاد رکھو جس طرح اس کی تشخیص حادق ڈاکٹر ہی کر سکتا ہے اسی طرح کسی کامل انبصرت شیخ ہی کا منصب ہے کہ باطنی مرض کی رگ پکڑے اور یہ علاج تجویز کرے نہ وہ جن کے خود ہی منہ پر ڈاڑھی نہیں اور اس لئے بصیرت کا تو کیا پوچھنا بھارت بھی اتنی کمزور ہے کہ علیک کے بغیر کتاب کا حروف بھی نہیں دیکھتا ڈاکٹری پریش کی نقل اگر بازاری اتارنے لگے تو مریض کا خدا حافظ ہے بچارہ کل کا مرنے آج مرجائے گا۔ صورتہ شیر اور شیر یکساں ہیں مگر حقیقتہً ایک سبب موت ہے اور دوسرا سبب حیات) مجھے ایک بزرگ نے جن کو بیداری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوا کرتی تھی اور اپنے وطن شہر ناس میں بیٹھے ہوئے مدینہ منورہ کی بوسوں گھا کرتے تھے، یہ قصہ سنایا کہ میں نے ایک شیخ کے پاس اندلس کی جامع مسجد میں شب جمعہ گزاری بعد نماز جمعہ جب ہم مسجد سے باہر آئے تو ایک شخص نے شیخ کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور کہا حضرت مجھے آپ کے ساتھ اللہ واسطہ کی محبت ہے شیخ نے ایک اوپری اور ترچھی نظر سے اس کو دیکھا اور فرمایا کیا تمہیں معلوم نہیں اللہ کو باطن کا اور اس سے بھی مخفی تر کا علم ہے مطلب یہ تھا کہ اگر تم کو میری محبت تھی تو اللہ کو اس کا علم ضرور ہے۔ لہذا اسی پر اکتفا کیا ہوتا اور اسی سے اس کا صلہ لے لیا ہوتا مجھے جتانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کہہ کر شیخ تو چلے گئے اور مدعی محبت نے رونا شروع کیا میں نے اس کے پاس آکر کہا کہ اے شخص تو جے بڑی بات کا دعویٰ کیا ہے اور شیخ تم کو آزمانے بغیر نہ چھوڑیں گے لہذا ہر درجنے ہو ورنہ پھر شیخ کہاں اور تم کہاں۔ اتفاق سے اس شخص کا باغ حضرت شیخ کے باغ سے ملحق تھا اور درمیانی سرحد پر انجیر کا ایک درخت کھڑا تھا جو درحقیقت شیخ کا مملوک تھا۔ مگر یہ شخص ہر سال اس کے پھل توٹ لیا کرتا اور حضرت شیخ صبر کیا کرتے اور اس کے پڑوسی ہونے کے سبب شیم پوشی و درگزر فرمایا کرتے تھے اب اس کے دعویٰ محبت پر حضرت شیخ نے فرمایا کہ یہ درخت ہمارا ہے اس کا کوئی پھل نہ توڑنا۔ مدعی محبت نے اس کا انکار کیا اور کیا کہ درخت تو میرا ہے۔ غرض اس نے شیخ سے خوب مقدمہ بازی کی حتیٰ کہ میں نے سنا حضرت شیخ



کو سب شتم کیا کرتا تھا۔ اسی شخص کو میں نے یہ کہتے سنا کہ جب میں حج کو گیا اور روضہ مطہرہ پر حاضر ہوا تو مجھ پر ایک حالت طاری ہوئی۔ اور میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میرا یہ گمان نہ تھا کہ آپ کے مدینہ میں پہنچ کر پھر فاس کو جاؤں گا۔ قبر شریف کی جانب سے مجھے ایک آواز آئی۔ اگر میں اس قبر کے اندر بند ہوں تب تو جو آؤں وہ یہیں رہ پڑے۔ اور اگر میں رعبورت فیض روحانی و شمول انوار و برکات ایمانی اپنی اُمت کے ساتھ ہوں جہاں کہیں بھی ہوں تو تم کو اپنے وطن چلا جانا چاہیے۔ چنانچہ میں وطن واپس آ گیا حضرت ممدوح نے فرمایا ایک محذوب تھے وہ قصد اکوئی مخالف کام کیا کرتے تھے مگر لوگ اُن سے نفرت کھا کر بھاگ جاتے چنانچہ ایک دفعہ انہوں نے اپنے کپڑے پر شرب ڈال لی۔ سب لوگ شراب کی بو سونگھ سونگھ کر چلے گئے اور صرف ایک شخص جو ان کے سرباطن کا وارث تھا باقی رہ گیا تب انہوں نے کہا کہ یہ میں نے اس لئے کیا تھا تاکہ یہ جیونٹیاں (یعنی پیچھے لگنے والی بھڑ) مجھ سے الگ ہو جائیں۔ کیونکہ اُن کی حاجت مجھے نہیں ہے مجھے تو صرف تمہاری ضرورت ہے اُمت محمدیہ کی بھی عجیب شان ہے کہ نہ بنی دُشارع ہے، اور نہ عامی محض علم ظاہر کے حاملین علماء و فقہاء ہوں یا علم باطن کے حاملین صوفیہ و ادویاء مقاصد شریعت و طریقت میں ذرہ برابر ترمیم نہیں کر سکتے کہ یہ منصب ہے صرف مہیبط وحی پیغمبر کا مگر وسائل مقصود میں ان کو دیکھنا پڑتا ہے اقتضا و وقت اور طبائع اہل زمانہ کو کہ اجتہاد و خداقت اسی کا نام ہے اور کائنات بنی اسرائیل کا مقتضا یہی ہے مثلاً کفار سے جنگ جس کا نام جہاد ہے ایک مقصود شرعی ہے کہ غلبہ ہو تو اسلام کو اور شکست لپٹ و پامال ہو کفر کی حیثیت تک دنیا قائم ہے اس مقصود کو بدلنا کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے البتہ اس کا طریق باقتضا زمانہ متغیر و متبدل ہو سکتا ہے کہ زمانہ ثبوت یہ مقصود حاصل ہوتا تھا نیزہ و تلوار اور تیر و کمان سے اور اب حاصل ہوگا توپ و مشین گن بلکہ ہوائی و بحری جنگی جہازوں اور برقی آلات حرب سے لہذا مجاہدین اسلام کا طریق تیر و تلوار چلانے کا سیکھنا سکھانا تھا مگر غزاة اخلاف کا طریق ان جدید آلات حرب کا تعلیم و تعلم ہوگا اور یہ صوری اختلاف عین اتحاد و سمجھا جائے گا بلکہ اتحاد و صوری بحکم اختلاف قرار دیا جائے گا۔ پیری مریدی ایک ذریعہ ہے باطنی نور حاصل کرنے کا جس سے عظمت و محبت پیدا ہو اللہ و رسول کی اور حلاوت و دل وستی حاصل ہو اطاعت و عبادات میں مرین بھی غذا کھاتا ہے مگر بادل خورستہ محض طبیع کے حکم اور عزیزوں کی رعایت سے کہ حل نہیں چاہتا مگر امید صحت کی جھلکیاں جبر و قہر کر کے ایک دو نوالہ حلق سے اُمار دیتی ہے اور نذرست ہوگا بھی غذا کھاتا ہے مگر سچی طلب اور صادق اشتہاء سے کہ کوئی منع بھی کرے تو باز نہیں آتا معرفت اور ایمان کا نور و حلاوت اسی کا نام ہے اور تمامی اذکار و اشغال جنہیں اطباء روحانی مشائخ نے تجویز کیا ہے اسی مقصود بالذات اور روح اعمال کے طریق تحصیل اور سائط و ذرائع ہیں اور اس لئے مریدین کی طبائع کی اختلاف سے



وہ ادا لے رہے ہیں روحانی اصلاح کا سارا مدار طلب صادق اور شیخ کے ساتھ توحید مطلب یعنی اس قسم کی ایک درگیری پر ہے جیسی بلا تشبیہ بیوی کو اپنے شوہر اور فرزند کو اپنے باپ کے ساتھ حاصل کر بڑا ہو یا عیلا اسی سے صحیح النسب نطفہ لینا ہے اور اسی کی میراث و جاگیر پر قبضہ کرنا ہے اس کیسوی پر عزم و پختگی کا امتحان کرنے کے لئے شیخ کو ایسی ضرورتیں پیش آتی ہیں جن کی ظاہری صورت ارتکاب معصیت کی اور خلاف شان شیخوخت کے ہوتی ہے جیسا کہ شوہر اپنی بیوی کا طرح طرح کی سختی و زیادتی کر کے امتحان لیتا ہے اور حیب مطمئن ہو جاتا ہے کہ ظلم و تشدد پر بھی میرا دروازہ چھوڑنا اور باپ کے گھر تک جانا نہیں جانتی تب اس کے دل میں اس کی قدر و منزلت ہوتی ہے کہ باید و شاید پہلے زمانہ میں صلاح کا فائدہ تھا اس لئے مرید کی یک درگیری کا یہ امتحان بہتر معصیت یا تھا کہ بڑے سے بڑے شیخ اور مشہور سے مشہور بزرگ کو بھی خلاف شرع امر کا مرتکب دیکھتے تھے تو اس کو چھوڑ دیتے تھے کسی صورت اتنی تھی کہ اس کی معرفت و ولایت کا بھی جس کے بڑے اثرات دیکھتے رہے تھے لحاظ کرتے اور اس غور و فکر کا یا حسن ظن کا بھی موقع نہ دیتے تھے کہ ممکن ہے اس کی کرتی اندرونی وجہ جواز ہو جس کا میں علم نہ ہو کم از کم یہ کہ وہی ہے نبی نہیں ہے اور اس لئے حقیقت بھی معصیت کا صدور اس سے محال نہیں ہے مگر اب جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا سے تشریف لے گئے ہوئے ساڑھے تیرہ سو برس گزر گئے اور اس خیر القرون پر جو بھی گزر رہا ہے وہ نور کو مضمحل اور ظلمت کو غالب کرتا گزر رہا ہے لہذا امتحان کی صورت ہی قدرت نے بدلدی ہے۔ عام طبائع میں ظلمت کا غلبہ اور ظلمت ہی کی طرف ان کی کشش ہو رہی ہے اس لئے جتنا کوئی بددین اور خلاف شرع بننا جائے گا اتنا ہی بڑا پیر قرار پاتا جائے گا اور مخلوق اس کی طرف لپکتی چلی جائے گی لہذا مرید صادق اور اہل طالب حق کا امتحان بھی اس وقت اتباع شریعت ہی میں منحصر ہو گیا ہے اول تو جتنا کوئی شیخ ممتنع شریعت ہوتا جائیگا مخلوق خود بخود اس سے بھاگتی چلی جائے گی کہ ملنا ہے یہ کیا جانے تصون کو اور نا بد خشک ہے اس کے پاس بجز اس کے ہے کہ نماز پڑھو اور روزہ رکھو اور اس پر بھی کوئی مارے باندھے کا اگر لگا چٹا رہا تو رسومات رائج کا بدعت ہونا یا ایسا کوئی مسئلہ اس کو سنا دو جس کا خلاف عام غلطی و جہالت کے سبب باپ دادا کے زمانہ سے اس کے کانوں میں پٹلا ہوا ہے تب تو میدان ہی صاف ہو جائے گا اور یہ کہہ کر کہ نئے نئے ملکہ اور نئے نئے مسئلے ساری بھیڑ چھٹ جائے گی اور بڑا ہی مخلص اور سچہ ہو گا جو یہ سمجھ کر جہاد پڑا رہے گا کہ میرے پیر کا علم ہر حال مجھ سے زیادہ ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو میں اس کو پیر ہی کیوں بناتا۔ الحاصل غلبہ ظلمت نے امتحان کے اصلی مقصد یعنی یک درگیری اور احتیاج و طلب کی جانچ کا طریق بدل دیا ہے اس لئے اب کسی شیخ کو بھی یہ گنجائش نہیں کہ وہ اپنی معصیت کو امتحان عزم و ارادت کی کملی اڑھائے اور صورت خطا میں



بھی کوئی گنجائش نہ کالے دوئم اسی کتاب میں ابھی تم پڑھ چکے ہو کہ شیخ المشائخ حضرت زروق رحمۃ اللہ علیہ  
 نے قدیم طریق کی تربیت کو جو کہ صد ہا سال سے اکابر و اجلہ عارفین کا معمول چلا آ رہا تھا محض اس دلیل  
 سے یک لخت بدل دیا کہ اہل ظلمت نے اس کی نقل آنا شروع کر دی ہے لہذا پھر اسی طریق تربیت کی طرف عود کرنا  
 ضروری ہوا جو خیر القرون میں شائع تھا یعنی اتباع سنت اور کتاب اللہ و کتاب الرسول کا مضبوطی کے ساتھ تھامنا  
 کہ سہل ترین بھی ہے اور اہل ظلمت کی نقالی سے بھی محفوظ و مامون ہے اور بابرکت بھی ہے کہ جاری کیا ہوا ہے  
 محبوب رب العالمین کا پھر کیا پوچھنا اس زمانہ کا شیخ زروق کو بھی دنیا سے اٹھے ہوئے کئی صدیاں گزر گئیں اور ظلمت  
 و بددینی و الحاد کی گھٹا جھاگئی کر فی لاکھ بلکہ فی کروڑ بھی ایک قطب نور والا جو کچھتا ہو اللہ و رسول کی طرف نکل آئے  
 تو عنایت ہے۔ کافر تو کافر بہترے مسلمان اس وقت دین کا محول اور شریعت کا مذاق اُٹا رہے ہیں طاعون  
 و بلاء عام کے زمانہ میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا ضروری اور مشتبہات بلکہ اس جائز و مباح سے بھی احتیاط  
 کرنے کی شدید ضرورت ہے جس نے احتمال پیدا ہو عوام کی بے احتیاطی کا گذشتہ حضرات اولیاء کے ان  
 قصوں ہی سے جن کی صورت معصیت باطنی درجہ میں موصول اور جواد کی گنجائش رکھتی تھی لوگ استدلال کر کے  
 شریعت پر تیر و تفنگ چلا رہے اور معاصی و فسق و فجور میں اتنا کھل کھیلے ہیں کہ علماء و مشائخ کو جواب دینا مشکل  
 پڑ رہا ہے اگر خدا نخواستہ علماء و صوفیہ اہل حق اس کا ارتکاب کرنے لگے تب تو کچھ ٹھکانہ ہی نہ رہے گا اس لئے غور کرو  
 کہ دیگر مشائخ اگر مشائخ تھے تو حضرت زروق بھی مشائخ میں تھے بلکہ شیخ المشائخ تھے کہ حضرت عبدالعزیز دیاخ  
 بھی ان کے مذاح اور ان کو صائب الراعی بتا رہے ہیں۔ اس لئے حکایات مذکورہ کے بھی انکار کی ضرورت  
 نہیں کہ وہ بذریعہ حال اور تصرف کے مریدین کی تربیت کا زمانہ تھا اور اس وقت اہل فہم اور اہل صلاح کی  
 کثرت اور قرب زمانہ نبوت کی وجہ سے اس میں بہت گنجائش تھی مگر اس نازک اور قرب قیامت کے زمانہ میں تو  
 یہ رنگ مریدین ہی کے لئے نہیں بلکہ عامہ مخلوق کے لئے بھی ستم قاتل ہے اور حضرت امام زروق کا مذاق جس کو  
 اپنے نور بصیرت سے ادراک فرما کر وہ آج سے کئی سو برس پہلے قائم فرما گئے ہیں بہت زیادہ مضبوطی سے  
 پکڑنا ضروری ہے۔ رہا مذکورہ حکایات کا تذکرہ سو وہ محض اس لئے کیا ہے کہ علماء و علما ہر ان اسلاف پر سبب شتم و تخریب  
 اور متعصبانہ زبان ان سے دلیل نہ پکڑیں کیونکہ حقیقت اور وجہ دونوں پر کھل چکی کہ بعض مصالح دینیہ کی بنا پر  
 محض صورتہ اُن سے ایسا ہوا تھا ورنہ معصیت کا بغض اور اپنے اس فعل کی گرافٹی بدستور ان کے قلوب میں موجود تھی  
 کہ احرام شریعت کا یہی مقتضا تھا اور خود حضرت عبدالعزیز فرما چکے ہیں کہ شریعت کی مشعل کو ہاتھ میں لئے بغیر کوئی  
 کبھی عارف نہیں بنے گا حق تعالیٰ اپنی اور اپنے رسول کی محبت و فیض فرمائے کہ شریعت محمدیہ کو اپنا جہم اور طریقت کو کہ محافظ  
 شریعت ہے اپنی روح قرار دیکر دونوں نعمتوں سے مالا مال ہوں آمین۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔



حضرت نے فرمایا ایک شخص کسی ولی کے پاس آیا اور جسے کمر پاؤں تک بغور دیکھنے لگا۔ انہوں نے فرمایا اس سے کیا مقصود ہے؟ فرمایا میں حضرت مجھے یہی غنیمت ہے میرا مطلب یہ تھا کہ آپ کو اچھی طرح دیکھوں تاکہ آپ کل کو اللہ کے دربار میں میری سفارش فرمائیں اس کے بعد حضرت نے فرمایا اس اخلاص اور بے لوث محبت کے سبب اس شخص نے بڑا نفع کمایا نیز حضرت جب اس قصہ کا تذکرہ کیا کرتے تو فرمایا کرتے الحمد للہ اس امت میں ابھی آدمی باقی ہیں۔

ایک طالبِ صادق ایک بزرگ کے پاس آیا اور کہا میں اللہ واسطہ آپ سے محبت رکھتا ہوں یہ وقت صلوٰۃ فجر کا تھا۔ شیخ نے فرمایا اگر نفع اٹھانا چاہتے ہو تو اپنے گھر واپس نہ جاؤ اور ابھی بلاؤ شرق (عرب) کی طرف روانہ ہو جاؤ چنانچہ اُس نے حکم کی فوراً تعمیل کی اور بڑا نفع اٹھایا۔

حضرت ممدوح نے فرمایا لوگوں نے جو کرامات ادلیا میں کتابیں تصنیف کی ہیں اگرچہ اُن سے اتنا نفع ضرور ہوا کہ اُن ادلیا کو لوگوں نے پہچان لیا اور عقیدت و محبت رکھنے لگے، مگر اس درجہ میں نقصان بھی بہت ہوا کہ مصنفین نے صرف کرامتوں کے بیان کرنے پر اکتفا کیا اور ان صاحبانِ کرامت سے جو فانی امور دنیا ظہور میں آتے تھے ان کا تذکرہ نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب دیکھنے والے کی نظر سے جب کرامت پر کرامت اور کشف پر کشف اور تصرفات پر تصرفات ہی گزرتے رہیں گے تو اسے خیال ہو گا کہ وہی کسی امر میں بھی عاجز نہیں ہوتا، جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے اور اس سے کوئی حنطہ و معصیت صورت بھی صادر نہیں ہو سکتی اس لئے جہلِ عظیم میں پڑ جائے گا کیونکہ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ ولی میں ربوبیت کے بھی اوصاف پائے جاتے ہیں مثلاً یہی کہ جو چاہتا ہے کر سکتا ہے اور اس کو انجیز لاحق نہیں ہوتا اور نبوت کے اوصاف بھی پائے جاتے ہیں کہ معصوم ہے اور غلطی کا اس سے صدور نہیں ہو سکتا حالانکہ اوصافِ ربوبیت تو حق تعالیٰ نے اپنے انبیاء و رسل کو بھی عطا نہیں فرمائے جہاں تک ادلیا چنانچہ سیدِ محبوبین کے لئے ارشاد فرماتا ہے کُنْ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ اے محمد اس کام میں تمہارا کچھ اختیار نہیں یا خدا ان پر مہربانی فرمائے یا ان کو عذاب دے کیونکہ ظالم ہیں اور فرماتا ہے إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَئِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ اے محمد تم جس کو دوست رکھتے ہو اُسے ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ خدا ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں میں نے حق تعالیٰ سے دو باتوں کا سوال کیا تو وہ عطا فرمادیں اور دو باتوں کی درخواست کی تو منع فرمادیا حق تعالیٰ نے نازل فرمایا قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا بَاطِلًا مِّنْ قَوْلِكُمْ کہہ دو اے محمد خدا اس پر قادر ہے کہ تم پر عذاب بھیجے اور پھر کی جانب سے میں نے دعا مانگی یا اللہ آپ کی کریم ذات کی پناہ مانگتا ہوں فرمایا اچھا منظور کیا کہ تمہاری امت پر آسمانی عذاب نازل نہ ہو گا۔



اس کے آگے ارشاد فرمایا) اَوْ مِنْ تَحْتِ اُدْحِیْکُمْ یَا عَذَابُ نَازِلٌ فَمَنْ تَهَارَبَ بِاَوْسُ کَی نِیچے سے۔ میں نے عرض کیا آپ کی ذات کی پناہ مانگتا ہوں۔ فرمایا اچھا منظور رکھتے ہو اور غیثہ ارضی عذاب سے بھی اُمت کو ہلاک نہ کریں گے۔ آگے فرمایا اَوْ یَلِیْسَ کُمْ شِیْعًا یَا مَہْمِیْسُ فَرَقَ فَرَقَ کَر دے۔ میں نے عرض کیا پناہ چاہتا ہوں آپ کی ذات کی۔ فرمایا یہ پہلے مقدر ہو چکا ہے لہذا اُمت میں تفرقہ اور فرقہ وارانہ اختلاف ضرور ہوگا پھر آگے فرمایا) وَیَنْتِیْقُ بَعْضُکُمْ بِاَسَی بَعْضِیْنِ اور ایک دوسرے کی لڑائی کا مزہ چکھا دے۔ میں نے عرض کیا پناہ چاہتا ہوں آپ کی ذات کی فرمایا یہ پہلے مقدر ہو چکا ہے (لہذا باہم جنگ و طوئیر نہ ہو کر رہے گی) نیز حضرت نوحؑ نے اپنے بیٹے کے غرق سے بچ جانے کی درخواست کی اور منظور نہ ہوئی چنانچہ ارشاد ہے وَنَادٰی فِیْ کُوفٍ ذٰلِکَ الْاٰیۃِ اور لپکارا نوحؑ نے اپنے رب کو اور عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میرا بیٹا میرے اہل میں شامل ہے اور آپ کا یہ وعدہ (میرے اہل کو غرق سے بچا لینے کا) سچا ہے اور آپ حاکموں کے بھی بڑے حاکم ہیں حق تعالیٰ نے فرمایا کہ نوحؑ وہ تمہاری اہل میں (شامل) نہیں ہے کیونکہ اس کے اعمال اچھے نہیں ہیں (لہذا وہ ضرور غرق کیا جائے گا) پس مجھ سے ایسی درخواست نہ کرو جس کا تمہیں علم نہیں۔ میں تم کو نصیحت کئے دیتا ہوں کہ جاہلوں میں سے نہ بنو نیز فرمایا وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا اَمْرًا ؕ کَانَ لَوْحٌ وَّ اَلِیۃٌ ۙ اور اللہ نے مثال بیان فرمائی۔

کفر کرنے والوں کے لئے نوحؑ کی بیوی اور لوطؑ کی بیوی کی کہ دونوں ہمارے دو بزرگ بندوں (پیغمبروں) کی زوجیت میں تھیں۔ اور انہوں نے اپنے شوہروں کا خلاف کیا پس وہ (پیغمبر)، اللہ کے عذاب کو ان سے کچھ بھی نہ روک سکے۔ اور آج لوگوں کی یہ حالت ہے کہ اگر کسی ولی کو دیکھیں کہ اس نے کوئی دعا مانگی اور قبول نہ ہوئی یا اس کے لڑکے کو بدراہی پر دیکھا یا اس کی بیوی کو دیکھا کہ اللہ کا خوف نہیں کرتی، تو فوراً کہہ دیتے ہیں کہ یہ ولی ہی نہیں ہے۔ کیونکہ ولی ہوتا تو اس کی دعا کو ضرور قبول کرتا اور ولی ہوتا تو گھر والوں کی تو اصلاح پر قادر نہیں چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے وَکَوْلًا فَضَّلُ اللّٰهُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَتُهُ مَا تَکُنْ اَمَّا اَبَدًا وَّ لٰکِنْ اللّٰهُ یُنِیْکُمۡ مِّنْ یَّشَآءُ وَّلَکِنَّا لَنَرٰکُمۡ کَافِرٰتٍ اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی ایک بھی کبھی پاک طینت نہ بن سکتا ہے لیکن اللہ ہی جس کو چاہتا ہے پاک طینت بنا دیتا ہے (غرض اللہ کے کام میں اللہ ہی کے لئے مخصوص ہیں۔ جب ان میں کوئی نبی بھی شریک نہیں ہو سکتا تو ولی کا کیا پوچھنا)

اب رہا امر دوم یعنی معصوم ہونا۔ سوا اوصاف نبوت میں سے ہے اور ولایت نبوت کے کبھی ہم پتہ بھی نہیں ہو سکتی۔

نیز حضرت ممدوحؑ نے فرمایا کہ ملی کے ناخبر پر رجبیت ہونے سے صلاح و ہدایت کی جو کچھ بھی خیر و خوبی ظاہر ہوتی ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی برکت ہے کیونکہ ایاں جو اس خیر کا سبب ہوئے وہ ولی تک بواسطہ آنحضرت



صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے پہنچا ہے ورنہ وہی کی ذات وقطع نظر اس کے ایمان کے عام لوگوں کے مثل ہے  
برخلاف حضرات انبیاء علیہم السلام کے کہ ان کی آفرینش ہی عصمت پر اور تخلیق ہی اللہ کی معرفت اور  
تقویٰ پر ہوئی ہے کہ نہ وہ (اس معرفت اور توحید میں) شریعت کے محتاج ہیں کہ اس کا اتباع کریں اور  
نہ کسی دینیوی استاد اور معلم کے محتاج ہیں کہ اس سے مستفید ہوں بلکہ حق جو ان کی ذوات میں مستقر  
ہے یعنی حروف نبوت جو کہ ان کا فطری وطبعی ہے وہی ان کو سیدھے اور سچے راستہ پر چلاتا ہے۔  
شریعت محض امت کے لئے یا فروع و طریق عبادت بتانے کے لئے ہے (پس اگر مؤلفین جس دلی کی سوانح  
لکھ رہے ہیں اگر ان کا شرح حال اور فتح کے بعد امور باقیہ صالحہ اور امور فانیہ جو کچھ بھی اس سے  
صادر ہوئے ہیں سیکور رج کتاب کرتے تو بے شک لوگوں کو حقیقی و واقعی تفہیم ہوتی اور ان کو معلوم ہوتا کہ ولی  
کی بھی دعا مانگتا ہے تو قبول ہو جاتی ہے اور کبھی دعا مانگتا ہے تو رد ہو جاتی ہے اور قبول نہیں ہوتی نیز اس کی کوئی  
مراد ہوتی ہے مگر کبھی پوری کر دی جاتی ہے اور کبھی پوری نہیں کی جاتی جیسا کہ حضرات انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام  
کا حال ہے کہ وہ بھی دعا و اور مراد میں اللہ کے محتاج ہیں اور لا و نعم دونوں کے منظر بنتے ہیں، اور ولی ہیں انبیاء  
کی بہ نسبت صنعت کی، اتنی بات ناٹد ہے کہ عام لوگوں کی طرح اس کے اعضا پر کبھی طاعت کا ظہور ہوتا ہے  
اور کبھی معصیت کا برخلاف انبیاء کے کہ وہ معصوم ہیں اور یہ ان کی امتیازی شان ہے کہ قبل نبوت بھی ان سے  
معصیت کا صدور نہیں ہوتا، پس اگر وہی کو عوام الناس سے کوئی امتیاز ہے تو صرف ایک بات میں ہے۔  
کہ حق تعالیٰ نے اس کو معارف کے ساتھ مخصوص فرمایا اور فتوحات اور بصیرت کے مشاہدات نصیب فرمائے  
ہیں (جن سے عوام محروم ہیں) علاوہ ازیں وہی سے اگر معصیت ظاہر ہوتی ہے تو محض صورت اور ہمارے دیکھنے  
میں ہوتی ہے، درحقیقت نہیں ہوتی کیونکہ مشاہدہ جس میں وہ غرق ہے اس کو معصیت سے روکتا ہے اور  
خلاف کرنے سے باز رکھتا ہے مگر درجہ عصمت تک نہیں پہنچ سکتا ورنہ نبوت اور ولایت یکساں ہو جائیں  
کیونکہ ممانع معصیت انبیاء میں ذاتی وطبعی ہے اور اولیاء عارضی و خارجی ہے لہذا اولیاء میں اس کا زائل  
ہو جانا ممکن ہے مگر انبیاء میں مانع کا زائل ہونا ناممکن ہے اور اس کی حقیقت وہی جو پہلے بیان ہو چکی  
ہے کہ انبیاء کی خیر و خوبی ان کی ذات کی طرف سے ہے اور اولیاء کی خیر و خوبی ان کی ذات کی طرف سے نہیں بلکہ غیر  
کی طرح شمس نبوت سے نور ایمان حاصل کرنے کی بنا پر ہے) پس عصمت انبیاء ذاتی ہوئے اور اولیاء کی حفاظت  
عن الخطاء عارضی ہوئی۔ لہذا عادت کامل سے اگر خطا کا ظہور ہوگا تو صورتی ہوگا حقیقی نہ ہوگا یعنی دیکھنے  
والوں کا امتحان اور ان کی آزمائش مقصود ہوگی کہ کون دلی کو نبی کا درجہ دیکھ اس سے بھاگتا ہے اور کون اس کو نبی  
کا نائب اور محل صدور خطا صاحب معرفت سمجھ کر جبا اور پٹا رہتا ہے، نیز اس ظہور صدور



خطا میں) اور بھی اسرار میں جن کے ذکر کا یہ موقع نہیں نیز آپ نے فرمایا کہ جس شخص کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خور و نوش اور خواب و بیداری اور گھر میں امور خانہ داری کے متعلق سیرت و عبادت معلوم ہو جائے گی۔ اور آپ کے حالات جنگ اور غزوات کا علم ہو گا کہ کبھی آپ کی جیت ہوتی تھی اور کبھی دوسرے فریق کی۔ نیز یہ کہ آدمی آپ کے پاس اگر صحابہ کو اپنے ساتھ لے جانے کی درخواست کرتے اور آپ بھیج دیا کرتے تھے۔ پھر وہ لوگ ان کے ساتھ بد عہد می و غدیر کیا کرتے تھے جیسا کہ غزوہ ربيع اور غزوہ بدر معونہ میں ہوا یا دیگر واقعات جو مثلاً غزوہ حدیبیہ وغیرہ میں پیش آئے اور ان امور و حوادث اور سوانح و واقعات میں اسرار ربانیہ ہیں جن پر حق تعالیٰ نے اپنے نبی کو مطلع فرمایا تھا۔ ان باتوں کا علم ہو جانے پر اولیاء کا پہچاننا سہل ہو جائے گا اور اولیاء سے مقتضیات بشریہ اور اکل و شرب بول و برد و داد و ستد نفع نقصان حزن و فرح موت و ولادت وغیرہ وغیرہ) امور فانیہ صادر ہوتے ہوئے دیکھ کر اس کو تعجب نہ ہو گا پس عاقل پر جس کو صلاح اور اہل صلاح سے محبت ہو لازم ہے کہ سیرۃ محمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مطالعہ کیا کرے کہ اس سے اولیاء سے واقفیت کی رہبری ہوگی اور ولایت ولی کا پہچاننا دشوار نہ رہے گا۔

نیز آپ نے فرمایا ایک شخص دو رہی دور سے کسی ولی کا نام سنتا ہے تو اپنے ذہن میں اس کی صورت ایسی لاتا ہے جو ان کرامتوں کے مطابق ہوں جنہیں لوگ نقل کر رہے ہیں پھر جب اس کے پاس جاتا ہے اور اپنے متخیلہ کی صورت کے موافق اس کو نہیں پاتا تو اس کو شک ہو جاتا ہے کہ آیا یہ وہی ولی ہے جس کی کرامتیں سن رہا تھا۔ یا وہ نہیں بلکہ کوئی عامی شخص ہے) چنانچہ جزائر میں ایک شخص تھا اس نے فاس کے ایک ولی کا تذکرہ سنا اور اس کی بہت کچھ کرامتیں اس کے کان میں پڑیں تو اس کے متخیلہ میں ایک صورت آئی کہ ایک بڑا بوڑھا باریع شخص ہے جس سے بات کرتے بھی ہر شخص کو ڈر لگتا ہے، پس وہ باراد حصول فیضان اپنے وطن سے چلا اور جب شہر فاس میں پہنچا تو اس ولی کا گھر دریافت کیا۔ اس کا خیال تھا کہ ولی کے دروازہ پر مدبان بیٹھے ہوں گے۔ آخر جب دروازہ پر پہنچا تو دستک دی خود وہ ولی ہی نکل کر باہر آئے۔ نو وارد نے سمجھا کہ یہ دربان ہے اس لئے کہا جناب میں اعلیٰ حضرت کے دربار میں باریاب ہوتا چاہتا ہوں۔ ولی نے کہا وہ میں ہی تو ہوں جس کے پاس تم آئے ہو۔ چونکہ کرامتیں سن کر جیسی بڑی صورت یہ شخص اپنے ذہن میں لئے ہوئے تھا اس میں اس کا کچھ بھی نمونہ نہ دیکھا تو کہنے لگا جناب میں ایک مہینہ کی مسافت قطع کر کے بہت دور سے آیا ہوں۔ مسافر ہوں بے وطن ہوں اور بڑا شوق سے کر آیا ہوں اللہ کی قسم پر رحمت ہو۔ برائے خدا مجھے شیخ تک پہنچاؤ ولی نے کہا میاں میں ہی ہوں جس سے ملنے کی نیت سے تم آئے ہو۔ کہنے لگا میں آپ سے کہہ رہا ہوں۔ کہ میں ناواقف غریب الوطن ہوں اور درخواست کر رہا ہوں کہ مجھے اعلیٰ حضرت تک



پہنچنے کی رہبری کرو مگر آپ مجھ سے مذاق کیسے جاتے ہیں۔ ولی نے کہا میں مجھے اللہ ہی سمجھے اگر میں تم سے مذاق کرتا ہوں۔ آنے والا یہ کہہ کر کہ ہاں تجھے خدا ہی سمجھے، وہاں سے چل دیا۔ یہ صرف اس سبب سے ہوا کہ جو صورت اُس نے اپنے متخیلہ میں سے رکھی تھی ولی کو اس کے خلاف پایا۔ اور اس سبب کی بدولت بہترے لوگ گر چکے ہیں کیونکہ انہوں نے کرامات اولیاء کی کتابوں کا مطالعہ کر کے ایک صورت (کرامتوں کے شایان شان متخیلہ میں سمجھالی اور حیب اپنے اولیاء زمانہ کو اس صورت پر منطبق نہ پایا تو سبکی ولایت میں شک کرنے لگے کیونکہ ان میں بشری اقتضا اور عوام کے ساتھ اختلاط اور سادگی کی، وہ باتیں دیکھیں جو کتب کرامات میں کہیں لکھی ہوئی دیکھی نہیں تھیں اس لئے واہمہ میں یہ جم گیا کہ ولی کو نہ بول و براز ہوتا ہے نہ وہ سودا خریدنے بازار جاتا ہے نہ کسی سے بولتا ہے اور بات کرتا ہے۔ ایک بھاری بھر کم ثبت بنا بیٹھا رہتا ہے۔ اور لوگ اس کو پوجتے اور چڑھاؤ اس پر چڑھتے رہتے ہیں) حالانکہ اُن ہی اولیاء کو جن کی کرامتیں جمع کی گئی ہیں اگر کتاب کی تالیف سے پہلے دیکھتا تو ان میں بھی یہی اوصاف بشریہ موجود پاتا جن کو اپنے زمانہ کے اولیاء میں ادبیری پارہا اور بنظر استعجاب دیکھ رہا ہے۔ اسی سے زیادہ ایک جہالت یہ پیدا ہو گئی ہے کہ ولایت کے لئے بہت کچھ شرائط اور ضوابط تجویز کر لئے ہیں کہ جس میں وہ شرائط نہ پائی جائیں وہ ولی ہی نہیں۔ ان صاحبوں سے کوئی پوچھے کیا رحمت الہیہ ان ضوابط کے ماتحت ہے؟ اور کیا ضوابط تجویز کرنے والوں سے قبل کوئی ولی نہیں ہوا اس وقت ضوابط کو اپنے اولیاء زمانہ پر منطبق کرتے ہیں اور ساری شرائط جو لوگوں نے کتابوں میں لکھی ہیں ان میں موجود نہیں پاتے تو ان کے دئی ہونے کا انکار کر دیتے ہیں حالانکہ ولایت ایک عطا ہے حق تعالیٰ کی اور اصطفاء من اللہ ہے جس کو بھی نوازے اور جس حال میں بھی نوازے (نہ کسی قوم کے ساتھ مخصوص ہے نہ کسی پیشہ کے ساتھ، نہ کسی ریاضت مخصوصہ کی شرط ہے نہ کسی مجاہدہ معینہ کی) جب اس کی رحمت ایک کافر کو ایک لمحہ میں ایمان عطا فرمادیتی اور اس کے ایمان لائے ہی اس کو فتح و بصیرت بخش دیتی ہے تو پھر کونسا ضابطہ ہے جس کا دلالت کو پابند اور رحمت الہیہ کو مقید بنایا جائے اگر دیکھنے کے قابل ہیں تو علامات ولایت یعنی نفس معرفت اور نور ایمان ہیں کہ قلب میں اس کی حقیقت موجود ہے یا محض مکاری اور مجرور و مجبوس خانقاہ ہے یا متاہل اور بیوی بچوں والا، کچھ بھی قابل لحاظ نہیں)

یہ لوگ کہا کرتے ہیں اچھی ہماری نظروں نے نلاں بزرگ دیکھا ہے۔ اب وہ بات ہی کہیں نظر نہیں آتی۔

ان باتوں کو اور اس رنگ کو نظریں ڈھونڈتی ہیں مگر اب وہ کسی میں بھی دکھائی نہیں دیتیں۔ پس جی دنیا ہی خالی ہو گئی پیر بہترے ہیں مگر وہ بات کہاں مولوی دن کی سی، ان صاحبوں



کو سمجھنا چاہیے کہ دنیا تا قیامت اللہ والوں سے خالی نہیں ہو سکتی اور سارے پھول ایک رنگ کے اور تمامی پھل ایک مزہ اور ذائقہ کے نہیں ہوتے۔ ایک مرتبہ موسم بہار میں مجھے حضرت مدوح کے ساتھ ایک باغ میں جانے کا اتفاق ہوا جس میں رنگ برنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ حضرت نے فرمایا جس کو اولیاء اللہ کے حالات کا اختلاف اور ان کے مقامات کا تباہن دیکھنا ہو تو وہ ان گونا گوں اور قسم قسم کے پھولوں کو دیکھے کہ سب ہی جاذب اور دونوں کے لئے خوش کن و فرحت بخش ہیں۔ مگر رنگ سب کا الگ الگ اور خوشبو سب کی جدا جدا ہے۔ پس کسی ولی پر زہد کا غلبہ ہے کسی پر غوث و شیعہ کا کوئی کثرت صلوٰۃ سے مانوس ہے کوئی کثرت صوم سے کسی پر توکل غالب ہے کسی پر کسب حلال کسی پر رجا و سکون طاری ہے کسی پر گریہ و اضطراب کوئی درس و تدریس میں فنا ہے کوئی وعظ و تبلیغ یا تالیف و تصنیف میں غرض کوئی خاص ضابطہ نہیں۔ جس کے سب مقتدر ہوں۔ اصل شے ہونی چاہیے یعنی تعلق مع اللہ اور اتباع رسولؐ، استحضار سرطوت ربوبیت و استقرار عظمت رسالت ہر عمل میں اخلاص ہو اور جو بھی حرکت و سکون ہو وہ لوجہ اللہ الکریم ہو۔ خواہ کسی رنگ اور کسی شغل میں کیوں نہ ہو۔ پادشاہ اپنے تخت پر ولایت پاسکتا ہے اور تاجر اپنی دکان پر کاشت کار اپنے کھیت میں ولی بن سکتا ہے اور نوکر اپنی خدمتگاری و درباری میں، پس اس شخص کا یہ کہنا کہ اپنے پیرو کو دیکھ کر کوئی دوسرا نظر ہی میں نہیں آتا ہے گویا اللہ کی رحمت متناہیہ کو صرف ایک فرد میں حصہ کر دینا ہے۔

جیسا کہ ایک اعرابی نے دعا مانگی تھی اللھم ارحم منی وارحم محمدؐ واولادہم معنا اعدا یا اہی مجھ پر رحم فرما اور محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم پر رحم فرما باقی ہمارے ساتھ اور کسی پر رحم نہ فرما۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اے شخص تو نے بڑی وسیع شے کو بہت ہی تنگ کر دیا نیز حضرت مدوح نے فرمایا کہ ولی کا ظاہر کا نہ ہو دیکھنا چاہیے کہ صورتیانہ طرز ہے یا امیرانہ اور امیر جاگیر دار ہے یا بوسیدہ حال اور نادار، اس ترازو میں وزن کرنے والا دنیا و آخرت دونوں کا خزانہ پاتا ہے۔ اس لئے کہ ولی کے باطن میں اور رحمت خدا و رسول کے عجائب و غرائب سمیرے ہوتے ہیں اس کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے گڈری میں چھپا ہوا لعل اور کیمل کی چادر جس کے اندر ریشم بھرا ہوا ہے جس کا ظہور آخرت ہی میں ہوگا۔ اور جو ولی نہیں ہوتا ویکہ منکار اور اپنے کو بیربنگے ہوتا ہے، اس کی حالت برعکس ہوتی ہے کہ ریشم کے کپڑے میں کیمل لپٹا ہوا ہے۔ حضرت مدوح نے فرمایا ایک ولی صدیق کا ایک سچا مرید تھا۔ اس کو اپنے شیخ سے بہت محبت تھی اور جب حق تعالیٰ نے اس کو شیخ کے اسرار و ولایت پر مطلع فرمایا تب تو اس کی محبت حد سے بڑھ گئی اور قریب تھا کہ شیخ کو مقام نبوت سے بھی آگے بڑھادے پس حق تعالیٰ نے مرید پر لطف و کرم کا غرض من سے شیخ پر معصیت لانا کا صدور فرمایا کہ مرید نے جب یہ دیکھا تو غلو و عقیدت سے باز آگیا اور شیخ کو ان کے مرتبہ ریشم و تخت پر، لا امارا۔



کہ ولی غیر معصوم ہیں بنی نہیں، اس وقت حق تعالیٰ نے مرید کو فتح نصیب فرمادی یہ بھی صلاح ہی کا اثر تھا کہ اس کو ضعف اور نقص سمجھا دینا اس زمانہ میں تو عجب نہیں اس کو کمال سمجھ کر عقیدت میں اور ترقی ہوئی، حضرت مدوح نے فرمایا یہ بھی ایک راز ہے منجملہ ان اسرار کے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر ایسے ظاہر ہونے والے معاملات میں مضمحل تھا جیسے کھجور کی تابیر کے متعلق آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ اگر تابیر نہ کرو تو کیا حرج ہے چنانچہ صحابہ نے تابیر سے ہاتھ کھینچ لیا تو اس سال درختوں میں کھجور ناقص آئی۔ یا مثلاً آپ نے فرمایا میں نے خواب دیکھا ہے کہ ہم سب مسجد الحرام میں باطمینان داخل ہوئے اور عمرہ پورا کر کے، کوئی سر منڈوا رہا ہے کوئی بال کتر وار رہا ہے۔ چنانچہ آپ معہ صحابہ کے بسوئے مکہ مکرمہ روانہ ہو گئے مگر حدیبیہ پر کفار مکہ نے روک دیا اور اس سال آپ عمرہ پورا نہ فرما سکے، آئندہ سال اس عمرہ کی قضا فرمائی۔ ایسے امور کا ظہور آپ پر حق تعالیٰ نے اسی مصلحت سے فرمایا کہ حضرات صحابہ آپ میں رحمت علیہ السلام کی طرح الوہیت کا اعتقاد نہ کر لیں خصوصاً جبکہ آپ کی محبوبیت کے سبب دیکھتے تھے کہ آپ کی ہر خواہش و تمنا عموماً پوری ہوتی ہے، اور اسی بنا پر ارشاد فرمایا اِنَّكَ لَا تَخْضِي مَنْ اَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَخْضِي مَنْ يَشَاءُ۔

اے محمد تم جس کو محبوب سمجھو اُسے ہدایت نہیں دے سکتے۔ بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے یا مثلاً فرمایا كَيْسَ لَكَ مِنَ الْاُمْرِ شَيْءٌ تمہیں اس معاملہ میں کوئی اختیار نہیں۔ ان امور سے مقصود صحابہ کو اللہ کے استانہ پر لا جمع کرنا تھا کیونکہ محبوبیت کی وجہ سے آپ کی امت مرحومہ کی تکمیل و تربیت حق تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی تھی اس لئے گوارا فرمایا کہ عیسائیوں کی طرح بنی نکر رک جائیں اور بنی کا جو کارنامہ ہے کہ مخلوق کو سمیٹ سمیٹ کر استانہ خدا پر لا اکٹھا کرے اس میں کسی قسم کی کمی آجائے جب ان امور مذکورہ سے عشاق محمدی نے سمجھ لیا کہ آپ محبوب خدا ہیں خدا نہیں تو مقصود رسالت حاصل۔ اور حضرات صحابہ کمال عبادت اور قرب حق سے واصل ہو گئے،

نیز آپ نے فرمایا کہ ولی کے پاس آنے والے لوگ چار قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جن کا ظاہر اور باطن دونوں اعتقاد میں برابر ہوتے ہیں۔ یہ تو نہایت خوش نصیب اور بامراد لوگ ہیں دوسری قسم جن کا ظاہر و باطن دونوں اعتقاد میں برابر ہوتے ہیں یہ تو نہایت خوش نصیب اور بامراد لوگ ہیں کہ دل بھی ان کا ہر وقت جانچ اور پرکھ میں لگا رہتا ہے اور زبان بھی اسی میں مشغول اور یہ سب میں زیادہ بد نصیب و محروم قسم ہے تیسری قسم وہ جس کا بیرون معتقد ہے مگر اندرون انکا منتقد اور یہ ولی کے لئے بڑی حضرت رسالت قسم ہے جیسے بنی کے لئے منافق کہ ان کی ظاہری عقیدت سے پرہیزی الگ دھوکا کھاتے ہیں اشد شیخ صاحب بصیرت (کو یہ صنیق و کلفت جدا رہتی ہے کہ) اس کی ظاہری عقیدت پر نظر کر کے کچھ نفع پہنچانا چاہتا ہے تو اس کی باطنی حالت اس کو روکتی رادار منع کرتی ہے



کہ یہ اس کا اہل نہیں ہے۔ اور اگر اس کے باطن پر نظر ڈالتا اور اس سے دور رہنا چاہتا ہے تو اس کا ظاہر طبع اور توقع دلاتا ہے کہ شاید یہ اثر اندرون میں اتر جائے اور اصلاح ہو جائے، اس نوع کی مثال شیخ کے نزدیک ایسی ہوتی ہے جیسے ایک شخص کے پیٹ میں دوسرا شخص بیٹھ جائے اور دونوں اس کے سامنے آویں اور پر کا آدمی کہے ہاں حضرت میں آپ کا غلام و تابع فرمان ہوں اور ہر امر و نہی کی تعمیل کے لئے حاضر ہوں۔ اور اندر بیٹھا ہوا شخص کہے کہ تم زلی نہیں ہو اور جن لوگوں نے تم کو شیخ اور ولی سمجھ رکھا ہے سب غلطی پر ہیں۔ مجھے تمہارے متعلق بھی شک ہے اور تمہارے معتقدین کے بارہ میں بھی شک ہے۔ پس ناواقف جسے اندرون کا پتہ نہیں وہ تو پہلی قسم (مخلصین) کو اور اس تیسری قسم (منافقین) کو یکساں سمجھے گا کہ ظاہر دونوں کا اظہار محبت و عقیدت کر رہا ہے، مگر عارف کے پاس جب پہلی قسم والا (مخلص) بیٹھے گا تو پھر پورے نفع اٹھائے گا لیکن جب دوسری قسم والا منافق، بیٹھ گا تو باوجودیکہ پیر کا ادب و احترام اور امر و نہی کا امتثال پہلی ہی قسم کے مثل کر رہا ہے مگر کوئی نفع نہ اٹھائے گا اور اس محرومیت پر بھی اپنے باطنی جست پر تنبہ نہ ہوگا بلکہ، اپنے دل میں بھی کہے گا کہ نفع نہ ہونے کا سبب اس ولی کی کمزوری اور عیب و خلل ہے اور یہ ایک بڑا سبب ہوتا ہے مشائخ پر اعتراض و گرفت کا اور ان کے بارہ میں (دوسروں کو بھی) طرح طرح کے وساوس و شبہات پیدا ہونے کا اور چوتھی قسم وہ ہے جن کا باطن معتقد ہوتا ہے مگر ظاہر انتقاد میں لگا رہتا ہے اور اس کا سبب محض حسد ہو کر تا کہ دل کھلتا ہے مجھے یہ مسند کیوں نہ ملی اور شیخ میں ایسی کون سی خوبی ہے جو مجھ میں نہیں اس لئے زبان اس لئے زبان اس جہن کے پھپھوے پھوڑنے لگتی ہے،

ایک دن میں نے عرض کیا کہ حضرت یہ معارف و علوم جو آپ کی زبان مبارک سے نکلتے ہیں اس میں آپ کو قصد و ارادہ سے کام لینا پڑتا ہے یا بے اختیار از خود آئینے لگتے ہیں؟ فرمایا ولی کامل ہر وقت مشاہدہ حق میں غائب و محو ہوتا ہے ایک لمحہ بھی محجوب نہیں ہوتا ہاں اس کا ظاہر اور جسم (مخلوق کے ساتھ ہوتا ہے اور اس سے حق تعالیٰ کام لیتا ہے کہ اس کے پاس آنے والے اپنے اپنے مقصود کے موافق اس سے نفع اٹھاتے رہتے ہیں جس کی قیمت میں خیر و نلاح نکھی ہے حق تعالیٰ ولی کے ظاہر کو اس پر آنا داتا کو علوم کا ناطق بنا دیتا ہے کہ منبسط ہو کر اس کی زبان سے علوم لدنیہ نکلنے اور برسنے لگتے ہیں، اور جس کی قیمت میں اس کے ہاتھوں کچھ ملنا نہیں کھاتا تو اس پر ولی کو روک لیتا اور معارف والی زبان کو بند کر دیتا ہے کہ شیخ کے دل میں انقباض آتا اور زبان علمی بات نکالنے سے رک جتی ہے، دلی کی مثال بنی اسرائیل کے پتھر کی سی ہے کہ جب وہ اولیاء اللہ (یعنی سیدنا موسیٰ کے صحابہ) کے سامنے آیا تو اس سے (ایک دو نہیں بلکہ خاندان بائبل) بنی اسرائیل کی شمار کے موافق بارہ چٹے جاری ہو گئے۔ اور جب اعدائے قوم فرعون کے



سامنے تھا تو ایک قطرہ بھی اس سے کبھی نہ ٹپکا۔

جامع کتاب کہتے ہیں واقعی ہم نے بارہا تجربہ کیا جب کبھی کوئی غیر معتقد (معترض) شخص مدوح کے پاس آکر بیٹھا تو مفید و عارفانہ بات ایک بھی آپکی زبان سے نہ نکلتی۔ بلکہ جب تک وہ اٹھ کر چلا جاتا آپ کو علمی بات کرنے پر قدرت ہی نہ رہتی تھی اور ہمیں نصیحت بھی فرمایا کرتے تھے کہ ایسا کوئی شخص آکر بیٹھا کرے تو جب تک وہ اٹھ کر رخصت نہ ہو جائے مجھ سے کوئی بات نہ پوچھا کرو۔ اس سے قبل چونکہ ہمیں اس راز کی خبر نہ تھی اس لئے ہم اس خیال سے ادھر بھی پوچھا کرتے تھے کہ اچھا ہے اسرار و معارف اس معترض کے کان میں پڑیں تو عجب نہیں توبہ کر لے مگر ہم دیکھتے تھے کہ اس کی موجودگی میں سوال کرنے سے حضرت ایسے بن جاتے تھے گویا آپ ہیں ہی نہیں کوئی دوسرا شخص ہے جو نہ ہم سے واقف ہے اور نہ ہم اس سے واقف ہیں حتیٰ کہ جب آپ نے اس کا سبب ظاہر فرمایا تب ہم کو حقیقت راز پر آگاہی ہوئی۔

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ دلی پر کبھی شہود کا غلبہ ہوتا ہے تو اس کو لہنی ذات کے متعلق اندیشہ ہوتا ہے کہ ہلاک اور پارہ پارہ نہ ہو جائے۔ اس لئے اس کو ضرورت ہوتی ہے ایسے کام کرتے کی جن سے وہ اپنے حس و شعور کی طرف لوٹ آوے اگرچہ وہ کام صورت عیب و نقص ہی کیوں نہ ہوں۔ اور یہ اس قاعدہ کے موافق ہے کہ جب کسی کو ضرر پیش آوے تو جو ان میں ہلکا ہو اسے اختیار کر لے پس جب کوئی شخص ولی کو اس (عیب کے) کام کا مرتکب دیکھتا ہے اور وجہ جس کی بنا پر مرتکب ہوا ہے اسے معلوم ہوتی نہیں تو بہت جلد اعتراض کر بیٹھتا ہے اور اس لئے شیخ کی برکات سے محروم رہ جاتا ہے حالانکہ شریعت مطہرہ کا تاقان ہے کہ کسی عضو کو مرضی آکلہ لاحق ہو جائے رکہ گوشت کو کھاتا ہو یا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور ذات کے ہلاک ہونیکا خطرہ ہو تو اس عضو کو کاٹ دینا چاہیے حالانکہ عضو انسانی معصوم ہے مگر ذات انسانی کی حفاظت کے لئے اس کا قطع کر دینا حقیقت عیب و ظلم نہ ہو بلکہ مباح قرار پایا۔ اسی طرح بھوک کی شدت اگر احتیاط کی حد کو پہنچ جائے اور ہلاکت کا اندیشہ ہو تو مردار کا کھانا (حالانکہ عیب اور معصیت ہے مگر مباح) حلال ہے ایسے مسائل جو اس قاعدہ کے تحت میں آئیں گے شریعت میں بہت نکلیں گے اس قیاس سے بعض دفعہ ولی پر صورت معصیت کا ارتکاب ہوتا ہے کہ یہ اخف ہے اور ہلاکت ذات اشد ہے اور خطرہ جان کی وجہ سے اس کو اختیار کیا گیا ہے چنانچہ سماع وغیرہ امور منہیہ کے بعض اٹکے عارفین سے مرتکب ہونے کی یہی وجہ منقول بھی ہوئی ہے اور یہ امور جو ذات ولی کو اس کے حس کی طرف واپس لے آتے ہیں وہی ہیں جن کی اس کو فتح نصیب ہونے سے قبل عادت پڑی ہوئی تھی اور ظاہر ہے کہ عادت کو بدن میں بڑا دخل ہوتا ہے نیز آپ نے فرمایا کہ غیر دلی اگر اپنی شرمگاہ کو کھولتا ہے تو فرشتے اس سے بھاگتے ہیں کیونکہ ملائکہ میں حیا کا



غلیہ ہے، یہی حال ہر لیا ت اور بیہودہ الفاظ زبان سے نکالنے کا ہے کہ وہ معنوی شرکاء ہے مگر وہی جب اپنا کشف عورت کرے یا زبان سے ہر لیا ت نکالے تو ملائکہ نفرت نہیں کھاتے اس لئے کہ وہ جب اس کا ارتکاب کرتا ہے تو اس سے بہتر و افضل مصلحت کی وجہ سے کرتا ہے اور اقویٰ مصلحت کا ارتکاب ہے جبکہ لہذا اسکو کشف عورت پر بھی ستر عورت ہی کا اجر ملتا ہے کیونکہ اس نے واجب پر عمل کیا ہے اگر وہ اقویٰ مصلحت ہوتی تو کبھی ستر نہ کھوتی میں نے پوچھا کہ وہ اقویٰ مصلحت کیا ہے جس کی بنا پر اس نے ستر عورت کو چھوڑ دیا یا کوئی ناشائستہ لفظ زبان سے نکالا ہے؟ فرمایا ہر وہ چیز جو ذات کو اس کے حسی عالم کی طرف لائے اور اس پر اس کے ہوش و حواس کو واپس کرے وہ اقویٰ ہے کہ تحفظ ذات واجب ہے اور یہ اس کا سبب ہوتا ہے پس اگر کشف عورت اس کو واپس لانا کا موجب ہوگا تو یہ اس کا ارتکاب کرے گا مثلاً بیوی سے مجامعت میں مشغول ہوگا، ادا اگر بیخیالی کے الفاظ اس کا سبب ہوں گے تو ان کا مرتکب ہوگا مثلاً بیوی سے ملائیت اور ایسے الفاظ کا تکلم کرے گا جن کا مجمع میں زبان سے نکالنا بے شرمی ہے ادا اگر کوئی اور دنیا کا کام مثلاً نہنسا، بولنا لذتہ غذا کھانا وغیرہ، اس کا سبب بنے گا تو اس کا ارتکاب کرے گا اور سب پر باوجودیکہ دنی کام میں مگر امتثال واجب کا اجر پائے گا، میں نے عرض کیا ذات کو ایسی چیز کی حاجت کیوں ہوتی، جو اسکو حس و شعور کی طرف واپس لائے اور کیا ذات اپنے حس و شعور سے غائب بھی ہو جاتی ہے؟ فرمایا ہاں غائب ہو جاتی ہے اور اس کی مثال ایسی سمجھو کہ ایک شخص کے پاس چھ لاکھ روپیہ ہو اور بڑھا بھی ہو گیا ہو اور اندھا بھی ہو گیا ہو کہ کسی کام کا ج کے قابل یا نکل نہ رہا ہو طرہ براں اس کے بکثرت بچے بھی ہوں اور سب چھوٹے چھوٹے ہوں کہ ابھی کسی کام کرنے کے قابل ایک بھی نہیں ہوتا پھر اس شخص نے یہ سارا روپیہ بغرض تجارت چند لوگوں کے حوالہ کر دیا ہو جو ایسے وقت جہاز میں سوار ہو کر روانہ ہوئے کہ سمندر میں سخت طوفان و تلاطم ہو رہا ہو اور جہاز کی تباہی اور اسباب و ساریوں کی ہلاکت و فساد کا قوی خطرہ اور غالب گمان ہو نیز اس نے اپنے لئے یا اپنے بچوں کے لئے ایک پیسہ بھی نہ رکھا ہو۔ اب تباہ اس شخص کی عقل اور ہوش و حواس کا کیا حال ہوگا اس کی عقل و ہوش پس اہل جہاز کے ساتھ ساتھ ہوگی اور ذات سے بالکل منقطع ہو جائے گی (کہ بات بھی کریگا تو دیوانوں اور باگلوں کی طرح)، ادا اب اسکو دو مصیبتیں پیش آئیں گی ایک یہ کہ اس کی آن رگوں کے منہ بند ہو جائیں گے جن سے جسم کو غذا پہنچا کرتی ہے کیونکہ جہاز کے بارہ میں تکر کے منہمک ہو جانے کے وقت حرارت میں ہیجان اور اشتعال پیدا ہوگا۔ اور رگوں کو جلاد یگا چنانچہ میں نے ایک حافظ قرآن عالم کو دیکھا کہ اس کی عقل میں فتور آگیا اور بالکل بن گیا تھا۔ اسکو کیمیا کی دھت ہو گئی تھی ادمہ وقت اسی فکر اور اسی تدبیر اور خزانے جمع کرنے میں منہمک رہا تھا آخر اس کا رنگ زرد پڑ گیا آدمیوں کے پاس بیٹھا اٹھنا بہت کم ہو گیا خراک بہت ہی قلیل رہ گئی تھی پھر دن بدن یہ اس کی بڑھتی ہی رہی حتیٰ کہ چند ہی روز بعد مر گیا۔ اس کی حقیقت یہی تھی کہ جسمانی غذا کی عروق کے منہ بند ہو کر



جسم کو نقصان پہنچے۔ لگا، بدن کی تازگی زائل ہو گئی اور زردی و لاغری بڑھتی چلی گئی جو اسکی جان ہی بے کر گئی  
 نَبَاً لِلّٰهِ وَآخَا الْکَیۡدِ رَاجِعُوۡنَ ۝ دوسری مصیبت یہ پیش آئیگی کہ عقل جب اہل جہاز کے ساتھ چلی جائے گی اور  
 ذات سے جدا ہو جائے گی اور اس پر طویل مدت گزرے گی تو روح جسم ذات سے نکل جائے گی اور پھر کبھی واپس  
 نہ ہوگی کیونکہ شروع ہی میں ذات کے اندر اس کا داخلہ جبراً و قہراً ہوا تھا۔ طوعاً و رغبتاً نہیں ہوا تھا پس جب اسکو  
 نکلنے کے لئے کوئی راستہ ملا اور وہ نکلی تو پھر واپس ہرگز نہ آئے گی پس اگر حق تعالیٰ نے اس کی موت کا یہی وقت  
 مقدر فرمایا تھا تب تو یہ صورت اس کے مرض کی ابتداء اور یہ عوارض اس کے لئے اسباب موت بن کر اسکو ختم ہی کر دیں گے۔ اگر  
 حق تعالیٰ سبب کا وعدہ ابھی کچھ دنوں اسکو دنیا میں رکھنے کے متعلق ہے تو روح کا نکلا بذریعہ عقل نکل جانے کے ہوگا کہ عقل ہی اسکی  
 اصل تھی اور اسی کے ہاتھ میں اس کی تدبیر و نظم تھا۔ پس جب عقل نکل گئی گویا روح نکل گئی اور اسی لئے پاگل کی زندگی اہل دنیا  
 کے نزدیک بھی موت کے برابر ہے بلکہ بدتر۔ اللہ بھی وہ مردوں کے حکم میں ہے کہ نہ شرع کا مکلف ہے نہ اس کے  
 اقوال و افعال پر مواخذہ) پس اگر اس شخص کو کوئی سبب ایسا ہاتھ آ جائے جو اس کو پہلی حالت پر واپس لائے  
 اور اہل جہاز کو اس کی عقل اذکر سے باہر نکال دے تو بیشک ان دنوں مصیبتوں سے بچ جائے گا یہی حالت  
 اولیاء اللہ کی ہے کہ ان کو مشاہدہ حق میں غیبیوت و محویت حاصل ہوتی ہے پس جب تم ان کو دیکھو کہ  
 کلمات و اہمہ یا منہی مذاق وغیرہ ایسے امور کے حامل ہو رہے ہیں جو ان کی عقول کو ان پر واپس لارہے اور ان کی  
 بقا و ذات کو محفوظ کر رہے تو ان پر اعتراض میں عجلت نہ کیا کرو کیونکہ یہ افعال ایک غرض صحیح کے لئے کر رہے ہیں تاکہ  
 جب تک ذات باقی رہے مخلوق ان سے نفع ہوتی ہے۔

یار ما ایسا ہوا کہ حضرت نے ہم سے فرمایا میاں خوش طبعی دل لگی کی باتیں کرو کہ اس سے تم پر خیر کثیر ظاہر ہوگا  
 حتیٰ کہ ایک مرتبہ فرمایا صاحب مشاہدہ کی مثال ایسی ہے جیسے گرس ہوا میں اڑ رہا اور بہت اونچا چڑھ گیا ہو۔ اور  
 حالت یہ ہو کہ ہوا بہت تند آمد اندھی چل رہی ہو اور ایک شخص کے ہاتھ میں پتلی سی ڈور ہو جس میں گرس  
 بندھا ہوا ہو جب یہ شخص دیکھے کہ وہ بہت اونچا چڑھ گیا اور ہوائیں چاہتی ہیں کہ اس کو اتنا اوپر چلیں  
 کہ اب وہ زمین پر کبھی نہ جا سکے تو وہ یہ شخص اس اندیشہ سے کہ ٹوٹ نہ جائے ڈور کو آہستہ آہستہ کھینچنے لگے  
 اور گرس آہستہ آہستہ نیچے اترتا چلا آئے حتیٰ کہ اپنے مالک کے ہاتھ پر آ بیٹھے پس یہی حال ان دنیوی  
 امور فانیہ کا ہے کہ ذات ترابی ان کی عادی و خوگر ہے اور وہ ذات کو اس کے عالم حسّی کی طرف لاتے ہیں  
 نیز آپ نے فرمایا کہ ولی رکے ہاتھ پر بیعت ہونے سے غرض اللہ کی طرف رہیری، ماسوائے اللہ سے بے نیاز ہونا  
 اور اللہ کے آستانہ پر لا ڈالنا ہے پس اگر ولی کے پاس آنے والا اس سے یہ بات طلب کرے تب تو نفع  
 پائے گا۔ اور اگر اس سے قضاء حاجات کا طالب ہو اور رب کی بابت کوئی بات دریافت ہی نہ کرے



تو دلی کو اس سے ناراضی و بغض ہو جائے گا اور رفع تو کیا، اگر کسی مصیبت میں مبتلا ہوتے ہی سے بچ جائے تو بڑی بات ہے۔ اور اس کی کسی وجہ ہیں اول یہ کہ دلی کے ساتھ اس کی محبت لوحہ اللہ نہ ہوئی (خود غرضی و مطلب برابری کی اور اوپری ہوئی اور اوپری محبت کھلا خسارہ ہے کہ اس پر نور حق کا نزل ہرگز نہیں ہوتا دوم یہ کہ دلی اسکو غیر اللہ کے ساتھ تعلق کی بنا پر منقطع عن اللہ دیکھ کر چاہتا ہے کہ باہر نکالے اور اللہ کے ساتھ متعلق کرے) اور یہ چاہتا ہے کہ رپر کو بھی آلہ حصول دنیا بنا کر، اس بے تعلق کو بڑھائے دلی اسکو دیکھ رہا ہے کہ اس نے انا کو چھوڑا اور انکا کو تھا تا کہ معرفت الہیہ اور اس کے ساتھ آستانہ پر پڑنا گویا انا تھا جسے اس نے ترک کر دیا اور اللہ ہی سے توڑنا اور غیر اللہ سے جوڑنا اور دنیا کی طرف تھیک جانا اور مصنوعی آرائش سے دل لگانا گویا انکار ہے جسکو اس نے اختیار کیا لہذا یہ ضدیت سبب بغض و دلی بن جائیگی سوم یہ کہ دلی اگر اسکی کسی حاجت برابری میں موافقت کرے گا اور اسکی دعا سے اسکی دینیوی مراد برائیگی یا کسی کشف وغیرہ کا ظہور ہوگا تو بہت ممکن ہے کہ مرید کو خیال ہو کہ اسی کا نام معرفت و ولایت ہے اور اسکی رگوں کو رغبت ہو اترتی ہے اور اس کے سوا دلی سے اور کوئی مطلب و غرض ہی نہیں ہے اور یہ سب باتیں کھلی گمراہی اور دلی کی ناراضی و غصہ کا سبب ہیں (جن پر اللہ کی طرف سے کوئی یلہ اور مصیبت نازل ہو جاتا ہے عید نہیں)

نیز آپ نے فرمایا کہ عشقہ مضامین کا، اسنشا اہل عرفان کے لئے بمنزلہ کشتی کے ہے جس کے ذریعہ وہ شاہدہ کا سمد عبور کرتے اور وہ عجائبات دیکھتے ہیں جن کی کیفیت بھی ناقابل بیان ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جس کا شاہدہ مطلق ہے یعنی اللہ سبحانہ وہ حقیقتیم ہے جس کی نہ کوئی نظر ہے نہ کوئی مثل۔ اس لئے طالب کفایت تراپی کے لئے بحر حادث الفاظ اور سیمیان والی عبارت کے اور ہے کیا جس کا سہارا پکڑے کہ ذات تراپی اسی کی عادی ہے اور اسی پر پیدا کی گئی ہے (جیسے بلاشبہ جس معشوق تک رسائی اور اس کا نظارہ ناممکن ہو اس کا عاشق و الہامۃ الفاظ اور جوش و خروش کی آہ و بکا والے اشعار ہی سے آتش عشق کو ٹھنڈا کیا کرتا ہے) اور جب شاہدہ وسیع ہو جاتا اور کبار اولیاء میں سے بن جاتا ہے تو اس کا عشق صورتہ قریب قریب مجازی عشق اور رفقاء و محبوبوں جیسے اہل ہزل عشاق کی طرح ہو جاتا ہے کیونکہ وہ مخلوقات میں حق تعالیٰ کے فعل کا شاہدہ کرتا ہے تو روح کو ایک عجیب سرور اور بے کیف طرب حاصل ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک ایسے ہی اہل وجد حال ولی نے ایک تلی کو دیکھا کہ اپنے بچہ سے اپنی گردن کھجاری ہے تو گریہ طاری ہو گیا اور آنسو بہنے لگے اور بلی کے سامنے سجدہ پر پر سجدہ شروع کر دیا اور اتنا دیا کہ سامنے کی سب زمین بھیگ گئی۔ میں نے عرض کیا کہ اسکی حقیقت کیا تھی؟ فرمایا روح نے دیکھا کہ حق تعالیٰ اس حرکت کا ناعمل ہے اس لئے روح نے اس کے سامنے جھکنا اور رونا اور سجدہ کرنا شروع کر دیا اور ذات چونکہ روح کی موافقت کیا کرتی ہے اس لئے جسم بھی اسکی نقل اتارنے اور وہی کام کرنے لگا جو



روح کر رہی تھی۔ مگر لوگوں پر ظاہر ہو رہا تھا کہ بلی کو سجدہ کر رہا ہے۔ حالانکہ ولی نے اپنے رستے اور سجدہ کرنے کے وقت بجز اللہ سبحانہ کے کسی کو دیکھا ہی نہیں اس لئے وہ اسی کے سامنے جھک رہا اور زار زار رو رہا تھا نیز فرمایا کہ یہ کیفیت اولیاء کو حاصل تو ہر وقت رہتی ہے مگر اتنا فرق ہے کہ فات جب اپنی عقل سے غائب (اور محروم) رہے ہوتی طاری ہو جاتی ہے تب تو وہ روح کی موافقت کرنے لگتی ہے لیکن جب غائب نہیں ہوتا اور عقل اپنے مکان قائم رہتی ہے تو عقل اس کو اس سے روکتی ہے تاکہ ظاہر محفوظ رہے تم دیکھو گے کہ ولی دفت کی ہتھیاں جھومتی ہوئی دیکھ کر جھومنے لگے گا اور اس پر وحید طاری ہو جائے گا چنانچہ انکا قول ہے کہ اگر مولیٰ پتھر مارے تو مجھے شکر سے زیادہ شیریں اور پیارے ہیں اس لئے کہ ان کو اللہ کی طرف سے جو بھی فعل ہو اس کے مشاہدہ میں لذت و سرور آتا ہے۔ نشوونما نصیب دشمن کہ شور ہلاک تیغ و سردستان سلامت کہ تو خیر آزمائی تیرا آپ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ جب کسی بندہ کو فتح نصیب فرماتا ہے تو اس وقت جس حالت پر بھی وہ ہوتا ہے اسی پر قائم رہتا ہے اگرچہ وہ طبعاً مذموم ہو مثلاً قصاب یا حجام یا حلاق وغیرہ کا کوئی بھی پیشہ کیوں نہ ہو اس سے منتقل نہیں ہوتا کیونکہ وہ انتقال و تبدیل حال کو تصنع اور بناوٹ سمجھتا ہے اور صاحب فتح کے نزدیک تصنع و بناوٹ شراب نوشی وغیرہ کیا سرگنا ہوں سے بھی زیادہ ہے۔ چنانچہ میں ایک صاحب سے واقف ہوں جو ملک شام کے شہر رملہ میں رہتے ہیں جس وقت ان کو فتح نصیب ہوئی تو وہ ایسی حالت میں تھے کہ لوگ ان کا محول اڑاتے اور ان پر ہنسا کرتے تھے بالکل یہ حالت تھی جو ہمارے شہر ناس میں اُس شخص کی ہے جسے معینہ کہتے ہیں چنانچہ فتح کے بعد بھی وہ اُسی حالت پر رہے اور انہوں نے اپنی حالت کو بدلا نہیں، معینہ کی حالت یہ تھی کہ بچے اور کم عقل بڑے آدمی بھی تمام دن اس کے پیچھے پڑے رہتے اور اس پر ہنستے اور اس کا محول اڑتے رہتے تھے۔ نیز حضرت نے فرمایا ایک اور شخص سے میں واقف ہوں کہ حق تعالیٰ نے ان کو فتح نصیب فرمائی اس سے قبل وہ تیار ہوتا کرتے تھے اور اب بھی اسی حال میں ہیں اسکو چھوڑا نہیں واللہ اعلم۔

### چھٹا باب (شیخ تربیت، تلمیذ ذکر کا نفع، اسماء حسنی، اور حلقہ درویشانہ)

امام طریقت حضرت ابوالعباس احمد بن محمد قرشی صدیقی قدس سرہ کا تفسیر کردہ ایک قصیدہ ہے جس میں مرید شیخ کے اوصاف اور مریدین کے آداب کہ شیخ کے ساتھ کیا برتاؤ رکھنا چاہیے مذکور ہیں چونکہ حضرت ممدوح نے ان اشعار کی شرح بھی اکثر بیان فرمائی اور عموماً اہل طریقت نے اس کو پسند فرمایا اور اپنے مریدین کو نصیحت فرمائی کہ اس کو حفظ کریں اور اس پر عمل کا خاص خیال رکھیں اس لئے ہم ادل اسکو بیان کرتے ہیں کہ اس کی شرح حضرت ممدوح ہما کے ارشادات میں داخل ہے امام ابوالعباس علیہ السلام میں موضع سلام میں پیدا ہوئے مراکش میں نشوونما پایا۔ علاقہ مصر کے شہر فیوم کو وطن بنایا۔ اور ماہ ربیع الاول ۳۸۴ھ میں بعمر ۶۰ سال وہیں



وفات پائی آپ کا لقب تاج الدین تھا۔ نحو و ادب علم فقہ و علم کلام وغیرہ تمامی علوم میں بحرِ خارتھے اور علم تصوف میں دریائے ناپیداکنار۔ ابتدائی فنون و علوم آپ نے مراکش میں پڑھے اور پھر طلب علم میں سفر کرتے ہوئے شہرِ فاس میں آکر امام الاصول مولانا ابو عبد اللہ محمد بن علی، امام النخو ابو ذر مصعب بن محمد ششتی، اور شیخ ابو العباس ابن ابی العباس بن الفحال رحمہم اللہ سے علوم کا استفادہ فرمایا پھر اندلس تشریف لے گئے اور وہاں کے علماء سے مستفید ہوئے اس کے بعد حجاز تشریف لائے اندج و زیارت سے فارغ ہو کر بغداد گئے وہاں قطب الصدیقین حضرت محبوب سبحانی شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہ کے صاحبزادہ مولانا محمد عبد الرزاق امام التاریخ مولانا ابو الحسن محمد بن احمد طبعی اور مولانا ابو محمد تمیمی بن فیروز حبلی رحمۃ اللہ علیہم سے اکتسابِ علوم فرمایا علم کلام امام تقی الدین ابو العز منظر بن عبد اللہ شافعی سے اور اصول فقہ اسکندریہ شمس الدین ابو الحسن علی بن اسمعیل مالکی سے اور تصوف قدوة الزمان شیخ الشیوخ سلطان طریقت امام شہاب الدین سہروردی قدس سرہ سے اخذ فرمایا جن کی تصانیف میں عوارف المعارف مشہور کتاب ہے اور اس قصیدہ کا اصل ماخذ بھی وہی ہے حضرت ابو العباس نے اپنے اثناء سلوک میں یہ قصیدہ تصنیف فرمایا اور خود ہی اس کا نام انوار السرائر و سرائر الافوار رکھا تھا۔

حضرت شیخ ابو عبد اللہ محمد بن میری سے منقول ہے کہ وہ اپنے مریدین قتلاندہ کو خاص طور پر اس کی ترغیب دیتے اور خواص اصحاب کو تاکید فرمایا کرتے تھے کہ اسکو اکثر پڑھا کریں کیونکہ نہایت مختصر ہے اور اس کے مضامین کو مستحضر رکھیں کہ نہایت جالب خبر ہے اور قصیدہ یہ ہے

اَوَّلُ شَيْخٍ اَبَاتٍ اِذَا لَمْ يَكُنْ لَهُ | اَفْتَا هُوَ اَلْفِي رِيَا فِي اَلْهَوَىٰ لَيْسِي

ترجمہ شیخ کی علامتیں واضح ہیں راہل فہم پر پوشیدہ نہیں، اگر اس میں وہ علامتیں موجود نہ ہوں تو دوسرے کی اصلاح کیا کرے گا، خود ہی خواہشات نفس کی راتوں اند تاریکیوں، میں چل رہا ہے حضرت مدوح نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ ہر باطنی شے کا پتہ اس کی علامتوں سے چلا کرتا ہے جب کسی کے چہرہ پر زردی اور بدن میں لرزہ پائیں گے تو معلوم کریں گے کہ اس کے دل میں خوت اور دہشت ہے، اسی طرح مرید کی تربیت و اصلاح کے اہل ہونے کی علامتیں ہیں جو بالکل واضح ہیں اور یہ ہیں کہ مخلوق کی طرف سے سلیم الصدور ہو یعنی امت محمدیہ میں کسی شخص کی عداوت اس کے دل میں نہ ہو سخی ہو کہ کوئی چیز مانگو تو دینے میں بخل نہ کرے اس کے ساتھ جو شخص بدلو کی کرے وہ اس کے ساتھ محبت رکھے، مریدوں کی غلطیوں سے نفاقاں برتنے والا ایسی گرفت نکریں جس سے ان کو وحشت ہو جاوے جس شخص میں یہ علامتیں نہ ہوں وہ میر نائے جانے کے قابل نہیں۔

اِذَا لَمْ يَكُنْ عِلْمٌ لَدِيهِ يَظَاهِرُ | اَوَّلًا بِاطْنٍ فَاصْرَبْ بِلَمْ يَلْجِ الْبَحْرُ

ترجمہ: اگر اس کو ظاہری و باطنی علم حاصل نہ ہو تو اسے قعر دریا میں دے مارو۔ حضرت مدوح نے فرمایا کہ



علم ظاہر سے مراد بقدر ضرورت علم فقہ اور علم توحید ہے کہ فرض کی مقدار مسائل شرعیہ اور عقائد صحیحہ معلوم ہوں اور علم باطن سے مراد علم معرفت ہے کہ یہ نون علم جسے حاصل نہ ہوں وہ شیخ بننے کے قابل نہیں۔

وَإِنْ كَانَ إِلَّا أَنْتَ عَنِوْ جَامِعٍ	يُوصَفِيهَا جَمْعًا عَلَى الْكَمْلِ الْأَمْرِ
فَأَقْرَبُ أَحْوَالِ الْعَالَمِ إِلَى الدَّرَجَةِ	إِذَا لَمْ يَكُنْ مِنْهُ الطَّيِّبُ عَلَى خَيْرٍ

ترجمہ :- اگر شیخ تو ایسے مگر ہر وہ علم کا بطریق کمال جامع نہ ہو تو اس سے بجائے نفع کے نقصان پہنچے گا اندیشہ ہے کیونکہ مریض کی حالت ہلاکت کے زیادہ قریب ہوتی ہے جبکہ اس کے مرض کی ضروریات سے یا خبر نہ ہو۔ حضرت فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ شیخ اگر علم کے ناقص ہونے کی وجہ سے جامع شریعت و طریقت نہ ہو تو وہ سمجھ ہی نہ سکے گا کہ مرید کو کون (فعل اور کون عقیدہ) مضرت پہنچائے گا۔ لہذا اس کی حالت اس مریض کی طرح جس کے معالج کو پتہ نہ ہو کہ کس کس چیز سے اس کو پرہیز کرنا ضروری ہے، صحت کی نسبت موت کے زیادہ قریب ہوگی حضرت منصور قطب فرمایا کرتے تھے اگر شیخ کامل کی صحبت نصیب ہو جائے تو حرص کرنی چاہیے کہ اپنا ارادہ اس کے ارادہ میں فنا ہو جائے اور تمنا ہونی چاہیے کہ اس کی زندگی ہی میں مرنا نصیب ہو اور اس کے بعد زندہ رہنا نہ پڑے کہ پھر دوسرا اس جیسا ملنا مشکل ہے اور دوسرے کے ساتھ ہو کر تندرست رہنا ہی تعجب ہے چہ جائے کہ وصول اللہ نصیب ہو۔

وَمَنْ لَمْ يَكُنْ إِلَّا الْوُجُودُ قَامَةً	فَاطْهَرَهُ مَشْرُودَ الْوَيْةِ النَّصْرِ
فَأَقْبَلَ أَبَابُ الدَّارِ كَمَا تَحْوُهُ	بِصِدْقِ حَلِّ الْعُسْرِ فِي حَلِّ الصَّخْرِ
وَأَيْتُهُ أَنْ لَا يَمِيلَ إِلَى السَّهْوِ	فَدُنْيَاةً فِي طَبَقٍ وَأَخْرَاجًا فِي نَشْرِ

ترجمہ :- اور جس شیخ کو صرف وجود نے قائم کیا ہو یعنی اس کو شیخ کی طرف سے اجازت نہ ملی ہو اور تکمیل سے پہلے ہی اس کے شیخ کی وفات ہو گئی ہو مگر لوگوں کا رجوع اس کی طرف ہونے لگا ہو اور نصرت و کامیابی کے پھر سے بہانے لگے ہوں کہ اس کے پاس آنے والوں کی خواہشات نفسانیہ اور شیطانیہ کی ہریت (ظاہر ہونے لگی ہو اور اس بنا پر قریب الہی کے طالبین مرید ہونے کی غرض سے ایسی سچی ارادت لے کر خوشخت پتھر کے اندر اتر جائے اس کی طرف آنے لگے ہوں تو اس کی شیخوخت بھی مسلم اور قابل اعتبار ہے۔ کیونکہ ممکن ہے اس کی تکمیل مردان غیب کے ذریعہ ہوئی ہو یا حضرت خضر علیہ السلام کے ہاتھ پر بیعت ہوا ہو، مگر اس کی شناخت راہ اور اس کے مستحق مرتبہ شیخوخت کی کھلی علامتیں یہ ہیں کہ اس کی دنیا تہ ہو چکی ہو اور آخرت مفتوح ہو چکی ہو اور یعنی تربیت میں کسی قسم کی طلب دنیا اور غرض نفسانی ظاہر نہ ہو اور اس کا دنیا سے نہاد اور آخرت کی طرف رغبت و توجہ واضح اور آشکارا ہو۔



وَرَانُ كَانَ ذَا جَمْعٍ لَا كُلِّ طَعَامٍ | مُرِيدٌ فَلَا تَصْحَهُ يَوْمًا مِّنَ الدَّهْرِ |

ترجمہ:- اور اگر وہ شیخ صرف روٹیاں کھانے کے لئے لوگوں کو اکٹھا کر رہا ہے تو اس مرید ایک دن کے لئے بھی اس کی صحبت اختیار نہ کر۔ حضرت فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ اگر لوگوں کا جمع ہوتا محض اس لئے ہے کہ (شکر کا) کھانا کھائیں اور فسح (توجہ الی اللہ) کا کوئی اثر ان پر پیدا نہیں ہوتا تو یہ اجتماع لوجہ اللہ نہ ہوا بجز من خور و نوش ہوا ہے لہذا اس کی صحبت اور اس کے اتباع سے طالب کو دور رہنا چاہیئے۔ البتہ اگر وہ لوگوں کو جمع کرتا ہے اللہ والا بنانے کے لئے اور اس کے ساتھ کھانے کا شکر بھی جاری ہے تو اس میں مضائقہ نہیں اور اس کا تحقیر برصیت صحیح ہے

وَلَا تَسَالَتْ عَنْهُ سَوَى ذِي بَعِيَّةٍ | خَلِيٍّ مِّنْ آلَ هَوَاءٍ لَيْسَ بِمُحْتَوَىٰ |

ترجمہ:- اشیخ کا پتہ کسی سے دریافت نہ کر بجز اس کے جو صاحب بصیرت ہو، خواہشات نفس سے خالی ہو اور دھوکہ میں پڑا ہو نہ ہو۔ حضرت نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ شیخ تربیت کو دریافت کرتا ہو تو ایسے شخص سے دریافت کر جس میں تین شرائط پائی جاتی ہوں اول یہ کہ اہل بصیرت ہو، محض سالک نہ ہو کہ قلوب کے معاملہ سے ناواقف ہو اس لئے کہ اس سے دریافت کرو گے تو ایسے سالک کا پتہ بتائے گا جو وظائف کا شیدا اور کثرت اور اوراد کا گرویدہ ہو گا کہ اس کے نزدیک سلوک کا منتہائے مقصود ہی یہ ہے اور اس کے نزدیک اہل طریقت میں فرق مراتب اسی کی کمی بیشی پر موقوف ہے حالانکہ سالک محض نہ شیخ ہونے کا اہل ہے اور نہ درجہ شیخیت پر پہنچ سکتا ہے البتہ شیخ وہ ہے جس کا قلب ہمہ وقت اللہ کے سامنے جھکا ہوا ہو کہ اوراد سے بھی مقصود یہی ہے اور تربیت کرنا اسی کا کام بھی ہے) دوسری شرط یہ ہے کہ ہوائے نفس سے خالی ہو یعنی متعصب نہ ہو کہ اس سے دریافت کر دے تو تعصب کی وجہ سے اہلیت دانے شیخ کا پتہ نہ دے گا اور کسی نااہل کی تعریف کر کے اُدھر لے جا گا تیسری شرط یہ ہے کہ مفرد نہ ہو یعنی شیخ تربیت کے اوصاف میں اصطلاح صوفیہ سے ناواقف نہ ہو کہ اگر اس کو چھو گے تو مجذوب محض کا پتہ بتائے گا اس لئے اس کے نزدیک معرفت الہیہ میں قوت اور فنایت اسی کو حاصل ہے حالانکہ مجذوب محض اسے سلسلہ تربیت نہیں چلتا اور وہ شیخ بننے کا اہل ہے نہ ان مرتبہ پر پہنچ سکتا ہے

فَن صَدَقَتْ مَرَاةٌ فَهَمَّ ارْتَه | بوجہ الشمس من كلف البدر

وَمَنْ لَمْ يَكُنْ يَدْرِي الْعَرُوضُ فَرِيَّتًا | يَرَى الْقَبِيضَ فِي التَّطْوِيلِ مِنْ اَبْجَدِ الْكَلِمِ

ترجمہ:- کیونکہ جس کا آئینہ فہم و غبار آلودہ ہو گا وہ چاند کا سیاہ وہیہ سورج میں دکھانے لگے گا حالانکہ اس میں سیاہی نام کو بھی نہیں ہوتی، اور جن عروض نہ جانتا ہو گا وہ شعر کا وزن نہ سمجھ سکے گا اور بحر طویل کے پانچویں حرف کا گونا بدترین عیب سمجھے گا حالانکہ وہ شعراء کے نزدیک مطلق عیب نہیں ہے، حضرت نے فرمایا مطلب یہ ہے



کہ جس طرح غبار آلود شیشے میں شے کی حقیقت بدل جاتی ہے اسی طرح جو شخص اہل بصیرت نہ ہوگا اسکی فہم میں حقیقی شیخ تربیت کی حقیقت معکوس ہو جائے گی اور وہ بجائے اہل دل عارف کے صاحب اور ادسا لک کو بہتر سمجھے گا حالانکہ عارف بمنزلہ آفتاب کے ہے کہ مستقل اور ذاتی نور رکھتا ہے اور صاحب اور ادمنزلہ قمر کے ہے کہ نور حاصل کرنے میں دوسرے کا محتاج ہے اور اس کا نور مستعار ہے مگر اس کو قمر کا سیاہ حصہ یعنی صاحب اور اد کا نقص و ضعف آفتاب کے چہرہ یعنی اہل دل کی ذات پر دکھائی دے گا اور اصل کو فرع سمجھے گا اور فرع کو اصل غرض شیخ کامل میں اس کو عیب نظر آئے گا لہذا اس سے نفرت کھائے گا اور سا لک محض میں کمال نظر آئے گا لہذا دوسروں کو بھی اسی کا پتہ تباہی گائے نیز اصطلاح شعرا یعنی فن عروض سے ناواقف شخص کو جیسے، اہل فن کے نزدیک بے عیب چیز عیب دار نظر آتی ہے اسی طرح اصطلاح صوفیہ یعنی فن اصلاح و تربیت سے واقف شخص کو مجذوب شخص کامل اور مستحق نظر آئے گا اور صاحب دل عارف ناقص اور مبتدی معلوم ہوگا۔ لہذا وہ مجذوب کی طرف رہبری کرے گا جس کو شیخ بننے کا استحقاق نہیں ہے۔ آیات مذکورہ کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ اگر علم ظاہر اور علم باطن سے بالکل سورا ہو، یا دونوں علم رکھتا ہو مگر بدرجہ کمال نہ رکھتا ہو، تو اس کی صحبت سے کوئی نفع نہیں۔ اور اگر دونوں علم بدرجہ کمال رکھتا ہو اور (زہد و سخا وغیرہ کی) علامات مذکورہ اس میں پائی جاتی ہوں تو اس کو بے شک شیخ بنایا جائے (اور اسکی بیعت اور صحبت کو غنیمت سمجھا جائے) بشرطیکہ اس کے شیخ نے اس کو مسند تربیت پر بٹھایا ہو اور اپنی حیات میں اسکو مجاز بنایا ہو۔ لیکن اگر شیخ کا وصال اس سے قبل ہو چکا ہے اور آپ شیخ کی زندگی میں اس کی روحانی تعلیم و تربیت، پوری نہ ہوئی ہو تو اس میں غور و فکر کرنا چاہیے۔ اگر فتح و بصیرت کی علامات اور خیر و صلاح کے آثار اس پر نمایاں ہوں دنیا سے منہ پھیرے ہو ہو، آخرت کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو اس کے ہاتھ پر بیعت ہو کر مریدوں کو فتح و بصیرت حاصل ہوتی ہو تو اس کو بھی شیخ بنایا جاسکتا ہے لیکن اگر یہ بھی نہ ہو بلکہ لگوں کو محض روٹیوں پر جمع کرتا ہو تو اس سے روشناسی بھی مناسب نہیں ہے اور شیخ تربیت کے متعلق کسی سے مشورہ کرنا ہو تو ایسے شخص سے دریافت کرنا کرنا چاہیے جس میں ہر اوصاف مذکورہ پائے جاتے ہوں ورنہ ممکن ہے کہ نتیجہ برعکس نکلے۔ اب آگے اُن آداب کا ذکر ہے جن کی رعایت شیخ تربیت کی صحبت میں رہ کر مرید پر واجب ہے۔

وَلَا تَقْدَمُ قَبْلَ اعْتِقَادِكَ	مَرَبِّ وَلَا اَعْنِي بِحُجَّتِهِ فِي الْعَصْرِ
فَاتَّزِقِيْبِ الْاَلْفَاتِ لَغِيْرِهِ	يَقُوْلُ لِمَحْبُوْبِ السَّامِيَةِ لَا تَسْ

ترجمہ:۔ اور ربیت ہونے کے لئے، قدم نہ پر صاحب تک تیرا یہ اعتقاد (چمتہ) نہ ہو جائے کہ وہ مرنے والے ہے اور تربیت کے لئے زمانہ بھر میں اس سے بہتر کوئی نہیں ہے۔ کیونکہ دوسرے کی طرف التفات کو دیکھنے والا شیخ



جس کا چلنا پسند کر رہا تھا اس سے کہہ دیا کرتا ہے کہ مدت چل۔ حضرت ممدوح نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ جب تک شیخ کے متعلق طالب کا یہ اعتقاد نہ ہو جائے کہ واقعی وہ تربیت کا اہل ہے نیز یہ کہ اس زمانہ میں اس سے بہتر کوئی مرتبی نہیں ہے اس وقت تک دخول سلسلہ اور حصول صحبت کی نیت سے قدم بڑھانا صحیح نہیں سا اور اس توحید مطلب کی ضرورت اس لئے ہے کہ شیخ جب دیکھے گا کہ مرید کی توجہ دوسری طرف ہے تو وہ مرید سے رقبولیت فیضان کا مادہ سب اور قطع کر دے گا۔ کیونکہ جو مرید باوجود شیخ سے بیعت ہو جانے کے دوسرے کو اس سے اکمل سمجھے گا تو لا محالہ اس کی طبیعت اس کی طرف کھینچے گی جس کے لئے اکمل ہونے کا یقین کئے ہوئے ہے اور جب شیخ کو فراست و بصیرت ہے م اس کا علم ہوگا تو وہ مرید سے اس مادہ ہی کو قطع کر دے گا (جو فیضان کو جذب کیا کرتا ہے) لہذا مرید پہلے شیخ سے منتفع ہو سکے گا نہ دوسرے شیخ سے اور اس زمانہ میں ایسے لوگ بکثرت نظر آ رہے ہیں اللہ ہدایت و توفیق نصیب فرمائے آمین واللہ اعلم

|| اومن بعدہ الشیخ الذی ہو قدوۃ || | بلیغی مراد الحق فی سیرۃ والمجہر

ترجمہ:- اور اس کے بعد وہ شیخ جو مقتدا قرار پایا ہے ظاہراً و باطناً مقصود حق سے آگاہ کرے گا۔ حضرت نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ مقام تربیت اور ضرورت سلوک حاصل کرنے کے بعد ایسے شیخ کی طلب ہونی چاہیے جو مقتدا اور مربی بنے اور یہ بتائے کہ اس کے پیدا کرنے سے حق تعالیٰ کا مقصود کیا ہے اور اس کے ظاہر سے کیا کام لینا مطلوب ہے اور باطن سے کیا کام لینا مقصود ہے کیونکہ شیخ ہی کے ذریعہ شیخ کی معرفت حاصل ہوگی اور وہی آداب مریدین تعلیم کرے گا کہ شیخ سے کیونکر ملنا چاہیے اور کس طرح اس کے پاس بیٹھا جائے نہ یہ کہ شروع ہی سے فکر و مراقبہ میں جلد جاوے اگر شیخ ایسا نہ ہو کہ ضرورت سلوک اور آداب شرعیہ سکھائے، تو سمجھ لے کہ تو ایسا مریض ہے جس کا کوئی طبیب نہیں اور پھر کتنی ہی ریاضت و محنت کیوں نہ کرے کچھ نفع نہ ہوگا۔

|| افقہ واجتنب ما ذمۃ العلم واجتنب || | لما خصۃ بامدح فهو جینی الذکر

ترجمہ:- پس کھڑا ہو اور پنج اس سے جس کو علم نے مذموم بتایا ہے اور اسے اسکو جس کی اس نے مدح فرمائی ہے یہی موتیوں کا چھنا ہے۔ حضرت نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ جب مولیٰ تعالیٰ شانہ تجھ کو شیخ مربی نصیب فرمائے تو اس کی خدمت کے لئے مردانہ وار کھڑا ہو جا اور اس کے حق صحبت سے آگاہ ہو اور اس کو اللہ تک پہنچانے کا وسیلہ قرار دے کہ عجب نہیں تجھے معرفت اللہ نصیب ہو جائے مگر اس کے ساتھ ہی تجھ پر واجب ہے کہ رشریعت محمدیہ کا پابند ہو اور افعال ذمہ جنکو شریعت بڑا بتاتی ہے چھوڑ دے اور افعال حمیدہ حنی کو شریعت اچھا کہتی ہے اختیار کرے کہ تقویٰ اسی سے حاصل ہوگا جو بمنزلہ بیش قیمت موتی کے ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ نقیصت کے تمامی احوال و مقامات کی بنیاد یہ تقویٰ ہے جو اتباع شریعت یعنی امتثال اوامر و اجتناب نواہی سے نصیب ہوگا۔



اَوَانِ تَسْمُوْهُنَّوَالْفَقْرُ نَفْسٌ فَاطْرَحَ | | هَوَاهَا وَجَانِبُهُ مَجَانِبَةُ الشَّهْرِ | .

ترجمہ :- اور اگر راہ فقر کی جانب تیرا نفس متوجہ ہو تو خواہش نفس کو پھینک اور اس سے ایسا علیحدہ ہو جیسا شر سے علیحدہ ہوا کرتے ہیں حضرت نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ اگر طریق تصوف کی طرف چلنے کی ہمت اور رغبت تیرے کو حق تعالیٰ نصیب فرمائے تو نفس کی تجویز کردہ نفل عبادتوں سے بھی پرہیز کرنا اور جب تک شیخ ان کا حکم نہ دے۔

ان سے اتنا دور رہ جتنا شر سے دور رہا کرتے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ مرید کی یہودی اُسی میں ہے جسکو شیخ تجویز فرمائے نہ کہ اس میں جس کو اپنا نفس تجویز کرے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نور بصیرت حاصل ہونے سے قبل جب مرید کا نفس نوافل اور قیام و صیام کی کثرت کو اختیار کرتا ہے تو اکثر اس کا محرک نمودار شہرت کی تمنا ہوا کرتی ہے اور اس لئے اس کے اعمال بغیر اللہ بن جاتے ہیں اور جب حق تعالیٰ مرید شیخ نصیب فرمادیتا ہے تو وہ اس مرض کا ادراک کرتا اور اخلاص کی طرف منتقل کرنا چاہتا ہے۔ پس اگر مرید اپنے شیخ کی موافقت کرنا اور حق تعالیٰ کی عنایت اس کے شامل حال ہوتی ہے تو شیخ اس کے حسب حال اس کو وظائف تعلیم کرتا اور عند اللہ پسندیدہ حالت کی طرف اس کو لے آتا ہے اور اگر مرید موافقت نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ میں تو آیا تھا زیادتی کی طلب میں اور شیخ کرنے لگے کمی، تو سمجھ لو کہ اس پر شیطان کا تسلط ہو گیا اور مرض ریا میں استحکام آ گیا ایک مرتبہ صحابہ نے بعض ازواج مطہرات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شب بیداری کا حال معلوم کیا کہ خواب استراحت بھی فرماتے ہیں اور تہائی شب نوافل میں گزارتے ہیں، تو اپنے خیال میں اس کو قلیل سمجھ کر کہنے لگے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تو اگلے پچھلے سب گناہ معاف ہو چکے ہیں اس لئے نوافل نہ بھی پڑھیں تب بھی حرج نہیں مگر میں ریاضت و مجاہدہ میں کمی کرتی چاہیے، چنانچہ ایک نے کہا کہ میں تو ہمیشہ روزے رکھا کروں گا اور ایک دن کا بھی روزہ نہ چھوڑوں گا۔ دوسرے نے کہا کہ میں تمام رات عبادت میں گزاروں گا۔ ایک منٹ کو نہ سوؤں گا۔ تیسرے نے کہا میں تجرّد اختیار کروں گا۔ کبھی عورت کے پاس نہ جاؤں گا یہ کہہ کر وہ چلے گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکان پر تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ نے ان تینوں کی رائے اور مقولہ حضرت سے عرض کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تینوں کو بلوایا اور فرمایا کہ مجھے اللہ کا خوف خوشیہ اور اس کی معرفت تم سب میں زیادہ حاصل ہے اور باوجود اس کے کبھی روزہ رکھتا ہوں اور کبھی نہیں رکھتا۔ رات کو تہجد بھی پڑھتا ہوں، اور سوتا بھی مولیٰ اور عورتوں سے ہم بستری بھی کرتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حق عبودیت اور مقتضایہ عبادت یہی ہے، پس جو شخص میرے طریقہ سے علیحدہ جائے گا وہ میرا نہیں ہے نیز حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَحْرِمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ** اے ایمان والو! اللہ کی حلال کی ہوئی صاف ستھری چیزوں کو حرام نہ بناؤ اور حد سے آگے نہ بڑھو کہ حد سے بڑھنے والوں کو اللہ پسند نہیں کرتا۔



محمد شین میں اختلاف ہوا ہے کہ یہ تین حضرات کون تھے؟ بعض نے حضرت عثمان بن مظعون، عبد اللہ بن مسعود اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کو بیان کیا ہے اور بعض نے حضرت سعد بن ابی وقاص کو ان میں شمار کیا ہے اور بعض نے حضرت علی کریم اللہ وجہہ کو اور بعض نے حضرت عبد اللہ بن عمر بن العاص کو اور بعض نے حضرت ابو بکر صدیق کو رضی اللہ عنہم جمعین پر حال (ایک صحابہ کو نوافل میں زیادتی کا خیال ہوا مگر، دیکھو آنحضرت صلی اللہ وسلم نے اس کے متعلق ان کی ذاتی تجاویز کو کیسا رد فرمایا اور عند اللہ محبوب اور مستدل طریق کا کیسی عجیب رہبری فرمائی یہ بڑی دلیل ہے مشائخ کے اس برتاؤ کی جو تفصیل و ظائف میں) وہ مریدین کیساتھ کیا کرتے ہیں کہ ہر امر میں توسط و میانہ روی کو پسندیدہ سمجھتے ہیں۔ ایک شخص بغرض بیعت ایک بزرگ کے پاس آئے جو کثیر العباد تھے۔ ہر شب میں ایک قرآن مجید ختم کیا کرتے اندرون میں کئی مرتبہ پوری دلائل الخیرات پڑھا کرتے تھے۔ اور ہمیشہ روزہ رکھا کرتے تھے۔ رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ اور مردوں کی سی حالت ہو گئی تھی شیخ نے ان کو آہستہ آہستہ نیچے آنا اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل کرنا شروع کیا۔ حتیٰ کہ توسط اعتدال پر آئے اور اس کے بعد ایک دن فرمایا کہ وہاں تمہیں حق تعالیٰ نے تقی و شفقت سے کتنی راحت نصیب فرمادی۔

انہوں نے عرض کیا حضرت آپ کو حق تعالیٰ نے جزا خیر عطا فرمادے واقعی میرے اعمال نمونہ کے لئے تھے کہ غیر اللہ کے لئے عبادت کیا کرتا تھا۔ آپ کی برکت سے حق تعالیٰ نے مجھے اس سے راحت بخش دی۔ ایک مرتبہ حضرت ممدوح نے فرمایا کہ نفل عبادتوں کی حالت تو یہ ہے کہ کوئی نہ کرے گا تو کچھ عیب نہیں، اس لئے کہ قیامت کے دن باد پرش نہ ہوگی۔ لیکن اگر نمود کی غرض سے اور اس نیت سے کہ لوگ میری مدح اور عزت کریں ان کو کیا تو اخطار ہے اس لئے کہ آخرت میں ان پر سزا دی جائے گی (کیونکہ ریا و معیبت ہے) نیز فرمایا کہ نمود و شہرت کے اثر سے کوئی حال نہیں ہو سکتا جب تک کہ اپنے تمامی افعال کو حق تعالیٰ کا مخلوق اور اپنے آپ کو محل اجراء نہ سمجھے اور بحالت فعل ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے غفلت نہ ہو اگر ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے فہل ہو گیا تو اسی وقت زیادہ سمعہ اور عجب و خود ستائی کا دخل ہو جائے گا۔

وَضَعَهَا بَحْرَ الشَّيْخِ طِفْلًا تَنَمَّا لَهَا بِخُرُوجٍ بِلَا فِطْرَةٍ مِنَ الْحَجْرِ وَالْحَجَرِ

ترجمہ :- اپنے نفس کو طفل شیر خوار بنا کر شیخ کی گود میں ڈال دے کہ جب تک دودھ نہ جھوٹ جائے گود سے اور روک ٹوک سے باہر نہ نکلے حضرت نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ شیخ بمنزلہ مان کے ہے کہ میں طرح بچہ پرورش میں اپنے ماں کی گود کا محتاج ہے اسی طرح مرید کو تربیت میں شیخ کی نظر شفقت درکار ہے تو یہ و تفرق سے بھی کام لے اور روک ٹوک بھی رکھے کہ ناٹ لٹے کاموں سے روکنا رہے اور صلاح و فلاح کے کاموں کی نصیحت و تاکید کرتا رہے ہاں جس وقت صاحب نسبت ہو جانے کی وجہ سے تربیت کا محتاج نہ رہے اور اپنا بُرا بھلا



خود سمجھنے لگے تو گویا درود چھوٹ گیا اور اب اپنا گذر خود کر سکتا ہے

وَمَنْ لَّمْ يَكُنْ سَلْبَ الْإِرَادَةِ وَصَفَقَهُ ۖ فَلَا يَطْمَعُ فِي شَيْءٍ رَّا تَحْتَ الْفَقْرِ

ترجمہ :- اور جس کو سلب ارادہ نصیب نہ ہو اس کو فقر کی خوشبو سونگھنے کی ہوس نہ کرنی چاہیے حضرت نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ مرید کو اپنے شیخ مرئی کے ارادہ کے سامنے اپنے ارادہ کو فنا کر دینا چاہیے کہ جو وہ تجویز کرے پس اسی کو واجب العمل سمجھے اور جس کی یہ شان نہ ہوئی ہو اسے تصوت کی بوسونگھنے کی بھی ہوس نہ کرنا فضول ہے۔

وَهَذَا وَإِنْ كَانَ الْعَزِيزُ وَجُودَهُ ۖ وَلَكِنَّهُ فِي الْعَزْمِ مِرْخَالٍ مِّنَ الْعُسْرِ

ترجمہ :- اور یہ ریعنی مرید کا مسلوب الارادہ ہونا، اگرچہ تادرا الوجود ہے لیکن اگر ارادہ میں پختگی ہو تو اس کا حصول ناممکن اور دشوار بھی نہیں ہے لہذا مہت نہ ہارنی چاہیے

وَلَا تَعْتَزُّ يَوْمًا عَلَيْهِ قِيَانُهُ ۖ كَقَبْلُ بَشَيْتِ الْمُرِيدِ عَلَى حَجَرٍ

ترجمہ :- اور شیخ پر کسی وقت احد کسی بات پر بھی اعتراض نہ کر کہ یہ فراق کے علاوہ مرید کویت سے علیحدہ کر دینے کی ضمانت ہے حضرت نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ شیخ پر اعتراض کرنے کا نتیجہ لازمی یہ ہے کہ شیخ اس کو اپنی صحبت سے بھی دور کر دے گا اور مرید آستانہ الہیہ اور دین سے بھی ہٹ جائے گا اس لئے اس سے بہت بچنا چاہیے۔ جامع کتاب کہتے ہیں کہ یہاں تک میں نے اشارہ مذکور کی شرح خود حضرت شیخ کے ہاتھ لکھی ہوئی ہے دیکھی جس کو میں نے اس لئے بقیہ اشعار کی شرح خود کرتا ہوں۔

وَمَنْ لَّيَعْتَزُّ بِالْعِلْمِ عَنْهُ مَبْعُورٌ ۖ يَكُنِي النُّقْصُ فِي عَيْنِ الْكَمَالِ وَلَا يَدْرِي

ترجمہ :- کیونکہ جو شخص علم سے بے بہرہ ہوتے ہوئے شیخ یا دوسرے ارباب، اعتراض کیا کرتا ہے اس کا نظر میں عین کمال بھی نقص معلوم ہوتا ہے اور اسے پتہ بھی نہیں چلتا کہ میں نے کمال کو نقصان سمجھ لیا ہے۔ یہ مضمون عوارف المعارف سے ماخوذ ہے کہ اس کے مولف حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہ نے تحریر فرمایا ہے مرید کو مناسب ہے کہ جب شیخ کا کوئی ایسا فعل دیکھے جس کی حقیقت سمجھ میں نہ آوے تو سیدنا موسیٰ اندسیدنا خضر علیہما السلام کا قصہ یاد کرے کہ حضرت خضر علیہ السلام سے ایسے افعال سرزد ہوئے جن پر سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اعتراض فرمایا مگر جب آپ کو ان افعال کی حقیقت معلوم ہو گئی تو آپ نے رجوع فرمایا۔ چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضرؑ کے مرید نہ تھے بلکہ اُن سے افضل اور صاحب ثبوت ہیں۔

اس لئے ان کے اعتراض میں کوئی خرابی نہ تھی اور وہ معذور تھے مگر مرید سے بہر حال اس کا شیخ علم میں افضل ہوگا اس لئے مرید کو شیخ پر اعتراض کا حق نہیں ہے اسی سے یہ نتیجہ بھی نکلا کہ اگر علم شریعت میں کوئی مرید اپنے شیخ سے



بڑا ہوا ہو تو اس کو ادباً اعتراض کا تو حق نہیں مگر خلافت کرنے کا حق ضرور ہے کہ خلافت شرع امر میں اتباع جائز نہیں ہے غرض عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ شیخ عالم ہوتا ہے اور مرید عالم یا طالب علم یا ناقص العلم اس لئے عام قاعدہ عدم اعتراض کا ہے لیکن مستثنیات اکثر قواعد میں ہوتے ہیں اس لئے ممکن ہے کہ علوم باطنیہ میں شیخ بڑھا ہوا ہو مگر علم ظاہری میں مرید زیادہ ہو لہذا اسکو دونوں پہلو سنیھا لانا پڑے گا کہ نہ اعتراض و سواد ادب ہونے پائے اور نہ خلافت شرع امر میں اتباع خصوصاً جبکہ صاحب نسبت ہو کر شیخ بن چکا ہو۔ واللہ اعلم

اَوْ مَنْ لَمْ يُوَافِقْ شَيْخَهُ حَتَّى اِجْتِمَاعِهِ | | لِيَقْلُ مِنَ الْاِفْكَارِ فِي هَيْبِ الْجَبْرِ |

اور جو شخص اعتقاد میں شیخ کی موافقت نہ کرے گا وہ اعتراض کی وجہ سے شعلہ نار میں جائے گا یعنی شیخ سے کوئی فعل صورتہ مذموم اگر صادر ہوا اور مرید نے یہ سمجھا کہ ضرور اس میں کوئی راز ہوگا جس کا مجھے علم نہیں تب تو مرید کو شیخ سے نفع پہنچے گا اور اگر مرید نے سمجھا کہ شیخ نے غلطی کھائی تو پھر شیخ سے جدائی نصیب ہوگا اور شیخ کی نظروں سے گر کر مفارقت میں پڑے گا جو بمنزلہ شعلہ آتش کے ہے حضرت شیخ محی الدین بن عربی سے منقول ہے کہ مرید پر لازم ہے اپنے شیخ کو راستہ کا دیکھا بھالا اور علی شریعتہ من رتبہ سمجھے اور اپنے رقائق علم و فہم کی ترازو میں اس کے حالات کو وزن نہ کرے کہ بعض دفعہ شیخ سے ایسی صورت ظاہر ہوتی ہے جو بظاہر مذموم ہوتی ہے مگر باطن اور حقیقت میں محمود ہوتی ہے۔ لہذا سر جبکا نا ضروری ہے ف یہ سب کچھ اس شیخ مربی کے حقوق لازمہ میں ہے جس کی علامات پہلے بیان ہو چکی ہیں کہ جامع شریعت ہو، دنیا سے زاہد و بے فہم ہو، کسی مسلمان سے حسد و بغض نہ رکھتا ہو، سخی اور مال دنیا کی محبت سے خالی ہو کہ یہ علامات اس کے کمال تجربہ کا یقین دلائیں گی اور اس کے افعال ایک درجہ میں حضرت خضر علیہ السلام کے افعال کی نظیر بن سکیں گے کہ حضرت خضر کا مقبول عند اللہ ہونا خود حق تعالیٰ کے ارشاد سے ظاہر ہوا ہے ورنہ مطلق شیخ کو خصوصاً اس زمانہ میں کہ جس کو چاہا پیر بنایا یہ منصب حاصل نہیں ہو سکتا خلاصہ یہ ہے کہ مرید کو حسن ظن اور اتباع کامل کی یہ ہدائیں شیخ عارف کے لئے ہیں نہ کہ ہر پیر کے لئے کہ غیر عارف کا تو پیر بنانا ہی مناسب نہیں آتا۔ شیخ کا محل تو کیسے ہو سکتا ہے اس لئے عوام اس سے دھوکا نہ کھادیں واللہ اعلم

اَلْاَعْقِلُ لَا يَرْضٰى سِوَاكَ اَوْ اَنْ نَاي | | عَنِ الْحَقِّ نَايَ الْاَلْبَلِ عَنِ الْوَاضِعِ الْبُخْرِ |

صاحب عقل اپنے عارف و جامع شیخ کے سوا دوسرے کو پسند نہیں کرتا اگرچہ وہ بظاہر حق سے اتنا بعید ہو جتنی صبح سے رات بعید ہے حضرت ممدوح فرمایا کرتے تھے کہ جب مرید اپنے شیخ کے ساتھ حسن ظن رکھتا ہے تو صاحب بصیرت ہو جانے کے بعد حق تعالیٰ اسکو ان اسرار پر مطلع فرما دیتا ہے جو شیخ کے افعال میں مضمر تھے اسی طرح اگر احکام شرعیہ کے ہر ار حکم معلوم کرنے کی ہوس ہو تو اس کا طریق یہی ہے کہ اول اپنے عقل



| وَلَا تَعْرِفْنِي فِي حَضْرَةِ الشَّيْخِ غَيْرُهُ | | وَلَا تَمْلَأَنَّ عَيْنَا مِنْ النِّظَرِ الشَّرِّ |

ترجمہ :- اور دربارِ شیخ میں حاضری کے وقت دوسرے سے آشنا ہی نہ ہو اور نہ نظر بھر کر کسی دوسرے کو دیکھ۔  
حضرت مدوح فرمایا کرتے تھے کہ جو حسنِ ادب اور یک درگیری کا برتاؤ مرید اپنے شیخ کے ساتھ کرے گا اس کے صلہ میں اُسی جلیا برتاؤ اس کو اپنے اللہ کے ساتھ نصیب ہوگا یہ بھی سمجھ لو کہ یہ ادب اور یکسوئی مرید کو نصیب نہیں ہو سکتی جب تک کہ خود شیخ کی طرف سے باطنی جاذب اس کو نہ کھینچے شیخ کو جب اپنے مرید کے ساتھ محبت ہوتی ہے تو اس کی شعا عین مرید پر پڑتی ہیں اور اس کے چاروں طرف محیط ہو کر اس کو شیخ کی طرف کھینچتی ہیں کہ ہر شے سے تعلق قطع کر کے خالص اپنا بنا لیتی ہیں جب تک وہ محبت اور اس کی شعا عین قائم رہتی ہیں تو شیخ اور مرید میں تعلق قائم رہتا ہے اور جب وہ منقطع ہو جاتی ہیں تو تعلق بھی منقطع ہو جاتا ہے ایک مرید ہر وقت اپنے شیخ کیساتھ رہا کرتا اور کسی وقت بھی ان کی خدمت سے غیر حاضر نہ ہوتا تھا اور اسکو اپنی محبت کا ثمرہ سمجھتا تھا نہ کہ شیخ کی محبت کا ایک دن شیخ نے فرمایا کیوں جی کیا تم کو میرے ساتھ محبت ہے؟ مرید نے کہا حضرت اگر مجھے محبت نہ ہوتی تو ہر وقت حاضر باش کیسے رہتا فرمایا اچھا معلوم ہو جائے گا اس وقت سے اس کا شیخ کے پاس آنا ہی بند ہو گیا اور ایک سال کامل گذر گیا کہ صحبتِ شیخ تو درکنار زیارتِ شیخ بھی نصیب نہ ہوئی۔

| وَلَا تَنْطَقَنَّ يَوْمًا لِرِيَّةٍ فَنَانٍ دَعَا | | إِلَيْهِ كَلَّا تَعْدَلُ عَيْنُ الْكَلَامِ النَّفْسَ |

ترجمہ :- اور شیخ کے سامنے بلا ضرورت کوئی بات نہ کر اور اگر وہ خود کوئی بات دریافت کرے تو بقدر ضرورت مختصر جواب دے۔ مطلب یہ ہے کہ زیادہ باتیں کرنا بے ادبی میں داخل ہے ہاں اگر شیخ ہی اس کا خواہشمند ہو تو اس وقت تطویلِ کلام پسندیدہ ہے شیخ کی مجلس میں مرید کی یہ شان ہونی چاہیے جیسے کوئی سمندر کے کنارہ بیٹھا روزی کا منتظر ہو کہ اب اللہ بھیجے گا۔ اسی طرح مرید منتظر رہے کہ حق تعالیٰ بزبانِ شیخ روحانی معاش آمارے گا اور میں اس سے حکم سیرا دیراب ہو جاؤں گا۔

| وَلَا تَوَدَّعُوا أَصْوَابَكُمْ فَوْقَ صُورِهِمْ | | وَلَا تَجْهَسُوا جَهْشَ الْكَذِبِ هَوًى فِي قَفْرِ |

ترجمہ :- اور شیخ کی آواز سے اپنی آواز کو ادنیٰ نہ کر۔ ایسے الفاظ سے اس کو نہ پکار جیسے جنگلی آدمی پکارا کرتے ہیں مطلب یہ ہے شیخ کی آواز سے اپنی آواز کو بلند کرنا سوءِ ادب میں داخل ہے اور اس طرح بدویانہ لہجہ میں گفتگو کرنا اس کے احترام کے خلاف ہے تعظیم کے ساتھ مخاطبت کرنی چاہیے مثلاً یا دلی اللہ اے میرے سردار یا حضرت وغیرہ جب کسی کا وقار احترام قلب میں ہوتا ہے تو وہ انسان کی زبان کو سنبھالے رہتا ہے اور گفتگو میں جبری و بیباک نہیں ہونے دیتا نہ آواز ادنیٰ ہونے پاتی ہے نہ زیادہ سنسی آتی ہے نہ بلا ضرورت بات ہو سکتی ہے اور بعض کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ نظر بھر کر شیخ کو دیکھ بھی نہیں سکتے۔



| وَلَا تُدْفَعَنَّ بِالضَّحْلَةِ صَوْلَتُكَ عِنْدَهُ | | فَلَا تَجْزِ إِلَّا دُونَكَ فَا مُتَّقِرٌ |

ترجمہ:- اور شیخ کے پاس اپنی آواز سے مت نہیں کہ تلاش کرنے سے جتنے عیوب کا پتہ چلتا ہے وہ سب اس سے کم درجہ پر ہیں اور تو زیادہ ہنسنا ہی عیب ہے اور قلب میں مُردنی لاتا ہے کیونکہ رعونت اور حماقت کا اثر ہے خصوصاً شیخ کے سامنے ہنسنا اور وہ بھی کھل کھلا کر کہ آواز نکلتے۔ یہ علامت ہے کہ قلب میں شیخ کا احترام نہیں اس لئے حرمان اور خسران کا موجب ہے۔

| وَلَا تَقْدَنْ ثَدًّا اَمَةً مُتَوَبِّعًا | | وَلَا بَارِيًّا رَجُلًا قَبِيحًا رَوَّاحِي السَّيِّئِ |

ترجمہ:- اور شیخ کے سامنے پلو تھی مار کر یا پاؤں پھیل کر مت بیٹھ (کہ یہ متکبرین کی نشست ہے) اور اگر پاؤں پھیل جائے تو جلدی سمیٹ لے تو وضع کی نشست یہ ہے کہ دونوں گھٹنیں کھڑے کر کے ہاتھوں کا حلقہ کرے یا ایک پاؤں ٹکیٹر کر بیٹھ جائے اور دوسرا گھٹنا کھڑا کرے یا دوزانو بیٹھے اور دونوں ہاتھ اپنے گھٹنوں پر رکھے۔

| وَلَا بَاسِطًا تَجَادَةً مَجْضُوسَةً | | فَلَا مَقْصِدَ إِلَّا السَّعْيَ لِلْخَادِمِ الْبَرِّ |

| وَسَجَادَةً الصَّوْفِيَّ بَيْتَ سَكُونِهِ | | وَلَا وَكْرًا إِلَّا أَنْ يَلْبَسَ عَنْ لَوْكِرٍ |

ترجمہ:- اور شیخ کی خدمت میں حاضری کے وقت مصلے نہ بچھا اور پیر بنکر اس پر نہ بیٹھ کہ یہ مقصود کے خلاف ہے شیخ کے پاس تیرا آنا خدمت گزاری کے لئے ہونا ہے اور خادم کا کام خدمت میں دوڑ دھوپ کرنا ہے نہ کہ مقننا و مخدوم بن کر باناز پر بیٹھنا، صوفی کا مصلے اپنی رہائش کے حجرہ میں ہونا چاہیے اور جب تک اشیاء سے پرواز نہ کر جائے خود اشیاء نہ بننا چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح گھونسہ پرتد کا مادی و مسکت ہے کہ دانہ پانی کی تلاش میں چار طرف گشت لگاتا ہے مگر سیرا کرتے کے لئے گھونسہ ہی کی طرف آتا ہے اسی طرح شیخ کا آستانہ گویا مریدوں کا آشیانہ ہے کہ سکون قلب اور ٹھکانہ کا روحی آرام یہیں ملتا ہے اس لئے جب تک تربیت میں آستانہ شیخ کا محتاج ہے اس وقت تک اپنے آپ کو مریدوں کا آشیانہ نہ بنا اور پیر بنکر نہ بیٹھ ہاں جس وقت بال و پیر نکل آریں اور آشیانہ سے پرواز کر جائے کہ تربیت و نگہانی شیخ کی فرست نہ رہے اور صاحب نسبت ہو کر اپنی حالت کو خود سنبھالنے کا اہل بن جائے تب پیر بنکر مصلے پر بیٹھو کہ اب تیرا آشیانہ دوسروں کا آشیانہ نہ بنے گا مگر اس حالت میں بھی پیر کے سامنے پرانہ شان سے نہ آئیو بلکہ وہی غارنا طرز قائم رکھو اور اپنا مصلے اپنے گھر میں بچھا لیو نہ کہ شیخ کے مقابل کہ یہ سوادوب اور عقوق میں داخل ہے سعادتمند بچہ صاحب اولاد بکر بھی اپنے باپ کے برابر کرسی پر نہیں بیٹھا کرتا اور صفت خدام میں اپنا کھڑا ہونا فخر سمجھا کرتا ہے۔

| وَمَا دُمْتَ لَمْ تَقْطَعْ فَلَا فَرْجِيَّةٌ | | عَلَيْكَ وَلَا تَكْفِي عَلَيْهَا مِشْجَرٌ |



اور جب تک تیرا دودھ نہ چھوٹ جائے (یعنی تربیت شیخ کی مدت جو گویا مدت رضاعت ہے پوری نہ ہو جائے اس وقت تک نہ تجھ پر جبر ہونا چاہیے اور نہ اس کی مجبورت تجھ میں پائی جانی چاہیے مطلب یہ ہے کہ جب تک شیخ بننے کا اہل نہ بن جائے اس وقت تک شیخ کا لباس پہننا اور ان کی وضع اختیار کرنا مناسب نہیں کہ تصنع اور تکبر میں داخل ہے اور سب خسران و حرمان ہے۔

وَلَا تَوْنُوا فِي الْأَرْضِ ذُو نَكَ مُؤْمِنًا	وَلَا كَافِرًا هَتَا تَعْتَبُ فِي الْقَبْرِ
إِنَّا خَتَمَ الْأَمْرَ عِنْدَ مُغِيبٍ	وَمَنْ لَيْسَ فَاحْصٍ يَخَافُ مَنْ نَكِرَ

ترجمہ: اور دنیا میں کسی مومن یا کافر کو اپنے سے کمتر نہ سمجھ جب تک کہ تو قبر میں نہ چھپ جائے۔ کیونکہ انجام تیری نظروں سے غائب ہے اور جو خسارہ میں مبتلا نہیں اس کو شان بے نیازی کا خوف لگا رہتا ہے مطلب یہ ہے کہ زندگی میں چونکہ کسی کو معلوم نہیں کہ میرا انجام کیا ہوگا اور دوسروں کا انجام کیا ہوگا تو یہ قبر میں جاتے ہی پر پتہ چلے گا کہ ایمان پر مرا اور مومن قرار پایا یا عیاذ باللہ کفر پر مرا اور عند اللہ کافر قرار پایا اس لئے تو مومن کسی کافر کو بھی بنگاہ حقارت نہ دیکھ اور اپنے سے کمتر نہ سمجھ کیا خبر ہے کہ اس کو ایمان پر مرنا نصیب ہو جائے اور تجھے اس کے خلاف پس موجودہ حالت کا کیا اعتبار نہ اور مان لے کہ اس وقت کوئی شخص خسارہ میں نہیں اور مومن صالح بنا ہوا ہے مگر اس کو بھی ہر وقت یہ اندیشہ لگا ہوا ہے کہ اللہ کی تجویز اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ مقلب القلوب والاحوال ہے نہ معلوم دم بھر میں کیا کیا بنا دے۔

عالم میں اسی کا تصور چلتا ہے اور وہ چھٹتا ہے کہ کسی کو محال دم زون نہیں عوارق المعارف میں مذکور ہے کہ حضرت یوسف بن اسباط سے کسی نے دریافت کیا کہ تواضع کی حقیقت کیا ہے؟ فرمایا آپ گھر سے نکل کر جس سے بھی ملے اسے اپنے سے بہتر سمجھے۔ میں نے اپنے شیخ ابوالنجیب ضیاء الدین کو دیکھا جبکہ میں ملک شام کے سفر میں آپ کا ہمراہ تھا کہ ایک دنیا دار نے انگریز قیدیوں کے سروں پر خوان رکھ کر آپ کے لئے کھانا بھیجا جب ستر خوان بچھایا گیا تو آپ نے دیکھا کہ قیدی برتنوں کے خالی ہونے کے انتظار میں کھڑے ہیں خادم سے فرمایا ان کو بھی بلاؤ کہ فقروں کے ساتھ کھانے میں شریک ہوں چنانچہ ان کو تمامی جمع فقرائے ساتھ ایک صوف میں ستر خوان پر بٹھایا گیا اور حضرت اپنے مصئے سے اٹھ کر ان میں لے جا بیٹھے گویا ان ہی میں سے ایک آپ بھی ہیں اور ان کے ساتھ کھانا تناول فرمایا اس وقت آپ کے باطن سے جو تواضع نکلا آپ کے ظاہر پر برسر رہا تھا وہ کہو محسوس ہو رہا تھا اور اپنے ایمان اور علم کا تکبر آپ میں نام کو بھی نہیں تھا شیخ ابوالحسن فقیہ فرماتے ہیں کہ میں نے شیخ ابو محمد عبداللہ کو کہ فقہا ہیں سے تھے ایک شدید سردی کے دن کثیر بارش اور کچھڑ میں سڑک پر چلتے ہوئے دیکھا سامنے سے ایک کتا آگیا جو درسی راستہ



پر چل رہا تھا جس پر آپ جا رہے تھے آپ نے اُس کے لئے راستہ چھوڑ دیا اور دیوار سے لگ کر اس انتظار  
 میں کھڑے ہو گئے کہ یہ گزر جائے تب میں چلوں حتیٰ کہ جب کٹا قریب آ گیا تو میں نے دیکھا کہ آپ نے اپنی اس جگہ کو بھی  
 چھوڑ دیا اور اوپر کا حصہ کتے کے لئے چھوڑ کر خود حصہ زیریں میں اتر گئے تاکہ کتا آپ سے اونچا ہو کر گزرے  
 جب کتا وہاں سے گزر گیا اور میں آپ کے پاس پہنچا تو میں نے آپ کے چہرہ پر ایک کلفت اور پریشانی محسوس کی میں نے  
 عرض کیا کہ حضرت آج تو میں نے آپ سے ایک عجیب بات صادر ہوتے دیکھی آپ نے یہ کیا کیا کہ خود ترکیچڑ میں اتر گئے  
 اور کتے کے لئے صاف جگہ چھوڑ دی کہ وہ سڑک کے اوپر چلے۔ فرمایا جب میں اس کے لئے نیچے کا حصہ چھوڑ کر  
 دیوار سے لگ گیا تو مجھے خیال آیا کہ میں نے تو بکتر کیا اور اپنے آپ کو کتے سے بہتر اور اونچا قرار دیا حالانکہ اونچا وہ ہے  
 کیونکہ میں تو اللہ کا خطا کار بندہ ہوں اور میں نے بہتیرے گناہ کئے ہیں اور یہ بے گناہ ہے (کیونکہ مکلف ہی نہیں)  
 اس لئے میں فوراً نیچے اتر گیا اور اس کے لئے اوپر کا حصہ چھوڑ دیا مگر اب بھی مجھے عذاب الہی کا ڈر ہے اگر  
 معاف نہ فرمائے تو مستحق سزا ہوں کیونکہ اپنے سے بہتر کو (زرا اوپر کے لئے) کمتر سمجھ چکا ہوں۔ علامہ مائتہ  
 فرماتے ہیں کہ ہر لمحہ اور ہر زمان حق تعالیٰ کی اپنے بندوں کے قلوب پر توجہات ہوتی ہیں اور ان میں جس کو جتنا چاہے  
 اپنے معارف و انعامات عطا فرماتا ہے پس عارف کے پاس بیٹھا ہوا کوئی شخص اگر ایک لمحہ کے لئے بھی جدا ہوتا  
 اور پھر واپس آتا ہے تو یہ اس کی تعظیم و خدمت کے لئے تیار ہو جاتا ہے کیونکہ سمجھتا ہے ممکن ہے اس پر مولیٰ کی  
 نظر کرم پڑ گئی ہو اور ہمیشہ کے لئے مالا مال ہو گیا ہو پس اگر واقعی نظر پڑ گئی ہے تب تو وہ تعظیم و خدمت کا  
 مستحق ہی ہے اور عارف نے اس کا حق ادا کیا اور اگر نہیں پڑی تب بھی اُس نے اپنے اللہ کے ساتھ حسن ادب  
 برتنا کہ حق تعالیٰ کی شان کرم گستری جس بڑاؤ کو مقتضی ہے کہ اس کی نظر کرم کا احترام کیا جائے، اس پر عمل کیا  
 کیا نیز اہل اللہ اگر کسی کو معصیت کرتے ہوئے بھی دیکھ لیتے ہیں تو معصیت ختم ہو جانے کے بعد اس پر اڑا اور اصرار کی  
 بدگمانی نہیں کی بلکہ یوں سمجھتے ہیں کہ ممکن ہے مخفی طور پر اس نے توبہ کر لی ہو یا عجیب نہیں حق تعالیٰ نے اس کی  
 خطا کو نظر انداز فرما دیا ہو۔ پس جس شخص نے اپنے آپ کو کسی سے بہتر سمجھا اور حالت یہ ہے کہ انتہا و انجام نہ  
 اپنا معلوم ہے نہ اس کا تو وہ شخص بڑے دھوکہ میں مبتلا ہے کتنے ہی علوم و معارف اس کو حاصل کیوں نہ ہوں  
 امام غزالیؒ فرماتے ہیں تمامی مسائل اللہ کی مشیت اور ارادہ سے وابستہ و مربوط ہیں جس کا علم یقین کے درجہ میں تو کیا گمان و قیاس  
 کے درجہ میں بھی کسی کو حاصل نہیں سادہ یہی ایک بڑی چیز ہے جو عارفین کے قلوب کے ٹکڑے کئے ڈالتی ہے کہ  
 ہر شخص کا معاملہ اس ذات کے ہاتھ میں ہے جو بے نیاز و بے پردہ ہے چنانچہ ایک عارف کا قول ہے کہ ایک شخص کا  
 موحد ہونا مجھے بچاس برس سے معلوم ہوا اور وہ مجھ سے ہٹ کر ستون کی آڑ میں جا کر انتقال کر چکا تو میں اس کی توجہ پر یقین  
 کے درجہ میں شہادت نہیں دے سکتا کیونکہ نہ معلوم (اسی اوجھل ہونے کے لئے ایک لمحہ میں) اللہ کی شانِ تعظیم اس پر



کیا ظہور ہوا ہو دوسرے عارف فرماتے ہیں اگر درجہ شہادت میرے گھر کے دروازہ پر ہوا اور محض اسلام پر مرنا میری  
 کوٹھڑی کے دروازہ پر ہو تو میں اسلام پر مرنے کو اختیار کروں گا اور شہادت کی ہوس نہ کروں گا، کیونکہ نہ معلوم  
 کوٹھڑی سے گھر کے دروازہ تک پہنچنے (کے چند قدم) میں میرے قلب کو کیا انقلاب پیش آوے اور اسلام کی  
 کہیں ہلاکت سے نہ جاتا رہے حضرت سہیلؑ فرماتے تھے کہ صدیقین کو ہر حرکت و سکون میں سوجھ بوجھ کا اندیشہ  
 لگا رہتا ہے اور یہی ہیں جن کی حالت حق تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے **وَقُلُوبُهُمْ وَجَلَةٌ** کہ ان کے دل لرز  
 رہتے ہیں نیز فرمایا کرتے تھے کہ مرید کو تو معصیتوں کا خوف رہتا ہے مگر عارف کو یہ ڈر رہتا ہے کہ کفر میں مبتلا  
 نہ ہو جائے حضرت ابو یزید فرمایا کرتے تھے کہ جب مسجد کی طرف چلتا ہوں تو میری کمر میں زنا رہتا ہے اور میں قدم  
 قدم پر درتا ہوں کہ کہیں مجھے (نصاری کے کنیسریا دھجوس کے) آتش خانہ میں نہ لے جائے جب مسجد میں پہنچ جاتا ہوں  
 تب راضی ہو جاتا ہوں اور یہ زنا میری کمر سے جدا ہوتا ہے روزانہ پانچ دقت میری یہی حالت ہوتی ہے۔  
 اسی قسم کا ایک عجیب قصہ میں نے اپنے حضرت سے سنا کہ فرماتے لگے مکہ مکرمہ میں ابو الحسن علی ہندی سے میری  
 ملاقات ہوئی ان کی عجیب و غریب حالت تھی کہ جب چلنے کا ارادہ کرتے اندھا پاؤں اٹھاتے تو وہ لہرتا تھا اور فوراً  
 اس کو واپس لے آتے اور پھر وہ کانپتا تھا اس کے بعد پھر اٹھاتے اور قدم بڑھانا چاہتے تو لڑتا تھا اور پھر واپس  
 لے آتے اور وہ کانپتا تھا غرض ایک قدم پورا نہیں اٹھا سکتے تھے کہ دیکھنے والا ان کو مہینوں کہتا تھا پھر قدم ہی پر پھر  
 نہیں کھاتے کہ لئے منہ کی طرف نوالہ اٹھاتے تب بھی یہی حال ہوتا تھا کہ منہ کے پاس تک لے گئے اندھا لڑتا رہا ہے  
 اور پھر ہٹا لیا ہے اندھا لڑتا رہا ہے غرض نوالہ منہ میں ڈال نہ سکتے تھے کہ دیکھنے والا کو ترس آتا تھا بیٹھے  
 کا ارادہ کرتے تب بھی یہی حال تھا کہ اٹھتے بیٹھتے غرض ہر اختیاری حرکت و سکون میں حتیٰ کہ آنکھ کھولنے اور بند کرنے  
 جھپکاتے تک میں ان کی یہی کیفیت تھی مجھے ان کی یہ حالت دیکھ کر بے حد رنج ہوا اور بہت ترس آیا میں نے ان سے  
 کہا اے ابو الحسن یہ تمہاری کیا حالت ہے حالانکہ حق تعالیٰ نے تم کو اپنے اولیاء اور خواص اصفیاء اور کبار عارفین اور  
 اہل دیوان میں سے بنایا ہے کہ قطب وقت ہو اور تمہارا جسم بھی صحیح سالم ہے کوئی بیماری نہیں ہے فرماتے لگے  
 تمہارے سوا اب تک میں نے اپنی حالت کا کسی پرانہا نہیں کیا ہاں تم سے بیان کرتا ہوں کہ الحمد للہ حق تعالیٰ  
 نے مخلوقات میں اپنے فضل کا مجھے شاہدہ نصیب فرمایا اور میں آنکھوں سے دیکھتا ہوں کہ اس کا نفع اس کی تمام  
 مخلوقات میں ساری و جاری ہے ایک چیز بھی مجھ پر پوشیدہ نہیں پھر اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مخلوقات میں اپنے  
 فضل اور قضا و قدر کے اسرار پر بھی مجھے مطلع فرمایا کہ افعال الہیہ بھی مجھے نظر آتے ہیں اور یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ ان میں مصلحت  
 کیا ہے اور ان کے امور مقدرہ کے راز سے بھی آگاہی ہے کہ ان اسرار میں کوئی بات بھی مخفی نہیں اس کے بعد میں نے  
 اپنی ذرت میں فضل الہی پر نظر ڈالی تو میں نے اپنے آپ کو اس شاہدہ سے اور ان کے اسرار کے شاہدہ معلوم



پایا۔ اس لئے میرا خیال یہ ہوا کہ اس مشاہدہ سے مجھے محروم رکھنا عجیب نہیں اس لئے ہو کہ میرے کسی فعل پر حق تعالیٰ نے  
 اپنا غصہ مرتب فرمانا تجویز کیا ہے اور اس لئے تمامی افعال کا مشاہدہ مجھ سے روک دیا ہے تاکہ مجھے یہ پتہ نہ چل سکے کہ وہ کونسا  
 فعل ہے جس میں میری ہلاکت مقدر ہے اور میں اس سے پرہیز کر جاؤں اس بنا پر مجھے ہر اختیاری فعل پر جو  
 میری طرف منسوب ہے خوف لاحق ہوتا ہے اور میں درتا ہوں کہ ممکن ہے یہی وہ فعل ہو جس پر میری ہلاکت مقدر  
 ہو، لہذا میں اپنے ظاہر و باطن دونوں سے اللہ کے حضور گڑ گڑاتا ہوں۔ اور جب بھی کسی فعل کا ارادہ کرتا ہوں تو وہ  
 خوف میری نظر کے سامنے ہوتا ہے اس لئے اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ اس کو میرے لئے سبب ہلاکت  
 نہ بنائے چونکہ چلنے کے لئے قدم اٹھانا یہ بھی ایک فعل اختیاری ہے اس لئے اس پر کانپ جاتا ہوں اور خوف  
 کے بدلے اس کو پیچھے ہٹاتا ہوں مگر پیچھے ہٹانا بھی میرا فعل اختیاری ہے اس لئے پھر لرز جاتا ہوں غرض ہر فعل میں  
 یہی حال ہوتا ہے شیخ فرماتے ہیں کہ میں نے ان کو بہت کچھ سمجھایا، اللہ کی وسعت رحمت یاد دلائی اور حدیث قدسی  
 سنائی انا عند ظن عبدي فی فیلطن بی ما شاء فان ظن بی خیرا اعطیتہ حتیٰ المحدث۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے  
 میں بندہ کے گمان کے ساتھ ہوں جیسا بھی وہ میرے ساتھ گمان رکھے گا (دیا اُس کے ساتھ برتاؤ کرے گا)  
 لہذا اب اُسے اختیار ہے جیسا چاہے میرے ساتھ گمان رکھے۔ پس اگر میرے ساتھ اچھا گمان رکھے گا تو میں اس کو خیر ہی  
 عطا کروں گا، غرض سب کچھ کہا اور وہ غور سے میری بات کو سنتے بھی تھے حتیٰ کہ میرا خیال ہوتا تھا کہ اب سنبھل جائیں گے  
 اور یہ حالت جاتی رہے گی مگر پھر وہی ان کا خیال عود کرتا اور ان کی وہی حالت ہو جاتی تھی کہ ہر دیکھنے والے کو  
 ان پر ترس آتا اور دعا مانگا کرتا تھا کہ یا اللہ ان کو صلب آرام نصیب فرما خواہ ادھر ادھر کہ زندگی ہو تو سکون  
 نصیب ہو ورنہ موت آجائے اور آرام ملے، مان مجھے یہ تمنا ضرور ہوئی کہ کاش اہل غفلت اور اہل حجاب  
 ان کو دیکھیں اور ان کی حقیقت حال سے آگاہ ہوں اور ان کا اللہ جل جلالہ سے شدت خوف اور ہر حرکت  
 و سکون میں اس کا مراقبہ و دھیان معلوم کریں تو ان کو عبرت ہو اور اپنے انہماک شہوت اور اللہ سے بے تعلقی  
 کا ان کو احساس ہو نیز حضرت ممدوح نے فرمایا کہ حالانکہ درحقیقت اپنی ذات میں فعل الہی کے مشاہدہ سے محروم رکھنا  
 اللہ کی نعمت تھی جس کو شیخ ابوالحسن نے غلبہ خوف کے سبب برعکس سمجھ لیا یا، کیونکہ اگر حق تعالیٰ اس پر ان کو  
 مطلع فرمادیتا اور وہ اپنی ذات میں فعل الہی کا مشاہدہ کرتے تو ان کی ذات پارہ پارہ ہو جاتی مگر حق تعالیٰ نے چونکہ  
 ان کی بقا اور ایک وقت معین تک زندگی تجویز فرمائی تھی اس لئے اس مشاہدہ کو مخفی فرمادیا اور دیگر اشیاء میں  
 فعل الہی کا مشاہدہ جیسا ان کو نصیب ہوا دیگر اولیاء و انبیاء کو بھی نصیب ہوا ہے البتہ حادث زمانہ شے کوئی  
 بھی کیوں نہ ہو اپنی ذات کے اندر فعل الہی کا مشاہدہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتی اگر یہ مشاہدہ ہو تو (کہہ طور کی طرح)  
 فوراً ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا دوسری چیز میں فعل الہی کے مشاہدہ کی طاقت حادث شے کو حاصل ہے واللہ اعلم



ترجمہ۔ اور کسی دقت بھی مخلوق پر نظر نہ کر کہ وہ صاف اور آزاد کو مکر اور مقید بنا چھوڑے گی پہلے شعر میں بیکر اور مخلوق کو حقیر سمجھنے کی ممانعت کی تھی اور اس شعر میں اس کی دوسری جانب یعنی افراط سے بچایا ہے کہ اتنا ان کو معظّم و محترم بھی نہ بنا کہ قبلہ و کعبہ ہی قرار دے لے اور اپنے احوال، اقوال، افعال، عبادات، عادات، غرض تمام حالتوں میں انکا لحاظ اور ان کی رعایت رکھتے لگے کہ اس کا نام ربا و تصنع ہے اور اس سے حالات صافیہ مکرور عیب دار بن جاتے ہیں اور آزادی مبدل بغلامی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جہاں جہاں بھی مخلوق کی نظر جاتی ہے اس کی بناؤ سنگھار اور آراستہ کرنے کی اس کو فکر لگ جاتی ہے اور اسی لئے شیخ عبد اللہ قرشی فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنے اقوال و افعال میں حق تعالیٰ کے سننے اور دیکھنے پر اکتفا نہیں کرتا لامحالہ اس پر نمود کا دخل ہو جاتا ہے کیونکہ لوگوں کے دیکھنے اور سننے کی خواہش ہی کا نام نمود اور دکھاوا ہے، اور حضرت بشر حافی رحمہ فرماتے ہیں جس نے اپنی شہرت کو محبوب سمجھا ہے وہ ضرور ذلیل و رسوا ہوا ہے نیز فرمایا کہ اس کو آخرت کی جلالت کبھی نصیب نہ ہوگی جس کی خواہش ہوگی کہ لوگوں میں اس کی شہرت ہو نیز فرمایا اگر لوگوں میں قدر و منزلت کی طلب ہے تو اللہ کے نزدیک قدر و منزلت کی امید نہ رکھ۔ عوارف میں مذکور ہے کہ یہ جرّ ہے جس کا لحاظ رکھنے سے اعمال درست ہو جاتے ہیں، اور غفلت کرنے سے اعمال بگڑ جاتے ہیں میں ایک دن باب الحدید پر اپنے حضرت کے ساتھ تھا کہ آپ نے مجھ پر نگاہ ڈالی اور فرمایا جب تک رسول کی معرفت حاصل نہ ہو جائے کسی کو اللہ کی معرفت کی ہوس نہ کرنی چاہیے اور جب تک اپنے شیخ کی معرفت حاصل نہ ہو جائے کسی کو رسول کی معرفت کی ہوس نہ کرنی چاہیے اور شیخ کی معرفت نصیب نہیں ہوتی جب تک کہ لوگوں پر نماز جنازہ نہ پڑھ لے اور ان کو مردہ کی مثل سمجھ کر اپنی نظر نہ ہٹائے اور جب مخلوق اس کی نظر سے خارج ہو جاتی ہے اندر یہ کسی کی بھی پروا نہیں کرتا کہ دیکھ لیں تب کیا نفع اور نہ دیکھیں تب کیا نقصان، تو اس وقت اللہ کی رحمت ایسی طرح آتی ہے جہاں اس کا خیال دگمان بھی نہیں جاتا۔ اور شیخ کو بھی وہی مرید سمجھاتا ہے جو لوگوں کے دیکھنے کی پروا نہیں کرتا، کاغذ میں جب شکن پڑ جاتی ہے تو اس کو جس وقت تک اتنا ہی دوسرے رخ پر نہ موڑو اس کی شکن دور نہ ہوگی یہی حال اخلاق کا ہے کہ افراط و تفریط کے ہر دو پہلو سے بچنے کا نام اعتدال ہے، اور اطباء روحانی یعنی مشائخ کی خداقت و تربیت کا اسی پر مدار ہے کہ مرید کے جس پہلو کو جھیکا ہوا دیکھتے ہیں اس کی اصلاح کے لئے اتنا ہی مبالغہ کے ساتھ اس کو دوسرے پہلو اختیار کرنے کی تاکید کرتے ہیں کہ اس غلو کے بغیر موجودہ شکن کا جھیکاؤ رفع نہیں ہو سکتا چونکہ عام طور پر طبائع میں کبر کا غلبہ ہے اور نخوت و بڑائی مرکز خاطر ہے اس لئے حد سے زیادہ تواضع پر زور دیا جاتا ہے تاکہ اعتدال محمود پیدا ہو جائے ورنہ ظاہر ہے کہ تذلل بھی مذموم ہے اور اسی لئے شریعت نے بھیک مانگنا حرام قرار دیا ہے



اسی طرح نمود اور شہرت گویا اعمال کی موت ہے کہ ساری عبادتیں ضبط و ضبط ہو جاتی ہیں اور اس لئے فردوس ہے کہ مخلوق کو مثل مردہ کے سمجھ جو نہ دیکھتا ہے نہ سنتا ہے غرض منصفانہ فیصلہ وہی ہے جو فریقین کی پوری شہادتیں سننے کے بعد دیا جائے۔ اسی طرح ہر امر میں پسندیدہ وہ اعتدال ہے جس کے دونوں پہلو کی بدرجہ مساوی رعایت ہو۔ لہذا مصلحین اُمت کی تحریر یا تقریر میں کسی ایک پہلو میں اگر مبالغہ دیکھو تو ابھی فیصلہ نہ دو کہ یکطرفہ شہادت ہے دوسرے فریق کی شہادت سننے کا انتظار دیکھو اور اس کے بعد علماً و عملاً بآسانی صحیح نتیجہ پر پہنچ سکو گے۔ مخلوق کو مردہ سمجھنے میں دونوں پہلو کی پوری رعایت ہے کہ مردہ پر نہ تکبر ہوتا ہے اور نہ اس کے سامنے تذلل اس پر شفقت کی نظر اور نفع پہنچانے کی گردیدگی بھی ہوتی ہے اور اس سے خود نفع چاہنے کی نہ توقع ہوتی ہے کہ احتیاج نہ وہ اتنا حقیق ہے کہ جانوروں کی طرح گدھ گردن کو کھلا دیا جائے اور نہ اتنا محترم ہے کہ قبلہ حاجات بنایا جائے اور اس سے مراد یہ مانگی جائیں خود اس کی خدمت کرتے اور اپنے اللہ سے اس کی ندرج کی دعائیں مانگتے ہیں اور اپنی ضروریات میں اس سے بے نیاز بھی ہیں کہ یہ نہ دیکھتا ہے نہ سنتا ہے۔

وَإِنْ نَظَّمْ الْحَقُّ الْكِرَامَاتِ اسْتَطَاعَ	فَلَا تَبْدِيْنَ حَرْقًا لِّغَيْرِكُمْ مِنْ سَطَرٍ
سِوَى الشَّيْخِ لَا تَكْتُمُهُ سِرًّا فَوَائِدُ	بِأَحَدٍ كَشَفَ السِّرَّ بِحُرِّ عَمَلٍ بِمَحْسَرٍ

ترجمہ۔ اگر حق تعالیٰ تیری نظر کو مخلوق سے ہٹا کر اپنے اوپر قاصر فرمائے اور اس بنا پر تجھ پر رحمت الہیہ ہو کہ کرامتوں کی سطریں منظوم ہو جائیں اور مختلف قسم کے کشف اور خوارق عادات امور کا ظہور ہونے لگے تو اب ادب یہ ہے کہ اس کو مخفی رکھو اور کسی ایک سطر کا ایک حرف بھی کسی دوست پر ظاہر نہ کر۔ بجز شیخ کے کہ اس سے النبیہ کوئی راز بھی مت چھپا۔ کیونکہ وہ کشف اسرار کے مقام میں گویا دریا پر چل رہا ہے۔ یعنی ان کی حقیقت سے آگاہ اور دریائے کشف کا پیرا کہ ہے مطلب یہ ہے کہ شیخ چونکہ تیرے ان روحانی امراض سے جو راستہ قطع کرنے سے تجھ کو روک رہے تھے واقف ہے اور روحانی طبیب ہے اس لئے بڑی ہو یا بھلی کوئی حالت بھی اس سے چھپانی نہ چاہیے۔ عوارف میں لکھا ہے کہ مرید کو اپنے شیخ سے اپنا کوئی حال بھی مخفی نہ رکھنا چاہیے جو بھی اس پر حق تعالیٰ کا انعام ہو خواہ کرامت کا ظہور ہو یا قبولیت دعا ہو، یا کشف صادر ہو، سب بیان کر دینا چاہئے اور اگر کوئی بات ایسی جس کے ذکر کرنے میں شرم آتی ہو تو اشارۃً و کنایۃً اس کا اظہار کر دے۔ کیونکہ مرید جب کوئی بات اپنے دل میں رکھتا ہے اور شیخ پر ظاہر نہیں کرتا تو اس کے باطن پر ایک گرہ لگ جاتی ہے۔ اور جب شیخ سے کہہ دیتا ہے تو وہ گرہ کھل جاتی ہے اور شیخ کو یہ مناسب ہے کہ مریدین کے اسرار کو اور کشف و کرامت وغیرہ جو کچھ بھی حق تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا ہے ان کو محفوظ رکھے اور کسی پر اس کا اظہار نہ کرے، کہ مرید کے اسرار پروردگار اور شیخ سے آگے نہ بڑھنے چاہئیں۔ اس کے بعد مرید کو چاہئے اور آگاہ کرے کہ یہ چیزیں مقصود نہیں ہیں



اور ان سے دل بستگی اللہ سے غافل بنانے والی چیز ہے ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ دین کے متعلق ہو یا دنیا کے جو کوئی بات بھی تم کو پیش آیا کرے اس کا مجھ سے ذکر کر دیا کرو حتیٰ کہ کوئی مصیبت ہو جائے تو سکر بھی نہ چھپایا کرو۔ اس رفاقت سے نفع کیا جس میں ایک کا حال دوسرے سے چھپا رہا، دیکھو میں بھی تو اپنا کوئی حال تم سے نہیں چھپاتا۔ اس کے بعد اپنے واقعات کا ہم سے تذکرہ کیا کرتے تھے کہ بچپن کے واقعات اور امور متعلقہ بالعوادت تک کو بیان فرما دیا کرتے اور کہا کرتے تھے کہ اگر میں اپنے حالات پر تم کو مطلع نہ کروں تو اللہ مجھ سے باز پرس فرمائے گا اور مجھے سزا دیگا اس لئے کہ تم میرے ساتھ حسن ظن رکھتے ہو۔ پس ذرا ٹھہرو اور میرے وہ اندرونی حالات بھی سن لو تم کو معلوم نہیں اس لئے کہ تم میرے ساتھ رہے اور اب مجھے اس کا ہدیہ لینا اور اس کا لایا ہوا طعام کھانا بھی جائز ہو گا۔ اور جس کا جی چاہے چلا جائے کہ اندرونی حالات سے میرا سکوت کرنا گویا تم کو دھوکا دینا اور حقیقت پر پردہ ڈالنا ہے جو کہ حرام ہے اور مرید کو تو اصلاح حال کی ضرورت ہے پھر اس کو اپنے کسی مرض کا طبیب روحانی سے چھپا کیسے صحیح ہو سکتا ہے

﴿وَفِي الْكَشْفِ أَنْ كُشِفَتْ رَابِعَةُ الْكَلْبِ | لِيَتَوَضَّعَ مَا كُشِفَتْ مَبْتَدَأُ التَّعْهَرِ |

ترجمہ :- اور اگر تجھ کو کوئی بات مکشوف ہو تو اپنے شیخ سے مراجعت کر یعنی جو بات پوچھنی ہو وہ بے تکلف پوچھ کر تیرے امیر مکشوف کی حقیقت واضح کرنے میں شیخ کو رگ رانی و ناراضی نہ ہوگی، بلکہ مسرور ہوگا

﴿وَلَا تَنْفِرْ دَعْنَهُ بِوَأَقْعِيَةِ جَبَرَاتٍ | فَهِيَ غَشَا عَيْنَاكَ وَالسَّمْعُ فِي وَفَرَا |

ترجمہ :- اور اگر کوئی واقعہ جاری ہو تو اس کو بھی شیخ سے مخفی مت رکھو۔ کیونکہ رشیخ بصارت صحیحہ اور سماعت حقہ رکھتا ہے اور تیرمی آنکھوں میں کمزوری ہے اور سماعت میں ثقل ہے عوارف المعارف میں نکھتا ہے کہ سالک فکر کو آئندہ ہونے والا کوئی معاملہ کبھی صورت مشابہ میں نظر آتا ہے اور اس کا نام راصطلاح صوفیہ میں، واقعہ ہے اور کبھی بغیر صورتہ مشابہ کے نفس حقیقت نظر آتی ہے اور اگر خواب دیکھا کہ سانپ پر حملہ کیا اور اسی کو مار دیا اس کو داب لیا۔ اس کو تعبیر کی ضرورت نہ ہوگی اور اگر خواب دیکھا کہ سانپ پر حملہ کیا اور اسی کو مار دیا اس کی تعبیر کی ضرورت ہوگی اور تعبیر یہ ہے کہ سانپ صورتہ مشابہ ہے دشمن کی اور اس کو مار ڈالنا صورتہ مشابہ ہے فتح و غلبہ کی۔ پس جس طرح خواب میں ایک شے کا ظہور کبھی بصورتہ مشال ہوتا ہے اور کبھی نفس حقیقت کا شاہد ہوتا ہے اسی طرح بجاالت بیداری ایک شے کا ظہور کبھی پردہ مشال میں ہوتا ہے اور کبھی اصل واقعہ بخشبہ نظر آتا ہے پہلے کا نام واقعہ ہے اور دوسرے کا نام کشف ہے۔ پھر کشف کبھی بواسطہ نظر ہوتا ہے اور کبھی بواسطہ سماعت۔ اور کبھی رظاہری کان سے نہیں بلکہ، اپنے باطن و اندرون میں ایک شے مسموع ہوتی ہے اور کبھی باطن میں بھی نہیں بلکہ ہوا میں آواز سنائی دیتی ہے جیسے ہاتھ عینبی کی آواز یہ سب صورتیں حق تعالیٰ کی طرف سے پیش آنے والے معاملہ کی اطلاع ہے اور خواہ اس کے متعلق ہو یا کسی دوسرے کے، ارادہ الہیہ اور امر مقدر کا اظہار



ہوتا ہے۔ مگر ان سب سے بالا وہ مکاشفہ ہے جو خالص یقین کے ذریعہ حاصل ہو کر نور ایمان کی وجہ سے قلب پر کسی امر کا جزم و یقین وارد ہو جائے، کیونکہ دیگر مکاشفات ملحدین فلاسفہ و ہر یہ اور جوگیوں کو بھی حاصل ہو سکتے ہیں اور ان کے لئے استدراج بنتے ہیں کہ ان کو کشف سمجھ کر اپنی حالت کے مستحسن ہونے کا یقین کر لیتے اور اپنے کفر و ضلال پر جھبے رہتے ہیں حتیٰ کہ اسی پر مرتے اور وبال و عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں لہذا سالک کو کشف پر مغرور نہ

ہونا چاہیے۔ اور یاد رکھنا چاہیے کہ جب تک اللہ جل جلالہ کے خوف و خشیتہ اور ہد و تقویٰ کا حق ادا نہ کرے گا نہ ہو ایا اُن کا کچھ نفع و یگانہ پائی پر چلنا کچھ مفید ہوگا۔ اور اسی لئے کشف ہو یا واقعہ اپنے شیخ پر ظاہر کرنا ضروری ہے کہ وہ حقیقت شناس اور محسن مشفق ہے۔ اصل حقیقت پر آگاہ و متنبہ کرے گا اور اس پر قاصر اور قائم نہ رہنے دیگا نیز کبھی صورت مشابہ بھی نتیجہ سے خالی اور ایسی بے سود ہوتی ہے جیسے اصفا ث احلام اور خبیلات محضہ۔ کیونکہ واقعہ کے لئے بھی شرط ہے کہ ذکر اللہ میں اخلاص ہو و نمود و شہرت کا دخل نہ ہو (پھر اثناء ذکر میں استغراق ہو و ماسوی اللہ کی طرف

التفات و توجہ نہ ہو) اور اخلاص و استغراق کی علامت یہ ہے کہ دنیا سے زہد و بے نیازی ہو اور تقویٰ کی (جس کا درجہ فتویٰ سے بھی بالا ہے کہ شرعی مشتبہات سے بھی مثل محرمات کے پرہیز کرے) ہر وقت و ہر خطم پابندی ہو پس یہ امر آداب مریدین میں داخل ہے کہ کوئی شے بذریعہ کشف معلوم ہو یا بذریعہ واقعہ اس کو شیخ سے پوشیدہ نہ رکھے کہ اسی کا دروازہ بسوی خالق چومکہ مفتوح ہے اس لئے اگر واقعہ اور کشف صحیح ہوگا تو اس کو نا مذکرے گا اور اگر اس میں کوئی شبہ ہوگا تو اس کو زائل کر لیا۔  
وَفَرَّ إِلَيْهِ فِي الْمَهَاتِ حَلِيمًا ۖ فَإِنَّكَ تَلْقَى النُّصْرَ فِي فَلَاكَ الْفَتَى

ترجمہ :- اور اپنی تمام ضروریات میں رفقاء وہ دینی ہوں یا دنیوی، اپنے شیخ ہی کی طرف بھاگ کہ اس بھاگنے ہی میں تجھ کو نصرت ملے گی حضرت سہروردی قدس سرہ لکھتے ہیں مرید کہہ سمجھنا چاہیے کہ شیخ ایک دروازہ ہے جس کو حق تعالیٰ نے اپنی بارگاہ رحمت کی طرف کھول رکھا ہے کہ اسی کے واسطہ رافعہ و وصول ہوگا رحمت الہیہ تک اور اسی کے ذریعہ نزول رحمت ہوگا مرید پر اور شیخ پر لازم ہے کہ مرید کو اللہ کی امانت سمجھے اور جس طرح رجوع الی اللہ کرتا ہے اپنی ضروریات دینیہ و دنیویہ میں اسی طرح اللہ کی طرف رجوع کرے مرید کی ضروریات دینیہ و دنیویہ میں۔ نیز مرید پر لازم ہے کہ شیخ پر اپنی ضروریات پیش کرنے میں ادب و احترام اور وقت و موقع کی رعایت رکھے کہ جب شیخ کو اپنی طرف متوجہ اور بات سننے کے لئے آمادہ و مستعد پائے اس وقت ذکر و درنہ خاموش رہے اور عجبت نہ کرے۔

وَلَا تَكُ مِمَّنْ يَحْسِنُ الْفِعْلَ عِنْدَكَ ۖ فَيُفْسِدُ الْأَاتَ لِيَأْتِيَ الْكَسْرَ

ترجمہ :- اور ان لوگوں میں سے نہ بن جو اپنے عمل کو اچھا سمجھتے ہیں کہ یہ عجب و خود ستائی ہے جس سے اچھا عمل بھی فاسد و خراب ہو جائے یا کرتا ہے ہاں البتہ شکستگی کی طرف لپکے اور یوں سمجھے کہ میں کیا اور میرا عمل کیا۔ میں خود بھی اللہ کا پیدا کیا ہوا بندہ ہوں اور اعمال بھی سارے اسی کی مخلوق ہیں اس لئے اپنے لطف و کرم سے مجھ کو واسطہ اور



محل بنادیا اعمال حسنہ کا۔ پس اس رجوع الی اللہ سے عجب اور اپنے افعال کا مستحسن سمجھنا جو کہ مفید اعمال تھا۔  
 جاتا رہے گا اور اعمال اب مستند بن جائیں گے بلکہ عجب کے بدلہ حق تعالیٰ سے حیا و شرم، ناراضگی کا خوف اور نعمت پر شکر و توبہ  
 ہوگا۔ غرض حق تعالیٰ کا قول ہے کہ عجب اور اپنے فعل و عمل پر ناز علامت ہے عمل کے مقبول نہ ہونے کی۔ حتیٰ اگر بعض کا قول ہے  
 کہ عمل کے مقبول ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس کو قبول جائے اور اس سے بالکل ہی نظر مٹ جائے (چہ جائیکہ اس کو اچھا سمجھنا  
 اور اس کی دلیل یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ ۚ وَعَمَلُكَ نِيكَ كَوْثَرُ تَعَالَى اٹھایا کرتا ہے یعنی بندہ  
 کے پاس اس کی یادداشت بھی باقی نہیں رہتی اور جب اس کی نظر اس پر پڑ رہی ہے تو معلوم ہوا وہ اسی کے پاس  
 موجود ہے حق تعالیٰ کی طرف اٹھا نہیں۔ اور جب نظر سے غائب و نسیا منیا ہو گیا تو معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی طرف اٹھ گیا اور  
 مقبول ہو گیا ہے۔

وَمَنْ حَلَّ مِنْ صَدَقِ الْإِثَابَةِ مَنَزَلًا ۖ يَرَى الْعَيْشَ فِي الْأَفْعَالِ وَهُوَ مُسْتَبْرَأٌ

ترجمہ اور جس کو سچا توجہ الی اللہ کا مرتبہ نصیب ہو جاتا ہے وہ باوجود رعیت کے، بری ہونے کے اپنے اعمال میں عیب پایا  
 کرتا ہے یعنی رجوع الی اللہ کا مقام جن کو حاصل ہوتا ہے وہ باوجودیکہ صورت و سیرۃ ظاہر و باطن ہر طرح اپنے اعمال کو  
 شریعت کے موافق ادا کرتے اور ارکان و شرائط ہی نہیں بلکہ سن و آداب میں کمال یعنی پورا کر لیتے ہیں، مگر پھر یوں سمجھتے ہیں  
 کہ حق ادا نہیں ہوا اور اعمال ناقص صادر ہوتے کہ ممکن ہے کوئی ایسا عیب اس میں موجود ہو جس کا وہ علم نہیں ہوا شیخ  
 ابو یعقوب اسحاق بن محمد نہر جویری فرماتے ہیں اس کی علامت و شناخت کہ حق تعالیٰ تمامی احوال میں بندہ کا فیصل و کارزار  
 بن گیا ہے یہ ہے کہ بندہ کو اپنے اخلاص میں کوتاہی نظر آئے اور ذکر میں غفلت، اور صدق میں کسی اور شاہد میں  
 فتور، اور اظہار فقر و احتیاج میں قلت مراعاة و بے احتیاطی محسوس ہو کر اپنے تمامی احوال ناقص و ناپسندیدہ دکھائی  
 دیں۔ اور ہر حال اللہ کی طرف افتقار و احتیاج زیادہ ہوتی رہے۔ حضرت ابو بکر اسماعیل بن بنید فرماتے ہیں  
 عبودیت میں قدم نہیں پڑ سکتا جب تک کہ اپنے تمامی افعال ریا و نحوہ اور تمامی احوال دعویٰ بلکہ دلیل نظر نہ آئی  
 کیونکہ نفس کو محبوب ہمارا وہ چیز ہے جو شر کی ضد ہو اس لئے اگر نفس سے عمل کو اچھا اور شر سمجھا تو اس کے فطری انتفا  
 کے موافق وہ درحقیقت بد اور شریر ہوا، حق تعالیٰ فرماتا ہے وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ مَا ذُكِرْتُمْ مِنْ أَحَدٍ أَبَدًا  
 اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہو تو کوئی بھی تم میں کبھی اچھا نہیں بن سکتا نیز فرمایا ہے۔ وَمَا أَمَرْتُ نَفْسِي  
 أَنْ أَنْفُسَ لَدَا مَائَةٍ ثَمَانٍ وَسِتِّ مِائَةٍ يَوْمَ يُنْفَخُ السُّنْبُوتُ ۚ وَمَا أَمَرْتُ نَفْسِي أَنْ أَنْفُسَ لَدَا مَائَةٍ ثَمَانٍ وَسِتِّ مِائَةٍ  
 کہ تو طبیعت ہی ہے بدی کا حکم دینا۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں بجز اس کے فضل کے ہمارے پاس کچھ نہیں ہے اور اس کی  
 پردہ پوشی کے سہارے ہم تو جبار ہے ہیں اگر کہیں پردہ اٹھا دے تو وہ ہماری گندمی حالت ظاہر ہو کہ  
 الامانات والحفیظ اس بنا پر اکابر نے اپنے صحیح عمل سے بھی بیزاری کا اظہار کیا ہے، چہ جائیکہ جن اعمال



میں نقص ہو چنانچہ حضرت ابو یزید فرماتے ہیں ایک بار کی تسہیل اور کلمہ لا الہ الا اللہ پڑھنا بھی اگر (عیسے) سالم و صاف ثابت ہو جائے تو میرے لئے بسا غنیمت ہے اور پھر مجھے دیگر اعمال کی پروا بھی نہ ہو حضرت ابوسلیمان دارانی فرماتے ہیں کہ مجھ سے ایک عمل بھی ایسا نہیں ہوا جس پر مجھے اجر و ثواب کی توقع ہو واللہ اعلم (حضرت ممدوح کے مشائخ) ارشاد فرماتے ہیں کہ مجھے دس اولیاء اللہ کی میراث نصیب ہوئی ہے اول حضرت عمر بن محمد ہواری رحمۃ اللہ علیہ کہ روضہ علی بن حزم کے متونی کو سجادہ نشین تھے اور ہم مزار کے اوقات اور منکر خانہ کے مصروف تھے۔ میں متعدد لوگوں کو شیخ بنا چکا تھا۔ مگر ان میں سے ایک بھی ستر الہی کا حامل نہ تھا کھانا لینے کے لئے روضہ پر جاتا تو سجادہ صاحب کو دیکھا کرتا تھا ان کی حالت مجھے اچھی معلوم ہوتی اور میں نے ان سے تلیقین اور ادکی درخواست کی مگر انہوں نے ٹال دیا جون جوں وہ تغافل برتتے رہے دوں دوں میرا شوق یزید ہوا آخر ایک شب میں روضہ ہی میں پڑ رہا اور صبح کو حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کا وہ واقعہ پیش آیا جو شروع کتاب میں درج ہو چکا ہے حضرت خضر علیہ السلام چونکہ سجادہ صاحب کو میرے متعلق وصیت فرما چکے تھے اس لئے انہوں نے مجھ پر خاص توجہ فرمائی اور میں نے ان سے اکتساب کیا حتیٰ کہ ان کی وفات پر ران کے روحانی انوار و ستر الہی کا وارث ہوا ایک مرتبہ میں حاضر تھا کہ حضرت سجادہ صاحب کسی شخص نے سوال کیا اوراد جو مشائخ تلیقین کیا کرتے ہیں ان کا کیا فائدہ ہے جبکہ سب کتابوں میں درج ہیں اور ہر شخص از خود پڑھ سکتا ہے؟ فرمایا سچوں کی تلیقین کا فائدہ دیرا کرتے ہو جبکہ سب جھوٹوں کی تلیقین کا؟ سائل نے کہا کہ سچے اولیاء کی تلیقین کا فائدہ دریافت کرتا ہوں۔ فرمایا کہ حق تعالیٰ نے امت محمدیہ کے دین اور ایمان کی حفاظت فرمائی ہے بذریعہ شریعت ظاہریہ کے کہ اس پر عمل کرے گا تو ایمان جو باطنی شے ہے محفوظ رہے گا (پس اگر ظاہری اعمال پورے کئے مگر قلب نور ایمان سے خالی رہا تو ایسا ہے جیسے پوست موجود ہے مگر گری نہیں۔ حالانکہ پوست سے مقصود گری ہی کی حفاظت تھی) اور سچے ولی کا باطن چونکہ مشاہدہ الہیہ سے معمور ہوتا ہے۔ اس لئے عامی آدمی جب شیخ کامل سے ملے بغیر از خود مثلاً کلمہ توحید پڑھتا ہے تو محض اس کی زبان ہے لا الہ الا اللہ کہتی ہے اگر دل اس کا غافل ہوتا ہے اور ولی جب کلمہ پڑھتا ہے تو ہا من سے پڑھتا ہے کیونکہ اس کو بڑے درجہ کا مشاہدہ حاصل ہے اور وہ وحدانیت حق تعالیٰ کو گویا آنکھ سے دیکھ رہا ہے اس کی مثال ایسی سمجھو جیسے ایک شخص پیاس میں گرم پانی پئے اور کہے الحمد للہ دوسرا پیاسا بروت کا ٹھنڈا پانی پئے اور کہے الحمد للہ اس کا دل اور زبان دونوں نے شکر خدا ادا کیا اور پہلے نے صرف زبان سے کہا ہے مگر دل نے نہیں کہا، اس لئے جب شیخ اپنے مرید کو اسی کلمہ توحید یعنی ذکر حق اثبات کی تلیقین کرتا ہے تو اس کی حالت مرید کے اندر سرایت کرتی ہے اور وہ نور ایمان میں برابر ترقی پاتا رہتا ہے یہاں تک کہ مقدر ہوتا ہے تو اپنے شیخ کے مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے (جیسے ان متواتر بار بار مقناطیس سے متاثر ہو ہو کر خود مقناطیس بن جاتا اور دوسرے لوہے کو اپنی طرف کھینچنے



لگتا ہے اس کے بعد آپ نے مثال کے درجہ میں یہ مشہور حکایت نقل فرمائی کہ ایک بادشاہ تھا اس کو اپنے رُکے  
 کے ساتھ بہت محبت تھی۔ شاہزادہ بیمار ہو گیا تو بادشاہ نے پریشان ہو کر طبیعوں کو جمع کیا اور دھمکایا کہ اگر میرا  
 بچہ تندرست نہ ہوا تو تمہارا سرے سے اچھانہ ہوگا طبیعوں کی بالاتفاق رائے یہ ہوئی کہ شاہزادہ کو گوشت کھانے سے  
 پرہیز کرنا ضروری ہے چنانچہ شاہزادہ سے کہا گیا کہ گوشت کھانا چھوڑ دیں مگر شاہزادہ نے صاف انکار کر دیا اور  
 اور کہا کہ چاہے دم نکل جائے مگر گوشت نہیں چھوڑ سکتا۔ اطباء حیران پریشان ہو گئے رُکے جو اصل علاج  
 ہے وہ قبول نہیں ہوتا اور عدم صحت پر سزا و زلت کا سامنا ہے، اس لئے بار بار الحاح کے ساتھ التجا کی اور  
 چاہا کہ کسی طرح شاہزادہ اس پر عمل کرے مگر وہ نہ مانا اور ان کی نصیحت سے اس کی نفرت ہی بڑھتی رہی آخر ایک  
 طبیب نے گھر آکر غسل کیا اور اللہ جل جلالہ کے حضور میں گڑ گڑایا اور نیت کی کہ جب تک بیمار شاہزادہ گوشت  
 چھوڑے رکھے گا اس وقت تک میں بھی چھوڑے رکھوں گا۔ اور گوشت نہ کھاؤں گا اس کے بعد شاہزادہ کے پاس  
 آکر عرض کی کہ تاحصت چند روز کے لئے گوشت کھانا چھوڑ دے رُکے چونکہ نصیحت محض زبان سے نہ تھی بلکہ دل سے  
 تھی کہ قول و عمل باہم موافقت کھا رہے تھے اس لئے شاہزادہ نے فوراً کہنا مان لیا اور بہت جلد تندرست ہو گیا دوسرے  
 طبیعوں کو اس پر بڑی حیرت ہوئی کہ کیا جادو کر دیا مگر جب اس نے بتایا کہ میں نے یہ صورت اختیار کی تب ان کی سمجھ میں  
 آیا اسی طرح شیخ چونکہ کلمہ توحید کا قائل بھی ہے اور عامل بھی لہذا اس کی تعلیم موثر ہو کر دوسرے کو بھی عامل بنادیتی ہے  
 نیز حضرت نے فرمایا کہ اہل معرفت ادلیا جب اہل حجاب (اور غافل قلوب والی) فعات پر نظر ڈالتے اور ان میں کسی ایک ذات  
 کو طہارت اور الہی کی طاقت رکھنی والی دیکھتے ہیں تو اس کی تربیت اور فکر وغیرہ کی تلقین میں ہر وقت لگے رہتے ہیں  
 کہ شیخ کا مقصود صرف وہ ایک ہی شخص ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی کوئی دوسرا اگرچہ حل ستر الہی کے ناقابل  
 ہوتا ہے لیکن تلقین ذکر کا طالب ہوتا ہے تو اس سے بھی انکار نہیں کرتے کیونکہ مایوس کرنا ان کو پسند  
 نہیں یہی وجہ ہے کہ مشائخ کے پاس جو کوئی بھی آتا ہے خواہ وہ ستر الہی کو اٹھائے یا نہ اٹھائے ذکر کی اسکو تلقین  
 کر دیتے ہیں جیسے مدرس کے طلبہ کہ ہونہارا اور عالم بن کر نور چمکنے والا ان میں ایک دو ہی ہوتا ہے اور اسی لئے اس  
 پر استاذ کی خاص نظر ہوتی ہے مگر جماعت میں داخلہ جو کوئی بھی آدے اس کا ہو جاتا ہے اور درس میں بیٹھنے اور  
 تقریر سننے کی اجازت اس کو مل جاتی ہے، نیز ایک فائدہ اور بھی ہے جو آخرت میں ظاہر ہوگا وہ یہ کہ قیامت کے دن سرور عالم  
 و عالمیان کے ہاتھ میں نور احمد ہوگی جو نور ایمان (کی صورتہ مثالیہ) ہے اور تمامی مخلوق خواہ آپ کی امت ہو یا غیر  
 امت، حتیٰ کہ انبیاء و رسل بھی سب آپ کے پیچھے ہوں گے کہ ہر امت اپنے نبی کے جھنڈے کے نیچے ہوگی اور (جو مکہ پر نبی  
 کے ایمان کا افاضہ نور ایمان محمدی سے ہوا ہے لہذا ان کے نبی کا جھنڈا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے سے  
 مستفید و مستعد ہوگا۔ اس طرح پر تمامی انبیاء مع اپنی امتوں کے آپ کے ایک شانہ کی جانب ہوں گے



کہ ان کا استفادہ عالم ارجح میں ہوا تھا اور آپ کی اُمتِ مطہرہ آپ کے دوسرے شاہ کی جانب ہوگی کہ ان کے استفادہ کا تعاقب عالم دنیا اور روح مع الجسد سے ہے اور امتِ محمدیہ میں حضراتِ انبیاء کی شمار کے موافق اولیاء ہوں گے جن کے ہاتھوں میں انبیاء کے جھنڈوں کی مثل جھنڈے ہوں گے اور ان کے تابعین ان کے تابعین ہوں گے کہ یہ اولیاء مستفید و مستمد ہوں گے ذاتِ محمدی سے اور ان کے اتباع مستفید ہوں گے خود ان سے جیسا کہ حضراتِ انبیاء کا حال ہوگا کہ وہ نوریں گے ذاتِ محمدی سے اور ان کے امتیں نور حاصل کریں گی اپنے اپنے نبی سے پس مرید اگر سرِ الہی کی طاقت نہیں بھی رکھتا تھا رتبہ بھی تعلق بیعت اور اتباعِ شیخ کی وجہ سے، اپنے اس شیخ سے نفع ہوگا۔ جس نے اس کو ذکر تلیقین کیا تھا۔ مگر یاد رکھو کہ شیخ کے محض ذکر تلیقین کر دینے اور مرید کے محض زبان سے ذکر کر لینے سے کوئی نفع نہ ہوگا جب تک کہ اللہ اور اس کے رسول، فرشتوں، اس کی کتابوں پر ایمان لانے کی کیفیت شیخ سے نہ سیکھے اور فی الحقیقہ کسی درجہ کا باطنی نفع حاصل نہ کرے ورنہ محض زبانی تلیقین اور نسانی ذکر تو ایسا ہے جیسا کتاب میں دیکھ کر معلوم کر لیا اور پڑھنا شروع کر دیا، طبیعوں ہی کے مذکورہ قصہ کی طرح ایک واقعہ ہے کہ ایک مملوک غلام نے ایک بزرگ سے خواہش کی کہ میرے آقا سے سفارش فرما دیجئے کہ مجھے آزاد کر دے۔ چونکہ وہ آپ کی بات بہت مانتا ہے اس لئے آپ کی ذرا زبان ہلانے سے میرا کام بن جائے گا شیخ چپ ہو گئے اور کچھ جواب نہ دیا حتیٰ کہ ایک سال سے زائد گزر گیا۔ آخر ایک دن غلام کو ساتھ لے کر اس کے آقا کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ اس کو آزاد کر دو چنانچہ اس نے قبول کیا اور غلام کو آزاد کر دیا۔ غلام بہت خوش ہوا اور شیخ سے کہنے لگا کہ حضرت نے اتنی تاخیر فرمادی۔ اگر اسی وقت سفارش فرما دیتے تو میں سال بھر پہلے ہی آزاد ہو جاتا۔ شیخ نے فرمایا کہ میں کسی سے کوئی بات نہیں کہا کرتا جب تک کہ خود اس پر عمل نہ کروں اور جب تم نے مجھے سفارش کی خواہش کی تھی تو اس وقت میرے پاس کوئی غلام نہ تھا جسے آزاد کر دیتا اور خود عامل بن کر تمہاری آزادی کے لئے تمہاری آزادی کے لئے کہتا، مگر میں اس وقت سے برابر کماتا اور جوڑتا رہا حتیٰ کہ (سال بھر میں) ایک غلام خریدنے کی رقم میرے پاس جمع ہو گئی تب میں نے غلام خریدا اور اس کو آزاد کیا اور اس کے بعد میں نے تمہارے آزاد کرنے کی سفارش کا لفظ تمہارے آقا کے سامنے زبان سے نکالا چنانچہ اس نے قبول کر لیا۔ ادا گریں خود غلام آزاد کرنے سے قبل تمہارے آقا سے سفارش کرتا تو یہ خیال یہ ہے کہ وہ گرز نہ مانتا ہے۔ پس یہ ہے ضرورتِ بیعت کی بہت فرق ہے خدا کو ایک کہنے میں اور خدا کو ایک سمجھنے میں۔

مفرد سخن مشوک توحید خدا : واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

غیر عامل و اعط کا دغظ بھی موثر نہیں ہوتا بیکار جاتا ہے پھر کیا پوچھنا باطنی عمل اور حبِ خدا اور رسول کا کہ جس کے قلب کی انگلیٹھی میں خود عشق کی چنگاری نہ سلگ رہی ہو وہ دوسرے کے قلب میں آتشِ محبت کیسے سلگتا



سکتا ہے۔ اس لئے جہاں بیعت ہونے کی ضرورت ثابت ہوئی وہیں یہ بھی محقق ہوا کہ جب تک شیخ صاحب کمال اور اہل دل نہ ہو اس وقت تک بیعت کو رسم سمجھ کر ادا کرنا بے سود ہے واللہ اعلم۔  
 دوسرے شیخ عبداللہ برنادی ہیں جو اقطاب میں سے تھے اور ان سے ملاقات اور اکتساب کا تذکرہ شروع کتاب میں ہو چکا ہے آپ نے فرمایا حضرت برنادی قدس سرہ حق تعالیٰ کے اسماء حسنہ میں ستر ناموں کے انوار سے سیراب کئے گئے تھے۔

سوئم حضرت یحییٰ صاحب البحریدہ کہ اقطاب میں سے تھے اور شریعت محمدیہ کے ظاہر و باطناً بہت زیادہ متبع تھے مزارات صالحین کے زائرین کی حاجات ان کے تحت تصرف ہیں کہ ان کی جن مرادوں کا پورا ہونا مقدر ہو چکا ہے وہ ان کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں میں نے ایک دن مزارات صلیحاء کے متعلق آپ سے گفتگو کی کہ اکثر لوگ مزاریں مانگنے کے لئے مزاروں پر جاتے ہیں، کوئی اولاد مانگنے اور کوئی اپنے بیمار عزیز کی شفا و صحت کے لئے اور کوئی دست رزق کے لئے اور کوئی دفع ہتم و مصیبت کے لئے اور اکثر کامیابی ہوتی ہے اس کا کیا سبب ہے؟ فرمایا اُمت محمدیہ کے قلوب کی عند اللہ بڑی نشان ہے۔ اگر کسی ایسی جگہ کے متعلق جہاں کوئی بھی دفن نہ ہوا ہو تلوٰب اُمت محمدیہ کا مجتمعاً یہ گمان قائم ہو جائے کہ یہ دلی کا مزار ہے اور وہاں آکر وہ اللہ کے سامنے گر گڑا تے اور دعائیں مانگنے لگیں تو ان کی دعائیں بھی جلد قبول ہوتے لگیں گی رجبہ جابیکہ کسی جگہ اللہ کا کوئی ولی واقعی مدفون ہو، کہ یہ اثر اجماع قلوب اُمت کا ہے۔ صاحب مزار کو اس میں کوئی دخل نہیں اور آج کل اس خدمت کے متولی و متصرف ہمارے حضرت مولانا یحییٰ صاحب البحریدہ ہیں اور اولیاء و اموات کی خیر صحبت نہیں۔ زندہ اولیاء میں بھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص لوگوں کے نزدیک مشہور ولی سمجھا جاتا ہے حالانکہ اس کو ولایت کی ہوا بھی نہیں لگی۔ مگر اس کا توسل پکڑ کر اللہ سے دعائیں مانگی جاتی ہیں اور وہ جلد قبول ہوتی ہیں۔ اس کی حقیقت یہی ہے کہ حق تعالیٰ نے قلوب اُمت کے اجتماعی خیال کا احترام فرمایا اور اہل تصرف (اقطاب) کے ہاتھوں (حسب مشیت) ان کی مرادیں پوری فرمادیں مگر لوگوں نے سمجھا کہ یہ اس مشہور ولی کی بزرگی اور مقبولیت کا اثر ہے، حالانکہ حضرات اہل تصرف نے اس نام کے ولی کو ایک گڈا بنا کر کھڑا کیا ہے جیسے کاشتکار اپنے کھیت میں پزند اڑانے کے لئے آدمی کا ڈھانچ بنا کر کھڑا کر دیتا ہے کہ چڑیاں اس کو آدمی سمجھ کر پاس نہیں آتیں اور دُور بھاگتی ہیں۔ حالانکہ یہ فعل درحقیقت کاشتکار کا ہے نہ کہ اُس مورت کا اسی طرح تحت مشیت الہیہ مرادیں پوری کرنا اقطاب زمین صاحبان خدمت کا کام ہے مگر عوام سمجھتے ہیں کہ یہ فعل اس کا ہے جس کو ہم ولی کامل سمجھ رہے ہیں، اور اس نام کے ولی کو کھڑا اس لئے کیا ہے کہ اس جیسے اہل ظلمت اس کے پاس جمع امدادی کے معتقد بنے رہے اور اہل تصرف خود مخفی دستور ہیں ان پر ظاہر ہوا کیونکہ وہ اہل حق ہیں اور اہل ظلمت میں حق کو سمجھ (اور قبول کرتے) کی طاقت نہیں ہے رجب دنیا داروں اور ضعیف العقیدہ



مسلمانوں کے قلوب کا محض اس وجہ سے کہ ان میں فی الجملہ اثر ہے تعلیم محمدی کا اور وہ منسوب ہیں ذات محمدی کی طرف کہ اُمت کہلاتے ہیں محبوب رب العالمین کی عند اللہ یہ احترام ہے کہ دین نہ سہی دنیا ہی کی مرادیں مل جائیں تو کیا پوچھنا صلیا و علما و اولیاء اُمت کے قلوب کا کہ وہ مجتہد کسی امر مثلاً تقلید ائمہ یا تربیت شیخ و تعلیم تصوف کو حق سمجھ لیں جس کا نام اجماع اُمت ہے تو اُس کی عند اللہ کیا شان ہوگی اور منافع دینیہ کا اس پر منجانب اللہ کیا ترتیب ہوگا) حضرت ممدوح نے فرمایا کہ ایک مسافر راستہ میں بعد مغرب ایک خطرناک مقام پر پہنچا کہ پہاڑ کی گھاٹی تھی اور درحقیقت ڈھلوان اس کو لوٹنے کی نیت سے یہاں بھیٹے ہوئے تھے۔ ایک ورے ہی کنارہ پر اور دوسرا وسط میں۔ یہ شخص کسی ایسے پیر کا مرید تھا جس کے پاس کچھ بھی نہ تھا جب اس نے گھاٹی میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تو پیر کا نام لے کر کہنے لگا اے میرے فلاں حضرت میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جاہ کا آپ کے سامنے واسطہ پیش کر کے التجا کرتا ہوں کہ اس گھاٹی سے مجھے باطن قدامان پار کرادو اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ حاضری کے وقت آپ کی نذر پیش کروں گا ایک اہل نصرت نے اس کی فریاد کو سنا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جاہ شریف کا توسل جو اُس نے اپنے نااہل پیر کے سامنے پیش کیا تھا ان کے کانوں میں پڑا تو اس کی عظمت و احترام کے سبب اُس مسافر کی حاجت پوری کئے بغیر چارہ نہ دیکھا اس لئے خود نفس نفیس اس کے ساتھ ہو لئے اور اس کے قلب میں سکون و اطمینان ڈال دیا حتیٰ کہ ساری گھاٹی کو عبور کر لیا اور پیر کے کنارہ پر پہنچا کر چھوڑا مگر اس مسافر نے آنکھوں دیکھا اور نہ اُنہوں نے اپنے آپ کو ظاہر کیا اور دونوں کو کو حق تعالیٰ نے اندھا بنا دیا اور وہ راستہ قطع کرنے والے مسافر کے ساتھ کچھ بھی نہ کر سکے۔ مسافر کو یقین ہو گیا کہ یہ میرے پیر روشن ضمیر کا کام تھا چنانچہ وہ جب ان کی خدمت میں پہنچا تو حسب وعدہ چار اشرفیاں نذرانہ کی بھی پیش کیں اس میں پیروں کے لئے بھی عبرت و نصیحت ہے کہ ان کے مریدوں کو ایسے واقعات پیش آویں تو اپنا کمال نہ سمجھیں اور نذر نہ کریں کیونکہ ممکن ہے عر کوئی معشوق ہو اس پر وہ زنگاری میں۔ حضرت منصور بن احمد۔ جبل حبیب کے باشندہ تھے اور اقصاب میں سے تھے کہ بحری خدمات آپ کے سپرد تھیں۔ ایک مرتبہ حضرت ممدوح نے مجھ سے فرمایا کیا تم نے دیکھا ہے فرمایا ہمارے حضرت شیخ منصور کی بس یہی حالت تھی کہ جب حق تعالیٰ نے ان کو فتح نصیب فرمائی تو حق تعالیٰ کی ہمت و جلال کے سبب ان کے تمام بدن کا ریشہ ریشہ پھڑکتا اور ہر قطر کا پتا تھا اندیہ حالت ایک مدت تک قائم رہی۔

نیز آپ نے فرمایا میں نے سیدنا ابراہیم خلیل اللہ کو دیکھا کہ حضرت منصور سے دعا خیر طلب فرما رہے تھے (ف) یہ اکابر کی شان ہے کہ اپنے چھوٹوں سے بھی دعا خیر کے طالب ہو کرتے ہیں چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی منقول ہے کہ حضرت عمر فاروق عمرہ کے لئے مکہ جانے لگے تو آپ نے فرمایا لا تسناک



یا اَخْرِجْ مِنْ دُعَائِكَ بھائی ہیں دُعائیں نہ بھول جانا۔ پنجم حضرت محمد سراج کہ انجرا کے باشندہ تھے اور قطب وقت تھے ان کی ملاقات کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے ششم حضرت احمد بن عبد اللہ مصری۔ غوث زمانہ تھے اور حکایات جن کے ذریعہ آپ نے حضرت مدوح کو کتمان ستر کی وصیت فرمائی تھی شروع کتاب میں مذکور ہو چکا ہے ہفتم حضرت علی بن عیسیٰ مغربی۔ یہ بھی اقطاب میں سے تھے اور ان کا وطن جبل درز علاقہ شام میں تھا۔ ان کے مغرب سے ملک شام میں منتقل ہونے کا ایک لمبا قصہ مدت ہوئی حضرت نے بیان فرمایا تھا مگر مجھے پورا یاد نہیں رہا۔

ہشتم حضرت محمد بن علی کیمونی و نہم حضرت محمد مغربی اور دہم حضرت عبد اللہ جراز جن کا مسکن دیر اور علاقہ مراکش میں تھا۔ اور سترھویں حضرت مدوح نے ایک نام کا اور اضافہ فرمایا یعنی حضرت ابراہیم سلمز کہ البحر الرک کے رہنے والے اور اکابر اولیاء میں سے تھے اور فرمایا کہ ان کی وراثت بھی مجھے ملی ہے رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

حضرت مدوح نے فرمایا کہ اسم اعظم رحب کی خاصیت ہے کہ جو دعا مانگی جائے وہ قبول ہوتی ہے، اللہ جل جلالہ کے اسماء حسنی یعنی نودہ ناموں میں نہیں ہے بلکہ ان کے علاوہ سو اٹھ نام ہے البتہ اس کے کثیر معانی ننانوے ناموں میں موجود ہیں اور وہ زبان کا ذکر نہیں بلکہ ذات کا ذکر ہے کہ ذاتِ ذاکر سے نکلتا ایسا سنائی دیتا ہے جیسے پتیل کو کھسکھساتے، سے آواز نکلتی ہے اور وہ ذات پر اتنا ثقیل ہے کہ دن بھر میں ایک یا دو مرتبہ سے زیادہ اس کا ذکر کرنے کی ذات میں طاقت نہیں ہے میں نے دریافت کیا کہ اس کی کیا وجہ؟ فرمایا وجہ یہ ہے کہ اس کا ذکر مشاہدہ تامہ کے بغیر نہیں ہوتا اور وہ ذات انسانی پر بہت ثقیل ہے۔ ذات جب اس کا ذکر کرتی ہے تو رُحِ تعالیٰ کے سمیت و جلال اور خوف کی وجہ سے سارا عالم اس کی نظروں سے مفقود ہو جاتا ہے۔

ہاں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے اس کے ذکر کی خاص قوت عطا فرمائی تھی کہ وہ دن بھر میں چودہ مرتبہ اس کا ذکر فرمایا کرتے تھے نیز آپ نے اسماء حسنی کے متعلق فرمایا کہ ان کے معانی کا مختلف طور پر حضرات انبیاء علیہم السلام کو مشاہدہ حاصل ہوا تھا جس بنی کو جس معنی کا مشاہدہ ہوا انہوں نے اس کا نام وضع فرمایا کہ معانی ان پر بقدر ان کے مشاہدہ کے ظاہر ہوئے اور اسی کے موافق اسماء کا ظہور ہوا۔ مثلاً کسی بنی کو ان کی طاقت کے موافق قدرت الہیہ کا مشاہدہ ہوا تو انہوں نے حق تعالیٰ کا نام قدیر وضع کیا۔ اور جن کو کرم الہی کا مشاہدہ ہوا انہوں نے اللہ کا نام کریم جو رکھیا۔ غرض تمامی اسماء الہیہ حضرت انبیاء کے وضع کرنے سے حاصل ہوئے ہیں۔ چنانچہ سیدنا حضرت ادریس علیہ السلام میں جنہوں نے سب سے پہلے علیم، قوی، عظیم، متان کو وضع کیا۔ مگر حضرات انبیاء نے ہر نام اپنی زبان میں وضع کیا تھا اور یہ خصوصی فضیلت ہے قرآن مجید کہ اُس نے تمامی اسماء جمع کئے اور سب کو عربی زبان میں ادا کیا نہ کہ انبیاء و تقدسین کی زبانوں میں، اور اسمِ جلالت یعنی اللہ سب سے اول حضرت آدم علیہ السلام نے وضع کیا کہ جب حق تعالیٰ نے اُن کی روح



پھونکی اور وہ اٹھ کر کھڑے ہوئے تو ایک پاؤں پر کھڑے ہوئے اور دوسرے پاؤں کا گھٹنا زمین پر ٹیک لیا۔  
اس حالت میں ان کو اپنے پروردگار کا ایک عظیم شاہدہ نصیب ہوا اور حق تعالیٰ نے ان کو گویا نئی عطا فرمائی تاکہ ذات  
حق سبحانہ کے جن اسرار و معانی صفات کا شاہدہ کیا ہے ان کو لفظ کے ذریعہ ادا کریں تب ان کی زبان سے  
نکلا اللہ چونکہ اللہ جل جلالہ کے علم قدیم میں تھا کہ یہ اسماء حسنیٰ اس کے نام قرار پائیں گے۔

لہذا ان کو اپنے انبیاء و اصفیاء و ک زبانوں سے جاری کر لیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان معانی کے اسماء وضع  
فرماتے جو آپ کو بیرون از طاقت مشاہدہ میں حاصل ہوئے تو وہ اسماء بھی دوسروں کے لئے ناقابل برداشت  
ہوتے اور جو بھی ان کو سننا وہ رانگ کی طرح، پگھل جاتا مگر حق تعالیٰ کا اپنے بندوں پر بڑا لطف و کرم  
ہے اس لئے آپ کے مشاہدہ عظمیٰ سے اسماء الہیہ وضع نہ ہوئے، جامع کتاب کہتے ہیں اس پر یہ شبہ  
کیا جائے کہ اسماء حسنیٰ تو قدیم ہیں اور یہ تقریر کہ حضرات انبیاء نے حرب مشاہدہ ان کو وضع کیا ہے، ان کا  
حادث ہونا تبارہی ہے لہذا عقیدہ کے خلاف ہوا۔ کیونکہ اسماء حسنیٰ کے قدیم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے معانی  
رچونکہ صفات الہیہ ہیں وہ قدیم ہیں نہ کہ ان کے الفاظ رچو کہ دلالت کرنے والے ہیں معانی پر اس لیے کہ وہ حادث ہیں۔

اس لئے کہ لفظ عرض ہے اور ہر عرض حادث ہوا کرتا ہے خصوصاً جبکہ رہتے ہوئے پانی کی طرح استیال ہو  
جیسے لفظ اور آواز وغیرہ کہ پہلا حرف ختم ہو جائے گا تب دوسرا حرف زبان پر جاری ہوگا۔ اور جب وہ ختم ہو  
جائے گا تب تیسرا حرف زبان پر آئے گا۔ کہ ان کا حادث ہونا تو ان کی ہیئت ترکیبیہ اور تلفظ ہی سے ظاہر ہوتا  
آپ نے فرمایا کہ اسم جلالہ (اللہ) میں تین اسرار ہیں اول یہ کہ اس کی مخلوق بے شمار ہے، اور اس کی مختلف  
اقسام ہیں انسان، جنات، حیوان، وغیرہ وغیرہ اتنی انواع ہیں کہ بس اللہ ہی کو معلوم ہیں اور باوجود اس کثرت کے  
وہ یکتا ہے اپنے ملک میں کہ نہ اس کا کوئی وزیر ہے نہ معاون وہ تنہا سب کا مدبر و منتظم ہے اکیلا متصرف ہے  
تمامی افراد و اشیاء میں تصرف فرمایا ہے، نہ کوئی چیز اس سے بچ سکتی ہے نہ اس کی قدرت سے باہر کچھ سکتی ہے وہ

تمامی اشیاء پر قاهر و غالب ہے، اور ہر چیز اس کے احاطہ قدرت میں داخل ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے: وَاللَّهُ مِنْ دُونِهِ  
مُحِيطٌ۔ دوم یہ کہ مخلوقات میں جس قسم کا اور تصرف چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔ کسی کو مگر نباتا ہے کسی کو مفلس و بادر  
کسی کو عزت بخشتا ہے اور کسی کو ذلت، کسی کو سفید بناتا ہے اور کسی کو سیاہ۔ کسی کی دعا قبول فرماتا ہے اور کسی  
کی درخواست مسترد فرماتا ہے۔ غرض زبان ہو یا مکان ہو مختلف برتاؤ کرتا اور طرح طرح سے اپنی شان  
ظاہر فرماتا ہے كُلُّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ۔ پھر ایک کیساتھ ایک برتاؤ دوسرے کے ساتھ دوسرے برتاؤ  
سے اس کو غافل نہیں بناتا۔ کلی اختیار ہر قسم کا اسی کو حاصل ہے مخلوق کے ہاتھ اختیار کچھ بھی نہیں ہے۔

دوسری ہوتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ نہ کہ جو وہ مخلوق چاہتی ہے، يُخَافُكُمْ لَوْلَا أَنَّهُ لَاقَاكَ سَومٌ۔ یہ کہ وہ ہر عیب



پاک ہے اور ہر نقص سے منزہ ہے، تاہم اس کی کیفیت بیان ہو سکتی ہے اور نہ مخلوق میں کسی شے کا وہ شبہ و  
 مثل ہے اور باوجود اس کے وہ مسطور و اقتدار اور جلال ہے کہ اگر غفلت کے پردے نہ ہوتے جو حق تعالیٰ نے مخلوق  
 پر ڈال دیئے ہیں تو جس وقت اُن پر حق تعالیٰ کی تجلی ہوتی سب ریزہ ریزہ اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے بلکہ نام و نشان بھی  
 باقی نہ رہتا اور کہنے والا کہتا کہ اس عالم میں کبھی کوئی مخلوق پیدا ہی نہیں ہوئی مگر چونکہ حق تعالیٰ نے سابق قضا و قدر  
 کی بنا پر محض اپنی رحمت اور حکمت سے طے فرمایا تھا کہ (حبیب اور دوزخ)، دو مقام بنائے جائیں۔ اور ہر ایک  
 کے اہل کو اس کے مقام پر پہنچایا جائے۔ اس لئے جب کسی مخلوق کے پیدا فرمانے کا ارادہ کیا تو اس کے  
 پیدا کرنے سے قبل پردہ حجاب پیدا کر دیا کہ وہی سبب بقا ہے، حضرت ممدوح نے فرمایا کہ اہل بصیرت  
 کو اسم ذات (اللہ) کے زبان سے نکلتے ہی یہ تینوں اسرار مخلوق کا مشاہدہ کئے بغیر ہی نظر آ جاتے ہیں۔  
 اور اس کے بعد ایک مثال بیان فرمائی جس کا مطلب ہماری سمجھ میں یہ آیا کہ اسم ذات جامع ہے تمامی اسمائے  
 کا واللہ اعلم۔ نیز آپ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ مقدس و منزہ ہے اور مخلوقات میں لکھیں نہ کہیں ضرور موجود ہے یہ دوسری  
 بات ہے کہ جس نظر نہیں آتی، نتیجہ یہ نکلا کہ خیالی صورت کا مثل چونکہ عالم میں ضرور موجود ہے اور اللہ جل جلالہ  
 مثل سے منزہ ہے اس لئے ذات حق کسی کے فکر و خیال میں نہیں آ سکتی اور حق تعالیٰ کی جو صورت و شکل بھی کسی  
 کی قوت فکر یہ اپنے اندر لائے گی وہ اس کے خلاف اور اس سے بے تر و بالا ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ قوت فکر یہ  
 کو تو حق تعالیٰ نے بڑی وسعت اور پرواز عطا فرمائی ہے کہ وہ انسان کو اوندھا اور رنگوں سار بھی مصور کر سکتا  
 ہے کہ پاؤں اوپر ہیں اندر کے بل چلتا ہے فرمایا واللہ میں نے ایسی مخلوق دیکھی ہے (لہذا یہ خیال کا تصور  
 بھی مخلوقات عالم سے باہر نہیں ہو سکا۔ بلکہ یہ دیکھ لے کہ وہ) مقلوب انسان اپنی شرمگاہ کو (ہر وقت  
 اپنے، ہاتھ سے چھپائے رہتا ہے کہ اس کا ہاتھ گویا شرمگاہ کے لئے پردہ ہے اور وہ اس کو صرف اس وقت اٹھاتا  
 ہے جبکہ بول و برازی یا مجامعت کا ارادہ کرتا ہے نیز آپ نے فرمایا کہ ایک روز میں اور حضرت محمد بن عبد اکرمؐ بھاری  
 بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اسی کا تذکرہ آگیا اندر مجھ سے فرماتے لگے آؤ عجیب سے عجیب کوئی صورت اپنے  
 فکر و خیال میں گھڑیں اور پھر مخلوقات خداوندی میں گشت لگا کر دیکھیں کہ وہ موجودہ ہے یا نہیں میں نے  
 کہا بہت اچھا جو صورت آپ کا دل چاہے وہ گھڑ لیجے۔ فرمایا اچھا ایک صورت ایسی لیتے ہیں جو جو پایہ  
 اور انت کی شکل ہے،

اور اس کی ساری پیٹھ پر سنہ ہی سنہ ہیں، اور اس کی پشت پر ایک گر جا ہے جس کا رنگ  
 اس جا نور کے رنگ سے مخالف ہے۔ اور وہ اگر جا کے منارہ کی طرح، اوپر کو چڑھا چلا گیا ہے اور اگر



رُخ اس میں متعدد روشندان ہیں کہ ایک روشندان سے پیشاب کرتا ہے اور ایک سے پاخانہ پھرتا ہے، اور ایک سے پیتا ہے اور اُن روشندانوں کے درمیان مجسم انسان کی صورت ہے کہ سر سے لیکر پاؤں تک تمامی اعضاء بالکل آدمی کے سے ہیں پوری طرح ہم صورت گھر کر فارغ نہ ہوتے پائے تھے کہ روحانی سیاحت کے ذریعہ بعینہ ایسی ہی مخلوق کثیر تعداد میں ہو کر نظر آگئی اور ہم نے دیکھا کہ اس کا نہ حقیقی کھانا ہے ماہ سے وہ گیا بھن ہوتی ہے مگر لگے سال وہ مادہ حقیقی کھاتی ہے اس نہ سے یعنی حالت پلٹ جاتی ہے کہ جو اس سال رہتا وہ اُتیدہ سال مادی بن جاتا ہے اور جو اس سال مادی تھیں وہ لگے سال نہ بن جاتی ہے کہ یہ اس سے حقیقی کھانے لگتا ہے، اور وہ حاملہ ہونے لگتی ہے ورنہ حق تعالیٰ شانہ تے ہزار ہا عالم پیدا فرماتے ہیں جن میں ایک چھوٹا سا عالم یہ ہے جس کو دُنبہ کہا جاتا ہے اور جس کے تین حصے میں پانی اور سمندر ہے اور چوتھا فی حصہ میں زمین ہے جس پر انسان آباد ہے اور اسی لئے اس کا نام رُبع سکون ہے۔ یہ رُبع سکون بھی آنا طویل و عریض ہے کہ برسہا برس بھی انسان کسی تیز سولہی پر چلتا رہے تو سارے حصہ کو قطع نہیں کر سکتا یا وجودیکہ صد ہا برس میں اس کے مختلف ممالک متعین کئے گئے اور نقشے بنائے گئے ہیں کہ اس کا چپہ چپہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے مگر بلا مبالغہ کہا جاتا ہے کہ اس کے جگلات بن جزائر کو ہزار چٹانیں صد ہا بلکہ ہزار ہا میل کے رقبہ کی ایسی ہیں جو نہ سیاہاں عالم کو معلوم ہو سکیں اور نہ انسانی مرتبہ کردہ نقشوں میں آسکیں یا بھی صدیاں چاہئیں کہ رُبع سکون کی وہ سطحات ارضی معلوم ہو سکیں جو اب تک نامعلوم ہیں اور نقشوں میں ان کا اضافہ ہوتا رہے اسی مرتبہ و معلومہ سطح میں صرف حیوانات کو بھیجے تو اللہ جل جلالہ کی وہ وہ مخلوق آباد ہے جو کبھی کسی ملک کے عجائب خانہ میں نظر آتی ہے تو عقل و فکر رہ جاتی ہے اور گھٹنوں سے بھی نظر سے ہٹتا گھبرا نہیں کرتی۔

مصر کے عجائب خانہ رجسٹرہ الحیوانات، میں قسم قسم کے جانور ہوا ایسے ہیں جو اہل ہندسیا حین نے بھی نہیں دیکھے اور گویا کئی کئی جانوروں کا مجموعہ ہیں زرافہ ایک جانور ہے جس کی گردن اور ہاتھ پاؤں بالکل اونٹ کے سے ہیں مگر خرگوش کے برعکس لگے ہاتھ پڑے اور پھیلے پاؤں جھوٹے، بدن کی کھال بالکل چلتے کی سی ہے اور منہ گائے کا سا۔ اسی لئے فارسی میں اس کا نام شتر گاؤ ہے ایک اور جانور ہے بڑے بندر کی طرح کہ چال خرگوش کی طرح اور اس کی پستانیں پیٹ کے اندر ہیں پھر کوجب دودھ پینا ہوتا ہے تو ماں ان کو کھولتی ہے مگر پھر کبھی اس میں صرف منہ ڈال کر دودھ پی لیتا ہے کبھی آدھا اندر چلا جاتا ہے آدھا باہر لٹکا رہتا ہے اور کبھی سارا اندر داخل ہو جاتا ہے اور وہ پیٹ کا تندر کر کے پھر کو اندر لئے ایسا پھرتی ہے جیسے گیا بھن جانور اور کجب وہ دودھ پلا سکتی ہے تو ہانہ کو نکر پھر کوزین پر ڈال دیتی ہے اور بچا جاتی ہے۔

اسی طرح صد ہا جزند پرند ہیں جو کبھی دیکھنے میں نہیں آتے۔ اہل تصرف اقطاب اور اغواث کو حق تعالیٰ نے جو کچھ نظام عالم کا



کارکن نبایا ہے اور ان کی سیاحت تمامی اکناف عالم میں عام اور طبعی ہے اس لئے مخلوقات کے جو عجائب و غرائب ان کو نظر آتے ہیں سیاحان دنیا کو ان کی ہوا بھی نہیں لگی کسی لئے ان کا یہ فرمانا کہ انسان کے تصور و تخیل میں ایسی چیز آہی نہیں سکتی جس کا وجود اس عالم دنیا میں نہ ہو، جہاں تجربہ کے درجہ میں صحیح اور واقعہ ہے وہیں اس کی شہادت بھی ہے کہ انسان کو عقل اور قوت فکر یہ چونکہ آدر گذران اور وسیلہ معیشت بنا کر دی گئی ہے اس لئے محدود ہے اور اس کا دائرہ اگرچہ آنکھ اور کان کی رسائی سے بہت زیادہ وسیع ہے مگر یہ تک دنیا میں ہے اس وقت تک اشیاء دنیا کے اندر محصور ہے۔ لہذا اس عالم سے باہر جو شے ہے اُس کی حقیقت کا احاطہ کرنے سے بھی وہ قاصر و کوتاہ ہے چہ جائیکہ خالق جل شانہ کی ذات کا احاطہ۔ یہی وجہ ہے کہ عالم برزخ کے واقعات مثلاً یہ کہ روح کا اعادہ کیونکر ہوتا ہے، عجوبوں اور نیربوں میں اتنی دیر کیونکر جیتا ہے منکر نکیر کے آنے کی اور سوال و جواب کی کیا صورت ہوتی ہے، جنت یا دوزخ کی کھڑکی کھلنے کا کیا طریق ہے وغیرہ وغیرہ کوئی بات بھی دنیا میں رہتے ہوئے ہماری عقل میں نہیں آسکتی۔ اس لئے کہ یہاں ہر کوئی جو عقل دی گئی ہے وہ زندگی کی گذران اور نظم عالم کو قائم رکھنے کے قابل دی گئی ہے دوسرے عالم کی چیزیں سمجھنے اور اپنے دائرہ میں لانے کے قابل اس میں وسعت ہی نہیں ہے اسی طرح جنت، وہاں کی نہریں، وہاں کی حوریں، وہاں کے پھل، وہاں کے درخت، وہاں کے کھانے اور پینے کی چیزیں اور ان کی لذتیں، غرض وہاں کی نعمتوں اور راحتوں کی حقیقت اگر کوئی اس عقل سے معلوم کرنا چاہے جو دنیا میں انسان کو دی گئی ہے تو ناممکن ہے بلکہ تخیل اور تصور میں بھی لانا چاہے تو قادر نہیں اسی لئے نعمائے جنت کے متعلق حدیث میں یہ لفظ آیا ہے ولا خطر علی طلبہش کہ انسان کے دل پر اس کا خطرہ و خیال بھی نہیں گذرا۔ وجہ یہی ہے کہ عالم جنت کی اشیاء کا ادراک دنیا کی ضرورت معاش کے قابل دی ہوئی عقل کے احاطہ سے باہر ہے اور وہ چیزیں اور ان کی لذت یا کیفیت یا صورت اس دائرہ عقل میں نہیں آسکتی جو کچھ بتایا گیا ہے ورنہ حقیقت ہر عالم کے اشیاء کی اسی عالم میں جا کر معلوم ہوگی اور یہی وجہ ہے کہ انسان اعتراض کرنے اور شبہات پیش کرنے لگتا ہے کہ اس عالم پر قیاس رکھنے پر دائرہ عقل میں اس کو محدود سمجھتا ہے اور اس پر شبہ لاحق ہوتا ہے حالانکہ جو چیز اس کی عقل میں آئی ہے وہ اصل شے کی حقیقت نہیں آئی۔ کیونکہ اس عالم میں رہتے ہوئے وہ اس عقل کے اندر آہی نہیں سکتی۔ جیسے عالم بلوغ سے پہلے بطن انشی حامل حمل ہو ہی نہیں سکتا اور نہ سمجھ سکتا ہے کہ حمل اور اس کے نشو و نمو اور تربیت و تغذیہ احوال کی حقیقت و کیفیات کیا ہے جب عالم بلوغ کو پہنچے گی تو از خود ادراک کرے گی اور جو بات اس وقت قابل توجہ و تحقیق نہ تھی عقلی اعتراض کا محل بنی ہوئی ہے اس وقت سہل ترین اور معمولی و ناقابل بحث بن جائیگی کاش ہم اپنی عقل کی حد اور اس



حائرہ کی تنگی کو عقل ہی سے ادراک کریں تو عالم ان شریعت انبیاء نے جو واقعات عالم برزخ و عالم جنت و عالم جہنم و عالم ملائکہ و عالم جنات و عالم شیاطین وغیرہ کے بیان فرمائے ہیں نہ ان کا انکار کریں اور نہ ان پر اعتراض و شبہ لادیں ان کی مثال ایسی ہے جیسی کسی نے حجام سے پوچھا نائی رے نائی میرے سر پر بال کتنے ہیں؟ اس نے جواب دیا جحمان جی ایسا منے آئے جاتے ہیں پس جب عالم برزخ و عالم جنت و دوزخ ہر شخص کے سامنے آیا جاتا ہے تو اس کی کرد اور تحقیق یا شبہ و اعتراض سے کیا حاصل بہت قریب ہے وہ زمانہ کہ سب نظروں کے سامنے کھل جائے گا۔ ایک مرتبہ آپ شاہدہ اہلبیت کا تذکرہ اور اس کی عظمت شان کا اظہار فرما رہے تھے اس کے بعد وجوہ بیان کر رہے تھے کہ اکثر مخلوق اس سے عاجز ہے حتیٰ کہ آپ نے خود اپنا قصہ بیان فرمایا کہ اخیر سنہ ۲۷۰ھ میں ایک مدنی کامل سے میری ملاقات ہوئی اور میں نے اُن سے درخواست کی کہ دعا فرمادیجئے حق تعالیٰ مجھے اپنا شاہدہ نصیب دے انہوں نے فرمایا کہ اس خیال کو دل سے نکال دو اور تم اس کی طلب اللہ سے نہ کرو حتیٰ کہ وہ خود ہی اپنا شاہدہ بلا طلب و سوال تم کو عطا فرمائے۔ کیونکہ اگر تمہارے سوال کے بغیر تمکو عطا فرمائے گا تو تمہاری مدد بھی فرمائے گا اور تم کو عطا سے قبل اس کی برداشت کی طاقت بھی بخشنے گا۔ اور اگر تم اس کی درخواست کرو گے اور بار بار سوال کئے جاؤ گے تو ممکن ہے ناکام نہ ہو، مگر اندیشہ ہے کہ تم اس کو اٹھانہ سکو اور عاجز ہو جاؤ میں نے کہا کہ آپ دعا فرمادیجئے میں اس کو اٹھاؤں گا فرمایا اچھا عالم انسان پر نظر ڈالو چنانچہ میں نے اس پر نظر ڈالی۔ فرمایا سارا عالم انس بیک وقت اپنی آنکھوں کے سامنے آئے۔ فرمایا اب عالم جنات پر نظر ڈالو۔ اور ایسا ہی کرو جیسا عالم انسان کے ساتھ کیا کہ تمامی عالم جنات حلقہ انگشتری کی طرح نگاہ کے سامنے آ جلتے ہیں نے کہا بہت اچھا کر لیا غرض ایک ایک عالم کا علیحدہ علیحدہ نام لے کر فرماتے رہے کہ اس کو بھی تماہا نظر کے سامنے لاؤ حتیٰ کہ عالم جنت اور جو کچھ بھی جنت میں نعمتوں اور اہل نعمت کی انواع کثیرہ میں آئے اور عالم دوزخ اور جو کچھ بھی دوزخ میں رعب اور معذبت کی اقسام کثیرہ میں، ہے سب کو گنوا گنوا کر میری نظر کے سامنے لاتے کا حکم فرماتے رہے اور میں تعمیل حکم کرتا اور ہر عالم کو جدا جدا اپنی نظر کے سامنے لاتا رہا۔ اس کے بعد فرمایا کہ اچھا یہ عوالم جن کو جدا جدا نظر کے سامنے لائے ہو اب سب کو جمع کرو اور بیک وقت تمامی عوالم کو نظر کے سامنے لانے کے بعد فرمایا جتنی بھی تم میں طاقت ہے اس کو صرف کر کے پوری کوشش کرو کہ ایک نگاہ سے سب کو دیکھو اور بتاؤ کہ مجموعہ عوالم کو یہ ایک نظر جمع کر سکتے ہیں یا نہیں؟ چنانچہ میں نے کوشش کی مگر ایسا نہ کر سکا کہ بیک نظر بیک وقت تمامی عوالم میری نگاہ کے سامنے مستحضر ہو جائیں اس وقت انہوں نے فرمایا کہ عزیز من جب تم اللہ کی مخلوقات کا مشاہدہ نہ کر سکے اور ایک نگاہ میں ان کو مستحضر کرنے سے عاجز ہو گئے تو ہلا خالق مہل شانہ، کامتا بہ کیسے کر سکتے ہو۔



تب مجھے امرحق معلوم ہوا اور میں قلب کے آنسوؤں سے رو پڑا کہ رنا و اقصیت کے سبب، ایسی چیز کی حرص کی جس کی مجھ میں کسی طرح بھی طاقت نہیں ہے نیز حضرت مدوح نے فرمایا کہ واقعی تمامی مخلوقات کو ایک نظر میں مستحضر کرنے کی طاقت کسی بشر میں بھی نہیں ہے اسی طرح ادبیا میں جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بحالت بیداری نصیب ہوئی ہے وہ تمامی عالم کو دیکھ لیتا ہے مگر یہ ایک نظر نہیں کہ وہ انسانی قدرت سے باہر ہے بلکہ علیحدہ علیحدہ ہر عالم کا مشاہدہ کرتا ہے، نیز آپ نے فرمایا کہ یہی حال روح کا ہے کہ جب تک انسان پر تمامی عوالم مکشوف نہیں ہو جاتے اس وقت تک روح کی حقیقت اس پر منکشف نہیں ہوتی اور اگر عوالم کا کوئی حصہ بھی مکشوف ہوئے بغیر رہ گیا اور روح کی حقیقت اس پر منکشف ہو گئی تو فتنہ میں پڑ جائے گا اور اندیشہ ہے کہ ایمان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھے نیز آپ نے فرمایا کہ بڑے سے بڑا اور فہیم سے فہیم بھی کوئی عالم میرے پاس بیٹھے اور روح کے متعلق سوالات کرنا شروع کرے اور میں اس کو جواب دیتا رہوں تو چار برس گزر جائیں گے مگر اس کے اعتراضات ختم نہ ہوں گے۔ کیونکہ حقیقت روح اس درجہ خفی اور دقیق ہے کہ عقل اور علم کے ذریعہ اس کا ادراک ناممکن ہے اس کی معرفت صرف مشاہدہ سے ہوسکتی ہے اور اس کا مشاہدہ جب تک تمامی عوالم کا یکے بعد دیگرے مشاہدہ نہ ہو جائے اس وقت ہونہیں سکتا ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ بندہ میں طاقت ہجائی نہیں ہے کہ اپنے رب کی حقیقی معرفت حاصل کر سکے اور جیسی بھی اس کی شان عظمت و کبر بانی ہے اس کو معلوم کر سکے اور اس کے لئے ایک مثال بیان فرمائی کہ مٹی کے برتن کو اگر حق تعالیٰ فہم و ادراک عطا فرمادے اور کوئی اس سے دریافت کرے کہ اپنے بنانے والے صنایع کی حقیقت بیان کر کہ اس کا طول کتنا ہے، اس کا رنگ کیا ہے، اس کی عقل کتنی ہے اس کا ادراک کیسا ہے، اس کی قوت سامعہ کتنی ہے اس کی بصارت کیسی ہے عالم دنیا میں اس کی عمر کتنی ہے وہ آلات و اوزار کون کون سے ہیں جن کو تیرے بنانے کے وقت وہ کام میں لایا، وغیرہ وغیرہ تمامی ظاہری و باطنی اوصاف دریافت کرے جو اس کے صنایع میں موجود ہیں تو وہ نہ بتا سکتا ہے اور نہ ان کی معرفت کی اس میں طاقت ہے، اور نہ ان معارف اور حقائق کو اس کی ذات تیرائی برداشت کر سکتی ہے، اور مٹی کے برتن ہی کی کیا خصوصیت ہے۔ کوئی مصنوع بھی اپنے صنایع کی حقیقت واقعہ کو کبھی نہیں سمجھ سکتی ہے۔ اور جب حادث صنایع کے متعلق حادث مصنوع بھی عاجز ہونے کی یہ حالت ہے تو کیا پوچھنا صنایع قدیم سجانہ و تعالیٰ کا اس کی معرفت حقیقہ کسی مخلوق کو حاصل ہو جائے کوئی سی مخلوق کیوں نہ ہو حق تعالیٰ کی حقیقت سے ایذا لایا تک نہ اس عالم دنیا میں واقف ہو سکتا ہے نہ اس عالم آخرت، میں آگاہ بن سکتا ہے۔

نیز آپ نے فرمایا کہ ذات تیرائی پر ذکر اللہ بہ نسبت عبادت کے زیادہ گردان ہوتا ہے اور ذات سے مراد ذات جنیدہ ہے جس میں ظلمت ہو۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ذکر اس کو نور پلانا چاہتا ہے اور وہ اپنی ظلمت



کے سبب نور کو قبول نہیں کرتی۔ گویا ذکر اس کی طبیعت کو بدلتا چاہتا ہے اور اس کی حقیقت سے اس کو ٹکانا چاہتا ہے  
 (جو ایسا ہی مشکل ہے) جیسے کوئی عورت کی طبیعت کو مردانہ، یا مرد کی طبیعت کو زنانہ بنانا چاہے یا جوار و باجرہ  
 وغیرہ میں گیہوں کے مزہ اور گیہوں کی مٹھاس و ذائقہ ڈالنا چاہے۔ برخلاف عبادت کے کہ وہ محض بدنی  
 محنت ہے جیسے پھاؤڑا چلانا کہ اس میں صرف بدن کو تعب و تکان لاحق ہوتا ہے جس کی فی الجملہ شخص  
 کو عادت ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ منافقین بھی عبادتوں کے مستعمل ہو گئے مگر ذکر اللہ نہ کر سکے کہ ذکر سے مراد ذکر قلبی  
 یعنی اللہ کی یاد ہے نہ کہ ذکر لسانی کہ وہ بھی منجملہ عبادات بدنی کے ہے اور اعضا و جہیم سے تعلق رکھنے والی  
 محنت ہے جس کا برداشت کر لینا معمولی سی طمع اور ادنیٰ سے خوف یا کسی مصلحت کی بنا پر ہر انسان کے لئے  
 آسان ہے ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ کے ناموں میں ایک نام ایسا ہے کہ جب بندہ کو اس کے نور سے سیرا  
 کیا جاتا ہے تو وہ ہر وقت روتا رہتا ہے۔ میں نے پوچھا وہ کونسا نام ہے؟ فرمایا قریب میں نے کہا غالباً رونے کی وجہ  
 یہ ہوگی کہ اس کے معنی کی حقیقت گویا اثر ڈال رہی ہے کہ) بندہ اپنی عفت سے واپس آیا اپنے رب کے  
 جیسے مسافر اپنے سفر سے واپس آکر پہنچا اپنی ماں کے پاس کہ ایسی حالت میں اکثر اس کی طبیعت بھڑکتی ہے  
 اور وہ رو پڑتا ہے۔ فرمایا ماں کے قریب آکر رونا تو محض فرط مسرت اور غلبہ قرح کی وجہ سے ہوتا ہے اور رب  
 کی طرف رجوع کرنے میں یہ (غلبہ سرور) بھی ہے اور اس کے ساتھ ایک دوسری چیز بھی ہے یعنی حیا جو اپنے ذات  
 عفت میں احکام الہیہ کی مخالفت کو یاد کر کے اس پر طاری ہوتی ہے اور وہ سوتے پر سہاگہ تیکر گریہ میں اضمح  
 کر دیتی ہے، نیز فرمایا اور اسماء الہیہ میں ایک نام ایسا ہے کہ جب اس کے نور سے بندہ کو سیرا کیا جاتا ہے  
 تو ہر وقت تنہا ہی رہتا ہے اور تنہا بھی ایسا کہ فرض کرو ساٹھ آدمی کسی شخص کے پاس آکر اس کے کپڑے  
 اتار دیں اور سب مل کر اس کے گدگدسی کرنا شروع کر دیں جہاں گدگدسی زیادہ لگتی اور بے اختیار  
 زیادہ ہنسی آتی ہے مثلاً بغل پیٹ تلو وغیرہ) ان مقامات کو انگلیوں سے خوب گدگدائیں، اور وہ اپنے  
 آپ کو ان سے چھڑانے کے۔ میں نے کہا وہ کونسا نام ہے؟ فرمایا المتعانی میرا دل چاہتا تھا کہ تمامی اسماء حسنہ  
 کے انوار اور ان کے آثار، آپ سے دریافت کروں مگر ہیت کی وجہ سے ہمت نہ ہوئی اور دریافت نہ کر سکا  
 نیز آپ نے فرمایا کہ دینی پر اسماء حسنیٰ کے انوار کی سیرابی کے وقت سے زیادہ کوئی وقت بھی سخت ترین نہیں ہے  
 اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اسماء کے مقتضیات مختلف اور باہم متضاد ہیں کہ اس نام مثلاً التَّائِبُ کا اقتضا کچھ اور  
 ہے اور دوسرے نام مثلاً الصَّادِقُ کا اقتضا اس کے خلاف ہے۔ لہذا ذات ولی، اضداد میں تڑپتی رہتی ہے  
 اور یکسوئی و سکون اور یک حالی کا قرار نصیب نہیں ہوتے پاتا، نیز آپ نے فرمایا کہ کسی ولی کو صرف ایک ہی نام کا  
 نور پلا یا جاتا ہے اور اس پر عمر بھر اسی کا حکم مثلاً حکم ضحک یا گریہ وغیرہ قائم و دائم رہتا ہے اور کسی کو



دوناموں کا نور پلایا جاتا ہے، اور کسی کو اس سے زیادہ ناموں کا، میں نے دریافت کیا کہ حضرت کو کتنے اسماء کے انوار سے سیراب کیا گیا ہے؟ فرمایا ستا توڑے اسماء سے یعنی تسو میں تین کم، میں نے کہا اسماء حسنیٰ تو تنانوے ہیں نہ کہ تسو فرمایا سوان نام ان اسماء میں محسوب نہیں ہوا کیونکہ لوگوں میں اس کی طاقت نہیں ہے اور وہ وہی اسم اعظم ہے جس کے متعلق حدیث میں آیا ہے **اِذَا دُعِيَ بِہٖ اَجَابَ**۔ جب اس نام کے ذریعہ دعا مانگی جاتی ہے تو حق تعالیٰ ضرور قبول فرماتا ہے اس کو ملا کر اسماء حسنیٰ اپورے تسو ہیں نیز فرمایا کہ اتنی تعداد کے اسماء سے سیرابی صرف ایک ہی شخص کو نصیب ہو سکتی ہے یعنی غوث اعظم کو کہ وہ عالم میں ایک ہی ہوتا ہے۔

نیز میں نے آخر عمر میں آپ سے یہ بھی سنا کہ پورے تسو اسماء کے انوار کی سیرابی آپ کو نصیب ہو گئی نیز آپ نے یہ بھی فرمایا کہ سیرابی انوار کی دو قسمیں ہیں ایک سیرابی مرتبہ روح میں اور یہی سیرابی ہے جو کسی ولی کو ایک نام کی نصیب ہوتی ہے اور کسی کو دوناموں کی اور کسی کو اس سے زیادہ کی اور پورے تسو اسماء کی سیرابی بجز غوث وقت کے کسی کو نصیب نہیں ہوتی اور دوسری سیرابی ہے مقام ستر و باطن میں اور وہ پورے تسو اسماء کی بجز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ کے کسی مخلوق کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔

نیز آپ نے فرمایا کہ لوگ اپنے اور اذکار و الفاظ میں جو اسماء الہیہ لیتے ہیں اور ذکر کرتے ہیں۔ پس اگر کسی عارف شیخ سے جیتے ہیں تو کسی قسم کی مضرت نہیں ہوتی۔ اور اگر کسی غیر عارف (یعنی چلتے پھرتے درویش یا اکتاہوں) سے اذکار کرتے اور وظیفہ قرار دیتے ہیں تو نقصان اٹھاتے اور (جنون و مرض وغیرہ کی) مضرت پا جاتے ہیں۔

غالباً اسی کا نام عمل کا پلٹ جانا اور وظیفہ کا الٹ جانا ہے، میں نے دریافت کیا کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ فرمایا اسماء حسنیٰ کے انوار منجملہ انوار الہیہ کے ہیں پس اگر اسم الہی کے ذکر کے وقت اس کا نور بھی اس کے ساتھ ہوگا تب تو مضرت نہ پہنچی گی اور اگر اس کا نور اس کے ساتھ نہ ہوگا جو کہ ذاکر کو شیطان سے محفوظ رکھا کرتا ہے تو ذکر اسماء الہیہ کے وقت شیطان اکھڑا ہوگا اور ذاکر کی مضرت کا سبب بن جائے گا اور شیخ عارف جس کا باگاہ حق کی دائماً حضوری نصیب ہے جب وہ اپنے مرید کو اسماء حسنیٰ میں سے کوئی نام دے گا اور اس کا ذکر بصورت وظیفہ تلقین کرے گا تو اسم مع اس نور کے دیگا جو اس کو شیطان سے محفوظ رکھے گا۔ لہذا مرید کو اس کے ذکر سے مضرت نہ پہنچے گی۔ پھر اس اسم کا نفع شیخ معطل کی نیت پر مرتب ہوگا کہ اگر دنیوی نفع کی نیت سے دیا اور شفاء مرض یا ادائے قرض یا کاسیابی مقدمہ کے لئے اللہ کے نام کا کوئی وظیفہ بتایا، ہے تب تو ذاکر کو وہی دنیوی نفع حاصل ہوگا اور اگر ثواب آخرت کی نیت سے دیا ہے تو وہی ثواب نصیب ہوگا اور اگر معرفت الہیہ حاصل ہونے کی نیت سے دیا ہے تو وہ نصیب ہوگی۔ اور اگر شیخ جس نے اسم الہی کی تلقین کی ہے عارف نہیں بلکہ مجرب اور معرفت الہی سے محروم ہے تو وہ اپنے مرید کو صرف نام دے گا بغیر اس کے نور کے کہ عقلیت



و حجاب کی وجہ سے انوار اسماء الہیہ خود کسی کو نصیب نہیں، دوسروں کو کہاں سے دے، اور بغیر نور کے شیطان سے حفاظت نہ ہوگی۔ لہذا مرید ہلاک ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ قرآن مجید میں اسماء حسنیٰ مذکور ہیں اور حفاظ و حاملین قرآن ہمیشہ قرآن مجید کی بھی تلاوت کرتے ہیں مگر کبھی کسی کو مضرت نہیں پہنچی۔

حالانکہ کسی شیخ عاریت سے اخذ نہیں کیا فرمایا کہ قرآن مجید حق تعالیٰ نے ہمارے آقا سیدنا محمد ﷺ علیہ وسلم کو دیکر دنیا میں اس لئے بھیجا تھا کہ اپنے زمانہ سے لے کر قیامت تک آنے والی انسانی مخلوق کو پہنچائیں لہذا جو بھی قرآن مجید کی تلاوت کرتا اور اس ضمن میں اسماء حسنیٰ پڑھتا ہے۔ وہ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کرتا ہے پس اس میں اس کے شیخ (سید العارفین) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے ہیں اور یہ سب بنتا ہے حفاظ کے شیطان سے محفوظ اور اس کی مضرت سے مامون رہنے کا۔ یہی صورت ہے اُن وظائف کا اثرہ کی جو احادیث میں آئے ہیں اور ان میں اسماء حسنیٰ مذکور ہیں کہ چونکہ تعلیم فرماتے ہوئے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمامی اُمت کو، لہذا ان سے کسی کو مضرت نہیں پہنچ سکتی، علاوہ ازیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو قرآن اپنی اُمت کو دیا ہے وہ بقدر ان کی طاقت کے اور بلحاظ اُن امور ظاہری کے دیا ہے جن کو وہ سمجھ سکیں اور برداشت کر سکیں قرآن مجید اسرارہ اور مع اس کے تمامی انوار اور انوار اسماء کے نہیں دیا۔ اگر مع تمامی انوار کے عطا فرماتے تو آپ کی اُمت میں کوئی ایک بھی معصیت نہ کر سکتا اور سب کے سب اقطاب بن جاتے اور کسی کو کبھی اسماء الہیہ سے ضرر نہ پہنچتا۔

نیز آپ نے فرمایا کہ سورہ لیس میں (بجملہ اسماء حسنی کے) دذنام ہیں شروع میں الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ اور دوسرا نام ہیں وسط سورہ میں الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ اور سورہ ص میں دذنام ہیں الْعَزِيزُ الْمُكَرَّبُ ان (چھیوں اسماء میں صلاحیت ہے دنیا کی ساری خوبیوں کی اور آخرت کی تمام خوبیوں کی اور سورہ ملک میں ہر شے دھلا دینے والی ہے اَللّٰهُمَّ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ یہ نافع ہے ہر حادثہ و مصیبت کے لئے خواہ فقر و افلاس ہو یا مرض ہو، یا جہل ہو، یا بلا و آفت ناگہانی ہو، یا ابتلاء و مصیبت ہو، کہ اس آیت شریفہ کی رچلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے ہر وقت) بکثرت تلاوت کرے گا تو جس کلفت میں بھی مبتلا ہو گا حق تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس کو رہائی و عافیت نصیب فرمائے گا۔ جامع کتاب کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا ایک شخص کے بدن پر وہ دانے نمودار ہوئے جو سخت ترین امراض میں سے ہے اور عام لوگ اس کو حب النیش کہتے ہیں وغالباً چھپکے ہو یا اور کوئی مرض، وہ ثروت زدہ ہو کر حضرت کی خدمت میں آیا تو حضرت نے اس کو اسی آیت شریفہ کی بکثرت تلاوت کرنے کا حکم فرمایا۔ چنانچہ وہ محفوظ رہا اور خلافت گمان اس کا مرض رفع ہو گیا۔

حضرات (یعنی درویشوں کے حلقہ مروجہ) کی بابت آپ نے فرمایا کہ اس کا وجود نہ قرن اول یعنی زمانہ صحابہ



رضی اللہ عنہم میں ثابت ہے اور نہ قرن ثانی یعنی زمانہ تابعین میں، اور نہ قرن ثالث یعنی تبع تابعین کے زمانہ میں اسہی تینوں قرن بہترین قرون ہیں جیسا کہ حدیث میں آیا ہے لہذا اس میں برکت و خیر نہیں ہے نیز فرمایا کہ ایک شخص نے مجھ سے اسی کے متعلق ایک مرتبہ سوال کیا میں نے صاف اور صریح جواب دینا اس خیال سے پسند نہ کیا کہ میں (مولوی نہیں ہوں) اور ایک معمولی اور عامی شخص ہوں اس لئے میری بارت یہ قبول نہ کرے گا لہذا میں نے اس سے یہ تقریر کی کہ بھائی، یہ مسئلہ حضرات علماء سے دریافت کرنا چاہیئے۔ جاؤ ان سے پوچھو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات کی ہے یا کبھی نہیں کی؟ اگر وہ کہیں کہ کبھی نہیں کی تو ان سے پوچھو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات کی ہے یا کبھی نہیں کی؟ اگر وہ کہیں کہ کبھی نہیں کی تو پھر پوچھنا چاہیئے کہ (آپ کے خلیفہ اول) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں، کبھی کی ہے یا نہیں؟ اگر وہ کہیں کہ انہوں نے بھی کبھی نہیں کی تو پوچھو کہ (خلیفہ دوم) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے (اپنے زمانہ رشد و ہدایت میں) کبھی کی ہے یا نہیں؟ اگر وہ کہیں کہ انہوں نے بھی کبھی نہیں کی تو دریافت کرو کہ (خلیفہ ثالث) حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ نے کبھی کی ہے یا نہیں؟ اگر وہ کہیں کہ کبھی نہیں کی تو پوچھو کہ (خلیفہ رابع) حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کبھی کی ہے یا نہیں؟ اگر وہ کہیں کہ چاروں خلفاء راشدین مہدیین کے زمانہ میں اس کا کہیں ثبوت نہیں ہے تو اب ان سے دریافت کرو کہ اچھا حضرات تابعین نے کبھی ایسا کیا ہے یا ان میں بھی کسی نے کبھی نہیں کیا؟ اگر وہ کہیں کہ ان میں بھی کسی نے کبھی نہیں کیا تو ان سے پوچھو اچھا حضرات تابعین میں کسی نے کبھی اس کو کیا ہے؟ اگر وہ کہیں کہ ان میں بھی کسی سے اس کا ثبوت نہیں ملتا تو بس اس سے ہم یہ نتیجہ نکال لیں گے کہ جب قرون ثلاثہ نے اس کو کبھی نہیں کیا تو اس میں مطلق خیر و برکت نہیں ہے یہ حافز کی صورت تو قرن رابع میں ظاہر ہوئی ہے (جس کا احداث بروئے شہادت حدیث خیر میں داخل نہیں) اور اس کی صورت یہ ہوئی تھی کہ چار پانچ اولیاء اللہ کسی جگہ جمع تھے اور اہل مشاہدہ تھے کہ حق تعالیٰ نے ان کو فتح نصیب فرمائی تھی اکثر وہ ملائکہ کا مشاہدہ کیا کرتے تھے۔ ملائکہ کی کیفیت یہ ہے کہ کوئی ان میں اللہ کا ذکر باللسان کرتا ہے اور کوئی اپنی ذات سے (کہ ان کا جہم فکر اللہ کرتا ہے) اور کبھی دائیں بائیں حرکت کرتا ہے اور کبھی آگے پیچھے جھکو جھومنا کہتے ہیں) یہ باچوں والی جیب کسی فرشتہ کو اس حالت (فکر بالذات) میں دیکھتے تو یہ حالت ان کو اچھی معلوم ہوتی اور فرشتہ کو جیسا کرتے ہوئے دیکھتے اس سے متاثر ہوا کرتے تھے۔ پھر وہی کیفیت ان کی ذات پر پیدا ہوتی اور یہ اختیار خود بھی فرشتہ کی طرح حرکت کرنے اور جھومنے لگتے تھے چونکہ مشاہدہ حق سبحانہ میں محو و مستغرق ہوتے تھے اس لئے خود ان کو اپنے جھومنے کا خبر بھی نہ ہوتی تھی ان کے مریدین اور متوسلین نے جب ان بزرگوں کو صومیت دیکھا تو وہ بھی ان کے اتباع میں یہی حرکت کرنے لگے کہ اولیاء کا جھومنا فرشتہ کی وجہ سے تھا اور مریدوں کا جھومنا اپنے شیخ کی دیکھا دیکھی اور ان کی سی صورت بنانے اور شبہ ظاہر کئی ظہر



پھر وہ اہل باطن اہل صدق تو دنیا سے رخصت ہو لئے مگر ان ظاہری لباس اختیار کرنے والوں نے اس طریق کو نہ چھوڑا اور حضرات میں مشغول ہو گئے۔ اور جھوٹے میں اضافہ کرتے رہے کہ اس حالت کو لانے کے لئے آلات تجویز کئے (اور سرد و مزامیر تک نوبت پہنچ گئی) ظاہر ہے کہ خود شاہنشاہ کی یہ حالت صنعت و کمزوری تھی کہ قوت ولے اولیاء دوسروں کی حالت سے متاثر نہیں ہوا کرتے اور کسی بنا پر مجذوب کو سالک کے مقابلہ میں ضیافت الحال کہا جاتا ہے، اور اہل ترون ثلثہ میں چونکہ ضبط کی طاقت تھی اور وہ رباطی مشاہدہ اور اس کے اثرات سے، اپنے ظواہر کو محفوظ رکھ سکتے تھے اس لئے ان کے زمانہ میں کسی ایک کی بھی یہ حالت سننے میں نہیں آئی و فت مجھے چونکہ عمر بھر اس قسم کے مجامع میں شرکت کا اتفاق نہیں ہوا اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ حضرت جس کو میں نے حضرات اور حلقہ درویشان سے تعبیر کیا ہے کیا چیز ہوتی ہے ایک متبہ مصر کے سفر میں جبکہ میرا قیام قاہرہ میں تھا مجھے ایک بزرگ کی اطلاع ملی کہ شہر سے باہر رہتے ہیں۔ چونکہ بزرگوں سے ملنے کا شوق تھا اس لئے میں وہاں گیا اور مغرب کی نماز وہیں جگہ میں شیخ کے ساتھ پڑھی کہ شہر سے چار میل ایک کچے کوٹھے میں رہتے تھے اور قریب ہی زمین کا فرش صاف کر کے پھوس کی چھوٹی ٹیسی مسجد بنا رکھی تھی۔ بعد مغرب ان کے دس بارہ مریدین و متقین جمع ہو گئے اور حلقہ شروع ہوا۔ جس کی صورت یہ تھی کہ شیخ بیچ میں دیوار سے کمر لگائے بیٹھے تھے اور سامنے ایک قوس دائرہ کی طرح مریدین کا حلقہ تھا شیخ کے خادم خاص عبدالقادر پٹنی نے کہ میرے خاص دوست تھے خوش الحانی کے ساتھ باوازی بلند قطب الزمان حضرت مولانا عبدالسلام بن مشیش قدس سرہ کا در مشہور اللہ صلی علی منہ التفت الاثر ادا الخ پڑھنا شروع کیا اور شیخ گردن جھکائے مریدین پر توجہ ڈالتے رہے چند ہی منٹ گزرے تھے کہ دفعۃً شیخ کھڑے ہو گئے اور ان کے ساتھ تمام مریدین دائرہ کی صورت میں کھڑے ہو گئے اور ایک نے اپنا ہاتھ دوسرے کے ہاتھ میں پکڑا کر شیخ کے دواں ہاتھوں سے مربوط ہو کر ایک دائرہ بنا لیا شیخ نے بھی عبدالقادر پٹنی کی آواز میں آواز ملا کر اسی لہجہ میں ورد مذکور پڑھنا شروع کیا اور مریدین میں جن جن کو یہ ورد یاد تھا انہوں نے بھی آواز ملائی۔ گویا مختلف اور متعدد آوازیں ایک بنکر جوش و خروش کے ساتھ ورد مذکور پڑھنے لگیں اور سب نے بندھے ہوئے دائرہ کے ساتھ چکر لگانا شروع کیا۔ جوں جوں گھومتے تھے جوش برہم تھا اور جھومتے تھے۔ میں چونکہ مریدین میں شامل نہ تھا اس لئے گوشہ میں علیحدہ بیٹھا ہوا اس منظر کا مشاہدہ کر رہا تھا تقریباً آدھ گھنٹہ ہی رنگ رہا اور اس کے بعد شیخ بیٹھ گئے اور سب مریدین بھی ایک دوسرے کے ہاتھ چھوڑ کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے ذرا دیر بعد سب عشاء کی نماز پڑھی اور اس کے بعد شیخ اپنے خلوت خانہ میں چلے گئے اور میں اپنی قیام گاہ پر واپس ہوا۔ مزامیر یا آلات طرب وغیرہ کچھ نہ تھے اور نہ قوالی کی صورت میں اشعار وغیرہ تھے۔ عجیب نہیں



بلاد اسلامیہ میں اسی کا نام حضرت ہوس کی جمع حضرات ہے گویا بارگاہِ احدیت میں حاضری و حضوری کا  
 کیفیت اور احتفاظ اس طرح بہ تکلف لایا جاتا ہے ہر ملک اور ہر زمانہ میں چونکہ رنگ مختلف ہوتے رہتے ہیں اس لئے  
 ممکن ہے اصل نوعیت حضرت کی یہ ہو جو بعض محتاط مشائخ میں محفوظ چلی آتی ہو مگر دوسروں نے اس میں  
 آلاتِ طرب و مزامیر کا اضافہ کر لیا ہو جیسا کہ ہندوستان میں اسی کیفیت کو مقصود سمجھ کر بہ تکلیف اور آمد نہیں  
 بلکہ آورد کے درجے میں کھینچ کر لانے کے لئے سماع اور قوالی کا رواج شائع ہو گیا ہے۔ یہ شرت اور نفل تو صرف  
 سنت نبویہ ہی کو حاصل ہے کہ نہ ملکی اثر سے بدل سکے اور نہ زمانی و وقتی اثر سے متاثر ہو۔ جو طریق آنحضرت صلی اللہ  
 علیہ وسلم کا اس وقت تھا جبکہ آپ دنیا میں تشریف فرما تھے وہی آج بکثرت ماثور و منقول اور محفوظ و مصون  
 چلا آتا ہے۔ اور بعد کی ایجادات ہمیشہ زمانی و مکانی اثر سے متاثر ہوتی اور بدلتی رہیں کہ کسی ملک میں حضرت اور صلہ  
 کا کوئی طریق ہے اور دوسرے ملک میں اس کے خلاف دوسرا طریق۔ کسی زمانہ میں امر محدث کا کوئی طرز تھا اور  
 دوسرے زمانہ میں اس کا طرز بدل کر دوسرا ہو گیا۔ اس لئے شیخ کی عبارت ہی سے جتنا معلوم ہوا کہ کوئی  
 طریق جمع کرنے کا تھا جس کو وجد کہہ لیا حال، وہ میں نے بیان کر دیا ورنہ حقیقت اس کی کہ شیخ کے زمانہ میں اور  
 ملک مغربہ کے اندر وہ کیا طریق تھا جس کا نام حضرت رکھا ہوا تھا۔ کسی کتاب سے بھی معلوم نہ ہو سکی۔ تجربہ سے  
 یہ بات بھی محقق ہوئی کہ صرت سنت رسول ہی کو یہ فخر و کمال نصیب ہے کہ حصارِ سطوتِ الہیہ میں محصور ہے  
 اور شیطان کی اس تک رسائی نہیں ہو سکتی لہذا نہ اس میں اضافہ ہونے پایا اور نہ کسی معصیت یا  
 شیطانی اثر کا اس میں دخل ہو سکتا ہے برخلاف امور محدثہ کے جن کو بدعات کہا جاتا ہے کہ شروع  
 میں بظاہر کوئی خاص خرابی اس میں معلوم نہیں ہوتی مگر چونکہ اس کا اختراع و احداث غیر رسول کے ہاتھوں ہوا ہے  
 اس لئے آئندہ حفاظت کی کوئی ذمہ داری نہیں اور اسی لئے شیطان اس میں دخیل ہو کر تہمت آمیز ہے  
 اس میں معاصی کا شمول کرتا رہتا اور چند روز بعد اس حد پر لا پہنچاتا ہے کہ کوئی صاحبِ دل اور منور القلب  
 اللہ والا اس کو سب صلاح و خیر نہیں تبا سکتا۔ ضد و جہالت والے گواہی بات کی پہنچ کرتے اور یہ سند  
 لاکر معمولی صلی اور دیا ہے طرح طرح کی تاویلوں سے اس کا مستحسن ہونا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر  
 نور ایمان تو کسی نہ کسی درجہ کا حق تعالیٰ نے عامی امت محمدیہ کو دیا ہے اور کتنا ہی کوئی بد دین یا جاہل و ضعیف  
 کیوں نہ ہو مشکوٰۃ قلب محمدی کی تجلیات سے کچھ نہ کچھ صذر مستفیض ہوا ہے، اس لئے خالی الذہن ہو کر جس وقت  
 دیکھتے ہیں تو عاملینِ محدثات خود بھی دلوں سے اقرار کر لیتے اور انتسابِ بارگاہِ محمدی کی بددلت  
 یہ صذر سمجھ لیتے ہیں کہ ہاں اب ان کے مفاسد و مضار غالب آگئے ہیں مصالح اور مفاد پر۔ اور یہی  
 علامت ہے ان کے محدث ہونے کی کہ شروع ہی میں اگر سنت کی طرح مجسم خیر ہو تو حفاظتِ الہیہ کے قلعہ میں



دشمن کے ہر اثر سے محصور و مامون ہوتے اور آج یہ نوبت نہ آتی۔ یہ حال یوں بھی دیکھ دیا حال اور سماع سے ہو یا مزامیر سے قطع نظر معصیت کے چونکہ تاثر طبعی ہے کہ حیوانات بھی مدی وغیرہ سے جھومنے لگتے ہیں اور مست ہو جاتے ہیں اس لئے نہ انسان کی کمال میں شامل ہے اور نہ کوئی قابل اعتناء خوبی ہے بلکہ ایک قسم کا روحانی صنعت اور کمزوری ہے کہ مغلوب بننا ہے طبیعت سے اور اگر اس میں تصنع و تکلف کا دخل ہو اور آورد کا ذریعہ ہو کہ اس کے حاصل کرتے کی کوشش و تدبیر کی جگہ نہ رہے تو کوئی چیز ہی نہیں۔ بے کٹھکے اور بے خطر طریق روحانی کمالات اور ایمانی نور و جلالت حاصل کرنے کا وہی ہے جو قرونِ ثلاثہ میں ثابت ہو چکا ہے اور اسی لئے بصیرت محمدیہ نے ان کے خیر محسوس ہونے کی شہادت دی ہے۔ واللہ اعلم۔

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ نگاہ بصیرت کے تین لاکھ چھیاسٹھ ہزار اجزا ہیں جن میں ایک جز آنکھ کی نگاہ میں آیا ہے اور باقی تمام اجزاء وارث کامل عارف کی ذات میں ہیں کہ وہ اپنی ذات سے دیکھتا ہے جیسے ہم اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں مگر تمامی اجزاء یعنی نگاہ چشم سے تین لاکھ چھیاسٹھ ہزار گونہ برہمی ہوتی نظر سے دیکھتا ہے اور یہ قوت صرف ایک شخص کو حاصل ہوتی ہے یعنی غوث اعظم کو جس کے ماتحت سات اقطاب ہوتے ہیں۔

حاضرین میں سے ایک شخص نے یہ قصہ نقل کیا کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی اور حضرت شیخ احمد بن حسین رفاعی اور حضرت شیخ ابراہیم وسوقی تینوں معصوم حضرات قدس اللہ ابراہیم کا رب جالت حیات دنیا ایک مرتبہ عالم ملکوت میں اجتماع ہوا اور وہاں کوئی واقعہ ان حضرات کا پیش آیا حضرت ابراہیم وسوقی نے اس ملکوتی واقعہ کا تذکرہ اپنے کسی خادم سے کیا تو اس نے کہا اس واقعہ کا گواہ گواہ کوٹھ ہے؟ حالانکہ آپ مع خدام و سریرین کے ملک مصر میں تھے اور وہ دونوں حضرات (یعنی حضرت جیلانی اور حضرت رفاعی) ملک عراق میں تھے مگر آپ نے ان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اس کی شہادت یہ دونوں دیں گے چنانچہ دونوں حضرات اس وقت وہاں تشریف لائے اور شہادت دی کہ ہاں یہ واقعہ صبح ہے اور ہمیں پیش آیا تھا، حضرت مدوح نے فرمایا کہ ایسا قصہ تو معمولی

دنی سے بھی ہو سکتا ہے کہ طی ارض اور ملکوتی اجتماع اور درواز ملک سے سماع و کلام کا جاری ہونا تو اقطاب و ابدال کے لئے معمولی بات ہے، میں نے تو ایسے ولی کو دیکھا ہے جو اتنے بڑے مرتبہ پر پہنچا ہوا تھا کہ ناطق اور غیر ناطق انسان و حیوان و حشرات و ارض جادات و نباتات۔ بہت زمین افلاک ستارے اور سیارے عرض تمامی مخلوقات کا مشاہدہ کرتا تھا اور سارا کہ عالم اس سے مدد پاتا اور منتفع ہوتا تھا۔ وہ سبکی آوازیں اور گفتگو بیک لحظہ سناتا اور ہر چیز کی ضروریات اور جو شے بھی جس کے لئے مناسب و شایان ہے وہ اس کو پہنچاتا تھا۔ اور ایک شے میں شغولیت اس کو دوسری شے سے غافل نہ بناتی تھی۔ بلکہ عالم بالا و عالم زیریں سب اس کے نزدیک گویا ایک محدود حصہ میں تھے پھر حق تعالیٰ



کی اس بندہ پر رحمت ہوئی اور حقیقت کا انکشاف ہوا، تو اس نے دیکھا کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں محض کالبد  
 خاکی اور بمنزلہ ظروت خالی کے ہوں، یہ طاقت اور مدد جو کچھ بھی آرہی ہے دوسرے کی طرف سے آرہی ہے یعنی  
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ طاقت اور مدد حق تعالیٰ سبحانہ کی  
 کی طرف سے پہنچ رہی ہے لہذا سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہو رہا ہے کہ وہی خالق متصرف اور قادر  
 مطلق ہے۔ مخلوق سب بالذات محتاج و مفقر اور ارادہ و مشیت الہیہ کی منظر و آلہ کار ہے، یہ وہی کہا کرتا تھا  
 کہ جیب میں دیکھتا ہوں کہ مدد و طاقت و قدرت دالا پاتا ہوں فہم ہی وجہ ہے کہ ان اہل معرفت حقیقت شناس  
 حضرات کو ان تصرفات عوالم کا اہل قرار دیا گیا ہے کہ تلوار کی دھار جتنی باریک ہوگی اسی قدر زیادہ کام کرے گی کنوئیں  
 اس کو اپنی حقیقت معلوم ہے کہ تلوار کے تمام جسم میں نجیف تر اور ضعیف ترین ہوں اور خود کسی شے کو کاناٹا تو  
 کیا معنی حرکت بھی نہیں کر سکتی کاٹنے کا طاقت مالک سیف کے قوت بازو سے آتی ہے اور بازو میں طاقت روح کی  
 طرف سے آرہی ہے ورنہ وہ خود ایک مضغ گوشت ہے۔ اگر روح نکل جائے تو حرکت بھی نہ کر سکے اسی طرح  
 حق تعالیٰ نے اس باریک اور تپلی دھار کو عامی اجزا سے قوی تر اور کار گزار بنایا اور ساری تلوار کا خلاصہ ذرا بیکر صاحب  
 تصرف اور اس اعلیٰ کام کا اہل بنایا جو تلوار کے کسی دوسرے حصہ سے کبھی انجام نہیں پاسکتا جتنا کوئی بیچ  
 مداتی اور اپنے ضعف و افتقار اور لاشے ٹھنڈی ہونے کی حقیقت شناسی میں بڑھا ہوا ہے اسی قدر قادر  
 ذوالجلال نے اس کو قوت و طاقت بخش کر تصرفات عوالم کا آلہ کار بنایا اور دنیا کو دکھایا ہے کہ قدرت الہیہ کی حقیقت  
 اور اپنے پتہ خاک ہونے کی معرفت نفس حاصل کر فیولوں کو یہ قوتیں عطا کی جاتی ہیں اگر یہ حضرات ان خدا داد قوتوں  
 پر کچھ بھی ناز کرتے یا ادنیٰ سے ادنیٰ کام بھی اپنی طرف منسوب یا اپنی طاقت کی طرف منصات سمجھتے تو نہ اہل تصرف  
 ہوتے اور نہ عند اللہ کسی قدر ذلت پر پہنچتے چنانچہ عوام بھی انہیں جیسے انسان اور بنو آدم ہیں مگر چونکہ غفلت  
 و عدم معرفت کے سبب اپنی عقل اپنی تدبیر اپنی طاقت کی طرف اور جدوجہد کو کچھ سمجھتے اور اپنی طرف منسوب کرتے ہیں  
 اس لئے خدا فریاد میں مھو کر یہ کہاتے اور رات دن بریشیاں حال دنیا کام بن کر ان ہی فقر اور درویش اور اللہ والوں  
 کے آستانہ پر دعا کرانے اور دست بوس و قد بوس ہو ہو کر حاجت بیلاری کے مہتمی بنکر آتے ہیں اللہ کی شان ہے  
 بے طاقت سمجھنے والوں کو یہ طاقت بخشی اور طاقت و سمجھنے والوں کو اتنا کمزور و ضعیف بنایا کہ محتاج الی اللہ شخص مخلوق  
 کا محتاج الیہ بن گیا اور اپنے کہ طاقت و سمجھنے والا دنیا ہی میں محتاج بن گیا۔ واللہ اعلم  
 جامع کتاب کہتے ہیں کہ اس ولی سے مراد خود حضرت شیخ ہیں کہ غوث دقت تھے اور اقطاب  
 سبعہ آپ کے ماتحت تھے۔

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ مجھے ساتوں آسمان اور ساتوں زمین اور عرش اپنی وسط ذات میں داخل نظر آتے ہیں۔



اور اسی طرح فوق العرش کے ستر حجاب بھی کہ ہر حجاب میں ستر ہزار عالم ہیں اور ایک حجاب سے دوسرے حجاب کی درمیانی مسافت ساٹھ ہزار برس کی ہے اور یہ سب حصہ ملائکہ سے معمور و آباد ہے اور اسی طرح ستر حجابوں سے اوپر عالم تھا کر ان تمامی عوالم کی تمامی مخلوقات کے اعمال و افعال اعضا و درکنا ان کے فکر و خیال میں بھکی ٹی بات پڑتی ہے تو ایک شخص (غوث اعظم) کے اذن سے پڑتی ہے واللہ اعلم۔

میں نے ایک مرتبہ آپ سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی کمالات کی میراث ایک لاکھ چوبیس ہزار (اولیاء امت) میں منقسم ہوئی (اس کی کیا وجہ کہ سارا ترکہ صرف غوث کو نہیں ملا؟ فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کمالات کے تحمل کی جتنی طاقت تھی وہ کسی شخص میں بھی نہیں ہے اس لئے غوث ان سب کا وارث و متحمل کیسے ہو سکتا ہے یہ بھی حضرت ہی کے فیضان کا اثر ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار افراد نے مل کر وہ بوجھ اٹھالیا جو آپ نے تنہا اٹھا رکھا تھا) ہاں غوث کے وارث کامل ہونے کا صرف یہ مطلب ہے کہ اس زمانہ میں نبی محمدی سے جتنا اس نے پیا (اور وہ سیراب ہوا ہے) وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوا (اور انوار ذات رسول اس میں

تمامی ہم عمروں سے نسبتاً زیادہ اور بدرجہ کمال آتے ہیں۔ واللہ اعلم

(اٹھواں باب) سیدنا آدم علیہ السلام کی آفرینش کی تدریج اور صورت نبی ص آدم کا فضل و شرف حضرت مدوح نے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو دس دن تک ان کی مٹی جمع کرائی اور بیس دن تک اس کو پانی میں ڈالے رکھا چالیس دن میں ان کی شکل و صورت کو مکمل فرمایا اور پھر بیس دن تک ان کو چھوڑے رکھا حتیٰ کہ ترا بیت سے وہ جس میت کی طرف منتقل ہو گئے (اور پتہ خاک ایک صیم بن گیا یہ سب یقین مہینے ہوئے یعنی رجب و شعبان و رمضان پھر حق تعالیٰ نے ان کو زمین سے اٹھا کر جنت میں پہنچا دیا اور وہیں ان میں روح فانی اور ہیں کے قیام میں ان سے حضرت حوا علیہا السلام کو پیدا فرمایا یعنی حضرت حوا علیہا السلام کی آفرینش جنت میں ہوئی جب آفرینش حوا کو پورا ہوئے گئے تو دونوں میں مادہ شہوت ڈالا گیا اور حضرت آدم نے ان سے ہم بستری فرمائی حضرت حوا کو حمل قرار پایا اور جنت سے نکلنے اور زمین پر آنے کے بعد جبکہ حمل کو تین مہینے گزرے (جو کہ آفرینش آدم علیہ السلام کی مدت تھی) تو وضع حمل ہوا اور بچہ پیدا ہوا پھر اس کے بعد زمین پر ان کو حمل قرار پایا تو نو مہینہ میں ولادت ہوئی اور آج تک یہی حالت مستمر بن کر چلی آتی ہے میں نے دریافت کیا وہ کون سی مٹی تھی جس سے حضرت آدم کی تخلیق ہوئی؟ فرمایا تمامی معدنیات کی مٹی لی گئی تھی سونے کی کان، چاندی کی کان، پیتل اور سیسہ کی کان، وغیرہ وغیرہ سبکی مٹی شامل تھی۔ میں نے کہا کہ اس کو جمع کس نے کیا تھا؟ فرمایا فرشتوں نے اور جس کو بھی اللہ نے چاہا اس نے۔ اور سب میں زیادہ مٹی حضرت جبریلؑ نے کر آئے۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے ان پر ظاہر فرمایا تھا کہ مٹی سے سے پیدا کئے ہوئے انسان سے زیادہ عزت و احترام



ذالامیر نزدیک کوئی نہ ہوگا اور حیرت اس کے انیس و رفیق ہوں گے اور برکات عظیمہ پائیں گے اور اس کا مراد وجود باوجود تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا (کہ خلاصہ بنی آدم اور سید الوجود ہیں) اس لئے حضرت جبرئیل یہ سجدہ کر اسی ذات کی تخلیق کے لئے ہے جس کا اظہار کیا گیا ہے، مٹی زیادہ لاتے تھے میں نے عرض کیا کہ اس مٹی کی مقدار کتنی تھی؟ فرمایا اتنی مقدار تھی جس سے ایک میل یا کچھ کم زمین کا حصہ معمور ہو جائے یعنی اتنی کثیر مٹی جمع کی گئی تھی کہ ایک میل رقبہ کی مسافت کو گھرے میں نے کہا کہ اس کے جمع کرنے میں دس دن کی ضرورت کیوں پیش آتی جبکہ حق تعالیٰ کو ایک لمحہ میں اس کے جمع کرنے کی قدرت تھی؟ فرمایا یہ عجیب سوال ہے، اللہ کو تو آسمانوں اور زمینوں کے ایک لمحہ میں پیدا کرنے کی قدرت تھی پھر ان کو چھ دن میں کیوں پیدا فرمایا۔ اور وہ تو قادر تھا آدم کو بغیر مٹی کے پیدا فرمانے پر پھر مٹی سے کیوں پیدا کیا؟ عرض اس طرح تو تمامی اسیاب اور وسائل بلکہ تدریج و نظام عالم کی ترتیب ہی معلوم ہو جائے گی۔ کہ قدرت الہیہ بلا واسطہ سبب اور دفعۃً یک لحظہ سب کچھ کر سکتی ہے، بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ جہاں بعض چیزوں کو بلا واسطہ سبب اور دفعۃً پیدا فرماتا اور اس طرح اپنی قدرت کا ملکہ کا ایک ڈنگ دکھاتا، وہیں اپنی قدرت کا ملکہ کا دوسرا ڈنگ دکھاتا اور بعض چیزوں کے پیدا فرمانے میں متعدد ایام کی ترتیب دیتا اور بتدریج شئیاً فشیئاً اس کو کمال پر پہنچاتا ہے کہ اس کی وجہ سے ملاء الاعلیٰ اور ملائکہ مقربین کو بڑے درجہ کی توحید نصیب ہوتی ہے کیونکہ آہستہ آہستہ نشو و نمود اور ترقی پانے اور ایک حالت سے دوسری حالت اور ایک طرز سے دوسرے طرز کی طرف منتقل ہونے میں (گویا ہر لمحہ ایک جدا تخلیق ثابت ہوتی اور ملاء الاعلیٰ کی توجہ اس حادثہ مخلوق میں امر الہی پر تعجب کے ساتھ دھندلا بلکہ ہزار ہا مرتبہ، یا ہتھام پڑتی رہتی ہے اور اس کے بارے میں یہ غور و فکر مدت تک چلتا، رہتا ہے کہ کس طرح پیدا فرمایا ہے اور اس سے کیا نتیجہ برآمد ہوگا اور اس کا مقصد و انجام کار کیا ہوگا وغیرہ وغیرہ پس اس زمانہ ارتقاء (اور تدریجی تکمیل کے ایام) میں اللہ جل جلالہ کی موقت اور اس کی قدرت کا ملکہ سے واقفیت اور اشیاء مخلوقہ میں اس کا سر بیان و جریان اتنا زیادہ حاصل ہوتا ہے کہ دفعی تخلیق میں اس کا ہزاروں حصہ بھی نصیب نہ ہوتا کیونکہ اس مخلوق میں اظہار قدرت کے جتنے بھی اسرار و مصالح ہیں وہ سب ان کے ذہن میں آجاتے اور ان کو تفہیم تام حاصل ہو جاتی ہے پس تدریج اس مصلحت کے لئے ہوا کرتی ہے اور اس کے علاوہ اس میں ایک مصلحت اور بھی ہے وہ یہ کہ اس تدریج اور انتظار خروج حادثہ اور اس کی طرف دھیان و خیال لگے رہنے کے زمانہ میں کسی حادثہ جیسی یا اس سے بھی افضل و اعظم دیگر مخلوق کو موجود کر دیا جاتا ہے کہ اس کا سلسلہ تکمیل چل رہا ہے اور اتنا تدریج میں اس فاصلہ وقت کے اندر دوسری چیزیں پیدا کر دی گئیں لہذا ایک کی تکمیل کے ضمن میں متعدد انواع کی مخلوقات کا ظہور ہو گیا، عرض ہر چیز میں حق تعالیٰ کی حکمتیں اور مصلحتیں ہیں جن کو سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں اور یہ اعتراض کرتا بہت آسان ہے۔



کہ جب یوں بھی کر سکتا تھا تو ایسا کیوں کیا اور ایسا کیوں نہ کیا، میں نے کہا وہ پانی کونسا تھا جس میں وہ مٹی  
 ڈالی گئی اور بیس دن تک پڑی رہی تھی؟ فرمایا زمین کا وہ پانی تھا جو حقیقت کے اعتبار سے زمین کی طرت  
 منسوب ہے اور ذات آدمی کے ہم شکل و مناسب حال ہے میں نے کہا وہ اصل زمین کا (یعنی تہ) کا پانی تھا  
 فرمایا اصل زمین کا نہ تھا بلکہ وہ پانی تھا جس کو زمین کے اکثر اجزاء پر مرور و عبور حاصل ہو چکا تھا زمین پر بہنے والے  
 پانی کی مختلف حالتیں ہوتی ہیں۔ بعض تو زمین کے کسی خاص حصہ پر بہتا ہے اور اس میں صرف اسی خطہ زمین کے  
 اسرار و اثرات آئیں گے اور بعض کا جریان اکثر اجزاء و ارضیہ پر یا تمامی اجزاء و زمین پر ہوتا ہے اور اس میں تمامی  
 اثرات و اسرار آجائیں گے اور یہ پانی جس میں وہ مٹی ڈالی گئی تھی، ان چشموں میں سے ایک چشمہ کا تھا جو زمین شام  
 سے آنے والی خطہ ارض سے (فوارہ کی طرح اُپر) اُبل پڑے ہیں۔ وہیں زمین کے ایک اتنے بڑے غار میں جس کی  
 مقدار ایک میل کے قریب تھی سیدنا آدم علیہ السلام کی مٹی کو جمع کیا گیا اور اس چشمہ کے پانی سے اس کو تری پہنچا  
 گئی۔ کیونکہ اس پانی کو تمامی اطراف زمین کے پانیوں سے مدد پہنچتی رہتی ہے کہ یہ زمین اول اور دوم کے  
 درمیانی غلو یعنی تخوم ارض میں بہتا اور اجزاء و ارضیہ کو پھاڑتا ہوا اس چشمہ تک پہنچتا اور تمامی جواب سے گذر کر اس تک  
 آتا ہے اور چشمہ اب تک موجود ہے اور اس میں ذات بنی آدم کیلئے اتنی موافقت موجود ہے کہ سطح زمین کے  
 تمامی پانیوں میں کوئی پانی بھی اتنا مزاج انسانی کے موافق نہیں ہے الغرض مٹی بیس دن تک پانی میں  
 پڑی رہی اور اب گارے میں پڑے ہوئے پتلہ کے اندر صورت بنی شروع ہوئی کہ آہستہ آہستہ  
 شيئاً فشيئاً چالیس دن میں کمال پر پہنچی مگر کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی اس کے بعد جب حق تعالیٰ نے گارے  
 جسمیت انسانیہ کی طرت منتقل کرنا چاہا تو انگلیوں میں ایک پھنسی کی شکل نمودار ہوئی اور اس نے ساری  
 انگلیوں کو بھر لیا۔ پھر وہ پھوٹ گئی اور اس کا مادہ انگلی پر جبکہ ایسا سفید ہو گیا جیسے درخت کھجور کی چھال اتارنے  
 کے بعد اندر کا گتتا ہوتا ہے جس کو شحم النخل کہتے ہیں اس کے بعد ایک ایک عضو اور ہر ہر جزو میں سرایت  
 کرتا اور بڑھتا رہا حتیٰ کہ سارا پتلہ شحم النخل بن گیا یا ایسا جیسے خالص گیسوں کا آٹے کا گندھا ہوا صاف پڑا ہوتا ہے  
 پس اس سے آدم کی صورت متشکل ہوئی اور پھر اس میں مقوڑی مقوڑی و موسیت داخل ہوئی گارہ پھسکریا ہو گیا  
 اور اس میں خشکی نمودار ہو گئی اس کے بعد اس پر ہوائیں چلتی رہیں اور اجزاء آدم میں خشکی مدھرتی اور ظاہر ہوتی رہی  
 اور اس سے باذن الہی ہڈیاں بن گئیں جب بیس دن میں بدن کی ساخت مکمل ہو گئی اور حق تعالیٰ نے اس میں  
 روح پھونکنے کا ارادہ فرمایا تو ان کو اٹھایا اور جنت میں منتقل فرمایا میں نے پوچھا کہ یہ جنت کون سی تھی؟  
 فرمایا پہلی جنت، پھر جب کالبد جنت میں آگیا تو اس میں روح داخل ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ عقل اور علم  
 کا دخول ہوا۔ اور ان کو اللہ جل جلالہ کی معرفت اور پہچان حاصل ہوئی اس وقت حضرت آدم علیہ السلام



نے اٹھنے کا ارادہ کیا۔ مگر کپکپا کر گر گئے پھر کھڑے ہونے کا ارادہ کیا اور پھر گر گئے جیسے شروع میں پہلے جب کھڑا ہونا چاہتے ہیں تو گر جاتے ہیں پھر حق تعالیٰ نے اس حالت میں کہ حضرت آدم ایک پاؤں زمین پر رکھے ہوئے اور دوسرے پاؤں کا گھٹنا زمین پر ٹیکے ہوئے سہارا لئے کھڑے تھے وہ مشاہدہ نصیب فرمایا جس کا تذکرہ آگاہ حسنی میں ہو چکا ہے جب یہ مشاہدہ آپ کو حاصل ہوا تو آپ کی زبان سے نکلا اللہ اللہ اللہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ تب حق تعالیٰ نے ان کو قوت بخشی اور وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور جنت میں چلنے پھرنے لگے کہ جہاں چاہتے تھے وہاں جلتے تھے پھر حق تعالیٰ نے ان کی پسلی میں ایک درو پیدا فرمایا اور ایک بڑے ڈنڈ کی طرح (دروم) نمودار ہوا یہاں تک کہ انسان کے سر کی مقدار وہ ابھر گیا اور کچھ مدت تک قائم رہا اور پھر وہ پھوٹ گیا اور چھوٹے سے کالبد کی طرح ایک شے اس سے نمودار ہو کر زمین پر گر گئی حضرت آدم نے اس پر نگاہ ڈالی تو اپنی سہی صورت کا پتہ دیکھا اور اس کو چھوڑ کر چلے گئے اس پتلہ پر جنت کی ہوا میں چلتی اور مہلک و خوشبوئیں اوپر گزرتی رہیں جس نے جلد جلد بڑھنے اور سرعت تشوید تہا پاتے کا تقع یونچایا۔

حضرت آدم بار بار اکر اس پتلہ کو دیکھا کرتے اور بہت ہی جلد جلد اس کو بڑھتا ہوا پاتے تھے۔ اب اس نے ساتھ ان کو اُنس ہونے لگا۔ اور حضرت آدم اس پتلہ کے پاس بیٹھنے لگے تب حق تعالیٰ نے اس کالبد میں عقل ڈالی اور وہ حضرت آدم سے باتیں کرنے لگا جب دو مہینے گزر گئے تو دروزوں میں حق تعالیٰ نے مادہ شہوت ڈالا اور حضرت آدم نے حضرت حوا سے کہ وہ کالبد مذکور وہی تھیں، مجامعت فرمائی حضرت حوا علیہ السلام کو حمل قرار پایا۔ اور تین مہینہ بعد جبکہ دونوں کا نزل زمین پر ہو چکا تھا پھر کی اس دنیا میں دلالت واقع ہوئی۔

حضرت ممدوح نے فرمایا کہ حضرت آدم کو حق تعالیٰ نے جنت کی طرف صرت اس لئے اٹھایا تھا کہ ان کی ذات کو انوار جنت سے سیراب کیا جائے تاکہ ان کی ذریت روز است کے عہد و پیمان کو بھلا نہ دے نیز سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کی خاطر اور اس کو اہل بصیرت خوب جانتے ہیں میں نے دریافت کیا کہ جس درخت کی حضرت آدم کو ممانعت کی گئی تھی وہ کونسا درخت تھا؟ فرمایا وہ انجیر کا درخت تھا بلا شک و شبہ اور اس کے کھانے کی ممانعت صرف اس لئے فرمائی کہ یہ درخت اور اس کے علاوہ درخت ہائے جنت کی دیگر انواع اسہال لاتی ہیں لہذا اس کے کھانے سے ممانعت فرمادی کہ دست کئے لگیں گے تو پھر جنت میں نہ رہ سکیں گے کہ جنت بول و براز کی جگہ نہیں ہے میں نے کہا کہ جنت کے طعام اور جنت کے پھل اور جنت کی تمام نعمتیں تو اگرچہ جرم رکھتی ہیں مگر خالص انوار ہیں جن میں ثقل نام کو بھی نہیں ہے جیسا کہ بہت سی حدیثوں میں آیا ہے اور جس چیز میں ثقل نہ ہوگا اس کو کھانے سے دست نہیں آسکتے فرمایا یہ نہارا کہنا صحیح ہے مگر اہل جنت جب بروز قیامت جنت میں داخل ہوں گے تو ان کے مزاج بالذات صحیح و تندرست ہوں گے اور ان کو وہ قوت بخشی جائے گی جو احادیث میں منکر اور سب پر ظاہر ہے اور جب حضرت آدم جنت



میں گئے تھے تو ان کی یہ شان نہ تھی بلکہ ضعیف المزاج تھے لہذا ان کے ابتدائی بغرض ابتدائی دخول جنت  
 کو اتھرائی دخول جنت بصلہ اعمال پر قیاس نہ کرو، کہ اہل جنت کے پیٹ میں جب نعمت جنت اتریں گی تو ان کی  
 برداشت (ادھم) کی استعداد، ان کو اس قوت کی وجہ سے ہوگی جو ان میں ڈالی جائے گی اور نیز اس لئے کہ  
 آخرت میں اہل جنت کی فوات و طبائع بھی نعمت جنت کی طرح محسوس انوار ہوں گی۔ لہذا انوار انوار میں گھل مل  
 جائیں گے اور ہر پھل کا، نور اپنی اصل کی طرف لوٹ جائے گا یہ خلافت اس ابتدائی دخول جنت کے کہ اس وقت  
 حضرت آدم کی ذات جو تک تراپی اور ضعیف تھی اس لئے اس درخت کا پھل کھانے کی طاقت نہ رکھتی تھی میں نے کہا  
 کہ اس کا مقتضا تو یہ ہوا کہ اس وقت حضرت آدم نہ اس درخت کا پھل کھانے کی طاقت رکھتے تھے اور نہ جنت کے  
 کسی دوسرے پھل کی (پھر جنت میں رہ کر کھاتے کیا تھے) قرایا کہ جنت کے درخت اور جنت کی نعمتیں دو طرح کی ہیں  
 ایک تورہ قسم ہے جو خالص انوار ہیں کہ عالم دنیا کی نعمتوں میں کسی کے بھی مشابہ و ہم شکل نہیں ہیں۔ اور جنت  
 میں یہی قسم زیادہ اور کثیر ہے پس یہ تو نور محسوس ہیں جن میں نام کو بھی ثقل نہیں اور حضرت آدم کی ذات اس  
 کی طاقت اس وقت بھی رکھتی تھی، اور اسی نوع میں سے کھانے کی آپ کو اجازت دی گئی تھی۔ اور دوسری  
 قسم وہ نعمتیں ہیں جو نوعیت اور کیفیت میں عالم دنیا کی نعمتوں کے مشابہ و ہم شکل ہیں اگرچہ لذت و مزہ  
 میں بے حد فوقیت لئے ہوئے ہیں، اس نوع کی نعمتوں اور پھلوں میں ثقل و بوجھ ہے اور یہی وہ قسم ہے۔  
 جس کے کھاتے اور سہضم کرنے کی حضرت آدم میں طاقت نہ تھی لہذا اس کے کھانے کی حق تعالیٰ نے مانع فرمادی  
 تھی تاکہ جنت سے ان کا اخراج نہ ہو جائے اور جنت کی نعمتوں کے دو قسم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ  
 کے علم قدیم میں یہ بات تھی کہ اہل جنت کی دو حالتیں ہوں گی ایک حالت جو کہ غالب اور کثیر ہوگی اور وہ یہ ہوگی  
 کہ جنت میں جلنے کے بعد، دنیا و فانی کا خطرہ و خیال بھی ان کے عقل و قلب پر خطور نہ کرے گا اور دنیا اور اس کے  
 سارے معاملات اور اس کی تمامی لذتیں اور نعمتیں عقول و افہام سے غائب اور محو ہو جائیں گی۔ اس حالت میں  
 تو حق تعالیٰ ان کی میزبانی فرمائے گا قسم اول نعمت جنت سے جس میں نہ شمار دنیا کی مشابہت ہے نہ ثقل ہے کہ اسی  
 نوع سے کھائیں گے اور اسی نوع سے پیئیں گے اور دوسری طاقت جو شاذ و نادر کبھی کبھی ہوگی وہ  
 یہ ہوگی کہ دنیا فانیہ کا ان کو خیال آئے گا اور جن حالتوں میں یہاں تھے وہ مستحضر ہوں گی۔ لہذا ان کی تمنا کریں گے  
 اور فوراً ان کو حاضر و موجود پائیں گے اور یہ نعمتیں جو دنیا کی یاد پر ان کی حب و خواہش حاضر کی جائیں گی وہ قسم دوم  
 ہے جن کو شمار دنیا کا ہم شکل اور صاحب ثقل کہا گیا ہے، پہلی حالت یہ صورت اکمل ہے بلحاظ فکر بھی کہ اہل  
 جنت گویا اپنے رب کے ساتھ ہیں اور دوسری شے کی نہ ان کو خبر ہے نہ اس کا فکر و تخیل، اور بہت نعمت بھی اکمل  
 ہے کہ اصل نعمتیں جو اہل جنت کے لئے تجویز ہوئی ہیں اور جن کو جنیتوں کی حالت مقتضی ہے کہ لاشافی



و بے ثقل اور خالص نور ہوں، وہ یہی ہیں اور اکمل ہے دوام کے اعتبار سے بھی کہ اہل جنت کی حالت غالبہ اور اکثر یہ بھی ہوگی اور دوسری حالت بہر صورت ادنیٰ ہے ان باتوں میں بلحاظ مکر اس لئے کہ اس حالت تذکر دینا میں اگر یا وہ غیر حاضر و غائب ہیں شایدہ الہیہ سے اور یا خبریں اپنے نفوس سے کہ نفس سے باخبری ہی تو امور دنیا کے فکر و خیال کی طرف لائی حتیٰ کہ دنیا کی لذتوں اور نعمتوں کی تمنّا و خواہش کرنے لگے۔ اور مفتضا، جنت و بے نظری کے لحاظ سے ادنیٰ ہونا تو ظاہر ہی ہے کہ کہاں جنت کے مزے اور کہاں دنیا کی لذت اور اسی طرح بلحاظ دوام ادنیٰ ہونا بھی واضح ہے کہ یہ حالت کبھی کبھی اور گاہے گاہے ہوگی، مگر چونکہ حق تعالیٰ کو علم تھا کہ جنتیوں کو کبھی کسی وقت دنیا کی طرف بھی التفات ضرور ہوگا لہذا جنت میں طبیعت جنت کے موافق بھی نعمتیں پیدا فرمائیں جن میں مطلق ثقل نہیں اور اس التفات کی خاطر طبیعت جنت کے خلاف وہ نعمتیں بھی پیدا فرمائیں جن میں ثقل بھی ہے اور اہل دنیا کی نعمتوں کے ساتھ مشابہت بھی ہے تاکہ جنت جو ہر قسم کی خواہش پوری ہونے کا مقام ہے ادنیٰ خواہشوں کے پورا کرنے سے بھی عاجز نہ رہے، لیکن اہل جنت کی فوات طبع چونکہ جنت میں محکم انوار اور توی ترین ہوں گی اس لئے ان صاحب ثقل نعمتوں میں بھی ان کو ثقل محسوس نہ ہوگا جیسے قوی المفہم کو بھٹے اور بھوٹ کے کھاتے سے بھی کوئی گرانی محسوس نہیں ہوتی، اور حضرت آدمؑ کی ذات جب جنت میں گئی تھی تو چونکہ ان ذات اہل جنت کی بہ نسبت ضعیف تھی اس لئے ان صاحب ثقل نعمتوں میں ان کو ثقل محسوس ہوا جیسے بیماری سے اٹھے ہوئے کمزور شخص کے لئے روٹی دنا سخت ہوتا وہ بھی ثقل معلوم ہوتی ہے اور پیٹ میں درد کر دیتی بلکہ اسہال جاری کر دیتی ہے، الحاصل قسم دوم کا ثقل بھی صرت ضعیف و کمزور پر ظاہر ہوگا اور اس وقت بجز آدم علیہ السلام کے اور کوئی ذات ضعیف و کمزور موجود نہ تھی لہذا اسہال کا سبب ہوئی اور اسہال سبب اخراج بنا۔

حضرت معدوح نے فرمایا کہ اس درخت کا پھل کھانے سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کی عقل کا تعلق خالص اپنے رب کے ساتھ تھا کہ اپنے مصالح نفس سے بالکل غافل و بے خبر تھے مگر پھل کھا کر صورت حال پلٹ گئی اور عقل کا تعلق اپنی ذات کے مفاد اور نفس کے مصالح کے ساتھ ہو گیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ درخت کا پھل کھانے سے قبل ان کا جنت میں کھانا پینا محض تنعم و تفکھ کے درجہ میں تھا کہ نہ بھوک لگتی تھی نہ پیاس۔ اور اس لئے بھوک کے انتظام اور معاش کی تدبیر سے مستغنی وہ بے فکر تھے اور عقل کا تعلق محض رب کے ساتھ تھا کہ وہ حق تعالیٰ کی سطوت و جلالت شان کے سوچنے سمجھنے اور اس کے سامنے خضوع و خضوع اور عجز و نیاز ہی کی صورتوں میں غور و فکر کیا کرتی تھی، مگر جب اس درخت کا پھل کھا کر اسہال جاری ہوئے اور اس کے بعد بھوک لگی تو عقل کی توجہ ذات کی طرف مبذول ہوئی اور خیال ہوا کہ جب پیٹ خالی ہو گیا تو اب اس کو کس



چیز سے بھرتا چاہیے چنانچہ تدبیر معاش کا فکر ہوتے لگا اور عقل لبوٹی حق متوجہ تھی اب انتظام معشت اور بقا و ذات کی تدابیر میں لگ گئی اور اسی لئے حق تعالیٰ نے ان کو عالم تعب و مشقت میں اُتار دیا کہ فکر معاش میں عقل صرت کرنے کے لئے دنیا کو پیدا کیا گیا ہے نہ کہ جنت کو۔ اور چونکہ حق تعالیٰ کو علم تھا کہ ایسی صورت فریبشی آئے گی اور حضرت آدم کو دنیا میں یقیناً آنا ہوگا اس لئے جنت سے اتارنے کے قبل ہی دنیا میں ان کے لئے مساکن کے اسباب اور گدازان کے وسائل مہیا فرما دیئے تھے اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ جب مٹی اور گار سے حضرت آدم کی صورت مکمل ہو گئی اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ مٹی (جو میل بھر کے وسیع غار میں جمع کی گئی تھی بہت زیادہ مقدار میں تھی) اس لئے اس مٹی سے حق تعالیٰ نے وہ حیوانات پیدا فرمائے جن کی احتیاج دوبارہ معاش حضرت آدم کو پیش آنے والی تھی چنانچہ ان کی اصل خلقت بھی مذکورہ مٹی سے ہوئی کہ جب آدم علیہ السلام کو آسمان کی طرف اٹھایا گیا تو تمام حیوانات کیڑوں کی صورت میں اس مٹی کے اندر نمودار ہوئے اور حق تعالیٰ نے ہر نوع کے دس دس جانور یعنی پانچ پانچ نر اور مادیں پیدا فرمائے مثلاً شیر، چیتا، تیلو، وغیرہ پانچوں درجہ ایک نوع ہوئی اور گائے، بکری، اونٹ، وغیرہ ہر ایک کی پانچ پانچ قیس علیحدہ علیحدہ ایک ایک نوع قرار پائیں، اس کے بعد حق تعالیٰ نے اتنی زور کی بارش برساتی کہ اس جیسی کبھی کسی کے سُسنے میں بھی نہیں آئی اور ہر طرف سے سیلاب رواں ہو گئے اور ان کے ساتھ مٹی اور کچھ پتھر بے تعداد یہ بھر کر اس غار کی مٹی میں آملی اس سے ان حیوانات کو (جو چھوٹے چھوٹے کیڑوں کی صورت میں نمودار ہوئے تھے، بے حدود اور قوت پہنچی جیسے سماں کا موسم آجائے اور خوب پیداوار ہو اور کھیتیاں لہلہا جائیں) تو انسان کو وسعت معاش اور خوشحالی کی قوت پہنچا کرتی ہے جب نومہینے کے بعد حضرت آدم (جنت) اتر کر زمین پر آئے تو حیوانات کو زمین پر چلتے ہوئے پایا اور پایا دیکھا کہ حقوڑا حقوڑا بڑھ رہے ہیں لہذا ان سے مانوس ہونے لگے اور حق تعالیٰ نے ان کو اس کا علم بخشا کہ یہی (حیوانات) قیامت تک کے لئے تمہاری اور تمہارے اولاد کی معاش کا ذریعہ تجویز کئے گئے ہیں۔

نیز حضرت مدوح نے فرمایا کہ (غار میں) جس مقام پر حضرت آدم کا سر تھا وہاں حق تعالیٰ نے کھجور، انگور، انجیر اور زیتون کے درخت پیدا فرمائے چنانچہ جب نومہینے کے بعد حضرت آدم جنت سے اتر کر زمین پر آئے لہذا کھال کی وجہ سے پیٹ خالی ہو گیا اور بھوک لگ کر کھانے کی خواہش اور غذا کی طلب ہوئی تو حق تعالیٰ نے ان درختوں کے پھلوں میں ذائقہ ڈالا اور پہلے رزق جو میخدا اسباب معاش کے حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو عطا فرمایا وہ یہی پھل تھے کہ اس قلیل مدت میں باذن الہی یہ درخت پھل بے اُسے تھے میں نے عرض کیا کہ یہ حدیث جو مشہور ہے اکر مواءمتکمہ النخلہ فانتھا خلقت من طین آدم۔ احترام کرو اپنی پھوپھی



درخت کھجور کا کہ وہ تمہارے باپ آدم کی مٹی سے پیدا کی گئی ہے، صحیح ہے یا نہیں؟ فرمایا (مضمون اگرچہ صحیح ہے جیسا کہ مذکور ہوا مگر) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں ہے (لہذا حدیث کو موضوع کہا جائے گا چنانچہ علامہ ابن حجر علامہ زرکشی اور علامہ سیوطی وغیرہم حفاظ حدیث نے بھی اس کو موضوع لکھا ہے۔ پھر میں نے دریافت کیا کہ ان چار درختوں کے سوا کیا اور درخت بھی اس مٹی سے) حق تعالیٰ نے پیدا فرمائے؟ فرمایا ہر وہ درخت جس کا نام قرآن مجید میں مذکور ہے مثلاً غنجل کھجور، اعتاب انگور تین، انجیر، رمان، انار اور زیتون غرض جن پھلوں کا بھی نام قرآن میں آیا وہ سب حق تعالیٰ نے اسی مٹی سے پیدا فرمائے ہیں (اور اسی لئے ان پھلوں کو مزاج انسانی کے ساتھ موافقت زیادہ ہے کہ فائزہ اور لذت کے لحاظ سے بھی عام طبائع کو مرغوب ہیں اور قوت و فرحت کے اعتبار سے بھی عام مزاجوں کو ہر عمر اور ہر حالت میں مفید اور مقوی بدن و مفرح قلب ہیں۔

نیز آپ نے فرمایا کہ اللہ جل جلالہ کی تمامی مخلوقات میں بلحاظ آفرینش بنی آدم سے بہتر و خوبصورت کوئی مخلوق نہیں ہے ان کی ذات و اجسام ساری مخلوقات میں افضل و ارفع اور اقوم ہیں کہ ذی عقل شخص حیث ذات آدمی کی ہیئت ترکیب، اس کے اجزاء بدن اس کے جوڑوں اور رگوں کی ترتیب، اور ان ظاہری و باطنی خوبیوں میں غور کرے جن پر اس کی ساخت مشتمل ہے تو حیران ہو جائے اور اس کے صنائع و خالق کی عظمت معلوم کرے بے اختیار کہ اُٹھے فِتْيَانُ اللّٰهِ اَخْسَنُ الْخَالِقِيْنَ میں نے پوچھا کہ ذات ملائکہ پر بنو آدم کو کس امر میں فضیلت ہے؟ فرمایا جتنی مختلف و متعدد چیزیں ذات بنی آدم میں پیدا فرمائی گئی ہیں وہ ذات ملائکہ میں پیدا نہیں کی گئیں اور جتنی چیزیں ذات ملائکہ میں پیدا کی گئیں ہیں وہ سب مع شئی زائد ذات بنی آدم میں پیدا کی گئی ہیں چنانچہ فرشتہ کی (جسمانی) ترکیب نور سے ہوئی ہے اور اس نور میں عقل رکھی گئی ہے اس کے علاوہ ذات ملک میں اور کچھ نہیں ہے مگر ذات آدمی میں نور بھی ہے اور عقل بھی ہے اور ان کے علاوہ روح بھی ہے رنگ برنگ کی مٹی بھی ہے آگ بھی ہے ہوا بھی ہے پانی بھی ہے اور ان میں ہر چیز کے اندر اسرار قدرت الہیہ مضمر ہیں لہذا ایک ذات میں ان سب چیزوں کا جمع ہو جانا ان اسرار کو اس ذات میں قوی کر دے گا اور اس کو جامع الاسرار بنا کر افضل ترین مخلوقات بنا دے گا۔ الحاصل ذات آدمی مجموعہ ہے متعدد مخلوقات کا اور دوسری کوئی ذات اس جیسی (مجموعہ مخلوقات) نہیں ہے لہذا آدمی کی ذات تمامی ذات میں قوی تر ہوئی اور اسی لئے ربوبیت و قدرت الہیہ کے) جتنے اسرار کو یہ اٹھا سکتی ہے فرشتہ کی ذات بھی نہیں اٹھا سکتی اور یہی وجہ ہے کہ سیدنا مولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہی صورت و شکل عطا فرمائی گئی کہ آپ کی ذات مبارکہ اسرار ربانی برداشت کرنے میں تمامی مخلوقات سے قوی ترین معنی میں اگر کوئی درجہ ذات



ذات آدمی سے زیادہ قوی ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی کی صورت و شکل عطا کی جاتی۔

نیز آپ نے فرمایا کہ باوجود ذات آدمی کے احسن الذوات اور افضل ترین ہونے کے علم الہی میں طے ہو چکا تھا کہ ان کا ایک فریق جنت میں جائے گا اور ایک فریق بصیرتوں پر پردے پڑے ہونے کی وجہ سے دوزخ میں جائے گا اس لئے اولاً حق تعالیٰ نے اس ذات میں روح ڈالی اور عقل ڈالی جو کہ حقیقت ہے روح کی اور معرفت الہیہ ڈالی اور نور ایمان ڈالا مشاہدہ کے ساتھ اور اپنے اور اس کے درمیان کا پردہ اٹھالیا کہ اس کو اپنے خالق جل جلالہ کی معرفت بطریق اکمل حاصل ہو گئی اور اس وقت اَلْکُتُبُ بَرُکَتُہُمْ کا سوال فرما کر سبے اقرار و بوسیت لیا اور جب وعید کی تنفیذ کا ارادہ فرمایا تو ذات آدمی پر پردہ ڈال دیا کہ مشاہدہ جو کہ اس کو حاصل ہوا مقانائل ہو گیا اور بے تعلقی و انقطاع لاحق ہو گیا اور کاش جس وقت (ذات حق سے) یہ بے تعلقی واقع ہوئی تھی وہ کسی دوسری شے سے تعلق قائم نہ کرتا کہ یہ اس کے لئے اس حالت سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے جس میں وہ پڑ گیا اور امید تھی کہ قطع شدہ تعلق پھر واپس آ جاتا مگر اس نے تو یہ غضب کیا کہ اللہ سے توڑ کر عقل کے نور کا تار جو کس میں باقی تھا اس کو دیکھ کر اس پر ریجھا اور اس سے تعلق جوڑ لیا اور ہر شے میں اسی کو اپنا تکیہ گاہ و معتمد قرار دیا لہذا اللہ سے بے تعلقی میں اضافہ ہو گیا کیونکہ اس نے عقل کو اس نگاہ سے دیکھا کہ وہ میری ہے اور مجھ ہی سے پیدا ہوئی ہے اور ہر طرح بھروسہ کے قابل ہے اور ہر بات میں اسی کی طرف رجوع کرنے لگا پس اپنے نفس کے ساتھ استقلال اور اللہ سے اس کا انقطاع بڑھ گیا اور اگر عقل کی طرف اس کی نگاہ بائیں لحاظ جاتی کہ وہ اللہ کی طرف سے آئی ہے اور وہی ہر لحظہ اس کا محرک ہے تو یہی اللہ کی طرف رجوع بن جاتا اور وہ مشاہدہ جو زائل ہو گیا تھا پھر حاصل ہو جاتا۔ العز من نتیجہ یہ ہوا کہ تدبیر سے تعلق قطع کیا اور حادثہ کے ساتھ علائق قائم کیا۔ اور اگر کسی شے سے تعلق نہ رکھتا تب بھی اس کے لئے خیریت تھی نیز آپ نے فرمایا کہ جب آدمی نے ذاتی تدابیر اور امر معاش اور معاشرت مع الخلق میں عقل کے ساتھ تعلق والیتہ کیا تو چونکہ اللہ کو علم تھا کہ اس کی بدولت، وہ سیدھے راستہ سے ضرر و منخرت ہو جائے گا لہذا اس کی طرف تدبیر بھیجے تاکہ اس کو معرفت الہیہ کے راستہ کی طرف واپس لائیں پس ازل میں جو قرار پا چکا تھا اس کا ظہور ہوا کہ ایک گروہ نے پیغمبروں کا کہنا مانا اور ایک گروہ نے ان کو جھٹلایا پہلے گروہ کے کہنا مان لینے میں اتباع عقل سے کچھ علیحدگی ہوئی اور دوسرے گروہ کے جھٹلانے میں عقل کے ساتھ غایت درجہ کا تعلق اور اس کا کمال اتباع ثابت ہوا میں نے عرض کیا کہ وہ پردہ کیا تھا جو ڈالا گیا اور اس سے مشاہدہ زائل ہو گیا آیا وہ خون تھا جو رگوں میں جاری اور غفلت کا سبب یا کچھ اور؟ فرمایا دوسری ہی چیز تھی یعنی ظلمات جہنم میں کی ظلمت کہ وہ ذات کو پہنادی گئی اور اس نے حق تعالیٰ اور اس کی معرفت سے آدمی کو چھپا لیا۔ میں نے کہا کہ اس میں اور خون میں کیا نسبت ہے؟



فرمایا نسبت تو کچھ بھی نہیں ہے بجز اس کے کہ خون حق تعالیٰ سے بعد میں اضافہ کر دیتا ہے اور اس لئے  
 حجاب میں زیادتی ہو جاتی ہے مثلاً ایک شخص کا صغیر سن بیٹا ہو جو اس کو بے حد عزیز اور محبت دینا  
 میں آنکھوں کا تادم بنا ہوا ہو۔ اس کے چچک نکل آدے اور اس کے منہ اور تمام جسم کو گھیرے تو باپ کو برا بھلا  
 گھڑانا بنگیا ہے مگر اس سے نفرت نہ ہوگی بلکہ ترس آئے گا دل رکھے گا اندچہ کی تکلیف بے حد مشاق گدڑ  
 گئی وہ بچہ سے بھاگنے کا نہیں بلکہ اس کی محبت اتنی غالب آئے گی کہ اس مرض کو بڑا بھی نہ سمجھے گا اور بچہ  
 کو بچوے گا گود میں لے گا اور اس کو سونکھے گا ایسا کیوں کر رہا ہے؟ محض اس اتصال و تعلق کی وجہ سے  
 جو اس کے اور بچہ کے درمیان قائم ہے ورنہ اگر یہ بچہ کسی دوسرے کا اور اس سے اجنبی و بعید العلاقہ  
 ہوتا اور کسی شے میں بھی اس کے اور بچہ کے درمیان مناسبت نہ ہوتی تو اس سے بے انتہا نفرت کھاتا گھنیتا  
 ناک بھون چڑھتا دور بھاگتا اور حد درجہ اس سے بچتا اور پرہیز کرتا بس یہ مثال ہے خون کی مومن میں  
 اور کافر میں کہ خون بمنزلہ چچک کے اللہ سے بعید کرنے والی شے ضرور ہے مگر مومن میں نور ایمان و معرفت  
 اور تعلق مع اللہ موجود ہے اس لئے بجلتے نفرت و علیحدگی کے حق تعالیٰ کی مومن پر شفقت و محبت ہوتی  
 ہے اور اس لئے رحمت پر رحمت پرستی ہے اور کافر چونکہ اجنبی پنجکا اور اللہ سے ہر قسم کا تعلق قطع کر چکا  
 اور عقل کا بندہ بن کر مناسبت ہی کھو چکا ہے اس لئے اس کا خون جو سب غفلت ہے نفرت کا ملکہ کا  
 سبب بنتا اور حق تعالیٰ اس کو دور پھینک دیتا ہے پھر اس گروہ کے متعلق جس نے پیغمبروں کا کہنا مانا  
 حضرت ممدوح نے فرمایا کہ اس کی بھی دو قسمیں ہو گئیں کہ ایک فریق نے انکا کہنا مانا، مگر ایمان بالغیب  
 پر ٹھہر گئے اور مشاہدہ کی نہ طلب کی اور نہ وہ اسکو حاصل ہوا۔ یہ تو عامہ مومنین کہلاتے ہیں اور دوسرے فریق  
 نے کہنا مانا اور آگے مشاہدہ تک ترقی کی پھر بعض تو ان میں ہر دم اہل مشاہدہ بنے رہے اور دوسرے فریق نے  
 پروک گئی جن کا مشاہدہ استمراری ہوا وہ دائمًا ترقی و اضافہ پاتے رہے اور جن کا مشاہدہ رک گیا وہ دائمًا تنزل  
 اندکی میں آتے رہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے دو نیکر کسی دولت مند سے بھیک مانگنے کے گھرے  
 مکملے دونوں نے اس کے سامنے ہاتھ پھیلے اور ہر ایک نے اس سے ایک ایک درہم کا سوال کیا چنانچہ اس  
 دونوں کا سوال پورا کیا اور ایک ایک درہم ان کو دیا پس ایک تو درہم لے کر نیاز بن گیا اور اس کو کافی سمجھ کر  
 چل دیا اور دوسرے نے اکتفا نہ کیا بلکہ اس پر اضافہ چاہا چنانچہ دولت مند نے ایک موزونہ اور دیدیا پھر وہ زائد کا  
 طالب ہوا تو اس نے دس موزونہ دیدے پھر وہ اور زیادتی کا خواہاں ہوا تو اس نے ایک دینار طلائی دیدیا اب فرض کر کہ وہ بدتمیز بنا سنی ہے  
 اور اس کے پاس خزانہ بھی اتنے ہیں کہ داد و دہش سے نہ ان میں کمی آتی ہے نہ وہ ہتھم ہوتے نیز فرض کر کہ یہ سائل سوال سے تھکتا ہی نہیں  
 ہمیشہ دہر وقت اضافہ کا طالب رہتا ہے تو ظاہر ہے کہ عطا کسی حد پر رکھے گی نہیں اور ہمیشہ جاری اور بڑھتی رہے گی پس یہی حال ان اولیاء اللہ



کا ہے جن کا مشاہدہ استمراری ہے کہ وہ ہر لحظہ ابد الابد تک ترقی میں رہتے اور اللہ کے خزانہ لطف و کرم سے انوار  
درجلیات اور مشاہدات و باطنی کیفیات میں ترقی کے سائل و طالب بنے رہتے اور مولیٰ کریم کے دربار گہر بارگہ بھر پور  
عطاؤں سے روز افزوں مالا مال ہوتے رہتے ہیں حتیٰ کہ جس وقت ان کو موت آتی ہے تو اس کا بھی ان کو احساس  
نہیں ہوتا اس لئے کہ ان کی عقول ان کی احوال ان کی ذوات اور ان کے حس و شعور ان کے نفوس سب غیر اللہ  
سے منقطع اور بے تعلق ہوتے ہیں اور موت بھی چونکہ اللہ کی غیر ہے اس لئے اس کا بھی ان کو حس و شعور نہیں  
ہوتا یہ کلام اسی کے قریب قریب ہے جو پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ جو فانی ذات ذات باقی میں فنا ہو جاتی ہے  
اس کو یہ عرفی موت نہیں آتی اور یہ کہ موت کی دوا یہی ہے کہ باقی میں فنا و محو ہو جائے، واللہ اعلم  
(نوانے باب) فتح ظلماتی و فتح نورانی کا فرق اور محبت و مجذوب کی شناخت۔  
فتح یعنی مشاہدہ کی بہتری باتیں متفرق طور پر اس کتاب کے مختلف ابواب میں بیان کی جا چکی ہیں۔  
خصوصاً آیہ شریفہ و اذنا کنت اللیلۃ یا مریم ان اللہ اصطفیٰ و طہرک و اصطفیٰ علی النساء العالمین  
کے تحت میں امور باطلہ و فانیہ و ظلماتیہ کا مشاہدہ اور امور ثابۃ و باقیہ و نورانیہ کا مشاہدہ تفصیل کے ساتھ  
مذکور ہو چکا ہے اس کو دوبارہ غور سے دیکھ لو۔ نیز جو شخص بجاالت بیداری آنحضرت، صلی اللہ علیہ وسلم  
کی رویت کا دعویٰ کرے اس مسئلہ کے صفحہ میں بھی درباب پنجم سوال دوم یہ بحث آچکی ہے۔ اور حدیث  
شریف ان هذا القرآن انزل علی سبعة احراف کی نفیس و طویل بحث میں بھی فتح اہل کمال کا تذکرہ کیا  
جا چکا ہے اس لئے اس کا اعادہ بے سود اور تکرار محض سمجھ کر یہاں صرف وہ جدید باتیں بیان کرنی مقصود  
ہیں جن کو اس باب سے تعلق ہے۔

میں نے ایک مرتبہ حضرت ممدوح سے دریافت کیا کہ سقراط و بقراط اور افلاطون و جالینوس وغیرہ حکماء  
دنیا اور فلاسفہ کھر و منڈل نے عالم علوی کے متعلق جتنا کچھ بیان کیا ہے مثلاً نجوم اور ستاروں کی گردش اور جدا جدا  
ان کے الٹاک جھونک کرنے کے متعلق کہ قمر نلک اول میں ہے اور عطارد نلک دوم میں اور زہرہ نلک سوم میں اور  
شمس نلک چہارم میں اور رنچ نلک پنجم میں اور شتری نلک ششم میں اور زحل نلک ہفتم میں پھر ان کے قرآن  
باہمی پر حکم لگاتے ہیں کہ فلاں ستارہ جس وقت فلاں ستارہ سے ملتا ہے تو یہ اثر ہوتا ہے مثلاً ارزانی غلہ  
ہوتی ہے یا قحط واقع ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ کہ علم نجوم اسی کا نام ہے اور اس کے جاننے والے کو منجم اور جوشی  
کہا جاتا ہے یا مثلاً امور تعدیل نلک یہ علم ان کو کہاں سے حاصل ہوا حالانکہ خالص غیب ہے کہ افلاک تک کی  
رسائی نہیں ہوتی اور نہ ان باتوں کا ادراک بذریعہ حواس خمسہ ہو سکتا ہے اور نہ عقلی دلائل سے ان کا ثبوت محقق  
بن سکتا ہے پھر وہ اکو منسوب کرتے ہیں وحی کی طرف کہ کسی نبی کو حق تعالیٰ نے بذریعہ وحی اس پر مطلع فرمایا تھا۔



یہ بھی محتاج نقل ہے کہ وحی کے ذریعہ معلوم ہو کس بنی پر اترا تھا اور کس زمانہ میں) اور بعض روایات میں سیدنا  
 اور لیس علیہ السلام کی طرف اس کا انتساب اول تو مجمل ہے) اس تفصیل کے لئے رجوع مجاہدین و فلاسفہ مذکورین نے  
 بیان کی ہے کافی نہیں علاوہ ازیں سیدنا اور لیس علیہ السلام کا زمانہ بہت بعد ہو چکا اور اس کو مدت مدید گزر چکی  
 ثبوت کے لئے روایت متواترہ ہونی چاہیے، اور تو اترا اس طویل مدت میں یقیناً معدوم اور منتفی ہے اور یوں  
 کسی ایک دو کا کہنا کہ حضرت اور لیس سے چلا ہے خبر واحد کہلاتی ہے اور خبر واحد اس بارہ میں کافی اور مفید نہیں  
 اس لئے کہ یہ خبر دہندہ اگر کوئی فلسفی ہے تو ظاہر ہے کہ وہ دہر یہ منکر خدا اور رسول اور اہل کفر ہے اور خبر واحد  
 بجز ثقل رادی کے (جس کی پہلی شرط اسلام ہے کسی کی بھی مقبول نہیں) اور اگر منکر فلسفی نہیں کوئی اور ہے  
 تو وہ مجہول الحال ذرا معلوم الا ایمان ہے پتہ نہیں کہ مسلمان تھا یا غیر مسلم اس کے ایمان اور کفر کی تخلیق نہیں بہر حال  
 دریافت طلب یہ امر ہے کہ یہ علم کہاں سے چلا اور اس کی سند کیا ہے خصوصاً جبکہ اکثر مطابق واقعہ بھی  
 پڑ جاتا ہے تو اہل کفر و ضلال کو عینی حقائق ربانیہ کا علم کیسے حاصل ہوا (زبانا کہ حق تعالیٰ نے درجہ پیدائشی میں  
 نور اور ظلمت اور ہر ایک کے لئے اہل پیدا فرمائے کہ نور کے لئے اہل حق اور ظلمت کے لئے اہل باطل پس اہل حق  
 کو مشاہدہ کرایا جاتا ہے نورانی امور امدان کے تمامی متعلقات کا اور اہل باطل کو مشاہدہ کرایا جاتا ہے ظلمانی  
 امور کا کہ جس شے کو بھی تعلق ہے ظلمت سے وہ ان کی نظروں کے سامنے آتی اور اس کی معرفت ان کو حاصل  
 ہوتی ہے نور اور حق کیا شے ہے وہ تو اللہ پر ایمان لانا یعنی اس کے وجود کا یقین اور اس کی ربوبیت کا  
 اذعان اور اس امر کی تصدیق ہے کہ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بگزیدہ بنا لیتا ہے کسی کو کہنے کا  
 حق نہیں کہ فلاں کو شریف فنان یا اندام یا مجنوں الخ اس یا سیاہ نام یا نادار کیوں پیدا کیا اور فلاں کو دھنیا یا  
 بنیا یا عاتل یا حسین یا رئیس کیوں پیدا کیا یا یہ کہ فلاں کو موسیٰ یا دلی یا نبی کیوں بنایا اور فلاں کو کانریا یا ناسق  
 یا عامی کیوں بنایا یا نیز ایمان لانا یا بنیاد و رسل پر اور اللہ کے فرشتوں پر امد نامی ان چیزوں پر جن کو اللہ جل جلالہ  
 کی رضا و خوشنودی سے تعلق ہے اور ظلمت و باطل کیا چیز ہے؟ وہ کفر و شرک اور ہر وہ چیز ہے۔ جو اللہ  
 سے تعلق قطع کرنے والیکے ہے اور مجملہ ان کے خود دنیا امد نامی امور اور دنیوی حوادث و واقعات میں  
 کہ بہ سب اپنی طرف رجھاتے اور اللہ سے تعلق کو توڑا کر اپنا گویہ بناتے ہیں اور دنیا کے مجسم ظلمت ہونیکے  
 دلیل یہی کافی ہے کہ سرور عالم و عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں الدُّنْيَا مَلْعُونَةٌ وَمَلْعُونٌ مَا فِيهَا  
 اِلَّا ذِكْرُ اللهِ وَمَا دَالَا۔ دنیا ملعون اور رحمت حق سے دور ہے اور جو کچھ دنیا میں رساں و سامان ہے  
 سب ملعون ہے بجز اللہ کی یاد اور اس کے متعلقات کے کہ باوجودیکہ ان کا وقوع بھی دنیا میں ہوتا ہے مگر وہ  
 اللہ کی رحمت کے قریب ہے اور نور و حق ہے باقی سب فانی اور ظلمت و باطل ہے۔ غرض حق ایک نور ہے



انوار الہیہ میں سے اور اہل حق کی ذہانت کو پلا یا جاتا ہے، جس سے ان کے انوار معارف و حقائق کی شعاعیں پھیل جاتی ہیں اور باطل ایک ظلمت و تاریکی ہے جو اہل باطل ذوات کو پلائی جاتی ہے جس سے ان کی عقلیں سیاہ پڑ جاتی ہیں اور آنکھیں حق کے دیکھنے سے اندھی ہو جاتی ہیں اور کان حق بات کے سنے سے بہرے ہو جاتے ہیں بلکہ حق ان کی عقلوں میں پڑتا ہی نہیں اور نہ ان کے دل پر اس کا خطرہ گزرتا ہے حق ان کے نزدیک ایسا ہے جیسے پردہ عدم میں چھپی ہوئی چیز جس سے کبھی کان بھی آشنا نہ ہوئے ہوں یعنی وہ حق سے ایسے غافل و نا آشنا ہوتے ہیں جیسے صاحبان عقل معدوم سے غافل و نا آشنا ہوا کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اہل باطل رکناور مشرکین کو اس عالم دنیا میں اس کے آسمان اور زمین ہی کا مشاہدہ ہوا کرتا ہے اور ان میں جو امور فانیہ ہیں مثلاً اجرام حادثہ اور ان کی صورت و شہیت بس وہی نظر آتے ہیں ان کے اندر جو انوار الہیہ اور اسرار ربانیہ ہیں وہ مطلق نظر نہیں آتے چنانچہ انہیں پردہ حکم لگاتے ہیں مثلاً ستاروں پر کہ فلاں ستارہ کا مقام فلاں آسمان ہے اور فلاں ستارہ سے جب فلاں ستارہ کے گاتوا ایسا ہوگا مثلاً بارش برے گی یا قحط پڑے گا یا جنگ عظیم ہوگی یا امن و امان ہوگا) یا مثلاً ملکی مختلف زبانوں کو بروج پر بانٹ دیا ہے کہ عربی زبان منسوب ہے بروج عقرب کی طرف، اور فارسی میں منسوب ہے برج سنبل کی طرف وغیرہ باقی اسی دنیا کی نورانی چیزیں مثلاً قبر مطہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اور وہ نور جو قبر مطہر سے دراز ہو کر آپ کے مقام برزخی یعنی قبہ برزخ تک جا پہنچا ہے یا مثلاً اولیاء عارفین کی ذرات مبارکہ یا ارواح مومنین جو صحن ہائے قبور میں ہیں یا مثلاً ملائکہ محافظین کرام کا تبین اور وہ فرشتے جو غبار آتے جاتے ہیں مثلاً نماز فجر میں آتے ہیں اور دن بھر کے اعمال مخلوق کھکھ کر مغرب کے وقت چلے جاتے ہیں اور ان کی جگہ دوسری جماعت نماز مغرب میں آ جاتی اور رات بھر کے اعمال خلق کھکھ کر صبح ہوتے چلی جاتی ہے، اور ان کے علاوہ وہ اہل و تجلیات جو وصول الی اللہ کا سبب و ذریعہ ہیں اور ان کو حق تعالیٰ نے دنیا میں رکھ دیا ہے اور جو درجہ یہ سب چیزیں دنیا ہی میں ہیں مگر چونکہ حق اور نور ہیں اس لئے، ان کو بالکل نظر نہیں آتے نہ ان کی معرفت کا ذکر مشاہدہ ہوتا ہے اور نہ یہ چیزیں کبھی ان کی عقل میں آتی ہیں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کو ظلمتوں سے سیراب کیا ہے اور حق کی معرفت و شناخت سے قطعی بے تعلق بنا دیا ہے۔ حتیٰ کہ اس اہل باطل کو اگر لوح محفوظ بھی نظر آوے جس میں قرآن مجید مکتوب ہے جو کہ نور اور شفا ہے قلبی امراض کے لئے تو اس کی کھوٹی بصیرت کو روح کا صر جرم ہی جرم دکھائی دے گا اس میں کھسے ہوئے عامی کلام اللہ کا ایک حرفت بھی دکھائی نہ دیکھا اسی طرح اہل ظلمت کو حق تعالیٰ کے ان اسرار و حکم میں سے جو اس نے آسمانوں میں رکھے ہیں نہ کوئی سیر الہی نظر آئے گا اور نہ بشمار ملائکہ میں کسی فرشتہ کا مشاہدہ ہوگا نہ ان کی تسبیح سنائی دیگی نہ جنت نظر آئے گی نہ لوح، نہ قلم، نہ وہ انوارِ جودت



جو قلم سے نکلتے ہیں علیٰ ہذا نہ وہ حق سبحانہ کو پہچان سکیں گے جو کہ ان کا خالق ہے اور نہ اُس کی صفات جلال و جمال سے آگاہی پاسکیں گے (وضے) سورج گرہن کے وقت یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کتنی مقدار گہر چکا ہے ایک سفید شیشہ کو آگ کے دھویں سے سیاہ بنا لیتے ہیں اور اسی کو آنکھ پر رکھ کر سورج کی طرف دیکھتے ہیں تو ٹیکہ صدا ت نظر آتی ہے اور اس کا نور بالکل نظر نہیں آتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ بے نور کا گول جرم ہے بس یہی صورت ہے اہل ظلمت کے کشف کی کرا جرم محضہ نظر آتے ہیں اور ان کے انوار قطعاً نظر نہیں آتے۔ اطباء کی نظر عامی اعضاء و بدن پر کسی مگر روح کو نہ سمجھ سکے بجز اس کے کہ خون یا حرارت غریزہ کو کہ وہ بھی جرم یا عرض ہے روح قرار دیا۔ کفار و مشرکین نے پیغمبروں کو عامہ بشر کی طرح سمجھا اور نوروحی و تجلیات جوت کو ادراک نہ کر سکے۔

غرض انکو اللہ نے اپنی ذات اور ہر اُس شے سے جو موصول الی اللہ ہے محبوب بنا دیا ہے اور اس کے علاوہ دوسری چیزیں ان پر منکشف فرمادی ہیں جو اللہ سے بے تعلق بنا کر ان کے لئے مضر بن رہی ہیں اور نفع حاکم بھی نہیں پہنچا رہیں۔ پس فلاسفہ ملعونین کی دی ہوئی ساری جہریں اسی قبیل سے ہیں اور اس بارہ میں جو بھی انہوں نے حکم لگائے ہیں وہ سب غلط اور نادرست ہیں کہ حوادث عالم کو ستاروں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کا فاعل اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہے جو کہ ستاروں کا بھی خالق ہے اور اسی لئے حدیث قدسی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور اپنے رب کریم سے روایت کی ہے کہ صبح ہوتی ہے تو میرے بعض بندے مجھ پر ایمان لائے ہوئے اٹھتے ہیں، اور میرے بعض بندے میرا کھروانکار کرتے ہوئے اٹھتے ہیں جس کی شرح یہ ہے کہ جو کہتے ہیں ہم پر بارگاہ برسی اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے تو وہ مجھ پر ایمان لائے اور ستاروں کے منکر ہوئے اور جنہوں نے کہا کہ ہم پر بارش برسی نلاں ستارہ کے نلاں بُرج میں جانے کے سبب وہ میرے منکر ہوئے اور ستاروں پر ایمان لائے۔ پس فلاسفہ کو (خدا کی ان پر پھٹکار) حق تعالیٰ نے اپنی معرفت سے محبوب فرمادیا اور ان کی عقول کو ستاروں کے ساتھ والیتہ و متعلق بنادیا تاکہ ان ہی میں بھنسے رہیں اور ان پر اس وعید کا نفاذ کیا جائے جو ان کے لئے مقدر ہو چکی ہے علاوہ ازیں وہ ربط و تعلق جس کا یہ لوگ احکام نجوم میں ذکر کرتے ہیں کہ نلاں ستارہ کے نلاں بُرج میں جانے کو مثلاً تعلق ہے بارش ہونے سے) سو اگرچہ یہ بھی فعل الہی ہے کہ ستارہ کے اس بُرج میں جانے اور بارش ہونے میں باہم ارتباط اور وقتی اتحاد پیدا فرمادیا ہے، تاہم اس ربط کی تعیین میں بھی کبھی کوئی بات ٹھیک ہو جاتی ہے ورنہ اکثر باتیں خطا اور غلط ہوتی ہیں چنانچہ صد ہا پیش گوئیاں منجھن کی رات دن غلط اور خلاف واقعہ ظاہر ہوتی رہتی ہیں برخلاف اہل حق کے کہ ان کو امر و دل کا بھی شاہد ہوتا ہے اور امر ثانی کا بھی اول الامر کا شاہدہ تو انہیں تمام چیزوں کا شاہدہ ہے جن کا ذکر ہوا کہ اہل ظلمت کو اس عالم دنیا میں ہوا کرتا ہے مثلاً آسمان کا اور زمین کا چنانچہ عارت دلی شاہدہ کرتا ہے ساتوں



زمین کا اور جتنی چیزیں بھی ان میں ہیں ان سب کا، اور مشاہدہ کرتا ہے ساتوں آسمان کا اور جتنی بھی چیزیں ان میں ہیں ان سب کا اور مشاہدہ کرتا ہے بندوں کے افعال کا جو وہ اپنے گھروں کے اندر کرتے ہیں۔ اور ان آنکھوں سے نہیں دیکھتا بلکہ وہ اپنی چشم بصیرت سے دیکھتا ہے جس کو نہ کوئی پردہ روک سکتا ہے نہ دیوار اسی طرح وہ مشاہدہ کرتا ہے امور مستقبلہ و آئندہ کا کہ مثلاً نلاں نلاں یہ ہوگا اور نلاں مہینہ میں یہ ہوگا اور نلاں سن میں یہ ہوگا۔ اس مشاہدہ میں تو یہ حضرات اور اہل ظلمت بالکل برابر ہوتے ہیں اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ کشف، ولایت کا ضعیف ترین درجہ ہے یعنی اس لئے کہ اہل حق کسے پاس بھی پایا جاتا، اور اہل باطل رجوگیوں، سادھوؤں، شرکوں، کافروں کے پاس بھی پایا جاتا ہے۔ اور نیز اس لئے کہ صاحب کشف ولی کی حالت قابل اطمینان نہیں جب تک اس مقام کو طے کر کے آگے نہ بڑھ جائے ہر وقت خطرہ ہے کہ کہیں اللہ سبحانہ سے قطع تعلق ہو کر اہل ظلمت میں نہ جا ملے اور ثانی الامر کا مشاہدہ یہ ہے کہ اس کو حق تعالیٰ کے اسرار نظر آتے ہیں جن سے اہل ظلمت کو محروم و محجوب بنادیا گیا ہے چنانچہ وہ مشاہدہ کرتے ہیں اللہ کی معرفت و اسے اولیاء کا اور باوجود بعد مسافت کے ان سے اس طرح باتیں کرتے ہیں جیسے حلیس اپنے حلیس سے باتیں کیا کرتا ہے۔ اسی طرح وہ مشاہدہ کرتے ہیں قبور کے اوپر اسرار مومنین کا کرام کا تبیں کا ملائکہ کا عالم برزخ کا، اور ان مردوں کی روحوں کا جو برزخ میں مقیم ہیں نیز وہ مشاہدہ کرتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف کا اور اس نورانی کستون کا جو مزار مبارک سے ممتد ہو کر قبہ برزخ تک پہنچا ہے مگر ان مشاہدوں میں بھی خطرہ رہتا ہے کہ کہیں دل بستگی نہ ہو جائے، پھر جب بحالت بیداری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ کا مشاہدہ نصیب ہوتا ہے تو شیطان کے تلاعب سے امن و اطمینان مل جاتا ہے کہ کیونکہ رحمت الہیہ کے ساتھ اجتماع حاصل ہو گیا۔ یعنی سیدنا و مولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ (کہ مقتضاء و ما ادرسلناک الا رحمۃ للعالمین) مجسم رحمت الہیہ آپ ہی کا وجود باوجود ہے، پھر ولی کافات شریفہ کے ساتھ اجتماع سبب بنتا ہے اللہ سبحانہ کی معرفت اور ذات ازلیہ الہیہ کے مشاہدہ کا کیونکہ ذات محمدی کو مشاہدہ الہیہ میں محو و مستغرق پاتا ہے لہذا ہر برکت ذات محمدی ولی کا تعلق اللہ سبحانہ سے ہر لحظہ برقرار رہتا ہے اور وہ شیئاً فشیئاً معرفت الہیہ میں ترقی پاتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کو بھی مشاہدہ ربانیہ اور اسرار معرفت و انوار محبت نصیب ہو جاتے ہیں اور یہی مشاہدہ ثانیہ حد فاصل ہے اہل حق اور اہل باطل کے درمیان ورنہ مشاہدہ اولیٰ تو جیسا ان کو ہوتا ہے ایسا ہی اہل ظلمت کو بھی ہوتا ہے کہ امور ربانیہ ان پر منکشف بھی ہو جاتے ہیں اور ان میں تصرفات کرتے پر بھی وہ قدرت رکھتے ہیں چنانچہ اہل باطل کو دیکھو گے کہ دریا پر چل رہا ہے (خشک زمین کی طرح) اور ہوا میں اڑ رہا ہے (پرند کی طرح) اور غیب کے پاس کھانا آرہا ہے حالانکہ وہ کھانا کافر اور اللہ کا منکر ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ



نے نور کو پیدا کیا اور نور سے فرشتوں کو پیدا فرمایا اور ان کو اہل نور کا ناصر و معین بنایا کہ مقتضائے ایمان کے موافق اور راہِ راست پر قائم رکھنے اور خرقِ عادت و کرامات صادر کرنے میں، ان کی مدد و اعانت کرتے رہیں۔ اسی طرح مظلمت کو پیدا کیا، اور ظلمت سے شیاطین کو پیدا فرمایا اور ان کو اہل باطل کا ناصر و معین بنایا کہ استدراج اور اضافہ خسار اور خرقِ عادت امور کی قدرت میں ان کی مدد و اعانت کرتے رہیں اور اسی اصول پر حضرت ابراہیم خواص اور یہودی کا قصہ متفرع ہوگا کہ ایک کشتی میں دونوں کا اتفاقہ ساتھ ہو گیا اور باہمی تعارف ہو کر معاشرت میں باہم رفاقت ہو گئی۔ یہودی نے حضرت شیخ سے کہا اگر تمہارا دین سچا ہے تو سطحِ دریا پر چلو اور میں اتر چلتا ہوں یہ کہہ کر وہ اٹھا اور پانی پر چلنے لگا۔ حضرت ابراہیم خواص نے دل میں کہا اگر یہ یہودی مجھ سے بڑھ گیا تو دین اسلام کے لئے، بڑی ذلت ہے، یہ کہہ کر آپ نے اپنے آپ کو دریا میں ڈال دیا حق تعالیٰ نے مدد فرمائی اور آپ بھی پانی پر اسی طرح (بے تکلف) چلنے لگے جیسے یہودی چل رہا تھا۔ جب کنارہ پر پہنچ کر دونوں دریا سے باہر نکلے تو یہودی نے کہا میں سفر میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ حضرت ابراہیم نے فرمایا میری طرف سے اجازت، یہودی نے کہا مگر شرط یہ ہے کہ نہ تو ہم مسجد میں جائیں کہ وہ مجھے پسند نہیں، اور نہ آپ گرجا میں جادیں کہ یہ تمہیں پسند نہیں اور شہر کے اندر بھی نہ جائیں کہ لوگ کہیں گے مسلمان اور یہودی ساتھ ساتھ ہیں۔ پس جنگلوں اور بیا بانوں میں پھرتے رہے اور کھانا پینا کچھ ساتھ نہ لیں۔ آپ نے فرمایا اچھا منظور ہے چنانچہ تین دن کامل بنوں میں پھرتے رہے اور دونوں کو کوئی چیز چکھنے کو بھی نہ ملی (تین دن کے بھوکے پیاسے ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک کتا آیا جس کے منہ میں تین روٹیاں تھیں۔ یہودی کے پاس پہنچ کر اس نے تینوں روٹیاں اس کے سامنے ڈال دیں اور چلا گیا۔ ابراہیم خواص فرماتے ہیں کہ اُس نے میری صلاح بھی نہ کی اور باوجود مرافقت کے، اتنا بھی نہ کہا کہ آؤ کھا لو۔ اس نے تینوں روٹیاں کھالیں اور میں بھوکا (صبر کئے، بیٹھ رہا) محفوظی دیر بعد میرے پاس ایک نوجوان آیا نہایت خوبصورت حسین جس کے بدن سے خوشبو مہک رہی تھی اور اس کے ہاتھ میں کھانا تھا بے نیظر کہ اس جیسا کبھی دیکھنے میں بھی نہیں آیا۔ اس نے وہ کھانا میرے سامنے رکھ دیا اور چلا گیا۔ میں نے یہودی سے کہا کہ آؤ کھا لو۔ مگر اس نے اسکار کیا اور اس لئے میں نے تنہا شکم سیر ہو کر کھا لیا اس کے بعد یہودی کہنے لگا کہ ابراہیم مذہب تو ہمارا تمہارا دونوں کا حق ہے، اور موصیٰ الی اللہ ہے اور دونوں پر شرع مرتب ہوتا ہے کہ دونوں پانی پر چلے اور دونوں کو عینب سے روزی ملی، مگر اتنا فرق ہے کہ تمہارا مذہب صاف ستھرا لطیف چمکدار اور خوبصورت زیادہ ہے پس تمہاری رائے ہو تو میں بھی تمہارے مذہب میں داخل ہو جاؤں چنانچہ مسلمان ہو گیا اور ہم رے دستوں میں سچا صوفی بن یہ قصہ النعمیم نے حلیہ میں نقل کیا ہے۔ میں نے اس کے متعلق حضرت ممدوح سے دریافت کیا تو فرمایا



ان خانہ خراب تہید ستون کے ساتھ شیاطین کھیل کیا کرتے اور خرق عادت امور ان سے صادر کرایا کرتے ہیں۔ تاکہ وہ سمجھیں کہ اپنے مذہب کے موافق عبادت کرنے کا بھی کچھ ثمرہ ہے حالانکہ عبادت کا یہ ثمرہ ہی نہیں اس کا ثمرہ تو حب الہی عظمت رسول معرفت حقائق اور انوار تجلیات حقہ ہیں جو مسلمان ہوتے بغیر نصیب نہیں ہو سکتے، نیز حضرت ممدوح نے فرمایا کہ فلسفی علوم اور عالم علوی کے متعلق حکم لگانے کی اصل یہ ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ وعلی نبینا السلام کے زمانہ میں ایک شخص تھا جو آپ پر ایمان لے آیا تھا اور آپ کو جو مشاہدے ملکوت سموات وارض کے ہوا کرتے اور ان کے متعلق جو باتیں آپ ذکر فرمایا کرتے ان کو وہ سناتا تھا۔ ایک مدت اسی حالت پر گزری حتیٰ کہ حق تعالیٰ نے اس کو بھی مشاہدہ نصیب فرمادیا مگر جس عالم کا اس کو مشاہدہ ہوا اسی پر وہ رُک گیا کہ اس کو کمال اور اپنے کو کامل سمجھ کر نازاں ہو گیا، اور اللہ سبحانہ سے تعلق قطع کر بیٹھا کہ اس کی طلب و تمنا ہی دل سے نکل گئی، خیر الدنیا و الاخرہ کا مصداق بن گیا (کہ نہ ادھر کارہا نہ اُدھر کارہا) عالم علوی کا مشاہدہ کرتا اور اس پر اتر آیا کرتا، ستاروں کے مقامات بیان کیا کرتا، اور احکام کا ان کے ساتھ ربط دیا کرتا کہ فلاں ستارہ کے فلاں برج میں جانے کا حکم یہ ہے کہ خوب مینہ برسے وغیرہ وغیرہ۔ دین ابراہیمی سے بھی پھر گیا اور مرتد بن گیا۔ بدین اور حرمان نصیب لوگوں نے اس علم کو اس سے حاصل کرنا شروع کر دیا اور ہوتے ہوتے یہ فن ملعون اہل فلاسفہ تک پہنچ گیا نیز آپ نے فرمایا کہ وہ شخص شدید غضب الہی میں مبتلا ہوا کیونکہ اس نے غیر اللہ کا راستہ دکھایا اور جو غیر اللہ کا راستہ دکھایا کرتا ہے وہ اللہ سے قطع تعلق والی جماعت میں شامل ہو جاتا ہے نیز آپ نے فرمایا کہ نبوت و رسالت کا فائدہ ہی صرف رہبری ہے، اللہ کی طرف اور غیر اللہ سے تعلق قطع کرا کے، سمیٹ لانا ہے اللہ کے حضور۔ فرض کر دے کسی کو نبوت و رسالت دی جائے اور وہ بغرض محال غیر اللہ کا راستہ دکھانے یا لوگوں کو اپنا گریہ بنانے اور اللہ سے قطع تعلق کرانے لگے تو اس کا حکم بھی اسی شخص کا سا ہوگا۔ حالانکہ نبی سے ایسا ہونا قطعاً ناممکن اور محال ہے مگر اس امر محال کو فرض کے درجہ میں محض غیر اللہ کی رہبری سے نفرت دلانے کے لئے ہم نے مبالغہ کے طور پر ذکر کیا ہے۔

(ف) جسے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلَئِنْ أَتَيْتَ أَهْوَآءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ إِنَّكَ إِذْ طُوِيَ الظَّالِمِينَ دَرَأَ مُحَمَّدٌ أَفْضَلُ مَحَالِ تَمَنَّى عِلْمَ آتَمِ بَحِيحِ كَافِرِينَ خَوَاشَاتِ بَا تَبَاعِ كَمَا تَوْتَمُّ بَحِيحِ ظَالِمِينَ سَعَى هُوَ جَاوِغٌ کہ یہ طریق کفار کے اتباع سے نفرت دلانے کے لئے علی سبیل المبالغہ ذکر کیا گیا ہے، ورنہ پیغمبر سے خصوصاً سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم سے محال ہے کہ کفار کے کسی خیال کا بھی اتباع کریں۔ کاش دنیا طلب پروردگار کے مریدین اور مدعی نبوت شخص کے معتقدین کو یہ سمجھ کر اللہ جل جلالہ کی عدالت عالیہ میں پیشی کا وقت بہت قریب آگیا ہے اپنے پیشواؤں کو بنظر غور و انصاف اس کسوٹی پر کس لینا چاہیے کہ انہوں نے اللہ کا راستہ



دکھانے کی کوشش کی اور اہل غفلت مجبین دنیا کو زائد دعا شوقان خدا بنایا اور بنا رہے ہیں، یا اپنی خدمت، اپنی عقیدت، اپنی محبت، اور اپنے جاہ و مال کی بیشی، اور چند دن کا سبق پڑھایا ہے اور عشاق دنیا بنا رہے ہیں، اس تقریر کے وقت ہم باب المہدید کے پل پر عبور کر رہے تھے کہ حضرت مدوح نے فرمایا بناؤ یہ پل کیوں بنایا گیا ہے اور اس کا نفع کیا ہے؟ میں نے عرض کیا اس کا نفع یہ ہے کہ لوگ اس پر چلیں اور تعبد دیا کے خطرات سے محفوظ رہیں اور باطن و امان منزل مقصود تک پہنچ جائیں۔ فرمایا اگر یہ نفع اس سے اٹھا لیا جائے تو یہ لوگوں کے لئے ضرر فاسد اور بیکار محض بن جائے گا یا نہیں؟ میں نے کہا ہاں، بیشک رہے تو فضول بلکہ گھیرنا اور وقت کا ضائع کرنا ہے، فرمایا میں یہی حال انبیاء و مرسلین اور ملائکہ مغربین اور عباد صالحین اور عارفین کا ہے کہ وہ بحر غفلت میں ڈوبنے سے بچانے کے لئے بمنزلہ پل کے ہیں، تاکہ اللہ سبحانہ تک پہنچنے کی رہبری فرمائیں اور چار طرف سے مخلوق کو سمیٹ کر آستانہ خدا پر لا ڈالیں۔ اگر یہ فائدہ اُن سے جاتا رہا اور ان کے ذریعہ نہ رہے عن دنیا اور قور الی اللہ حاصل نہ ہوئی تو ظاہر ہے کہ وہ بے کار و عبث پل کے مثل محض ہو چکے اور بار بار منگئے۔ واللہ اعلم۔

نیز فرمایا کہ کالمین اہل حق سے اگر واقعات آئندہ کے متعلق کوئی بات پوچھی جاتی ہے تو بجز اس کے کہ مختصر سی کوئی بات کہہ دیں زبان سے کچھ بھی نہیں نکال سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا مشاہدہ انہوں نے شروع زمانہ میں کیا تھا اور اس کے بعد ان کو حق تعالیٰ کا مشاہدہ نصیب ہو گیا اور مشاہدہ حوادث مخلوق کا، باطل ہوتا معلوم ہو گیا۔ لہذا وہ خود پیش گوئی کو بھی بُرا سمجھتے ہیں اور اس کی زبان سے نکالنے کو بھی بُرا سمجھتے ہیں۔ نیز حوادث و واقعات چوتھے امور زمانہ اور دنیا میں داخل ہیں، اس لئے عند اللہ میغوض ہیں اور جو چیزیں عند اللہ میغوض ہوتی ہیں وہ اولیاء اللہ کے نزدیک بھی میغوض ہوتی ہیں اس لئے اس میں پڑتا ان کو ناگوار گذرتا ہے نیز حوادث مستقبلہ کی خبر دنیا اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے درجہ سے ایسا نیچے اتریں جیسے ثریا آسمان کی زمین کی طرف اترے کیونکہ ان حوادث کا درجہ اہل ظلمت کے کشف کا درجہ ہے جو گویا تحت الشری ہے۔ اور تنزل ظاہر ہے کہ عالی مرتبہ کو پسند نہیں نیز اہل اللہ کو جو مشاہدہ ہوتا ہے وہ بذریعہ انوار الہیہ کے ہوتا ہے اور نور الہی میں زمانہ اور اس کی ترتیب مرفوع ہو جاتی ہے کہ نہ ماضی رہتا ہے نہ حال نہ مستقبل۔ اس لئے ولی کو اکثر نور حق سے بس اتنا معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ واقعہ ضرور ہو گا۔ باقی یہ بات کہ نلال دن اور نلال وقت ہو گا جب تک نیچے اس مقام پر نہ اترے جہاں زمانہ اور اس کی ترتیب کا اعتبار ہے اس کو مطلق معلوم نہیں ہوتا۔ یہ ان کے نزدیک بمقابلہ نور حق کے ایک ظلمت ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے آفتاب اپنے آسمان سے جہاں وہ قیڈان و مکاں سے مستغنی و بالا ہے، نیچے اتر کر اپنی آنکھوں پر عینک لگالے اور اس کے ذریعہ اپنی ماتحت دنیوی دنیا کی چیزوں کو دیکھنا شروع کر دے۔ میں نے کہا کہ حق تعالیٰ نے کوئی واقعات آئندہ کا بھی



علم ہے، اور ان کے زمانہ اور ترتیب کا بھی علم ہے اور یہ تفصیل بھی معلوم ہے کہ یہ واقعہ ماضی کا ہے، اور یہ حال کا ہے، اور یہ مستقبل کا ہے جب ولی ہر چیز کو بنور الہی دیکھتا ہے تو اس کو بھی درجہ ظلمت کی جانب اترے بغیر واقعات عالم ترتیب زمانی کے ساتھ یہ تفصیل معلوم ہو جانے چاہتیں فرمایا حق تعالیٰ کو یہ (ترتیب و تفصیل) اس لمحہ معلوم ہے کہ اس کا علم ہر شے کو محیط اور قوی ہے برخلات بندہ کے کہ وہ ضعیف ہے اور اس کا علم قاصر ہے لہذا بندہ کو رب متعال پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ دیکھو سیدنا خضر علیہ السلام نے ایک چڑیا کو سمندر پر پانی پیتے دیکھ کر سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ میرے سارے علم اور تمہارے سارے علم کے مجموعہ نے، اللہ کے علم میں اتنی بھی کمی نہیں کی جتنی اس چڑیا کی چونچ نے سمندر کے پانی میں کمی کر دی ہے رجب پیغمبر کے تمام علوم تشریعی اور سید الاغواث کے تمام علوم تکوینی کے مجموعہ کو علم الہی سے اتنی بھی نسبت نہیں جتنی چونچ بھر پانی کو بخربا پید کنار کے پانی سے نسبت ہے تو پھر بندہ کے علم کو حق تعالیٰ کے علم پر کیسے قیاس کر سکتے ہیں، نیز آپ نے فرمایا کہ کبھی ولی اپنے درجہ سے نیچے اتر کر کسی واقعہ آئندہ کی خبر دے بھی دیا کرتا ہے اور یہ کوئی معصیت نہیں، مگر کوتاہ سمجھی ولی اپنے درجہ سے نیچے اتر کر کسی واقعہ آئندہ کی خبر دے اور درجہ عظمیٰ سے انحطاط ضرور ہے اور اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس قسم کی خبروں کا صادر ہونا مطلوب ہو تو ربا گاہ محمدی (کا) سودا دے بھی ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت نہ تھی کہ پیشین گوئیوں کو پسند فرمائیں اور شاہدہ خالق کو چھوڑ کر شاہدہ مخلوق کی طرف آئیں علاوہ ازیں اکثر اولیاء کا ملین کی پیشین گوئیاں نفس کی خواہش سے نہیں ہوتیں بلکہ یہ حکم تقدیر صادر ہوتی ہیں کہ حق تعالیٰ نے اُن واقعات آئندہ کا اظہار چونکہ ان کی تقدیر میں لکھ دیا تھا اس لئے ان کو اپنے ارادہ ازلیہ کا آلہ کار بنایا کہ یہ حضرات مظاہر حق ہوتے ہیں اور حق تعالیٰ جو کام بھی ان سے لینا چاہتا ہے وہ خواہش کے موافق ہو یا نہ ہو۔ بہر حال اس کے ظہور کے لئے اپنا تسلیم خم کر لیتے ہیں) اب جامع کتاب کہتے ہیں کہ مخلوق کو ادب اللہ کی شناخت اور ان کی صحبت اختیار کرنے میں زیادہ تر مضرت اسی بحث سے پہنچی ہے شناخت کے متعلق اس کی بڑی مضرت تو یہ ہے کہ عام لوگ اہل حق کے کشف میں اور اہل ظلمت کے کشف میں فرق نہیں سمجھتے اور اس لئے ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ جس کے بھی کشفی علوم عامہ مخلوق کے علوم بڑھ جائیں گے اور ایسے خارق عادت امور اس سے صادر ہوں جو عوام کی طاقت سے باہر ہیں، وہ کامل ہے اور اہل حق ہے اور اللہ کا ولی ہے بلکہ جو دہوں صدی کے بعض مسلمانوں نے تو اسی کو معیار نبوت قرار دیکر مرزا قادیانی کو نبی مان لیا اور پیشین گوئیاں بھی صرف طاعون کی، یا کسی کے مرنے کی یا کسی عورت کے اپنے نکاح میں آنے کی اور ان میں بھی اکثر کے جعوں ثابت ہو چکے ایسی رکیک تادیلیں گھڑیں جن کو سنکر منہ ہی آتی ہے) پس ایک فرق کا عقیدہ تو یہ ہو گیا کہ جسے کشف ہوتا ہو چکا کافر ہی کیوں نہ ہو مگر وہ ولی ہے اور ولایت کا صرف یہی مقصود اور منہا ہے۔ اور ایک جماعت اس کی معتقد



ہو گئی کہ جس کو بھی ظاہری نماز روزہ پر پابندی و دوام حاصل ہو اگرچہ اس کا باطن اللہ سے خالی اور غیر اللہ سے  
والبتہ ہو وہ ولی ہے حالانکہ ولایت نام ہے اللہ کی محبت و عشق اور اس لگن کا جو عبادات ظاہریہ میں پابندی  
کے ساتھ ساتھ اخلاص اور کشش پیدا کرے۔ مانا کوئی پھل بغیر چھلکے کے قائم اور محفوظ نہیں رہ سکتا لیکن اگر اس  
کے اندر رس اور مزہ نہ ہو تو خالی چھلکے کا نام کوئی آم بھی نہیں سکتا۔ صوفیہ کے کلام میں جہاں بھی زاہد خشک  
کی مذمت آئی ہے وہ اسی غفلت وانی عبادت کی آئی ہے جو بتقصائے عادت ہو، یا بہ نیت حصول جاہ و مال کر ایسی  
نماز روزہ گویا جسد بے روح ہے۔ درہ پابندی شریعت اور فرائض پر دوام و مواظبت بلکہ سنن و مستحبات تک  
کا اہتمام جتنا اہل حق عارفین سے ثابت ہے دوسرا کوئی کر بھی نہیں سکتا اور شیخ کی صحبت میں رہ کر کشوں سے  
جو مضرت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے مقصود کو برعکس کر دیا شیخ بنانے سے مقصود تو یہ تھا کہ وہ اس کو رب  
آشنا کرے اور اللہ سے قطع تعلق کرنے والی مرغوبات سے بچائے اور ڈرائے جن میں بڑا درجہ حب دنیا اور اس کی  
دل بھانے والی آرائشوں کا ہے۔ پس جب مرید شب و روز اس سے قضا و حاجات کی دعاؤں اور حصول  
دنیا کے اوراد و وظائف، ہی مانگنے میں لگ گیا نہ رب کے متعلق کوئی بات پوچھتا ہے اور نہ طریق معرفت دیانت  
کرتا ہے تو ولی کو اس سے نفرت ہو جائے گی اور پھر نزول آنت ہی سے محفوظ رہ جائے تو غنیمت ہے رچہ جائیکہ  
نفع اٹھاتا اور اس کی کسی وجہ ہیں اول یہ کہ ولی کے ساتھ محبت لوجہ اللہ نہ ہوئی دلیکہ خود غرضی کی اوراد پوری  
ہوئی اور اد پری محبت کھلا خسارہ ہے کہ اس میں شیاطین اور دوسوں کا ورود ہو کر رہے اور حق کا نور  
اس پر کبھی نہیں اُترا کرتا دوم ولی (دنیا طلبی میں) اس کو اللہ سے بے تعلق پا کر چاہتا ہے کہ اس سے  
بہر نکالے (اور یہ خود پیر سے بھی دنیا ہی کا طالب ہو کر) چاہتا ہے کہ اس کو بڑھائے اور اس میں ترقی کرے  
سوم اگر ولی سے (اس کی درخواست پر) کوئی کشف یا حاجت براری ظاہر ہوتی ہے تو یہ بیچارہ اس غلطی میں  
پڑ جاتا ہے اور سمجھتا ہے یہی دلالت کا کمال ہے اور ولی کا دامن پکڑنے سے یہی نفع اور مقصود ہے اور یہ سب  
اسباب ضلال و وبال ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت نے فرمایا کہ ولی کی مثال ایسی ہے جیسے ضرورت ساز کہ اس کا  
ہاتھ اور تمام اعضا ہر وقت طرح طرح کے برتن بنانے میں مشغول ہوں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس  
کے پاس ضروریات خلق یعنی طعام وغیرہ کے خزانے بھی موجود ہوں مگر اس کا قلب ان سے مانوس نہ ہو  
بلکہ وحشت و نفرت کھاتا ہو اور اس کے نزدیک ان کی کچھ بھی وقعت نہ ہو صرف اپنی صناعتی اور پیشہ سے دلچسپی  
رکھتا ہو کہ اس کے سوا کوئی بات بھاتی ہی نہ ہو، بلکہ دوسرا تذکرہ ناگوار گذرتا اور اتنا سفوفض ہو کہ اس کا تذکرہ  
کرنے والے کو بار بیٹھے تو عجب نہیں۔ اب شخص اس کے پاس آئے جن کو اس کی حالت کا علم ہو اور وہ خوب  
جانتے ہوں کہ فن ضرورت سازی کے سوا دوسرے تذکرہ سے اس کو گرانی ہوتی ہے۔ اور مقصود



ان کا اس کے خزانوں سے نفع اٹھانا ہوتا ہو شیاء اور سمجھدار شخص کا طریق کار تو یہ ہوگا کہ وہ آتے ہی اس کی  
صناعی کا ذکر پھیر ٹو بیگا اور پوچھے گا کہ برتن کیونکر بنائے جاتے ہیں اور اس میں کس کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے،  
اور وہ چیزیں کہاں اور کس طرح دستیاب ہوں گی وغیرہ وغیرہ۔ غرض جب آوے یہی اس کی عادت نتیجہ ضرور  
یہ ہوگا کہ صنایع کے قلب میں اس شخص کی محبت بیٹھ جائے گی اور یہ اس کا اس درجہ محبوب بن جائیگا  
کہ اس کے آنے اور پاس بیٹھنے سے بھی راحت پہنچے گی اس کے بعد اگر اس کے خزانے میں سے کوئی چیز بھی وہ اس  
سے مانگے گا تو یقیناً وہ دیگا بلکہ اگر اس کو اختیار بخندے کہ جتنی ضرورت ہوے تو عجب نہیں اور جو نادان و  
بیوقوف ہوگا وہ اس کے پاس آتے ہی روپیہ پیسہ کا سوال کرتے لگے گا۔ اور جو بات بھی کرے گا وہ خزانوں اور ان سے  
منقطع و متمنع ہونے کے متعلق کرے گا پس اگر وہ ضبط کر جائے اور کوئی مفرت نہ پہنچائے تو یہی بڑی بات ہے ورنہ  
عجب نہیں کوئی برتن اٹھا کر اس کے سر پر دے مارے اسی طرح دلی کا پیشہ صرف یہ ہے کہ اللہ کا راستہ دکھائے  
اللہ کی سطور شان سے واقف بنائے، اس تک پہنچنے کا جو طریق ہے اس سے آگاہ کرے۔ اس کو اگر  
پسند آتی ہے تو اسی کا تذکرہ اور اسی کے متعلق گفتگو پسند آتی ہے وہی صحبت اور مجلس اس کو بھاتی ہے  
جس میں اس کی بات چیت ہو اور وہی اس کا محبوب و مقرب بنتا ہے جس کو اسی تذکرہ سے رغبت اور اسی پیشہ و صناعی  
کی طلب و تمنا اور کربد و تلاش ہو۔ لہذا جو اس کو سمجھ لیگا وہ دین اور دنیا دونوں کا نفع اٹھائے گا اور مال مال  
ہو جائے گا اور جو اس سے ناواقف ہوگا (اور پیر کو اپنی کار براری اور قضاء حاجات دنیویہ کا آلہ کار بنائے گا) وہ  
خسر الدنیا والاخرہ کا مصداق بنے گا (اور کف افسوس ملے گا کہ چشمہ حیات پر پہنچ کر بھی پیاسا ہی واپس آیا) میں نے  
حضرت ممدوح سے دریافت کیا کہ حوادث کو امور باطلہ میں کیسے قرار دیا گیا۔ ان کا تو تحقق اور وجود ہے  
وہ آنکھوں سے نظر آتے اور جو اس کے ذریعہ ادراک کئے جاتے ہیں اور باطل اس کو کہتے ہیں جو بے اصل ہو  
حضرت نے ہلنے کی دیوار کی طرف اشارہ کر کے فرمایا دیکھو یہ دیوار آنکھوں سے نظر آتی ہے اور فانی ہے۔  
کہ نیست اور معدوم ہو جائے گی۔ اور اس کا رب نہیں نظر نہیں آتا جو اپنی قدرت سے اس کو تھامے ہوئے ہے اور وہ  
ہمیشہ سے زندہ ہے اور زندہ رہے گا، نہ اس کو فنا ہے نہ زوال ہے ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ ہمارے قریب ہے  
ہمارا پیدا کرنے والا ہے جو چاہتا ہے ہمارے اندر تصرف فرماتا ہے نفع اور ضرر اسی کے ہاتھ میں ہے پس دیوار  
کا مشاہدہ جس سے نہ کوئی نفع ہے نہ نقصان اور خالق سبحانہ و تعالیٰ کا عدم مشاہدہ اگر مشاہدہ باطلہ  
نہیں تو کیا ہے چونکہ بطلان ایک اضافی امر ہے اس لئے مراد یہ ہے کہ جو (دیوار) ہمیں نظر آرہی ہے بقابلہ  
اس (خالق برتر) کے جو ہمیں نظر نہیں آ رہا گویا عدم اور بیچ ہے چنانچہ ہم کہہ چکے ہیں کہ لوح محفوظ کا مشاہدہ بغیر ان  
حروف کے جو اس میں لکھے ہوئے ہیں باطل مشاہدہ ہے کیونکہ اصل اور مقصود کے فوت ہو جانے پر



فرع بیسود و لا حاصل ہے۔ اس کی مثالیں شریعت میں بہت ہیں مثلاً نماز بغیر وضو کے باطل ہے حالانکہ افعال نماز کا وجود ہوا۔ یا عبادت رکھاوے کی باطل ہے۔ حالانکہ صورت عبادت موجود ہے مگر چونکہ اس کی روح یعنی اخلاص جو اصل الاصول تھا اس میں نہیں ہے اس لئے اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے) پس جس پر حق تعالیٰ لطف و کرم فرماتا اس کو اپنی ذات عالیہ اور صفات کمالیہ اور افعال جلالیہ و جالیہ کا مشاہدہ و کشف عطا فرماتا ہے کہ وہ حقیقی و قیوم اور واجب الوجود اور خیر فانی ہے اور یہی مشاہدہ مشاہدہ حقہ و ثانیہ و ثانیہ و صحیحہ کہلاتا ہے پس اس کا تعلق اپنے رب کے ساتھ ہو جاتا اور اس کو وہ حیات و سعادت نصیب ہوتی ہے جس کے بعد نہ فنا ہے نہ شقاوت، کیونکہ فانی جب باقی سے وابستہ ہو گیا تو اس کی بقا کے ساتھ اس کو بھی بقا مل گئی۔

نیز آپ نے فرمایا کہ کشف اول یعنی حوادث اور ارض و سما کے مشاہدہ میں اگرچہ اہل ظلمت اور اہل حق دونوں شریک ہیں۔ مگر مقصود میں دونوں کے اختلاف ہے اہل ظلمت کو یہ کشف عطا زمانے کا مقصود ان کو اپنے آستانہ سے دھکے دینا، اور اس کے راستہ سے باز رکھنا ہے کہ کفر و تمرد کی وجہ سے) ان کے ساتھ اللہ کو بغض ہے اس لئے ان سے تعلق قطع دیا گیا ہے اور دوسروں کا تعلق ان کو دیدیا ہے اور استدراج کے لئے ان کو خوارق عادت امور پر ان کو قوت بخشی ہے تاکہ وہ سمجھیں کہ ہم بھی کچھ ہیں (اور اس لئے اپنے الحاد و سرکشی پر اڑے اور جے رہیں) بر خلاف اہل حق کے کہ ان کو یہ کشوت اس غرض کے لئے دئے جاتے ہیں کہ عطا و منعم کے سبب) ان کو اللہ کی محبت بڑھے اور درجہ بدرجہ اوپر چڑھتے اور ترقی کرتے رہیں کیونکہ یہ علامت ہے کہ اللہ نے ان کے لئے (اپنی ذات تک رسائی کا) دروازہ کھول دیا اور پردہ اٹھادیا اور ان کے قلوب کو اپنا تعلق بخش دیا، اور اغیار سے بے تعلق بنا لیا، اور یہ خوارق عادت ان کو اس لئے عطا فرمائے تاکہ ان کی بصیرت قومی ہو جائے اور اس میں مشاہدہ حق کی طاقت آجائے اور معرفت مستحکم ہو جائے (الحاصل ایک ہی شے دو شخصوں کو دی جاتی ہے مگر ایک کے لئے نعمت ہوتی ہے اور دوسرے کے لئے نعمت) چنانچہ ارشاد فرماتا ہے فَاَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَرَزَعْنَا لَهُمْ اَيُّمَانًا وَهُمْ يُبَشِّرُونَ وَ اَمَّا الَّذِينَ فِي تَلُوْبِهِمْ مَرَضٌ فَزَعْنَاهُمْ وَ جِئْنَا اِلٰى رَحِيْمِهِمْ وَ اَنَّا كَوْنُ الْكَافِرُوْنَ پس جو لوگ ایمان لائے ہیں آیات قرآنیہ نے ان کے ایمان کو بڑھادیا اور وہ مسرور ہو گئے اور جن کے دلوں میں کفر و شرک کی ظلمت کا مرض موجودہ آیتوں نے ان کی گندگی پر اور گندی بڑھادی اور وہ تار لیت اسی خیانت پر جے رہے حتیٰ کہ کفر ہی کی حالت پر مر گئے۔

نیز فرمایا کہ حادثہ کے مشاہدہ میں کبھی چھوٹا ولی زیادہ بڑھ جاتا ہے بڑے (درجہ) کے ولی سے اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بڑے درجہ کا ولی اس سے اونچے اور زبردست مشاہدہ یعنی مشاہدہ حق سبحانہ تعالیٰ میں مشغول ہونے کے سبب اس (مشاہدہ حادثہ) سے غائب و بنجر ہوتا ہے بر خلاف چھوٹے ولی کے کہ اس کی توجہ ہی



اس طرف ہوتی ہے کیونکہ اس کے مشاہدہ کا محل وہی ہے اور گو مشاہدہ حق بھی اس کو ہوتا ہے مگر بڑے  
 ولی کا سا مشاہدہ نہیں ہوتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ بڑے درجہ کا ولی مشاہدہ خالق میں قوی ہوتا ہے اور مشاہدہ  
 مخلوق میں کمزور اور چھوٹے درجہ کا ولی اس کے برعکس ہوتا ہے یعنی مشاہدہ مخلوق قوی ہوتا ہے اور مشاہدہ  
 خالق میں کمزور۔ اور یہی حقیقت ہے سیدنا خضر اندلسی علیہ السلام کے قصہ کی جو قرآن میں مذکور  
 ہے کہ کشتی کو عیب دار، اور لڑکے کو قتل، اور دیوار کو سیدھا کرنے کی، مصلحت و حکمت رحمت خضر کو  
 معلوم ہوئی حالانکہ چھوٹے درجہ میں تھے اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو معلوم نہ ہوئی کیونکہ آپ اس قوی ترین  
 یعنی مشاہدہ حق سبحانہ میں مشغول تھے لہذا آپ کی نادانیت آپ کے بڑے اور اچھے درجہ میں ہونے کی دلیل اور  
 عین کمال تھی اس کی مثال ایسی سمجھو کہ مثلاً پادشاہ کے دو غلام ہوں ایک کو پادشاہ نے اپنی چھاتی سے لگا رکھا اور  
 اپنے پاس رکھ چھوڑا ہو۔ اس کا مشغل بجز اس کے کچھ نہ ہو کہ پادشاہ کے سامنے دست بستہ حاضر اور ہر وقت اس کا  
 منہ تکتا اور اس کی زیارت کرتا رہے جب پادشاہ باہر آتا ہے تو یہ بھی باہر آتا ہے اور پادشاہ اندر جاتا  
 ہے تو یہ بھی اندر جاتا ہے وہ کچھ کھاتا ہے تو یہ بھی اس کے ساتھ کھاتا ہے اور وہ کوئی چیز پیتا ہے تو یہ بھی  
 اس کے ساتھ پیتا ہے، اور وہ جب بات کرتا ہے تو یہ بھی اس کے ساتھ باتیں کرتا ہے اور دوسرے غلام کو  
 پادشاہ نے رعیت کا انتظام حوالہ کر رکھا ہے اور وہ رعایا کے پاس جا کر پادشاہ کے احکام ان میں نافذ کرتا  
 اور چلے منعقد کر کے رعایا سے ان کے معاملات اور بیہودی کی صورتوں میں مشورے لیتا، اور بعض احکام سلطانی  
 کے انجام دینے میں مدتوں پادشاہ سے درداد نظروں سے غائب رہتا ہو۔ ظاہر بات ہے کہ پہلا غلام بہ نسبت  
 دوسرے غلام کے پادشاہ کا زیادہ مقرب اور ذات سلطانی نے اسرار سے زیادہ واقف ہوگا یا اس ہمہ رعایا  
 کے حالات اور سیاسی امور اور انتظامی معاملات کے متعلق جب کوئی بات اس سے دریافت کی جائے گی تو  
 دوسرے غلام کی سی آگاہی و واقفیت اس میں ہرگز نہ نکلے گی بس یہی حال سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا تھا کہ انکی  
 مثال پہلے غلام کی سی ہے (جو ہر وقت کا سلطانی حاضر باش ہے) اور سیدنا خضر علیہ السلام کی مثال دوسرے  
 غلام کی سی ہے جس کے متعلق ملکی انتظام اور رعایا کی نگرانی و اصلاح ہے، سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا مرتبہ یقیناً  
 بلا اختلاف حضرت خضر علیہ السلام سے بہت بڑا اور بلند تر ہے کیونکہ وہ اللہ کے پیغمبر اور اس کے کلیم و صفی ہیں  
 میں نے کہا کیا حضرت خضر علیہ السلام نبی تھے جیسا کہ بعض علماء کی رائے ہے چنانچہ علامہ ابن حجر نے بخاری کی  
 شرح میں لکھا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کی شان چاہتی ہے کہ آپ کی نبوت کا اعتقاد رکھا جائے تاکہ  
 غیر نبی کا نبی سے اعلم ہوتا ثابت نہ ہو (یعنی اگر حضرت خضر کو نبی نہ مانا جائے تو لازم آتا ہے کہ منصب نبوت ملے بغیر ان کا علم  
 نبی کے علم سے بڑھ گیا اور کشتی وغیرہ کے قصوں میں جو مصالح مخفیہ حضرت موسیٰ پیغمبر کو معلوم نہ تھے وہ ان کو



معلوم تھے) حضرت مدوح نے فرمایا کہ خضر علیہ السلام بنی نہ تھے صرف دلی تھے کہ حق تعالیٰ نے ان کو اپنی معرفت عطا فرمائی اور اپنی رعیت (یعنی مخلوق) میں تصرف کی طاقت بخشی تھی اور معرفت کاملہ اور تصرف تام نصیب فرمایا تھا۔ جیسا کہ امت محمدیہ میں غوث اعظم کو دیا جاتا ہے اور حضرت خضر نے یہ مرتبہ بلا شیخ کے اور بغیر سلوک کے پایا تھا کہ ابتدا ہی حق تعالیٰ نے ان کو یہ قوت نصیب فرمادی تھی پس حضرت خضر علیہ السلام کا یہی درجہ تھا اور یہ درجہ نہ مصیب نبوت کو پہنچ سکتا ہے نہ مرتبہ رسالت کو اور کشتی وغیرہ کے قصہ میں حضرت خضر کا واقف اور حضرت موسیٰ کا ناواقف ہونا اس شبہ کا موجب نہیں ہو سکتا کہ غیر نبی کا علم بڑھ گیا نبی سے کیونکہ اس کی وجہ وہی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام ان امور سے غافل تھے اس لئے کہ مشاہدہ حق میں غرق تھے جس کا نہ کوئی بدلہ ہے نہ کوئی نظیر لہذا حضرت خضر کے متعلق نبوت کے اعتقاد کی مطلق حاجت نہیں میں نے عرض کیا کہ جو علماء ان کی نبوت کے قائل ہوئے ہیں ان کی دلیل وَمَا فَعَلْتُمْ مَقْرُوح ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام فرماتے ہیں اے موسیٰ میں نے یہ کام اپنے حکم سے نہیں کیا بلکہ حکم خدا کیا ہے اور حکم خدا نبی ہی کو ہو سکتا ہے) فرمایا ہر غوث اور قطب اہل تصرف کی یہی شان ہے کہ وہ کوئی کام اور حادثہ ذاتی شے میں کوئی تصرف بھی حکم الہی کے بغیر نہیں کیا کرتا، اور یہ نبوت نہیں کہلاتی اور نہ یہ مصیب رسالت ہے مگر اگر آدمی بے علم ہیں کہ اہل تصرف صاحبان خدمت پر نبوت کا شبہ کر بیٹھے ہیں (فہم) چہ جائیکہ کوئی صاحب خدمت اور عارف و متقی بھی نہ ہو اور محض پیشین گوئیوں پر مدعی نبوت ہو جائے اور نبوت بھی اس بڑے درجہ کی حسیں کے الفاظ نقل کرنے سے دل کا نپتا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت مدوح نے فرمایا ہر چیز کی رشتا خست کے لئے علامت ہو کرتی ہے اور اس کی علامت کہ بندہ کو بحالت بیداری ذات محمدی کا مشاہدہ نصیب ہو گیا ہے یہ ہے کہ ہمہ وقت اس کا فکر و خیال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی میں پڑا رہے اور کوئی دھندلاد کوئی مشغلہ بھی اس کو تخیل ذات محمدی سے نہ ہٹا سکے۔ کھانا کھائے تب اس کا دھیان ذات محمدی میں پڑا ہو اور پانی پئے تب اس کا تخیل ذات محمدی میں پڑا ہو۔ کسی سے نزاع یا تیز گفتگو ہو تب اس کا یہی حال ہو اور سو رہا ہو تب وہ اسی رنگ میں ہو، غرض کوئی حالت اور کوئی وقت بھی اس سے خالی نہ رہے مگر یہ نعمت بندہ کے کسب اور تدبیر سے حاصل نہیں ہوتی۔ اگر تدبیر و کسب سے حاصل ہوتی تو جب کوئی مشغلہ یا عارض پیش آتا تو اس اشتغال سے غفلت ہو جایا کرتی (کیونکہ اکتسابی شے عارض و مانع کے ہوتے ہوئے کبھی قائم نہیں رہ سکتی بلکہ محض وہی ہے کہ حق تعالیٰ شانہ، بندہ کو اس دھیان اور فکر ذات محمدی پر آمادہ کرتا اور اس کا عامل بنا دیتا ہے اور بندہ کو اپنے ارادہ اور اختیار کا اس میں دخل بھی نہیں محسوس ہوتا۔ حتیٰ کہ اگر اس کو مجبور کیا جائے کہ اس دھیان کو چھوڑ دے تو اس کو اس پر قدرت نہ ہوگی اگر اس کا حصول اس کے اختیار و ارادہ سے ہوتا تو اس کے دفع اور ازالہ پر بھی اس کو



ضرورت ہوتی)۔ اور یہی وجہ ہے کہ دیگر مشاغل اور عوارض اس کے اس دھیان کو ہٹا نہیں سکتے۔ الحاصل اس شخص کا باطن و اندروں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتا ہے اور اس کا ظاہر و بیرون عام مخلوق کے ساتھ کہ ان سے بابتق کرتا ہے تب بلا ارادہ اور کھاتا ہے تب بلا قصد، غرض جو کام بھی اس کے اعضا سے صادر ہوتا نظر آتا ہے وہ سب اس کے قصد کے بغیر صادر ہوتا ہے کیونکہ رقصہ و ارادہ میں، اعتبار قلبی ہے

اور قلب ان (افعال اور مخلوق) کے ساتھ نہیں رہتا بلکہ ذات محمدی کے ساتھ ہے (جب بندہ کی اس حالت پر ایک مدت گذر لیتی ہے تب حق تعالیٰ اسکو بحالت بیداری اپنے نبی کریم اور رسول عظیم کا مشاہدہ نصیب فرماتا ہے اور اس دھیان کی مدت مختلف ہو کر تھی ہے کسی کے لئے ایک مہینہ ہے اور کسی کے لئے اس سے کم اور کسی کے لئے اس سے زیادہ۔ نیز فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدہ کی بڑی شان ہے۔ اگر حق تعالیٰ طاقت نہ بخشے تو بندہ اس کا کبھی متحمل نہیں ہو سکتا۔ فرض کرو ایک شخص میں چالیس مردوں کی یکجا قوت جمع ہو جائے اور وہ چالیس بھی ایسے قوی و دلیر ہوں کہ ہر ایک ان میں شیر کا کان پکڑ سکے۔ پھر فرض کرو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص کے سامنے تشریف لے آویں تو یقیناً اس کا جگر پھٹ جائے گا اور اس کی ذات (پانی کی طرح) گپھل جائے گی اور فوراً اس کا دم نکل جائے گا۔ اس کا سبب محض آپ کی ہیبت اور سطوت عظیم ہے مگر باوجود اس سطوت و رعب کے آپ کے مشاہدہ شریفہ میں وہ مزہ اور لذت ہے جس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی حتیٰ کہ جس کو یہ مشاہدہ نصیب ہوتا ہے اس کے نزدیک دخول جنت سے بھی بہتر و افضل ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جو کوئی بھی جنت میں جائے گی اس کو جنت کی تمام نعمتیں تو ملیں گی نہیں بلکہ رحمت الہیہ جس درجہ میں جائے گا، خاص اس کی نعمتیں اس کو دی جائیں گی اور صرف انہیں کا اس کو مزہ آئے گا، برفلات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدہ کے کہ یہ جس کو حاصل ہو گا اس کی ذات تمامی نعمات جنت سے سیراب کی جائے گی۔ لہذا ہر رنگ کی لذت اور ہر قسم کی حلاوت ایسی پائے گا جیسی جنت میں جا کر جنتی پائیں گے اور جنت کی تخلیق ہی جس ذات کے نور سے ہوئی ہو اس کے (مشاہدہ) میں تو یہ لذت بھی کم ہے پھر ہر دفعہ کے مشاہدہ میں چونکہ یہی سیرابی ہوا کرتی ہے لہذا جس کے لئے یہ مشاہدہ دائمی ہو گا اس کے لئے یہ لذت بھی دائمی اور ہر وقت کی ہوگی۔

نیز فرمایا اور اس کی علامت کہ بندہ کو اپنے پروردگار میل میلان کا مشاہدہ نصیب ہو گیا ہے یہ ہے کہ مشاہدہ محمدیہ کے بعد اس کا فکر و خیال اپنے رب جل شانہ میں ایسا پڑا رہے جیسا بحالت مشاہدہ محمدیہ ذات محمدی میں پڑا رہا تھا کہ کسی وقت بھی اس سے دھیان نہیں پھرتے پھر یہ حالت مسلسل قائم بھی رہے یہاں تک کہ مشاہدہ حق سبحانہ کا انکشاف ہو جائے اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدہ میں اہل جنت کی نعمتوں کے تمام انواع کی سیرابی نصیب ہوتی ہے تو خود ہی سوچو کہ حق تعالیٰ کے مشاہدہ میں کیا کچھ مزہ نصیب ہوگا



کہ وہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی خالق ہے اور حجت کا بھی خالق ہے بلکہ ہر شے اور ہر چیز کا وہی خالق ہے نیز فرمایا پھر مشاہدہ حق سبحانہ کا کشف حاصل ہونے کے بعد اہل مشاہدہ کی دو قسمیں ہو جاتی ہیں ایک قسم وہ اولیاء ہیں کہ مشاہدہ الہیہ میں مستغرق ہو کر تمامی ماسوی سے غائب و بجز ہو جاتے ہیں اور دوسری قسم اور وہی اکس و افضل بھی ہے وہ حضرات ہیں جن کی روح مشاہدہ حق میں رہتی ہے اور ذات مشاہدہ محمدی میں از روحی مشاہدہ مغلوب کرتا ہے ذاتی مشاہدہ کو، اور نہ ذات کا مشاہدہ غالب آتا ہے روح کے مشاہدہ پر۔ اور یہ قسم اکمل اس لئے ہے کہ ان کا مشاہدہ حق تعالیٰ کے بارہ میں اکمل اور اعلیٰ ہوتا ہے یہ نسبت پہلی قسم کے مشاہدہ کے اور اس کا سبب یہ ہے کہ ان کو مشاہدہ محمدیہ سے جو کہ مشاہدہ الہیہ میں بھی کمی ہوگی۔ اگر بندہ کو اختیار دیا جائے اور اس کی عمر مثلاً نوے برس کی تجویز ہو تو وہ اسی صورت کو اختیار کرے گا یہ سارا زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدہ محمدیہ میں استحکام حاصل اور قدم راسخ ہو جانے کے سبب اس ایک دن میں مشاہدہ حق سبحانہ کا جو انکشاف ہو گا وہ اس سے بدرجہا زیادہ ہو گا جو اس شخص کو نصیب ہو گا جسے شروع ہی سے دونوں مشاہدے حاصل تھے اور نوے برس تک برابر حاصل رہے۔ اس کے بعد اپنے حقیقت سمجھانے کے لئے، اپنی آنکھوں پر عینک چڑھا لی اور حروف کو دیکھنے لگے پھر فرمایا تباؤ حروف کا واضح اور صاف نظر آن اس عینک کے شیشہ کی آب و تاب اور صفائی کے تابع ہے یا نہیں؟ ہم نے عرض کیا کہ ہاں بیشک (جبنا شیشہ آب وار زیادہ ہو گا اسی قدر حروف زیادہ صاف اور کھلے نظر آئیں گے) فرمایا ایسی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات شریفہ کا مشاہدہ گویا عینک کا شیشہ ہے اور حق تعالیٰ کا مشاہدہ بمنزلہ حروف کے ہے کہ مشاہدہ نبویہ جتنا زیادہ صاف ہو گا اسی قدر مشاہدہ حق سبحانہ میں صفائی ہوگی اور اس سے غبار و بادل بھٹ جائے گا۔ یہ تقریر آپ نے اس وقت کی تھی جبکہ ایک عالم نے آپ سے سوال کیا کہ لوگ کہتے ہیں ولی بن جانے کے بعد ظاہری نماز کی ضرورت نہیں رہتی اور قرآن خدا کا دل ہر وقت نماز پڑھتا رہتا ہے تو کیا ہو سکتا ہے کہ ولی نماز پڑھنا چھوڑ دے؟ آپ نے فرمایا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ولی نماز پڑھنا چھوڑ دے۔ اور یہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ (آتش محبت) دکانیئے ہر وقت اس کو داغیے رہتے ہیں کہ مشاہدہ ذات محمدی (کی دانستی) داغی ہے ذات ولی کو اور حق تعالیٰ کا مشاہدہ داغی ہے روح کو اور دونوں مشاہدے اس کو حکم دیتے ہیں نماز پڑھنے کا اور دیگر تمام احکام شرعیہ کا۔ اور ایک مرتبہ آپ نے یہ تقریر فرمائی کہ ولی مہربان نماز پڑھنا کیسے چھوڑ سکتا ہے۔

سے عربی میں لفظ مشعاب ہے ترجمہ کاٹیا کر دیا ہے جسکو تپا کر ٹانگا لگایا جاتا ہے یا داغی جس سے جاتوں کو داغ کر نبر وغیرہ ڈالتا ہیں۔ مطلب وہ ہمیشہ محبت ہے جو اتباع اور تاثر پر مجبور کرتے ہیں ۱۲ ترجمہ



حالانکہ خیر و صلاح جو کچھ بھی اس کو ہر شاہدہ میں حاصل ہوئی ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات شریفہ کے اسرار سے سیراب ہونے کے بعد حاصل ہوئی ہے۔ اور یہ کیسے ممکن ہے کہ ذات شریفہ کے اسرار سے سیراب کیا جائے اور وہ افعال نہ کرے جو ذات شریفہ نے کئے تھے۔ (لہذا وہ تو مجسم اتباع سنت ہوگا کہ عبادات اور فرائض تو بڑی چیز ہیں، عادات بنویہ میں بھی برائی برابریاں نہیں کر سکتا۔ ورنہ علامت ہے کہ ذات محمدی کے پورے اسرار سے اس کو سیرابی نصیب نہیں ہوئی پس ناممکن ہے کہ وہی تارک صلوٰۃ ہو یا کوئی تارک صلوٰۃ شخص اللہ کا وہی ہو)

نیز آپ نے فرمایا کہ جب حق تعالیٰ کسی بندہ پر شاہدہ کا انعام فرمانا چاہتا ہے اور حجاب کی حالت سے فتح کی طرف منتقل فرماتا ہے تو اولیاء یعنی اقطاب و اغواث زمانہ کو اس کے متعلق بڑا خطرہ ہوتا ہے کہ دیکھتے زندہ رہے گا یا شاہدہ کی طاقت نہ رکھنے کے سبب مر جائے گا اور اگر زندہ بھی رہا تو نہ معلوم اس کی عقل قائم رہے گی اور سالک بنے گا یا عقل سلب ہو جائے گی اور مجذوب بن جائے گا۔ اور عقل کے سلب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جن بڑی چیزوں کا شاہدہ ہوتا ہے عقل ان کے ساتھ چلی جاتی اور ذات سے بالکل جدا اور ایسی بے تعلق بن جاتی ہے کہ پھر کبھی واپس نہیں آتی اور عقل کے سلب نہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ نور عقل کا کچھ حصہ شاہدہ کی ہوئی چیزوں کے ساتھ چلا جاتا ہے اور کچھ حصہ اس کا ذات کے ساتھ باقی رہ جاتا ہے جو خورد نوش اور لباس و دیگر مصالح ذات کا محافظ بنا رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ سالکین ادلیا و کوان چیزوں کا اہتمام نہیں رہتا۔ جو کچھ بھی روکھا سوکھا صلال ذریعہ سے مل گیا کھا پی لیا اور باسانی و بلا کلفت موٹا جھوٹا جیسا مل گیا پہن لیا۔ کیونکہ مقصود صرف یہ ہے کہ بدن جو روح کے لئے بمنزلہ سواری کے ہے قائم و محفوظ رہے نہ لذتوں کی طلب اور متاع دنیا کی رغبت و گرویدگی رہتی ہے اور نہ ان کے حاصل کرنے میں تدبیریں سوچتی ہیں کیونکہ عقل کا اکثر حصہ شاہدہ حق سبحانہ میں غرق ہے اور بقا حیات کے قابل بقدر ضرورت عقل و فہم صرف تحصیل معاش کے لئے باقی رہ گئی ہے، غرض جس کو فتح عطا کی جاتی ہے اس کے متعلق یہ حال کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے بجز شیخ کے کسی دوسرے کو معلوم نہیں ہوتا۔ میں نے عرض کیا کہ آخر وہ ازما رفتہ کیوں ہو جاتا ہے؟ اور اس حالت پر پہنچ جانے کا کیا سبب ہے کہ یا مر جائے یا عقل سلب ہو جائے؟ فرمایا جب بندہ کو فتح نصیب ہوتی ہے تو وہ وہ چیزیں اس کو دکھائی دیتیں جنکی برداشت نہیں ہو سکتی مثلاً عالم ملائکہ عالم جنات، عالم شیاطین اور ایسی وحشت ناک صورتیں نظر آتی اور ہونناک آوازیں سنائی دیتی ہیں جن سے کلچر پھٹ جاتا اور جگر شق ہو جاتا ہے بہتیرے لوگوں کو ایسا قصہ پیش آیا کہ اپنی دکان پر بیٹھے سووا بیچنے میں مشغول تھے کہ حق تعالیٰ نے فتح نصیب فرمائی اور ایسی صورتیں دیکھ کر جن کی برداشت نہ ہو سکی ان کا دم نکل گیا۔ لوگ سمجھے کہ حرکت تلب بند ہو گئی



اور بلا سبب اچانک موت آگئی حالانکہ درحقیقت ولایت پر موت آئی اور شاہدہ ملکوتی سبب مرگ ہوا) میں نے حضرت مدوح سے دریافت کیا کہ ایک شخص کی عقل جاتی رہے فتح کی وجہ سے (اس کا نام مجذوب رکھا جاتا ہے) اور ایک شخص کی عقل کسی دوسری وجہ سے جاتی رہے (اس کا نام مجنون اور پاگل رکھا جاتا ہے) انہی دونوں میں فرق کیا ہے؟ فرمایا جس کی عقل فتح کی وجہ سے گئی ہے درحقیقت اس کی عقل گئی نہیں بلکہ شاہدہ حق میں غائب ہوگئی ہے کہ ہر وقت اس کے سمندروں میں تیرتا رہتا ہے۔ البتہ اس کا تعلق حق تعالیٰ نے خاص مصلحت کی بنا پر اس کی ذات سے منقطع فرما دیا ہے اور جس کی عقل کسی دوسری وجہ سے گئی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ حق تعالیٰ جب کسی کی عقل زائل اور اس کو ہلاک کرنا چاہتا ہے کہ پاگل کی زندگی درحقیقت موت سے بدتر ہے تو اس کی روح کا تعلق ایک دو ساعت کے لئے اپنی ذات پاک کے شاہدہ سے قطع فرما کر اس ذات تراجل کے افعال کے ساتھ وابستہ کر دیتا ہے جس میں وہ رہتی ہے پس اس گناہ گار بندے سے جو افعال قبیحہ صادر ہوتے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے روح پر پوری ایک ساعت بھی نہیں گزرنے پاتی کہ اسے ایک انقباض پیش آتا ہے اور اس کی وجہ سے عقل جاتی رہتی ہے۔ پھر اگر اس قبض کو دوام ہوتا ہے تو عقل کا زوال بھی دائمی بن جاتا ہے کہ ہر وقت جنون میں رہتا ہے اور اگر انقباض دائمی نہیں ہوتا بلکہ کسی وقت روح کو ایسا طامہ جال بھی حاصل ہو جاتا ہے تو روح پھر ذات حق کی مشاہدہ کی طرف لوٹ آتی ہے جیسی قطع تعلق سے قبل تھی اور عقل بھی واپس آ جاتی ہے کہ ہوش کی باتیں کرنے لگتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ عقل تو کبھی نابالغ بچہ کی بھی جاتی رہتی ہے حالانکہ عمر مکلف ہونے کے سبب اس کے افعال کو نہ قبیح کہہ سکتے ہیں اور نہ اس کو گناہ گار قرار دے سکتے ہیں (پھر اسکی عقل کیوں جاتی رہی؟) فرمایا کہ روح کے نزدیک تو بندہ کی تمام حالتیں گناہ ہی گناہ ہیں کیونکہ روح نے حق تعالیٰ کی جو شان دیکھی اور سمجھی سچا پانی ہے اس کا مقتضایہ ہے کہ بندہ ہر وقت اللہ کے سامنے سجدہ میں پڑا رہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی سر نہ اٹھائے۔ لہذا روح کے نزدیک اس میں بچے اور بوڑھے سب برابر ہیں یہ تو لطف و کرم ہے حق تعالیٰ کا کہ سرائے جہنم کے لئے بلوغ کی قید لگا کر بچہ کو معافی دیدی ورنہ عیب و نقص ہونے کے درجہ میں کہ درحقیقت خطا و گناہ اسی کا نام ہے بچہ ہو یا بڑا ایک لمحہ بھی عبودیت سے غافل رہا تو گناہ گار ہے، نیز آپ نے فرمایا کہ اہل فتح کے پاس جب یہ دونوں شخص بیٹھیں گے جن میں ایک کی عقل فتح کی وجہ سے گئی ہے اور دوسرے کی عقل مدوح کی وجہ سے اور پھر اس کے ساتھ وہ باتیں کریں گے تو دلی ان کی گفتگو ہی سے فوراً امتیاز کرے گا کہ یہ مجذوب ہے اور یہ مجنون ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ مجذوب کو عقل نہ ہونے کے سبب خود خبر نہیں کہ زبان سے کیا کہہ رہا ہے مگر اکثر اس کی گفتگو سے اسرار الہیہ ظاہر ہوں گے رضائی بکواس نہ ہوگی، اور ان کو اہل اسرار فوراً سنتے ہی سمجھ لیں گے برخلات مجنون کے کہ اس کی باتوں میں یہ بتا مطلق نہ ہوگی نیز دونوں میں امتیاز کرنیکا ولی کے نزدیک



ایک طریقہ اور بھی ہے وہ یہ کہ مجذوب کی روح کو ہر وقت اپنا طر اور فرح و سرور میں دیکھے گا اور مجنون کی روح کو شغب و سرنگوں، جیسے کسی پر سخت مصیبت نازل ہوئی ہو اور وہ بے حد پریشان و مغموم اور متفکر و محزون ہو اور یہ (مجانین) جن کی عقل کسی دوسری وجہ سے گئی ہے جو پاؤں کے حکم میں ہیں (کہ شرف انسانیت کا مدار صرف عقل پر ہے اور وہ ان میں مفقود ہے لہذا چاہیے تھا کہ آخرت میں بھی بہائم کی طرح مٹی بنا دئے جائیں گے اور جنت میں نہ بھیجے جائیں گے) مگر حق تعالیٰ کی رحمت ان کو جنت میں اس لئے داخل فرمائیگی کہ آدمیت کی شکل و صورت جس پر ان کو پیدا کیا گیا ہے ان کی شفاعت کرے گی اور اس کو حق تعالیٰ قبول فرمائے گا، پس یہ لوگ گویا چوپایہ ہیں جنکو بنی آدم کی صورت دی گئی ہے لہذا حق تعالیٰ نے اس بزرگ صورت کے طفیل جس پر اپنے انبیاء و رسل اور برگزیدہ بندوں کو پیدا فرمایا ہے، آپر رحم فرمایا اور چوپایوں کی طرح مٹی نہ بنایا۔ فہے جب مقبولین الہی کی صورت میں مشابہت اور ظاہری تشبیہ کی حق تعالیٰ کے نزدیک اتنی رعایت ہے کہ غیر اختیاری چیز یعنی صورت انسانیت سبب دخول جنت بن گئی تو افعال اختیاریہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشبیہ و صورت میں کیا کچھ رحمت و برکت اور مقبولیت ہوگی اور اس کے برعکس مبعوضین خدا کفار و مشرکین کی مشابہت ظاہریہ میں بغض و نفرت الیہ کا کتنا کچھ اثر ہوگا مگر افسوس کہ آج مسلمان ہی یوں کہہ رہے ہیں کہ وارثی و بیاس اور صورت و وضع میں دین کا کوئی دخل نہیں۔ دین میں اعتبار صرف سیرت کا ہے کہ وہی اصل شے ہے لیکن اگر حق تعالیٰ صورت کی رعایت نہ فرماتا اور محض سیرت پر حکم جاری کرتا تو بہائم سیرت دیوانوں کے جنت میں جانے کی کوئی صورت نہ تھی۔

نیز آپ نے فرمایا اور مجاذیب، جن کی عقل بوجہ فتنہ و مشاہدہ کے گئی ہے، وہ اولیاء و کلام میں شامل ہیں۔ البتہ ان کو تصرف عالم کی خدمت نہیں دی جاتی اور ان میں نہ کوئی غوث بنتا ہے نہ قطب ہاں جس وقت حق تعالیٰ چاہے گا کہ دجال کا خروج ہو تو اس وقت تصرف عالم ان (مجازیب)، کے ہاتھ میں دیا جائے گا اور انہیں میں کا ایک مجذوب غوث بنے گا پس ان کے مسلوب العقل ہونے کے سبب دنیا کا سب نظام مختل اور انتظام درہم برہم ہو جائے گا اور انہیں کے عہد تصرف میں دجال کا ظہور ہوگا جب دجال کا فتنہ (سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں مقتول ہو کر) طے ہو جائے گا تو مجاذیب کی حکومت بھی ختم ہو جائے گی۔ اور پھر ان کی طرف کبھی عود نہ کرے گی حضرت محدوح نے فرمایا کہ ایک مرتبہ میرے مرشد حضرت عبداللہ برتاویؒ نے مجھ سے سوال کیا کیوں جی کیا تمہیں معلوم ہے کہ دنیا میں کون چیز ہے جو دخول جنت سے بہتر ہے اور کون چیز ہے جو دخول جہنم سے بدتر ہے؟ میں نے عرض کیا جی ہاں مجھے معلوم ہے وہ چیز جو جنت میں جانے سے بدرجہا بہتر اور عزیز ہے سیدالوجود صلی اللہ علیہ وسلم کی ردیت شریفہ بحالت بیداری ہے کہ وہی آپ کو آج اسی صورت و شکل میں دیکھے جس میں حضرات صحابہ نے آپ کو دیکھا تھا پس یہ جنت سے بھی افضل ہے کہ اس میں نامی جنتوں



کی عمومی نعمتوں کی لذت ہے اور وہ چیز جو دوزخ میں جانے سے بھی زیادہ بُری اور بدتر ہے فتح نصیب ہوتے کے بعد اس کا سلب ہو جاتا ہے یہ سنتے ہی حضرت شیخ نے میرے پاؤں پکڑ لئے اور بار بار ان کو چومنا شروع کر دیا۔ میں نے دریافت کیا کہ حضرت یہ کیوں فرمایا یہی سوال میں تقریباً اسی مشائخ سے کر چکا ہوں مگر یہ جواب کسی ایک نے بھی نہیں دیا جو آج تم نے دیا ہے۔ بحالت بیداری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت شریفہ تو بڑی چیز ہے خواب میں جس خوش نصیب کو آپ کی زیارت نصیب ہو جاتی ہے وہ فرط مسرت سے پھولا نہیں سماتا اور جب اپنی خواب کو یاد کرتا ہے تو خوشی کے مارے اس کا رُخ روٹاں کھل جاتا ہے۔ حالانکہ احتمال ہے کہ وہ آپ کی صورت حقیقیہ نہیں ہے اور اس میں رانی کے قلب کی ظلمت کو دخل ہے بلکہ سلمان محض اپنے تخیل میں جس وقت سید المجتہدین صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ صورت شریفہ لاتا ہے جو آپ کے رنگ و ہیئت قد و قامت، خدو خال اور حسن و جمال کے متعلق حالات اُس نے کتابوں میں پڑھے ہیں تو حالانکہ اصل اور نقل میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے اور نقل بھی محض قلمی اور محض قائل کا ادراک اور زبان سے اس کا اظہار۔ بھلا وہ حقیقت کو کیسے واضح کر سکتا ہے مگر مصدور صورت آن دستان خواہد کشید نہ لیک حیرانم کہ نازش را چساں خواہد کشید

با ایں ہمہ اس صورت متخیلہ سے بھی روح کو وہ فرحت پہنچتی ہے جس پر دنیا کی تمام لذتیں نثار ہیں اور بے ساختہ و بے اختیار زبان سے نکلتا ہے۔

تفرق تالفت دم ہرچہ می نگرم نہ کر شمع دامن دل میکشد کہ جا اینجا است

اور واقعہ بھی ہے کہ جس ذات کو حق تعالیٰ نے اپنا محبوب بنایا ہو اس کے ظاہری و باطنی حسن کا مخلوق میں ثانی کہاں نکل سکتا ہے چنانچہ حیات شریفہ کے واقعات آپ کے ساتھ ہزاروں ہزار اہل صحابہ کی اس محبت و عشق کا ثبوت دے رہے ہیں جو کسی عالم میں بھی کسی مخلوق کو نصیب نہیں ہوا اب رہا سوال آپ کی ہیئت و سطوت کا کہ حضرات صحابہ کے کھلچہ شوق کیوں نہ ہوئے سوا دل تو وہ حضرات چونکہ طفولیت کے زمانہ سے آپ کو دیکھتے رہے اور ہر وقت کی صحبت و اختلاط اور مہارت و شاہدے ایک کیفیت انس کی پیدا ہو کر رعب کا اثر قابل برداشت بن جاتا ہے اس لئے رویت کے ایسے متحمل ہو گئے جیسے سلطان وقت کے بچپن کے رفقاء و ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت و بے تکلفی اور صحابہ کے ساتھ اکثر اوقات اینساط و خوش طبعی کا برتاؤ اثر ہیئت کی ایسی تلافی کرتا رہتا تھا جیسا آگ پر بار بار ٹھنڈا پانی پڑتے سے اس کا اسرافاتی اثر مضمحل ہوتا رہتا ہے سوئم چونکہ ان حضرات سے حق تعالیٰ کو کام لینا اور وصال محمدی کے بعد ان کو نابین رسالت اور مظلہ ہر تعلیمات نبویہ بنانا منظور تھا۔ اس لئے ان کے قلوب میں وہ قوت عطا فرمادی تھی



کہ سطوت محمدیہ سے ہلاک نہ ہوتے تھے۔ چنانچہ اُمت محمدیہ میں اقطاب و اغواط کو جب یہ شرف رویت عطا کیا جاتا ہے تو پہلے وہ قوت قلبیہ دیدی جاتی ہے جو سلطانی دربار کے حاضر باش غلاموں کے لئے شایان ہے پس عوام جن کو حاکم ضلع کی عدالت کا جلال و رعب بھی دیکھنا کبھی نصیب نہ ہوا ہو وہ اگر سلطانی ایوان میں جا کر دفعۃً بادشاہ کے چہرہ پر نظر ڈالنے سے بے ہوش ہو کر گر پڑیں، بلکہ حرکت قلب بند ہو کر اُن کی رُوح قفصِ منصری سے پرواز کر جائے تو کوئی قابلِ تعجب بات نہیں کہ شاہانہ سطوت و ہیبت کا مقتضا یہی ہے اور اس پر یہ شبہ وارد نہیں ہوتا کہ جب ہیبت کا یہ اثر ہے تو بیوی بچے، بیگمات و شانہ ادے، وزراء، اُمراء، میرمنشی و مصاحبین، صاحبِ وپرہ دار، باڈی گارڈ و ملازمین حاضر باش اور خوجہ سرا و اغواط حرا، غلامان خاص اور باندیاں، کیسے زندہ رہتی ہیں اور کاروبار سلطنت کیونکر چل سکتا، جامع کتاب کہتے ہیں میں نے حضرت ممدوح سے کہا حضرت برنادی قدس سرہ کو تو جواب معلوم ہوگا اور دوسروں سے دریافت فرمانا محض امتحان کی خاطر اور زکاتِ جانچنے کے لئے ہوگا؟ فرمایا ہاں بیشک حضرت قدس سرہ جواب سے خوب واقف تھے اور سوال سے مقصود صرف فہم و زکات کا امتحان لینا تھا یقین نے کہا رومیہ محمدیہ کے جنت سے افضل ہونے کی وجہ تو گزشتہ تقریر سے معلوم ہو چکی مگر سلبِ بعدالفتح کا موزخ میں جانے سے زیادہ بُرا ہونا کس بنا پر ہے؟ فرمایا یہ صرف اس کے حق میں ہے جس کی فتح دائمی ہو اور سلبِ لاحق نہ ہوا ہو کہ وہ اپنی حاصل شدہ فتح کے زائل کر دینے والے سلب کو جہنم سے بھی زیادہ قبیح سمجھتا ہے ورنہ سلب کے واقع ہو جانے کے بعد تو سلوب کا قلب پتھر کی طرح بیخس اور سخت ہو جاتا ہے کہ نہ کچھ اس کو نظر آتا ہے نہ کسی بات کو سمجھتا ہے (ایسا بن جاتا ہے اگر یا کسی شے کا کبھی مشاہدہ ہی نہ کیا تھا لہذا اسکو سلب کے قبیح کا ادراک ہی نہ ہوگا بلکہ) اس کی حیثیت ذاتِ فتح کے بوجھ سے اپنے آپکو سبکدوش اور ہلکا سمجھے گی۔ دنیا میں کسی امیر کبیر کی دولت چھن جائے تو اس کا حال اس (دولت مشاہدہ کے) سلوب سے پھر اچھی ہوگی اپنے زمانہ تو نگری کی تمام نعمتوں اور لذتوں کا اس کو دھیان نہ آئے گا اور اس تصور سے بھی اس کو فی الحیلہ لذت حاصل ہوگی۔ مگر اس سلوب کا قلب تو رما درزا و اندھے کی طرح) چوہٹ اور اس کی بصیرت کا شمسِ رگین کی طرح) بالکل تاریک و بے نور ہو جاتا ہے جس کو اپنے اندھے ہو جانے کی بھی نہ کلفت ہوتی ہے نہ احساسِ فتنے مثل مشہور ہے قدرِ نعمت بعد زوال۔ مگر یہ اسی نعمت کا حال ہے جس کا بعد زوال ادراک و شعور بھی قائم رہے چنانچہ کوئی امیر حبیب فقیر بن جاتا ہے تو چونکہ دنیوی لذتوں کا ادراک اب بھی اس میں موجود ہے اس لئے گویا زبان کو مزہ نہ ملے گا مگر خیال و تصور کے ذریعہ قلب کو پھر بھی مزہ ملے گا اور اسی لئے اسکو تہم و غم اور تحسّر و تالم ہوگا کہ خیالی لذت زبان کو نصیب نہیں ہوتی۔ مگر جس کی نسبت روحانیہ چھن جائے یا حلاوت



ایمان جاتی رہے تو قلب سے مادہ ادراک ہی سلب ہو جاتا ہے۔ جہاں نعمت گئی وہیں اس کا ادراک بھی گیا۔ لہذا اس کو تو اس نعمت کے چھن جانے سے اتنا بھی حس نہ ہوگا جتنا ایک سوئی کھو جانے سے ہوتا ہے چہ جائیکہ عذاب دوزخ سے بدتر معلوم ہونا۔ البتہ صاحب فتح کو سلب اور زوال فتح باوجود مزہ نہ چکھنے کے اس سے بھی زیادہ قبیح معلوم ہوگا جتنا ایک مومن کو دوزخ میں جانا باوجودیکہ اس نے دوزخ کی کسی تکلیف کا مزہ نہیں چکھا قبیح اور بُرا معلوم ہوتا ہے واللہ اعلم۔

حضرت محدث نے فرمایا کہ حضرت محمد بن ابی طالب کی تلاش میں رہے جو ان کو آستانہ خدا تک پہنچائے اور کوئی جگہ نہیں چھوڑی جہاں (اس جستجو میں) پہنچے نہ ہوں مگر شام عراق، قسطنطنیہ اور ہندوستان سب ہی میں چکر لگایا اور جہاں بھی کسی ولی کا نام سنایا یا پتا لگا وہاں آئے مگر جس کے پاس بھی آئے باوجودیکہ لوگوں میں اس کی ولایت کا شہرہ اور جگہ اس کے کمالات کا تذکرہ ہوتا تھا مگر خالی شہرت کے سوا، کچھ نہ پاتے اور واپس ہو جاتے تھے اور اس کا سبب یہ تھا کہ ان کے والد عارفین میں سے تھے اور انہوں نے امر حق اُن سے سُنا تھا۔ مگر جب ان کے ہاتھوں پر ان کو فتح نصیب نہ ہوئی تو ایسے عارت کامل کو تلاش کرنا شروع کیا جو اللہ تک پہنچائے اور سلوک طے کرے مگر پرکھ کا مادہ موجود تھا اس لئے سمجھ بوجھ کر دامن پکڑنا چاہتے تھے محض شہرت پر اعتبار نہ کرتے تھے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ عراق میں مجھے ایک پیر ملے جن پر بے شمار مخلوق مجتمع تھی۔ آنے جانے والوں کے لئے ایک مہمان خانہ تھا جہاں باہر سے آنے والوں کی اتنی کثیر آمد تھی کہ روزانہ تقریباً دوسو درچارمن (کھانا پکتا تھا۔ خانقاہ میں ایک حجرہ تھا جس کو شیخ نے اپنا عبادت خانہ جو نیزہ کر رکھا تھا۔ اسی میں رہا کرتے اور مہینہ میں بجز آخری تین دنوں کے کبھی باہر نہ آتے تھے ستائیس دن برابر رکوع و سجود میں لگے رہتے تھے اس خلوت خانہ میں ایک بدشندان تھا جس کے ذریعہ خادم باہر ہی سے شیخ کا کھانا پہنچا دیا کرتا تھا۔ حجرہ ہی میں ایک جانب قضا و حاجت کے لئے جگہ بنادی گئی تھی۔ غرض مریدوں نے شیخ کی تمام ضروریات کا انتظام حجرہ کے اندر ہی کر دیا تھا تاکہ ان کو باہر نکلنے کی حاجت نہ پیش آوے اور وہ اپنے ستائیس دن اس میں بارام پورے کر سکیں۔ جب ستائیس دن پورے ہو جایا کرتے تھے تو غیر وار گفتگو کیا کرتے حتیٰ کہ سب فارغ ہو جاتے تھے جب تین دن پورے ہو جاتے تھے اور نئے مہینہ کا چاند نظر آتا تو پھر اپنے خلوت خانہ میں چلے جاتے اور ستائیس دن وہاں پورے کرتے۔

مدت سے ان کا یہ ہی معمول تھا چنانچہ ان کا نام آمد حال سنگہ میں بھی سفر کر کے وہاں پہنچا اور انتظار میں صبر کے ساتھ بیٹھا رہا حتیٰ کہ وہ حسبِ عادت وقتِ معمول پر حجرہ سے باہر تشریف لائے۔ اور







کچھ نہ کھاتے تھے۔ میں نے اُن سے بھی رب العزت کی شان کے متعلق سوال کیا اور انتہا درجہ کا جاہل پایا  
 سمجھ لیا کہ بنیاد کے بغیر چٹائی ہوٹھی ہے۔ نیز انہیں کا بیان ہے کہ میں ایک دن ساحل سمندر پر کھڑا ہوا تھا  
 کہ چند کشتیاں رنجارتی، مال بے کراہیں اور منگر انداز ہوئیں، اسیاب اُتارنے کے لئے حاملین جمع ہو گئے  
 کہ کمر پر بوجھ لاد کر شہر میں پہنچائیں اور اجرت لے لیں۔ میں نے دیکھا کہ معمول سے بہت زیادہ بوجھ  
 کمر پر اٹھا لیتے ہیں جیسے مصر میں کسانوں کی اور شہر فاس میں زر زایہ قوم کی، اور جدہ میں تکرونی مزدوروں  
 کی حالت ہے۔ یہ دیکھ کر میں دل ہی دل میں تعجب کرنے لگا۔ دفعۃً ان میں سے ایک شخص میری طرف آیا  
 جو کہ عارفین میں سے تھا مگر مجھے اس کا پتہ نہ تھا۔ وہ کشف کے ذریعہ میرے مافی الضمیر پر مطلع ہوا اور  
 مجھ سے کہنے لگا کہ اس پر تعجب نہ کرو بلکہ اللہ کی قدرت پر تعجب کرو جو ابھی میرے اندر ظاہر ہوگی یہ کہہ کر  
 اپنا بوجھ لئے ہوئے روانہ ہوا اور ذرا ہی دیر بعد واپس آیا۔ پھر چپ بیٹ گیا اور اپنے ہاتھ پاؤں پھیلے  
 اور روح نکل گئی۔ مرحوم نے گویا اشارہ کیا کہ ہم بیچاروں کی کیا طاقت و قوت ہے (قوت والا تو وہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ)  
 جو تمام قوتوں اور طاقتوں کا مالک ہے جس کو جتنی چاہتا ہے دیدیتا ہے اور جس سے جس وقت بھی چاہتا ہے  
 سلب کر لیتا ہے تعجب و حیرت کے شایان تو اس کی قدرت ہے اور اسی کی سطوت کو عظمت و بڑائی کا استحقاق  
 ہے **مُبَارَكُ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ** ۵۔ نیز وہ فرماتے ہیں کہ اس سفر میں، عارفین کی ایک جماعت سے  
 بھی مجھے ملنا نصیب ہوا مگر ان میں ہر ایک نے مجھے واپسی وطن کا مشورہ دیا اور یہی کہا کہ تمہاری حاجت  
 صرف شہر فاس میں پوری ہوگی۔ چنانچہ میں اپنے وطن رطابلس واپس آ گیا۔

اب حضرت ممدوح فرماتے ہیں کہ ان کے وطن میں بھی ایک بزرگ نے ان کو یہی بتایا کہ تمہاری مراد فاس  
 میں پوری ہوگی چنانچہ انہوں نے سفر کی تیاری کی اور یہاں آکر ایک شخص سے ملے جس کے ہاتھوں حق تعالیٰ نے انکو  
 فتح نصیب فرمائی اور خود حضرت شیخ تھے، فاس میں صرف چھ مہینہ قیام کیا اور جب اللہ عارفین و اہل دیوان میں سے  
 ہو گئے تھے نے حضرت ممدوح سے عرض کیا کہ اس کو حضرت والا کی حیات ہی میں فتح عطا ہو گئی حالانکہ باپ کی زندگی  
 میں کسی کو فتح مل نہیں سکتی اور اگر مل بھی جاتی ہے تو جلدی ہی جاتی رہتی ہے باقی نہیں رہ سکتی اور اس کی وجہ  
 یہ ہے کہ فتح کا نزول سرفراز پر ہوا کرتا ہے اور شیخ کاسر ذات جب اس کے روحانی بیٹے (یعنی خلیفہ یا نائبین)  
 کی طرف منتقل ہوتا ہے تب اسکو فتح عطا ہوتی ہے اور باپ کی زندگی میں اس کاسر ذات منتقل ہو نہیں سکتا  
 کہ وہ منتقل ہو تو اس کی ذات مشاہدہ سے خالی اور فتح سے محروم بن جائے اور اسی لئے اس کو میراث کہا جاتا ہے  
 کہ وفات شیخ کے بعد بصورت ترکہ روحانی اولاد کو ملتی ہے (حالانکہ اس شخص کو فتح نصیب ہوئی اور وہ قائم  
 و باقی بھی رہی اس کی کیا صورت ہوئی؟ فرمایا وہ میرا (روحانی) بیٹا نہ تھا اور یہ فتح جو میرے ذریعہ اس کو ملی تھی)



ایک شخص کی امانت تھی جس کا میں امین تھا کہ محفوظ رکھوں اور جب یہ شخص آئے تو اس کو پہنچا دوں، میں نے کہا وہ کون بزرگ تھے جن کی یہ امانت تھی؟ فرمایا نواج مراکش کے ایک شخص تھے اور عارف باللہ تھے۔ ان کا ستر باطنی (بطریق امانت) میرے پاس باقی تھا۔ چنانچہ جب یہ شخص آیا تو میں نے اپنے اوپر سے قمیص اتار کر اس کو پہنا دیا اور وہ ستر باطنی جس کی صورت مشابہ خرقہ پہنانا تھا، اس کے حوالہ کر دیا۔ میں نے کہا کہ ستر مذکور تو اس شخص کے لئے ثابت نہیں ہو سکتا جب تک کہ اسی مراکشی عارف کا ستر فات اس کی طرف منتقل نہ ہو اور اس کے لئے ضرورت ہے کہ وہ اس کو تعلیم دین اس کے ساتھ محبت اور اس کی تربیت کریں اور اس سے واقف و شناسا ہو کر قصد و ارادہ کریں ستر فات دینے کا، چہ جائیکہ انہوں نے اس شخص کو دیکھا تک بھی نہیں۔ فرمایا حق تعالیٰ اس امین کو جس کے پاس فات ولی کا ستر امانت رکھا ہے قدرت بخشا ہے کہ وہ اس کو دوسرے شخص کے حوالے کر دے اور پھر اس کو ستر اور فتح پر بھی قبضہ دیدیتا ہے اور باوجود اس کے وہ اس کا روحانی بیٹا نہیں کہتا اس عطاء ستر فات کا انتساب اسی پہلے شخص کی طرف رہتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ مورث کا وطن مراکش اور کہاں وارث کا مکان طرابلس، کیا اہل مغرب میں کوئی اس قابل ہی نہ تھا کہ پاس کے پاس ہمدون شیخ سے ان کی وفات کے وقت ستر فات لے لیتا اور اس کو باہر نکل کر طرابلس میں آنے کی ضرورت نہ ہوتی فرمایا ستر فات کی اس روحانی میراث کا مدار مناسب طبع پر ہوتا ہے کہ، مورث اور وارث ہم شکل و مشابہ ہوں عقل میں اور طبیعت میں اور خون میں چنانچہ ہمارے شیخ نلاں فرمایا کرتے تھے کہ اس (وراثت باطنیہ) کا مدار اگر حسابی قریب پر ہوتا تو میرا وارث میرا بیٹا ہوتا کہ اس سے زیادہ میرا قریب کوئی نہیں، اور اگر اس کا مدار قوت پر ہوتا تو میرا ترکہ سلطان کو ملتا کہ اس سے زیادہ باقوت کوئی نہیں، اور اگر اس کا مدار خدمت پر ہوتا تو میرا وارث میرا غلام خادم ہوتا کہ اس سے زیادہ میری خدمت کسی نے نہیں کی، مگر اس کا مدار تو صرف اس پر ہے کہ (مورث) کی عقل و نہم کو موافقت ہو و وارث کی عقل و نہم سے، اور اس کی طبیعت کو موافقت ہو اس کی طبیعت سے اور اس کے خون سے اور یہ موافقت کسی کی اکتسابی اور اختیاری نہیں۔

بلکہ محض وہی اور خدا داد ہے۔ اس لئے عدم مناسبت کے سبب پاس والے اس ترکہ سے عروم رہ جاتے ہیں اور دور والے میں یہ موافقت موجود ہوتی ہے اس لئے وہ ستر باطنی کا وارث ہو کر اس پر قبضہ کر لیتا ہے۔  
حسن زبیرہ بلال از حبش صہیب از روم بن زفاک مکہ ابو جہل اس چہ بوالعجبی ست

اور یہ طرابلسی شخص اپنے مورث مراکشی عارف کے ساتھ ان باتوں میں ہم شکل و مشابہ تھا۔ لہذا باوجود بعد مسافت اور بعد زمانی کے اس کا وارث قرار پایا۔ حتیٰ کہ انہوں نے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی مگر ترکہ بدرجہ امانت دوسرے کے پاس محفوظ رکھا گیا تا حق یہ حقدار رسد، واللہ اعلم



نیز آپ نے فرمایا کہ جب تم کسی عارت کو کثرت سے یہ کہتا ہو اُسنو کہ فلاں شخص میرا وارث ہوگا اور میرا ستر بٹنی  
 اس کو ملے گا اور تم میرے بعد اس کا دامن پکڑنا تو غالب یہ ہے کہ ایسا نہ ہوگا کیونکہ اسرار ربانیہ حشرات  
 گمان آیا کرتے ہیں جہاں کسی کا خیال بھی نہیں جاتا۔ چنانچہ خود ان مشائخ کو یہ اسرار جس وقت ملے ہیں تو  
 لوگوں کا خیال بھی نہ تھا کہ یہ اس کے اہل ہیں اسی طرح جب ان سے خارج (اور دوسرے کی طرف منتقل  
 ہوں گے تو بلاظن و گمان ہی منتقل ہوں گے پھر فرمایا کہ آٹھ مرید اپنے شیخ کی خدمت کیا کرتے تھے۔ ایک  
 ان میں بھٹک گیا تھا اور خدمت کے قابل نہ رہا۔ باقی رہے سات وہ برابر خدمت میں لگے رہے اور ان میں  
 بھی تین نے خدمت میں انتہا کر دی حتیٰ کہ اپنی بیٹیاں شیخ کی زوجیت میں دیدیں کہ وہ خادمہ بن کر گھر  
 کے اندر شیخ کو آرام پہنچائیں) ان تین میں بھی ایک کی لڑکی بہت حسین اور صاحب سلیقہ و خدمتگذار  
 تھی اس لئے اسی کے باپ سے شیخ کو تعلق زیادہ تھا کہ ہر بات میں اس کو ہوسروں پر ترجیح دیتے  
 تھے عام لوگوں کا خیال تھا کہ شیخ کا وارث (اور قائم مقام) یہی ہوگا مگر جب شیخ کی وفات کا وقت  
 قریب آیا اور سب خادم و منتسبین حاضر ہوئے تو انہوں نے اس عاجز کو جو خدمت سے معذور ہو چکا تھا  
 آواز دی اور فرمایا کہ تم ہو صاحب ستر یہ کہتے ہی روح پرواز کر گئی اور دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس کے بعد حقر  
 نے فرمایا کہ عام لوگ جس کو بنظر حقارت دیکھا کرتے ہیں اللہ کی رحمت اور نگاہِ کرم اس پر زیادہ ہوا کرتی ہے  
 بہ نسبت اس کے جس پر لوگوں کی نظریں عزت و احترام کی پٹا کرتی ہیں اس بنا پر اہل اعتقاد زیادہ  
 مستحق ہوتے ہیں ربانی اسرار کے فے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دل شکستہ اور انتظار سے  
 خالی ہوتے ہیں کہ وہ خود بھی اپنے کو حقر اور ذلیل سمجھتے ہیں اور یہ عجز و شکستگی ہی بارگاہِ احدیت میں  
 زیادہ مقبول و محبوب ہے اور عطا کا تورب متعال کی یہ حال ہے کہ چھپر بھاڑ کر دینا ضرب المثل ہو گیا ہے  
 اور یٰٰ نَفْسُ مِنْ حَيْثُ لَا يَخْتَبِئُ اس کی شان بے نیازی کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال کہ آگ لینے کو جانیسی ہمیری مل جائے

ایک بار حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رب العزت سے سوال کیا کہ آپ کو کہاں ڈھونڈوں؟ ارشاد  
 ہوا شکستہ دلوں کے پاس۔ ادبیات بھی یہی ہے کہ اللہ کی جس مخلوق کو عام مخلوق بنظر حقارت دیکھے اگر  
 خالق جل شانہ، بھی اس پر نگاہِ کرم نہ فرمائے تو پھر وہ بد نصیب کہاں جائے اور کس دروازہ پر پڑے؟

ایک مرتبہ اپنے فرمایا ایک بزرگ کے دو مرید تھے ایک عامی اور معمولی شخص تھا اور دوسرا شریف و صاحبِ جاہ  
 دونوں فتح اور ستر باطنی سے خالی تھے۔ بزرگ نے اس عامی سے کہا کہ شریف کے پاس جا کر کہو  
 کہ ستر و فتح تمہارے ہاتھ جمع کر دے چنانچہ وہ اس کے پاس گیا اور کہا کہ ستر و فتح بوجہ



سودینار کے میرے ہاتھ فروخت کر دو۔ اس نے انکار کیا کہ میں نہیں بیچتا۔ عامی نے کہا اچھا تو دستار اور  
 بڑھاتا ہوں (دو سودینارے لے لی) اور فتح و ستر کا حق مجھے دید و شریف نے کہا مجھے منظور نہیں اس نے  
 کہا اچھا ایک خادم و غلام قیمت میں اور بڑھاتا ہوں شریف نے کہا اس پر بھی منظور نہیں۔ عامی  
 نے کہا اچھا دختر اپنی کا اور اضافہ کرتا ہوں کہ اس کو تمہاری زوجیت میں دے دوں گا شریف نے کہا میں  
 اس پر بھی راضی نہیں۔ عامی نے کہا اچھا اپنا مکان بھی دیتا ہوں۔ اس پر شریف نے کہا میں اس  
 پر راضی ہوں۔ حالانکہ مدلول الہی حجاب تھے کہ فتح کے اسرار و انوار میں سے کسی نے کچھ بھی نہ دیکھا تھا مگر  
 عامی نے جو کچھ کیا وہ محض شیخ کے کلام کو سچا سمجھنے کی بنا پر ربوے عقیدت اور حکم کی تعمیل میں کیا تھا بیع کا  
 ایجاب و قبول ہو جانے کے بعد عامی نے شریف سے کہا کہ گواہ لاؤں تاکہ میں یا تم اس معاہدہ باہمی کا نقص یا  
 انکار نہ کر سکیں، شریف نے کہا بہتر ہے چنانچہ عامی چند دیداروں کو بلا کر لایا اور سارا قصہ ان کو سنا کر کہا  
 کہ میں نے قیمت میں نکلاں نکلاں چیز ان کے حوالہ کی ہے، تم اس پر گواہ رہنا۔ شریف نے بھی کہا ہاں میں  
 بھی تم کو گواہ بناتا ہوں کہ میں ستر و فتح اس کے ہاتھ فروخت کر چکا۔ الغرض دختر بعد نکاح رخصتی ہو کر  
 شریف کے گھر پہنچ گئی اور مکان و خادم اور سودینار پر اس کا قبضہ ہو گیا اس پر تورات ایسی پُر لطف  
 اور مزے کی گزری کہ عمر بھر میں کوئی رات ایسی مزہ دار نہ گزری تھی۔ اور عامی بیچارے پر ایسی پریشانی  
 کی رات گزری کہ ساری زندگی ایسی تاریک و تنگ کوئی رات بھی نہ گزری تھی کہ تمام شب شیخ کی طرت سے  
 بدگمان بنانے والے قسم قسم کے دسوے آتے رہے اور یہ ان کو دفع کرتا رہا مگر جب پوچھتی اور صبح صادق  
 نمودار ہوتی تو ستر اور فتح اول شریف کے پاس آئی حتیٰ کہ اس نے اس کا مشاہدہ کیا اور اس میں وہ وہ  
 عجائب دیکھے جو نہ کسی آنکھ نے (دنیا میں) کبھی دیکھے تھے نہ کسی کان نے سنے تھے اور نہ کسی کے خیال میں گزر تھے  
 جب اس نے خوب غور اور گہری نظر سے اس کو دیکھ لیا تو وہ سلب ہو گئی اور اس عامی کی طرت چلی گئی۔ وہ  
 تو ولی و کامل بن گیا اور شریف صبر نے اس کو رفاہی و چند روزہ متاع دنیا پر (بیچ دیا تھا اس لی ہوئی قیمت  
 میں بھی کسی چیز سے منتفع نہ ہو سکا اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ جب اس کے لئے ستر و فتح کا سلب واقع ہوا تو اس کی  
 عقل جاتی رہی اور اس کی زبان پر بجز اس کے کچھ نہ رہا کہ کہتا تھا تو کہاں ہے، بے اپنا مکان بے اپنا غلام  
 بے اپنی دختر بے اپنے دینار بے بلکہ، بلکہ میں اپنی ماں بھی تجھے دیتا ہوں سب بے گویا حالت جنوں میں  
 اس عامی کو مخاطب بنا کر کہتا تھا کہ اے ستر و فتح کے خریدار تو کہاں چلا گیا تجھے کس جگہ ڈھونڈوں، تو نے  
 مجھے جو کچھ بھی دیا ہے وہ سب تجھ کو واپس کرتا ہوں اور ماں کا اضافہ کرتا ہوں اس قصہ کے بعد تقریباً  
 ساٹھ برس وہ زندہ رہا مگر مدت العمر سلب العقل اور دیوانہ ہی بنا رہا یہ قصہ سن کر کسی نے حضرت



اس کی تو دنیا بھی گئی اور آخرت بھی گئی۔ دونوں کھو کر بد نصیب دنیا سے اٹھا فرمایا پھر اس میں کسی کا کیا سہ  
اس سے تو سڑ وفتح بھی گئی اور ایک اور چیز بھی گئی جس کو میں کہنا نہیں چاہتا۔

نیز آپ نے فرمایا میں ایک مسلوب العقل مجنون سے واقف ہوں، اس کا کام بجز اس کے کچھ نہیں کہ پتھر اٹھا کر  
اور اوپر ہوا میں پھینکتا ہے اور اپنا سر اس کے نیچے کر دیتا ہے کہ وہ اس کے دماغ پر آکر پڑتا ہے مدت دراز سے  
میں اس کو اسی حالت پر دیکھتا تھا اور وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی کہ ایسا کیوں کرتا ہے اب الحق تعالیٰ نے وجہ سمجھا دی  
اور معلوم ہوا کہ یہ شخص تپ کہنہ کا علاج کیا کرتا تھا اور اس کی دکان کوچہ رضیف میں تھی۔ ایک دن اس کو ایک  
دلی ملا اور اس نے کہا بیٹا میں چاہتا ہوں کہ تم میرے لئے ایک نئی ٹوپی خرید کر لا دو۔

لہذا وہ ہم لیتے جاؤ اور ٹوپی خرید لاؤ۔ یہ شخص اس سے واقف نہ تھا کہ دلی کامل ہے، درہم لیکر بازار  
چلا گیا اور دلی کھڑا ہوا اس کا انتظار دیکھتا رہا اس نے ٹوپی خریدی اور اس دلی کو دینے کے لئے چلا راستہ میں  
اس کی نیت بگڑی اور اس کے نفس نے کہا یہ شخص جس نے ٹوپی خریدنے کے لئے تجھے درہم دیدئے بڑا ہی بے وقوف  
ہے، جان نہیں، پہچان نہیں، اس نے تجھ پر اطمینان کیسے کر لیا اب تو بے وقوف ہے اگر ٹوپی اس کو پہنچاتا ہے  
خود اس کو اور ٹھہرے اور اس کے پاس نہ جا۔ چنانچہ اس نے پرانی ٹوپی جو اس کے سر پر تھی اتار کر دو موزوں سے  
بیچ دی اور اس ٹوپی کو اور ٹھہر لیا اور اپنی دکان پر جا بیٹھا دلی کو جب معلوم ہوا کہ اس نے خیانت اور بد عہدی  
کی تو اس دن تو کچھ نہ بولے۔ اگلے دن سیدھے اس کی دکان پر پہنچے اور اس کو غافل پار سر کے اوپر سے ٹوپی اتار  
لی اور یہ کہہ کر کہ دیکھ اللہ کی کیا نعمت تجھ سے جاتی رہی، وہاں سے بھاگ گئے۔ اس خائن نے دلی کی طرف  
دیکھا تو اس کو فتح نصیب ہوئی اور وہ عجائب قدرت، نظر آئے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھے تھے نہ کان نے سنے  
تھے نہ کسی بشر کے خیال میں آئے تھے جب اس نے نظر ہٹا کر اپنی دکان کی طرف دیکھا تو وہ فوراً سلب  
ہو گئی اور اس کی عقل جاتی رہی۔ چونکہ اس کو علم تھا کہ یہ آفت سر کی طرف سے آئی ہے کہ نہ ٹوپی خیانت  
کر کے سر پر اوڑھنا اور نہ فتح جیسی نعمت سلب ہوئی، اس لئے وہ اپنے سر کے ساتھ یہ عمل کرتا ہے کہ پتھر  
کا نشانہ بنا کر رات دن اس کو کچلتا رہتا ہے اب تک وہ زندہ ہے اور اپنی اسی حالت پر قائم ہے چنانچہ حضرت  
ممدوح نے اس کو مجھے بھی دکھایا اور فرمایا یہ ہے وہ شخص جس کا میں نے قصہ سنایا تھا۔ میں نے دیکھا  
تو واقعی اس کا یہی حال تھا جیسا حضرت نے بیان فرمایا تھا۔

میں نے حضرت سے سرباطنی کے متعلق جس کی طرف صوفیہ اشارہ کیا کرتے ہیں ایک مرتبہ دریافت کیا تو آپ نے  
مثال کے طور پر فرمایا کہ پادشاہ کے پاس ملا و سرخ ہوا کرتا ہے جس سے وہ ہر کردار کو عطا نہیں کیا کرتا۔ بلکہ جس سے  
خصوصی تعلق ہوتا ہے اسی کو دیا دیا کرتا ہے یہی شان سرباطنی کی ہے کہ وہ سمندر ہے، جسے



حق تعالیٰ اپنی مخلوق میں منتخب و برگزیدہ بندوں کے سوا کسی کو عطا نہیں فرماتا میں نے کہا ستر اور فتح کیا ایک ہی چیز ہیں؟ فرمایا فتح ایک زائد چیز ہے کہ ستر باطنی اس کی معیت میں قوت پکڑ جاتا ہے کیونکہ فتح کے معنی ہیں کشادگی اور کھل جانا یعنی جس کو یہ نصیب ہوتی ہے اس کی بنیادی میں کشادہ ہو جاتی ہے کہ ہفت انداک و ہفت زمین میں اس کو نظر آتی ہیں اور سماعت اتنی کھول دی جاتی ہے کہ پرند اگر فلاء فلک میں پرہلائے، یا چوئیٹی اپنے پاؤں کو حرکت دے تو اس کی آواز ایک سال کی مسافت سے اس کو سنائی دیتی ہے۔ اور قوت شامہ میں اتنی وسعت آ جاتی ہے کہ مٹی کی بو اس کو سنگھائی دیتی ہے اور ہر مٹی کی بو جدا ہے یا مٹی کی بوہ سوگھتا ہے، تمامی فوات اور ارواح کی جدا جدا بو اس کو سنگھائی دیتی ہے، زندہ ذات کی بو جدا سوگھتا اور معلوم کرتا ہے کہ یہ زندہ حیوان کی ہے اور مردہ ذات کی بو جدا سوگھتا اور فرق محسوس کرتا ہے اور ذوق میں اتنی کشادگی بخشی جاتی ہے کہ بدن سے مس کئے بغیر اشیا و مذکورہ کے مزے اور ذائقے محسوس کرتا ہے اور اسی طرح قوت لامہ کو کھول دیتا ہے نیز سماعت اتنی کھل جاتی ہے کہ مختلف آوازیں اس پر مختلط نہیں ہوتیں اور ایک آواز کی سماعت دوسری آواز کی سماعت سے مانع نہیں بنتی۔ ہزاروں آدمیوں کی آواز کو آن واحد میں سنتا اور ہر ایک کی بات کو سمجھتا اور جدا جدا اور اک کرتا ہے پس اگر وہ ستر الہی جس کا پہلے ذکر ہوا کہ بمنزلہ کنکدن اور طلاء کسرف کے ہے، اس فتح اور قوت حواس و ادراکات کے ساتھ جمع ہو جاتا ہے تو دو قوتیں اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ اور اگر تنہا ستر ہوتا ہے حجاب کے ساتھ کہ فتح حاصل نہ ہونے کا نام حجاب اور پردہ ہے تو فقط ستر ہی ستر ہے کہ جس کو عطا ہوتا ہے اس میں صاحب فتح کی سی قوت و طاقت نہیں ہوتی۔ میں نے کہا کہ تنہا ستر کے حاصل ہوتے سے کیا بات نصیب ہوتی ہے؟ فرمایا حق تعالیٰ کی اوصاف کی مشابہت فی الجملہ حاصل ہو جاتی ہے صاحب ستر کے لئے امر حق طبیعت ثانیہ بن جاتا ہے کہ حق پر چلتا ہے حق ہی بات زبان سے نکالتا ہے اور حق ہی سے مانوس ہوتا ہے نیز اوصاف عالیہ اور اخلاق حمیدہ پر چلتا ہے مثلاً عفو و درگزر حلم و شہم پوشی، حیاء و کرم، وغیرہ اس کے خصائل و شمائل بن جاتے ہیں۔ اور اگر اس ستر پر فتح کا بھی اضافہ ہو گیا تو دوسری طاقت نصیب ہو جاتی ہے وئے ستر الہی ایک نعمت عظمیٰ ہے جس کو عام اصطلاح میں نسبت مسلمہ بولتے ہیں اور جب شیخ دیکھتا ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کے نلاں مرید کو اس عطا فرمایا تو وہ اس کو بیعت لینے اور دوسرے دل کی تربیت کرنے کی اجازت دیدیتا ہے اس کو خلیفہ اور حجاز کہلاتا ہے نسبت درحقیقت بندہ کا اپنے مولیٰ تعالیٰ کا شائبہ کے ساتھ ایک ارتباط قلبی ہے اور یہ اس کے آثار و ثمرات ہیں یعنی حق گوئی و حق علی اس کا ایسا امر طبعی بن جاتا ہے جیسا چلنا پھرنا اور کھانا پینا کہ اس میں تکلف اور آہردگی



ضرورت نہیں رہتی۔ اخلاقِ رذیلیہ مثلاً کبر و بغض و حسد وغیرہ سے طبعاً ایسی نفرت ہو جاتی ہے جیسے بول ویرا ت اور گھناؤنی چیزوں سے نفرت ہوتی ہے اور اخلاقِ حمیدہ مثلاً صبر و شکر و توکل وغیرہ سے ایسا انس ہو جاتا ہے جیسا شیریں پھلوں اور لذیذ غذاؤں سے انس ہوتا ہے ستر الہی گویا ایک صبح و بے عیب تخم ہے جس سے وہ شاداب درخت پیدا ہوتا ہے جس کے پتے سبز، پھول خوشبودار اور پھل رسے اور مزہ دار ہوں یا یوں کہو کہ نسبت باطنیہ روح کے لئے بمنزلہ صحت و تندرستی کے ہے جسم کے لئے کہ لطیف غذاؤں کی رغبت ہوگی اور کثیف غذاؤں سے وحشت جو کھائے گا وہ مہضم ہوگا اور بدن کو نگے گا کہ ہر عضو میں طاقت آئے گی اور تمام جوارح کو قوت پہنچے گی۔ واعظین اسلام جس اصلاح کی ان دور باعیوں میں قول نصیحت کرتے ہیں کہ

خواہی کہ شوی بمنزل قرب مقیم صبر و شکر و قناعت و عزم و یقین	دیگر	نہ چیز بہ نفس خویش فرما تسلیم تفویض و توکل و رضا و تسلیم
اور: خواہی کہ شود دل تو چوں آئینہ حرص و امل و غضب و دروغ و غیبت		دہ چیزوں کن از درون سینہ بخل و حسد و آریا و کبر و کینہ

ان کی عملی حالت اور اتصاف کا نام نسبت اور ستر الہی ہے اور فتح نام ہے ملکوتی مشاہدہ کا کہ ادراکات و حواس باطنیہ میں بیش از بیش قوت آجاتی ہے پھر اس قوت کے بھی کثیر مراتب ہیں جس درجہ کی قوت نصیب ہوگی اسی درجہ کی فتح کہلائے گی اور اسی بنا پر کہا کرتے ہیں کہ فلاں ولی کی فتح ضعیف ہے اور فلاں کی قوی ہے صاحبانِ خدمت جن کے متعلق حق تعالیٰ نے نظامِ عوالم فرمایا ہے وہ عموماً فتح سے نوازے جاتے ہیں کیونکہ جب تک ملک اور رعیت کا مشاہدہ حاصل نہ ہو اس کا نظم انجام نہیں دے سکتے اور ہر چند کہ یہ حضرات محض مظاہر امر الہی اور کارکنانِ قضا و قدر ہوتے ہیں کہ اپنے ارادہ سے کچھ نہیں کرتے اور نہ کر سکتے ہیں اس لئے کہ عالم میں متصرف حقیقی بجز حق تعالیٰ کے کوئی نہیں۔ اور میں تو اس کا محض عقیدہ ہی ہے لیکن ان حضرات کو یہ حقیقت بھی شکست ہو کر علم الیقین بلکہ عین الیقین حاصل ہوتا ہے مگر چونکہ نظامِ عالم میں تنفیذ و صورت انہیں حضرات کے ہاتھوں ہوتی ہے اور ان کی قوت ارادیہ کو سبب کی شکل میں واسطہ کار بنایا جاتا ہے اس لئے تقرب الہی میں ان کا بڑا درجہ ہے اور یہ جراحات امتِ محمدیہ کے منتخب و حیدرہ کی افراد کی ہے ستر الہی اور فتح و حجاب کا لفظ اس کتاب میں جگہ جگہ آیا ہے اور میں وعدہ کر آیا تھا کہ آئندہ اس کی حقیقت و وضع ہوگی چنانچہ کتاب کے اسی مقام کا انتظار تھا اور آج ایفاء وعدہ سے الحمد للہ سبکدوش ہوا

حضرت مدوح نے فرمایا کہ فتح کا جب کسی ذات پر نور قوت سے قبل نزول ہو جاتا ہے تو ذات کو اختلال اور نقصان پہنچ جاتا ہے کہ مر جاتا ہے یا سلوب العقل (مجذوب) ہو جاتا ہے اور اگر ذات پر پہلے قوت کا



نور اور تحمل و برداشت کی طاقت، نازل ہوا اور پھر اس کے بعد فتح کا نزول ہو تو ذات کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا اور وہ صاحب فتح ساک و ولی کامل بن جاتا ہے، میں نے عرض کیا کہ وہ قوت کیا ہے؟ آپ نے گھاس کے ایک تنکے کی طرت جو دہاں پڑا تھا اشارہ کر کے فرمایا کہ اگر وہ قوت جس کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں حق تعالیٰ اس تنکے کو عطا فرما دے تو یہ اس پہاڑ کو اٹھا لے، اور پہاڑ کی طرت انگلی کا اشارہ کیا جو ہمارے سامنے تھا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا خوش نصیب اور صاحب توفیق وہ ہے جو حق تعالیٰ سے اس کی درخواست کر کے کہ نور فتح کے نزول سے پہلے قوت اور برداشت کا نور نازل فرمائے۔

نیز آپ نے فرمایا کہ میں اپنی ابتدائی حالت میں ایک مرتبہ حضرت منصور کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ وہ رہے ہیں حضرت ممدوح غزلی تھے یعنی کثرت بننے کا پیشہ کیا کرتے تھے میں نے روتے کا سبب پوچھا تو فرمایا ہم اصلاح کس چیز کی کریں ہمارے ہاتھ میں تو کچھ بھی نہیں، اب مجھے بننے کی حالت میں فعل الہی کا شاہد ہوتا ہے میں سمجھا کرتا تھا کہ میں کچھ کر رہا اور خود کپڑا بن رہا ہوں مگر حقیقت یہ منکشف ہوئی کہ کوئی اور یعنی ذات حق سبحانہ، سہی ہے جو سب کچھ کر رہی ہے حضرت فرماتے تھے کہ اس وقت میری سمجھ میں آیا جو جواب دیتا مگر آج میں واقف ہوں کہ مجھے کیا عرض کرنا چاہیے تھا میں نے پوچھا وہ کیا ہے جو آپ ان سے فرماتے؟ فرمایا ان سے یہ عرض کرتا کہ اللہ جل جلالہ سے ترقی طلب کیجئے کہ اوپر چڑھتے اور اپنی ذات و صفات کا مشاہدہ نصیب فرمائے ابھی تک آپ حادث (اور فانی) ہی چیزوں کے مشاہدہ میں پڑے ہوئے ہیں کیونکہ افعال الہیہ تو منجملہ اس کی مخلوقات حادثہ کے ہیں میں نے دریا منت کیا کہ حضرت منصور نے کیا اس حالت سے ترقی پائی؟ فرمایا اسی درجہ میں، آپ کی وفات ہو گئی۔

نیز آپ نے فرمایا کہ میرے شیخ حضرت عمر ہواری قدس سرہ کے اوصاف کمالیہ سے رجحان وہ مخفی رکھا کرتے تھے اگر لگ واقف ہو جاتے تو دوسرے زندہ ولیوں مثلاً فلاں اور فلاں کے پاس کبھی نہ جاتے کیونکہ حضرت ممدوح میں چار خریاں ایسی تھیں جو دوسروں میں ملنی مشکل تھیں اول وہ کسی کے بارے میں کبھی کچھ نہ کہتے تھے اور کسی کو بھی نہ علانیہ کبھی برائی سے یاد کرتے تھے نہ خفیہ دوم عزت ان کو بے حد پسند تھی کہ تمام عمر علی بن حزم کے روضہ میں سجادہ بنے رہے مگر سب سے یکسو اور اپنے خلوت خانہ میں دن بھر تسبیح و تہلیل اور دلائل الخیر کے پڑھنے میں مشغول رہتے تھے اور مغرب کے وقت اپنے گھر چلے جاتے تھے زائرین کی جب کثرت ہوتی تو روضہ بھی چھوڑ دیتے اور باب روضہ کے سامنے سدرہ محررہ میں جا بیٹھتے اور سب سے الگ اپنے مشغل میں لگے رہتے تھے سو م فضول اور عبث کام سے بالکل محفوظ تھے۔ پھر اپنے آپ کو کچھ بھی نہ سمجھتے تھے اور تعلیل یا کثیر کوئی عبادت بھی اپنی طرت منسوب نہ کرتے تھے سب اللہ کا فضل و انعام سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ



جتنے لوگ روضہ میں بغرض زیارت آتے خصوصاً ذاکرین و شاعین جو وہاں شب بیداری کیا کرتے تھے ان کو بھی مطلق پتہ نہ تھا کہ شیخ عمر صاحب سرام اہل نسبت ہیں شیخ علی روضہ میں حاضر رہتے تھے۔ اور زائرین سب انہیں کے پاس جاتے اور وہیں ان سے ملتے جلتے تھے۔ نہ ان سے کوئی دعا و کا خواستگار ہوتا تھا نہ فاتحہ خوانی و ایصال ثواب کا چہارم زہد کہ لذات دنیا سے بچتے تھے جب سے مجھے ان کی صحبت اور مخالفت نصیب ہوئی اکثر میں نے دیکھا کہ آپ علی الصباح شیخ علی کے پاس آتے اور آپ کے پاس روٹی کا سرکھا ٹکڑا بھی نہ ہوتا تھا شیخ علی کے پاس رکسی کا دیا ہوا ہدیہ یا نذرانہ آگیا تو انہوں نے بھی اس میں سے کچھ کھا لیا ورنہ تمام دن ناقہ سے گذرتے اور خالی پیٹ بھوکے پیاسے اپنے ذکر و عقل میں لگے رہتے تھے میں دیکھا کرتا تھا کہ بعض دفعہ ان کو روکھی روٹی کا ٹکڑا ملتا تو شیخ علی سے ذرا سا روغن زیت سے لیتے اور اس میں قدر نمک ڈال کر اس میں چور کر روٹی کھا لیا کرتے تھے اور اگر زیت بھی نہ ملتا تو پانی میں نمک گھول کر اسی میں بیگو بیگو کر روٹی کھا لیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت محدوح نے فرمایا ادبیا میں ایک خصلت ایسی ہے کہ لوگوں کو اگر اس کا انداز کی راحت و لذت کا علم ہو جائے تو جو کچھ بھی ان کو دنیا کا زرو مال، حاصل ہے اس کے مقابلہ پر سب پھینک دیں اور وہ یہ کہ مصیبت یا کلفت جس کا پیش آنا مقدر ہو چکا ہے، جب تک سر پر نہ آپڑے وہی کو نہ اس کا ٹکڑا ہونا ہے نہ اس کی وجہ سے کوئی پریشانی لاحق ہوتی ہے اگر اس کو ظن غالب بلکہ یقین بھی ہے کہ وہ عنقریب ایک ہی گھڑی بعد یا اس سے بھی کم میں نازل ہوتے والی ہے تو اس کی نظر میں بمنزلہ عدم کے ہے کہ اس کو بالکل بھی اس کا حس و شعور نہ ہوگا تم اس کو دیکھو گے کہ بزمانہ آئندہ جو حادثہ اس کو پیش آنے والا ہے حالانکہ وہ اس کا مشاہدہ کر رہا ہے مگر کھا بھی رہا ہے، پی بھی رہا ہے، بیوی سے ہم بستری بھی کر رہا ہے غرض ایسا مطمئن ہے گویا ناواقف ہے کہ نہ اس کی مطلق بصیرت حاصل ہے اور نہ اُسے علم ہے کہ کیا ہوا چاہتا ہے یہ سکون ایسی نعمت ہے کہ کبھی پریشان اند تکدر پاس بھی نہیں آتا، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں حق تعالیٰ کے تصرف کا کوئی شخص بھی احاطہ نہیں کر سکتا لوگ جس بات کو سمجھیں کہ ہو موالی ہے ممکن ہے کہ اللہ کا تصرف کو قطع کر دے اور وہ ہونہ سکے غرض ان کی نظر حق تعالیٰ کے آزاد اور بے قید تصرف پر پڑتی ہے کہ اس کی قدرت و مشیت نہ کسی کے کشف کی پابند ہے نہ لوح کی لکنت یا وہی کے مشاہدہ کی اگر موافقت فرماتا ہے تو اپنے ارادہ و اختیار ہی سے فرماتا ہے نہ کہ پابند امر مجبور ہو کر پس باوجود امر مقدر کا مشاہدہ ہو جانے کے جانتے ہیں کہ تحت قدرت الہیہ اند زیر تصرف قرار دے کر کیا ضرر ہے کہ وہ اس کا پابند ہو کر ہی رہے۔ پس اس خصلت میں اتنی راحت ہے کہ اس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی اور جب امور مقدرہ کا مشاہدہ کرنے والا صاحب فہم ولی کدیرہ حالت ہے تو صاحب حجاب کی



کیا حالت ہوتی چاہیے جسے پیش آئندہ حادثہ کا قبل از وقت علم ہی نہیں ہوا، اس کو تو لازم و ضروری ہے کہ تدبیر کے اہتمام سے سبکدوش اور سو و تقدیر سے مستریج و بی فکر بنارہے کہ جو مقدر ہے ہو رہے گا قبل از مرگ وادیلہ سے کیا حاصل، خصوصاً جبکہ اپنی تدبیر کا کوئی نتیجہ بھی نہیں کہ مقدر کسی کو ملے نکل نہیں سکتا اور ساری دنیا بھی اس کو روکنا چاہے جس کا نزول حق تعالیٰ نے طے فرمایا ہے تو ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں روک سکتی،

میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ وہ کونسا ولی ہے جس کے لئے یقین سوچ پیاٹھ ذات ہوتی ہیں؛ فرمایا صرف غوث کہ وہی انوار محمدی کا وارث کامل ہوتا ہے میں نے عرض کیا اور موروث اعظم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تو ایک لاکھ چوبیس ہزار ذات ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ غوث ان سب کا وارث نہیں ہوا؛ فرمایا حقیقی طاقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں تھی وہ کسی میں نہیں تھی اور غوث کے وارث ہونے کا مطلب صرف یہ ہے کہ انوار محمدیہ جس مقدار میں اس نے پینے ہیں اتنے اس زمانہ میں کسی نے بھی نہیں پیئے فے بندہ ناچیز اس عبارت کا جو مفہوم سمجھا کہ اس کو ذرا لبط کے ساتھ عرض کرتا ہے اللہ جل جلالہ کی مرضیات جن کو انسانی کمالات اور مظاہر انوار کمالیہ الہیہ کہنا چاہئے کثیر و کثیر ہیں جن کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے پھر ان کمالات میں بھی صنعت اور قوت کے کثیر درجات اور بلحاظ کمیت و کیفیت مختلف مراتب ہیں مثلاً اللہ سبحانہ پر کمال ایمان اس کے ساتھ محبت نامہ اس کی معرفت کاملہ علم الیقین تقویٰ توکل، رضا، تسلیم، نہم، ذکا، فراست، فطانت، عبادت، ریاضت، نفرت، سیاست، شجاعت، ہمت، ایثار، رقت، قلب، تعلیم، فرح، برکت، حق جو، اطاعت، صدق، وفا، صبر، شکر، قناعت، زہد، حلم، عدل، خوف، خشیت، ایثار، عزم، استقلال، استقامت، حیا، عفت، عصمت، حب فی اللہ، بعض فی اللہ اخلاص، ادب، تواضع، رحم، عفو، تجرد و کرم، رفق، شفقت، رافت، حنانت، عجز، انکسار، سیاتہ روی، مہمان نوازی، مسکنت، سادگی، خیرہ روی، حسن خلق، حسن معاشرت، حسن معاملہ، سلطنت، رعایا پروری، جان نثاری، طہارت، عبودیت، خشوع، عزت، انبساط، سادگی، بے تکلفی، اخوت، ساداقہ، امارت پسندی سے اجتناب، طول اہل سے نفرت، عدم حرص، عدم بخل، عدم کبر، لطفت، طبع، حسن صورت، جمال ملاحت، نزاکت، اعتدال و غیرہ سب جدا جدا محاسن ہیں اور حسن کے بلحاظ مستقلات متعدد اجزا اور مختلف اقسام ہیں مثلاً ایمان باللہ میں ذات باری پر ایمان جیسا بھی وہ حقیقت میں ہے اس کے علم قدیم پر ایمان اس کی قدرت غیر متناہیہ پر ایمان اس کے سمیع ہوتے پر ایمان، اس کی مشیت و ارادہ پر ایمان، قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے پر ایمان، تقدیر پر ایمان، ملائکہ پر ایمان، بعث پر ایمان، پل صراط پر ایمان، میزان پر ایمان، حبلہ مقیمات پر ایمان، حشر و نشر پر ایمان، جنت و دوزخ پر ایمان، عدو و دین پر ایمان، عرش و کرسی پر ایمان، لوح محفوظ اور اس کی لکھت پر ایمان و غیرہ جن کو

۱۔ جس کی مداشت دوسرے کو ملحق ہے اس کو موروث کہتے ہیں کہ مدرث اسم فاعل ہے اور موروث اسم مفعول علوم اس کو غلطی سے

مورث ہونے لگے حالانکہ وہ متعدی اور باب افعال سے ہے ۱۲ مترجم



علماء کلام نے عقائد اسلام کا درجہ دیا ہے علیٰ ہذا عبادت میں مثلاً نماز کی محبت، روزہ کی محبت، حج کا شوق، زکوٰۃ اور صدقات سے انس، تلاوت قرآن مجید کا ذوق، اعتکافات کا جذبہ وغیرہ جس کا عنوان کتاب العبادات ہے اسی طرح مثلاً صدق میں صدق مقال اور سنگونی صدق انفال، صدق حال یا مثلاً شفقت میں شہنوں پر شفقت، اہل کتاب پر شفقت، مشرکین پر شفقت، عورتوں پر شفقت، بچوں پر شفقت۔ یہاں می پر شفقت بیوگان پر شفقت، اپاہج و معذورین پر شفقت، جانوروں پر شفقت، زبیر و قربانی پر شفقت، جنگلی پرندوں پر شفقت، صحرائی مدندوں پر شفقت، عصاق پر شفقت، عباد و زہاد پر شفقت، رہبان و گہر و ترسا پر شفقت غلاموں پر شفقت، وغیرہ وغیرہ غرض ہر خصلت حمیدہ میں خواہ وہ عمل کے متعلق ہو یا خلق کے اور قلب کے تعلق رکھتا ہو یا جوارح سے اور تصور و مراقبہ سے متعلق ہو یا فکر و تخیل سے اور ظاہر ہو یا باطن، ہر حال متعدد اجزا نکلیں گے جن کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہوگی محض نمونہ کے درجہ میں مختصراً چند کی طرف اشارہ کر دیا ہے پھر ان محاسن کا ایک ادنیٰ درجہ ہے کہ اس سے نیچے اتر کر حسن کا وجود ہی باقی نہیں رہتا اور ایک ایک اعلیٰ ترین درجہ ہے کہ اس سے اوپر کسی بشر کو حاصل نہیں ہوا۔ ان اوصاف کا یہ میں جس ذات اور شخص کو ایک کمال بھی حاصل ہو جائے وہ اس صفت خاصہ میں کامل اور ایک مستقل ذات کہلائے گی۔ مگر سیدنا و مولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ شانہ نے ان تمام کمالات انسانیہ کے اعلیٰ ترین درجہ سے نوازا ہے کسی ظاہری و باطنی حسن کا کوئی جزو بھی ایسا نہیں جس کے انتہائی درجہ پر آپ نہ پہنچا دیا گیا ہو اس بنا پر آپ کی ذات مقدسہ کو جامع الکمالات کہا جاتا ہے اور یہی آپ کی محبوبیت کاملہ کا سبب ہے عالم ارواح میں آپ کی روح پرفورج سے حضرات انبیاء و علیہم السلام کی ارواح طیبہ نے استفادہ فرمایا اور اپنے اپنے نور نبوت کی استعداد کے موافق ایک ایک کمال کو خصوصی طور پر اخذ کیا تو ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء میں انوار کمالات محمدیہ کی تقیم پوری ہوئی کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کمال توحید لیا اور حنیف قرار پائے سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے کمال بغض فی اللہ لیا سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے کمال رحم و حرمانت اخذ کیا سیدنا یحییٰ علیہ السلام نے کمال خوف و خشیت لیا سیدنا داؤد علیہ السلام نے کمال عدل، اور خوش الحانی کو اخذ کیا سیدنا سلیمان علیہ السلام نے سلطنت وسیعہ اور فہم باطنی کا کمال حاصل کیا سیدنا ایوب علیہ السلام نے کمال صبر اخذ کیا سیدنا اسمعیلؑ نے کمال صدق و عدل لیا سیدنا یوسف علیہ السلام نے کمال حسن صورت لیا وغیرہ وغیرہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرات انبیاء میں بجز حسن و خوبی کے اور کوئی خوبی نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ کمالات سارے حاصل کئے مگر خاص اس کمال میں خصوصی اور بالادتی و امتیازی درجہ حاصل کیا جیسے بلا تشبیہ مدرسہ کے بچا سب طلبہ اپنے جامع علوم و فنون استاد سے درسی تمام علوم پڑھتے ہیں اور بقدر ضرورت سب میں



کمال دست گاہ حاصل کرتے ہیں مگر باوجود اس کے خدا داد طبعی مناسبت کے سبب کسی کو علم تفسیر میں زیادہ کمال ہوتا ہے اور وہ مفسر کہلاتا ہے اور کسی کو علم حدیث میں زیادہ کمال حاصل ہوتا ہے اور اس کا نام محدث پڑ جاتا ہے۔ کوئی ادیب بنتا ہے کوئی خطیب کوئی فقیہ کوئی صرفی کوئی نحوی کوئی منطقی کوئی اصولی وغیرہ وغیرہ جس کا بھی مطلب ہے کہ تمامی فنون کی مہارت رکھتے ہوئے خاص اس فن میں اسکو امتیازی کمال حاصل ہوا ہے اسی طرح تمامی حضرات انبیاء علیہم السلام ایک لاکھ چوبیس ہزار کمالات سے نواز گئے ہیں کہ برگزیدہ خلق ہیں، معصومین ہیں خلاصہ کائنات ہیں اور بہترین افراد عالم ہیں مگر خصوصی امتیاز و درجہ میں استاذ الکل جامع الکمالات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار کی تخیل و تجزیہ کے وقت اس ایک کمال کے ساتھ ان کو اُنس زیادہ ہوا اور مناسبت طبعیہ کی وجہ سے اس کو زیادہ مقدار میں اخذ کیا گیا یوں کہنے کے ایک ذات محمدی کے کمالات جدا جدا ہو کر ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کی ذوات میں منتقل ہوتے اور ہر کمال جس کے لئے ایک مستقل ذات ہونی چاہیے تھی سب یکجا جمع ہو کر ذات محمدی میں سما گئے۔ حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری بنہ آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری چنانچہ قرآن مجید میں جہاں ان حضرات انبیاء کے تذکرے آئے ہیں اور ان کو جدا جدا امتیازی خوبیوں کے ساتھ متصف کیا گیا ہے کہ کسی کی شان میں آیا ہے وہ سب طرف سے منہ موڑ کر صرف اللہ کے ہور ہے تھے کسی کے متعلق مذکور ہے وہ اپنے متعلقات کو نماز کا حکم کیا کرتے تھے کسی کی شان ہے وہ صابرین میں سے تھے کسی کا تذکرہ ہے کہ وہ دیکر کے سچے تھے وغیرہ اس کا بھی مطلب ہے کہ تمامی کمالات بقدر ضرورت تمامی انبیاء میں تھے مگر خاص اس صفت میں ان کو شرف و اہتمام اور خصوصی امتیاز حاصل تھا اور یہ وہی کمال تھا جس کو ان کی روح مقدسہ نے عالم ارواح میں روح محمدی سے لیا اور اپنی خدا داد مناسبت طبعیہ کے سبب خاص اس کمال کو اپنے درجہ میں لیا جس شخص کو حق تعالیٰ علم وسیع عطا فرمائے کہ وہ کمالات کی حقیقت امدان کے مراتب مختلفہ سے آگاہ ہو جائے اور پھر تمامی حضرات انبیاء علیہم السلام کے واقعات و سوانح امدان کے الوان طبعیہ معلوم ہو جائیں تو اس کو صاف نظر آئے گا کہ ہر نبی میں ایک خاص کمال خصوصی و امتیازی درجہ میں ایسا حاصل ہے کہ دیگر انبیاء میں وہ کمال اس درجہ پر نہیں پایا جاتا اور بالا جہاں اسی سے پتہ چل جائے گا کہ اگر وہ روایت جس میں حضرات انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی گئی ہے صحیح ہے تو کمالات و درجہ کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار رہی ہے کہ ہر کمال جدا جدا ایک ذات کو دیا گیا ہے اس کے ساتھ ہی جس وقت کوئی شخص سوانح محمدیہ پر نظر ڈالے گا اور ولادت سے لے کر وفات تک کے واقعات جو تاریخی روایتوں سے بدرجہا زیادہ اہتمام سند و ثقافت پر مرتب ہیں اور ہر زبان میں مذکور ہر کافر و مسلم کے سامنے لیے کھوکھ رکھ دئے



گئے ہیں جیسے آسمان پر سورج کہ کسی سے اس کا کوئی حال چھپا ڈھکا نہیں، تو واللہ العظیم اسکو اقرار کرنا پڑے گا کہ یہی کمالات تھے جو جدا جدا انبیاء سابقین کے کر دنیا میں تشریف لائے تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہے گا کہ اس کی کوئی دلیل نہیں کہ عالم ارجح میں ان کمالات کی تقسیم روح محمدی سے ہوئی ہے اور سب ان محاسن کو آپ ہی سے اخذ کیا تھا مگر حیب ہم دیکھتے ہیں کہ جس وقت وہی ذات محمدی جس کی روح کو ہم نے سید الارواح ادا تاذ الانبیاء مانا ہوا ہے حید تباری اور ہم عنقریب کے کر دنیا میں تشریف لائی تو بعینہ اس کے فیوضات روحانیہ کی یہاں بھی وہی تقسیم ہوئی ہے کہ جس وقت آپ نے سنگستان عرب میں کلمہ توحید کا اعلان کیا ہے تو ایک متنفس بھی اچکا کہاٹنے والا نہ تھا مگر اس کے تئیس برس بعد جب آپ نے وفات پا کر عالم قدس کا سفر کیا ہے تو حضرات صحابہ کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار چھوڑی ہے اور اس پاکباز اور افضل ترین امت جماعت میں بھی ہم یہی دیکھتے ہیں کہ تمامی روحانی کمالات ہر ایک نے اخذ کئے مگر خصوصی درجہ میں ایک ایک کمال ایک ایک صحابی نے اس عالی درجہ پر لیا کہ اس میں اس کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا مثلاً توحید و کمال ایمان حضرت صدیق بنی میں ممتاز ہے، تورعایا پوری و نظم سلطنت حضرت فاروق اعظم میں، حیا و کا غلبہ حضرت عثمان ذوالنورین میں ہے، تو کمال شجاعت حضرت علی بن ابی طالب میں، زہد کا غلبہ حضرت ابوذر میں ہے تو اشاعت علم کا غلبہ حضرت ابوہریرہ میں، کوئی شب بیداری سے زیادہ مانوس ہے تو کوئی کثرت اسفار میں مشہور، کوئی مہمان نواز زیادہ تھا اور کوئی ایثار میں بے نظیر غرض تمام صحابہ کی پوری سوانح عمریاں یکجا ادبیک نظر محفوظ ہوں تو آنتاب نصف المنہار کی طرح واضح ہوگا کہ اصل کمالات روحانیہ میں جن پر رضا، حق مرتب و متفرع ہے سب کامل تھے مگر کسی نہ کسی خوبی میں اکل بھی ضرور تھے، اور وہی ان کی امتیازی شان تھی جو سوتے پر سہاگہ بن کر ان کو اپنے جدا رنگ سے چکا رہی ہے یہ ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کی ذات میں انوار محمدیہ کی تخیل عالم حید اور دنیا کے اندر وضع کر رہی ہے یہ ایک لاکھ چوبیس ہزار ذوات میں بھی انوار محمدیہ کی یہی تخیل ارجح اور دار آخری میں ضرور واقع ہوئی تھی ان حضرات نے متقدمین و سابقین بن کر ترتیب دار تمامی کمالات محمدی کو فرداً فرداً کھولا اور حضرات صحابہ نے متاخرین و لاحقین بن کر تمامی کمالات محمدی کو فرداً فرداً واضح کیا میرے نزدیک یہی مفہوم ہے شیخ کی اس عبارت کا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار ذوات ہیں۔ یعنی ہر کمال کے لئے ایک مستقل ذات ہے اور وہ مقبولیت اور ملائکہ پر مہیا ہوا و ثبوت اکمیت کے لئے کافی و دافی ہے مگر ذات محمدی مجموعہ ہے ان ایک لاکھ چوبیس ہزار ذوات کا کہ جس کمال کا تحمل جدا جدا ایک ایک ذات نے کیا تھا تنہا ذات محمدی ان سبکی یکجا حامل و متحمل ہو گئی نیز اس خصوصی کمال میں بھی جو شان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے وہ دیگر انبیاء کی نہیں کہ باوجود جامع ہونے کے آپ کا ہر کمال بنی کے خصوصی کمال سے برتر اور قوی تر



اور بہتر ہے۔ پھر تحصیل انوار محمدیہ سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ تقسیم کے بعد ذات محمدیہ عیاذاً باللہ خالی ہوگئی کر یہ  
تقسیم حوادث دنیا اور امور نانیہ کی نہیں بلکہ انوار کی ہے جن کی شان یہ ہے کہ ایک چراغ سے دس لاکھ چراغ  
روشن کرلو، مگر اس کے نور میں تل برابر فرق نہ آئے گا نیز یہ بھی شبہ نہ کیا جائے کہ حضرات صحابہ کی شان  
حضرات انبیاء کی برابر ہوگئی کیونکہ استفادہ اند اخذ نور اپنی اپنی استعداد و قابلیت کے موافق ہوا کرتا ہے ایک  
قمقمہ صرت مدیتی کی برقی روشنی لے سکتا ہے اور دوسرا قمقمہ پچاس بتی کا متحمل ہو سکتا ہے ہر چند کہ مخزن و منبع  
ایک ہے مگر اخذ و مستفید میں جتنی طاقت ہوگی اسی مقدار پر استفادہ کرے گا پس حضرات انبیاء علیہم السلام  
کی فطری استعداد بوجہ نور نبوت، نور رسالت، نور علم، نور لبط، نور فہم، نور عصمت اور سلامتی قلب، کے ایسی بڑھی  
ہوئی تھی جیسے کسی چراغ میں اعلیٰ درجہ کاصات شفات تیل پڑا ہوا ہوتا ہے کہ جب وہ دوسرے چراغ سے روشن کیا  
جائے گا تو اس کی روشنی اتنی صاف اور کھلی ہوئی ہوگی کہ دوسرے چراغ کی جس میں دوسرے نمبر کا تیل ڈالا گیا ہو  
اتنی صاف روشنی نہ ہوگی حالانکہ وہ بھی اسی چراغ سے روشن کیا گیا ہے اس لئے ہر چند کہ عالم ارجح میں جس  
کمال کا نور ایک پیغمبر نے مشکوٰۃ محمدی سے حاصل کیا ہے وہی نور ایک صحابی نے عالم اجساد میں اسی مشکوٰۃ  
محمدی سے حاصل کیا ہے مگر جو فرق بنی اور غیر بنی میں ہونا چاہیے وہ اس حاصل کردہ نور کی قوت میں قدر  
نمایاں ہوگا اور اس لئے صحابہ کا بنی ہونا لازم نہ آیا البتہ شبہ ہوتا ثابت ہو سکے گا جیسا کہ علماء امتی کثرتاً  
بنی اسرائیل کا مفہوم ہے بشرطیکہ اس کا حدیث ہوتا محقق ہو جائے میرا دل چاہتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ  
علیہ وسلم کے کم از کم اتنے کمالات کے اظہار اور ثبوت میں جن کے عنوانات میں نے گنوائے ہیں واقعات  
نقل کروں کہ ہر دعویٰ بعد شہادت ہی مقبول ہوتا ہے مگر طول بہت ہو جائے گا جو ترجمہ کتاب کے مناسب نہیں ہے  
دیگر کتب سیر پر محمول کرتا ہوں جو بکثرت شائع ہو چکی ہیں ہاں اتنا ضرور کہتا ہوں کہ جتنے بھی واقعات حیات  
شریفہ میں پیش آئے ہیں خواہ خانہ داری کے ہوں یا جہاں بانی کے، اور رات کو پیش آئے ہیں، یا دن  
کو، ہر واقعہ ایک عہد اکمال کا منظر ہے گویا پوری سوانح محمدیہ ایک لاکھ چوبیس ہزار کمالات انسانیہ  
کو عکاس بیان کرنے والی ہے کہ دو واقعہ ایک ہی کمال کے منظر نہ نکلیں گے۔ فرق اگرچہ اتنا دقیق ہوگا کہ اور  
کمزاد شوار ہے مگر یہ ناممکن ہے کہ آپ کے سوا لاکھ کمالات میں کوئی کمال واقعہ کی شہادت سے خالی رہ گیا ہو،  
ان کو دیکھ کر کوئی کافر بھی بشرطیکہ خدا اور ہٹ سے خالی ہو مسلمان اور آنحضرت روحی فداہ کا شان کمال سے اتنے  
شیدا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا مگر زیادہ افسوس اپنے بھائیوں پر ہے کہ وہ آنحضرت روحی ندا کی شان کمال سے  
اتنے غافل ہو گئے کہ حد نہ رہی چاہئے تو یہ تھا کہ سیدنا موسیٰ اور سیدنا عیسیٰ علیہما السلام بھی دنیا میں تشریف  
لاتے اور اپنا کوئی سلک بیان نہ کرتے تو ہم بعد ادب عرض کرتے کہ یا بنی اللہ آپ پر اللہ کا



ہزاراں ہزار صلوٰۃ و سلام مگر عمل کے لئے تو میں اپنے باپ کی تعلیم بالکل کافی اور قائم البتین کا سلک قطعاً کافی و شافی ہے، کسی دوسرے رہبر کی ضرورت نہیں چہ جائیکہ آیا و اجداد یا لیڈران قوم یا مدعیان اصلاح کفار کی بخاویز پر نگاہ محبت یا اس پر عمل ہو فیا اسفی انہما اشکوا بخی و حزنی الی اللہ غوث زمانہ چونکہ اپنے زمانہ کا اکل الاولیا و نائب رسول و قائم مقام پیغمبر ہوتا ہے مگر اس کا بھی یہ مطلب نہیں کہ وہ حضرات صحابہ یا حضرات انبیاء سے بڑھ گیا کہ نبی سے غریبی کا افضل ہونا محال ہے اور اسی طرح یہ بھی محقق ہے کہ غیر صحابی خواہ قطب ہو یا غوث صحابی کے درجہ سے نہیں بڑھ سکتا پس اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ حضرات انبیاء کا استفادہ کمال کمال عالم ارجح میں اور حضرات صحابہ کا استفادہ کمال کمال عالم احباب میں گو خصوصی

درجہ پر تقریباً سوالا کھ شیون محمدیہ میں سے کسی ایک شان کا ہوا ہے مگر بطرح صحابی اس شان میں نبی کے برابر نہیں پہنچا اسی طرح کوئی قطب یا غوث اس شان میں صحابی کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکا نیز گو خصوصی استفادہ ایک کمال میں ہوا مگر عمومی استفادہ تمامی کمالات میں ہوا ہے اور حضرات انبیاء و صحابہ کا یہ عمومی استفادہ بھی مابعد حضرات کے خصوصی استفادہ سے بڑھا ہوا ہے کہ وہ براہ راست و بلا واسطہ اور بالموافقہ ہوا تھا اور اغوات و انقلاب کا استفادہ بلا واسطہ اور برزخی فیضان سے ہوا ہے اس لئے غوث کاتین سو چھیا سٹھ شیون محمدیہ میں اکمل ہونا صرف اپنے معصوموں کے اعتبار سے کہ ان کا عموم بھی عجب نہیں ان کے خصوص سے افضل اور قوی تر ہونا للہ اعلم بالصواب الیہ مرجع والمآب ان کان صواباً فمن اللہ تبارک و تعالیٰ وان کان خطاً فمینی والی۔ استغفر وہ راتوب الیہ انہ هو التواب الرحیم نیز اپنے فرمایا کہ جس کو فتح کبیر نصیب ہوئی (اور غوث اعظم بنایا جاتا ہے) اس کے (بیتیت ظل محمدی اگلے اندھیلے گناہ بخش دئے جاتے ہیں اس کے اعمال حسنہ سب مقبول ہوتے ہیں اور اس کی تمامی سیئات کو جو اس نے فتح حاصل ہونے سے قبل کی تھیں حنات بنادیا جاتا ہے اور فتح حاصل ہونے کے لئے بعد تو اس سے گناہ کا صدور ہی نہیں ہوتا اور وہ معصوم تو نہیں) اور یہ حضرات ہر وقت شاہدہ حق میں رہتے ہیں اور اسی بنا پر کہ شاہدہ حق معصیت کے لئے مانع ہے۔

ملا لکہ شان لا یعصون اللہ ما امرہم و یفعلون ما یؤمرون ہے کہ اللہ تعالیٰ جو ان کو حکم دیتا ہے اس کا خلدت نہیں کرتے اور جس بات کا ان کو حکم کیا جاتا ہے وہی کرتے ہیں۔

یعنی حکم الہی صادر ہوتا ان کو تعمیل میں دریغ نہیں ہوتا اور جب تک حکم نہ ہو۔ اس وقت تک کسی کام میں قدم نہیں اٹھاتے۔



یہ بے دریغ امتثال اور یہ معصیت سے معصومیت اسی شاہدہ کا ثمر ہے جو ہر وقت ان کو حاصل ہے۔

میں نے حضرت سے عارین کی نماز کے متعلق دریافت کیا کہ وہ کیسی ہوتی ہے اور عوام کی نماز میں انداس میں کیا فرق ہے، فرمایا عارف جب اللہ اکبر کہتا ہے اور جسم ظاہری سے نماز پڑھتا ہے تو ساتھ ہی ساتھ اس کے اندر کی روح بھی نماز پڑھتی ہے کہ بدن کے رکوع کے ساتھ وہ بھی ٹھکتی ہے اور رکوع کرتی ہے اور بدن کے سجدے کے ساتھ وہ بھی سجدہ کرتی ہے نیز فرمایا کہ ایک مرتبہ میں غور کرنے لگا کہ دیکھوں پہلے جسم زمین کی طرف جاتا اور روح اس کا اتباع کرتی ہے، یا پہلے روح رکوع و سجدہ کرتی اور اس کے تبعاً، جسم زمین پر ٹھکتا ہے تو حافظ اعمال (فرشتہ) نے مجھے اس سے منع کر دیا کہ اس تحقیق میں نہ پڑو اور روح کی نماز بہر حال مقبول ہوگی، اس لئے ان کی نماز کی قبولیت یقینی ہے، میں نے کہا شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ روح نظر نہیں آتی اور اس لئے اس میں نمود کا دخل نہیں ہو سکتا فرمایا یہ وجہ نہیں بلکہ اس لئے کہ روح امر حق ہے، حق کی طرف سے ہے اور حق ہی کی طرف اس کا رجوع ہے اور ظاہری نماز کی مشروعیت اسی لئے ہے کہ اکثر مخلوق روحی نماز سے عاجز ہے اور عارین اگرچہ اپنی ادراج سے نماز پڑھتے ہیں مگر بدن سے بھی نماز پڑھتے ہیں، بنا برعادہ کہ ابتداء سے اس کے خوگر رہے ہیں اور اس کی بدولت روحی نماز کا درجہ پایا ہے، اور نیز ظاہر شریعت کو محفوظ رکھنے کے لئے کہ اس کے بھی مامور ہیں) اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص اس نیت سے درزی کا پیشہ کرے کہ اس کے ذریعہ ریشم کی صنعت اور ریشمی بھول بوٹے بنانا آجائے اور یہ سلائی کا کام وسیلہ بن جائے ریشمی صنعت کا پھر حق تعالیٰ نے بغیر کسی استاذ اور معلم کے اس کو ریشم کی صنعت سکھادی ہو اور یہ بدستور درزیوں میں چھپا پڑا ہوا تو یہ اس کی وضعداری اور شرافت کی علامت ہے۔ پھر فرض کرو درزیوں کی کوئی خاص وضع اور خاص ہئیت ہے جو ان کے ظواہر پر نمایاں رہتی ہے اور جس کو دیکھ کر ہر شخص شناخت کرتا ہے کہ یہ درزی ہے، پس اگر یہ شخص اپنی وضع اور عادت و شکل و لباس بدل لے جو درزیوں کے لئے گویا علامت تھی اور پھر لوگ اس سے پوچھیں کہ تم نے اپنی وضع سابق کو تبدیل کیوں کر لیا؟ تو یہ جواب دے کہ میں اب درزی نہیں رہا بلکہ ریشمی صنعت کا کاریگر بن گیا ہوں حالانکہ علم الہی میں طے ہو چکا تھا کہ درزی کے پیشہ ہی میں اس کو ریشم کی صنعت نصیب کی جائے گی اور اس کی شناخت صرف ایک مخفی علامت سے ہوگی جس کا ظہور قیامت کے دن ہوگا لہذا اس کو زیبا ہے کہ یہ بدستور درزیوں کی عادت کا تابع بنا رہے اور ان کے لباس و ہئیت کو اختیار کئے رہے اور اپنی پہلی حالت پر بدستور قائم رہے۔

میں نے حضرت ممدوح سے ایک مشہور شخص کے متعلق دریافت کیا جو دسویں صدی کا تھا۔ فرمایا اس کو فتح نصیب ہوئی تھی مگر اسی ابتدائی شاہد پر، اس کی حالت رک گئی اور منجملہ ساحرین کے ایک ساحر بن گیا۔



کہ اس کے لہد جو عجائب امور اس سے ظاہر ہوتے تھے وہ طلسمیات اور جادو کے ثمرات تھے نہ کہ کرامات میں نے عرض کیا یہ کیا کیسے ؟ فرمایا بندہ کو رفتح و مشاہدہ میں، سب سے اول جو شے مشکف ہوتی ہے وہ بندوں کے معاصی ہیں کہ اس کو ان کے گناہ نظر آتے ہیں ان کے اسباب و وجود نظر آتے ہیں ان کے گناہ میں پڑنے کی کیفیت نظر آتی ہے اور وہ ظلمانی دھواں ان کو نظر آتا ہے جس سے اہل ظلمت کو مدد پہنچتی اور مرکبین معاصی اس سے مستفیض ہو کر غافل و جبری بنتے ہیں پس اگر حق تعالیٰ کا فضل و کرم اس کو نہ سنبھالے تو اس کی عقل ان امور کی طرف جھکتی ہے اور وہ ان میں غور و فکر کرنے لگتا ہے پس اگر ایک گھڑی کے لئے بھی نہ کر ان امور میں ڈوب رہے تو انقطاع لاحق ہو جاتا اور حق تعالیٰ سے تعلق قطع ہو کر صرف ان کشفیات ہی میں پھنسا رہ جاتا ہے۔ اور چونکہ یہ ظلمانی امور ہیں کہ شیطان کا ڈیرہ اسی بگڑا ہوا ہے اور بنی آدم کے لئے فتنہ کا مقام ہے اس لئے اس کا منظر اند شیطان کا منظر ایک ہو جاتا اور یہ شیاطین کا ساتھی اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالا ہوا رفیق بن جاتا ہے شیطان سحر پر اس کو قبضہ دے دیتا ہے اور وہ ساحروں میں شامل ہو جاتا ہے اور اگر حق تعالیٰ شانہ اس ابتدائی کشف والے پُر لطف و کرم فرماتا ہے تو فوراً ہی دوسرے امور اس پر مشکف فرما دیتا ہے کہ اس کی توجہ اُدھر مبذول اور ان امور سے غافل ہو جاتی ہے پھر اسی طرح ہر لحظہ اس کو ترقی بخشا اور ایکے بعد دیگرے ملکوتی عجائبات اس پر مشکف فرماتا رہتا ہے کہ وہ مشاہدہ محمدیہ کے حصول تک جو محل امن و اطمینان ہے کسی شے سے بھی دل بستگی نہیں لینے پاتا، نیز آپ نے فرمایا کہ فتح کی شان بھی عجیب و غریب ہے۔ حق تعالیٰ کے بہترے بندے ہیں کہ عند اللہ محبوب ہیں اور حق تعالیٰ ان پر لطف و کرم کی بنا پر ان کو فتح سے روکے رکھتا ہے اور نصیب نہیں فرماتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ فتح میں بہترین چیزیں ایسی ہیں کہ اگر فائز کے پاک صفات ہونے سے قبل ان کا مشاہدہ ہو جائے تو اس وقت عیاذ باللہ نصرانی بن جائے اور بہتری چیزیں ہیں کہ ان کا مشاہدہ اگر ہو جائے تو عیاذ باللہ فوراً یہودی بن جائے اس لئے خطرہ ایمان سے محفوظ اور علوت ایمان پر قائم رکھنے کے لئے اس کو غیر مفتوح رکھا جاتا ہے۔ اور اللہ کے بہترے بندے ہیں کہ ان کو روح نکلتے وقت ہی فتح نصیب کی جاتی ہے کہ اب خطرات ارتداد سے مطمئن ہو گیا، اور بہترے بندے ہیں جن کا غیر مفتوح ہی ہونے کی حالت میں انتقال ہو جاتا ہے مگر حق تعالیٰ بروز قیامت ان کو مفتوح کی حالت سے افضل و اکمل حالت پر اٹھائے گا۔ لہذا فتح و مشاہدہ کی ہوس اور طلب نہ کرنی چاہیے۔ طلب ہو تو صرف اللہ کی خوشنودی اور لطف و کرم کی ہو کہ اس کا فضل و انعام کسی خاص حالت کے ساتھ محدود و مقید اور مخصوص نہیں ہے طریق رضا کو اس کے حوالہ کرنا چاہیے۔ فراق و وصل چہ باشد رضا و دوست طلب نہ کہ حیف باشد از وغیرہ تمنائے۔



نیز آپ نے فرمایا کہ جس کو فتح عطا کی جاتی ہے اس سے فتح کے وقت ایک سیاہ جلد کی سیٹھی دور کی جاتی ہے اور وہ سیاہ کھال کی شبیہ وہ ظلمت ہے جو چار طرف سے ذات انسانی کو محیط ہے جب وہ جلد سیاہ دور ہو جاتی ہے تب ذات پر فتح کا نور ڈالا جاتا ہے جس کو فرشتے ایک عظیم الشان جلوس کی شکل میں لے کر آتے ہیں۔ اللہ پاک کی ایک دوسری جماعت تو اس جلد سیاہ کے دور کرنے میں لگ جاتی ہے اور فرشتے سر الہی کو لئے کھڑے رہتے ہیں اور کھال کے دور ہوتے ہی ملائکہ فوراً اس نور کو ذات کے اندر رکھ دیتے ہیں۔ اس جلد سیاہ کے دور کرنے جانے کے وقت مفتوح کے متعلق ایک مخلوق سر اسیمہ اور خائف ہوتی ہے کیونکہ ان کو انجام کا پتہ نہیں ہوتا کہ موت ہوگی یا عقاب کا سلب ہو جائے گا۔ ان دونوں سے سالم و محفوظ رہنا اس لئے اس کی شان ایسی ہوتی ہے جیسے مریض کا خطرناک آپریشن کہ اس کے انار ب و احباب بدحواس ہوتے ہیں اور جب تک کلور فورم سے پورا ہوش نہ آجائے یہی فکر رہتا ہے کہ دیکھئے جان برہوتا ہے یا بے ہوشی ہی میں ختم ہو جائے گا۔ غرض سب گڑ گڑا کر اللہ سے دعائیں مانگتے رہتے ہیں کہ اس کو قوت برداشت بخشنے اور اس بوجھ اٹھانے کی جو اس پر ڈالا جاتا رہا ہے توفیق نصیب فرمائے نیز آپ نے فرمایا کہ فتح کا نور شیخ کی ذات میں ہوا کرتا ہے پس اگر اس کا وارث (جو اسکی جگہ قطب بننے والا ہے) اپنے شیخ کی حیات کے اخیر حصہ میں اس کے اٹھانے پر قادر ہو گیا تب تو وہ شیخ کے اس وارثانی سے اٹھ جانے پر اس کو لے لیتا ہے۔ اور اگر اس کے یثاقت کی ابھی اس میں طاقت نہیں آئی تو وہ نور سیدنا جبریل علیہ السلام کے پاس امانت رہتا ہے یہاں تک کہ مرید کی ذات میں اس کی طاقت آجائے اس وقت اس کی جلد سیاہ دور کر دی جاتی ہے اور وہ جبریل علیہ السلام اس کے بے تکلف دوست بن کر شریف لاتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کاملہ سے اس کو مانوس بناتے اور اس کو ہر قسم کی کچی سے بچاتے، اور راہ راست پر چلاتے ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت ممدوح نے فتح کے متعلق اور بہت کچھ اسرار بیان فرمائے جنکو بخوت طوالت چھوڑ دیا گیا۔ مگر اتنا ضرور کہنا ہے کہ سیدنا جبریل علیہ السلام کے اس تذکرہ سے اس بنا پر کہیں وحشت پیدا نہ ہو کہ بعض علماء اہم (امام غزالی وغیرہ) اس کے قائل نہیں ہیں، بلکہ جو کہے کہ مجھے ملائکہ نظر آتے ہیں اس پر شدت سے نیکر اور اعتراض کرتے ہیں (کیونکہ ان حضرات کی رائے یہ ہے کہ ملائکہ نظر آتے ہیں اس پر شدت سے نیکر اور اعتراض کرتے ہیں (کیونکہ ان حضرات کی رائے یہ ہے کہ ملائکہ کا معاہدہ صرت بنی کو ہوتا ہے) اس لئے جواباً عرض کیا جاتا ہے کہ اول تو علماء ہی کا ایک گروہ اس کی تردید کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ نہ اس میں کوئی محال لازم آتا ہے اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رفیع کے مزاحم ہے اس لئے کہ یہ آنا انزال وحی کے لئے نہیں ہے نیز حضرت روحی خدا ہی کے برکات اور عطا و نور ایمانی کے طفیل امتی کو بر نعت ملتی ہے۔ اس کی تائید ایک مشہور اور



جلیل الشان صحابی حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کے قصہ سے ہوتی ہے کہ ملائکہ ان کو اثر نظر آتے اور سلام کیا کرتے تھے۔ مگر حیب انہوں نے کسی مرض کے علاج میں، بدن کو دغویا تو یہ صورت ر مشاہدہ و کلام کی، جاتی رہی نیز علامہ شعرانی نے تو اپنی کتاب میں اس کو نعمت عظیمہ شمار کیا ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کو ایسے شخص سے ملاقات نصیب فرمائی جو سیدنا جبریل علیہ السلام کا مشاہدہ کیا کرتے تھے۔ پھر علماء منکرین بخاری وغیرہ کی اُن متفق علیہ احادیث صحیحہ کا کیا جواب دیں گے جن میں امت محمدیہ کے سوا دیگر ائم کے لئے اس کا وقوع مذکور ہے جس کا دل چاہے بخاری میں اخبار بنی اسرائیل کا مطالعہ کرے پھر امت محمدیہ کے لئے اس کے ممنوع ہونے کی کیا وجہ۔ اب ہم راہِ نور فانیہ کے مشاہدہ ظلمانیہ سے فارغ ہو کر، چنداں امور باقیہ نورانیہ کا تذکرہ کرتے ہیں جو بڑے درجہ کی فتح و اے (اثنا عشر)، کو نظر آیا کرتے ہیں مثلاً برزخ، جنت، دوزخ، پطراط حوض کوثر ارح طیبہ ملائکہ امدھا قطب ثمر فرشتے اور ادلیا، واللہ وغیرہ امدھا پر کتاب کو ختم کر دیں گے۔

## سوال باب۔ برزخ، اور اسکی صورت و حالت اور اس میں نزول ارواح کی کیفیت۔

برزخ کے متعلق حضرت ممدوح نے ارشاد فرمایا کہ اس کی صورت ایسی ہے جیسے کوئی مقام نیچے سے تنگ ہو اور جوں جوں اچر کو جائے تو وسیع ہوتا جائے حتیٰ کہ منہا پر پہنچا کر ایک قبۃ اس کے سر پر قائم کیا جائے جیسا منارہ یا دہواں کش چھنبیوں کے اوپر قائم کیا جاتا ہے نمونہ کے درجہ میں اس کی مثال لکڑی کے بڑے ٹاؤن (یا ادکھلی) کی سی سمجھو کہ اس کا حصہ زیریں چھوٹا امدھک ہوتا ہے امدھپر اوپر کو بڑا وسیع ہوتا چلا جاتا ہے اگر اس کے سر پر ایک گیند بنا کر رکھ دو تو یہ صرف شکل اور صورت میں برزخ کا نمونہ بن جائے گا۔ مگر مقدار اور بڑائی میں تو کچھ ٹھکانہ ہی نہیں ہے اس کی جڑ اور ابتداء آسمان دنیا میں ہے کہ ہماری جانب میں اس سے باہر نہیں نکلا اور اوپر کو اپنا چڑھتا چلا گیا ہے، حتیٰ کہ آسمان دم کو پھاڑ کر پھر چڑھتا چلا گیا امدھسے آسمان کو پھاڑتا ہوا پھر اوپر چڑھا اور چڑھتے آسمان کو پھاڑا پھر اوپر چڑھا حتیٰ کہ پانچویں آسمان کو پھاڑا پھر اوپر چڑھا حتیٰ کہ چھٹے آسمان کو پھاڑا پھر اوپر چڑھا حتیٰ کہ ساتویں آسمان کو پھاڑا اور چھپڑا اتنا اوپر چڑھتا چلا گیا جس کی حد و شمار نہیں پھر اس کے اوپر اس کا قبۃ قائم کیا گیا ہے۔ یہ ہے اس کی بناؤ اور یہی ہے بیت المعمور۔ میں نے عرض کیا کہ بیت المعمور کے متعلق تو روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ساتویں آسمان میں ہے امدھبرزخ تو آسمان دنیا سے شروع ہوتا ہے اور ساتویں آسمان سے بھی اوپر بے شمار درجہ چلا گیا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ بیت المعمور پر آسمان میں ہے؟ فرمایا ہاں یہی صورت ہے اور بالائے نملک ہفتم کے ذکر پر تو اہل روایت نے اس لئے اکتفا کیا ہے کہ وہاں اس کا قبۃ ہے جو کہ فلاہ ہے



برزخ کا اور اشرف و افضل ہے تمام برزخی سے کیونکہ اس میں بجز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح شریفہ اور ان حضرات کی ارواح طیبہ کے جنکو حق تعالیٰ نے آپ کے شرف کی وجہ سے نوازا ہے اور کوئی نہیں ہے مثلاً آپ کی ازواج مطہرات، صاحبزادیاں، ان کی ذریت جو آپ کے زمانہ میں تھی، یا جو آپ کے بعد قیامت تک ہوگی بشرطیکہ اس نے حق پر عمل کیا ہو، نیز خلفاء و اربعہ کی روہیں بھی اسی میں ہیں، اور اسی میں ان شہداء کی روہیں ہیں جن کا انتقال آپ کے زمانہ میں ہوا اور جنہوں نے آپ کی زندگی و بقاء کی خاطر اپنی جانوں کو خرچ کیا تھا اور ان کے اس حسن عمل کے صلہ میں (حق تعالیٰ نے) ان ارواح کو وہ طاقت اور قوت دی ہے جو دوسروں میں نہیں پائی جاتی۔ نیز قبہ ہی میں آپ کے درختہ کا ملیں ادباً واللہ مثلاً اغواث اور اقطاب کی روہیں ہیں رضی اللہ عنہم جمعین غرض برزخ کا اثر تین حصہ چونکہ قبہ مقدسہ ہے اس لئے جس نے کہا کہ بیت المعمور ملک منقسم ہے اس نے برزخ کے اقوال میں اسی قبہ پر اکتفا کیا رہا برزخ کا عرض سودہ اس سے اندازہ کر لو کہ سورج چوتھے آسمان پر ہے اور وہ برزخ کے چار طرف ایسا چکر لگاتا ہے جیسے طواف کرنے والا اچا رطوت گھومتا ہے اور وہ اس مسافت کو ایک سال میں قطع کرتا ہے اور سارے برزخ میں شہداء کی مکھیاؤں کے چھتہ کی مثل، سوراخ ہی سوراخ ہیں اور ان سوراخوں میں جن کی تنگی و وسعت روح کے حسب حال و حسب اعمال ہے، روہیں رہتی ہیں البتہ سید الوجود صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارکہ اور جن کو حق تعالیٰ نے آپ کے شرف کی وجہ سے شرف بخشا ہے ان کی روہیں وہ سب قبہ میں ہیں پھر اقسام جنت کی تعداد کے موافق یہ قبہ بھی سات قسموں پر منقسم ہے کہ ہر حصہ ایک جنت کے مشابہ ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پُر فتوح کا محل و مقام اگرچہ قبہ میں ہے مگر ہر وقت وہاں نہیں رہتی اس لئے کہ آپ کی روح شریفہ کا بوجھ اٹھانے کی ان اسرار کی وجہ سے جو اس میں موجود ہیں نہ اس قبہ میں طاقت ہے نہ تمامی مخلوقات میں کسی دوسری شے کے اندر اس روح شریفہ کا بوجھ اٹھانے کی طاقت صرف آپ کی ذات مطہرہ (اور جس مبارک) ہی میں تھی۔ لہذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح شریفہ برزخ میں کسی خاص اور معین مقام پر مقیم نہیں رہتی کیونکہ کسی شے میں طاقت ہی نہیں کہ اس کی حامل ہو سکے اور جو روہیں برزخ کے اس ربالائی حصہ میں ہیں جو آسمان چہارم میں اور اس سے اوپر واقع ہے ان کے لئے ایسے قوی انوار ہیں کہ اجسام میں بجلی کی طرح، پار ہوتے چلے جائیں اور جو روہیں آسمان سوم میں اور اس سے نیچے ہیں وہ عموماً محبوب ہیں کہ ان میں بالکل نور نہیں اور یہ برزخی سوراخ آدم علیہ السلام کی پیدائش کے قبل سے ہیں کہ ان میں ارواح (جو یکے بعد دیگرے اب دنیا میں آرہی ہیں) رہتی یقیناً اور ان ارواح میں نور بھی تھا مگر اس نور سے کم تھا جو اجسام سے مفارقت کرنے (اور بعد مرگ برزخی سوراخوں میں جانے کے بعد ہوا کیونکہ ایمان اور اعمال صالحہ کے انوار میں شامل ہو گئے مگر کفار کی ارواح کا ظلمت کفر کی وجہ سے پہلا



نور بھی مجبور ہو گیا، پس جب ارواح میں رہے پہلے، حضرت آدم علیہ السلام کی روح اتر کر ان کے  
 کالبد میں آئی تو اس کی جگہ رجو برزخ میں تھی وہ، خالی ہو گئی اور اس طرح جب کوئی روح دنیا میں، اتری تو اس  
 کا سوراخ اس سے خالی ہو گیا پھر جب مرنے کے بعد روح واپس ہوتی ہے تو جو جگہ اس کی رجو برزخ میں، تھی  
 وہاں نہیں جاتی بلکہ دوسری جگہ کی مستحق ہوتی ہے حضرت ممدوح کا مطلب یہ تھا کہ اگر روح مومنہ ہوتی ہے  
 تو ایمان و اعمال کی وجہ سے، بالائی حصہ میں جگہ کی مستحق ہوتی ہے (اور وہ اس کا مستقر قرار دیا جاتا ہے اور  
 اگر کافرہ ہوتی ہے تو زیر میں حصہ میں جگہ کی مستحق ہوتی ہے اور جو سوراخ (روح سے) خالی رہیں گے وہ  
 مخلوقات الہیہ میں دیگر مخلوقات سے آباد کئے جائیں گے اور روز الست سے قبل ارواح اپنے نصاب سے بالکل  
 ناواقف تھیں ان کو کچھ معلوم نہ تھا کہ ان کے پیدا کرنے سے حق تعالیٰ کا کیا مقصود ہے اور ان کے متعلق ارادہ الہیہ کیا  
 جب حق تعالیٰ نے چاہا کہ پہلے سے ازل اور قضا و قدر میں جو طے ہو چکا ہے وہ اپنا ظاہر ہو جائے تو حضرت اسرافیل  
 کو صور بھونکنے کا حکم فرمایا اور ان کے صور میں بھونک مارتے ہی ساری روحیں ایک جگہ اکٹھی ہو گئیں اور ان کو وہ  
 ہول و ہراس اور اضطراب لاحق ہوا جو بروز قیامت (دوسرے نفع صور پر) قبروں سے اُٹھتے وقت لاحق ہو گا۔  
 بلکہ اس سے بھی زیادہ (اس وقت پیش آیا کہ اچانک و دفعی اور پہلی بار کا تھا) جب ساری روحیں جمع ہو گئیں  
 تو حق جل و علانے اپنا بے کیف خطاب ان کو سنایا اور فرمایا اَلنَّسْتُ بِرَبِّکُمْ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟  
 پس جو روحیں اہل سعادت (اور خوش نصیب) تھیں انہوں نے اپنے رب کو (اقراری جواب) فرح و سرور  
 کے ساتھ دیا اور اسی وقت اس جواب دینے میں ان کا تفاوت ظاہر ہوا کہ کسی نے غایت سرور سے جواب  
 دیا اور وہ صلی و مطیعین تھے اور کسی نے معمولی سرور سے جواب دیا اور وہ عصاۃ مومنین تھے نیز وہیں ان کا  
 مشاہدہ میں فرق مراتب کھل گیا کہ کسی کو وہاں مشاہدہ کاملہ و قویہ حاصل ہوا اور کسی کو ناقصہ و ضعیفہ اور اسی کا  
 دنیا میں وقوع ہوا، اور اسی جگہ شیخ ادسریہ میں امتیاز رہا کہ بعض ارواح نے دوسری روحوں کو مدد پہنچائی اور  
 وہی دنیا میں مشائخ اور مریدین بنے اور کھل گیا کہ نلاں کا تعلق و اتصال نلاں سے ہو گا اور نلاں شخص نلاں سے  
 بے تعلق ہو گا۔ نیز انبیاء علیہم السلام کے مراتب کا تفاوت اور ان کی اُمتوں کے باہمی درجات کا اختلاف بھی  
 ظاہر ہو گیا۔ اور جو روحیں اہل شقاوت و بد نصیب تھیں، انہوں نے خطاب سنا مگر مکد و متغیر ہوئے اور  
 اقراری جواب ناگواری کے ساتھ دیا۔ اس کے بعد ایسے بھاگے جیسے شہد کے چھتے ہیں جب دھواں پہنچتا ہے تو  
 اس کی مکھیاں بھاگتا کرتی ہیں پس ان کو ذات لاحق ہوئی اور ان کے انوار سورج گرہن کی طرح یک لخت، سلب ہو گئے  
 اسی وقت مومن اور کافر کا پتہ چل گیا اور اسی گیا ہر روح کے لئے برزخ میں جگہ معین کر دی گئی ورنہ اس سے قبل رانگو آواز  
 تھی کہ جس محل میں چاہیں قیام کریں اور جب چاہیں اس سے منتقل ہو کر دوسرے محل میں جا قیام کریں



نیز حضرت نے فرمایا کہ اہل بصیرت اولیاء ہیں، جو شخص اب برزخ کی طرف نظر ڈالتا ہے تو ان ارواح کو جدا معلوم کر لیتا ہے جو اجسام سے جدا ہو کر بعد مرگ یہاں آتی ہیں کیونکہ ان کے انوار میں قوت ہوتی ہے جبکہ مومنہ ہوں، یا ان کی ظلمت میں کثرت ہوتی ہے (جبکہ کافر ہوں)، امدان ارواح کو بھی معلوم کر لیتا ہے جو ابھی تک دنیا میں نہیں آئیں کیونکہ ان کے نور اور ظلمت میں ضعف و کمی ہوتی ہے نیز آپ نے فرمایا کہ جب تک وہ روہیں جو اب تک دنیا نہیں آئیں کیونکہ ان کے نور اور ظلمت میں ضعف و کمی ہوتی ہے نیز آپ نے فرمایا کہ جب تک وہ روہیں جو اب تک دنیا میں نہیں آئیں اس وقت تک قیامت نہ آئے گی۔ میں نے عرض کیا کہ اس سے تو لازم آتا ہے کہ اس برزخ و ارواح کے کشف و انوار کو قیامت کا علم ہے کہ کب آئے گا حالانکہ حق تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَنُزُلُ الْعِیْثِ اِلَیْہِ کہ اللہ ہی کو علم ہے قیامت کا اور وہی مہینہ برساتا ہے الخ نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں فی خمس لا یعملون الا اللہ کہ قیامت منجملہ ان پانچ چیزوں کے ہے جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں (اور وہ یہی پانچ چیزیں ہیں جو آیت شریفہ میں مذکور ہیں)، فرمایا یہ ارشاد نبوی ایک خاص مصلحت وقتی کی وجہ سے تھا ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچ امور مذکورہ میں کوئی شے بھی پوشیدہ نہ تھی اور آپ سے پوشیدہ کیسے رہ سکتی ہیں جبکہ قطاب کو ان کا علم ہے، حالانکہ وہ غوث سے کم درجہ پر ہیں چہ جائیکہ غوث اور چہ جائیکہ سید المرسلین و الآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کہ سب وجود عالم اور اصل خلقت بنی آدم ہیں (ف) حضرت مدوح کی اس تقریر سے صراحت اور بعض گزشتہ تقریروں سے اشارة ظاہر ہو رہا ہے کہ معنیات خمسہ کا علم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ آپ کی امت کے اغواث و اقطاب کو بھی ہوتا ہے۔ مگر علماء و سلف و خلف کا تاہیہ مسلک یہ ہے کہ انکا علم ذات باری کے ساتھ مخصوص ہے امدان کی بڑی دلیل یہی آیت شریفہ اور حدیث مذکورہ ہے اس لئے مجھے حضرت مدوح کے اس قول میں انشراح نہیں ہوا قطع نظر اس کے کشف مورث علم یقین نہیں ہے امد اسکو کسی مسئلہ شرعیہ بالخصوص باب العقائد میں حجت نہیں بنایا جاسکتا، یوں بھی چند اشکالات ہیں اول حضرت مدوح کی تقریر کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ جب تک عالم ارواح کی سب روہیں دنیا میں نہ اتریں گی اس وقت تک قیامت نہ آئے گی اور اہل مشاہدہ اقطاب کو نور روح کا قوت و ضعف دیکھ کر پتہ چل جاتا ہے کہ فلاں روح کا ابھی دنیا میں نازل نہیں ہوا بلکہ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ابھی اتنی روہیں دنیا میں اترنے سے باقی رہ گئی ہیں مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ ان کو قیامت کا علم ہو گیا۔ زیادہ سے زیادہ یوں کہو کہ قیامت کے موقوف علیہ کا علم ہو گیا امد اس کا نام علامات قیامت یا شرائط و لوازم قیامت کا علم ہے نہ کہ قیامت کا علم اور شرائط و علامات قیامت کا علم تو عام امت کو بھی حاصل ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جب تک مہدی موعود حضرت محمد بن عبد اللہ کا ظہور نہ ہوے گا قیامت نہ آئے گی کہ جب تک مدعی الوہیت و مجال کا خروج نہ ہو گیا قیامت نہ آئے گی جب تک سیدنا عیسیٰ روح اللہ کا نازل نہ ہو گیا قیامت نہ آئے گی جب تک قوم یا جوج و ماجوج کا



خروج نہ ہوے گا قیامت نہ آئے گی جب تک دنیا میں ایک بھی اللہ کا نام لینے والا رہے گا قیامت نہ آئے گی، وغیرہ  
یہی نوعیت اس کی ہے کہ جب تک عالم ارواح کی سب روحوں کا دنیا میں نزول نہ ہوے گا قیامت نہ آئے گی فرق صرف  
اسا ہے کہ وہ علامتیں عام اہل بصارت کے لئے ہیں اور یہ خاص اہل بصیرت کے لئے ہے قیامت کا علم ہونے کا مفہوم  
تو یہ ہے کہ بالیقین یہ معلوم ہو کہ فلاں صدی کے فلاں سنہ اند فلاں مہینہ اند فلاں تاریخ فلاں گھنٹہ فلاں منٹ اور فلاں  
لمحہ میں آئے گی اور یہ حضرت محدوح کی تقریر سے کہیں ظاہر نہیں ہوا دوم علامات پر نتیجہ کا حکم لگانا بھی اس درجہ  
میں صرف مورث غلبہ ظن ہے، مورث علم یقین نہیں۔ کیونکہ تحت مشیت الہیہ ہے اور اذن الہی کا محتاج ہے اذن  
الہی کا کسی کو علم نہیں ہے۔ اور اسی بنا پر مطلق علم غیب صفت خاصہ ہے ذات باری عز اسمہ کی خود حضرت شیخ تحریر  
فرما چکے ہیں کہ عارت کو حق تعالیٰ نے ایک موجب رشک راحت عطا فرمائی ہے کہ وہ کتابت روح محفوظ کو دیکھ  
کر اور اپنے متعلق کسی حادثہ یا سانحہ کا نزول مقدر پا کر بھی متفکر و پریشان نہیں ہوتا کیونکہ جانتا ہے کہ اس کا وقوع  
تصرف الہیہ کا ماتحت ہے اور اس کا تصرف آزاد اور بے قید ہے کسی کو علم کا پابند یا لکھت میں محدود نہیں  
جو چاہے بدنے اور جو چاہے کرے، بالخصوص جبکہ بحوالہ اللہ مَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ وَعِنْدَهُ أُمْرُ الْكِتَابِ ارشاد فرما  
چکا ہے کہ جو چاہے بنائے اور میں کو چاہے قائم رکھے۔ لہذا قطع نظر اس کے کہ علامت اور اس کے نتیجہ بلکہ  
سبب اور سبب میں بسا اوقات تخلف ہو جاتا ہے یوں بھی یہ ترتیب مورث علم نہیں ہے اس لئے علامات  
قیامت کا علم کسی طرح بھی موجب علم قیامت نہیں ہوا۔ اور اس کی مثال ایسی ہوتی جیسے کوئی معجم کہے کہ جب  
تک فلاں ستارہ فلاں برج میں نہ آجائے گا بارش نہ ہوگی یا کوئی عالمی کہے کہ جب تک کالی اور گہری گھٹا نہ  
آئے گی مہینہ نہ برے گا۔ اس کا نام نہ کسی نے علم نزول العینٹ رکھا اور نہ معنیات خمسہ کا تراجم ثابت کیا۔  
سو ہم یہ قیاس کہ جب انقلاب اور اغواث کو اس کا علم حاصل ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بدرجہ اولیٰ ہونا چاہیے  
خود حضرت محدوح کی سابق تقریر سے عندئذ مع الفارق بن چکا ہے۔ چنانچہ حضرت خضر علیہ السلام  
اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں جو کہ قرآن مجید کے اندر مذکور ہے تحریر فرما چکے ہیں کہ حوادث اور  
امور نانیہ کا مشاہدہ چونکہ ادنیٰ درجہ کا شاہدہ ہے اس لئے حضرت خضر علیہ السلام کو حاصل تھا۔ اور سیدنا  
موسیٰ علیہ السلام کا مرتبہ افضل اور اعلیٰ تھا اس لئے وہ امور باقیہ یعنی مشاہدہ خالق سبحانہ میں مستغرق تھے  
ان کے لئے ان امور سے ناواقف ہی عین کمال ہے۔ لہذا اگر قیاس جاری ہو سکتا ہے تو اس میں جاری ہو سکتا ہے  
کہ جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے لئے مکوینی امور کا عدم علوم عین کمال ہے تو کیا پوچھنا سیدنا نبیاء صلی اللہ علیہ وسلم  
کا کہ مشاہدہ خالق سبحانہ میں سب بنیوں سے برتر اور افضل تھے چہارم تکوین و حقیقت تابع اور حادوم ہے  
تشریع کی کہ شریعت الہیہ کے بقا پر دنیا کا بقا و موقوف ہے جس دن اس قانون الہی کا علم و عمل دنیا میں



ختم ہو جائے گا اسی دن تمام عالم درہم برہم اور قیامت قائم ہو جائے گی اور جب دنیا ہی موجود نہ رہے گی تو اس کے فروع و جزئیات کی ترتیب میں کا نام نظم ہے وہ کہاں رہے گی یعنی اقطاب و اعنواث کی خدمات موقوفہ اور سیاستا باطنیہ سب معطل ہو جائیں گی لہذا خادم کے لئے امور متعلقہ بالخدمت کے علوم کی ضرورت ہے اور مخدوم کے لئے امور متعلقہ بالمخدریت کے علوم کی حاجت ہے دونوں کے علوم ایسے ہی متباہن اور جدا جدا ہیں جیسے حضرت ممدوح نے خود مثال دی ہے کہ یاد شاہ اپنے دو غلاموں میں ایک کو صوبہ کا ناظم و گورنر بنا کر ملکی انتظام کے لئے باہر بھیج دے اور دوسرے کو اپنا ندیم و صاحب الاسرار بنا کر اپنے پاس رکھ لے کہ اس کا کام ہر وقت کی حاضر باشما کے سوا کچھ نہ ہو تو ظاہر ہے کہ ملکی حالات کے متعلق اگر اس سے کوئی بات دریافت کی جائے گی تو کچھ جواب نہ دے سکے گا مگر اس کے ساتھ ہی اسرار سلطان و رموز خزانہ جو واقفیت اس کو ہوگی وہ اس کو نہ ہوگی بنابرین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم تو وہ معارف الوہیت و حقائق ربوبیت اور اسرار شریعت ہیں جن تک رسائی نہ کسی نبی مرسل کو حاصل ہوتی نہ ملک مقرب کو آپ کے لئے ان باتوں کا علم کہ دنیا کب ختم ہوگی، مہینہ کب برسبکا نڈاں کے لطن سے لڑ کا پیدا ہوگا یا لڑکی ملے گی کو کیا ہوگا اور نڈاں شخص کہاں جا کر رہے گا، ایک درجہ میں کشتان ہے پنجم شہادت نکوینی کو کسی درجہ میں اگر کمال مان بھی لیا جائے تو کہ علامت ہے رحمت اللہ کی تو معنیات پر ایمان لانا ایک مستحق کمال ہے بلکہ اصل الکالات اور مدار عبودیت ہے کیونکہ آنکھوں سے نظر آنے والی شے کا یقین تو رہی و بدہی اور غیر اختیاری شے ہے کہ ہر شخص کو حاصل ہوتا ہے مگر جو چیز نظروں سے اوجھل ہو اس پر محض حق تعالیٰ کے حکم سے ایمان لانا اور بدیہا کی طرح ان کا یقین کرنا اکتسابی و اختیاری امر ہے اور علامت ہے خاص غلامی کی صفت اللہ کے برگزیدہ بندوں کو نصیب ہوتا ہے چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات برکات جامع جمیع کمالات ہے اس لئے ذات مظہرہ کو ایمان بالغیب کے کمال سے غالی کیے کہا جاتا ہے خصوصاً جبکہ نسبت عبودیت ہی آپ کی تمام جماعت انبیاء و رسل میں مایہ ناز اور شان مایہ الاستیاز ہے اور اسی لئے کلمہ ایمان کے جز دوم و اشخص ان محمداً عبداً و رسلہ میں شان رسالت سے بھی اس کو مقدم رکھا گیا ہے۔ اس کمال کا مظہر اکثر علوم نکوینی ہیں جن سے آپ کی لاعلمی قوۃ و فعلہ اکثر احادیث میں مذکور ہے اور یہ امور خمسہ ہی چونکہ اصول ہیں تمام امور نکوینیہ کے اس لئے ان کے علم کا مخصوص بذات اللہ ہوتا آیت و حدیث میں مذکور ہوا ہے ششم کتاب ہذا کا یہ مضمون کہ مصلحت و ضرورت و قیہ کے سبب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معنیات خمسہ کے علم کا باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہونا ظاہر فرمایا گویا اس کا اقرار ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم روحی نداہ نے اپنے ان اشیاء خمسہ یا دیگر علوم غیبیہ کا کبھی اظہار نہیں فرمایا اس لئے ہمارے لئے یہی حجت کافی ہے کیونکہ ہم نصوص کے ظاہری معنی پر ایمان لانے کے مکلف ہیں۔

پس اگر حقیقت اس کے خلاف بھی ہو تب بھی ہم معذور ہیں خصوصاً جبکہ جمہور امت کی موافقت بھی اس میں مالک،

۱۷: ابن مردودہ نے حضرت سلمہ بن اکوع سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سرخ قیہ میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص گھوڑی پر سوار کیا اور اس کی آپکے کیا دعویٰ ہے؟ آپ نے فرمایا میں اللہ کا پیغمبر ہوں اس نے پوچھا قیامت کیسے لگے فرمایا یہ غیب ہے اور غیب کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے پھر اس نے پوچھا میری گھوڑی کے پیٹ میں کیا ہے؟ یعنی نرمی یا مادی؟ آپ نے فرمایا یہ غیب ہے اور غیب کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ علاوہ ان میں سلمہ بن اکوع شمس کا قصہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ اندیشہ فرمانا کہ میا دا قیامت تر نہیں آگئی نیز ابن صیاد کے بار میں تردد کہیں یہ دجال نہیں آئے گا ۱۲



اور اس کے خلاف میں گرفت کا بھی اندیشہ ہے کہ غیر الرسول کو رسول پر ترجیح ہے، اور باب فتنہ کا بھی کھولنا ہے کہ ہر بزرگ کے کشف پر ظاہر نص کو چھوڑنا پڑے گا ہفتم جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بقول حضرت ممدوح وقتی مصلحت کی رعایت فرما کر علم بالمغیبات کا اخفاء فرمایا تو ہم غلامان رسول پر زیادہ ضروری ہے کہ اس کی ملحوظ کردہ رعایت کو ملحوظ رکھیں اور یہی کہیں کہ مغیبات خمسہ اور تمامی وہ امور جن سے آپ نے اپنی لاعلمی ظاہر فرمادی ہے اپنے ظاہر معنی پر محمول ہیں انسان کا علم آپ کو نہ تھا حاشا و کلابیجے حضرت ممدوح پر اعتراض مقصود نہیں ہے بلکہ جس طرح خبر متواتر کے مقابلہ پر اخبار آحاد کی تادیل کی جاتی ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ قول رسول پر اعتراض کیا بلکہ یہ منہوں ہوتا ہے کہ خبر واحد کا راوی چونکہ ایک یا دو ہوتے اس خبر کا قول رسول ہونا ہی اذعان کے درجہ میں محقق نہیں ہوا ہے اسی طرح شیخ کا یہ قول مطبوعہ کتاب میں صرف بروایت احمد مبارک رحمۃ اللہ علیہ منقول دیکھ کر جبکہ علماء جہور کا قول متواتر اس کے خلاف ہے، مجھے اس کے حضرت ممدوح کا قول ہونے ہی میں تردد ہے اور وہ اس درجہ ثابت و محقق نہیں کہ ائمہ کا متفق علیہ مسلک اس کی وجہ سے چھوڑا جا سکے بالخصوص جبکہ بعض اہل کشف بھی علماء کے ہم مسلک ہیں اس وقت تحدیث نعمت رب کی بنا پر اس اظہار پر بھی مجبور ہوا کہ چند روز ہوئے تندرہ تاچیز سیدنا موسیٰ کلیم اللہ علیہ وعلی نبینا السلام کی زیارت سے خواب میں مشرف ہوا کہ آپ کی پیشانی مبارک پر بوسہ دے رہا ہوں اور پھر شوق کا غلبہ ہوا تو آپ کے ہر دو قدم مبارک کو پیسہ پر بوسہ دینے لگا۔ آنکھ کھلی تو اس رویا و صادقہ کا ایک خاص احتفاظ قلب میں کئی دن تک موجود پایا۔ اب ترجمہ میں اس مقام پر پہنچا تو از خود قلب میں پڑا کہ تعبیر کا مصداق یہی مقام ہے اس لئے تحریر مذکور کی جرأت و ہمت ہو گئی کہ طبعاً بھی مجھ کا کارہ کو اہل تشریح حضرات علماء امت ہی سے زیادہ محبت بھی ہے

أَحِبُّ الصَّالِحِينَ وَكُنْتُ مِنْهُمْ نَعْلَ اللَّهِ يَرْزُقُنِي صَاحِبًا

اگر خطا ہو تو حق تعالیٰ معاف فرمائے کہ ایمان اسی پر ہے جو عند اللہ و عند الرسول واقعہ اور حقیقت ہو۔ واللہ اعلم ۱۲  
اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ ارواح کے اجسام سے نکل کر جانے سے قبل برزخ میں نور بہت ہی کم تھا اور حضرت آدمؑ کی آفرینش سے پہلے بلکہ ان کے ایام حیات میں بھی اس کی روشنی بہت قلیل تھی۔ مگر جب حضرت آدمؑ کی وفات پر، ان کی روح اور پھر آئندہ زمانہ میں یکے بعد دیگرے، ان کی ذریت و اولاد کے انبیاء و رسل کی اور اولیاء کی روحیں برزخ کی طرف چڑھیں تو اس کے انوار بتدریج بڑھتے رہے کیونکہ ان روحوں کا چڑھنا بھی رے بیک وقت نہیں بلکہ، بتدریج ہوا۔ میں نے دریافت کیا کہ کفار کی روحیں اجسام سے نکل کر برزخ میں کہاں جاتی ہیں فرمایا برزخ کے حصہ زیرین میں اور اگر ان کے برزخی مستقر پر نظر ڈالو گے تو کوئلہ کی طرح بالکل سیاہ و تاریک پائے اور بآقرار کو

۱۳ خصوصاً سید الطائف حضرت علیؑ کہ اللہ وجہہ کا قول جہند امام احمد سند ابوعبید بن جریہ ابن مرویہ میں مروی ہے قل لا یغفر علی نبیکم صلی اللہ علیہ وسلم الا الحسن

من سوا الغیب ظاہر ہے کہ سطرار اولیاء و انوار منظر العجائب و القرائب کی شہادت ان کے اخلاف کی شہادت پر مقدم ہے اور قابل ترجیح ۱۴



سیاہ اس کے ساکنین یعنی کفار کی حالت نے بنا دیا ہے (کہ وہ خود ظلمت کفر کی وجہ سے کوئلہ کی طرح سیاہ ہیں) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آخرت کا حال دنیا کے بالکل برعکس ہے۔ کوئی شخص اگر دنیا میں چمکتا ہوا سفید لباس پہنے گا تو خواہ کافر ہو یا مومن جب تک باہر سے کوئی عارضی میل اور غبار اس پر نہ پڑے گا وہ بدستور سفید و بارونق رہے گا مگر آخرت میں لباس پر میل کچیل رہنے والے کی (ذات سے آئے گا) کہ ذات اگر بوجہ ایمان کے نورانی ہے تو اس کا سیاہ لباس بھی نورانی بن جائے گا اور اگر ذات بوجہ کفر کے مظلم ہے تو اس کا سفید لباس بھی سیاہ

بن جائے گا (پس فرض کرو عالم آخرت میں) کسی کافر کو نہایت حسین اور نہایت سفید شفات لباس پہنا دیا جائے حالانکہ کافر کو یہ نصیب ہی نہیں ہو سکتا، مگر وہ سارے کپڑے (ظلمت کفر کی وجہ سے) فوراً ایک لحظہ میں کوئلہ سے زیادہ سیاہ بن جائیں گے بلکہ ہوا جو چار طرف سے ہموگھیرے ہوئے ہے اس کا حال بھی دار دنیا اور دار آخرت میں باہم مخالفت ہے کہ دنیا میں اگر وہ ہوا منور ہوگی رحیمی کردن کے وقت سورج کی شعاعیں اس کو روشن کر دیتی ہیں تو کافروں کے ہوں یا مومنین کے تمام اجسام جو اس ہوا کے اندر ہیں سب روشن ہو جائیں گے مگر آخرت میں فوات کا حکم چلے گا اور وہی رہوائے محیط پر غالب ہوگا کہ فوات مومنین (اپنی چار طرف کی ہوا کو) جگہ جگہ لگی اور خود ہوا مومنین کے انوار سے محیر العقول روشنی حاصل کرے گی جس کی وجہ سے ان کی ارواح کا مستقر ایک بقعہ نور نظر آئے گا اور فوات کفار اپنی چار طرف کی ہوا کو بھی، نو کی طرح گرم اور کوئلہ کی طرح سیاہ بنا دے گی۔ اور کوئلہ بھی وہ جس سے زیادہ کوئی چیز ہو غرض دار آخرت میں باطنی امور کے احکام ظاہر ہوں گے کیونکہ اصل وہی ہیں اور آخرت درحقیقت ظہور اصلیت ہی کا گھر ہے پسینہ کے متعلق جو حدیث میں آیا ہے کہ بروز قیامت کسی کو اتنا پسینہ آئے گا کہ اس کے ٹخنوں تک پہنچ جائے گا اور کوئی اپنے پسینہ میں گھٹنوں تک ڈوب جائے گا اور کسی کے پسینہ اس کی کمر تک آجائے گا اور کسی کا گردن تک کسی کو لگام بن کر دہن تک غرق کر دے گا۔ حالانکہ پسینہ کے وقت جس زمین پر کھڑے ہوں گے وہ سب کے لئے ایک سطح مساوی ہے دنیا میں اگر تین شخص بھی ایک سطح مستوی پر کھڑے ہوں تو یہ اختلاف کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس کے متعلق بھی حضرت محدوح نے قریب قریب یہی جواب دیا کہ دنیا کے اندر چونکہ اہل باطن یعنی درجات طاعت و معصیت، میں سب متفاوت ہو گئے اس لئے آخرت میں اس کا حکم واضح ہو گیا کہ پسینہ کی مقدار حسب معاصی ظاہر ہوئی، کیونکہ آخرت دار حقیقت ہے (واقعیت کا اس میں ظہور ہوگا اور چھپاؤ صفا سب کھل جائے گا) اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ برزخ کے اس حصہ میں جہاں کافروں کی رحیمیں ہیں جگہ جگہ عراصین ہیں جو برزخ سے نکال کر لمبے ستونوں کی طرح جہنم کی سمت میں بڑھتے چلے گئے ہیں اور ان عراصین میں رہنے والوں پر جہنم کے عذاب امداس کی لپٹ امدید بود وغیرہ کا اثر اتنا پہنچتا ہے گویا وہ جہنم ہی میں ہیں۔ ان عراصین میں جو رکھے جائیں گے وہ متاقتین اور شدید الکفر لوگ ہوں گے جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔ اسی طرح



برزخ کے جس حصہ میں ارواح مومنین ہیں اس میں بھی عراجین ہیں جو برزخ سے نکل کر لمبے ستون کی طرح جنت کی سمت میں بڑھتے چلے گئے ہیں اور ان میں رہنے والوں پر جنت کی نعمتوں، ٹھنڈی ہواؤں اور مہنگ و خوشبوؤں کا ایسا ورود ہوگا کہ گویا وہ خاص جنت ہی کے اندر ہیں اور جو ان میں رکھے جائیں گے وہ شہداء اور وہ لوگ ہوں گے جن پر اللہ کی خاص رحمت ہے اور یہ ہر دو فریق کے عراجین مذکورہ درحقیقت برزخ ہی کے حصے ہیں مگر ان کی صورت ایسی ہے جیسے زائد چیز باہر نکل کر برزخ کی سمت کے سوا دوسری سمت کو ٹیڑھی چلی جاتی ہے۔ فے کھجور کے پتے جب کاٹ دئے جلتے ہیں تو اس کی جڑ کا حصہ تنہ درخت میں لگا ہوا رہ جاتا ہے اور وہ قائم رہتا ہے کہ درخت کھجور کے سیدھے تنے پر انہیں پر انگوٹھا لگا لگا کر پھٹک پر پہنچ جاتا ہے اس ٹھنڈے کو عربی میں عرجوں کہتے ہیں اور اس کی جمع ہے عراجین یہ حصہ درحقیقت تنہ کھجور ہی کا حصہ ہے مگر اصل تنہ سے زائد ہو کر ادھر ادھر کو باہر نکل گیا ہے میں نے عرض کیا کہ برزخ کا حصہ زیریں جب آسمان دنیا پر ہے تو اسی میں ارواح کفار کے جانے کی صورت بجز اس کے کوئی نہیں کہ آسمان کا دروازہ کھولا جائے حالانکہ حق تعالیٰ فرماتا ہے لَا تَفْتَحُ لَهُ أَبْوَابُ السَّمَاءِ کہ ارواح کفار کے لئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے نیز علماء نے بیان کیا ہے کہ مومنین کا برزخ قبر سے لے کر اعلیٰ علیین تک ہے اور کفار کا برزخ قبر سے لے کر سحین تک اور سحین اسفل السافلیق میں ہے جس سے نیچے کوئی حصہ ہی نہیں۔ پھر آسمان کا مستقر کیسے ہو سکتا ہے؟ پس اس کے جواب میں ایک مرتبہ تو اپنے یہ فرمایا کہ جب کافر کی روح اسفل برزخ یعنی آسمان دنیا میں ہے اور تمام ادراکات سے محروم و محجوب بنا دیا گئی ہے گویا اس کی آنکھ کان دل اور تمام آفات حس و شعور کو سی دیا گیا ہے تو رکھلا دروازہ بھی، اس کے لئے گویا ایسا ہے جیسے کھولا ہی نہیں گیا ہے؛ یعنی ارشاد خداوندی تمثیل کے درجہ میں ہے مثلاً فرمایا ہے وَلَكُلَّمَا أَعِثَّتْ لَآ يُصْبِرُونَ بَعْدَ وَكُهُمُ اَذَانٌ لَّآ تَسْمَعُونَ بَعَثَا۔ کافروں کی ایسی آنکھیں ہیں جن سے دکھائی نہیں دیتا اور ایسے کان ہیں جن سے سنا فی نہیں دیتا۔ مطلب یہ ہے کہ جب حق شے اور حق بات کا آنکھ کان کے ذریعہ شعور و ادراک نہ ہوا تو آنکھ کا دیکھنا بمنزلہ نہ دیکھنے کے ہے اور کان کا سنا بمنزلہ نہ سننے کے ہے اور اسی بنا پر ان کو صُفْحٌ بَیْكُهُ عُمْنٰی کہا گیا ہے کہ بہرے گونگے اور اندھے ہیں۔ یعنی جب کان اور زبان اور آنکھ سے ان کے مُدْرَكَات کا ادراک ہی نہ ہوا تو ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے اور ایک مرتبہ یہ فرمایا کہ برزخ میں ارواح کفار کی دو قسمیں ہیں ایک قسم وہ ہے جو مظلمت و بے حالی کے غلبہ کی وجہ سے بالکل پردہ میں (اندھ پرپٹے اندھی) ہے کہ کسی روح تک کو بھی نہیں دیکھ سکتی اور تیل کیشہ کچھ بھی اس کو نظر نہیں آتا اور پردہ رکھڑے یا وہ ہے وغیرہ جرم کا نہیں بلکہ، اللہ پناہ میں رکھے صرف غضب خداوندی کا ہے اور ایک قسم وہ ہے جس پر حجاب نہیں ہے بلکہ وہ دیکھتی ہے مگر کیا دیکھتی ہے؟ صرف وہ عذاب دیکھتی ہے جو اس کے لئے تیار کیا گیا ہے اور ہر قسم بر اللہ پاک کا غصہ ہے لہذا وہ بمنزلہ اس کے ہے



جس کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے گئے اس کا مفہوم یہ ہے کہ آسمان کے دروازہ کا کھولا جانا علامت ہے احترام کی کہ ملائکہ استقبال کریں اور مبارکباد دیں اور یہ مشاہدہ کرے آسمانی مخلوق اور مناظر قدرت الہیہ کا اور جب یہ صورت نہیں بلکہ الیسا ہے جیسے پٹی باندھ کر حبیل خانہ کی کال کوٹھری میں ٹھونس دیا جائے کہ بھر تک الیف اور سزا ہائے مشقت کے چار طرے کچھ نظر نہ آئے تو آسمانی دروازہ کھلنا نہ کھلنا اس کے برابر ہے۔ پہلی تقریر میں تمثیل فتح باب کے عدم شعور و ادراک میں مٹھی اور اس تقریر میں تمثیل فتح باب کے مقصود یعنی مشاہدہ ما فی السماء سے حرمان اور عدم احترام میں ہے، جامع کتاب کہتے ہیں کہ اس کی تائید آیت شریفہ کی تفسیر کے متعلق خود علماء کے اختلاف سے ہو رہی ہے کہ بعض نے کہا ہے مطلب یہ ہے کہ رصعود روح کے لئے نہیں بلکہ کافروں کی دعاؤں کے لئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے یعنی وہ مقبول نہ ہوگی (اور بارگاہِ مجیب الدعوات تک ان کی رسائی نہ ہوگی) اور بعض نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ حیس (عزت افزائی اور استقبال ملائکہ) کے لئے مومنین کے واسطے دروازے آسمان کھولے جائیں گے اس نشان پر ان کافروں کے لئے نہ کھولے جائیں گے (پس کشود باب کی نفی ہزار نہیں بلکہ برائے استقبال کشود کی نفی مراد ہے) چنانچہ بیضاوی میں یہ اقوال مذکور ہیں نیز معراج والی حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آسمان پر حضرت آدم سے ملے اور دیکھا کہ ایک جماعت ان کے دائیں بیٹھی ہے (یہ ارواح مومنین حقیقی) اور ایک جماعت اُن کے بائیں طرف بیٹھی ہے (اور یہ کافروں کی روہیں حقیقی) حضرت آدم علیہ السلام جیتا ہنی طرف نظر ڈالتے ہیں تو مسکرا دیتے ہیں اور جب بائیں طرف نگاہ کرتے ہیں تو رو پڑتے ہیں اس حدیث میں بھی جماعت کافرین کے متعلق علماء کا اختلاف ہوا ہے کہ بعض نے ظاہری معنی پر عمل کیا (اور ارواح کفار کا آسمان پر صعود مانا ہے) اور بعض نے اس کی تاویل کی ہے (کہ ارواح کی صورت مثالیہ حقیقی ارواح نہ تھیں) اور ایک مرتبہ حضرت ممدوح نے (دوسرے شبہ کے جواب میں) یہ فرمایا کہ جب برزخ کی ابتداء آسمان دنیا سے ہے تو اسکا مطلب یہ نہیں کہ وہ صرت ہمارے سر ہی کی جانب ہے۔ بلکہ ہمارے پیروں کے نیچے بھی ہے اس لئے کہ آسمان ساری زمین کو محیط ہے اور ہر آسمان ان چیزوں کو محیط ہے جو اس کے اندر واقع ہیں (لہذا زمین بھی اس کے اندر ہوئی عرش سب آسمانوں اور زمینوں) کو محیط ہے (اور برزخ اتنی بڑی اور عظیم الشان چیز ہے کہ اس کی اصل کا عرض عرض جو برزخ کا سب میں زیادہ تنگ حصہ ہے مقدار میں زمین سے سات گونہ ہے پس جب ہم نے کہا کہ برزخ ہمارے سروں پر ہے تو یقیناً اس کا ایک حصہ ہمارے پیروں کے نیچے بھی ہوا۔ لہذا جن علماء نے یہ فرمایا ہے کہ کفار کی روہیں اسفل سافلین میں ہوں گی ان کی مراد برزخ کی وہ زیریں جانب ہے جو ہمارے پیروں کے نیچے ہے۔ حضرت ممدوح کا مطلب یہ ہے کہ برزخ ساتوں آسمانوں کو قطع کرتا ہوا اعلیٰ علین ربالا ازبالا، تک چلا گیا ہے نیز ساتوں زمینوں کو قطع کرتا ہوا اسفل سافلین زیریں زمین) تک چلا گیا ہے (کہ زمین مع مافہیما



اس کے جوہر میں آگئی ہے) پس برزخ کا زیریں حصہ ساتویں زمین کے نیچے سجّین میں ہوا اور بالائی حصہ اس کا ساتویں آسمان کے اوپر علین میں ہوا۔ اس سے اس روایت کی موافقت بھی ہو گئی جس میں آیا ہے کہ جنت آسمانوں کے اوپر ہے اور جہنم زمینوں کے نیچے ہے کہ برزخ کا زیریں حصہ سمت جہنم ہوا اور اس میں کفار و اشیاء اور فجار کی روہیں ہیں اور برزخ کا بالائی حصہ جنت کے رُخ ہوا اور اس میں مومنین و سعد اور اخیار کی روہیں ہیں اس تقریر کو سابق اختلاف سے بھی کوئی منافات نہیں۔ کیونکہ جب برزخ کی یہ صورت ہے کہ وہ محیط ہے اتلاک کو بالاد زیریں ہر دو جانب سے) تو لازم نہیں آیا کہ ارواح کفار کے لئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے کیونکہ حصہ زیریں سجّین میں جانا بھی آسمان ہی کے دروازے سے ہوگا اگرچہ وہ دروازہ آسمان کے اُس حصہ میں ہوگا جو زمین سے نیچے ہمارے پردوں کی جانب واقع ہے) نیز ایک مرتبہ اپنے فرمایا کہ کفار میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی روح کو برزخ کی جانب چڑھنے سے روک دیا جاتا ہے اور وہ ہمراہ اور دیگر اشیاء طین جو اس کی ذات میں دنیا کے اندر و سو سے ٹالا کرتے تھے اس پر مسلط کر دئے جاتے ہیں کہ جس وقت بھی وہ روح اپنی ذات (جسم) سے باہر نکلتی ہے تو یہ اشیاء طین فوراً اس کو گھیرتے اور اس کو کھلونا بنا کر اس کے ساتھ کھیلتے ہیں جیسے بچے گیندے کھیلا کرتے ہیں کہ ایک شیطان دھکا دیکر اُسے دوسرے پر پھینکتا ہے اور وہ شیطان اُسے دھکے دھکیں کر اس پر پھینک دیتا ہے پھر سب مل کر پتھروں پر اس کو ٹپختے اور سنگلاخ زمینوں پر دے دے مارتے ہیں غرض جب تک اس کا بدن و ہیکل یا قبر میں پھول پھٹ کر، فنا نہیں ہو جاتا اور مٹی نہیں بن جاتا اس وقت تک طرح طرح کے ناقابل برداشت عذاب الہی میں اس کو مبتلا رکھتے ہیں اس کے بعد اس روح کو برزخ کے حصہ زیریں میں اس کی قیامگاہ پر پہنچا دیا جاتا ہے پس جن علامات کافر کی روح کے لئے دروازہ آسمان نہ کھولے جائیں گے یہ مطلب لیا ہو کہ وہ تا فنا جسم اشیاء طین کے ہاتھوں دنیوی عذاب میں دنیا ہی کے اندر گرفتار رہتی ہے تو یہ بھی صحیح ہے۔

بہر حال ان عامی اقوال میں تنازع نہیں ہے اس لئے کہ ارواح کفار کی مختلف قسمیں ہیں بعض اسفل برزخ (سجّین) میں ہوں گے اور بعض اُن عراجیق میں (جو زائد حصہ کی طرح عمودی شکل میں سمیت جہنم نکلے چلے گئے ہیں اور بعض ان دونوں کے درمیان وسطی حصہ میں ہوں گے اور بعض تا فنا جسم دنیوی کے اندر شیطانی ہاتھوں میں محبوس ہو گئے اور بعض زمین سوم میں ہوں گے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت مدوح نے فرمایا کہ میں نے زمین سوم میں چند جاعتوں کو تنگ مکانوں اور گہرے کنوئوں میں بھر رکھی ہوئی آگ اور مسلسل عذاب کے اندر مبتلا دیکھا کہ رہنڈوے کی طرح، ہر وقت صعود اور نزول میں رہے ہیں کوئی ان میں ادھر ادھر کلام کرنا چاہتا ہے مگر بات پوری نہیں کرنے پاتا کہ فوراً نیچے اُتر جاتا ہے نیز آپ نے فرمایا کہ ان ہی لوگوں میں میری نظر ایک شخص پر پڑی جس سے مجھے عالم دنیا کی واقفیت تھی اور اس کا نام بھی مجھے معلوم تھا میں نے اس کا نام لے کر اُسے پکارا اور کہا وائے تجھ پر تو یہاں کس



شامت اعمال میں آگیا؟ وہ چاہتا تھا کہ مجھ سے بات کرے مگر فوراً ہی نیچے اترا چلا گیا۔ جامع کتاب کہتے ہیں کہ میرا غالب گمان یہ ہے کہ میں نے حضرت سے عرض کیا کہ یہ جگہ بھی برزخ ہی کی جگہ ہوگی۔ اس لئے کہ برزخ ساتوں زمینوں کو قطع کرتا ہوا اسفل سافلین تک چلا گیا ہے؟ فرمایا ہاں تم سچ کہتے ہو واللہ اعلم بالصواب۔

صرف یہ ایک موقع ہے جس میں مجھے اپنی تمامی تحریر کتاب کے اندر شک لاحق ہوا کہ یہی ہے جو میں نے لکھا ہے یا مجھے کچھ سہو ہوا ہے؟ اور اس کے لئے میں نے غالب گمان کا لفظ لکھ کر اس پر متنبہ کر دیا ہے اور یہ شخص جبکہ حضرت ممدوح نے مستقبل و غلاب، دیکھا عالم دنیا میں مہملہ مومنین کے تھا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا اور مشیت الہیہ کا عجیب کرشمہ ہے کہ ارواح کفار کو ارواح مومنین سے کوئی نفع نہیں پہنچتا حالانکہ مدثر میں کوئی پردہ یا ادٹ نہیں ہے ظاہری حجاب کے بغیر محض ارادہ و مشیت کا حجاب قائم فرما دیا ہے کہ ارواح مومنین کے لئے وہ انوار ہیں جن کی روشنی اور چمک کو چاند اور سورج وغیرہ کسی نورانی جسم کی روشنی بھی نہیں پہنچ سکتی۔ بلکہ ان نورانی اجرام کی روشنی بھی انہیں انوار سے آتی ہے جیسا کہ آئینہ مذکور ہوگا۔ مگر باوجود اس کے کافر کی روح اس سے منتفع نہیں ہو سکتی۔ اور اس کی قلیل و کثیر کچھ بھی روشنی نہیں لے سکتی۔ بدستور اپنی اسی کیفیت تاریکی اور بے حد سیاہی میں رہتی ہے گویا ان انوار کے اعتبار سے وہ پردہ میں ایسی چھپی ہوئی ہے جیسے اسکوڑیہ میں بند کر دیا گیا ہو اور ڈیہ کا منہ رانگ سے جہاں دیا گیا ہو حالانکہ نہ ڈیہ ہے نہ رانگ، بلکہ محض ارادہ الہیہ مانع ہے کہ وہ نہیں چاہتا اس کافر کو انوار مومنین سے انتفاع نصیب ہو رہاں ارواح مومنین میں باہم ایک دوسرے سے نفع پہنچتا ہے اور ایک روح دوسری کو نور پلاتی ہے اور ایک دوسرے کی شفاعت کرتی ہے حتیٰ کہ ایک روح میں ان گناہوں کے آثار نظر آتے ہیں جو اس کی ذات نے دنیا میں کئے تھے پھر وہ آثار بالکل زائل ہو جاتے ہیں۔

محض اس وجہ سے کہ اللہ کے کسی مقبول و محبوب بندہ کی روح اس کے قریب ہوتی ہے۔

نیز آپ نے فرمایا کہ برزخی مکانات اور جنت کے درمیان نور کے دُورے ہیں جو روحوں کے اجسام سے جدا ہو کر برزخ میں جاتے کے بعد پیدا ہوتے ہیں اور یہ نور جو دنیا کے کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے (نور ایمان ہے اور اس لئے ان روحوں میں نہیں ہے جو ابھی دنیا میں اگر مکلف یا لایمان نہیں ہوئیں، مثلاً زید کی روح ہے جو ایمان کے ساتھ دنیا سے اٹھتی تھی) تو نظر آئے گا کہ نور کا دُور اس سے نکل کر برزخ کو قطع کرتا ہوا جنت تک چلا گیا ہے اور اس نور کے ذریعہ اس کو جنت سے تمتع انتفاع حاصل ہو رہا ہے اور اسی طرح کفار کے برزخی مکانات اور دوزخ کے درمیان ظلمت کے دُورے ہیں اور وہ بھی ارواح کے اجسام سے جدا ہونے کے بعد ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہ ظلمت ظلمت کفر ہے کہ اس کا دُور کافر کی روح سے نکل کر دوزخ تک چلا گیا ہے اور اس کے ذریعہ کافر کی روح کو جہنم کی گواہی اور لپٹ پہنچتی ہے (دُنے) حدیث میں آتا ہے کہ منکر ذیکر کے سوال جواب کے بعد



اگر مومن ثابت ہو تو اس کے لئے جنت کی کھڑکی کھول دی جاتی ہے اور اگر کافر ہو تو جہنم کی کھڑکی کھول دی جاتی ہے عجب نہیں اس سے یہی ضبوط نور و ظلمت مراد ہوں جن کی مقدار و ضخامت حسب مقدار کفر و ایمان ہوتی ہے اور جن طرح نل اور تار کے ذریعہ دور کی ہوا اند بھاپ کھینچتی ہے اسی طرح یہ دورے جنت کی خوشگوار و نازکی کو اخذ کرتے اور جہنم کی تپش اور سوزش کو جذب کر کے اس متبدل تک پہنچاتے ہیں جہاں سے دورے چلے ہیں جیسے شعاعوں کے تار کہ سورج کی گرمی بھی شعاع ہی ذریعے سر پر آتی ہے اور چاند کی خشکی بھی اس کی شعاع ہی کے ذریعہ بدن پر پڑتی ہے اسی طرح نور و ایمان اند ظلمت کفر کے تار یا جذب ہوا بن کر خشکی و راحت اند پیش کھینچتے ہیں نیز آپ نے فرمایا کہ اسی طرح برزخ کے اند دنیا میں اجسام مومنین کے درمیان بھی ان کے نور ایمان کے دورے ہیں کہ صاحب بصیرت کو ایمان کا دورا بالکل صاف اند سفید ایسا نظر آتا ہے جیسے دھوپ کسی بند دروازہ مکان پر پڑ رہی ہو اند اس کی شعاع کسی باریک سوراخ کے ذریعہ اندر آرہی ہو کہ وہ لمبے دھلگے کی طرح دروازے سے آگے نکلی ہوئی نظر آتی ہے اسی طرح یہ دورا صاحب بصیرت کو زندہ مومنین میں ہر ایک کے سر سے نکلا ہوا برزخ میں جو جگہ بھی اس کا مستقر ہے وہاں تک چڑھتا نظر آتا ہے مگر جب تک سروں سے ایک بالشت ادبھا نہیں ہو جاتا اس وقت تک نمایاں نہیں ہوتا اور دورے کی ضخامت حسب قسمت ازلی مختلف ہوتی ہے کہ کسی مومن میں دھلگے کی طرح باریک نظر آتا ہے اور کسی میں اس سے زیادہ موٹا سر کنڈھے کی مثالی کے مثل، اور کسی میں بالن اوگٹے کی طرح اور کسی میں تنہ کھجور کی طرح موٹا اور یہ لوگ رجن کا نور ایمان تنہ کھجور کے مثل ضخیم ہوتا ہے اکابر اولیا ہیں رضی اللہ عنہم اسی طرح کفار کے اجسام اور ان کے برزخی مستقر کے درمیان دورے نظر آتے ہیں مگر کفار کے دوروں کا رنگ سیاہی مائل نیلیوں ہوتا ہے جیسے گندھک کی کو کا رنگ ہوتا ہے (اور پرانے زمانہ کی دیاسلائی جیلانے سے شروع میں نظر آتا تھا) جس شخص میں اس رنگ کا دورا نظر آوے وہ اس کے شقی را اور جہنمی ہونے کی علامت ہے اور یہ بھی حسب اہل ضخامت میں مختلف ہوتا ہے کہ کسی کا دورا تپلا ہوتا ہے (جو اس کے معمولی کفر کی علامت ہے اور کسی کا تنہ کھجور کے موافق ضخیم) جو متمر و اور شدید الکفر ہو نیکی علامت ہے، غرض حسب تفاوت کفر یہ دورا بھی رفیق اور غلیظ ہوتا ہے نیز اپنے فرمایا اکثر ایسا ہوتا ہے کہ میں یہودی سبتوں میں جاتا ہوں تو یہ دورے ان کے سروں سے نکلے ہوئے دیکھتا ہوں جو اوپر چڑھ کر افق میں ایسے جمع ہو جاتے ہیں جیسے سیاہ کھرا کہ موسم سرما میں برت پڑنے کے دن خلا میں دھوپ اند سیاہ گھٹا کی طرح ایک چمکت سی قائم ہو جاتی ہے نیز ان میں رملے چلے بہت کم دورے سفید اور چمکدار بھی نظر آتے ہیں اس سے میں سمجھ لیتا ہوں کہ یہ دورے واے (اپنا مذہب چھوڑ کر) دین محمدی کی طرف منتقل ہونگے اسی طرح کسی اسلامی شہر میں جاتا ہوں تو دیکھتا ہوں ان کے سروں سفید چمکدار دورے نکل کر برزخ کی طرح چڑھ کر، ہیں ہاں بعض دورے



ان میں ایسے بھی نظر آتے ہیں جن میں نیلا ہٹ ہوتی ہے مگر ایسے دورے بہت قلیل مقدار میں ہوتے ہیں اور جس میں یہ دُور نظر آتے وہ اسکی شفاوت (اور ارتداد) کی علامت ہے۔

جامع کتاب کہتے ہیں کہ ان ہی کی طرف اشارہ ہے اس حدیث میں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں انسان لوگوں کی نظروں میں عمل کرتا ہے جنتیوں کے سے اعمال کہ دفعۃً ازنی لکھت اس پر غالب آتی ہے اور وہ عمل کرنے لگتا ہے دوزخیوں کے اعمال اور آخر وہ داخل ہوتا ہے جہنم میں اور روزمرہ یہود میں جو سفید دُورے والے نظر آتے ہیں ان کی طرف اشارہ ہے اس چیز حدیث میں کہ انسان عمل کرتا رہتا ہے اہل جہنم کے سے اعمال حتیٰ کہ اس کے اور جہنم کے درمیان صرت ایک بالشت کا فعل رہ جاتا ہے یعنی موت کا وقت قریب اور دخول جہنم پاس آ جاتا ہے کہ دفعۃً لکھت اس پر غالب آتی ہے اور وہ عمل کرنے لگتا ہے اہل جنت کے سے اعمال اور ایک مرتبہ وہ داخل ہو جاتا ہے جنت میں۔

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا جو ازنی لکھت کا نظارہ کرنا چاہیے اور حق تعالیٰ کا ارشاد جو حدیث میں مذکور ہے *هؤلاء الى الجنة ولا اباني وحولاماني انتادفلا اباني* مشاہدہ کرنا چاہیے وہ بچوں پر نگاہ ڈالے یعنی بشرطیکہ صاحب یقین ہو اور اس کشف خیوط سے بہرہ یاب ہو تو وہ دیکھے گا کہ بعض بچے ایسے ہیں جن کا دُور نہایت چمکدار ہے (جو علامت ہے کہ ایمان پر خاتمہ ہوگا اور جنتی فریق میں درج ہوا ہے) اور بعض ایسے ہیں جن کا دُور نیلا ہٹ ہے (جو علامت ہے کہ کفر پر مرے گا اور جہنمی فریق میں درج ہوا ہے) حالانکہ ابھی تک غیر مکلف ہیں مگر ازنی لکھت نوازی ہے اسکو کون مٹا سکتا یا بدل سکتا ہے (ایک مرتبہ ہمارا گزریو کمسن بچوں پر ہوا جن کی عمر تقریباً چار پانچ برس کی تھی اور وہ دونوں کھیل رہے تھے حضرت نے مجھ سے فرمایا دیکھو اس نے کونسا عمل کیا ہے اور اس نے کونسا عمل کیا ہے یعنی ربا و جود عمل کا وقت نہ آنے کے ایک کا دُور چمکدار رہو تیار رہا ہے کہ عامل بالحنان ہوگا) اور دوسرے کا دُور نیلگوں ہے (جو تیار رہا ہے کہ عامل بالسیئات ہوگا)

اور ایک مرتبہ بچوں کی ایک جماعت پر ہمارا گزرا جو کھیل رہے تھے تو آپ نے فرمایا اس زمانہ کے بچوں پر نظر ڈال کر معلوم ہوتا ہے کہ آنے والے زمانہ سے بہتر ہے کیونکہ اس زمانہ کے بچوں کے انوار میں حسن اور ملاحضت انتہا درجہ کی ہے ایک بار ہمارا گزرا ایک مقام پر ہوا اور وہاں سے ایک بچہ نکلا تو حضرت نے اس پر نظر ڈالی اور اس سے پوچھا صاحبزادے تمہارا کیا نام ہے؟ اس نے کہا مقداد۔ آپ نے فرمایا اس بچہ سے ایک بڑا دلی پیدا ہوگا جو اللہ کے نزدیک مغرور و محترم ہوگا ایک مرتبہ دوسرے بچہ پر گزرا ہوا تو آپ نے مجھ سے فرمایا دیکھو اس کے چہرہ پر ولایت کا نور چمک رہا ہے (دیکھو اس کے منہ پر ولایت کی علادت (پیرس رہی ہے) دیکھو اسکی ذات میں ولایت (صاف نظر آ رہی ہے) کہ کسی پر بھی مخفی نہیں اس کے بعد فرمایا میں تمکو وصیت کرتا ہوں کہ اس کے ساتھ عربی برتن



چنانچہ وہ بڑا ہوا اور آج ماشاء اللہ کوئی چیز ہے۔ الحمد للہ حج بھی کر چکا بڑے بڑے مقامات اس کو نظر آتے ہیں۔ عملی حالت نہایت اچھی ہے امر دین میں استقامت اس کو نصیب ہے اور چہرہ پر ملاحیت کی شعاعیں دکھ رہی ہیں نیز آپ نے فرمایا کہ بچہ کے ماں کے پیٹ سے نکلتے ہی اور زمین پر آتے ہی اس کشف و الیکو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے جیسے جو بڑ کا حال ہے کہ نبات سے قبل تو بیشک پتہ نہیں چلتا کہ اس میں کچھ پیدا ہوگا یا نہیں مگر جب اس میں بیل جھکراؤ پر تپڑوں کے سامنے آ جاتی ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تربوز کا پتہ ہے اور اس میں تربوز ہی لگے گا اور یہ دوسرا پتہ ہے جس میں تربوز آنے کی کوئی صورت نہیں یا جیسے غنچہ کہ اگر زرد رنگ کا ہے تو سبز نہیں بن سکتا اور جو سُرخ ہے وہ زرد نہیں بن سکتا اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ منافقوں کے بدترین کفار اور جہنم کے درک اسفل میں جانے کا کیا سبب ہے جبکہ ان سے حقیقتہً نہ ہی مگر صورتاً تو نماز روزہ حج، جہاد، وغیرہ کا صدور ہوا اور یہ بھی نہ سہی انہوں نے ایذا رسانی سے تو مسلمانوں کو محفوظ رکھا (برخلاف کفار کے کہ ان سے صورتاً صوم و صلوٰۃ بھی نہ پائی گئی اور ایذا میں بھی ان سے مسلمانوں کو زیادہ پہنچیں فرمایا سبحان اللہ میاں کفر اور اس کی خیانت و شدت کا امتداد ازنی تکھت کی طرف سے ہوا کرتا ہے بلکہ اعمال کی طرف سے بارہا ایسا ہوا کہ ہم نے برزخ کی طرف نگاہ کی تو ایک ظلمانی ستون نہایت نیلا خبیث دراز ہوتا اور وہاں سے اُترتا ہوا کفرستان کے کسی شہر کی طرف جاتا نہیں نظر آیا اور میں نے خیال کیا کہ ضرور یہ کسی بڑے ستم و اور حاکم ذی جاہ پر اُترے گا اس لئے میں نے اپنی نگاہ اس کے پیچھے لگائی (کہ دیکھوں کس پر جا کر پڑتا ہے) مگر دیکھا تو وہ ایک بڑھے پھوس ضعیف الجثہ شخص پر آکر پڑا جو اپنی دکان میں بیٹھا ہوا چندھی آنکھوں سے تک رہا تھا یہ دیکھ کر میں کلمہ طیبہ پڑھتا اور اللہ کی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کیا تھا کہ سبحان تیری قدرت کہاں یہ بڑھا گننام اور کہاں شدید کفر کا یہ ظلمانی ستون، کہ کسی کا وہم و گمان بھی نہ جائے بس کرم ہے تیرا کہ اس پر یہ وبال، اور ہم پر بلا استحقاق تیرا فضل اور لطف شامل حال) ایک مرتبہ فرمایا کہ نیلا ڈورا اگرچہ شقاوت و کفر پر دلالت کرتا ہے مگر کبھی یا ذن اللہ متبدل بھی ہو جاتا ہے جبکہ اس شخص کو اہل سعادت کی محبت نصیب اور اس کے دل میں ان کا تعلق قائم ہو جائے۔ پس اس صورت میں آہستہ آہستہ اس کا ڈورا صفات ہوتا رہتا اور آخر کار اہل سعادت کی طرح صفات و صفیں بن جاتا ہے۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا یہ نیلا ڈورا اگر نیلا تو ہو مگر اس میں روشن کردہ گندھک کی سی، چمک نہ ہو تو ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ وہ صحبت صلحاء سے عموماً بدل جاتا ہے لیکن اگر نیلا ہٹ کے ساتھ چمک بھی ہو تو اس کو بدلتے ہوئے ہم نے کبھی نہیں دیکھا ایک مرتبہ فرمایا حضرات ابنیاد علیہم السلام کے مبعوث ہوتے میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ وہ لوگوں کو ایک کلمہ تو حید پر جمع کرینگے حتیٰ کہ سب ایک ملت وند ہی پر آجائیں گے تو باہم ایک دوسرے کی



مدد اور ایک دوسرے کو نصیحت کیا کریں گے اور ظاہر ہے کہ بعض ان میں اہل سعادت ہوں گے اور بعض وہ ہوں گے جن کا دُورا نیلا ہوگا پس اگر اسکو کچھ مدت تک اہل سعادت کی صحبت نصیب رہی تو ان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے اس کا نیلا دُورا سفید رنگ قبول کرے گا اور وہ بھی بہ برکت اجتماع صلیحی سعید ہو جائے گا۔ پس محبت نصیب ہوتی لعنت انبیاء کی وجہ سے اور تبدیل حال نصیب ہوا اس محبت کی وجہ سے جامع الکتاب کہتے ہیں یہی راز ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت میں شامل رہنے کا تاکید حکم فرمایا کہ بالشت برابر بھی سواد اعظم سے یا ہرنہ نکلا جائے چنانچہ ارشاد ہے علیکم بالجماعۃ فانہ من شدَّ شُدَّ فی النار جماعت سے لگے اور چپٹے رہو کہ جو اس سے علیحدہ ہوا وہ جہنم میں گیا۔

ایک بار میرا ہاتھ حضرت کے ہاتھ میں تھا ادھم ایک بازار میں جا رہے تھے میں حضرت سے اسی قسم کے کشفی سوالات کر رہا تھا اسی میں محو تھا کہ ایک شخص ملا جو صلاح کی طرف منسوب اور لوگوں کا پیر بننا ہوا تھا اس نے ہم سے ایک بات کہی جس میں بظاہر تو نصیحت تھی مگر فریہ سے معلوم ہو رہا تھا کہ مقصود کچھ اور یعنی طعن و اعتراض ہے اس کے بعد حضرت نے فرمایا کہ اس کا دُورا اللہ پناہ میں رکھے نیلگوں ہے ادب بارہا اس پر قیم کھائی اور یہ بھی فرمایا کہ مجھے پتہ نہیں اس کا دُورا تبدیل ہوگا (ادکسی وقت سفید ہو جائیگا) یا نہیں۔

نیز اپنے فرمایا کہ جب آدمی مر جاتا اس کا جسم (قبر میں) پھوٹنا پھٹنا شروع ہو جاتا ہے تو روح کا تعلق اس سے منقطع ہو جاتا ہے اور وہ عالم برزخ میں چلی جاتی ہے ہاں بعض ادبیا میں سر روح کا تعلق قبر کے ساتھ ایسا ہی قائم رہتا ہے جیسا زندگی میں فات کے ساتھ قائم تھا کہ اس کا نور ایمان ادھر قبر سے متصل رہتا اور وہاں سے اوپر کو چڑھتا ہوا ادھر برزخ میں روح سے جا ملتا ہے نیز فرمایا میں اکثر فاس کے مقابر اور گورستان پر نظر ڈالتا ہوں تو انوار کو زمین سے نکلتا اور بوئے برزخ ایسا چڑھتا ہوا پاتا ہوں جیسے بانس یا نیلگر زمین سے اُگ کر اوپر برزخ تک چلا جائے اس سے معلوم کر لیتا ہوں کہ یہ لوگ رحمن کی قبروں سے یہ نور برآمد ہو رہے ہیں، صلیحہ امداد ادبیا میں راسی طرح ہمارے آقا و مولانا سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف سے آپ کے نور ایمان کا ستون ممتد ہو کر اُس برزخی قبۃ تک جا پہنچا ہے جو کہ آپ کی روح مطہرہ کا مستقر ہے اور اس نور ممتد کے ستون کا طواف کرتے کے لئے ملائکہ کی جماعتیں آتی رہتی ہیں کہ وہ تبرکاً نور شریف کو مس کرتے اور رثوق دہم میں، اس پر ایسے گرتے ہیں جیسے شہید کی لکیر اپنے یعوب سلطان النخل نکلتے، پرگرا کرتی ہیں جب کوئی فرشتہ سیر الہی یا کسی امر کی برداشت سے عاجز آتا یا اس کو کسی قسم کی گرانی و ماندگی لاحق ہوتی یا کسی مقام پر رکاوٹ پیش آتی ہے، تو وہ فوراً نور شریف کی طرف لپکتا ہے اور از محمدی سے استفادہ کی نیت پر اس کا طواف کرتا ہے اور



ایسا کرنے سے اس کو قوت کاملہ نصیب ہوتی ہے اور وہ شاد کام دیا مراد اپنی جگہ واپس ہو جاتا ہے ایک گروہ طواف سے فارغ نہیں ہوتے پاتا کہ فرشتوں کا دوسرا گروہ آجاتا ہے اور ان میں کا ہر فرشتہ طواف میں بتایا نہ شوق کے ساتھ عجلت کرتا ہے (نہی) عجب نہیں بعض مشائخ کے کلام میں استفادہ روحانی کے لئے مزارات صلحاء کے طواف کا طریق اسی سے مستنبط ہوا ہو مگر جن علماء نے اسکو ممنوع قرار دیا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ طریق سجدہ آدم کی طرح شرعیّت ملائکہ میں جائز و مستحسن ہے مگر ہم شرعیّت محمدیہ کے مسئلہ نہ کہ شرعیّت ملائکہ کے کیا فرود ہے کہ نور روح محمدی سے استفادہ کا جو طریق ملائکہ کے لئے تجویز کیا گیا ہو وہی طریق بشر کے لئے بھی جائز ہو بلکہ جب تولاً یا فعلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تعلیم ثابت نہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ امت محمدیہ کے لئے یہ طریق استفادہ جائز ہی نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ سلفاً و خلفاً حضرات صحابہ و تابعین یا دیگر اولیاء کاملین حتیٰ کہ اقطاب و اغوات سے بھی عملاً اس طواف کا مزار سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی کہیں کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اصل مقیس علیہ وہی ہے چہ جائیکہ دیگر صلحاء امت محمدیہ دوئم ملائکہ کی تخلیق ارحام کی طرح خالص نور سے ہے اس لئے وہ اجلہ کاملین جن کو قدرت ہے کہ اپنی ارواح کو اجسام سے جدا اور ممتاز کر سکیں مثلاً اقطاب و اغوات جن کی ارواح ان کے اجسام کے ساتھ ساتھ جدا رکوع و سجدہ کر سکتی ہیں اگر وہ اپنی ارواح محضہ سے جنکو نور مجسم ہونیکے سبب خالص مشابہت ہے فرشتوں کے ساتھ، اس طریق استفادہ کو اختیار کریں تو ممکن ہے مفید ہو اور ان کو روحانیات میں فرشتوں کی طرح قوت کاملہ نصیب ہو کہ ان ہی کو صاحب مزار کا نور ایمان بصورت ستون نظر بھی آئے گا مگر جن کی ظلمت بشریہ نے اس ستون نور کو نظروں سے اوجھل کر رکھا ہے اور ان کی روح اپنے تریبی جسم کثیف میں محبوس ہے کہ اس کو چھوڑنے پر قادر نہیں وہ ملائکہ کی نقل اتار کر نفع نہیں اٹھا سکتے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ سبزہ پر نظر ڈالنے سے بصارت کو قوت پہنچا کرتی ہے اور یہ سنکر ایک بنیا اور تندرست شخص تو اپنی آنکھیں کھول کر بار بار سبز گھاس کو دیکھا کرے اور ایک دھتھی آنکھ والا شخص جس کی آنکھیں کھلی ہی نہیں حلقہ چشم میں چھپی ہوئی نگاہ کو سبزہ کا گشت کراتے لگے تو اس نقل سے کوئی فائدہ نہ ہوگا اور نہ یہ قانون کہ سبزہ مفرح و مقوی لبصر ہے اس کے لئے نافذ ہوگا کہ اس کی لبصر ہی محبوب ہے اور گشت کرنے والی شے نگاہ نہیں بلکہ گشت کا کثیف جرم ہے جو نورانی ڈھیلے پر چھایا ہوا ہے پس روحانی طواف کے استفادہ پر حسانی طواف کا استفادہ قیاس مع الفارق ہے۔ سوم یہ امت مرحومہ سید عالم و عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبہ ہے اور اس میں مطلوبیت کی شان آئی ہوئی ہے کہ شفقت محمدیہ سے ہر لمحہ مالا مال ہے ان کی طرف سے محبت خالصہ و عقیدت حقہ اور آپ کی تعلیم کردہ شرعیّت کا تسک و اتباع اس کے لئے کافی ہے کہ روحانیت محمدیہ



ان کی طرت متوجہ اور از خود اس کے انوار و تجلیات ان پر مبذول ہوں کہ ماں کی چھاتیوں سے دودھ کی بہریں جاری ہونے کے لئے بچہ کا اپنی جگہ بلبلا نا امد اسکی طرت ذرا ہاتھ پھیلانا بھی کافی ہے۔ چنانچہ خود حیات شریفہ میں جبکہ وہ نورِ مہر عام نظروں کے سامنے تھا آپ نے کسی کو اپنے طوات کا محتاج نہیں رکھا۔ اس لئے آج یہ کہنا کہ اب استفادہ روحانیت کا طریق آپ کے مزار کا طوات ہے گویا آپ کی حیات برزخیہ میں صنعتِ ثابیت کرنا ہے برخلات ملائکہ کے کہ ان کی شانِ طالبیہ ہے اور وہ اُمتِ محبوبہ میں شامل نہیں۔ حیات میں بھی ان کا طریق استفادہ یہی تھا جو اب ہے کہ آپ کے ستونِ نور ایمان کا طوات کیا کرتے تھے اور قوتِ ایمان و نورِ عمان میں ترقیات پایا کرتے تھے۔ لہذا اس قول کے مقابلہ میں کہ عامہ اہلِ کمال ہے اور نقل و حمل یعنی روایت و درایت ہر دو کے موافق ہے کسی شاذ قول کو دربابِ طوات روضہ مہرہ بھی حجت نہیں بنایا جا سکتا چہ جائیکہ دیگر ادبیاتِ اُمرت کے مزارات کا طوات زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مخصوص ہے اس کے لئے جو روح کو حیم سے فاصل کر کے اور فرشتہ کا شبیہ و مماثل بننے کی طاقت رکھتا ہو۔ واللہ اعلم۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ جب حق تعالیٰ نے چاہا کہ مجھے فتح نصیب فرمائے تو میں نے اپنے دطن، ناس ہی میں تھا کہ دفعہً حجابی پردے میرے سامنے سے اٹھا دئے گئے اور مجھے (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی) قبر شریف نظر آئی اسکے بعد میں نے آپ کے ایمان کامل و اکمل کے نور شریف کو دیکھا کہ وہ میری طرف قریب ہوتا چلا آ رہا ہے۔ حتیٰ کہ جب وہ میرے قریب آگیا تو اس میں سے ایک شخص نمودار ہوئے اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے یہ دیں ہے کہ روحِ محمدی اپنے غلامانِ آستانہ کی طرت خود متوجہ اور ایہ بنیاد کی طرح خود سروں پر آ کر بارش برسانے کو آمادہ ہے، طوات مزار کا محتاج نہیں رکھا، یہ واقعہ سنکر (میرے شیخ) حضرت عبداللہ برنادی نے فرمایا اے مولانا عبدالعزیز اللہ پاک نے تم کو اپنی رحمت یعنی سید الوجود صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمع فرمادیا لہذا اب مجھے تم پر شیاطین کے تلاعب کا اندیشہ نہیں رہا کہ وہ تم کو اپنا کھونا تو کیا بنائیں گے پاس بھی نہیں بچھک سکتے۔

نیز آپ نے فرمایا کہ برزخ کی شان بھی عجیب و غریب ہے وہ خود مومنین کے نور ایمان سے منور ہے اور ان کی اتنی روشنی لیتا ہے جس سے عقول حیران ہیں حتیٰ کہ سورج کی روشنی بھی امداح مومنین ہے کہ نور سے آئی ہے اور چاند و دیگر ستاروں میں جو روشنی آئی ہے وہ نورِ آفتاب سے آئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ برزخ کا حصہ زیریں دنلک چہارم سے نیچے جو کہ امداح کفار کا مستقر ہے وہ، وہ بالکل سیاہ اور تاریک ہے اور اس لئے اس کے مقابل جو سیارے واقع ہوئے ہیں ان میں روشنی نہیں ہے اور وہی حاکم امداح ہے کہ یہ سیارے امداح مومنین کی اصل روشنی سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اگر وہ اس سے منور ہوں تو ظاہر ہے کہ وہ نور امداح اس برزخی حصہ کو عبور کر کے ان تک آئے گا اور اس لئے، وہ برزخی حصہ بھی منور ہو جائے گا اور پھر کفار کی



رو میں (تبعاً) منتفع ہو جائیں گی ارواح مومنین سے جالانکہ مشیت الہیہ نہیں چاہتی کہ ارواح کفار کو ارواح مومنین سے کسی قسم کا بھی نفع ہو لہذا براہ راست ان کو نور نہ پہنچا دے) آفتاب کی روشنی سے ان کو منور کیا گیا۔

کیونکہ آفتاب برزخ سے باہر ہے اور یہ سیارے (چاند وغیرہ) اس کے مقابل پڑتے ہیں لہذا اس سے تواخذ کر لیتے اور روشن نظر آتے ہیں (یعنی اس سے بالانور لے لیتے ہیں برزخی تاریک حصہ کا کوئی دخل اور واسطہ نہیں پڑتا۔ اور چاند آسمان دنیا میں اس سمت پر واقع ہے جو ہمارے متصل ہے اس لئے اس کی روشنی جو برزخ سے ہٹی ہوئی ہے براہ راست سورج سے آئی ہے ہمارے سروں پر پڑتی اور پھر دنیا بھر میں پھیلتی ہے۔

غالباً یہی وجہ ہے چاند کے چھوٹے بڑے نظر آنے کی کہ تدریجاً ہلال سے ترقی پاتا ہوا شب چہارم کو بدر بن جاتا ہے اور پھر تدریجاً کم ہوتا ہوا ہلال بن کر دو تین شب کے لئے نفروں سے غائب ہو جاتا ہے کہ اس کے گول جسم کا جو حصہ برزخ کے سامنے گیا وہ تاریک ہو کر ہمیں نظر نہ آیا اور جتنے حصہ کا مقابلہ قائم رہا آفتاب سے وہ منور ہوا اور ہمیں نظر آیا اور رفتار سیارگان کے اعتبار سے اس مقابلہ کی ہر مہینہ یہی صورت رہتی ہے جو نظر آتی ہے بلکہ سورج گرہن کی بھی اگر یہی وجہ ہو تو عجیب نہیں کہ اپنی مقدار رفتار کے اعتبار سے چلتے چلتے جب اس کا کوئی حصہ اس برزخی حصہ کے مقابل آ پڑے گا جو ارواح کفار کی وجہ سے بے نور ہے تو یہ حائل بن جائے گا اور ارواح مومنین کا نور اس پر نہ پڑ سکے گا اور جتنا حصہ اس کے مقابل پڑے گا اسی مقدار وہ بے نور ہو جائے گا یعنی گہنہ جائے گا اور جتنا حصہ اس کا براہ راست برزخ کے بالائی حصہ کے مقابل رہے گا وہ روشن رہے گا غرض آفتاب کا براہ راست ارواح مومنین سے روشنی لینا اور مانتہاب کا براہ راست سورج سے روشنی لینا اس پر موقوف ہے کہ ان کا باہمی تقابل قائم رہے اور برزخ کا حصہ زیریں جو مستقر ارواح کفار اور مظلم و سیاہ ہے درمیان میں حائل نہ ہو جب اس کی حیلولیت واقع ہو جاتی ہے تو وہ بے نور بن جاتا ہے کیونکہ ذاتی نور کسی سیارہ یا ستارہ میں نہیں ہے جو بھی منور ہے وہ ارواح مومنین کے انوار سے منور ہے۔

گرہن کا یہ سبب عقلاً بھی قریب الی الفہم ہے بہ نسبت اس کے کہ زمین کی حیلولیت کو اس کا سبب بتایا جائے۔ اس لئے کہ باد جو دریکہ بندہ تے ریاضتی اور سہیت پڑھی ہے مگر اب تک نہیں سمجھ سکا کہ یہ زمین جس پر ہم آیا ہیں جگہ کھاتی ہوئی ہمارے اور سورج کے درمیان حائل ہو جائے اور ہم اس کی کردی سطح پر چلتے پھرتے بلکہ کسی انقلاب کے قائم ہیں۔ چہ جائیکہ مدزائے آفتاب و مانتہاب کے درمیان اس کی حیلولت ہوتی اور چاند کی روشنی سطح کو کم دیش بتاتی رہے ۱۲۔ میں نے عرض کیا کہ مجھ میں کا قول قویہ ہے کہ نجوم ثوابت رجنگو گردش نہیں ہوتی اور ایک جگہ قائم ہیں، وہ سب تلک ثابت یعنی آٹھویں آسمان پر ہیں فرمایا انہوں اسکی کیا خبر اور وہ آسمان ہشتم پر پہنچے کہاں جو اس کا پتہ لگا لائیں) میں نے کہا کیا سبب سیارہ کی رفتار کے اختلاف کی بنا پر انہوں نے



اس کو ثابت کیا ہے۔ فرمایا ان کا خیال بالکل غلط ہے ستارے سب کے سب اسی آسمان دنیا میں ہیں۔ اور ان کے منور یا تاریک ہونے کی وجہ یہی ہے کہ جو حصہ آفتاب کے مقابل پڑا وہ روشن ہوا اور جس میں آٹھ بڑی برزخی حصہ نہیں کی وہ تاریک رہ گیا اور یہیں نظر نہ آیا نیز اخذ نور میں بھی دخل ہے ہر ستارہ کے مادہ کی صفائی اور کدورت کو اور اس کے جرم کی بڑائی چھٹائی کو اس لئے جس میں جتنا اخذ اور مادہ جذب نور ہے اسی قدر وہ میں منور و روشن دکھائی دیتا ہے واللہ اعلم۔

## گیارہواں باب جنیوں کی ترتیب اور شمار

جنت الفردوس کے متعلق حضرت ممدوح نے فرمایا کہ جنتی بھی نعمتیں عالم دنیا کے اندر سننے میں آئی ہیں وہ سب، اور نیز جو نعمتیں یہاں کسی نے سنی بھی نہیں وہ سب، جنت الفردوس میں موجود ہیں اور اسی سے جنت کی نہریں جاری ہوتی ہیں کہ سب کو منع بھی جنت الفردوس ہے، اندھروں کے جاری ہونے کی کیفیت یہ ہے کہ پانی شہد، دودھ، شراب چلوں مشروبات ایک ہی نہر میں بہتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ مخلوط نہیں ہوتے۔ جیسے قوس قزح۔ دھنک اور آسمانی کمان کے رنگ مختلف نظر آتے ہیں کہ ایک دھاری سرخ ہے اور دوسری زرد اور تیسری نیلی اور چوتھی سبز۔ یہ سب رنگ کمان کی شکل میں انگ اور ممتاز ہیں اور ایک دوسرے سے مخلوط نہیں ہوتے، اسی طرح ایک نہر میں چاروں مشروبات جدا جدا ہیں اور ایک دوسرے سے آمیز نہیں ہوتے اور یہ مشروبات جنت میں مومن کی حسب خواہش جاری ہوں گے کہ جس کو چاروں چیزوں کی رغبت ہوگی اس کے لئے چاروں جاری ہوں گے اور اس کے پاس دے مومن کی رغبت اگر دو چیزوں کی ہوگی تو اس کے لئے صرف دو جاری ہوں گے اور دو ہمیشہ الہیہ بند ہو جائیں گی اور ان کے قریب والا تیسرا مومن اگر صرف ایک چیز کی خواہش کرے گا تو اس کے لئے تین بند ہو جائیں گے اور صرف ایک جاری ہوگی اور اگر کوئی جنتی چار سے زیادہ رکسی پانچویں چھٹی چیز کی بھی خواہش کرے گا تو اس کے لئے حسب خواہش زائد چیزوں کی نہریں باذن اللہ جاری ہو جائیں گی، عرض ادل سے آخر تک نہر کا جریان دیکھو گے (تو باوجودیکہ نہر ایک ہوگی مگر کسی جگہ چار چیزیں بہتی نظر آئیں گی۔ اور کسی جگہ دو چیزیں اور کسی جگہ ایک اور کسی جگہ پانچ حالانکہ ان کے درمیان نہ کوئی آٹھ ہوگی نہ صد حاصل۔

نیز آپ نے فرمایا کہ جنت کی نہریں دنیا کی نہروں کی طرح، کھدی ہوئی زمین میں نہ ہوں گی بلکہ بالا سطح محض قدرت حق پر ہوں گی۔ میں ایک مرتبہ آپ کے ساتھ باب الفتوح میں تھا اور عرض کیا کہ فلاں بزرگ فرمایا کرتے تھے میں نے جنت کا انگور ایک ہاتھ کے برابر دیکھا ہے۔ فرمایا اور میں نے تو باب الفتوح کی اس عید گاہ کی دیوار کے برابر دیکھا ہے جو قید رخ عرض میں واقع ہے اور ایک بار فرمایا کہ اس دیوار کے طول کی برابر اور اس سے چھوٹے اور بڑے (مختلف مقدار کے) دیکھے ہیں نیز آپ نے فرمایا کہ لوگوں بچتے ہیں کہ جنت الفردوس



تمام جنتوں سے اعلیٰ اور افضل ہے کہ کوئی جنت بھی اس کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتی۔ حالانکہ ایسا نہیں بلکہ وہاں ایک اور جنت ہے جو اس سے بھی افضل اور اعلیٰ ہے اور اس میں ان نعمتوں میں سے کوئی چیز بھی نہیں ہے (وہاں کی نعمت صرف مشاہدہ حق اور دیدار خداوندی ہے) اور اس میں بجز اہل مشاہدہ عارفین یعنی حضرات انبیاء علیہم السلام اور خواص اولیاء رضی اللہ عنہم کے اور کوئی نہ رہے گا۔

نیز آپ نے فرمایا کہ اہل مشاہدہ کے نزدیک حق تعالیٰ شانہ کا مشاہدہ ہر نعمت سے زیادہ افضل و اعلیٰ ہے اور ہر لذت سے زیادہ شیریں و لذیذ تر ہے (مگر محب ہی لذت دیدار محبوب کی قدر سمجھ سکتا ہے) اس جنت میں رہنے والوں کو (جہانی لذتوں والی) دوسری جنتوں میں جانا ایسا ہی ناپسند ہوگا جیسا عام جنتیوں کو علم دنیا کی طرف جانا ناپسند اور ناگوار ہوگا۔

نیز آپ نے فرمایا کہ جنت الفردوس میں رہنے والے اکثر جنتی ہمارے آقا سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہوں گے اور بجز تقریباً بیس اقسام اہل ظلم و مرتکبین کبار کے رکن وہ تو اس میں نہ جا سکیں گے۔ باقی سب مومنین امت محمدیہ اسی جنت میں جائیں گے (اور اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ اللہ سے جنت کا سوال کیا کرو تو بس جنت الفردوس کا کیا کرو گویا اس سوال کے ضمن میں یہ دعا بھی آگئی کہ حق تعالیٰ اس ظلم اور کبیرہ گناہ کے ارتکاب سے محفوظ رکھے جو اس جنت میں جاتے سے مانع ہے۔)

نیز آپ نے فرمایا کہ ہمارے آقا سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کے ساتھ بڑی محبت ہے آپ کو خواہش ہوگی کہ جنت میں آکر اپنی امت کو دیکھیں اور ان کے ساتھ رحمت سکون و اعانت کا ایسا برتاؤ فرمائیں گے جیسا قریبی رشتہ دار اپنے کنبہ اور خون کے تعلق والوں کے ساتھ کیا کرتا ہے اسی لئے حق تعالیٰ نے مشاہدہ والی جنت عالیہ اور ہر قسم کی نعمتوں والی جنت الفردوس دونوں کو آپ کے لئے جمع فرمایا اور دونوں کے وسط کا مجموعہ آپ کا مسکن تجویز فرمایا ہے تاکہ امت کی دونوں قسمیں گویا ہر وقت نظر کے سامنے رہیں اور ہر وقت ان کو دیکھ کر آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتی رہیں، ذات محمدی کے سوا اور کسی کو بھی حق تعالیٰ نے یہ شرف عطا نہیں فرمایا پس آپ اہل مشاہدہ اور غیر اہل مشاہدہ تمامی امت کے ساتھ صلہ رحمی کا برتاؤ فرمائیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ جنت غالباً وہ جنت عالیہ ہے جس کی طرف ابو سعید خدریؓ کی اس حدیث میں اشارہ ہوا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علیین والے حضرات دوسری جنت کی طرف جھانکیں گے تو جنتیوں کو ان کا منہ ایسا روشن نظر آئے گا جیسا اہل دنیا کو چودھویں رات کا چاند چمکتا نظر آتا ہے اور ابو بکرؓ و عمرؓ انہیں میں ہیں۔ نیز امام احمد اور امام ترمذی اور امام حبان نے حضرت ابو سعید خدریؓ سے اور طبرانی نے حضرت جابرؓ سے اور ابن عساکر نے حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ رضی اللہ عنہم سے روایت کی ہے کہ عالی درجات والوں کو



نیچے درجہ والے ایسا دکھیں گے جیسے تم اس ستارہ کو دیکھتے ہو جو افق فلک میں طلوع کرے اور ابوبکر رضہ و عمر رضہ انہیں میں ہیں حضرت ممدوح نے فرمایا کہ وہ دوسری جنت ہے اس کے بعد فرمایا کہ جنت علیین بھی جنت الفردوس سے اوپر ہے مگر اس کی جہت سے خارج ہے اور اس کی ہم سمت نہیں ہے اور یہ جنت رحمن کا نام جنت عالیہ ہے اور اہل مشاہدہ کے لئے مخصوص ہے، اس کے علاوہ دوسری جنت ہے میں نے کہا کیا یہ وہ جنت ہے جس کا نام دارالمرید ہے؟ فرمایا ہاں یہی ہے اس کا نام، اور اس میں بجز مشاہدہ جی سبائے کے اور کوئی نعمت نہیں ہے مگر اہل مشاہدہ کے لئے یہ لذت ہر نعمت سے زیادہ عزیز ترین ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جنت میں جنتی بھی نعمتیں ہوں گے ان سب کی لذتیں اس مشاہدہ میں موجود ہیں لہذا اس میں تمامی مافی الحیثہ مع شئی زائد پایا جاتا ہے۔ اور اس جنت والوں کی لذت (یعنی لذت دیدار حق) روحانی لذت ہے (جو اصل لذات ہے) اور دوسری جنتیوں والوں کی لذتیں صرف جسمانی لذتیں ہیں، اگرچہ وہ باقیہ ہیں فانیہ نہیں (مگر جسمانی لذت روحانی لذت میں داخل ہے اور ان کے علاوہ زیارۃ محبوب کی ایک خاص لذت محض روحانی ہے جو جسم کے کسی عضو سے تعلق نہیں رکھتی۔ نیز آپ نے فرمایا کہ جس کو ان قسموں (یعنی روحانی اور جسمانی لذتوں میں) کسی ایک قسم کی لذت حاصل ہوگی اس میں دوسری قسم کی لذت حاصل کرنے کی طاقت نہ ہوگی کہ ہر در لذتوں کو کوئی جمع نہیں کر سکتا۔ بجز ایک ذات یعنی سرور عالم و عالمیاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ کو لذت مشاہدہ بھی (روح شریف) اس درجہ پر حاصل ہوگی جسکی طاقت دوسرے میں نہیں اور ذات مقدسہ ان جسمانی نعمتوں سے بھی اتنی لذت پائے گی جو کوئی دوسرا نہیں پاسکتا۔ اور یہ لذت اس کو مانع نہ ہوگی، اور وہ لذت اس کو مانع نہ ہوگی۔ اور جنت علیین میں تو بیشمار نعمتیں ہیں اور جنت الفردوس میں نعمتوں کی انواع اس سے بھی زیادہ ہیں۔ مگر علیین کی نعمتیں رقیق اور دقیق زیادہ ہیں گویا حضرت ممدوح کا یہ مطلب تھا کہ جنت علیین چونکہ دارالمرید (یعنی جنت مشاہدہ دیدار حق) کے قریب ہے اس لئے اس کی نعمتوں کو مناسب ہے کہ منوی کہا جائے کیونکہ وہ حسنی نہیں ہیں نیز فرمایا کہ جنت علیین (بلجاوہ کیفیت افضل اور سب میں اعلیٰ اور شیریں تر ہے، اور جنت الفردوس (بلجاوہ کمیت افضل ہے) اور نعمتوں کی اقسام و انواع اس میں زیادہ اور کثیر در کثیر ہیں اس جنت میں حضرات انبیاء علیہم السلام کی ایک جماعت رہے گی اور سیدنا ابراہیم و سیدنا اسماعیل علیہما السلام بھی انہیں میں ہیں رحمن کا مکن و مقام علیین میں ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ ان احادیث کا کیا جواب ہوگا جن میں آیا ہے کہ سب میں اعلیٰ جنت الفردوس ہے چنانچہ بخاری میں ہے کہ حضرت تے ارشاد فرمایا سوال کیا کرو تو جنت الفردوس کا سوال کیا کرو کہ وہ وسط جنت ہے اور اعلیٰ جنت ہے بعض علماء نے وسط سے مراد عمدہ اور جید لیا ہے اور اعلیٰ سے مراد حقیقی مفہوم یعنی بلند تر اور افضل ترین۔ حضرت ممدوح نے فرمایا کہ ان تینوں جنتوں (یعنی علیین اور دارالمرید



اور حبت الفردوس کی شان ایسی ہے کہ تینوں کو ایک حبت کھدیا جائے اور مجموعہ کا نام حبت الفردوس رکھا جائے  
جب بھی مضائقہ نہیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قبہ شریف (جو آپ کا مسکن و مقام ہے) وہ تینوں پر محیط  
ہے اس لئے جو لوگ حبت الفردوس میں ہیں ان کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت حاصل ہے اور جو حضرات  
علیین میں ہیں وہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہیں اور جو حضرات دارالمزید میں ہیں وہ بھی آنحضرت صلی  
علیہ وسلم کی معیت میں ہیں۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام رفیع پر نظر کرتے ہوئے تینوں کو ایک کھدیا گیا بھی  
صحیح ہے اور اب اس کا اعلیٰ ہونا بلحاظ رفعت مقامی و باعتبار زیادہ درجات و لذات جہانی و روحانی ہر طرح  
محقق و ثابت ہو جائے گا، کیونکہ قبہ مطہرہ نے حبت الفردوس کا وسط اپنے دائرہ میں لے لیا ہے اور بنیاد  
علیین چل کر اس کو لیتا ہوا دارالمزید تک پہنچ گیا ہے اور اس کے وسط کو اپنے اندر لے لیا ہے میں نے  
پوچھا کیا باقی حبتوں میں بھی نعمتیں ہیں؟ فرمایا ہاں ان میں جانے والے حبتوں کے اعمال کی مقدار کے موافق  
کم و بیش، سب میں نعمتیں ہیں البتہ حبت الفردوس صرف امت محمدیہ کے لئے ہے یا ان مومنین کے  
لئے جنہوں نے نبی کی لعنت کے بغیر و ہدائی و مہی ہدایت کے ذریعہ خدا کو ایک سمجھا اور شرک چھوڑ کر  
توحید کو اختیار کیا ہے، میں نے عرض کیا جیسے قس بن ساعدہ اور زید بن عمرو بن نفیل؟ فرمایا کہ ان صاحبوں کے  
بارہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ارشاد فرمایا ہے؟ اس وقت تو مجھے جواب مستحضر نہ ہوا۔ مگر بعد میں علامہ  
ابن خلیل سیکی کے رسالہ شرح منظومۃ القبور میں یہ تصریح نظر آئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے  
دایمان اور نجات اخروی کے متعلق شہادت دی ہے اور فرمایا ہے کہ دونوں قیامت کے دن تنہا امت  
بنا کر اٹھائے جائیں گے۔ چنانچہ اس کے بعد حضرت ممدوح سے ملاقات ہوئی تو میں نے یہ حدیث اور علماء  
کا قول آپ پر پیش کیا تو فرمایا ہاں اسی مطلب کو میں اپنی زبان سے ادا کرنا چاہتا ہوں مگر اندیشہ ہوا لوگ  
کہیں گے کہ اہل جاہلیت کو بھی حبتی کہنے لگا اس لئے میں نے چاہا کہ معلوم کروں حضرات علمائے اس بارہ میں  
کیا فرمایا ہے نا لحد لکھ کر ان کا قول میری موافقت میں مل گیا وہ قس بن ساعدہ مکہ کے باشندہ تھے  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لعنت سے قبل فطری ہدایت سے بہرہ یاب ہوئے، شرک اور اپنے قومی مذہب  
بت پرستی سے بے زار ہو کر و ہدایت باری تعالیٰ کے قائل و معتقد ہوئے اور لعنت محمدیہ سے پہلے ہی  
استقبال فرما گئے۔ حضرت زید بن عمرو بن نفیل سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے چچا تھے۔ یہ بھی فطری  
ہدایت سے قومی مذہب کو چھوڑ کر توحید کے قائل ہوئے بتوں کے نام ذبح کئے ہوئے جانور کا گوشت  
بھی نہ کھاتے تھے لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کا عواج جو اشران عرب میں شائع تھا اس کو خصوصیت  
سے روکتے اور نوزائیدہ لڑکیوں کو یہ کہہ کر باپ سے لے لیا کرتے تھے کہ تم پر دوس کے بارے سے گھبراتے ہو تو



اس کی کفالت میرے ذمہ ہے، اور پھر خود اس کی پرورش کیا کرتے تھے جب بالغ ہو جاتی تو باپ کو اختیار دیا کرتے کہ دل چاہے اس کو لے جاؤ کہ تمہاری امانت ہے اور اب بھی اگر یارِ مونت گراں گذرے تو میں عمر بھر کفالت کے لئے حاضر ہوں۔ دین حق کی تلاش میں ملکوں ملکوں چکر بھی لگایا اور آخر احبارِ یہود و نصاریٰ سے یہ سنکر کہ بنی آخر الزمان کا وقت قریب آگیا ہے اور ان کا ظہور وہیں ہوگا جہاں سے تم آئے، ہو محبت تمام واپس مکہ ہوئے راستہ میں قبیلہ بنی لخم پر گذر ہوا تو انہوں نے ان کو قتل کر دیا۔ اس لئے کہ قوی مذہب چھوڑنے پر لوگ ان کے دشمن ہو گئے تھے یہ دونوں حضرات یا ان جیسے اور جنہوں نے قبل از بعثت توحید پر وفات پائی مثلاً ورقہ بن نوفل، چونکہ موجد تھے مگر زمانہ نبوت نہیں پایا اس لئے مستقل اُمت بن کر بروز قیامت اٹھیں گے۔ اس لئے کہ نہ کسی نبی کے تابع بنے کیونکہ زمانہ ہی نہ پایا اور نہ متبوع بنے اس لئے کہ خود نبی یا رسول نہ تھے مگر چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جویان اور شریعت حقہ اسلامیہ کے طالب و خواہاں تھے اس لئے بقول حضرت ممدوح ائمہ محمدیہ کیساتھ حنیت الفردوس میں جگہ پائیں گے واللہ اعلم۔

فرمایا کہ ان صاحبوں کا حنیت الفردوس میں جانا اس لئے ہوا کہ وہ اپنی کافر قوم کے درمیان رہتے ہوئے اللہ وحدہ لا شریک پر ایمان لائے اور یہ محض حق تعالیٰ کے لطفِ عظیم کی بدولت نصیب ہوا کہ اتنا بڑا نور ان کو عطا فرمایا جس کی وجہ سے کفار کی ظلمتوں کو چاک کر کے اپنے ہم جنس ہادی و راہبر کے بغیر از خود توحید خداوندی تک پہنچ گئے میں نے دریافت کیا کہ جنیتوں کی تعداد کیا ہے؟ فرمایا آٹھ میں نے کہا کہ پہلی حنیت کونسی ہے فرمایا دارالسلام اند اس کے بعد حنیت النعیم پھر اس کے بعد حنیت المادی پھر دارالخلد پھر حنیت عدن پھر حنیت الفردوس پھر حنیت علیین اور پھر دارالمزید جامع کتاب کہتے ہیں کہ علامہ سیوطی کی تصنیف البدور السافرة سے معلوم ہوتا ہے جنیتوں کی تعداد کے متعلق علماء کی کوئی تحریر محقق نہیں چنانچہ بعض حضرات نے ان کی تعداد چار بتائی ہے اور بعض نے سات، اور بعض نے کہا ہے کہ حنیت ایک ہی ہے اُمت ان کے حصوں کے اعتبار سے جدا جدا نام ہو گئے ہیں، مگر حضرت ممدوح کا ارشاد کہ حنیتیں آٹھ ہیں اُن حدیثوں کے زیادہ مناسب ہے جن میں تذکرہ ہے کہ فلاں عمل والے کے لئے آٹھوں دروازے حنیت کے کھول دیئے جائیں گے جس دروازے سے چاہے داخل ہوا پس دروازوں کا آٹھ ہونا قرینہ ہے کہ جنیتیں بھی آٹھ ہیں۔

نیز حضرت نے فرمایا کہ جنیتوں کی ترتیب یہ نہیں ہے جو عام لوگ سمجھے ہوئے ہیں کہ سب فوقانی جہت میں ہیں اور ایک حنیت دوسری حنیت کے اوپر ہے بلکہ ان کی ترتیب ایسی عجیب ہے کہ ہر چھ جانب سے آٹھ ہی نظر آتی ہیں۔ کوئی شخص ان کے نیچے سے آئے تب اُن کو آٹھ پائے گا اور دائیں جانب سے آئے تب آٹھ پائے گا اور بائیں جانب سے آئے تب آٹھ پائے گا اور سامنے سے یا پیچھے سے، یا اوپر سے، غرض جہر سے



آئے گا ان کی تعداد آٹھ پائے گا اور آخرت کا معاملہ دنیا کے مشابہ نہیں اس لئے یہاں یہ صورت نہیں ہو سکتی کہ کوئی شے آٹھ کی تعداد میں ہو اور ہر شے سمت سے وہ آٹھ ہی نظر آئے مگر دار آخرت میں ایسا ہی ہو گا پھر دوسری مرتبہ میں نے جنیتوں کی ترتیب اور کیفیت وضع آپ سے دریافت کی تو فرمایا کہ سطح زمین پر یا دیگر مخلوقات میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کو جنیت کے ساتھ مشابہت ہو بجز عالم برزخ کے کہ اس کو جنیت کے ساتھ کچھ مشابہت ہے مگر برزخ کو لوگوں نے دیکھا نہیں اس لئے کس چیز کی مثال دیکر سمجھا جلتے؟ میں نے کہا کہ اتنا حال تو برزخ کا احادیث سے سموع ہوا ہی ہے کہ اس کی شکل سنگ کی سی ہے اور وہ ایک بہت ہی بڑا عالم ہے جس کا گولائی کا دور آسمان و زمین کے فصل کی برابر ہے فرمایا ہاں اور اس میں ایسے سوراخ ہیں جیسے سمندر جھاگ میں ہوا کرتے ہیں اور ان سوراخوں میں رو میں رہتی ہیں پھر یہ سوراخ بھی اوپر ہی اوپر نہیں ہیں بلکہ نہایت گہرے ہیں اور اوپر کی طرح اندر تک سوراخ ہیں ایک ادنیٰ مثال کے درجہ میں یوں سمجھو کہ شہد کے چھتہ کے سوراخ گویا برزخی سوراخ ہیں پھر مثلاً بیس چھتے لے کر ایک کو دوسرے سے ملاؤ اور مجموعہ کو ایک شے سمجھو کہ اس کا مجموعہ کایرون اور اندرون سب گہرے سوراخوں سے بھرا ہوا ہو اور پھر فرض کرو کہ ان سوراخوں کے منہ پر موم کا پردہ پڑا ہوا ہو کہ اندر کا شہد نظر نہ آ سکے یہ محض سمجھانے کے جنبت کا کچھ نمونہ بنے گا کہ اس کی حقیقت اور وہ نفس الامری حالت و کیفیت تو یہاں سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی۔ اب اس مجموعہ کو سات حصوں میں تقسیم کرو۔ پس ایک فریق تو پہلے میں ہو چکا ہے سوراخ و وسعت اور راحت و زیبائش میں ساری دنیا اور اس جیسی دس دنیا کی برابر ہو اور دوسرا حصہ اس کا بھی اصنافاً مضافاً عقدہ ہوا اور تیسرا حصہ اس سے بھی اتنا زیادہ ہو جس کی مقدار کسی کے حد شمار میں نہیں آ سکتی اور چوتھا حصہ انسانی خیال سے بالا ہو کر اس کی لذتوں اور آنکھیں کھنڈی کرنے والی نعمتوں کا نہ کسی نفس کو علم ہے نہ کسی آنکھ نے کبھی دیکھیں نہ کسی کان نے کبھی سنیں اور اور نہ کسی تلب پر انکا تحیل کبھی گذرا اور اس کا پانچواں حصہ حصہ سوم کے مثل ہو اور چھٹا حصہ حصہ دوم کے مثل اور ساتواں حصہ حصہ اول کے مثل۔ پھر یہ نہ سمجھنا کہ حصہ اول میں رہنے والے سب کے سب حصہ دوم میں رہنے والوں سے ادنیٰ ہی درجہ کے ہوں گے۔ نہیں بلکہ اس جنبت کے بعض جنیتی دوسری جنبت کے بعض جنیتوں سے برتر اور افضل بھی ہوں گے اور ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ مومن کو جنبت کا اتنا حصہ عطا فرمائے گا جتنا دنیا میں اوپر کے رخ اس کے سر سے لے کر ساتواں آسمانوں کو طے کرنا ہوا، عرش تک ہے اور نیچے کے رخ پاؤں سے لے کر ساتواں زمینوں کو قطع کرنا ہوا، عرش تک ہے اور سمت راست تا عرش لحد سمت چپ تا عرض اور سامنے کے رخ تا عرش اور پشت کی جانب تا عرش اور یہ شخص جسکو ہر شے جہت تا عرش کی مفت اور وسیع جنبت عطا کی جائے گا سارے جنیتوں میں ادنیٰ درجہ کا جنیتی ہو گا۔ میں پھر کہتا ہوں



یہ نہ سمجھنا کہ مثال مذکور نے جنت کی پوری یا قریب قریب کیفیت بیان کر دی۔ حاشا دیکھا حقیقت جنت میں اور اس مثال میں کوئی مناسبت ہی نہیں ہے محض خفیف سا اشارہ کرنے کے لئے ہم نے اس کو ذکر کیا ہے کہ بالکل خاموش رہنے سے بہر حال کچھ بیان کر دینا اچھا ہے ورنہ جنت میں جانے والی مخلوق کا شمار انسانی طاقت سے باہر ہے کہ سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر تا یوم قیامت جتنے بھی انبیاء و رسول اور ان کی امتوں کے صحابہ و صالحین و مومنین دنیا میں آئے اور ایمان صحیح و سالم لے کر دنیا سے اٹھے خواہ اشیاء میں ہوئے یا یورپ میں اور افریقہ میں ہوئے یا امریکہ میں اور جزائر میں ہوئے یا غاروں میں، اور کوہستانوں میں ہوئے یا نیوں اور جنگلوں میں کسی قرن میں اور کسی ملک میں کیوں نہ ہوئے ہوں سب ہی جنت میں جائیں گے پھر نفس ایمان کے قوت و صنعت کے لحاظ سے حضرات انبیاء و اولیاء کا فرق مراتب، اور اعمال حسنت کے اعتبار سے عامہ مومنین کا اختلاف درجات ایسا بیش از بیش ہے کہ جس طرح ایک صورت اور ایک سیرت کے در آدمی ملنے مشکل ہیں اسی طرح اعمال کے اعتبار سے بھی دو مسلمانوں کا ایسا مساوی ہونا مشکل ہے جن میں کسی قسم کا کوئی فرق مطلق نہ ہو بنا بریں جتنے نفوس جنت کے باشندے ہوں گے اتنے ہی جنت میں درجات اور مراتب ہوں گے کہ ہر مومن کا جدا مرتبہ اور دوسروں سے بالکل ممتاز صلہ ہوگا جیب ادنیٰ سے ادنیٰ جنتی کا جس کے نیچے کوئی درجہ ایمان اور دخول جنت ہی کا نہیں ہے یہ صلہ ہے کہ ہر شش جہت سے عرش تک کی مقدار اس کو جنت کی سلطنت دی جائے گی تو اس سے بالا یہ بالا پیرا تا سید و ولد آدم صلی اللہ علیہ وسلم جس کے مافوق کوئی جنتی نہیں، ان سب کے جدا جدا مراتب مختلفہ کے اعتبار سے جنت کی مملکت اور اس سلطنت آخری کی وسعت کو تیس کر د اور دیکھو کہ جنت کتنا بڑا ملک اور غیر متناہی قدرت والے خدا کی کتنی عظیم الشان مخلوق ہے ایک وقت جو ہر انسان پر گزرا ہے وہ تھا کہ بطن مادر اس کا مسکن تھا اور وہی تنگ جگہ گویا اس کی دنیا تھی کہ نومہینہ اسی میں رہا سہا بیٹھا اور پھولا پھلا شکم مادر میں رہتے ہوئے اگر اس سے کوئی اس دنیا کی وسعت کا قصہ بیان کرتا جو اس وقت اس کی نظروں کے سامنے ہے تو اس کو یقین آنا مشکل تھا اسلئے کہ وہ اسکی نظروں نے اپنے مسکن رحم سے زیادہ وسعت والی کوئی چیز دیکھی اور نہ اس کا دماغ اس تنگ کوٹھری سے زاید چیز کا تخیل اپنے اندر لانے کی گنجائش رکھتا ہے مگر جب نویں مہینہ بطن مادر سے باہر نکل کر گھر کی کوٹھری میں آیا اور نظر اٹھا کر زمین سے بیکر چھت تک اور پھر چار سست اسکی چار دیواری پر نظر ڈالی تو اب عقل میں آیا کہ میرے علم حل کے مسکن کو تو اس وسیع کوٹھری سے کچھ بھی مناسبت نہیں کہ یہ اس جیسے صد ہا مسکن سے بھی زیادہ وسیع ہے پھر کوٹھری سے زیادہ وسیع چیز کا تخیل اسکو ناممکن معلوم ہوا۔ مگر جب چند روز بعد



گھر کے صحن میں نکلا تو معلوم ہوا کہ وہ بھی ایک تنگ کوٹھری تھی اس مکان میں تو اس جیسی بیس کوٹھریاں  
 نکل سکتی ہیں مگر پھر بھی اس کا تخمینہ محدود ہے اور وہ کہتا ہے کہ اس سے بڑی چیز کوئی ہو ہی نہیں سکتی مگر یہ  
 چلنے پھرنے کے قابل ہوا اور گھر سے باہر محلہ میں گشت لگایا تو سمجھا کہ میرے گھر کی کوئی حقیقت ہی نہیں ملے تراتا  
 بڑا ہے کہ اس جیسے صد ہا گھر اس میں آباد ہیں مگر اس کا تخمینہ تنگ ہے کہ اس سے زیادہ وسعت اس کے ذہن  
 میں نہیں ساتی اور کوئی سیاح اگر اس سے کہتا ہے کہ میاں رئیسوں کے پاس تو تمہارے محلہ کے چار طرف کی  
 مقدار اور اس کنارہ سے لے کر اس کنارہ تک کا دس بیس بلکہ سو گونہ جائیدادی حصہ موجود ہے تمہنے ابھی  
 دیکھا ہی کیا ہے تو اس کو یقین آنا مشکل ہے اور کہتا ہے کہ ہزار ہا رئیسوں کے پاس محلہ سے بڑا حصہ کہاں  
 سے آسکتا ہے لیکن جب شہر کے باواں اور شہر کی گلیاں گھومنے کا وقت آیا اور چار طرف فیصل شہر کا  
 چکر لگایا تو معلوم ہوا کہ میرے محلہ جیسے صد ہا محلہ تو اس احاطہ فیصل کے پیٹ میں پڑے ہوئے  
 ہیں۔ غرض اس کے بعد ضلع پھر کے دیہات و قصبات اور تحصیلات متعلقہ کا مشاہدہ ہوا اور  
 پھر کشنری پھر کا چپہ چپہ جھاننا اور پھر صوبہ پھر کا دورہ کیا اور پھر سارے ہندوستان کے ٹکڑے  
 ٹکڑے کی سیاحت کی اور پھر ایشیا پھر کا چکر لگایا جس میں ہندوستان کے رقبہ کا پچاس گونہ بر زمین  
 سایا ہوا ہے اور پھر اسی جیسے دیگر ممالک ارضیہ کی سیاحت کی اور سیاحت بھی وہ کہ پٹواری کے نقشہ  
 میں اور نقشہ نویس کی نظر میں کسی حصہ کا رہیجانا ممکن ہو مگر اس کی نظر سے بالشت برابر زمین بھی اوجھل نہ رہی ہو  
 اس تمامی مسافت اور وسعت پر بھی اہل ساحت کے نزدیک ایسی زمین کا ربع سکون یعنی صرف جو تقائی حصہ ہوا  
 ہے کہ تین حصے جس میں سمندر اور پانی ہے وہ ابھی باقی ہے اور وہ بھی محض تخمینہ ہے کیونکہ ان کو خود  
 اقرار ہے کہ کچھ دور چل کر اتنی خنکی ہے جس میں انسان زندہ نہیں رہ سکتا اس لئے اس کا رقبہ کہ وہ کہتا  
 وسیع و عریض ہے، ظاہر ہے کہ کوئی نہیں تباہا کا اور نہ تباہا کہتا ہے با ایں ہمہ اس کو بھی محسوب کر لو اور  
 بڑو بحر سیکی حقیقی و تخمینی چپائش کو جمع کر دو تب بھی وہ صرف زمین ہی کا سطحی رقبہ ہے اب اس کے لیکر  
 آسمان تک نظر اٹھاؤ اور دیکھو کہ کرۂ ارض ہر جانب سے تا تلک ادل بروئے وسعت کہتا بڑا عالم ہے۔ اس  
 سب کے مجموعہ کا نام عالم دنیا ہے جو تمام عوالم میں چھوٹا عالم ہے اور اس سے بے شمار گونہ بڑے  
 صد ہا عوالم حق تعالیٰ نے پیدا فرمائے ہیں جن کی بنا پر اس کا نام رب العالمین ہے اب انسان کے قبل از  
 ولادت عالم بطن مادر کو دیکھو اور پھر بعد از ولادت اس عالم دنیا کو دیکھو اور بتاؤ کہ اس میں اور دنیا میں  
 بلحاظ وسعت کیا مناسبت ہے؟ اور اس پر بھی غور کرو کہ شکم مادر میں رہنے کے وقت کیا یہ وسیع بڑو بحر  
 تمہاری عقل و ذہن میں سما سکتا تھا؟ اور اگر نہیں سما سکتا تو کیا تمہارے انکار کر دینے سے یا اس وقت



منہس کر یہ کہہ دینے سے کہ کیا افسانہ سنار ہے ہو مھلا آتنا بڑا ملک کہاں ہو سکتا ہے، کیا دنیا کا وجود ثابت و محقق نہ رہتا مدائقہ بہر حال واقعہ ہے وہ کسی کے اقرار و اعتقاد کا تابع نہیں رساری دنیا بھی اگر کسی حقیقت کا انکار کر دے تب بھی حقیقت بہر حال حقیقت ہے اور خوشے موجود و محقق ہے وہ بہر صورت موجود و محقق ہے اس لئے عالم حنیت اگرچہ دنیا میں رہتے ہوئے ہماری نظروں سے ایسا ہی اوجھل ہے جیسے یہ عالم دنیا ہمارے جنیں ہونے کے زمانے میں رحم مادر میں رہنے کے وقت ہماری نظروں سے اوجھل تھا مگر واقعہ ہے کہ وہ تمام عالم دنیا سے آتنا ہی بلکہ اس سے بھی بدرجہا بڑا ہے جتنا بطن مادر سے عالم دنیا بڑا ہے کریم دروں پھر بھی عالم دنیا ہی میں ہیں اس لئے باہم کچھ مناسبت رکھتے ہیں مگر وہ دار آخرت ہے جو دار دنیا سے بالکل مباحث ہے یہاں ہر چیز کا تعلق سیلاب سے ہے اور سیلاب کو ظہور قدرت اللہ کا واسطہ بنادیا گیا ہے مگر دار آخرت خالص منظر قدرت ہے اور وہاں جو شے بھی ہے اس کا ظہور بلا واسطہ محض قدرت الہیہ سے ہوا ہے اس لئے دنیا سے مہاسکھ گونہ بھی بڑی اور وہاں ان گنت مفار میں عظیم الشان ہے تب بھی متناہی ہے اور قدرت الہیہ غیر متناہیہ کے سامنے ایک معمولی مخلوق ہے لہذا ہمارے استعجاب یا کفار کے انکار کرنے سے اس کا تحقق محروم یا مشیت نہ ہوگا لاریب اور بے شک اس باب میں جو کچھ بھی آیا ہے سب حق ہے اور اس کی کیفیت اور وسعت جو کچھ بھی حضرات انبیاء و رسل نے بالخصوص صادق و صدوق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہے بالکل سچ اور صحیح اور واقعہ اور حقیقت ہے۔ ہمارے فکے تاریک متخیلہ میں اگرچہ نہ آئے مگر قدرت الہیہ کے بہر حال ماتحت ہے اس لئے اس کے ہونے میں بال برابر بھی شک نہیں ہے اسی کا نام ایمان بالغیب ہے جس کے بغیر مومن مومن نہیں۔

حضرت ممدوح نے فرمایا کہ حنیت میں تخت (جن کی شان شاہی تخت کی ہوگی اس نوعیت کے ہوں گے کہ ایک ہی تخت مختلف رنگوں پر نظر آئے گا ایک رنگ چاندی کا سا سفید، ایک خالص سونے کا سا سنہرا، ایک رنگ زرد کی طرح سبز، ایک رنگ سندھی ایک رنگ بزرگ یا قوت سرف و غرہ و غرہ غرض رنگ بے شمار ہوں گے مگر سب کی اصل ایک ہوگی جس میں نہ تدر ہوگا نہ اختلاف پھر صاحب تخت جتنی کو جس وقت سیراد تفریح کی خواہش ہوگی اور وہ تخت ہی پر ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا چاہیگا تو تخت اسکو وہاں سے جائے گا اور اگر وہ خود جانا چاہے گا تو تخت وہیں رہے گا اور خود وہاں پہنچ جائے گا نیز چھپوں سمت میں جس سمت بھی جانا چاہے گا بر غلات دنیا کے کہ یہاں بجز سامنے کی سمت کے اور کسی سمت نہیں چل سکتا۔ مگر حنیت میں آگے، پیچھے، دائیں و بائیں، اوپر، نیچے، جس جانب چاہے گا بے تکلف، چلے گا نیز ہر شش جانب اس کے ہمسایہ بھی ہوں گے اور بار وجود آتنا وسیع ملک ہونے کے تنہائی محسوس نہ ہوگی، بر غلات دنیا کے



کہ یہاں اکثر مکانات کی بالائی جانب اور تمامی مکانات کی نیچے کی سمت ہمایہ سے خالی ہوتی ہے کہ اوپر آسمان ہوتا ہے اور نیچے ٹھوس زمین نیز آپ نے فرمایا کہ حبت کی تمام نعمتیں اور پھل اور میوے سب بے نظر ہیں کہ دنیا کی کوئی نعمت یا میوہ اور پھل اس کی مشابہت نہیں رکھتا (یہاں کے پھلوں کو دینی پھلوں مثلاً انار انگور وغیرہ سے محض سمجھانے کے لئے تعبیر کر دیا ہے درنہ اگر ان کی نفس الامری حقیقت ابدان کے انوار کی مقدار پر اگر اصل لذت وہی ہے) ان کے نام لئے جائیں تو کوئی سمجھ ہی نہ سکے اور کوئی لفظ ان کی حقیقت پر دلالت نہ کر سکے یہ حق تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ علی سبیل التنزل ان کا تذکرہ ان ناموں سے زیادہ جن سے دنیا میں مانوس تھے اور عام بول چال میں وہ نام مشہور و معروف تھے تاکہ فی الجملہ ان کو سمجھ سکیں اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہم اپنے بچوں سے ان کی عقل و فہم اور ان کی صغر سنی و کسنی کا لحاظ رکھ کر ان سے باتیں کیا کرتے اور دینی کویت، گوشت کوشتی، پانی کو تم اور دودھ کو بوا کہا کرتے ہیں۔ پس ہم جس وقت مثلاً سنتے ہیں کہ حبت میں انگور ہوں گے تو فوراً ہمارا ذہن دنیا کے انگور کی طرف جاتا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا کے انگور کی طرح ہوں گے حالانکہ ان کی حقیقت یہ ہے کہ وہ سرتا پالذت کے ساتھ ساتھ مجسم نور ہیں اور اسی لئے بول زیر ازاد سنک و حقوک کا سبب نہیں بنتے اور نور بھی اتنا کہ اگر حبت اور دوس کا ایک دانہ انگور اس کے قریب والی حبت میں آجائے تو اس حبت والے اس کے نظارہ میں محو ہو کر اپنی حبت کی تمام نعمتوں کو بھول جائیسی اسی طرح اگر اس دوسری حبت کا دانہ انگور تیسری حبت میں اتر جائے تو یہاں کے حبتی اس میں محو ہو کر اپنی حبت کی تمام نعمتوں کو بھول جائیسی غرض ہر اعلیٰ حبت کا پھل نیچے کی حبت میں اترنے سے اس حبت والوں کا یہی حال ہو حتیٰ کہ جو حبت ہماری دنیا یعنی حبت ابلاک و حبت زمین کے قریب ہے اس کا ایک دانہ انگور اگر دانہ میں آجائے تو اس کے نور کی وجہ سے آفتاب و مانتہاب اور سیارے مانند چرخائیں کہ کسی میں نہ نور باقی رہے نہ روشنی نیز آپ نے فرمایا کہ حبتوں کی شمار کے موافق دروازہ ہائے حبت بھی آٹھ ہیں اور یہ دروازے حبتوں کے حبت میں جانے سے پہلے ہی پہلے ہوں گے۔ حبتوں میں پہلے جانے کے کوئی دروازہ بھی باقی نہ رہے گا میں نے عرض کیا شاید اس کی وجہ یہ ہوگی کہ دروازہ سے مقصود دخول و خروج ہوا کرتا ہے اور حبتی کے لئے خروج ہے نہیں کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا هُمْ بِمُخْرِجُونَ اہل حبت سے نکالے نہ جائیں گے، لہذا دخول حبت کے بعد پھر دروازہ کا کوئی فائدہ نہ رہا اس پر آپ نے سکوت فرمایا اور کچھ جواب نہ دیا اس سے میں سمجھا کہ اس میں کوئی دوسرا راز ہے جس کا ذکر کرنا آپ نے مناسب نہیں سمجھا اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ حبت کے ہر دروازے کے مقابل اُن آٹھ فرشتوں میں کا ایک فرشتہ ہے جو عرش خداوندی کو اٹھائے ہوئے ہیں میں نے پوچھا کہ اس میں کیا راز ہے؟



فرمایا کہ حالبین عرش آٹھویں فرشتوں کو اور آٹھویں جنوں کو حق تعالیٰ نے ہمارے آقا رسولی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نور مبارک سے پیدا فرمایا ہے کہ اہل نور محمدی کو آٹھ قسموں پر منقسم کیا اور ہر قسم کو ایک خاص کسٹر باطنی کے ساتھ مخصوص فرمایا پھر ایک قسم سے ایک فرشتہ اور جنت پیدا فرمائی کہ دروزوں میں یا اعتبار اصل اور بلحاظ کسٹر باطنی تناسب ہوا۔ اور دوسری قسم سے دوسری جنت اور دوسرا فرشتہ پیدا فرمایا کہ ان دروزوں میں یا ہم مناسبت ہوئی علیٰ ہذا القیاس آٹھوں قسموں سے آٹھ فرشتے (جو عرش کے حامل قرار پائے) اور آٹھ جنیں پیدا فرمائیں کہ ہر جنیت کے مقابل وہ فرشتہ رہا جسے اس کے ساتھ مناسبت اور شائبہ تھی اور اس فرشتہ کو اسی جنیت کے نور سے سیراب کیا جاتا اور روحانی غذا پہنچائی جاتی، ہے میں نے عرض کیا کہ توبہ کا دروازہ جو آفتاب کے سمت مغرب طلوع کرنے سے قبل تک کھلا رہے گا کیا وہ بھی جنیت کا دروازہ ہے جیسا کہ بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے چنانچہ ابو یعلیٰ طبرانی اور ابن ابی الدنیاء نے حضرت عید اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ جنیت کے آٹھ دروازہ ہیں جن میں سات بند ہیں اور ایک دروازہ توبہ کے لئے کھلا ہوا ہے حتیٰ کہ آفتاب اسی سے طلوع کرتا ہے اور جب وہ بند ہو جائے گا تو آفتاب کا طلوع مغرب کی جانب سے ہوگا) حضرت محدوح نے اس کی تائید کرتے ہوئے یہ مطلب بیان فرمایا کہ نور ایمان بھی گویا جنیت ہے منجملہ جنیتوں کے، بلکہ جنیتوں میں جنیتی بھی نہایت ہیں سب کا سبب یہی نور ایمان ہے بلکہ خور جنیتوں کا سبب بھی درحقیقت یہی نور ایمان ہے کہ ہر خیر و سعادت کا سبب اصلی یہی ہے اور چونکہ توبہ اس کا دروازہ ہے کہ ہر کافر و مشرک توبہ ہی کے ذریعہ ایمان میں داخل ہوتا ہے، اس لئے بایں لحاظ توبہ گویا جنیت کا دروازہ ہے نیز جنیت میں داخل ہونے والا جس طرح ذاتی جنیت اور میل کچیل کی پستی کی حالت یعنی ظلمت معاصی سے بلند حالت یعنی توبہ و طاعت کے نور کی طرت منتقل ہوتا ہے اس اعتبار سے توبہ کو جنیت کا دروازہ کہہ دیا گیا ہے اور جانب مغرب سے آفتاب طلوع کرنے پر اس دروازہ کے بند ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ زمین سے اندر زمین میں جو مخلوقات آباد ہے اس سے نور حق اُٹھ جائے گا اور نور حق کا اُٹھ جانا ہی مراد ہے امر اللہ سے جو اس حدیث میں آیا ہے لا تنزل طائفۃ من امتی ظاہرین علی الحق حتی یأتی امر اللہ میری امت کا ایک گروہ حق پر قائم اور سب پر غالب رہے گا یہاں تک کہ امر الہی آئے۔

اور حکیم خداوندی نور حق دنیا سے اُٹھ جاتے۔ یعنی قیامت آجائے، اس گروہ امت سے مراد اہل دائرہ و عدد نیز وہ راویا و امت، ہیں جنہوں نے اس نور سے (حسب استعداد) اپنا حصہ



لیا ہے کہ یہی حضرات اس نور کے حامل ہیں اور انہیں کی وجہ سے نور ایمان زمین پر باقی ہے۔ پس جب حق تعالیٰ اس نور کو زمین سے اٹھانا چاہے گا تو ان حضرات کو دنات دیکر دنیا سے اٹھائے گا اور ان میں کوئی باقی نہ رہے گا پس نور حق اٹھ جائے گا کیونکہ اس کا اٹھانے والا کوئی باقی نہ رہا اس کے بعد ایک اور مضمون بیان فرمایا جو منجملہ اسرار کے ایک ستر الہی تھا اور اس کا بیان کرنا مناسب نہیں ہے۔

میں نے حضرت ممدوح سے دریافت کیا اس کی کیا وجہ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے سے حبت وسیع ہوتی ہے اور تسبیح و تہلیل وغیرہ دیگر اذکار سے وسیع نہیں ہوتی؟ فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ حبت کی اصل (اور وہ مادہ جس سے اس کی تخلیق ہوتی ہے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا نور مظہر ہے۔ اس لئے وہ آپ کی طرف ایسا جھکتا ہے جیسا بچہ اپنے باپ کی طرف جھکتا ہے اور حبت کا ذکر مبارک سننے سے تو مستبج ہو کر اس کی طرف (ایسی) پرواز کرتی ہے جیسے بیابا پرند دریا کی طرف لپکتا ہے) کیونکہ وہ سیراب ہی نور محمدی سے کی جاتی ہے اس کی مثال ایسی سمجھو جیسے چوہا یہ اپنی خوراک اور چارہ کا مشتاق ہوتا ہے پس فرض کرو کہ وہ حد سے زیادہ بھوکا ہو اور اس کے سامنے جو کی گٹھری لائی جائے تو جس وقت بھی اس کی بو اس کی ناک میں جائے گی وہ اس کے قریب آئے گا اور جب گٹھری کو اس سے مدد کر دے گا وہ اس کے پیچھے پیچھے جائے گا اور جب تک پہنچ نہ لے گا برابر اس کا تعاقب کرتا رہے گا بس یہی حال اُن ملائکہ کا ہے جو حبت کے چار طرف اور اس کے دروازوں پر موجود ہیں کہ وہ ہر وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر اور صلوٰۃ و سلام میں مشغول رہتے ہیں لہذا حبت (اپنی غذا یعنی) ذکر محمدی کی طرف جھکتی اور خاک زمین کی طرف چلتی ہے اور چونکہ ذکر کرنے والے ترشتے حبت کی ہر جانب ہیں اس لئے وہ تمام جوانب سے وسیع ہوتی اور بڑھتی چلی جاتی ہے نیز آپ نے فرمایا کہ اگر حق تعالیٰ نہ روکتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں حبت عالم دنیا کی طرف نکل پڑتی اور جہاں آپ جاتے وہاں وہ بھی جاتی اور جہاں آپ رات گزارتے وہاں وہ بھی رات گزارتی اور شب و روز میں ایک لمحہ کے لئے آپ سے جدا نہ ہوتی) مگر حق تعالیٰ نے آپ کی طرف نکلنے سے اس کو روک دیا تھا تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان بالعبیہ حاصل ہو یعنی حبت پر ایمان لانا اور اس کا یقین کرنا آنکھوں سے دیکھنے کا بنا پر نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ہو کیونکہ ہر شے پر ایمان وہی معتبر ہے جو بامثال محمدی ہو۔

نیز آپ نے فرمایا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حبت میں تشریف لے جائیں گے اور نیز آپ کی امت اس میں ہوگی تو حبت کو بے حد فرح و سرور حاصل ہوگا اور وہ بہت زیادہ وسیع ہو جائے گی اور جب دیگر انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتیں اس میں داخل ہوں گی تو اس میں انقباض پیدا ہوگا۔ وہ حضرات اس کی شکایت کریں گے اور وجہ پوچھیں گے تو حبت کہے گی کہ تم میں تمہاری ہوں اور نہ تم میرے ہو حتیٰ کہ بواسطہ حضرات انبیاء



علیہم السلام کے انہ کی امتوں کو درد پہنچے گی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرت سے، اور اُس وقت حنت اُن پر وسیع ہوگی جسے شفاعتہ کبریٰ کے وقت حیطہ رح شان محمدی کی رفعت و جلالت کا ظہور ہوگا کہ تمام مخلوق پریشان ہوگی اور یکے بعد دیگرے اجلہ انبیاء علیہم السلام کے پاس حاضر ہوگی کہ بارگاہِ اہدیت میں شفاعت فرمائیں گے مگر سب حضرات انکار اور عذر فرمائیں گے آج ہماری ہمت نہیں کہ کچھ عرض کر سکیں۔ اور سب کے اخیر ساری مخلوق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر استدعا کرے گی تو آپ اٹھیں گے اور مقام محمود میں بسرِ سجود ہو کر سفارش فرمائیں گے اسی طرح اس کا ظہور کہ حنت کی تخلیق نور محمدی سے ہوئی، اور اسی ذاتِ بابرکات کا دخول اس کی توسیع اور فرج و سرور کا سبب حقیقی ہے بایں صورت کیا جائے گا تا کہ سب کو مشاہدہ ہو جائے کہ آپ کے استمداد و استفاہتہ کے بغیر حنت میں داخلہ اور حصولِ راحت قطعاً ناممکن ہے اور یہی راز ہے آپ کے خاتم النبیین اور بعثتِ عامہ کا کہ آپ پر ایمان لانا تمام انبیاء اور ان کی تمام امتوں یعنی ہر بشر پر ضروری ہے اسی کی صورت مثالیہ یہ ہے کہ نور محمدی سے استفاہتہ و استمداد کے بغیر حضراتِ انبیاء علیہم السلام کی امتوں پر بھی حنت بایں وسعت ننگ ہو جائے گی نیز حدیث میں آیا ہے کہ حنت کا بند دروازہ کھلوانے والے صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے کہ رضوانِ حنت آپ کے قبل کسی کے لئے بھی اس کا دروازہ نہ کھولیں گے۔

میں نے حضرت ممدوح سے عرض کیا اکثر علماء کا مشہور قول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو شخص بھی درد پڑھے گا وہ یقیناً مقبول ہے اس کے بارہ میں حضرت کی کیا رائے ہے؟ فرمایا اس میں تو شک و شبہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درد پڑنا تمام اعمال سے افضل و برتر ہے کہ حنت کے چار طرف جتنے بھی فرشتے ہیں سب کا ذکر و شغل یہی درد ہے اور دردِ شریف ہی کی برکت ہے کہ ملائکہ چاروں طرف سے مبتلا درد پڑھتے رہتے ہیں اسی قدر حنت کی وسعت میں اضافہ ہوتا ہے اور ملائکہ اطراف حنت کو چونکہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس کی توسیع میں رکاوٹ پیش نہیں آتی۔ کیونکہ ملائکہ درد پڑھتے ہوئے رہ رہ جابجہ میں آگے بڑھتے جاتے ہیں اور حنت (ہر سمت بڑھتی ہوئی، ان کے پیچھے چلتی رہتی ہے۔ اور جب تک کہ ملائکہ دردِ شریف کو چھوڑ کر دوسرے ذکر یعنی تسبیح کی طرف منتقل نہ ہوں گے اس وقت تک حنت بھی توسیع سے نہ رکے گی۔

اور ملائکہ درد سے تسبیح کی طرف اس وقت منتقل ہوں گے جبکہ حق سبحانہ تعالیٰ حنت میں اہل حنت کے لئے تجلی فرمائے گا کہ اس تجلی کا مشاہدہ کرتے ہی ملائکہ اس کی تسبیح شروع کر دیں گے اور اب ان کا ذکر بجائے دردِ شریف کے سبحن اللہ سبحن اللہ ہو جائے گا۔ پس ان کے تسبیح شروع



کرتے ہی جنت اپنی جگہ ٹھہر جائے گی اور اہل جنت کے لئے ان کے منازل مقامات قائم و مستقیم ہو جائیں گے اگر ملائکہ اپنی پیدائش ہی کے وقت سے تسبیح میں مشغول ہو جاتے اور درود شریف نہ پڑھتے، تو جنت میں کچھ بھی اضافہ نہ ہوتا یہ اضافہ رکہ ارنی جنتی کو دس سال دنیا کی برابر ملک وسیع عطا ہوگا صرف درود شریف ہی کی برکت سے حاصل ہوا ہے رحیم کا اظہار آیۃ شریفہ اِنَّ اللّٰهَ وَرَحْمَتَهُ لَکِبْرٌ لِّیَصْلُوْنَ عَلٰی الْبَنٰی مِّنْ کِیَا کِبٰیا ہے، مگر یہ بات کہ درود پڑھنے کی قبولیت یقینی ہے صرف اُس شخص کے لئے ہے جس کی ذات رنجاست مٹا ہے (پاک اور جس کا قلب (اخلاقی گندگیوں سے) صاف ہو کہ۔ کیونکہ درود شریف جب ایسے پاک صاف شخص کی زبان سے نکلے گا تو تمامی عیوب و نقائص مثلاً ریاء عجب وغیرہ سے سالم و محفوظ نکلے گا ورنہ ہر شخص کے لئے یہ حکم نہیں کیونکہ) عیوب بکثرت ہیں اور ہر طبیعت اور ہر قلب کا ان سے محفوظ رہنا ناممکن ہے البتہ ذات طاہرہ اور قلب طاہر میں رجوع اللہ والوں کو نصیب ہوتی ہے ان عیوب میں سے کوئی عیب نہیں ہوتا۔ اور ان کا درود پڑھنا خالص محبت اور سچی اطاعت اور مخلصانہ شوق میں ہوتا ہے لہذا اس کی مقبولیت بے شک یقینی اور قطعی ہے اور یہی مطلب ہے اُن احادیث کا جن میں آیا ہے مَتَّ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ کہ جس نے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہہ لیا وہ یقیناً جنتی ہو گیا۔ یعنی بشرطیکہ یہ کہنے والا (عیوب سے) پاک صاف قلب رکھتا ہو۔ کیونکہ اس صورت میں وہ رسطوت الہیہ کی شان علو کا ملاحظہ کرتا ہوگا) اخلاص کے کیسا کھ اس کلمہ طیبہ کو کہے گا اور پھر ناممکن ہے کہ اس کے کسی حکم کے امتثال یا نہی سے اجتناب میں فروگزاشت ہو۔ لہذا اس شبہ کی گنجائش ہی نہیں کہ اس حدیث کی رو سے کلمہ طیبہ پڑھ لینا دخول جنت کے لئے کافی ہے۔ اعمال کی ضرورت نہیں، مگر باوجود اس کے جب میں حق تعالیٰ شانہ کی شانہ نشانہ سطور اور بے نیازی دشان تفتیب اور اس امر پر نظر کرتا ہوں کہ بندہ کا قلب اس کی دو انگلیوں کے درمیان ہے کہ جس وقت اور جس طرح چاہے ان پلٹا دیدے تو کھرا اٹھتا ہوں اور اطمینان نہیں کر سکتا کہ جس قلب کو ہم نے بے عیب اور اس کے درود کو قطعی مقبول سمجھا ہے وہ درحقیقت اور عند اللہ بے عیب ہے بھی یا ہم نے اپنے خیال میں اس کو مخلص اور عیوب سے سالم سمجھ لیا ہے۔ اس لئے کہ اس کے قبضہ میں ہے وہ کسی عمل بد کو نظر میں مزین فرمادے اور انسان اپنے آپ کو پہلی حالت سے بہتر حالت میں سمجھنے لگے (حالانکہ وہ بہتر حالت نہیں بلکہ بدتر ہے) اس بنا پر کہتا ہوں کہ لَا یَاْمَنُ مَکْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُونَ۔

اللہ کی تدبیر اور شان عملی سے وہی بے خطر ہو سکتا ہے جس کے لئے دنیا و آخرت ہر دو عالم کا خسارہ مقدور ہوا ہے اور اس لئے کسی کو بھی مطمئن نہ ہونا چاہئے۔ کہ میرا درود پڑھنا یقیناً مقبول ہو گیا ہے۔ دیگر اعمال کی طرح اس کو اللہ کے کرم پر چھوڑنا چاہیے واللہ اعلم۔



جامع کتاب لکھتے ہیں کہ ہر شخص کے درود شریف پڑھنے کی مقبولیت کا یہ سوال حضرت علامہ مولانا محمد بن یوسف سنوسی قدس سرہ سے بھی کیا گیا تھا اور انہوں نے اس کے دو جواب دئے تھے۔ مگر دونوں درحقیقت عقلی احتمال کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور اس باب میں جب کوئی شرعی نص نہ ہو عقلی احتمال و تامل قبول نہیں۔ اس قول پر اشکال یہ ہے کہ درود کی مقبولیت اگر قطعی مانا جائے تو درود پڑھنے والے کا حسن خاتمہ اور جنتی ہونا قطعی ہوا جاتا ہے، حالانکہ کسی کی خاتمہ کا حال کسی کو معلوم نہیں اس لئے یہ حکم کیسے لگایا جاسکتا ہے کہ جو کوئی بھی درود شریف پڑھے گا اس کا خاتمہ ایمان پر یقیناً ہوگا، حضرت علامہ سنوسی نے ایک جواب تو یہ دیا ہے کہ درود شریف کے یقیناً مقبول ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے لئے حق تعالیٰ نے حسن خاتمہ مقدر فرمایا ہے اس کے نامہ اعمال میں جو درود شریف ہوگا وہ ضرور اور بے شک و شبہ قبول شدہ درج ملے گا۔ بر خلاف دیگر اعمال کے کہ باوجود جنتی اور مومن ہونے کے بھی دثوق نہیں کہ سب مقبول ہی درج کئے گئے ہوں ممکن ہے کوئی طاعت مقبول ہو اور کوئی غیر مقبول، مگر یہ فرق چونکہ کسی دلیل شرعی سے ثابت نہیں اس لئے جواب محض عقلی احتمال ہے۔ دوسرا جواب یہ دیا ہے کہ درود شریف کے قطعی مقبول ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بشرطیکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے تقاضے سے پڑھا گیا ہو۔ اور قیاس کیا ہے ابو طالب کے واقعہ پر کہ ان کو چونکہ (چچا ہونے کی وجہ سے اور نیز کفیل تربیت ہونے کے سبب) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت تھی اس لئے (باوجود کفر پر مرنے کے) آخرت میں ان کو سب سے ہلکا عذاب دیا جائے گا (جیسا کہ حدیث میں وارد ہے)، اور اگر یہ محبت نہ ہوتی تو (دیگر کفار کی طرح) جہنم کے طبقہ زیریں میں داخل کئے جاتے نیز ابولہب پر دو شبہ کے دن عذاب میں تخفیف ہو جاتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دو شبہ کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریف ہوئی اور جس باندی نے آپ کی ولادت شریف کا مژدہ ابولہب کو سنایا اس کو ابولہب نے اس خوشی میں آزاد کر دیا تھا۔ نیز ابولہب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک میں چُسنے کے لئے اپنا انگوٹھا دیا تھا جب کافروں کو طبعی محبت کی وجہ سے (حالانکہ غیر اختیاری ہے) اور لوجہ اللہ نہیں بلکہ محض خون کے تعلق کی وجہ سے ہوتی ہے، تخفیف عذاب کا نفع پہونچا تو کیا پوچھنا مومن کی محبت کا اور بتقاضاء محبت آپ پر درود شریف پڑھنے کا کہ اس کا نافع اور مقبول ہونا تو اظہر من الشمس ہے مگر اس جواب پر یہ اعتراض ہے کہ کلام اللہ و کلام الرسول کی نصوص کثیرہ اس پر دلالت کر رہی ہے کہ کافر کے امتیازی اعمال (کتنے ہی صورت حسنہ اور نیک کیوں نہ ہوں، حبیط اور بے کار ہیں۔ کیونکہ ایمان کے بغیر کوئی عمل بھی مقبول نہیں ہے اور اس بنا پر ابولہب اور ابو طالب کی یہ محبت بھی ناقابل اعتبار ہے، مگر ان پر عذاب کی تخفیف چونکہ نص (اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد) سے ثابت ہوتی ہے۔



اس لئے ان کو مستثنیٰ کر لیا گیا۔ اور یہ مسئلہ اصولی ہے اور طے شدہ ہے کہ جو حکم خود خلافت قیاس ثابت ہوتا ہے اس پر دوسرے کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ درود نہ لازم آئے گا کہ اور کسی کا نہ کو بھی اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ طبعاً محبت ہو، یا وہ بحالت کفر درود پڑھے مگر ایمان نہ لائے، تو چاہیے کہ وہ بھی جنتی ہو جائے یا کم از کم آخرت میں عذاب اس پر ملکا ہو جائے حالانکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں، علاوہ ازیں (خود یہ حدیث ہی پایا ثبوت کو نہیں پہنچتی جس سے درود شریف کی یقینی قبولیت ثابت کی جاتی ہے۔ چنانچہ علامہ سیوطی نے درود منتوثہ میں لکھا ہے کہ حدیث عن حضرت علیؓ اعمال اُمتی فوجہد منھا المقبول والمراد بالاصلاۃ علیؓ کی مجھے سند نہیں ملی۔ اسی طرح یہ حدیث کُلُّ الاعمال فیہا المقبول والمراد بالاصلاۃ علیؓ فانھا مقبولة بخیر من درود کے تمام اعمال میں کوئی عمل مقبول ہوتا ہے اور کوئی عمل مردود۔ مجھ پر درود پڑھنے کے کہ وہ بہر حال مقبول ہوتا ہے کبھی نامقبول نہیں ہوتا۔ علامہ ابن حجر کہتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور بعض محدثین نے لکھا ہے کہ درود کے رد نہ ہونے کا مضمون کلام الرسول نہیں ہے بلکہ ابوسلیمان دارانی کا قول ہے اور احیاء العلوم میں اس کو مرفوع حدیث بیان کر کے لکھا ہے کہ ہمارے شیخ یعنی مولانا ابوالخیر شمس الدین محمد بن عبدالرحمان سخاوی مولف مقاصد حسنہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس کی سند نہیں ملتی اور میرے نزدیک یہ قول حضرت ابودرداء کا ہے نہ کہ ارشاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بہر حال ان تمام اقوال سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ درود شریف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑھنے پر قطعاً کوئی یقیناً قبولیت مرتب ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے البتہ دیگر اعمال کی بہ نسبت اس کی قبولیت زیادہ متوقع ہے اور جن اعمال کی قبولیت پر ظن غالب کیا جاسکتا ہے ان میں درود شریف کا نمبر پہلا ہے واللہ اعلم فی بندہ ناچیز کے ذہن میں یہ آرہا ہے کہ درود شریف دعا ہے حق تعالیٰ سے کہ رحمت کاملہ نازل فرما آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اور خود حق تعالیٰ کا ارشاد قرآن مجید میں اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلَیْكَ اَیُّہَا الرَّسُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ ذُو الْحُرْمِیْنَ اس کا اظہار فرما رہا ہے کہ حق تعالیٰ سبحانہ ہمہ وقت آپ پر رحمت کاملہ نازل فرماتا رہتا ہے اور اللہ کے معصوم و مقبول بندے یعنی آسمان وزمین کے فرشتے ہمہ وقت ذات محمدی پر نزول رحمت کاملہ کی دعا مانگتے رہتے ہیں پس کسی بندہ کے آپ پر درود پڑھنے کی مقبولیت کے دو مفہوم ہیں ایک یہ کہ اس کی درخواست دوبارہ نزول رحمت پر سیدنا محمدؐ مقبول ہو اور درود نہ کی جائے۔ سونپا ہر ہے کہ جب ہمہ وقت حق تعالیٰ کی طرف سے آپ پر نزول رحمت ہو رہا ہے تو یہ دعا دعا واقعہ کے موافق اور مقبول ہوئی مردود نہ ہوئی۔ بالخصوص جبکہ وقت میں بھی موافقت کھا رہی ہے ملائکہ کی دعا سے جب دیگر دعاؤں کا یہ حال ہے کہ ملائکہ اس پر آمین کہیں تو وہ مقبول ہوتی ہے یعنی درخواست منظور ہوتی ہے تو یہ تو درخواست ہی ایسی

۱: مجھ پر میری امت کے اعمال پیش کئے گئے ہیں ان میں سے بعض اعمال کو اہل اور بعض اعمال کو ناقابل مجز مجھ پر درود پڑھنے کے کہ وہ مقبول ہی تھا نامقبول نہ تھا



چیز کی ہے جس کی مداومت حق تعالیٰ نے تجویز فرمائی ہے پس اس دعا کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی دعا مانگے یا اللہ اپنی ذات کا قدم قائم رکھ، حضرات انبیاء کو معصوم بنائے رکھ۔ اہل جنت کو جنت میں داخل فرما، جن کو ایمان پر مرنا نصیب ہوا انہیں دوزخ سے محفوظ رکھ وغیرہ وغیرہ کہ واقعہ مقدرہ و تجویز کردہ الہی کے موافق دعا ہے لہذا اس کے رد اور نامقبول ہونے کے کوئی معنی ہی نہیں۔ اس کو نامقبول اس وقت کہا جائے جبکہ حق تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول رحمت کو بند فرمائے اور وہ خلافت مفہوم آیت شریفہ ہے لہذا درود کی قبولیت بایں معنی یقینی قطعاً ہوئی کہ جس شے کی یہ درخواست کر رہا ہے وہ اس کو مل رہی ہے یعنی نزول رحمت ذات محمدی پر ہو رہا ہے اور جاری ہے احادیث یا آثار میں جہاں بھی یہ مضمون آیا ہے میرے نزدیک اس کا محل یہی ہے۔ البتہ دوسرا مفہوم قبولیت کا یہ ہے کہ درود پڑھنے والے کو اجر و ثواب ملے، اور ایک بار درود پڑھنے کے صلے میں اس پر دس رحمتیں حق تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوں۔ سو یہ دیگر اعمال کی طرح بے شک نیت اور اخلاص پر موقوف ہے کہ خود کلمہ طیبہ بھی اگر اخلاص سے نہ پڑھا جائے جیسا کہ منافقین کا کلمہ پڑھنا تھا تو وہ بھی مقبول نہیں چہ جائیکہ درود شریف جو منجملہ اعمال حسنہ کے ایک عمل ہے اور یہ اسی آیت شریفہ کا جزو ہے یا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا صَلُّوا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوا تَلٰمًا پس نماز روزہ اور دیگر اعمال کی طرح یہ بھی ایک امر خداوندی ہے جس کی تعمیل مومنین پر فرض و واجب کی گئی ہے جب نفس ایمان کی قبولیت مشروط ہے اخلاص کے ساتھ تو اعمال بدرجہ اولیٰ مشروط ہیں، اخلاص کے ساتھ۔ پس بایں اعتبار جیسے کلمہ طیبہ اور ایمان کسی کا مقبول ہے کسی کا مردود، اسی طرح درود شریف پڑھنا بھی کسی کا مقبول ہے کہ اجر ملے گا اور اس پر دس رحمتوں کا نزول ہوگا اور کسی کا مردود ہے کہ کوئی صلہ دین میں اس کو نہ ملے گا۔ اگرچہ جو درخواست تھی کہ رحمت کاملہ نازل ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ مقبول ہوئی۔ اس کی مثال عکس کے درجہ میں ایسی ہے جیسے ابو جہل نے دعا مانگی اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ فَامْطِرْ عَلٰیْنَا حِجَابًا مِّنَ السَّمَاءِ اَوْ اَلْعَنَّا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ۔ بارالہا اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم بنی برحق ہیں تو ہم پر آسمان سے پتھر برسائے یا اور کوئی دردناک عذاب نازل فرما ظاہر ہے کہ اس اعتبار سے کافر کی یہ دعا مقبول ہوئی کہ واقعہ کے مطابق ہوئی۔ درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم برحق تھے اور آپ کے دشمنوں پر عذاب آنا مقدر تھا۔ اس کی قبولیت قطعاً یقینی تھی اور اس کے رد ہونے کا احتمال ہی نہ تھا مگر بایں معنی یہ دعا نامقبول تھی۔ کہ دعا کنندہ کو نفع نہ پہنچا اور جس نیت سے اس نے دعا مانگی تھی وہ پوری نہ ہوئی لہذا ابو جہل مستجاب الدعاء نہ ہوا اور وہاں دعاء الکفرین اَلَا نِیْ صِلَالٌ بِاَمَوْعٍ رَّہَا کہ کافر کی دعا قبول نہیں ہوا کرتی۔ یعنی اس کی خواہش کے موافق مراد اس کو نہیں ملا کرتی۔ واللہ اعلم۔



نیز حضرت ممدوح نے جنتوں کے لباس کے متعلق فرمایا کہ نہ وہ (بوسیدہ اور پھٹ پھٹا کر) فٹا ہوں گے اور نہ میلے کچیلے ہو کر، پھینکے جائیں گے اور ایک ساعت کے اندر جنتی ستر ہزار کی مقدار لباس پہنے گا۔  
 میں نے دریافت کیا کہ جب لباس اتارے اور بدے نہ جائیں گے تو اتنے لباسوں کا جنتی پر بوجھ ہوگا جو موجب کلفت ہے) فرمایا کہ سب لباس مجسم انوار ہوں گے اور نور کا ثقل نہیں ہو کرتا۔ پس انوار آئیں گے اور جائیں گے اور جتنے لباس جس رنگ کے بھی یہ چاہے گا وہ بدن پر چکیں گے اور زیب تن ہوں گے۔  
 نیز آپ نے فرمایا کہ جنتی کی نظر جنت میں کسی حد پر کبھی رُکے گی نہیں کیونکہ جنت میں اللہ کی نعمتیں غیر محدود ہوں گی پس جب جنتی کی نظر ایک نعمت پر پڑے گی تو یہ نہ ہوگا کہ وہیں رُک جائے بلکہ اس کا مشاہدہ ہوتے ہی فوراً اسکو دوسری نعمت نظر آئے گی اور پھر اس پر بھی نہ رُکے گی فوراً ہی اس کو تیسری اور چوتھی نعمت نظر آئے گی وغیرہ  
 وغیرہ اور ہر نظر پر ایک جُدا لذت پائے گا کیونکہ نعمتیں جو نظر آئیں گی وہ سب مختلف قسم کی ہوں گی۔ اس کی مثال ایسی سمجھو مثلاً ایک قد آدم شیشہ پر تمہاری نظر پڑے جس میں ازسرتا پاتہارا وجود نظر آوے تو تم کو تعجب ہوگا اور تمہاری نظر اس پر رُک رہ جائے گی پھر اگر دوسرا آئینہ اسی جیسا نظر آوے تو تعجب نہ ہوگا لیکن اگر اس کے خلاف دوسری حالت پر نظر آوے تو اب تم کو پھر تعجب ہوگا جیسا پہلے آئینہ کو دیکھ کر ہوا تھا۔ اور اب نظر اس پر منتقل ہو جائے گی اسی طرح یکے بعد دیگرے نئی شکل اور نئی وضع کے جتنے آئینے نظر آتے رہیں گے تو تعجب پر تعجب ہوتا اور نگاہ برابر منتقل ہوتی رہے گی اور جنت میں بوجھ کبھی نظر آئے گا وہ پہلے نرالی شان کا ہوگا اس لئے کسی ایک پر نظر کے رُک جانے کی صورت ہی نہ ہوگی نیز آپ نے فرمایا کہ ہاں اس میں اولیاء کا اختلاف ہوا ہے کہ مثلاً دوسری نعمت سے نظر ہٹا کر اگر پہلی نعمت کو دوبارہ دیکھیں گے تو اس کو پہلی ہی حالت پر پائیں گے یا نہیں (یعنی وہ شکل سابق پر بدستور قائم رہے گی یا نظر کی تجدید کے ساتھ جدت قبول کرے گی اور نئی وضع پر دکھائی دے گی۔ واللہ اعلم۔

ایک مرتبہ حضرت ممدوح نے اٹنا کلام میں فرمایا کہ جنت میں بعض اہل جنت کو حزن و غم اور حسرت و افسوس بھی پیش آئے گا ایک عالم دہاں بیٹھے تھے انہوں نے ٹوکا اور کہا کہ تحسّر ایک روحانی کلفت ہے اور اس کا وقوع جنت میں نہ ہوگا میں نے اُن سے کہا کہ انکار نہ کرو۔ مجھے پانچ برس سے اس کا تجربہ ہے کہ حضرت ممدوح نے جو بھی ارشاد فرمایا اس کی تائید نصوص میں خصوصی یا عمومی ضرور ملی ہے اس وقت مجھے کوئی نص مستحضر نہ ہوئی جو میں پیش کر دیتا۔ کیونکہ سفر کی حالت تھی مگر حضرت ممدوح نے فرمایا مولوی صاحب اس کا انکار کیوں فرماتے ہیں۔ اہل جنت جب جنت میں داخل ہوں گے تو حدوثنا کا نور اُن کی زبانوں پر جاری ہوگا جیسا کہ آیت شریفہ میں مذکور ہے وَخَرَجُوا مِنْهَا فِي سُرُورٍ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ اور الْحَمْدُ لِلّٰہِ



الَّذِي هَدَانَا لِهَذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللَّهُ ط یعنی اہل جنت کہیں گے اللہ کا شکر ہے۔  
 اور وہی حمد کا مستحق ہے جس نے ہمیں اس جنت کا راستہ دکھایا اور ہم کو یہ راستہ کبھی نظر نہ آتا اگر اللہ ہمیں نہ دکھاتا  
 اور یہ نور اس مقدار پر ہوگا جتنی ان کو دنیا میں اپنے رب کی معرفت حاصل تھی رکہ جتنی کسی کو معرفت زیادہ  
 نصیب تھی اسی قدر وہ حدوثنا کا نور زیادہ پائے گا۔ پس جب وہ جنت میں جائیں گے اور جتنی ان کو دنیا  
 میں اللہ کی معرفت حاصل ہوتی تھی اس سے بدرجہا زائد حق تعالیٰ کی معرفت ان کو حاصل ہوگی  
 تو اول سے لے کر آخر تک سب ہی جنتی اپنے پروردگار کی حمد اور اس کی خدمت و اطاعت میں اپنی کوتاہی و کمی  
 پر نادم ہوں گے (اور افسوس کریں گے کہ ہائے رب متعال کا کچھ بھی حق ادا نہ کیا، پس یہ صورت آخرت میں  
 ضرور ہونے والی ہے اور اس میں نہ شک ہے نہ شبہ (پھر حسرت کا انکار کرنے کی کیا وجہ) نیز آپ نے فرمایا  
 کہ ایک صورت ایسی ہی اظہار تحسّر کی خاص زنا کرنے والی جماعت کے لئے اور بھی پیش آئے گی وہ یہ کہ  
 جب یہ لوگ سزا پا کر یا معافی ملنے پر جنت میں داخل ہوں گے تو حق تعالیٰ شانہ ان پر تجلی فرمائے گا اور اپنے  
 دیدار سے عام جنتیوں کے ضمن میں ان کو بھی مشرف فرمائے گا اس وقت جب ان کو علم ہوگا کہ ہم کس دنی  
 اور رفیل حالت میں تھے، اور ذات حق کس درجہ جلالت و عظمت اور کیرمائی و سطوت والی ہے اور  
 باوجود اس شان قہر و غلبہ کے کتنی وسیع رحمت رکھتی ہے رکہ ہماری اس کمینہ حرکت کو بھی نظر انداز فرمادیا،  
 تو نادم و شیمان ہوں گے اور شرم کے مارے بے ہوش ہو جائیں گے اور مدت کے بعد ہوش آئے گا اس وقت  
 جن کو حق تعالیٰ نے معصیت زنا سے محفوظ رکھا تھا وہ ان کی ندامت و غشی دیکھ کر اللہ کا شکر کریں گے اور  
 ایک دوسرے سے کہیں گے کہ اس وقت حق تعالیٰ نے ہمیں اپنی تمام نعمتوں سے نوازا اور اس شرم و ندامت سے بھی  
 بچائے رکھا، پھر جب ان کو ہوش آئے گا تو حق تعالیٰ کی طرف سے ان کو ایک ایسی قوت اور کمال معرفت  
 عطا کی جائے گی جن کی کیفیت ناقابل بیان ہے تاکہ دوبارہ اس غشی و ندامت کی تکلیف میں مبتلا نہ ہوں  
 اس سے حضرت ممدوح نے جنت میں حسرت و ندامت ہونے کا استدلال فرمایا نیز اور بھی نصوص ہیں جن  
 اس کا ثبوت ہوتا ہے مثلاً علامہ جلال الدین سیوطی نے بدو معارف میں باب ہی متفقہ کیا ہے۔  
 ترک ذکر پر اہل جنت کا اظہار حسرت اور پھر طرانی و بیہوشی سے حضرت معاذ بن جبل کی یہ روایت نقل کی ہے  
 کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اہل جنت کو حسرت صرف اُس گزشتہ وقت پر ہوگی جو ان پر دنیا کے  
 اندر ایسی حالت میں گذرا کہ انہوں نے اللہ کو یاد نہیں کیا۔ اور احمد اور ترمذی اور ابن حبان اور حاکم نے  
 حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو قوم کسی جگہ بیٹھی اور وہاں نہ  
 ذکر اللہ کیا اور نہ نبی پر درود پڑھا وہ نشست بروز قیامت ان کے لئے حسرت کا سبب بنے گی کہ ہائے افسوس



وقت کو برباد کیا، اگرچہ وہ لصلہ اعمال جنت میں داخل ہو گئے اور بیہقی و ابن ابی الدنیا نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ساعت کسی ابن آدم پر اس حالت میں گزری کہ اس نے اللہ کو خوبی کے ساتھ یاد نہیں کیا وہ قیامت کے دن اس کے لئے ضرور حسرت بن کر رہے گی نیز لباس اہل جنت کے باب میں طیبی اور نسائی و ابن حبان اور حاکم نے حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت کی ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس نے (مرد ہو کر) دنیا میں رشیم پہنا (اور توبہ نہ کی) وہ آخرت میں رشیم نہ پہنے گا اگرچہ جنت میں چلا جائے تمام اہل جنت کو رشیمی لباس نصیب ہوگا مگر اسکو نصیب نہ ہوگا اور دوسری جگہ شیخین یعنی بخاری و مسلم سے بروایت ابن عمرؓ نقل کیا ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس نے دنیا میں شراب پی اور توبہ نہ کی وہ آخرت میں اس سے محروم رکھا جائے گا اور ظاہر ہے کہ رشیمی لباس اور حمر ظہور سے دوسروں کو متمتع اور اپنے آپکو محروم دیکھ کر حسرت ہوگی کہ دنیا و فانی میں اس کا استعمال کیوں کیا تھا کہ آج جنت باقیہ میں اس سے محروم رہے، واللہ اعلم۔

نیز حضرت نے فرمایا کہ عامر مومنین جنت میں نعمتوں کے متعلق عقلیں دوڑائیں گے اور سوچ سوچ کر اپنے دلوں میں طرح طرح کی نعمتوں کے خیال لائیں گے (اور وہ سب فوراً موجود پائیں گے تو جنت اور اس کی مہیا شدہ نعمتوں پر بہت مسرور اور فرحان ہوں گے مگر ولی کا فکر و خیال غیر اللہ سے بے تعلق ہوگا۔ اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ غیر اللہ یعنی جنت یا نعمائے جنت کی طرف، ان کا خیال تو متوجہ ہوگا مگر وہ اس سے اپنا خیال ہٹا لینگے بلکہ مراد یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کی عقول میں ماسوی اللہ کا فکر و خیال پیدا ہی نہیں کیا اور نہ کبھی پیدا فرمائے گا اس لئے ان میں اللہ کے سوا کسی طرف توجہ کرنے کا مادہ ہی نہیں حضرت ممدوح کا یہ کلام بندہ کو اپنے مولیٰ کی طرف متوجہ دیکھو کرنے اور اس کو بلند ہمت و عالی حوصلہ بنانے کے کھتا کہ نعمت میں مشغول ہو کر ولی النعمۃ کو نہ بھولے۔ بلکہ ضروری ہے کہ اپنے منعم میں مشغول ہو، اسی کی طرف لپکے اسی کے سامنے جھکے، اور اسی کے حضور گرہ گڑائے کہ بندہ مومن کو یہی شایان ہے۔ رہا نعمت کا قصہ سو اس کی طرف توجہ و خیال صرف اپنے رب کے ساتھ اظہار محبت کی خاطر ہو کہ آپکی عطا کردہ ہے اس لئے تبعاً یہ بھی ہمیں پیاری ہے، اور اس اقرار کے لئے ہو کہ یہ حق سبحانہ کی طرف سے ہے پس نعمت کو محض اس نظر سے دیکھے اور اس سے قبل اپنے منعم و خالق جل جلالہ کے ساتھ رہے حتیٰ کہ فرض کر دے نعمت ہوتی ہے نہیں یا اب معدوم و منقود ہو جائے تو قلب پرستور اپنے آقا کے ساتھ والیتہ اور بحر توحید میں مستغرق اور اس کے اکرار الوہیت میں غرق رہے۔ کہ نعمت کا وجود اور عدم کوئی حال بھی منعم سے غافل نہ بنا سکے اور



اسی بنا پر حضرت نے یہ فرمایا کہ ولی کو جب اپنے مولیٰ تعالیٰ شانہ کے متعلق اپنی مراد مل جاتی ہے تو پھر اُسے  
 پرفا نہیں ہوتی کہ حق تعالیٰ اسے کہاں رکھتا اور کس محل میں اتارتا ہے اور اس کے بعد تمثیل بیان فرمائی  
 کہ جیسے شہد کا کیرا جو از سر تا پا بتمام اجزائے شہد کھانے کا عاشق ہو، اگر اسے شہد کے منکے میں ڈال دیا جائے  
 کہ اس کو اپنے مطلوب سے اتصال نصیب ہو جائے اور تمام رات و تمام دن وہ اس کے کھانے میں لگا  
 رہے تو پھر اس شہد کے منکے کو جس میں کیرا پڑا ہوا ہے چاہے اس سے برے منکے میں بھی ڈال دو جو  
 رال سے لبریز ہو تو کیرے کو اس کی کچھ پروا نہ ہوگی اور اس کے قلب پر شہد کے سوانہ کوئی خیال گذرے گا اور  
 نہ رال یا کسی دوسری شے کی بو سے اس پر کوئی تکرر لاحق ہوگا کیونکہ اس کی ذات بالکل شہد میں فنا و غرق ہے  
 اور اس کے سوا ہر چیز سے بے تعلق ہے اس لئے رال کی طرف اس کا دھیان بھی نہ جائے گا چہ جائے کہ اس تکرر  
 یا گرانی پیش آئے۔

## ربار ہواں باب، جہنم کا بیان

حضرت ممدوح نے فرمایا کہ دوزخیوں کو وہ درخت اور نہریں جو اُن کے قریب ہوں گی نظر نہ آئیں گی، بلکہ جن کا  
 فاصلہ ساتوں زمین کی مقدار بعید ہوگا وہ نظر آئیں گی تاکہ ان کے عذاب پر عذاب کا اضافہ ہو۔  
 نص: مطلب یہ ہے کہ جہنم میں مختلف قسم کے درخت بھی ہوں گے مگر مجسم عذاب اور سرتا پا آگ کہ پتے اور  
 شاخیں اور چھال اور پھل غرض اس کا ہر جزو اور ہر حصہ عذاب ہی عذاب ہوگا۔ اسی طرح پانی بہتی ہوئی  
 نہریں نظر آئیں گی مگر وہ بھی مجسم عذاب کہ کھولتا ہوا پانی ہوگا جو حلق سے لے کر معدہ تک کو تھپس دے گا  
 اہل جہنم کو یہ آگ کے درخت اور آگ کی نہریں پکس والی تو نظر نہ آئیں گی البتہ دور والی نظر آئیں گی اور دور  
 بھی اتنی جتنی ساتوں زمین کی مسافت ہے اور یہ بھی اس لئے کہ گو یہ درخت اور نہریں مجسم عذاب ہیں  
 مگر صورت ان کی پھل دار سبز درختوں اور شیریں و خشک آب جاری کی ہوگی جو کسی درجہ میں تسلی بخش اور  
 سہارا دینے والی ہو سکتی ہیں اس لئے یہ سہارا بھی ان کو نصیب نہ ہوگا اور سبز منظر بھی ان کو بعید از بعید  
 مسافت پر نظر آئے گا جیسے مسافر کو دور کا پڑاؤ اگر پکس نظر آوے تو سہارا بندھ کر بدن میں طاقت آ جاتی ہے  
 اور اگر پکس کا پڑاؤ دور نظر آوے تو رہی سہی بہت بھی پست ہو کر ایک ایک قدم گویا ایک ایک میل بن جاتا ہے  
 پھر یہ دوسرا عذاب ہوگا کہ جب وہ پکس کی بے تابی میں نہر کی طرف چلیں گے اور بھوک کی تڑپ میں پھلدار  
 درخت کی جانب لپکیں گے تو یہ مسافت طویلہ جس کو محض سہارا نہ ملنے کی وجہ سے دور دراز دکھایا گیا تھا  
 بحکم خدا صرف تین قدم میں طے ہوگا (تاکہ اب اس عذاب میں دیر نہ ہو جو اس کے پھل کھانے اور نہر کا پانی پینے  
 سے ان بد نصیبوں کو پڑنا ہے غرض من تحیل کے سہارے کی راحت بھی نصیب ہوگی اور واقعہ عذاب میں بھی تاخیر نہ ہوگی ہر دو حالتوں سے محروم ہونگے



حضرت مدوح نے فرمایا اہل جہنم کو مسافت بعیدہ مذکورہ پر درختوں کی سی صورتیں نظر آئیں گی جن میں پھل لگے ہوئے اور سبز پتے پھیلے ہوئے ہوں گے وہ (بتیابانہ) ان کی طرف لپکیں گے تاکہ اس کے پھل کھا کر اور ہرے درخت کے پاس پہنچ کر بھوک اور تپش و سوزش کی، جس تکلیف میں مبتلا ہیں اس کو دور کریں چنانچہ اتنی لمبی مسافت کو جلد از جلد پہنچنے کے لئے تقریباً تین قدم میں طے کریں گے اور اس کے پھل اور پتے لے کر بجلت تمام اپنے منہ میں ڈال لیں گے اور جہنم ہو یا جنت اس میں یہ خاصیت ہے کہ اس کی جو چیز بھی انسان اپنے منہ میں ڈال لیگا اس کو باہر نہ نکال سکے گا جنت کا پھل اس لئے کہ بیکار لذیذ ہے اور اگلتا اس چیز کا ہوتا ہے جو خلافت طبع بدمزہ ہو اور جہنم کا پھل اس لئے کہ وہ عذاب ہے اور اگلتا عذاب کا رفع ہوتا ہے جو ان کے نصیب میں نہیں۔ لہذا اکھایا ہوا تلخ پھل اگل نہ سکے گا برخلافت دنیا کے کہ یہاں منہ میں ڈالی ہوئی چیز کا اگلتا اور تلخ یا بدمزہ اور ناگوار معلوم ہو تو منہ سے باہر نکال دینا انسان کے اختیار اور طاقت میں داخل ہے پس جب اس پتے یا پھل کو منہ میں ڈالیں گے تو پہلے سے بھی زیادہ عذاب و تکلیف میں پڑ جائیں گے اور اب اٹھ پادوں رٹیں گے تو سابق مسافت بعیدہ کو تقریباً ڈیڑھ قدم میں قطع کریں گے کیونکہ آگ لگی ہوئی ہوگی اور اس کی حرارت و بدحواسی رفتار کو دو چند بنا دے گی واللہ اعلم۔

نیز آپ نے فرمایا کہ دوزخ کا آگ دنیا کی آگ کی طرح لپٹ اور شعلوں والی آگ ہوگی کیونکہ شعلہ والی آگ سے انسان کچھ تڑپا نہ مانوس ہو جاتا ہے چنانچہ مستورات روٹی پکانے کی خوگر ہوتی ہیں تو شعلہ میں ہاتھ دینے سے ڈرتی نہیں اسی طرح باورچی تنور کے بھڑکتے ہوئے شعلہ میں ہاتھ ڈال دیتا اور بے تکلف روٹی اس میں جاتا اور اس سے نکالتا ہے پس اگر جہنم کی آگ میں بھی شعلے ہوں تو جہنمی شروع شروع تو اس کی تکلیف پائیں مگر کچھ مدت بعد اس سے مانوس ہو جائیں اور اب تکلیف تکلیف نہ رہے حالانکہ جہنم ہر لمحہ اضافہ عذاب کا مقام ہے نہ کہ تخفیف عذاب کا اس لئے نار جہنم کی کیفیت یہ ہے کہ وہ خالص ظلمت اور اندھیر ہے اگر اس میں سے ایک چھوڑا کی مقدار لے کر ہوا میں اس کا جرم منتشر کر دیا جائے حتیٰ کہ ساری دنیا کی ہوا میں وہ ایسا پھیل جائے جیسے دھواں تو اس وقت اس میں چمک اور شعلہ نمودار ہوگا مثلاً ایک گولی کو شریں سمندر میں گھول دیا اور وہ سارے پانی کو ایلوے کی طرح کرٹوا بنا دے تو اس گولی کی تلخی کھٹکا ٹھکانا ہوگا اسی طرح جس آگ کا کھجور برابر حصہ ساری ہوا میں دھوئیں کی طرح پھیل کر سارے جزیرے کو شعلہ نار بنا دے اس کھجور برابر اصل آتش کا کیا ٹھکانہ ہے نیز آپ نے فرمایا کہ اگر مثلاً اس کنارہ سے لے کر اس کنارہ تک ساری دنیا کو آگ سے برباد کر دیں اور پھر ذہن کرو جس طرح میلوں میں بھیلی ہوئی گھاس کو مشین کے ذریعہ چھینچ کر چھوٹی سی گٹھری بنا لے جاتی ہے اسی طرح اس آگ کو بھیجیں اور انتہائی شدت سے اس کو مجتمع کریں حتیٰ کہ وہ بھیج بھجھا کر ایک صندوق کی برابر



ظن میں سما جائے تو اب اس میں شعلہ لپٹ کچھ نظر نہ آئے گا بلکہ وہ محض سیاہ اور خالص اندھیر ہوگا کہ شعلہ و لپٹ تو صرف پھیلاؤ کی وجہ سے تھا کہ آگ بھٹی کم اور اس کا طرف یعنی خلا تھا وسیع اس لئے تھا کہ پھیل کر ملے ہو گئی اور تقسیم ہو کر شعلہ دے گئی ورنہ جتنی جگہ کم اور حریق و سوزش شدید تھی اسی قدر ظلمت و سیاہی شدید و قوی ہو گئی) نیز آپ نے فرمایا کہ جہنم میں (عذاب کی ندیاں ہوں گی جن میں پانی نظر آئے گا مگر خالص عذاب اور تہیم و غشاق ہوگا) دوزخیوں میں کی عورت اپنے بچہ کو کمر پر لادے ہوئے لاحق شدہ شدت تشنگی کی وجہ سے اسی مسافت سابقہ (یعنی ہفت زمین کی مقدار) کو قطع کر کے ندی کی طرف جائے گی اور جب ندی پر پہنچے گا تو وہوں کی طرح بے تابانہ اس میں منہ ڈال کر پیئے گی تو پانی اس کو بھی تھکس دے گا اور اس کے بچے کو بھی (کہ منہ کی کھال اتر کر ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آئے گا) پھر میں حضرت سے یہ نہ پوچھ سکا کہ یہ بچہ جو اس کی کمر پر ہوگا وہ کون ہوگا آیا جہنم میں بھی (بصورت عذاب) توالد تناسل جاری ہوگا اور یہ بچہ وہیں کا پیدا شدہ ہوگا، یا اُن بچوں میں کا ہوگا جو دنیا میں اس کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا پس اگر وہ ہوگا جو دنیا میں اس کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا تو اس اختلاف پر محمول ہوگا جو کہ کافروں کی (نا بالغ و صغیر سن) اولاد کے بارہ میں علما کا ہوا ہے (کہ بعض کہتے ہیں وہ غیر مکلف ہونے کے سبب جنت میں جائیں گے اور اہل جنت کے خادم بنیں گے اور بعض کا قول ہے کہ والدین کے تبعاً دوزخ میں جائیں گے اور بعض کا مذہب یہ ہے کہ یہ نہ سب جنتی ہیں اور نہ سب دوزخی بلکہ علم الہی میں اگر مومن تھے تو جنتی ہوں گے اور اگر علم الہی میں کافر تھے تو جہنم میں جائیں گے) چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ کسی شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اولاد کفار کے متعلق استفسار کیا (کیا نا بالغ ہی اگر مر جائیں تو جنت میں جائیں گے یا دوزخ میں) تو آپ نے ارشاد فرمایا اللہ اعلم بما کا نوا عاملین اللہ خوب جانتا ہے کہ زندہ رہتے تو کیسے عمل کرتے (یعنی گویا ظہور نہ ہونے کے سبب ان کا کفر یا ایمان ہمارے علم میں نہیں آیا مگر اللہ کو تو معلوم ہے کہ اگر عمر پاتے اور زندہ رہتے تو کفر کرتے یا ایمان لاتے لہذا علم الہی کے موافق آخرت میں اُن کے ساتھ برتاؤ کیا جائے گا) اور یہی ہمارے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے پس اس مسلک کی بنا پر کافر کے (نا بالغ فوت شدہ) بچہ کے متعلق علم الہی یہ ہوگا کہ اگر وہ بڑا ہوتا تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتا مگر طفولیت میں مر جاتے کے سبب اس کا ظہور نہ ہوا) تو وہ جنت میں جائے گا اور اسی پر حضرت جابر بن سمرہ کی وہ حدیث محمول کی جائے گی جس میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں بعض کافروں کے بچوں کو جنت میں دیکھا اور جس بچہ کے متعلق علم الہی یہ ہوگا کہ اگر وہ بڑا ہوتا تو کفر کرتا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لاتا تو وہ دوزخ میں جائے گا۔ اور اسی پر محمول کیا جائے گا شیخ کی اس روایت کو اور اسی پر مرتب ہوگا اُس بچہ کا قصہ جس کو صغیر سنی میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہ نے قتل کیا تھا۔ اور علما نے اس کے



بارہ میں لکھا ہے کہ اس کی طبیعت اور جبلت ہی کفر پر ہوئی تھی۔ یقیناً اس مسئلہ کے متعلق بھی حضرت ممدوح سے دریافت کیا کہ اولاد کفار کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے (تو فرمایا اس بارہ میں صحیح مذہب یہی ہے جو اس حدیث سے ثابت ہو رہا ہے کہ علم الہی میں اس کے بڑے ہوتے پر جس امر کا ظہور مقدر تھا اسی پر حکم جاری کیا جائے گا۔ بلکہ یہ بھی فرمایا کہ بہتر سے بچے ہیں جو بحالت طفولیت مرجاتے ہیں مگر وہ قیامت کے دن حفاظ قرآن مجید کے زمرہ میں اٹھائے جائیں گے۔ کیونکہ علم الہی میں تھا کہ یہ بچہ اگر زندہ رہتا تو قرآن مجید حفظ کرتا۔ لہذا بروز قیامت وہ حافظ محصور ہوگا۔ اور بہتر سے بچے ہیں جو صغیر السن مرجاتے ہیں مگر وہ علماء اور اولیاء کے زمرہ میں اٹھائے جائیں گے۔ اسی لئے کہ ان کے متعلق علم الہی میں تھا اگر بڑے ہوتے تو عالم بننے یا مثلاً ولی ہوتے تو نلاں گروہ جماعت میں ہوتے۔

جامع کتاب کہتے ہیں ایک واقعہ ہمارے زمانہ میں پیش آیا کہ ایک بچہ قریب البلوغ تھا اور اس نے بروایت قانون یا بروایت ابن کثیر قرآن مجید حفظ کیا تھا۔ اور اس کی تسماعی کہ سبع قرأت کا حافظ بنے چنانچہ وہ حضرت یا بروایت ابن کثیر قرآن مجید حفظ کیا تھا۔ چنانچہ وہ حضرت ابو یعزٰی کے مزار پر حاضر ہوا۔ جہاں مشہور ہے کہ دعا قبول ہوتی ہے اور دعا مانگی کہ میں اہل سبع بن حبادوں۔ فوراً اس کی آنکھ جھپک گئی اور اس نے خواب میں دیکھا کہ حضرت ابو یعزٰی سامنے کھڑے ہیں امدان کے ہاتھ میں اجازت نامہ ہے جیسا کہ بلاد مغرب میں اہل سبع حفاظ کا دستور ہے کہ تحریر کر کے (بصورت سند فارغ التحصیل شاگرد کو) دیا کرتے ہیں اور اس پر علماء کے دستخط بھی تھے کہ یہ زیارت کنندہ شخص اہل سبع میں سے ہے شیخ نے خواب ہی میں وہ اجازت نامہ اس کو دیا اور فرمایا لو اپنی سند اجازت کہ تم اہل سبع میں سے ہو۔ اس کی آنکھ کھل گئی اور یہ اپنے وطن واپس آگیا چند ہی روز بیمار ہوا اور اس کا انتقال ہو گیا۔ کہ جتنا پڑھا تھا اس میں کچھ بھی اضافہ نہ ہوا تھا اس کے باپ نے اس کی خواب مجھ سے بیان کی اور تعبیر دریافت کی تو میں نے اسی تقریر سابق کے موافق اس کو جواب دیا کہ وہ قیامت کے دن اہل سبع قراء کے زمرہ میں مشہور ہوگا اور خواب میں شیخ کا اجازت نامہ دینا گویا علم الہی کا اظہار تھا اگر زندہ رہتا تو اہل سبع قرأت کا حافظ بنتا، یہ سنکر اس کا باپ بہت خوش ہوا اور بچہ کی موت کا حزن و غم سب جاتا رہا واللہ اعلم بالصواب

فہم: اس مسئلہ میں کہ کفار و شرکین کی اولاد جو قبل از بلوغ مرگئی ہے حبت میں جلنے کی یاد دوزخ میں، علما کا بہت اختلاف ہے ایک فریق کا مسلک یہ ہے کہ والدین کے تابع ہو کر جہنم میں جائے گی جیسے سانپ کا بچہ سنبھلایا اس سے قبل ہی کسی کو کاٹ دیا جائے کے قابل ہو بدرالدم ہے اور مار جلنے کا مستحق ہے دوسرا مسلک یہ ہے کہ وہ جنت میں جائیں گے اس لئے کہ ان سے کفر کا صدور نہیں ہوا تھا اور بچپن کا کوئی فعل شرعاً معتبر نہیں لہذا جہنم کا دخول جو مستغرق ہے کفر پر مرتب نہ ہوگا۔ بلکہ عجبکم اصل



فطرت کہ کلُّ مولودٍ یولد علی الفطرۃ ہر بچہ فطرت رہدایت پر پیدا ہوتا ہے ، عام اہل جنت کی طرح ان کو بھی جنت میں داخل کیا جائے گا تبسرا مسلک یہ ہے کہ عامل اور غیر عامل کا فرق قائم رکھنے کے لئے وہ اہل جنت کے خدمت گار بنائے جائیں گے چوتھا مسلک یہ ہے کہ جس طرح عمل کفر کے بغیر دخول جہنم مرتب نہیں ہوا اسی طرح عمل ایمان کے بغیر دخول جنت بھی مرتب نہ ہوگا کہ طفولیت کا ایمان بھی معتبر نہیں۔ لہذا درسیانی ایسے مقام پر رکھے جائیں گے جہاں نہ تنعم و التذاذ ہوگا نہ کلفت و تاذی۔ پانچواں مسلک یہ ہے جو شیخ ممدوح کا۔ ظاہر ہوا کہ علم الہی کے موافق حکم دائر ہوگا یعنی اگر بڑے ہو کر حسب علم الہی ایمان لاتے والے تھے تو جنت میں بھیج دیے جائیں گے اور اگر بڑے ہو کر حسب علم الہی کفر کرنے والے تھے تو جہنم میں بھیج دیے جائیں گے اس پر یہ اعتراض کہ عمل کے بغیر سزا دینا ظلم ہے بالکل غلط ہے اس لئے کہ اپنی ملک میں تصرف کرنا ظلم ہی نہیں کہلاتا انسان اپنی عارضی ملک میں جو چاہتا ہے تصرف کرتا اور مکان کے جس حصہ میں چاہتا پاختہ تعمیر کرتا اور اپنے باغ کے جس درخت کو چاہتا ہے تصرف کرتا اور مکان یا چولہے میں کاٹ کر جلداتا ہے۔ پھر حقیقی ملک بلکہ تخلیق و ایجاد میں کس کا سہ ہے کہ کوئی کہہ سکے حق تعالیٰ اس کی کس خطا پر اس کو جلا رہا ہے اس میں ظلم کا شائبہ بھی ہو تو ہر جانور کی تخلیق پر یہی شبہ عائد کیا جاسکتا ہے کہ گدھے اور خنزیر کو کس خطا میں گدھا اور خنزیر بنایا اور آدمی نہ بنایا بلکہ ہر انسان کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ محکوم رعایا کیوں بنایا حاکم پادشاہ کیوں نہ بنایا اور دنیا دار اٹھن میں کیوں آمار بلا عمل کے جنت میں کیوں نہ بھیج دیا غرض خلاق و شاہنشاہ اور ملک مقدر کے تصرفات میں مزاحمت گویا اس کے شاہنشاہانہ اقتدار کو محدود کرنا ہے لَا یَسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ یُسْئَلُونَ ہاں اس کے لطف و کرم اور ان رحمتی سبقت علیٰ غیبی پر نظر کرتے ہوئے رجحان اس طرف ہوتا ہے کہ شاید عمل کفر کے بغیر جہنم میں کوئی نہ جاوے کیونکہ خود اس کے تجویز کردہ قانون و مائتات ہعدہ باین حقیقی نبیوت رسولہ کا بظاہر مقتضی یہی ہے اس صورت میں حضرت ممدوح نے اس صورت کا جو قصہ بیان فرمایا اہل توحید نہیں کہ کشف ہے جو نقص کا مقابلہ نہیں کر سکتا دہم صرف ایک عورت کا قصہ ہے حالانکہ لاکھوں بچے مشرکین کے بحالت طفولیت مرچکے ہیں اس لئے لاکھوں عورتوں اپنے بچوں کو کمر پر لادے جہنم میں نظر آتی جائیں پس ممکن ہے یہ بچہ مستثنیات میں ہو کر حسب علم الہی دخول جہنم کا اقتدار اور مالک نہ تصرف اس پر ظاہر فرمایا گیا ہو۔ سوم خود جامع کتاب کہتے ہیں دریافت نہ کر سکا یہ بچہ دنیا میں اس کے لطف سے پیدا شدہ تھا جو بچپن میں مر گیا تھا یا جہنم ہی میں بصورت عذاب اس کی ولادت ہوئی تھی کہ ماں کو اپنی ذاتی تکلیف کے ساتھ بچہ کی تشنگی و گرسنگی اور ہر قسم کی تکلیف کا جیدا گناہ درد و الم پہنچے اور ایک نوع عذاب پر اس دوسری نوع عذاب کا اضافہ ہو۔ کیونکہ دوزخ متامی انواع عذاب و کلفت کا گھر ہے۔ لہذا



اس نوع عذاب یعنی بچہ کی تکلیف کے سوا ان روح سے بھی خالی نہ ہونی چاہیے۔ پس مشتبہ حالت سے جبکہ احتمال ہے جہنمی ولادت کا بھی یہ علماء کا معترکہ الاراء مختلف فیہ مسئلہ کہ کفار کے بچے جہنم میں جائیں گے ثابت نہیں ہو سکتا۔ بلکہ خود حضرت مدوح ہی کا قول ثابت نہیں ہوا کہ وہ اسکو دنیوی ولد کافر قرار دے کر جہنمی بتا رہے ہیں۔ چہاں جن علماء کا مسلک یہ ہے کہ والدین کے تبعاً یا حسبِ عالم الہی کے بچے جہنم میں جائیں گے غالباً اس کا مفہوم یہ ہے کہ ان کو دیگر جہنمیوں کی طرح بڑا اور جوان بنا کر جہنم میں ڈالا جائے گا۔ نہ یہ کہ وہ بچہ طغولیت اور اسی عمر میں رکھ کر جہنم میں ڈالے جائیں گے جس عمر میں ان کا انتقال ہوا تھا۔ اس لئے کہ بچہ کو تکلیف کا احساس و شعور کم بلکہ بہت کم ہوتا ہے بچہ بڑھتا ہے اسی قدر اس کا احساس اور شعور و ادراک بھی بڑھتا ہے پس اگر کفر کی سزا ہے نہ تکلیف اور یہ بچہ جس کو مان کر پرلاوے ہوئے تھے۔ اسی نوعی و طفولیت میں تھا۔ اس لئے اس کے متعلق یہ کہنا کہ ماں کے تبعاً کافر قرار پا کر جہنمی ہوا ہے اس بحث ہی میں داخل نہیں ہے جس میں علماء کا اختلاف ہو رہا ہے۔ پنجم حضرت خضر علیہ السلام کے قتل کردہ بچہ پر اسکو قیاس کرنا صحیح نہیں کہ اول تو اسی مقتول کے جہنمی ہونے کا ثبوت نہیں۔ ممکن ہے وہ بھی جنت میں جائے اور اسی اختلافی حکم کا اس پر ترتیب ہو۔ دوم علماء کا اس کو مجہول علی الکفر کہنے کا مطلب صرف حضرت خضر علیہ السلام سے اس الزام کا اٹھانا ہے کہ انہوں نے باوجود بنی یا ولی کامل ہونے کے بے گناہ و معصوم کو کیسے قتل کر دیا۔ سو اس کی توجیہ ہو گئی کہ علم الہی میں چونکہ یہ تھا کہ بڑا ہو کر کفر کرے گا اور غالب تھا کہ مادی و پدری شفقت کی بنا پر اپنے دیندار والدین کو بھی کافر بنا چھوڑے، لہذا اپنے اس علم ازلی سے حق تعالیٰ نے حضرت خضر علیہ السلام کو مطلع فرما کر اس کے قتل کا مامور بنا دیا اور اس لئے وہ قتل افساد و ظلم نہ ہوا بلکہ عین اصلاح و احسان ہوا آخری نتیجہ کے متعلق اس میں کوئی بحث نہیں کہ جنتی ہو گا یا روزخی۔ سوم ممکن ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کے اس فعل کو جہاں حق تعالیٰ نے والدین پر احسان بنایا کہ وہ کفر سے محفوظ رہے وہیں خود اس مقتول کے لئے بھی انعام بنایا ہو کہ بڑا ہو کر کھڑکرتا تو جہنم میں جاتا اور اب بچپن میں مقتول ہو کر سزا سے بچ گیا اور دخول جہنم سے محفوظ ہو گیا۔ یہ حال حضرت مدوح کے کسی قول سے کوئی ایسی بات محقق نہیں ہوتی جس کی بنا پر علماء کے دیگر اقوال کو مسترد کیا جاسکے۔

رہے بچوں کے زمرہ حفاظ و علماء و اولیا میں معشور ہونے کے واقعات سو بہ مفتضا، کرم الہی ہیں اور من جملہ ان انعامات مخصوصہ کے ہیں جو بطفیل محبوبیت محمدیہ حق تعالیٰ نے اس امت مرحومہ پر مبذول فرمائے ہیں۔ کہ جس طرح امت محمدیہ کے لئے عزم فعل بلکہ نیت پر بھی قبل از صدور عمل خود عمل کا ثواب مرتب فرمادیا وَمَنْ يُخْرِجْ مِنْ بَيْتِهِ مَعَاجِرًا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ زُكِيَ



اجرا علی اللہ اسی طرح اپنے علم ازلی پر اعمال مقدرہ کو اعمال صادرہ بنا کر حشر کے میدان میں ظاہر فرما دیا اس سے تعدیسی صورت کا استدلال کہ اسی نوع پر سزائے جہنم بھی مرتب ہوگی میرے نزدیک قیاس مع الفارق ہے۔ چھٹا مسلک اس مسلک اس بحث میں سکوت و خاموشی کا ہے کہ نصوص اس بارہ میں مختلف ہیں اور اس اختلاف میں راز بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اس بارہ میں عدالت عالیہ کے قطعی فیصلہ کا عوام پر اظہار پسند نہیں فرماتے کیا ضرور ہے کہ آخری شاہنشاہی فیصلے بھی دنیا میں ہر شے کو معلوم ہو جاویں لہذا یہی مسلک احوط اور مقتضائے آداب الوہیت معلوم ہوتا ہے کہ کوئی حتمی رائے قائم نہ کی جائے۔ اس کا اعتقاد ضرور رکھا جائے کہ حق تعالیٰ مالک الملک الملکوت کو لاریب حق ہے کہ کوئی حتمی رائے قائم نہ کی جائے۔

اپنے علم ازلی کے موافق بلا صدور اعمال بھی جزا و سزا مرتب فرمائے اور یہ بھی عین عدل ہوگا کیونکہ اس بارگاہ میں ظلم کی ماسیت و حقیقت کا تحقق ہی محال ہے باقی یہ امر کہ وقوع کس صورت کا ہوگا یعنی عدل کا یا لطف و کرم کا سو وہ جانے اس کا کام یفعل ما یشاء و یحکم ما یرید کسی کو معلوم ہی کرنا ہے تو اس کا دقت بھی قریب الگ ہے مشاہدہ سے خود معلوم ہو جائے گا۔

کارکن کار بگزار از گفتار : کاندین راہ کار آید کار

اس کی بہ نسبت کہ تفتیش و کرید کی جائے مرنے والے بچے کہاں جائیں گے زیادہ ضروری و اہم یہ ہے کہ اپنی فکر کی جائے ع تجھ کو کسی کی کیا پڑی اپنی نیڑ تو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

نیز آپ نے فرمایا کہ مالک علیہ السلام کو کہ جہنم کا دار و مقرہ ہیں جس کا بھی دوزخ پر گزر ہوگا خواہ مومن ہو یا کافر ہر شخص دیکھے گا کہ پھر اٹھ کر عبور کرتے ہوئے جہنم پر مومنین کا بھی گزر ہوگا، مگر مومن تو ان کو دیکھ کر معلوم کرے گا ان کی تخلیق مومنین کے سیر ایمان سے ہوتی ہے (اور وہ اللہ کے معصوم فرشتوں اور مقبول بندہ ہیں) اس لئے دشت نہ کھائے گا۔ لیکن کافر کا ان کو دیکھتے ہی رعب کی وجہ سے دم نہا ہو جائے گا (اور گدڑت کا نہیں مگر مرنے سے بدتر اور بد ہوش بن جائے گا) نیز فرمایا کہ دوزخ میں ادنیٰ سے ادنیٰ کافر کے لئے یہی رحمت کا عذاب میں ہلکا ہوگا) دنیا اور اس جیسی دس دنیاں برابر وسیع حصہ دیا جائے گا (جو عذاب سے بریز ہوگا) مین نے عرض کیا کہ پھر کافر کے لئے تنگ کیا مطلب؟ فرمایا چار طرٹ سے عذاب اس کو محیط ہوگا اس لئے آگ کے شکنجہ میں رہے ہوتے شخص کی طرح تنگی بھی بجا نہ رہے گی۔

میں نے کہا کہ ایک شخص اپنے وسیع گھر میں ہو اور شب و روز اس کو نڈوئوب کیا جائے تاہم اس کو وسعت کا علم ہو کہ ایک قسم کی راحت ملتی ہے اور اس کا تعلق و اضطراب اس درجہ کا نہیں ہوتا جیسے کسی کو تنگ مکان میں جہاں ہاتھ پاؤں بھی نہ پھیل سکیں مثلاً نیزہ کی آبی سے رات دن چھیدا جائے حضرت نے فرمایا اس کی وجہ تو یہ ہے کہ ہوا اس پر عذاب ہی نہیں بلکہ دیواریں سب تکلیف بنی ہوئی ہیں اس لئے دیواریں جتنی دور ہیں اتنی تکلیف کم ہے اور دیواریں جتنی قریب ہیں اس کی قدر تکلیف زیادہ ہے اور اسی کا نام تنگی



وضیق ہے بر خلاف جہنم کے کہ اس کی توہواہی (جو چار طرت بدن کو چپٹی ہوئی ہے) خالص عذاب ہے لہذا وہ ظاہر اچھی  
 متبادل عذاب ہے (کہ شکنجہ کی طرح گویا آگ کی دیواروں میں بچھا ہوا ہے اور باطن بھی متبادل عذاب سے  
 کہ اندرون کا ریشہ ریشہ جل اور جھلس رہا ہے اور دنیا سے دس گنا وسیع میدان سارا اسی عذاب سے لبریز ہے  
 اس میں اس کے ترپنے کی یہ حالت ہوگی جیسے مرغی کو ذبح کر کے ڈال دیا جائے اور تڑپتی پھرے (کہ کھلا میدان اس  
 کے لئے بے حد تنگ اور جانکنی کی تکلیف میں ترپنے کے لئے ایک ناقابل بیان ضیق ہے۔ غرض کہ بھی مرغ  
 نسیم سہل کی طرح ترپیں گے اور کبھی ہائے وادیاں مچائیں گے اور چغلیں چلائیں گے اور چلانے کا ان کے عالم ہوگا  
 کہ اگر کسی مومن کا اس حالت میں ان پر گزر ہو جائے اور وہ ان کی صرخہ دیکھ کر کوشن پائے تو اس کے حواس معطل ہو جائیں  
 اور دنیا میں تو چیخنے چلانے سے بھر کچھ آرام مل جاتا ہے اور بھائی نکل کر تکلیف ہلکی پڑ جاتی ہے) مگر اہل جہنم کی تکلیف  
 میں تو اس سے (بجائے کمی کے) اضافہ ہی ہوگا کیونکہ ان کی ہائے وادیاں سے آگ کی قوت اور سوزش و پیش بڑھ  
 جائے گی اور ایسی مثال ہوگی جیسے انگلیٹی میں سلگتی ہوئی ٹکڑیوں کے انگارے اور اکھ جھاڑ دیا جائے تو آگ ٹکڑیوں  
 میں زیادہ بھڑک جاتی اور ان کی آج تیز ہو جاتی ہے واللہ اعلم۔

نیر آپ نے فرمایا کہ جہنم میں (چھوٹے بڑے) مکانات بھی ہیں (ادبے اونچے) محلات بھی ہیں (ان کے دروازے بھی  
 ہیں، درخت بھی ہیں، ندیاں اور نالے بھی ہیں جیسے دنیا کے عام شہروں میں ہوا کرتے ہیں مگر سب مجسم عذاب ہیں  
 کہ جس چیز کے جس حصہ اور جس جزو کو بھی لوگے خالص آگ اور محض عذاب پاؤ گے۔ مکانات و محلات اور شجر  
 و ندیاں وغیرہ سب آگ ہی آگ ہوں گے کہ اگر اس کا ایک پتنگا بھی عالم دنیا میں اترے تو اس کنارہ سے کہ  
 اس کنارہ تک تمامی دنیا کو جلا پھونک کر خاکستر بنا دے۔

نیر فرمایا کہ بندہ عالم دنیا میں اعمال بد کرتا ہے تو جہنم میں اس کے لئے ساگ کے محل تعمیر ہوتے رہتے ہیں مگر  
 جب ان اعمال بد سے نوہ کر لیا یا کوئی ایسا نیک عمل کرنا ہے جسے حق تعالیٰ نے قبول فرمایا تو وہ محل جو اس کے لئے  
 جہنم میں تعمیر کئے گئے منہدم و معدوم ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ جنت میں اس کے لئے محل تعمیر کر دئے جاتے ہیں  
 اس کے بعد آپ نے ایک قصہ نقل کیا کہ ایک مومنہ حاملہ تھی اور اس کے پیٹ میں جو بچہ تھا وہ غوث زمانہ بننے والا تھا  
 اس کے پڑوس میں ایک شاہی کی تقریب ہوئی اور یہ بھی بغرض تفریح و ولہن کے گھر چلی گئی۔ اتفاق سے ولہن کا  
 کوئی قیمتی زیور کسی نے چور کیا۔ اہل خانہ نے اس بے خطا حاملہ کو الزام لگا کر پکڑا اور گھر جانے سے روک دیا کہ  
 جب تک چیز نہ ملے گا گھر واپس نہ جانے دیں گے، اس کا شوہر ایک شریف شخص تھا جسے یہ بھی گوارا نہ تھا کہ بیوی اپنے  
 دروازے مکان پر کھڑی ہو چہ جائیکہ پڑوس میں کسی کے گھر جانا۔ پھر غرض تنہا بہت تھا بیوی پر چوری کا رعبہ  
 مرنے سے بدتر تھا (اس لئے عورت کو خوف ہوا کہ خاندان کو جب خبر ہوگی کہ میں گھر سے باہر نکلی تھی تو مجھ پر



کیا آفت ٹوٹے گی چہ جائیکہ چوری کامیری طرہ انتساب اور چہ جائیکہ اس میں پکڑا جانے اور محبوس و قید ہو جائے ان طرح طرح کے خطرات سے اس کو اپنے خاوند کا خوف اتنا یہ اتھا اور ناقابل بیاض و لاحق ہوا کہ محل کو نقصان پہنچا (اور گو اسقاط نہیں ہوا مگر حزن و خوف کے اندر دنیٰ صدمہ نے ریشہ ریشہ میں دور کر جنہیں کراہیت پہنچائی اس لئے اس جھوٹا بہتان باندھنے والی عورت کے لئے جہنم میں کسی محل تعمیر کر دیئے گئے اور وہ مدت دراز تک تعمیر شدہ باقی رہے حتیٰ کہ وضع محل ہوا اور بچہ (جو کہ اپنے زمانے کا غوث ہونے والا تھا) بڑا ہو گیا بچہ کی ماں کا بھی انتقال ہو گیا اور باپ بھی دنیا سے اٹھ گیا بالغ ہونے کے بعد انہوں نے نکاح کا ارادہ کیا۔ (مگر مہر ادا کرنے کے لئے کچھ پاس نہ تھا تب اس عورت نے (جس نے ان کی والدہ کو چوری کا الزام لگایا تھا اور ان کی بحالت محل اذیت پہنچائی تھی) ان کو اتنی رقم دی جو مہر کے لئے کافی ہو گئی۔ اس وقت حق نکلے آتے اس کے وہ محل جو جہنم میں تعمیر کئے گئے تھے معدوم فرما دیئے اور اس مالی خدمت کو اپنے فضل و کرم سے قبول فرما کر اس غلطی کو محو اور معاف فرما دیا جو اس نے بحالت محل غوث وقت کے ساتھ کی تھی۔

نیز آپ نے فرمایا کہ بندہ جو بھی حرکت کرتا ہے حتیٰ کہ آگے چلنے کے لئے اپنا قدم اٹھاتا یا (پچھے پھرنے کو) قدم لوٹاتا ہے تو اس کے لئے یا تو محل تعمیر کیا جاتا ہے جنت میں (بشرطیکہ اس قدم نے طاعت میں حرکت کی تھی) اور یا محل تعمیر کیا جاتا ہے دوزخ میں (اگر قدم کی حرکت کسی مصیبت میں ہوئی تھی) بلکہ بحالت خواب اس کے پیٹ میں جو رگ بھی حرکت کرتی ہے اس پر یا محل تعمیر ہوتا ہے دوزخ میں اور یا محل تعمیر ہوتا ہے جنت میں اور جب ان افعال میں یہ حال ہے جن کا صدور نبدہ کے قصد و ارادہ سے نہیں ہوتا تو کیا پوچھنا ان افعال کا جن کو بالقصد کرتا ہے جبکہ شریعت نے اس کی ممانعت کی ہے یا اس کے کرنے کا حکم دیا ہے۔

میں نے عرض کیا کہ غیر اختیاری افعال پر محلات کی تعمیر کیسی بالخصوص ان افعال پر جو سونے کی حالت میں صادر ہوں جبکہ ان میں قصد و ارادہ کا مطلق دخل ہی نہیں (فرمایا محلات کی تعمیر میں اعتبار اس حالت کا ہے جو قصد و ارادہ کی صورت میں انسان کا مرجع بنتی ہے (یعنی یہ دیکھا جائے گا کہ اگر یہ فعل بالقصد اور بالارادہ کرتا تو اس وقت وہ کس حالت پر ہوتا) کیونکہ محلات کی تعمیر کا حقیقی سبب وہی ہے۔ پس کافر کی وہ حالت ظاہر ہے کہ بالقصد صدور فعل کے وقت بھی کفر و مقررہ کی حالت ہوتی۔ لہذا اس کے لئے جہنم میں محل تعمیر ہوتے رہیں گے خواہ اس کے افعال قصداً صادر ہوں یا غفلت سے یا بحالت خواب اور سو میں کی وہ حالت ظاہر ہے کہ بالقصد صدور فعل کے وقت بھی ایمان ہی کی ہوتی لہذا اس کے لئے جنت میں محل تیار ہوتے رہیں گے خواہ اس کے فعل قصداً صادر ہوں یا غفلت سے یا بحالت خواب و غیرہ اس تقریر کی شرح یہ ہے کہ فعل جس طرح اپنے سبب قریب کی طرف منسوب ہوتا ہے اسی طرح سبب بعید کی طرف بھی منسوب ہوتا ہے جبکہ وہی سبب اصلی ہو۔



مثلاً ایک شخص نے قاتل کو ابھارا اور آمادہ کیا کسی بے گناہ کے قتل پر تو جس طرح فعل قتل سبب قریب یعنی قاتل کی طرف منسوب ہوگا اسی طرح سبب بعید یعنی قتل پر ابھارنے والے کی طرف بھی منسوب ہوگا بشرطیکہ یہ ابھارنا ہی قتل قاتل کا سبب بنا ہو کہ اگر یہ نہ ابھارتا تو وہ قتل نہ کرتا لہذا دونوں مجرم میں مساوی بلکہ ابھارنے والا اصل قاتل سمجھا جائے گا اگرچہ صدور قتل کے وقت پڑا سوتا ہی کیوں نہ ہو۔ یہی نوعیت کافر اور مومن کے افعال کی ہے کہ ان کا صدور اگرچہ قصد اور ارادہ سے ہوتا ہے اور قصد و ارادہ ہی اعمال کے لئے سبب قریب ہے مگر قصد پیدا کرنے والی شے جو سکون کے ساتھ بیٹھے ہوئے ارادہ کو ابھارتی اور ارتکاب فعل پر آمادہ کرتی ہے۔ وہ ان کی طبیعت اصلیہ اور مادہ طبیعیہ ہے کہ کافر کی طبیعت میں چونکہ حق تعالیٰ سے عناد و بغض پھرا ہوا ہے اس لئے اس کا ہر فعل خواہ بالقصد ہو یا باقتضا طبیعت بلا قصد وہ بغض و عناد ہی کا ہوگا اور مومن کی طبیعت میں چونکہ اللہ و رسول کی محبت پھری ہوئی ہے اس لئے اس کا ہر فعل خواہ بالقصد ہو یا باقتضا طبیعت اللہ و رسول کی محبت اور خلوص ہی کا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ منافقین کا نماز روزہ بھی معصیت میں داخل ہے اور انکو خلع اور دھوکہ قرار دیا ہے کہ چونکہ ان کی طبیعت کفریہ ہے جو کہ اس قصد صوم و صلوٰۃ کا سبب اصلی ہے ان افعال حسنہ کو عین سنیہ بنا دیا ہے اور مومنین کی اکثر سنیات بھی مبدل حسنات کر دی گئی ہیں اس لئے کہ گو قصد و ارادہ نے غلطی کھائی مگر مادہ طبیعیہ نے اسکو حسنہ بنا رکھا ہے جب طبیعت اصلیہ قصد و ارادہ کو معطل اور مبدل بالحال بنا دیتی ہے تو بلا قصد فعل پر مادہ طبیعت کا اثر پڑنا کیا بعید ہے حدیث میں ہے من سن سنتہ حسنة فله اجرھا و اجر من عمل بها الخ جو شخص نیک ڈگر ڈال جاتا ہے تو اس پر جو کوئی بھی عمل کرے گا ب کا ثواب اس کو ملے گا اور اسی طرح جو کوئی بُری ڈگر ڈال جاتا ہے تو اس پر جو کوئی بھی عمل کرے گا ب کا مجھوئے عذاب (گناہ) اس پر بھی ہوگا اس کا سبب یہی ہے کہ مفسدوں کے عمل کرنے میں حالانکہ اس کے قصد و ارادہ کا کوئی دخل نہیں مگر سب کے عمل کی جڑ چونکہ اسی کی قائم کی ہوئی ہے اس لئے سبب بعید کہ اصل سبب درحقیقت وہی ہے اس کا سبب بن گیا کہ گویا تمامی اعمال اسی نے کئے انسان رفاه عام کے لئے ہر جاری کر جاتا ہے حالانکہ قریب جا سوا ہے اور قصد و ارادہ تو کیا معنی اس کو علم بھی نہیں کہ کون اس سے نفع اٹھا رہا اور آبپاشی کر رہا یا پانی پی رہا ہے۔ مگر اس کے نامہ اعمال میں جب تک ہر قائم ہے برابر اجر مکھا جائے گا اس لئے کہ انتفاع خلق کی اصل یہی ہر ہے جو اس نے کھدوائی اور جاری کی ہے غرض اعلان اور کفر انسان کا فعل اختیاری ہے اس لئے جو افعال اکلے بلا قصد بھی صادر ہوں گے چونکہ ان کا محرک یہی کفر و ایمان ہے اس لئے سبب اختیاری افعال کی طرح مستحق جزا و نزا ہوں گے۔ جیسے کوئی شخص سنکھیا کھالے اور مر جائے تو گو جان کنی اور نزع روح میں اس کے قصد و اختیار کا بالکل دخل نہیں ہے مگر جس پر جان کنی مرتب ہوئی ہے یعنی سنکھیا کھانا وہ تو اس کے قصد و اختیار سے ہوا ہے



لہذا خودکشی کا مجرم قرار دیا جائے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ حکم کا ترتیب مادہ اصلیت پر ہوتا ہے اس لئے ہوسن کی بیداری تو طاعت  
 ہے ہی، حالت خواب بھی طاعت میں داخل ہے اور اس کا ہر فعل مباح بھی حسنہ میں شمار ہے اور کافر کی بیداری تو  
 کفر و طغیان ہے ہی، حالت خواب بھی معصیت میں داخل ہے اور اس کا مباح پر عمل بھی سیئہ میں شمار ہے کیونکہ یہ  
 مباح کا استعمال حکم خدا و رسول نہیں کر رہا بلکہ اپنی اس گندی طبیعت کے اقتضا سے کر رہا ہے جو اللہ و رسول سے  
 اتنا دور بالکل بے تعلق ہے جس پر شخص کا ہر فعل اپنے محرک حقیقی کا حکم لے گا اور وہ اس کی طبیعت یعنی کفر ہے  
 یا ایمان واللہ اعلم۔ اسی نفیس بحث پر یہ اختلافی مسئلہ متفرع ہوگا کہ مباح افعال مثلاً کھانا پینا وغیرہ کفار کے لئے  
 بھی مباح ہیں کہ ان پر ان کو سزا نہ ملے گی یا ان کے لئے مباح نہیں اور ان پر بھی ان کو دیگر معاصی کی طرح سزا ملے گی چنانچہ  
 ایک گروہ علماء کا مسلک یہی ہے کہ اباحت بھی چونکہ ایک شرعی حکم ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے خطاب  
 بن کر ہم تک پہنچا ہے اس لئے کافروں کے لئے کوئی مباح مباح نہیں ہے اس لئے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
 کی رسالت کا اقرار نہیں کیا اور اپنے آپ کو تحت شریعت محمدیہ داخل نہیں سمجھا لہذا وہ اباحت شرعیہ کے تحت میں ہی  
 داخل نہیں ہوئے اور کوئی مباح شے ان کے لئے مباح نہیں ہوئی۔ علماء محققین مثلاً تقی الدین سبکی وغیرہ کا یہی مذہب ہے  
 اور ہمارے نزدیک بھی صحیح و صواب یہی معلوم ہوتا ہے اس بنا پر کفار کے تمام افعال حتیٰ کہ خورد و نوش بول و راز و نشست  
 و برخواست وغیرہ سب معاصی اور سیئات ہوئے واللہ اعلم فی مشہور حدیث ہے من قال لا الہ الا اللہ  
 و دخل الجنة حينئذ بھی لا الہ الا اللہ کہ لیا وہ جنت میں جائے اس پر یہ شیعہ وارد ہوتا ہے کہ یہودی اور  
 عیسائی بھی توحید کے قائل ہیں بلکہ بعض نہرو بھی موجد بن جاتے ہیں تو چاہئے کہ اس حدیث کی رو سے وہ سب جنتی  
 ہوں۔ تقریر سابق سے اس کا جواب واضح ہو گیا کہ شریعت محمدیہ چونکہ ناسخ الشرائع ہے اور دین عیسوی و موسوی  
 غرض تمام ادیان و مذاہب اس سے منسوخ ہو چکے اس لئے اگر کوئی شخص اب دور شریعت محمدیہ میں حکم سیدنا سیدنا  
 و سیدنا عیسیٰ علیہما السلام بھی کلمہ لا الہ الا اللہ کہے گا۔ تو وہ مقبول نہ ہوگا چہ جائیکہ باقتضا عقل و دہم یا بتقاضا طبیعت اگر  
 کوئی اس کلمہ توحید کا قائل ہو تو وہ کیسے معتبر ہو سکتا ہے نیز دوسرا شیعہ کہ دنوں حیات کے لئے صرف توحید کافی  
 ہے اقرار رسالت کی ضرورت نہیں وہ بھی اس سے دفع ہو گیا کہ جب کلمہ توحید پڑھنا وہی معتبر ہے جو سیدنا  
 محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں اور آپ کے ارشاد تَوَدُّوْا لَہٗ اِلَّا اللّٰہُ کے امتثال کی نیت سے ہو تو اس سے اقرار رسالت  
 خود لازم آگیا بلکہ شرط لا ینفک بن کر لازم آگیا اور اس میں راز یہ ہے کہ اللہ کی وحدانیت کا اقرار خود مقتضی ہے  
 کہ اللہ کو سچا اور ماکم مختار سمجھا جائے اور خود اس کا ارشاد ہے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ نِیْزًا طِیْعُوْا اللّٰہَ وَطِیْعُوْا الرَّسُوْلَ اُوْا اٰمِنُوْا  
 بِاللّٰہِ اَلَّذِیْ اَنْزَلْنَا بِسْمِ اللّٰہِ رِسَالَتِہٖ جِب رَبِّہٖ کا اقرار نہ کیا اور آپ کے حکم تَوَدُّوْا لَہٗ اِلَّا اللّٰہُ کی اطاعت میں  
 کلمہ توحید نہ پڑھا بلکہ منسوخ دین کے حکم کو بجاں سمجھ کر اس کی تعمیل حکم میں یا بتقاضا عقل و طبع کلمہ توحید پڑھا تو



در حقیقت اللہ کو اللہ نہ سمجھنا اور اس کے حکم کی اطاعت نہ کی لہذا اس کا لالہ الا اللہ پڑھنا محض نقالی اور طبعی فعل ہوتا ہے تو حیدر حقیقت توحید نہ ہوئی اور وہ یکسور کافر بنا رہا واللہ اعلم۔

نیز حضرت نے فرمایا اگر جنت اور جہنم پر نظر ڈالو اور ان کے محلات اور ریاضات پر نظر ڈالو تو آخرت کی ان نعمتوں اور کفایتوں میں اور بندوں کے ان اعمال میں جو دنیا کے اندر رہ کر رہے ہیں ایک ربط اور خاص تعلق پاؤ گے کہ جسی درجہ کا اعمال میں حسن و قبح ہوتا ہے اسی درجہ کی شدت و کمی نعمات جنت اور عذابہائے جہنم میں پیدا ہوتی ہے اس کے بعد آپ نے ایک قصہ نقل فرمایا کہ ایک جاہل مشاہدہ دلی نے ایک مومن کے قصر جنت پر نظر ڈالی جو ابھی یقینہ حیات تھے تو اس میں ان کو ایک نعمت نظر آئی جو بڑھوتری کی طرف حرکت کر رہی تھی جیسے انگور کا درخت جب اس درجہ پر پہنچتا ہے کہ اس میں عرق اور مٹھاس پیدا ہوتی ترقی کی طرف حرکت کیا کرتا اور چاہتا ہے کہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہو پھر اس کے بعد اس دلی نے اس مومن پر نظر ڈالی جس کا یہ قصر تھا۔ تو دیکھا کہ وہ اپنی دکان پر بیٹھا ہے اور کپڑا فروخت کر رہا ہے دفعۃً اس کی طبیعت میں ایک حرکت پیدا ہوئی اور وہ گھر آکر اٹھ کھڑا ہوا دکان بند کر کے قفل لگا دیا اور اپنے گھر پہنچا کسی تہوار وغیرہ کا دن تھا جس میں لوگ عمدہ کھانے پکاتے اور خرچ کرنے کے عادی تھے اس نے گھر آکر اپنی بیوی سے کہا کہ آج کھانے پینے کا دن ہے اور ہمارے پڑوسی (غریب و نادار ہیں) ان کے پاس کچھ نہیں ہے اس لئے اُٹھو اور ہمارے لئے کھانا تیار کرو اور ہماری غریب پڑوسن کے لئے بھی صورت حال یہ تھی کہ اس کے پڑوس میں ایک محتاج عورت رہتی تھی جس کی کسی ٹھکانا کھیتیں اور سوت کاتنے پر ان کا گذران تھا عورت نے اپنی رذکیوں کو تاکید کی کہ جلدی سوت کات لوتا کہ سویرے فروخت ہو جائے تو دن ہی میں اس کو بیچ کر کھانے کا ضروری سامان خرید لیا جائے اور دوسروں کو کھانا پتیا دیکھ کر بچیوں کی نیت نہ بھٹکے رہا ہے روکھا سو کھا ہی سہی مگر جب پیٹ بھرا ہو گا تو دوسروں کے کھانے پر حرص و طمع کی نگاہ نہ پڑے گی عرض بیوی اپنے شوہر کی رائے کو پسند کرتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی شوہر اس کو یہ تاکید کر کے کہ صبح پکاؤ اور خوب اچھا کھانا پکاؤ خود رو بادینے لے کر بازار کی طرف روانہ ہوا اور ان کو دودھ کے بریز کر کے گھر واپس آیا جب بیوی نے کھانا تیار کر دیا تو شوہر نے اس کو نہ منہ نصف کیا ایک حصہ تو اپنے لئے لے لیا اور دوسرا حصہ ایک سینی میں رکھ کر خود اٹھایا اور دودھ کے ایک بادیے سمیت اپنی پڑوسن کے دروازہ پر آیا لڑکیاں بڑے جدوجہد کے ساتھ سوت کاتنے میں مشغول تھیں اندر سب خالی پیٹ اور بھوک بھیس دفعۃً انہوں نے سنا کہ دروازے پر کوئی دستک دے رہا ہے دیکھا تو ایک شخص کھانا لئے کھڑا ہے اور کہہ رہا ہے کہ مجھے معلوم ہے تمہاری آمدنی کا ذریعہ کئی نہیں اور آج کھانے پینے کا دن ہے اس لئے بقدر کفایت کھانا لے آیا ہوں اس کو قبول کرو اور یہ دودھ بھی اس کے ساتھ ہے لڑکیاں بے حد خوش ہوئیں اور کھانا لے لیا وہ شخص تو چلا گیا اور ان سب نے



کھانا کھا کر اور دودھ پی کر اس کے لئے دعا مانگی کہ اللہ اس کے صدقہ کو قبول فرمائے اور اجر جزیل بخشے اس وقت دینی حنیت کی اُس نعمت پر پھر نظر ڈالی جس نے بڑھوتری کی طرت حرکت کی تھی اور دیکھا کہ وہ بڑھ گئی ہے اور اتنی بیروں اور بیان حالت کی طرت منتقل ہو گئی ہے جس کی توصیف سے زبان قاصر ہے حنیت میں تزییر ہوا مگر اس مومن کو اس کی کچھ خبر بھی نہ ہوئی یہ ہے اللہ کا فضل و کرم کہ جس نعمت سے بندہ کو نوازنا چاہتا ہے اس کی حرکت اس کے قلب میں ڈال دیتا ہے اور پھر عمل کی توفیق بخشتا ہے اور اس کو زیادتی نعمت کا بدم قرار دیتا ہے۔

ایک دن حضرت کے سامنے ایک شخص کا تذکرہ آگیا جو نہایت ظالم اور سنگدل تھا کہ لوگ اس سے بے حد تنگ اور بزار تھے میں نے عرض کیا حضرت بددعا فرمائیں کہ حق تعالیٰ اُسے موت دے تاکہ مخلوق کو امن نصیب ہو فرمایا ہنوز اس کے محل جہنم میں پورے نہیں ہوئے اور ابھی بہت محل باقی ہیں جن کے پورے ہونے سے قبل اس کو موت نہیں آئے گی چنانچہ حضرت مدوح کا وصال بھی ہو گیا مگر وہ شخص اب تک زندہ ہے اور اپنے جہنمی محلات کی تکمیل میں بیٹا ظلم بریز کر رہا ہے) ایک ظالم قیصر کے متعلق میں نے آپ سے دریافت کیا جو کہ اپنے عہدہ سے برخاست کر دیا گیا تھا اور لوگ اُس کے معزول ہو جانے سے بے حد خوش تھے کہ اُس کے مظالم سے پناہ ملی، تو حضرت نے فرمایا واہ میاں ابھی اس کا قصہ پورا کہاں ہوا ہے چنانچہ وہ پھر اپنے عہدہ پر بحال ہو گیا اور اس وقت تک کہ رمضان ۱۳۳۶ھ کا آخری دن پہنچا حیات (اور مشغول ظلم و تعدی) ہے۔

نیز ارواح حیوانات کے متعلق آپ نے فرمایا کہ جانوروں کے لئے نہ ثواب ہے نہ عذاب۔ مگر بعض جانور اہل جہنم کے لئے عذاب بن کر جہنم میں ہوں گے اور بعض جانور اہل جنت کے لئے نعمت بن کر جنت میں ہوں گے چنانچہ کتے بھڑکے اور دیگر درندے یا قلع جانور اگر دنیا میں کافروں کے ساتھ رہتے اور وہ اُن کو پالتے اور ان کے ساتھ اُنیت رکھتے تو جہنم میں نہ جائیں گے بلکہ مٹی بنا دئے جائیں گے۔

عید الاضحیٰ کا دن تھا کہ آپ نے فرمایا آج کے دن قربانیوں کی ارواح قبض کرنے کے لئے خاص فرشتے اترتے ہیں اور ہر قبیہ ہر شہر اور ہر جگہ کا چہاں بھی عید قربانی کی جاتی ہے گشت لگاتے ہیں۔ آج کے دن کے سوا زمین پر ان کا نزل کبھی نہیں ہوتا پس جب قربانی کا جانور ذبح کیا جاتا ہے تو اس کی روح کو لے کر یا جنت کی طرف جاتے ہیں یا جہنم کی طرف۔ اگر قربانی کرنے والے کی نیت مستحسن اور خالص لوجہ اللہ ہوتی ہے کہ قربانی کرنے میں نہ تفاخر ہے نہ ٹرائی نہ نمود ہے اور نہ طلبِ شہرت۔

تب تو اس کی قربانی کی روح کو اس کے جنتی محلات کی طرف لے جاتے ہیں اور وہ مسجدِ نعمائے جنت کے اُس کے لئے ایک نعمت بن جاتی ہے اور اگر قربانی کرنے والے کی نیت اس کے برعکس اور فاسد ہوتی ہے تو اس کی قربانی کی روح کو جہنم کی طرف لے جاتے ہیں اور اس کے لئے مسجدِ عذاب بن جاتی ہے۔



ایک عذاب بن جاتی ہے کہ اسی صورت کا اُدن اور نیگوں سمیت کھال اور بدن والا مینڈھا لیا جو جانور بھی قربانی کیا ہے وہ، نظر آتا ہے مگر جہنم آگ ہوتا ہے کہ اس کا بال بال آگ ہوتا ہے، اس کے سینگ بھی آگ ہیں اور سر سے کر پاؤں تک سارا آگ ہے نیز فرمایا کہ لوگوں سے اسی کا تذکرہ کرو کیونکہ عوام کو اس اطلاع کی سخت ضرورت ہے۔ چنانچہ میں نے اکثر لوگوں کو یہ مضمون سنا دیا۔

نیز آپ نے فرمایا کہ جنات کو جہنم میں آگ کا عذاب نہیں دیا جائے گا اس لئے کہ آگ تو ان کی طبیعت ہے اور اسی سے ان کو پیدا کیا گیا ہے لہذا اس سے ان کو تکلیف نہ ہوگی اس لئے ان کو زمہریر اور انتہا درجہ کی خنکی کا عذاب دیا جائے گا کہ اس میں جھٹھڑ جائیں گے۔ دنیا میں بھی جنات سردی سے بے حد ڈرتے ہیں چنانچہ موسم گرما میں خوش رہتے اور ہوا میں گھومتے ہیں مگر ٹھنڈی ہوا کا ان کو خطرہ لگتا رہتا ہے اگر اتفاق سے ٹھنڈی ہوا چل جائے تو ایسے بدحواس ہو کر بھاگتے ہیں جیسے جھکی گدھے بھاگا کرتے ہیں اور پانی کے اندر نہ تو جن داخل ہو سکتا ہے اور نہ شیطان اگر کسی میں ایسی قدرت ہو کہ ان کو پکڑ کر پانی میں ڈال دے تو چھو کر ایسے نسا ہو جائیں گے جیسے انسان آگ میں گر کر فنا ہو جاتا ہے فہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ كُلِّ بَابٍ مِنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْصُودٌ جہنم کے سات دروازے ہیں اور ہر دروازے کے لئے فریق معین ہے یعنی دوزخ کے اوپر نیچے سات طبقے ہیں کہ ہر طبقہ کا دروازہ جدا ہے اور ہر طبقہ خاص کفار کے لئے مخصوص ہے چنانچہ مردی ہے کہ بائیں اسفل یعنی سب سے نیچے کا طبقہ فرعون اور اس کے اصحاب اور انصار کے لئے اور منافقین کے لئے ہے اور اس کا نام ہادیہ ہے اس لئے اوپر دوسرا طبقہ مشرکین کے لئے ہے اس کا نام جحیم ہے اس سے اوپر تیسرا طبقہ لادھیہ فرقہ صابین کے لئے ہے اور اس کا نام سقر ہے اس سے اوپر چوتھا طبقہ ابلیس اور اس کے تابعین کے لئے ہے اور اس کا نام نطی ہے اس سے اوپر پانچواں طبقہ یہود کے لئے ہے اور اس کا نام حطہ ہے اس سے اوپر چھٹا طبقہ انصاری کے لئے ہے اور اس کا نام سعیکو ہے اس سے اوپر ساتواں طبقہ عصاة مسلمین کے لئے ہے اور اس کا نام جہنم ہے مگر سب پر جہنم کا اطلاق آیا ہے جس کا ترجمہ دوزخ ہے اس کے اوپر پل کی صورت میں صراط قائم کی گئی ہے گی جس کو عام زبان میں یطراط کی نوعیت سے یاد کیا جاتا ہے طبقات کے جہنم کے ہر دروازے سے دوسرے دروازے کا فصل سات سو برس کی مسافت ہے اور پٹھرا کی نوعیت ممکن ہے ایسی ہو جیسے آسمانوں پر پل ہوتے ہیں کہ ایک ہزار برس کی مسافت اس کا ہیوٹ ہو گا۔ مگر ہر شخص اپنے اپنے اعمال کے موافق عبور کرے گا کوئی مثل برق خاطف نہ یا ادھر جتنی یا کوئی ایک لمحہ میں اُدھر۔ کوئی آندھی کی رفتار اور کوئی تند ہوا کی رفتار اور کوئی تیز گھوڑے کی رفتار وغیرہ وغیرہ۔

سب سے پہلے اس پر عبور کرنے والی ذات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہوگی۔ اور سب سے آخر گھٹنوں چلتے والے اور مرنوں پر گھسیٹنے والے ہوں گے اور جن کو سبزا، معصیت جہنم



میں جانا ہے وہ کٹ کٹ کر نیچے جہنم میں پڑ جائیں گے واللہ اعلم وعلہ اتم ولنسئلہ العصۃ من بندہ المہالک ۱۲۔  
 نیز آپ نے فرمایا کہ قاتلین کا عذاب عام اہل نار کی طرح نہ ہوگا بلکہ خاص اور شدید ہوگا۔ اس کے بعد ایک مثال بیان  
 فرمائی کہ کسی یا اقتدار بادشاہ کی رعایا میں یہودی بھی ہوں اور مسلمان بھی اور قرصن کر دو دونوں فریق کی مجرموں کی  
 سزا کے لئے اس نے علیحدہ علیحدہ فیصل قائم کر رکھی ہو کہ مسلمان رعایا کے قاتل مجرم کو پھانسی دے کر ایک  
 دیوار پر لٹکایا جاتا ہے اور یہودی رعایا کے قاتل مجرم کو دوسری دیوار پر لٹکایا جاتا ہے پس اگر بادشاہ مسلمان مجرم  
 کو یہودی کی فیصل پر لٹکائے جانے کا حکم فرمائے تو ظاہر ہے کہ اس میں اس کی بڑی اہانت اور خاص تذلیل کا  
 اظہار ہے کہ (باوجود مسلمان ہونے کے اس کو سزائے جرم میں) یہودیوں کے ساتھ شامل کر دیا۔ اسی طرح  
 دوزخ میں نار کی دو قسمیں ہیں ایک نار حارہ یعنی گرم آگ اور اس میں عصاۃ بنی آدم کو مبتلا و عذاب کیا جائے گا۔  
 اور ایک نار بارودہ یعنی ٹھنڈی آگ جس کا نام زمہریر ہے) اور اس میں زناری مخلوق (یعنی شیاطین کو مبتلا و  
 عذاب کیا جائے گا اور جنہوں نے ناحق کسی کی جان لی اور قتل نفس کا ارتکاب کیا ہے ان کو اسی نار  
 بارودہ (یعنی زمہریر) میں شیطانوں کے ساتھ عذاب دیا جائے گا (تاکہ عذاب کے ساتھ شرکت شیاطین کی  
 خاص اہانت و تذلیل بھی اُن کے شامل حال ہو) نیز فرمایا کہ قاتلین ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ بعض اور معصیتوں  
 کے مرتکبین بھی شیاطین کے ساتھ) اسی عذاب میں شامل کئے جائیں گے اس کے بعد آپ چاہتے تھے کہ اُن معافی  
 کو معین فرمائیں (جن کا ارتکاب اس سزا کا سبب بنا ہے) اور ان کو زمہریری عذاب دیئے جانے کی حکمت بیان  
 فرمائیں۔ مگر ایک شخص نے اگر قطع کلام کر دیا اس لئے دوسری گفتگو شروع اور بیان ناتمام رہ گیا۔

ایک مرتبہ آپ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ جانتے بھی ہو قیامت کے دن سب زیادہ سخت عذاب میں کون ہوگا؟  
 میں نے عرض کیا کہ حضرت ہی بیان فرمائیں فرمایا وہ شخص کہ جس کو حق تعالیٰ نے حیم کامل اور اعضا و صحیحہ عطا فرمائے عقل کامل  
 بخشی صحت نامہ نصیب فرمائی ہر قسم کا عیش اور رزق کے اسباب مہیا فرمائے اور اس پر ایک دن دو دن یا زیادہ  
 اس حالت سے گزرے کہ اس کو اپنے رب کا خیال بھی کبھی نہ آیا اور جب کسی گناہ پر قدرت پائی تو سرے بدن اور  
 عقل سے اس پر ٹوٹ پڑا اور اُس کے مزے لینے لگا کہ پروردگار کی طرف سے ذرہ برابر نکر بھی لاحق نہ ہوا جو اُسے  
 پریشان کر دیتا یا معصیت کی تلاوت میں کمی لے آتا چونکہ اس شخص کو معصیت کے ساتھ کمال درجہ کا اتصال اور رب کے  
 پورا انقطاع ہو چکا ہے اور جہلاً قلباً ہر طرح معصیت کی طرف مائل اور اس کو حد درجہ شیریں پارہا ہے۔  
 لہذا قیامت کے دن اس کی سزا بھی یہی ہوگی کہ اس کے تمام اجزا کو جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔ اور  
 سارے کو عذاب میں ڈال دیا جائے گا۔ پس معصیت کے ارتکاب کی حالت بہت قابل اہتمام ہے  
 مومن کو چاہیے کہ اگر معصیت بھی کرے تو اس کا علم اپنے قلب میں ضرور قائم رکھے کہ



کوئی اس کا رب بھی ہے جسے اس پر ہر طرح کی قدرت حاصل ہے ایسا سمجھتے ہوئے اللہ کا کچھ خوف دل میں قائم رہے گا اور پھر اگر عذاب بالکل معاف نہ بھی ہو تو کم از کم اس کا جوش فرو اور ہلکا ضرور ہو جائے گا۔ فہم: یہی مضمون صفحہ ۱۸ پر مذکور ہو چکا ہے ممکن ہے کہ سہواً اعادہ ہوا ہے اور ممکن ہے قصداً تکرار بیان کیا ہو کہ اسی پر کتاب ختم ہوئی ہے اور متنبہ کیا ہے کہ فلاح و صلاح کی اصل یہی مراقبہ، خوف الہی اور خشیت خداوندی ہے اگر حق تعالیٰ اپنے کسی بندہ کو یہ نعمت عطا فرمائے کہ کوسطوت و قدرت غیر متناہیہ اور اقتدار و مواخذہ کا استحضار رہنے لگے تو اس سے معصیت کا صدور ہی نہ ہو سکے گا کیونکہ معصیت ثمرہ غفلت ہے اور اگر حکم تقدیر صدور ہوگا تو فوراً گریہ و ندامت اور سچی توبہ نصیب ہوگی جس سے یہ سیئہ تبدیل بہ حسنہ ہو جائے گی۔

وذلك هو الفوز العظيم۔

الحمد للہ کہ ابریز کا حصہ دوم بھی ختم ہوا اور اب چند امور مجھے عرض کرنا ہیں۔

۱۱۔ اقل میں نے کوشش کی ہے کہ شیخ کی عبارت کا نفس مطلب ادا کروں اور اس لئے ترجمہ کرتی تحت اللفظ کے قریب رکھنے کا اہتمام کیا ہے۔ اگر توضیح کی ضرورت پیش آتی ہے تو قوسین کے درمیان عبارت کا اضافہ کیا ہے یا نائدہ کی صورت میں مستقل مضمون بڑھایا ہے اگر دوبارہ اس کی طبعاً عبارت میں و موفق ہوئی تو خیال ہے کہ خلاصہ مضمون اپنی عبارت میں ادا کروں گا کہ کتاب بھی مختصر ہو جائے گا اور عبارت بھی دلچسپ و جادب قلوب بن جائے گی۔

۱۲۔ دوم جلد اول صفحہ ۲۵ پر شوق شجرہ کا قصہ صاحب کتاب نے سیدنا یحییٰ علیہ السلام کا بیان کیا ہے۔ مگر مشہور یہ ہے کہ یہ واقعہ سیدنا زکریا علیہ السلام کا ہے ممکن ہے کہ ذمہ بول ہوا ہو یا کاتب کی زلت قلم ہو اور ممکن ہے کہ جامع کتاب کی تحقیق یہی ہو جیسا کہ سیدنا آدم علیہ السلام کو حیس درخت کے کھانے کی عاقبت ہوئی تھی مشہور یہ ہے کہ وہ گندم کا درخت تھا مگر شیخ کی تحقیق یہ ہے کہ وہ انجیر کا درخت تھا اور اس کو بلا شک شبہ نہایت وثوق کے ساتھ ظاہر فرمایا ہے اس لئے بندہ نے وہاں اس سے کوئی تعرض نہیں کیا کہ بحث واقعہ سے ہے نہ کہ صاحب واقعہ سے خواہ کوئی کیوں نہ ہو۔

۱۳۔ سوئم اکثر کتاب کے مضامین علمی اور دقیق ہیں بالخصوص اتزل القرآن علی سبعة احرف اور حقیقت رویا اور علم الحروف کی بحث زیادہ دقیق ہے چونکہ جامع کتاب علامہ احمد بن مبارک سلجاسی جامع الفنون اور متبحر عالم تھے۔ اس لئے ان کے سوالات بھی علم کے اونچے پیمانہ کے تھے خیال ہوا کہ طویل و دقیق ہونے کے سبب ان کو بھی فصل مستقل کی طرح ترک کر دوں۔ مگر اس خیال سے کہ تحقیق بہت پیاری اور انوکھی ہے اور قدر شناس کے لئے اس کا ایک ایک لفظ جواہرات میں تو لے کے قابل ہے میں نے حتی الوسع اس کو سہل بنانے کی کوشش



کی ہے۔ امید ہے کہ عوام نہیں تو خواص ذی فہم اس سے زیادہ منتفع ہوں گے۔ باقی عام اشتباہات متعلقہ آیات و احادیث کے انوکھے جوابات ہر طبقہ کے لئے بے حد لذیذ اور موجب احتفاظ ہیں۔

۴۔ چہارم ہرزخ اور جہنم و جنت کے ابواب بالخصوص موجب عبرت ہیں جن سے مسلمان عموماً غافل ہوتے جاتے ہیں اس لئے ان کو بغور ملاحظہ کرنے کی ضرورت ہے کہ واقعات ہیں جو عنقریب پیش آنے والے ہیں انسان ہر شب میں خواب کے اندر عموماً پریشان کن صورتیں دیکھتا ہے چمکتا ہے چلتا ہے رزتا ہے کانپتا ہے روتا ہے اور بری طرح تنہا تکلیف پاتا ہے کہ نہ کوئی یار ہوتا ہے نہ مددگار۔ ہر چند کہ عارضی ہے اور آنکھ کھلتے ہی وہ خوف کا منظر ختم ہو جاتا ہے مگر اتنی ہی دیر میں اُس پر جو گذرتا ہے وہ اس کا ہی دل خوب جانتا ہے زندگی تلخ اور بیداری کی ساری لذتیں ریح بن جاتی ہیں پھر کیا پرتپنا حقیقی اور دائمی تکلیف کا جو آنکھیں بند ہوتے ہی اکیلی جان پر پڑتی ہیں کہ دفن کرنے والے اپنے سرور و آرام میں مشغول ہوں گے اور قبر میں سونے والے پر جو گزر رہی ہوگی اس کو وہی برداشت کر رہا ہوگا وہ حسرت و ندامت کا وقت ایسا ہوگا کہ نہ حسرت کچھ نفع دے گی نہ ندامت بس زد و کوب ہوگی اور اس کی ناقابل برداشت تکلیف، پس اگر ایمان ہے کہ مرنا ہے اور ہرزخ و جنت و جہنم کوئی چیز ہے جیسا کہ مقتضا ہے اسلام کا اور دعویٰ ہے ہر مسلمان کا تو اس کے انتظام اور تحفظ آلام کا یہی وقت ہے جس کا نام زندگی ہے اس لئے غفلت نہ کرو اور بیدار ہو جاؤ کہ صلا کو اپنے ہاتھوں نہلاؤ کفن اور زیر خاک دفن ہو چکے ہو۔

۵۔ پنجم قطب، اور غوث وغیرہ ناموں کا ذکر اگرچہ قرآن مجید و احادیث شریفہ میں نہیں آیا مگر درجات و ولایت و خدمات تکوینیہ کے مراتب کا فرق بتانے کے لئے یہ ایسی اصطلاحات ہیں جیسے محدثین میں ثبت حقائق اور حجتہ وغیرہ اور درجات حدیث ظاہر کرنے کے لئے صحیح حسن وغیرہ علماء کی اصطلاحات ہیں اور حدیث تکوینیہ کے ثبوت کی اصل سیدنا خضر علیہ السلام کا قصہ ہے جو قرآن مجید میں مفصل مذکور ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام ان کی ملاقات کے لئے تشریف لے گئے اور صورتہ خلاف شرع متعدد واقعات پیش کئے جن کو سیدنا موسیٰ علیہ السلام ضبط نہ فرما سکے اور ان پر اعتراض کیا اس لئے اس کے اثبات کے لئے مزید دلائل کی ضرورت نہیں۔

۶۔ ششم تمامی کتاب کے ارشادات سے مقصود اصلاح حال اور حق تعالیٰ شانہ کے ساتھ غلامانہ برتاؤ درست رکھنے کی ترغیب و تلقین ہے جس کا طریق ہے کہ اہل عقائد اہل السنۃ والجماعۃ اختیار کریں اور محبت اور بھروسہ حق تعالیٰ کے اور امر کے امتثال اور نواہی سے اجتناب کا پورا اہتمام کریں۔ اعمال حسنہ پر مواظبت کریں اور محبت و شوق کے ساتھ کریں اور حق تعالیٰ شانہ کی سطوت و ربوبیت کا استحضار رکھ کر محض اس کے شاہد محکم



تعمیل میں کریں کہ اخلاص اسی کا نام ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن مبارک کو باب عطاء الہی سمجھ کر اس منبہ غلطی کے ساتھ پکڑیں کہ دوسرے نبی کی تعلیم بھی اس میں تذبذب پیدا نہ کرے۔ چہ جائے کہ قوی رواج یا آبائی رسوم۔ اگر مباح پر بھی عمل کریں تو یہ سمجھ کر کریں کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ اس کو مباح بتایا ہے اس لئے اس کو اختیار کرتا ہوں۔ ایسا کرنے سے مباح بھی طاعت بن جائے گا، اخلاق ہوں یا عادات اور معاملات ہوں یا معاشرت اور نشست و برخاست ہو یا رفتار و گفتار ہر امر اور ہر حال میں اتباع سنت کا شوق ہو اور ہر بنی نوعی سرور عالم و عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہو کہ آپ کی محبت و طاعات کے بغیر نجات و فلاح ہرگز نصیب نہیں ہو سکتی۔

(۷) ہفتم چونکہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا سے تشریف لے گئے سارے تیرہ صدیاں گزر چکیں اور جو لمحہ بھی اس زمانہ خیر القرون سے بعید ہوتا جاتا ہے وہ ظلمت بڑھاتا جاتا ہے اس لئے آج جو بھی دین سے وحشت اور دنیا کی فرط محبت عامہ قلوب میں بڑھ گئی پس اس کی زیادہ اللہ کریم سے ہے کہ اسے دوتی کشتی کے کھیون ہمارے اور اسے بنی اسرائیل کو قعر مذلت سے نکالنے والے جبار و قہار اپنے محبوب کی امت کو سنبھال اور اس کی اصلاح میں اپنی قوت جبروتی کا اظہار فرما، اور ہم کو اس نادان بچہ کی طرح پرورش کر جسے اپنے بڑے بھلے کی تمیز نہیں، ہمارے دلوں میں اپنے دین کی عظمت اور شریعت کی محبت ڈال اور انکھول میں وہ نور عطا کر کہ ریت اور پانی کا فرق نظر آئے یا درجہ اراحمین ہوں اپنی محبت بخش کہ ساری دنیا ہمیں محبوب سمجھے ہمارے قلوب میں اپنی عظمت اور اپنا خوت بھردے کہ ہر دشمن ہمارے عظمت کرنے اور ہم سے ڈرنے پر مجبور ہو اسے رب محمد اکرم پر بلا استحقاق رحم و لطف و کرم فرما کہ صاحب اقتدار سنیں تو عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرح جس کے دامن ہاتھ میں شریعت تھی اور بائیں ہاتھ میں سیاست و حکومت اور اگر نادار و بد حال ہیں تو اس طرح کہ شریعت سطرہ ہماری لیلیٰ اور شیریں ہوا اور ہم اس کے محبوبوں اور فرہاد۔

۸۔ ہشتم اللہ پاک کی مشیت تھی کہ زمانہ ترجمہ کی پوری ششماہی اس طرح گزری کہ یا خود بیمار یا متعلقین بیمار رہے محض اس کا فضل تھا کہ اسی بیماری و بیماری میں یہ خدمت بھی انجام پاتی رہی۔ ناظرین سے استدعا ہے کہ کوئی غلطی پائیں تو اصلاح فرمائیں اور بندہ ناچرز کے لئے دعائے حسن خاتمہ کریں۔

والاخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین صلی اللہ علی سیدنا و مولانا و شفیعنا محمد و آلہ و صحبہ و بارک و سلم۔  
بندۃ ناچیز







